تفسیر سورۃ مائدہ

تحقیق و ترتیب
محمد طاہر ہاشمی
ایم۔اے علوم اسلامیہ

اشاعت 2023

ای بک پی۔ڈی۔ایف

نظم وترتیب محمد طاہر ہاشمی ایم اے علوم اسلامیہ وہسٹری

ٹائیٹل معاونت پروفیسر محمد حسان ہاشمی

تکنیکی تعاون محمد انس ہاشمی

ہدیہ دعائے خیر

بار اول

برائے رابطہ

hashmipk786@gmail .com

برائے ایصال ثواب

والد گرامی ووالدہ محترمہ

مولایَ صلِّ وَسَلِّم دائماً ابداً

علیٰ حَبِیُبِکَ خَیرِ الخَلقِ کُلِھِم

انتساب

ان نفوس قدسیہ کے نام جن کے دم قدم

سے اس گلستان میں علوم کی نیرنگیاں ہیں

اِعُتذِار

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

فہرست

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رب یسر و أعن برحمتك

پروردگار! آسانی بخش اور اپنی رحمت سے اعانت فرما۔

اللہ جل شانہ !کا بے پایہ شکر و امتنان ہے۔ جس کی توفیق و عنایت سے یہ تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی

۔بہت محنت طلب کام تھا۔ اصل میں بندہ ناچیز کے جو بات مطالعہ میں آئی ہے وہ یہ کہ اسلام مکمل نقلی علوم پر منتج ہے اور اس نقلی علم کو عقلی پذیرائی سے ہی سمجھا جاسکتا ہے، جو سراسر فضل الٰہی پر منہج نبی دو عالم فخر موجودات ﷺ سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے متقدمین کی کتب ہی سرمایہ و سرچشمۂ ہدایت ہیں ان کے اصولوں کو چھوڑ کر صراط مستقیم سے بھٹک جانا بازیچۂ اطفال ہے۔ جو آج ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس کی کہ کیوں نہ آسان زبان میں تفسیر و تاویل و اعتبارات بیان کر دیئے جائیں تا کہ طلباء جو وابستہ ہیں۔ وہ ان راہوں سے آشنا ہو جائیں اور قرآن کریم سے منضبط ہو جائیں۔ ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اسے پڑھیں اور قرآنی اصولوں کو مد نظر رکھ کر قرآن کریم کے علوم سے بہرہ مند ہوں۔

دوسری طرف اسے لکھنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ افسوس واعظ حضرات قرآن پاک کی آیات کی من بھانوری تاویلات کرتے ہیں یا تو انہیں ادراک ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں یا عمدا ایسا کرتے ہیں جو کہ بے راہ روی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے لئے سخت وعید آئی ہے۔ تحریر لکھ دی ہے ۔ ؎شائد کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کلمات طیبات قرآن حکیم کو سمجھنے، پڑھنے اور عمل کرنے کی سعادتوں سے بہرہ مند کرے اور ہمیں راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہماری اور ہمارے آبا کی بخشش فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ۔

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ أَشْرَف الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِینَ وَعَلَی آلِہِ وَصَحْبِہِ وَمَنِ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَی یَوْمِ الدِّینِ. أَمَّا بَعْدُ!

یَا طَالِبَ الْمَعْرِفَۃ وَمَقَامَات الصَّفَا

أَصْحَب خَلَا قَد وَفَا بِعُبُودِیَّۃ اللّٰہ

لَا تَکْتَفِي بِالْأَقْوَال أَنْہَض بَادَر بِالْأَعْمَال

تَبْلُغ مَقَام الْمَالِ لَا إِلَہَ إِلَّا اللّٰہُ

وَإِن تُرِید الْمَعْنَی فِي اسْمِ ذَاتِہ فَأَفْنَی

کررا مُعْلِنًا تَحْظَی بَلْقَاء اللّٰہ

بِہ تَبْلُغ الْمَقْصُود تُسْقَی مِنْ کاس الشُّھُود

فَتَرَی کُلّ الْوُجُود ظَاھِرًا بِنُورِ اللّٰہِ

أَذْکُرُہ مَعْنَی وَحِسّ مِنَ النُّورِ تقتبس

تَدْخُلُ فِي مَقَامِ الْإِنْس دَائِمًا فرحك بِاَللّٰہ

قُلْ اللّٰہُ جَھْرَۃً وَسِرًّا وَخُلْوّہ

فتاتیك نغحۃ تفنیك فِي ذَاتِ اللّٰہِ

رَاقَب جَمَال الْحَبِیب ھُوَ الْقَرِیبُ الْمُجِیبِ

یَأْتِیك فَتْحًا غَرِیبٌ تُحی بِشُھُود اللّٰہ

توضاء بِمَاء الْغَیْب وَیَمّم نَحْو الْحَبِیب

فَثَمّ سِرّ عَجِیبٌ تَشْھَد اللّٰہِ بِاَللّٰہِ

وَإِن تُرِید التَّمْکِین وأذواق الْعَارِفِین

استادی عَیْن التَّعَیُّن العلاوی سِرُّ اللّٰہِ

فھیمنی بالوداد مِنْہ أَتَتْنِی الْمِدَاد

فَنِلْت أَعْلَی الْمُرَاد صِرْت غَنِیًّا بِاَللّٰہ

یَامَنْ تُرِید الدَّوَاء وَالْغَیْب عَن السُّوَی

أُشْرِبْ مِنْ خَمْرِی تُرْوَی فَتَنْظُر جَمَالِ اللّٰہِ

تَبَرَّز لَك شُمُوس الذَّات بِالْأَسْمَاءِ وَالصِّفَاتِ

فِی جَمِیعِ الْکَائِنَاتِ کَانَ اللّٰہُ وَبَاقِی اللّٰہ

حَدَّد بَصَرِ الْإِیمَانِ تَرَی اللّٰہِ لَا الْأَکْوَان

ھَذَا مَقَامُ الْإِحْسَانِ اخْتِصَاصًا مِنْ اللّٰہِ

لَا بِجِدّ وَاجْتِھَاد عَطَاءٍ مِنْ الْجَوَاد

الرَّءُوف بِالْعِبَاد شُکْرًا وَحَمْدًا لِلّٰہ

(مُحَمَّد الفیتوری)

اللہ سبحانہ کا بے پایاں احسان وو کرم ہے کہ اس نے ہمیں دین اسلام کی آغوش میں پناہ دی، اور تاجدار کائنات ﷺ کی غلامی کا شرف عطا کیا۔ نہ اسلام سے بڑھ کر کوئی دولت و نعمت ہے اور نہ غلامی مصطفے ﷺ سے بڑھ کر کوئی سعادت و عزت۔ لہٰذا وہ شخص بڑا خوش بخت ہے جو شجر دین سے وابستہ اور کتاب و سنت کے احکام پر پورے طور پر عمل پیرا ہے۔

بلاشبہ دین اسلام اللہ کا بتایا ہوا ایک سیدھا راستہ، آسان طریقہ اور مکمل دستور حیات ہے، جس کو اختیار کرنے میں دنیا و آخرت کی کامرانیاں پنہاں ہیں۔ یہ ایک ایسی روشن شاہراہ ہے، جہاں رات دن کا کوئی فرق نہیں، اور نہ ہی اس میں کہیں پیچ و خم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین و انسانیت کے لیے پسند فرمایا، اور رسول کریم ﷺ کی مبارک زندگی ہی میں اس کی تکمیل فرمادی۔ عقائد، عبادات،

معاملات، اخلاقیات، غرضیکہ جملہ شعبہ ہائے زندگی میں کتاب وسنت کی بھرپور رہنمائی لیے موجود ہے۔ اس تحفۂ خداوندی یعنی قرآن حکیم کو مظبوطی سے پکڑلیں۔ ارشاد فرمایا:

حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْكُوفِيُّ، حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ الْحَسَنِ هُوَ الْأَنْمَاطِيُّ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّتِهِ يَوْمَ عَرَفَةَ وَهُوَ عَلَى نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ يَخْطُبُ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا، كِتَابَ اللَّهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي". قَالَ: وَفِي الْبَابِ عَنْ أَبِي ذَرٍّ، وَأَبِي سَعِيدٍ، وَزَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، وَحُذَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ، قَالَ: وَهَذَا حَسَنٌ غَرِيبٌ هَذَا الْوَجْهِ، قَالَ: وَزَيْدُ بْنُ الْحَسَنِ قَدْ رَوَى عَنْهُ سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ وَغَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ. **(ترمذی :3786)**

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہو کر خطبہ دے رہے تھے، میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا: ”اے لوگو! میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جارہاہوں کہ اگر تم اسے پکڑے رہوگے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے: ایک اللہ کی کتاب ہے دوسرے میری « عترت » یعنی اہل بیت ہیں۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَعَن مَالك بن أنس مُرْسَلًا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَ رَسُولِهِ». رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّأ«

مالک بن انس رحمہ اللہ مرسل روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہاہوں، پس جب تک تم ان دونوں پر عمل کرتے رہوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، (یعنی) اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔“ موطاء میں یہ روایت ہے۔ [مشكوة المصابيح / كِتَاب الْإِيمَانِ / حدیث:186]

مزید

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: سَأَلْتُ الْأَعْمَشَ، فَقَالَ: عَنْ زَيْدِ بْنِ وَهْبٍ، سَمِعْتُ حُذَيْفَةَ، يَقُولُ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "أَنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ مِنَ السَّمَاءِ فِي جَذْرِ قُلُوبِ الرِّجَالِ وَنَزَلَ الْقُرْآنُ، فَقَرَءُوا الْقُرْآنَ، وَعَلِمُوا مِنَ السُّنَّةِ."

ہم سے علی بن عبد اللہ مدینی نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان بن عیینہ نے بیان کیا، کہا کہ میں نے اعمش سے پوچھا تو انہوں نے زید بن وہب سے بیان کیا کہ میں نے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے سنا، انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امانت داری آسمان سے بعض لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں اتری، (یعنی ان کی فطرت میں داخل ہے) اور قرآن مجید نازل ہوا تو انہوں نے قرآن مجید کا مطلب سمجھا اور سنت کا علم حاصل کیا تو قرآن وحدیث دونوں سے اس ایمانداری کو جو فطرتی تھی پوری قوت مل گئی۔ [صحيح البخاري / كِتَاب الِاعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ / حديث:7276]

تو قرآن وسنت، اہل بیت سے تمسک یہی طریقہ نجات ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنا اور عمل کرنا ہی نجات اخروی ہے۔ اہل بیت یعنی خانوادہ نبوت (اہل وعیال، اہل قرابت) سے تعلق انسان کو راہ ہدایت سے بھٹکنے نہیں دیتا کیونکہ ان کی روحانی تربیت بندہ کو روح کی بالیدگی عطا کرتی ہے۔

اللہ کریم ہمیں ایمان پر کاربند رکھے اور ایمان پر ہمارا خاتمہ فرمائے۔ آمین!

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کلمات طیبات قرآن حکیم کو سمجھنے، پڑھنے اور عمل کرنے کی سعادتوں سے بہرہ مند کرے اور ہمیں راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہماری اور ہمارے آبا کی بخشش فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

يَا فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ

اے خدا اے خالق ارض وسما۔۔۔۔۔ اے خدا اے مالک روز جزا

ہے تو ہی دنیا میں میرا کارساز۔۔۔۔۔ اور تو ہی ہے آخرت کا کارساز

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ

موت دے یارب مجھے اسلام پر۔۔۔۔۔ اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ کر

اللهم انی اسئلك نعيما لا ينفد وقرة عين

دے وہ ٹھنڈک آنکھ میں اے ذوالجلال۔۔۔۔۔ اور وہ نعمت نہ ہو جس کو زوال

لا تنقطع والرضاء بالقضاء وبرد العيش

رکھ رضامند اپنی خواہش پر مجھے۔۔۔۔۔ کر نہ دے حرص وہوا مضطر مجھے

بعدالموت ولذۃالنظر الی وجھك

بعد مرنے کے مجھے راحت ملے۔۔۔۔۔اور ترے دیدار کی لذت ملے

باالشوق الی لقائك من غیر ضراء مضرۃ وفتنۃ مضلۃ

کر عطا اپنا مجھے شوق لقا۔۔۔۔۔دین دنیا کی خرابی سے بچا

اللّٰھُمَّ لَقِّنِی حُجَّۃَ الإِیمَانِ عِنْدَ الْمَمَاتِ

اور دلیل ایمان کی دل کو مرے۔۔۔۔۔یاالٰہی مرتے دم سکھلا تو دے

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَ اخْسَأْ شَیْطَانِیْ

مغفرت مری کر اے رب غفور۔۔۔۔۔اور کر دے مجھ کو شیطاں سے دور

وَفُكَّ رِھَانِیْ وَثَقِّلْ

مجھ سے ہر ایک بند میرا دے چھڑا۔۔۔۔۔کر مجھے قیدِ عاصی سے رہا

مِیْزَانِیْ وَاجْعَلْنِیْ

پلہ میری نیکیوں کا اور ثواب۔۔۔۔۔کر دے بھاری اور بڑھا روز حساب

فِی النَّدِیِّ الْاَعْلٰی۔

طبقہ اعلیٰ میں دے مجھ کو جگہ۔۔۔۔۔مجلس بالا میں دے مجھ کو جگہ

بِسۡمِ اللہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَلۡحَمۡدُ للہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشۡرَفِ الۡاَنۡبِیَاۤءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ سَیِّدِنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ط اما بعد فَاَعُوۡذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ط بِسۡمِ اللہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

آیت مبارکہ:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

لغۃ القرآن: [بِسۡمِ اللّٰہِ : اللہ کے نام سے] [الرَّحۡمٰنِ : جو بے حد رحم والا] [الرَّحِیۡمِ : نہایت مہربان ہے]

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

تعارف سورۃ المائدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سورۃ پاک کا نام "المائدۃ" ہے اور یہ مدنی ہے۔ کیونکہ ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی خواہ وہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہوں یا مدینہ طیبہ سے باہر حالت سفر میں یا حج و عمرہ کے ایام میں خاص مکہ مکرمہ میں سب کو مدنی کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک سو بیس آیات اور سولہ رکوع ہیں۔ اس کے حروف کی تعداد 12464 ہے۔

اس سورۃ کی فقط ایک آیت الیوم اکملت لکم الخ متعلق تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں 9۔ ذی الحجہ 10ھ کو نازل ہوئی۔ باقی آیات کی تاریخ نزول کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن مختلف روایات میں غور و فکر کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اس کا نزول صلح حدیبیہ کے وقت سے شروع ہوا اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس کا اختتام ہوا۔

”مائدہ“ نام رکھے جانے کی وجہ

عربی میں دستر خوان کو "مائدہ "کہتے ہیں اور اس سورت کی آیت نمبر 112 تا 115 میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے آسمان سے مائدہ یعنی کھانے کے ایک دستر خوان کے نزول کا مطالبہ کیا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے مائدہ کے نازل ہونے کی دعا کی، اس واقعے کی مناسبت سے اس سورت کا نام "سورۃ مائدہ "رکھا گیا۔

سورۃ مائدہ کے فضائل

(1)۔۔اس سورت کی ایک آیت مبارکہ کے بارے میں حضرت عمر فاروق (رض) سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے ان سے کہا "اے امیر المومنین ! (رض)، آپ اپنی کتاب میں ایک آیت کی تلاوت کرتے ہیں، اگر وہ آیت ہم یہودیوں کے گروہ پر نازل ہوئی ہوتی تو (جس دن یہ نازل ہوتی) ہم اس دن کو عید بناتے۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا "وہ کون سی آیت ہے ؟اس یہودی نے عرض کی (وہ یہ آیت ہے)
اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ : ۳)
آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔
حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا "ہم اس دن اور اس جگہ کو بھی جانتے ہیں جس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ آیت نازل ہوئی، (جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت) حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جمعہ کے دن عرفات کے میدان میں مقیم تھے (اور جمعہ و عرفہ دونوں مسلمانوں کی عید کے دن ہیں۔)

(بخاری، کتاب الایمان، باب زیادۃ الایمان و نقصانہ، ۲۸/۱، الحدیث : ۴۵)

(2)۔۔حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) فرماتے ہیں "جب حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سورۃ مائدہ نازل ہوئی اور اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی سواری پر سوار تھے تو سواری میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہ رہی اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سواری سے نیچے تشریف لے آئے۔

(مسند امام احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) عنہما، ۵۸۹/۲، الحدیث : ۶۶۵۴)

(3)۔۔حضرت مجاہد (رض) سے مروی ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "تم اپنے مردوں کو سورۃ مائدہ اور عورتوں کو سورۃ نور سکھاؤ۔

(شعب الایمان، التاسع عشر من شعب الایمان۔۔الخ، فصل فی فضائل السور والآیات، ۴۶۹/۲، الحدیث : ۲۴۲۸)

علامہ عبد الرؤف مناوی (رح) فرماتے ہیں "سورۃ مائدہ میں چونکہ مردوں کے لیے بہت (زجر و تَوبیخ) ڈانٹ ڈپٹ ہے اس لیے انھیں سورۃ مائدہ سکھانے کا حکم دیا گیا اور سورۃ نور میں عورتوں کے لیے بہت (زجر و توبیخ) ڈانٹ ڈپٹ ہے کہ اس میں واقعہ افک اور زینت کے مقام ظاہر

کرنے کی حرمت وغیرہ ان چیزوں کا بیان ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں، اس لیے انھیں سورۃ نور سکھانے کا حکم دیا گیا۔ (فیض القدیر، حرف العین، ۴/۴۳۳، تحت الحدیث: ۵۴۸۲)

سورۃ مائدہ کے مضامین

اس سورت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے باطل عقائد و نظریات ذکر کرکے ان کا رد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت میں یہ مضامین بیان کئے گئے ہیں۔

(1)۔۔ مسلمانوں کو تمام جائز معاہدے پورا کرنے کا حکم دیا گیا اور ان جانوروں کے بارے میں بتایا گیا جو مسلمانوں پر حرام ہیں اور جو مسلمانوں کے لیے حلال ہیں۔

(2)۔۔ وضو، غسل اور تیمّم کے احکام بیان کئے گئے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے اور ناانصافی کرنے سے بچنے کا حکم دیا گیا۔

(3)۔۔ بنی اسرائیل سے عہد لینے، ان کے عہد کی خلاف ورزی کرنے اور اس کے انجام کو بیان کیا گیا۔

(4)۔۔ بنی اسرائیل کا جبّارین سے جہاد نہ کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

(5)۔۔ چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کی سزا کا بیان، شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان، قسم کے کفّارے کا بیان، احرام کی حالت میں شکار کے احکام۔ قرآن کے احکامات پر عمل کو ترک کرنے کی وعید، یہودیوں، عیسائیوں، منافقوں اور مشرکوں سے ہونے والی بحث کا بیان ہے۔

(6)۔۔ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اصلاح کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا کہ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کی جائے اور گناہ و سرکشی کے کاموں پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون حرام ہے، کفار کے ساتھ دوستی کرنا حرام ہے نیز گواہی کے متعلق فرمایا کہ گواہی دینے والا عادل ہو اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے اور مسلمانوں کے درمیان مساوات قائم کی جائے۔

(7)۔۔ اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہی ہے اگرچہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ عَزَّوَجَلَّ سے شریعت اور ان کے طریقے مختلف تھے۔

(8)۔۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پوری مخلوق کو عام ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عام تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(9)۔۔ عبرت اور نصیحت کے لیے اس سورت میں یہ تین واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ (1) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کا واقعہ۔ (2) حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کا واقعہ۔ (3) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزے "کھانے کے دستر خوان" کے نازل ہونے کا واقعہ۔

سورۃ نساء کے ساتھ مناسبت

سورۃ مائدہ کی اپنے سے ماقبل سورت "نساء" کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ سورۃ نساء میں مختلف صریح اور ضمنی معاہدے بیان کئے گئے تھے جیسے نکاح اور مہر کے معاہدے، وصیت، امانت، وکالت، عارِیَت، اجارہ وغیرہ کے معاہدے اور سورۃ مائدہ میں ان معاہدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (تناسق الدرر، سورۃ المائدۃ، ص ۸۱) (صراط)

یہ چند سال اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مدینہ کے افق پر خطرات کے جو سیاہ بادل ہر وقت منڈلایا کرتے تھے وہ آہستہ آہستہ ناپید ہو رہے تھے۔ کفار پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی تھی کہ اسلام ایک قوت ہے اس کو مٹانا اب ان کے بس کی بات نہیں۔ یہودیوں کا زور بھی اب ٹوٹ چکا تھا۔ مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں ان کی سب بستیاں گڑھیاں اور قلعے مسلمانوں کے تصرف میں تھے۔ غرضیکہ مظلومیت کی طویل اور تاریک رات اب ختم ہو رہی تھی اور آفتاب اقبال طلوع ہو رہا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآن حکیم نے

مسلمانوں کو کیا ہدایات فرمائیں

1۔ اس سورۃ کا آغاز تربیت اخلاق سے ہو رہا ہے اس لیے پہلے اسی عنوان پر غور کریں۔ اس سورۃ میں مختلف اقسام کے اخلاقی سبق دیئے گئے ہیں جن کا تعلق جس طرح ایک قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے اسی طرح ان کا تعلق بین الاقوامی معاملات اور تعلقات سے بھی ہے۔ سب سے پہلے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جو وعدہ کرو اس کو پورا کرو۔ خواہ یہ وعدہ نجی کاروبار کے متعلق ہو اپنے حلیفوں سے ہو یا حریفوں سے ہو اور خواہ اپنے رب ذوالمجد والعلی سے ہو۔ آج کل کی متمدن قومیں یہ درست ہے کہ اپنے انفرادی وعدوں کی کسی تک پابندی کرتی ہیں لیکن سیاسی زندگی میں اپنے وعدوں کی جو مٹی پلید کرتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ مسلمانوں کا رب انھیں حکم دیتا ہے کہ جو وعدہ کرو اسے پورا کرو خراہ وہ وعدہ حدیبیہ کے میدان میں دشمنان اسلام سے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔

اب جب قوت واقتدار مسلمانوں کے پاس آرہا ہے تو ان کو صاف صاف اور کئی کئی بار حکم دیا کہ جب قضا کی کرسی پر بیٹھو تو یاد رہے عدل وانصاف تمہارا اشعار ہو۔ فریق مقدمہ تمہارا دشمن ذاتی نہیں بلکہ دینی دشمن ہی کیوں نہ ہو عدل کا دامن تمہارے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ نیز فرمایا کہ اقوام عالم سے تمہارے تعلقات کی بنیاد یہ ہو کہ نیکی اور بھلائی کے ہر کام میں انھیں تمہاری معاونت حاصل ہو اور گناہ ظلم کے کسی کام میں تم ان سے اشتراک نہ کرو۔ فرزندان آدم کا قصہ بیان کرکے بتایا کہ حسد بہت بری چیز ہے اس نے بھائی کو بھائی کا قاتل بنادیا تم اس مذموم خصلت سے احتراز کرنا۔

2۔ آسمانی کتابیں:۔ دوسری اہم چیز جس کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ توراۃ، انجیل اور قرآن الگ الگ نظریات کے علم بردار نہیں بلکہ یہ تینوں نہریں ایک ہی سرچشمہ فیض سے پھوٹی ہیں۔ توراۃ کے متعلق فرمایا کہ فیھا ھدی ونور۔ انجیل کے متعلق بھی بعینہٖ یہی الفاظ فرمائے کہ فیہ ھدی ونور اور قرآن کے متعلق تو بار بار یہی فرمایا گیا۔ معلوم ہوا سب میں ہدایت ہے سب میں نور ہے۔ اور ہر ایک کتاب میں اپنے زمانہ کے مطابق شریعت کا مکمل ترین نظام اور اخلاقیات و معاملات کا واضح ضابطہ موجود تھا۔ اور ان سب کا جامع اور ان تمام بلند اخلاقی قدروں کا نقیب، محافظ اور نگہبان قرآن مجید ہے۔

3۔ حاملان قرآن کو تنبیہ فرمادی کہ دیکھو! ہدایت ونور یہود کے پاس بھی آیا اور نصاریٰ کے پاس بھی۔ لیکن انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اے غلامان مصطفیٰ! اب وہی ہدایت ونور اپنی پوری آب وتاب اور شوکت وجلال سے تمہارے مطلع حیات پر نمودار ہو رہا ہے۔ اور تمہیں اس سے استفادہ کا موقع دیا جارہا ہے کہیں تم بھی اپنے پیش روؤں کی طرح اپنی خواہشات اور خودساختہ مصلحتوں کی قربان گاہ پر اسے بھینٹ نہ چڑھادینا۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی پوری پوری تعمیل کرنا۔ کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے مطابق فیصلے کرتا ہے وہ منکر حق ہے۔ وہ

نافرمان ہے وہ اپنے پر ظلم کرنے والا ہے۔ نیز فرمایا کہ یہود و نصارے خود تو بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں بھی جادہ حق سے بہلانے پھسلانے کی انتہائی کوشش کریں گے۔ خبردار ! ہوشیار ! ان کے دام فریب میں نہ پھنس جانا۔ واحذران ان یفتنوک عن بعض ماانزل اللہ الیک۔
معلوم ہوتا ہے اہل حق کو حق سے برگشتہ کرنے کی جو کوشش اس وقت شروع ہوئی تھی وہ بدستور جاری ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ تندی اور تیزی سے۔ اور اسی تحریک کے پیدا کردہ وہ وسوسے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی مملکتوں کے سربراہ اسلامی قانون کو اپنانے سے ہراساں ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ جس طرح پوری یک جہتی کے ساتھ ایک بار اللہ اکبر کہہ کر ہم نے ان فرنگی آقاؤں کی ظاہری غلامی کے زنجیر توڑے ہیں۔ بس ایک بار اور جی کڑا کرکے اللہ اکبر کہیں اور ذہنی غلامی کا طلسم بھی توڑ کر رکھ دیں۔ قوت یقین اور ذوق عمل کا ایک معجزہ چند سال ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اقوام عالم کو دکھایا ہے۔ فقط ایک اور معجزہ نمائی کی ضرورت ہے۔ وادی ایمن سے تو اب بھی یہ آواز دمادم آرہی ہے۔ لاتخف انک انت الاعلی۔ گھبرانہیں تو ہی سرفراز و کامیاب ہے اور الق مافی یمینک کا حکم مل رہا ہے لیکن ہم ہیں کہ ساحر فرنگ کی شعبدہ بازیوں سے دم بخود ہوئے بیٹھے ہیں۔
افحکم الجاھلیۃ یبغون (کیا تم جاہلیت کے قانون پر عمل کرنا چاہتے ہو؟) کی توبیخ سے یہ بتایا کہ اگر تمہاری غفلت کے باعث حق کا چراغ گل ہوگیا تو پھر " جاہلیت "کا اندھیرا چھا جائے گا۔ اور " جاہلیت "خواہ اس کے چہرہ کو علم و فن کی مشاطگی نے کسی دل آرام کی طرح بہت ہی دلکش و دلفریب بنا دیا ہو۔ اس کی روح ظالم ہے اس کی فطرت بے رحم ہے وہ تمہاری ساری عزیز قدروں اور عقائد کو کچل دے گی روند ڈالے گی بلکہ خود تم سے روندوا ڈالے گی۔

4۔ قرآن جو شریعت لے کر آیا اس کی کئی جزئیات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ حج کے آداب۔ شعائر اللہ کی تعظیم، کرنے والوں اور چوری کرنے والوں کے لیے عبرتناک سزائیں وغیرہ۔ جن کا تفصیلی تذکرہ اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

5۔ لات و ہبل کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ان کے اپنے ماننے والے ان سے بدظن ہو چکے تھے۔ اب صرف اتنی ہی دیر تھی کہ کوئی دھکا دے اور وہ دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر پڑیں۔ لیکن شرک کی ایک اور قسم دنیا کے ایک وسیع حصہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی یعنی عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث۔ جس کی اشاعت کے لیے شاہی خزانوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ جس کی حفاظت کے لیے بیشمار تلواریں بے نیام تھیں۔ اور جب کبھی کسی فکری بحران نے اسے دود چراغ محفل بنانا چاہا تو علماء فلسفہ یونان وروما کا حجاب اکبر تان کر کھڑے ہو جاتے۔ قرآن نے اس عقیدہ کا پہلے بھی محاسبہ کیا ہے۔ اور یہاں بھی بڑی بے تکلفی اور فطری سادگی سے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) خدا نہیں ہو سکتا۔ جو ماں کے شکم سے پیدا ہو۔ جو اپنی بقا کے لیے کھانے پینے کا محتاج ہو وہ بندہ ہو سکتا ہے مقبول ترین بندہ، محبوب ترین بندہ، لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ اور روز قیامت پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح کی زبانی توحید خالص کا اعلان کرا دیا۔

6۔ اس سورۃ کا طرہ امتیاز وہ آیت کریمہ ہے جو بتاریخ 9۔ ذی الحجہ 10 ھ میدان عرفات میں رحمت عالمیاں، پیکر ہدایت، نور مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ دین کی تکمیل کا اعلان ! اتمام نعمت کا مژدہ ! اللہ اللہ ! بلال (رض) کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہوں گی۔ ابوبکر (رض) کی جبین نیاز سجدہ میں جھک گئی ہوگی۔ عمر و عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چہرے فرط مسرت سے رشک مہ تاباں بن گئے ہوں گے اور حمزہ (رض) یاسر (رض) سمیہ (رض) اور خباب (رض) اپنے اپنے مزارات پر انوار میں رب ذوالجلال کی حمد و ثنا معلوم نہیں کوثر و سلسبیل سے دھلے ہوئے کن نورانی کلمات سے کرنے لگے ہوں گے (رض) کائنات کا ذرہ ذرہ جھوم اٹھا ہوگا۔ اللہ رب السموات والارض کی ساری نوری مخلوقات اس کے حبیب، اس کے رسول، اس کے صفی اور اس کے "عبدہ "محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ سلم پر درود وسلام کے پھول نثار کر رہی ہوگی۔

فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین بجاہ سیدی و مولائی و حبیبی محمد الامین والہ الطیبین امین امین یا رب العالمین۔ (ضیاء)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ﴿١﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا : اے][الَّذِيْنَ : لوگ][اٰمَنُوْٓا : جو ایمان لائے][اَوْفُوْا : پورا کروتم][بِالْعُقُوْدِ : وعدوں کو][اُحِلَّتْ : حلال کیے گئے][لَكُمْ : تمہارے لیے][بَهِيْمَةُ : چوپائے][الْاَنْعَامِ : مویشی][اِلَّا مَا : سوائے جو][يُتْلٰى: پڑھے جائیں][عَلَيْكُمْ : تم پر][غَيْرَ : علاوہ][مُحِلِّي : حلال جاننے والے][الصَّيْدِ : شکار][وَاَنْتُمْ : اور تم ہو][حُرُمٌ: حالت احرام][اِنَّ : یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][يَحْكُمُ : فیصلہ کرتا ہے][مَا يُرِيْدُ : جو چاہتا ہے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! (اپنے) عہد پورے کرو۔ تمہارے لیے چوپائے جانور (یعنی مویشی) حلال کر دیئے گئے (ہیں) سوائے ان (جانوروں) کے جن کا بیان تم پر آئندہ کیا جائے گا (لیکن) جب تم احرام کی حالت میں ہو، شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے

تشریح:

جس طرح وعدہ کیا گیا ہو اسی کے مطابق اس کو پورا کرنے کو وفا اور ایفا کہتے ہیں۔ عقود عقد کی جمع ہے۔ اس کا لغوی معنی گرہ لگانا ہے۔ اب اس کا اطلاق اس پختہ وعدہ پر ہوتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے پائے۔ یہاں عقود سے مراد ہر قسم کے معاہدے ہیں خواہ وہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان ہوں یا انسان اور انسان کے درمیان ہوں۔ ان کا تعلق دینی احکام سے ہو یا دنیوی معاملات سے۔ سب اس میں درج ہیں۔ اور سب کی پابندی کا ہمیں حکم دیا جارہا ہے۔ البتہ وہ وعدہ جس کے پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو اس کا پورا نہ کرنا ضروری ہے۔ حضور کریم

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عہد شکنی کو منافقت کی علامت قرار دیا ہے۔ اخلاق کا کتنا بہترین درس ان دو لفظوں میں دیا گیا۔ کاش! ہم سمجھیں اور عمل کریں۔

احکام الٰہی کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ جن کی تعمیل کا وعدہ ہر مسلمان اسلام قبول کرتے وقت اپنے رب سے کیا کرتا ہے۔

پہلا حکم یہ ہے

کہ ان جانوروں کے علاوہ جن کا ذکر آگے آرہا ہے دوسرے مویشی تمہارے لیے حلال ہیں۔ مشرکین عرب نے اپنے باطل عقائد اور فاسد خیالات کی وجہ سے کئی مویشی اپنے اوپر حرام کر رکھے تھے مثلاً بحیرہ وغیرہ۔ نیز کئی مویشی بطور سزا بنی اسرائیل پر حرام کر دیئے گئے تھے۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ یہ جانور تمہارے لیے حلال ہیں۔ بھیمۃ کا معنی علامہ راغب نے کیا ہے مالا نطق لہ یعنی بے زبان۔ ترجمہ میں میں نے یہی معنی اختیار کیا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ ہر چوپائے کو بہیمہ کہا جاتا ہے اسم لکل ذی اربع اس صورت میں اس کی اضافت انعام کی طرف اضافت بیانیہ ہوگی۔ بعض دیگر اہل علم کا خیال ہے کہ بہیمہ سے مراد چرنے والے شکاری جانور ہیں مثلاً ہرن۔ نیل گائے وغیرہ۔

دوسرا حکم یہ

دیا گیا کہ جب تم نے حج وعمرہ کے لیے احرام باندھ لیا ہو تو پھر تمہارے لیے خشکی کا شکار ممنوع ہے۔

بیشتر احکام جو اس وقت نازل ہو رہے تھے وہ عرب کے دیرینہ رسم ورواج اور ان کے آبائی عقائد کے بالکل خلاف تھے۔ اس لیے احتمال تھا کہ سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہو جائے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا۔ اسے کیوں حرام اور اسے کیوں حلال کیا گیا وغیرہ وغیرہ اس لیے یہ فرما کر ان تمام چہ میگوئیوں کا دروازہ ہی بند کر دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور وہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے۔ جب تم نے اس کا بندہ ہونے کا اعتراف کر لیا۔ اس کو علیم وحکیم تسلیم کر لیا اور اس کے احکام کی تعمیل کا وعدہ کر لیا تو اب قیل وقال کیسی۔ یقین محکم سے ہر ارشاد کی پیروی کرتے جاؤ۔ (ضیاء)

کون سے عہد ہیں اس بارے میں مفسرین کے چند اقوال ہیں:

(1)۔۔ امام ابن جریج (رح) نے فرمایا کہ یہاں اہل کتاب کو خطاب فرمایا گیا ہے اور معنٰی یہ ہیں کہ اے اہل کتاب کے مومنو! میں نے گزشتہ کتابوں میں سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرنے کے متعلق جو تم سے عہد لیے ہیں وہ پورے کرو۔

(2)۔۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں خطاب مومنین کو ہے، انھیں اپنے عہد پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ ان عقود یعنی عہدوں سے مراد ایمان اور وہ عہد ہیں جو حرام وحلال کے متعلق قرآن پاک میں لیے گئے۔

(4)۔۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس میں مومنین کے باہمی معاہدے مراد ہیں۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۱، ۱/۴۵۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اپنے عقود (عہدوں) پورے کرو۔

عقود کا لغوی اور عرفی معنی

عقود عقد کی جمع ہے۔ عقد کا معنی ہے کسی چیز کو پختگی اور مضبوطی کے ساتھ دوسری چیز کے ساتھ واصل کرنا 'یا ایک چیز کی دوسری چیز کے ساتھ گرہ باندھنا 'عہد کا معنی ہے کسی چیز کو لازم کرنا اور عقد کا معنی ہے پختگی کے ساتھ کسی چیز کا التزام کرنا 'یعنی اس لزوم کو ماننا 'اور عقود سے مراد وہ عہود ہیں جو اللہ اور بندوں کے درمیان کیے گئے 'یا وہ عہود ہیں جو بندوں نے آپس میں عقد بیع اور عقد نکاح وغیرہ کے ساتھ کیے 'یا جو لوگوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے عہد کیے 'یا جس چیز پر حلف اٹھا کر عہد کیا۔

عقود کا شرعی معنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔اے ایمان والو ! اپنے عقود کو پورا کرو 'اللہ تعالیٰ کی ذات 'صفات 'اس کے احکام اور اس کے افعال کو ماننے اور قبول کرنے کا نام ایمان ہے 'اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان والے اس کے تمام احکام پر عمل کریں اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے 'ان سے باز رہیں۔لہٰذا جو شخص ایمان لاتا ہے 'اس کا ایمان اس عقد اور عہد کو متضمن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو بجالائے گا 'تو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے ایمان والو ! تم نے اللہ پر ایمان لا کر جس عقد کا التزام کرلیا ہے 'اس کو پورا کرو۔

اس آیت میں عقود سے کیا مراد ہے؟اس کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں 'اس کی اطاعت کریں 'جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے 'ان کو حلال قرار دیں اور جن کو اس نے حرام کیا ہے 'ان کو حرام قرار دیں۔

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا اس سے مراد وہ عقد اور عہد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔
مثلاً قسم کھا کر معاہدہ کرنا 'عقد نکاح اور عقد بیع وغیرہ۔

مجاہد نے بیان کیا اس سے مراد وہ عقود ہیں جو زمانہ جاہلیت میں لوگ ایک دوسرے مدد کرنے کے لیے کرتے تھے۔

قتادہ نے کہا "اس سے مراد وہ عقود ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے توراۃ اور انجیل میں لیے تھے کہ وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کریں گے اور آپ کی کتاب پر ایمان لائیں گے"۔ (جامع البیان ج ٦ ص ٦٦ '۔ ٦٤ مطبوعہ دارالفکر بیروت ١٤١٥ھ)

عقود کی اقسام

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ عقد کی تین قسمیں ہیں :

(١) اللہ اور بندہ کے درمیان عقد۔

(٢) بندہ اور اس کے نفس کے درمیان عقد۔

(٣) ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ عقد۔

جو ع عقد اللہ اور بندہ کے درمیان ہے اس کا موجب عقل ہے یا شرع ہے۔ عقل سے مراد تو بداہت عقل ہے کیونکہ انسان کی عقل میں اللہ تعالیٰ نے ایسا نور رکھا ہے جس سے انسان اپنے خالق کی معرفت حاصل کرلیتا ہے اور یا عقل سے مراد یہ ہے کہ انسان مخلوق میں غور و فکر کرے تو ہر چیز کا ایک نظم اور ضبط کے ساتھ کام کرنا اور نظام کائنات میں کسی فرق اور رخنہ کا واقع نہ ہونا ' زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ خالق وحدہ لا شریک ہے 'اور یا اس عقد کا موجب شرع ہے اور شرع سے مراد کتاب اور سنت ہے۔ سو کتاب اور سنت میں اللہ تعالیٰ کے جو احکام بیان کیے گئے ہیں 'بندہ ایمان لانے کے بعد ان سب پر عمل کرنے کا اللہ سے عقد کرلیتا ہے۔ جو عقد بندہ اور اس کے نفس کے درمیان ہے 'اس سے مراد ہے بندہ کا نذر مان لینا۔ اگر وہ کسی عبادت کی اور کار خیر کی نذر مان لیتا ہے تو اس کو پورا کرنا واجب ہے۔ اگر وہ کسی مباح کام کو ترک کرنے کی قسم کھاتا ہے 'مثلا یہ کہ وہ اونٹ کا گوشت یا شہد نہیں کھائے گا تو اس قسم کو پورا کرنا مستحب ہے۔ اور اس کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرنا بھی جائز ہے۔ اور اگر وہ کسی معصیت کی یا کسی عبادت کو ترک کرنے کی قسم کھاتا ہے تو اس قسم کو پورا کرنا حرام ہے 'اور اس کو توڑنا واجب ہے۔

اور جو عقد ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہوتا ہے 'جیسے عقد بیع 'عقد نکاح وغیرہ۔ ان کا حکم معقود علیہ کے اعتبار سے ہے۔ جس چیز پر عقد کیا ہے اگر وہ واجب ہے تو عقد واجب ہے 'مثلا غلبہ شہوت کے وقت نکاح واجب ہے تو یہ عقد واجب ہے۔ اگر وہ سنت ہے تو عقد سنت ہے 'جیسے عام حالات میں عقد نکاح۔ اگر وہ جائز ہے تو عقد جائز ہے 'جیسے بیع شراء۔ اگر وہ مکروہ ہے تو عقد مکروہ ہے 'جیسے نبیذ کی بیع۔ اگر وہ حرام ہے تو عقد حرام ہے 'جیسے خمر اور خنزیر کی بیع ہے۔ اسی طرح عقد اجارہ (کرایہ) کی اقسام ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمہارے لیے ہر قسم کے چار پاؤں والے جانور حلال کیے گئے ہیں۔

بہیمۃ الانعام کا معنی

بھیمۃ اس جاندار کو کہتے ہیں جو بے عقل ہو اور عرف میں یہ سمندر اور خشکی کے چار پاؤں والے جانوروں کے ساتھ خاص ہے اور انعام اونٹ ' گائے اور بکریوں کو کہتے ہیں اور جو جانور ان کے ساتھ ملحق ہیں 'جیسے بھینس 'بھیڑ 'اور ہرن وغیرہ۔

قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "اللہ الذی جعل لکم الانعام لترکبوا منھا و منھا تاکلون " (المؤمن: ۷۹)

ترجمہ: اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے 'تاکہ تم ان میں سے بعض کو کھاؤ۔

(آیت) "و من الانعام حمولۃ و فرشا کلوا مما رزقکم اللہ، ثمنیۃ ازواج من الضان اثنین و من المعز اثنین، و من الابل اثنین و من البقر اثنین، (الانعام: ۱۴۴، ۱۴۲)

ترجمہ: اور بعض (قد آور) چوپائے (پیدا کیے) بوجھ اٹھانے والے اور بعض زمین سے لگے ہوئے کھاؤ اس رزق سے جو اللہ نے تمہیں دیا۔ آٹھ جوڑے پیدا کیے 'بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) اور اونٹ سے دو پیدا کیے اور گائے سے دو پیدا کیے۔ (تبیان)

ان آیتوں میں آٹھ چوپایوں 'بھیڑ بکری 'اونٹ اور گائے کے جوڑوں پر انعام کا اطلاق فرمایا ہے۔اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے المائدہ کی تیسری آیت میں جن چوپایوں کا استثناء فرمایا ہے 'ان کے علاوہ باقی تمام جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد ان کو کھانا اور ان سے بار برداری وغیرہ کے دیگر منافع حاصل کرنا جائز ہیں۔

{ اُحِلَّتْ لَكُمْ : تمہارے لیے حلال کر دیئے گئے۔ } یہاں سے حلال جانوروں کا بیان کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا کہ جن کی حرمت شریعت میں بیان ہوئی ہے ان کے سوا تمام چوپائے تمہارے لیے حلال کئے گئے۔اس میں ان کفار کا رد ہے جو بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور بَحیرہ، سائبہ وغیرہ کو حرام سمجھتے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ حرام صرف وہ ہے جسے اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حرام فرمادیں۔ حلال کے لیے خاص دلیل کی ضرورت نہیں، کسی چیز کا حرام نہ ہونا ہی حلال کی دلیل ہے جس طرح اس آیت میں واضح طور پر فرمادیا گیا۔اس سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو مسلمانوں کے پاکیزہ کھانوں کو حیلے بہانوں سے حرام بلکہ شرک قرار دیتے رہتے ہیں۔

{ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ : اور تم حالت احرام میں ہو۔ } احرام کی حالت میں خشکی کا شکار کرنا حرام ہے جبکہ دریائی شکار جائز ہے۔

(بدائع الصنائع، کتاب الحج، فصل واما بیان انواعہ، ۲/۴۲۷)

خیال رہے کہ مُحْرِمْ (یعنی احرام والے) کا شکار کیا ہوا نہ مُحْرِمْ کو حلال ہے نہ غیر کو، احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا۔اس سورۃ کے آخر میں بھی مُحْرِمْ کے شکار کے مسائل کا بیان آئے گا۔ (صراط)

جانوروں کے ذبح کرنے پر اعتراض کا جواب

مجوسی اور ہندوؤں کے بعض فرقے یہ کہتے ہیں کہ جانوروں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے 'کیونکہ یہ جانور بے زبان ہیں اور اپنے خلاف مدافعت نہیں کر سکتے اور ان کو پکڑ کر زبردستی ذبح کر دینا ظلم ہے اور کسی پر ظلم کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض مسلمانوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ذبح کے وقت ان کو تکلیف نہیں ہوتی اور اللہ ان سے اس تکلیف کو اٹھالیتا ہے۔لیکن اس جواب میں مکابرہ ہے اور بداہت کا انکار ہے۔معتزلہ نے کہا 'درد اور تکلیف مطلقاً قبیح نہیں ہے 'انسان سرجری اور جراحی کرتا ہے 'تاکہ اس عمل جراحی کے ذریعہ اس کو کسی بڑی تکلیف سے نجات مل جائے۔اسی طرح ان جانوروں کو آخرت میں ذبح کی اس تکلیف کے بدلہ بہت عمدہ عوض ملے گا 'اس لیے یہ قبیح نہیں ہے اور اہل سنت نے یہ کہا کہ چوپایوں کو ذبح کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے 'اور اللہ ہر چیز کا مالک ہے 'اور وہ ہر طرح تصرف کر سکتا ظلم اس وقت ہوتا جب غیر کی ملک میں تصرف کیا جاتا 'اور جب ہر چیز اللہ کی ملک میں ہے 'تو پھر جب وہ اپنی ملک میں کوئی تصرف کرے تو کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ماسوا ان کے جن کا حکم تم پر آئندہ تلاوت کیا جائے گا۔ (المائدہ : ۱)

مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس استثناء کا بیان (المائدہ : ۳) میں بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے :

مردار 'رگوں کا بہا ہوا خوں 'خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو 'اور گلا گھٹ جانے والا 'اور چوٹ سے مارا ہوا اور اوپر سے گرا ہوا 'اور جس کو درندے نے کھالیا ہو مگر جس کو تم نے (اللہ کے نام پر) ذبح کرلیا اور جس کو بتوں کے لیے نصب شدہ پتھروں پر ذبح کیا گیا ہو (یہ سب) تم پر حرام کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لیکن تم حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھنا، بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ (المائدہ : ۱)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بھیمۃ الانعام " (چوپایوں) کو حلال فرمایا تھا۔ اب یہ فرمایا ہے کہ جو چوپائے شکار ہوں 'وہ حالت احرام میں حلال نہیں ہیں 'اور جب احرام کھول دیا ہو 'تو حلال ہیں۔
اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لیے ہر قسم کا شکار کرنا جائز نہیں ہے 'لیکن ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم پر صرف خشکی کا شکار کرنا ممنوع ہے 'اور سمندری شکار کرنا جائز ہے 'قرآن مجید میں ہے :
(آیت) "احل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارۃ وحرم علیکم صید البر ماد متم حرما"۔ (المائدہ : ٩٦)
ترجمہ : تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام (اس کی پھینکی ہوئی مچھلیاں وغیرہ) حلال کردی گئی ہیں 'تمہارے لیے (بھی) اور تمہارے مسافروں کے لیے (بھی) اور جب تک تم محرم ہو 'تم پر خشکی کا شکار کرنا حرام ہے۔
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے ؟ کہ اللہ تعالیٰ نے محرم پر خشکی کا شکار کرنا حرام کیا ہے 'اور سمندر کا شکار حلال کردیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا مالک اور خالق ہے اور کسی عام حکم میں کسی چیز کو مستثنی کرنے یا کسی چیز کی تخصیص کرنے کی وجہ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : بیشک اللہ جو چاہتا ہے 'حکم دیتا ہے۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآٮِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَـرَامَ وَلَا الۡهَدۡىَ وَلَا الۡقَلَۤاٮِٕدَ وَلَاۤ آٰمِّيۡنَ الۡبَيۡتَ الۡحَـرَامَ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرِضۡوَانًا‌ ؕ وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا‌ ؕ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا‌ ۘ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى‌ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ‌ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ‏ ﴿۲﴾

لغۃ القرآن: [يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ : اے لوگ][اٰمَنُوۡا : جو ایمان لائے][لَا : نہ][تُحِلُّوۡا : تم بےحرمتی کرو][شَعَآٮِٕرَ : نشانیاں][اللّٰهِ : اللہ کی][وَلَا : اور نہ][الشَّهۡرَ : مہینہ][

الْحَرَامَ : حرمت والا][وَلَا : اور نہ][الْهَدْيَ : قربانی][وَلَا الْقَلَآىِٕدَ : اور نہ پٹے کی][وَلَآ آٰمِّيْنَ : اور نہ قصد کرنے والے][الْبَيْتَ :: گھر][الْحَرَامَ : حرمت والا][يَبْتَغُوْنَ : وہ تلاش کرتے ہیں][فَضْلًا مِّنْ : فضل سے][رَّبِّهِمْ : اپنے رب][وَرِضْوَانًا: اور رضا][وَاِذَا : اور جب][حَلَلْتُمْ : تم احرام کھول لو][فَاصْطَادُوْا : تو تم شکار کرو][وَلَا : اور نہ][يَجْرِمَنَّكُمْ : وہ آمادہ کرے تمہیں][شَنَاٰنُ : دشمنی][قَوْمٍ : قوم][اَنْ : یہ کہ][صَدُّوْكُمْ : انہوں نے تم کو روک دیا تھا][عَنِ : سے][الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : مسجد حرام][اَنْ : یہ کہ][تَعْتَدُوْا : تم ایک دوسرے پر زیادتی کرو][وَتَعَاوَنُوْا : اور تم آپس میں تعاون کرو][عَلَي : پر][الْبِرِّ : نیکی][وَالتَّقْوٰى ۠: تقوٰی][وَلَا : اور نہ][تَعَاوَنُوْا : تم تعاون کرو][عَلَي الْاِثْمِ : پر گناہ][وَالْعُدْوَانِ : اور زیادتی][وَاتَّقُوا اللّٰهَ : اور اللہ سے ڈرو][اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ][شَدِيْدُ الْعِقَابِ : سخت عذاب]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت (وادب) والے مہینے کی (یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب میں سے کسی ماہ کی) اور نہ حرم کعبہ کو بھیجے ہوئے قربانی کے جانوروں کی اور نہ مکہ لائے جانے والے ان جانوروں کی جن کے گلے میں علامتی پٹے ہوں اور نہ حرمت والے گھر (یعنی خانہ کعبہ) کا قصد کرکے آنے والوں (کے جان ومال اور عزت وآبرو) کی (بے حرمتی کرو کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں) جو اپنے رب کا فضل اور رضا تلاش کر رہے ہیں، اور جب تم حالت احرام سے باہر نکل آؤ تو تم شکار کر سکتے ہو، اور تمہیں کسی قوم کی (یہ) دشمنی کہ انھوں نے تم کو مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ کی حاضری) سے روکا تھا اس بات پر ہر گز نہ ابھارے کہ تم (ان کے ساتھ) زیادتی کرو، اور نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) پر ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم (کے کاموں) پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ (نافرمانی کرنے والوں کو) سخت سزا دینے والا ہے

تشریح:

گزشتہ آیت کی تشریح میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کسی بھی صاحب اقتدار کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی علامت یہ ہے کہ آپ اس کو صحیح غلط ' جائز ناجائز اور حلت وحرمت کی اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے صاحب اقتدار کے اقتدار کو تسلیم کرلیا اور تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس کے اقتدار کو ماننے سے انکار کردیا۔

شان نزول

آیت کاشان نزول یہ ہے کہ شریح بن ہند ایک مشہور بدبخت تھا وہ مدینہ طیبہ میں آیا اور سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مخلوقِ خدا کو کیا دعوت دیتے ہیں؟ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا، اپنے رب عَزَّوَجَلَّ پر ایمان لانے اور اپنی رسالت کی تصدیق کرنے اور نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگا، بہت اچھی دعوت ہے، میں اپنے سرداروں سے رائے لے لوں تو میں بھی اسلام لاؤں گا اور انھیں بھی لاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے آنے سے پہلے ہی اپنے اصحاب کو خبر دے دی تھی کہ قبیلہ ربیعہ کا ایک شخص آنے والا ہے جو شیطانی زبان بولے گا۔ اس کے چلے جانے کے بعد حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ "کافر کا چہرہ لے کر آیا اور غدار و بدعہد کی طرح پیٹھ پھیر کر گیا، یہ اسلام لانے والا نہیں۔ چنانچہ اس نے فریب کیا اور مدینہ شریف سے نکلتے ہوئے وہاں کے مویشی اور اموال لے گیا۔ اگلے سال وہ یمامہ کے حاجیوں کے ساتھ تجارت کا کثیر سامان اور حج کی قلادہ پوش یعنی مخصوص ہار والی قربانیاں لے کر حج کے ارادہ سے نکلا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب (رض) کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں صحابہ کرام (رض) نے اسی شریح کو دیکھا اور چاہا کہ مویشی اس سے واپس لے لیں لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منع فرمادیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۲، ۱/۴۵۹)

اور حکم دیا گیا کہ جو حج کے ارادے سے نکلا ہوا سے کچھ نہ کہا جائے۔ (صراط و جملہ تفاسیر کا خلاصہ)

اب اس دوسری آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ خداپرستی اور اللہ کے عطا کردہ نظام زندگی سے وفاداری کی کچھ علامتیں ہیں جن کا احترام کرنا اور ان سے واقعی وابستگی باقی رکھنا اللہ کو اور اللہ کے دین کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ ان علامتوں کو شعائر اللہ کا نام دے کر ان کے احترام کا حکم دیا گیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے شعائر کا مفہوم سمجھ لیا جائے تاکہ شعائر اللہ کی اہمیت کا احساس ہو۔

شعائر کی تعریف

شعائر "شَعِیرۃ" کی جمع ہے اور "شعائر" ان چیزوں کو کہتے ہیں جو کسی بھی ملک 'قوم اور مذہب کے رویوں 'اس کی حکومت 'اس کی حاکمیت اور اس کی عام عزت و افتخار کی علامت ہوتے ہیں۔ مثلاً ملک کا جھنڈا 'فوج کی وردی 'ملک کی مہر 'ملک کا سکہ 'عبادت گاہیں 'یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کی اگر کوئی بے حرمتی کرے تو کوئی ملک و قوم اس کو گوارا نہیں کرتے۔ جیسے کہ روس جب دنیا کے سر پر سوار تھا تو سب جانتے تھے کہ ہتھوڑا اور درانتی اس کی علامتیں ہیں اس لیے اس کی بے حرمتی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کی کچھ علامات ہوتی ہیں۔ مثلاً عیسائیت ہی کو دیکھ لیں 'صلیب 'قربان گاہ اور گرجے ان کی عزت کی علامتیں ہیں۔ سکھوں میں کیس کڑے 'کرپان اور گردوارے ' ہندوؤں میں چوٹی 'زنار اور مندر وغیرہ ان کی علامتیں اور شعائر ہیں۔

شعائر اللہ کی تعریف

اسی طرح اسلام نے جن چیزوں کو اللہ اور دین کی عظمت کی علامتیں قرار دیا ہے'۔
اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے مراد دین اسلام ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اور اس کی ناراضگی سے اجتناب کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو عظمت دی ہے ان کی تعظیم کی جائے جیسے کعبہ اور قرآن مجید وغیرہ، نیز جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے نسبت ہو جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جیسے غار حرا، روضہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، صفا و مروہ، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے تبرکات کا تابوت وغیرہ۔

وَمَن يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ (۳۲) (الحج: ۳۲)

اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔
اس شَعَآئِرَ اللہ یعنی اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نشانیوں میں خانہ کعبہ، قرآن پاک، مساجد، اذان، بزرگوں کے مزارات وغیرہ سب ہی داخل ہیں بلکہ جس چیز کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے مقبول بندوں سے نسبت ہو جائے وہ بھی شَعَآئِرَ اللہ بن جاتی ہے جیسے حضرت ہاجرہ (رض) کے قدم صفا و مروہ پہاڑوں پر پڑے تو وہ پہاڑ شَعَآئِرَ اللہ بن گئے اور ربِّ کریم عَزَّوَجَلَّ نے فرمادیا:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰهِ (البقرہ: ۱۵۸)

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں۔ (صراط)
یہاں ان میں سے چند چیزوں کا ذکر ہے 'حتیٰ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حوالے سے اگر میں ایک بات کہوں 'آپ اس پر غور کریں کیونکہ کسی بھی بات پر غور کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے 'وہ یہ کہ داڑھی کو شعائر اسلام میں شامل کیا گیا ہے۔ یعنی داڑھی نہ رکھنا اور بات ہے 'لیکن داڑھی کی توہین کرنا خلاف ایمان ہی نہیں 'ناقابل برداشت بھی ہے۔ یہ شعائر اللہ میں سے ہے کیونکہ اس کا تعلق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارکہ سے ہے اور اس کی بے حرمتی کا مطلب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرے کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جن کا تعلق اللہ 'حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام سے ہے 'وہ سب چیزیں شعائر اللہ ہیں۔ مثلاً " صفا و مروہ "اس کی پہچان ہیں اسی لیے ان کو اللہ کے شعائر قرار دیا گیا۔

اَشْهَرِ حُرُمْ

" شَہر " کی جمع "اَشْہُرْ " ہے۔ یہ چار مہینے ہیں-1 ذیقعد '-2 ذی الحجہ '-3 محرم '-4 رجب۔ پہلے تین مسلسل اور ایک الگ ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (التوبہ: ۳۶)

اللہ نے جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا 'اسی دن سے اس نے اس کے بارہ مہینے طے کر دیئے تھے اور ان میں چار مہینے عزت والے رکھے تھے
"

ان میں لڑائی کی اجازت نہیں لیکن اگر کبھی لڑائی ناگزیر ہو جائے تو یہ ایک مجبوری ہے لیکن ان کو لڑائی کے لیے کبھی حلال نہ سمجھنا۔ ان چار مہینوں میں سے کوئی سا بھی مہینہ ہو اس کی عزت کو پامال نہ کرنا۔ اگرچہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت

میں اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ لیکن محتاط اہل علم یہ کہتے ہیں کہ اگر ان مہینوں میں لڑائی کی ضرورت پڑے بھی تو اس سے احتیاط کرنی چاہیے۔

وَلاَ الْهَدْیَ وَلاَ الْقَلاۗىِٕدَ (اور نہ (بے حرمتی کرنا) ہدی کی اور نہ (بے حرمتی کرنا) پٹوں (والے جانوروں) کی)

ہَدْی وہ جانور ہے جو اس زمانے میں عمرہ کرنے یا حج کرنے والے اللہ کے نام پر قربانی کے لیے ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ اب زمانہ ترقی یافتہ ہو گیا ہے 'لٰہٰذا لوگ اپنے ساتھ تو جانور لے کر نہیں جاتے البتہ وہیں سے جانور خرید کر قربانی کی جاتی ہے "ہدی "اسی قربانی کے جانور کو کہتے ہیں۔

قَلَآئِدُ جمع ہے "قلادہ "کی۔ "قلادہ "اس پٹے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ عرب کا رواج یہ تھا کہ وہ اس جانور کے گلے میں پٹہ ڈال دیتے جسے اللہ کے نام پر قربانی کے لیے لے جایا جا رہا ہوتا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔

اس لیے آیت کا ترجمہ تو بظاہر یہ ہے کہ نہ بے حرمتی کرو پٹوں کی لیکن اصل میں کہا جا رہا ہے کہ نہ بے حرمتی کرو پٹوں والے جانوروں کی۔ اس لیے یہاں مضاف محذوف ہے اور وہ ہے "ذوات"۔ یعنی وَلَا ذَوَاتَ الْقَلَآئِدَ "نہ بے حرمتی کرنا پٹوں والے جانوروں کی "مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی جانور کے گلے میں پٹہ دیکھو تو جان لو کہ یہ جانور اللہ کے نام پر قربانی کے لیے جا رہا ہے۔ اس کی توہین نہ کرنا 'اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔

وَلاَ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ط

(اور نہ (بے حرمتی کرنا) ان لوگوں کی جو بیت الحرام کی طرف قصد (سفر) کرکے جا رہے ہوں (اور وہ) محض اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا مندی چاہتے ہوں)

آمِّیْنَ کا مطلب ہوتا ہے "قصد کرنے والے "یعنی جو لوگ عمرے یا حج کے لیے جا رہے ہیں 'ان کو راستہ میں تنگ مت کرنا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ہر حال میں لازم ہے

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ط جب تم احرام کھول کر حلال ہو جاؤ تو اب تم شکار کر سکتے ہو کیونکہ حالت احرام میں شکار ممنوع تھا 'اب جائز ہے۔ اسی طرح احرام کی وجہ سے جو دوسری پابندیاں تھیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ احرام سے نکلنے سے

عدل واحسان کی پابندیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اس کی وضاحت کے لیے ارشاد فرمایا:

وَلاَ یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا م

(اور نہ تمہیں اکسائے کسی قوم کی دشمنی کہ تم حد سے تجاوز کرو اس بات پر کہ انھوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا)

اس آیت میں مختلف باتیں ہیں کیونکہ یہ سورۃ غالباً ٦ ہجری کے آخر میں یا ٧ ہجری کے شروع میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک طاقت فراہم کر دی تھی اور اس سے قبل کفار نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ زخم بھی ہرا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ حج کے مہینوں میں عرب جب اپنی عادت کے مطابق عمرہ یا حج کرنے جائیں تو مسلمان یہ سوچیں کہ اگر انھوں نے ہمارے لیے اللہ کے گھر کو ممنوع قرار دے دیا تھا تو ہم بھی انھیں حج نہیں کرنے دیں گے۔ بہت سارے قبائل کا راستہ مکہ جانے کے لیے مدینے کے پاس سے گزرتا تھا۔ اگر مسلمان چاہتے تو بڑی آسانی سے ان کا راستہ بند کر سکتے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا اصل کام شعائر اللہ کا احترام ہے 'جو خود

بھی کرنا ہے اور دوسروں سے بھی کروانا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ شعائر اللہ کا احترام اس قدر ضروری ہے کہ وہ لوگ بھی جو بے دین ہیں ،جو اللہ ،اس کے رسول اور اللہ کے دین کو نہیں مانتے ،ان کی اپنی عبادت (جو کہ بلاشبہ غلط ہے) میں بھی جتنا حصہ شعائر اللہ کا ہے ،اس کا احترام ضروری ہے ،اس بارے میں قانون شکنی نہیں کرنی یعنی اگر وہ ھدی (قربانی کا جانور) لے کر جا رہے ہیں تو اس میں اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ حج کے لیے قربانی کا جانور جانا چاہیے۔ اگر وہ احرام باندھ کر جا رہے ہیں تو یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا ایسا ذریعہ ہے جسے تم بھی درست خیال کرتے ہو ،اس لیے ان کی کسی ایسی چیز کو نقصان مت پہنچاؤ۔

مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد

یعنی مسلمان کو ایک طریقہ سکھلایا گیا کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ ،تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے۔ دوسرے مذاہب کے ساتھ ظاہر ہے تمہارا تمام باتوں میں اتفاق تو نہیں ہو سکتا ،لیکن اتنی مخالفت کرو جتنی ضروری ہو۔ ان کی خدا پرستی میں اگرچہ شرک کی آمیزش ہے ، اس کی مخالفت شرک کی وجہ سے ہونی چاہیے ،نہ کہ خدا پرستی کی وجہ سے۔ اس لیے جتنے خدا پرستی کے اجزاء ان میں موجود ہیں ،ان کی عزت و حرمت کا پاس رکھنا تمہارے لیے بھی ضروری ہے۔ جیسے مندر اور گرجے وغیرہ میں وہ جا کر دیوتاؤں اور حضرت مریم (علیہاالسلام) کو پوجتے ہیں ،یہ غلط ہے۔ لیکن یہ مندر اور گرجے بنائے تو اللہ کی یاد کے لیے جاتے ہیں ،لہٰذا دیکھنا! کہیں اس میں ہونے والے شرک سے مشتعل ہو کر انھیں کوئی نقصان مت پہنچانا۔ جو باتیں ان میں درست ہیں ان کی قدر کرو اور ان کو نقصان مت پہنچاؤ۔

دوسری بات یہ کہی کہ اگر دشمن نے تمہارے ساتھ حد سے تجاوز کر کے ظلم کا راستہ اختیار کیا ہے تو برائی کا بدلہ برائی سے نہیں ہونا چاہیے۔ برائی کے بدلے میں اگر نیکی کی گنجائش ہے ،تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں نیکی کرنی چاہیے۔ جیسے اگر انھوں نے تمھیں بیت اللہ سے روکا ہے تو اس کا بدلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم بھی انھیں بیت اللہ سے روک دو بلکہ انھیں جانے دو ،ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا اخلاق دیکھ کر راہ راست پر آ جائیں۔

صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو

فرمایا کہ آئندہ زندگی گزارنے کے لیے تمہارے رویے کی بنیاد تعاون پہ ہونی چاہیے۔ تعاون انسانی زندگی کی بقا کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ جس زندگی میں تعاون نہیں ہے ،وہ زندگی گزر ہی نہیں سکتی۔ جیسے درس قرآن کی مجلس بہت سارے احباب کے تعاون سے وجود میں آتی ہے۔ کسی نے کرسیاں لگائیں ،کسی نے لاؤڈ سپیکر چلایا ،کوئی درس دے رہا ہے ،کوئی سن رہا ہے۔ یہ سارا تعاون ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ اگر تعاون نہ ہو تو درس ہو ہی نہ پائے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی چھوٹے سے چھوٹے تعاون سے مستغنی نہیں ہے۔ بادشاہ جو تخت پر براجمان ہے ، اس کا تخت بھی کسی بڑھئی نے بنایا ہے۔ انواع واقسام کے کھانے جن سے وہ لذت حاصل کرتا ہے ،وہ کسی کے پکائے بغیر نہیں پکتے۔ ایک دانہ گندم بھی کسان کے علاوہ کئی چیزوں اور کئی افراد کا محتاج ہے۔ فوج ،پولیس ،اجتماعی ادارے یہ سب تعاون کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن یہی تعاون جب منفی بنیادوں پر اٹھتا ہے تو انسان نہیں بلکہ انسانیت کو پامال کر کے رکھ دیتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ مل کر ڈاکے ڈالنے کے لیے ایک گروہ

بنالیں۔ یہ بھی تعاون کی ایک شکل ہے۔ جس سے ظلم کا دروازہ کھلے گا اور نجانے کہاں تک جائے گا۔ اس لیے اسلام نے کہا کہ "تعاون تو کرو مگر نیکی اور تقویٰ میں"۔

نیکی کیا ہے؟

عام آدمی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا کیونکہ یہ ایک عام لفظ ہے۔ نیکی "فعل الخیرات "اچھائیاں کرنے کو کہتے ہیں اور تقوی "ترک المنکرات "برائیاں چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ تم تعاون کرو نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کی جڑ مارنے میں اور جس تعاون سے اسلام نے روکا ہے وہ یہ ہے "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان "اثم کہتے ہیں "گناہ اور نافرمانی کرنے کو "اور عدوان کہتے ہیں "حد سے گزر جانے کو " یعنی ظلم کرنے کو۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ ظلم کرو اور نہ گناہ کرو۔ گناہ بجائے خود انسانیت کے لیے داغ ہے اگر اس میں تعاون کیا جائے تو اس کے نقصانات کی وسعت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ظلم میں تعاون نہ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم حکمرانوں کی نوکری کو ہمارے علماء سلف نے حرام قرار دیا ہے۔

مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے نیکی اور تقوی کے کام میں تعاون کرے بصورت دیگر۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت پکڑنے والا ہے۔ الا یہ کہ نیکی اور تقوی کا نام لے کر کوئی شخص اس کے پس منظر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی سازش کا ارتکاب کرے تو بظاہر نیکی ہونے کے باوجود ایسے آدمی سے تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

اس لیے حضرت علی (رض) نے خارجیوں سے یہ کہہ کر عدم تعاون کا اعلان کیا تھا کہ یہ لوگ نیکی کے پردے میں باطل کی تائید کر رہے ہیں۔ (كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ) [البدایہ والنہایہ]

منصور نے امام ابو حنیفہ (رح) کو کہا تھا کہ میں اپنے بعد سلطنت کا دوسرا بڑا عہدہ آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ کو چیف جسٹس بناتا ہوں ' میرا حکم بھی آپ کی مہر کے بغیر نہیں چلے گا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ مجھے نہیں چاہیے۔ اس نے اصرار کیا 'لیکن امام صاحب نہ مانے 'حتیٰ کہ اس نے قسم کھالی کہ آپ کو یہ عہدہ ضرور قبول کرنا ہوگا۔ آپ نے بھی جواباً قسم اٹھائی کہ میں اسے ہر گز قبول نہیں کروں گا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ عقل سے کام لو امیر المؤمنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو؟ آپ نے فرمایا وہ مجھ سے زیادہ آسانی سے کفارہ دے سکتے ہیں۔ بالآخر منصور نے انھیں قید میں ڈال دیا حتیٰ کہ زہر دے کر مار ڈالا۔ لیکن امام صاحب نے اس کا عہدہ قضاء قبول نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی حکم میری مہر کے بغیر نہیں چلے گا اور وہ ظلم کا حکم دے گا ' مجھے مجبوراً مہر لگانی پڑے گی اور اس طرح میں بھی ظلم میں شریک ہو جاؤں گا۔ امام صاحب نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین آپ اس بات کو سمجھیں ' یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی کے ناحق قتل کا حکم دیں اور میں اس پر مہر لگا دوں۔ آپ اس کے لیے اگر مجھے دجلہ میں ڈبونے کا حکم دیں گے 'تو میں ڈوبنا پسند کروں گا لیکن اس ظلم کا حصہ نہیں بنوں گا۔ حدیث پاک میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد تو یہاں تک ہے کہ اگر کوئی آدمی ظلم کی تقویت کا باعث بنا یا ظالم کے ساتھ چلا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بلائے گا (ظالم کو بھی اور ان کا ساتھ دینے والوں کو بھی اور جنھوں نے قلم دوات بھی تیار کی انھیں بھی بلائے گا) اور تابوت میں بند کرکے ان سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ اندازہ کریں کہ ظلم کا ساتھ دینے کا معنی کیا ہے اور ہم ظلم کا کس کس طرح ساتھ دے رہے ہیں؟

" وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ " ہو سکتا ہے کہ تم دنیا میں تو ظلم کرکے آرام سے بیٹھ جاؤ 'لیکن یہ خیال رکھنا کہ ایک بہت بڑی ذات تمہاری نگران ہے 'اس کے سامنے جواب دہی کی تیاری کرنا 'وہ بڑا سخت عذاب دینے والی ہے۔(روح)

فوائد

1: معلوم ہوا کہ دینی عظمت والی چیزوں کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔رب فرماتا ہے۔**ومن یعظم شعائر اللّٰہ فانہا من تقوی القلوب**۔اس شعائر اللہ میں خانہ کعبہ۔بزرگوں کے مزارات۔قرآن شریف وغیرہ سب ہی داخل ہیں، بلکہ جس چیز کو اللہ کے مقبول بندوں سے نسبت ہو جائے وہ بھی شعائر اللہ بن جاتی ہے۔دیکھو حضرت ہاجرہ کے قدم صفا و مروہ پہاڑ پر پڑے تو وہ پہاڑ شعائر اللہ بن گئے رب فرماتا ہے۔ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔

2: محترم مہینے چار ہیں، رجب، ذیقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، کہ زمانہ جاہلیت میں بھی کفار ان کا ادب کرتے تھے،اسلام نے بھی ان کا احترام باقی رکھا۔اولاً اسلام میں ان مہینوں میں جنگ حرام تھی، اب ہر وقت جہاد ہو سکتا ہے۔لیکن ان کا احترام بدستور باقی ہے۔

3: عرب والے قربانیوں کے گلوں میں کچھ نشان ڈال دیا کرتے تھے۔تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ قربانی ہے اور انھیں نہ چھیڑیں۔

4: یہ امر اباحت کے لیے ہے مگر یہ اباحت ایسی قطعی ہے کہ اس کا منکر کافر ہے، کیونکہ احرام سے فارغ ہو کر شکار کرنا جائز ہے واجب نہیں۔ہر قطعی چیز کا انکار کفر ہے خواہ فرض یا واجب یا مستحب۔

5: کفار مکہ نے حضور کارم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حدیبیہ کے دن عمرہ سے روکا مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تم اس کے بدلہ میں انھیں کعبہ سے مت روکو خیال رہے کہ اب کافر کو روکا جائے گا کفر کی وجہ سے رب فرماتا ہے۔انما المشرکون نجس فلایقربوا المسجد الحرم۔

6: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ غیر خدا سے مدد لینا جائز ہے۔دوسرے یہ کہ امداد باہمی اچھی چیز ہے۔مالی ہو یا جسمانی یا روحانی بشرطیکہ جائز چیز پر ہو۔

7: اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی مدد کرنا بھی گناہ ہے چوری کرنا، چوری کرانا، چوری کا مال گھر میں رکھنا سب جرم ہیں، ایسے ہی نیکی کرنا اور کرانا نیکی پر مدد کرنا سب میں ثواب ہے۔(نور)

آیت مبارکہ:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ‌ؕ ذٰ لِكُمۡ فِسۡقٌ‌ؕ اَلۡيَوۡمَ يَئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡـنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ‌ؕ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ؕ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِىۡ مَخۡمَصَةٍ غَيۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ‌ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳﴾

لغۃ القرآن: [حُرِّمَتْ : حرام کیا گیا][عَلَیْکُمُ : تم پر][الْمَیْتَةُ : مردار][وَالدَّمُ : اور خون][وَلَحْمُ : اور گوشت][الْخِنْزِیْرِ : خنزیر][وَمَآ : اور جو][اُهِلَّ : مشہور کیا جائے][لِغَیْرِ : غیرکیلئے][اللّٰهِ بِهٖ : اللہ ساتھ اس کے][وَالْمُنْخَنِقَةُ : اور گلا گھٹنے سےمرنے والا][وَالْمَوْقُوْذَةُ : اور چوٹ لگنے سے مرنے والا][وَالْمُتَرَدِّیَةُ : اور گر کرمرنے والا][وَالنَّطِیْحَةُ : اور سینگ سے مرنے والا][وَمَآ : اور جو][اَكَلَ : اس نے کھایا][السَّبُعُ : درندے][اِلَّا : مگر][مَا : جو][ذَكَّیْتُمْ: تم ذبح کرلو][وَمَا : اور جو][ذُبِحَ : ذبح کیا جائے][عَلَي : پر][النُّصُبِ : تھانوں][وَاَنْ : اور یہ][تَسْتَقْسِمُوْا : کہ تم قسمت معلوم کرو][بِالْاَزْلَامِ : فال کے تیروں کے ساتھ][ذٰلِكُمْ : یہ سب][فِسْقٌ: گناہ ہے][اَلْیَوْمَ : آج کے دن][یَئِسَ : نا امیدہوگئے][الَّذِیْنَ كَفَرُوْا : وہ لوگ جنہوں

نے کفر کیا][مِنْ : سے][دِيْنِكُمْ : تمہارے دین][فَلَا تَخْشَوْهُمْ : تو نہ تم ان سے ڈرو][وَاخْشَوْنِ: اور مجھ سے ڈرو][اَلْيَوْمَ : آج][اَكْمَلْتُ : میں نے مکمل کردیا][لَكُمْ : تمہارے لیے][دِيْنَكُمْ : تمہارا دین][وَاَتْمَمْتُ : اور میں نے پوری کردی][عَلَيْكُمْ : تم پر][نِعْمَتِيْ : اپنی نعمت][وَرَضِيْتُ : اور میں نے پسند کرلیا][لَكُمُ : تمہارے لیے][الْاِسْلَامَ دِيْنًا: اسلام دین][فَمَنِ اضْطُرَّ : تو جو مجبور ہوجائے][فِيْ : میں][مَخْمَصَةٍ : بھوک][غَيْرَ : علاوہ][مُتَجَانِفٍ : مائل ہونے والا][لِّاِثْمٍ ۙ: گناہ پر][فَاِنَّ : تو یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][غَفُوْرٌ: بخشنے والا][رَّحِيْمٌ: رحم کرنے والا ہے]

ترجمہ: تم پر مردار (یعنی بغیر شرعی ذبح کے مرنے والا جانور) حرام کر دیا گیا ہے اور (بہایا ہوا) خون اور سؤر کا گوشت اور وہ (جانور) جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو اور گلا گھٹ کر مرا ہوا (جانور) اور (دھار دار آلے کے بغیر کسی چیز کی) ضرب سے مرا ہوا اور اوپر سے گر کر مرا ہوا اور (کسی جانور کے) سینگ مارنے سے مرا ہوا اور وہ (جانور) جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو سوائے اس کے جسے (مرنے سے پہلے) تم نے ذبح کر لیا، اور (وہ جانور بھی حرام ہے) جو باطل معبودوں کے تھانوں (یعنی بتوں کے لیے مخصوص کی گئی قربان گاہوں) پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم پانسوں (یعنی فال کے تیروں) کے ذریعے قسمت کا حال معلوم کرو (یا حصے تقسیم کرو)، یہ سب کام گناہ ہیں۔ آج کافر لوگ تمہارے دین (کے غالب آجانے کے باعث اپنے ناپاک ارادوں) سے مایوس ہو گئے، سو (اے مسلمانو!) تم ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو (بطور) دین (یعنی مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے) پسند کر لیا۔ پھر اگر کوئی شخص بھوک (اور پیاس) کی شدت میں اضطراری (یعنی انتہائی مجبوری کی) حالت کو پہنچ جائے (اس شرط کے ساتھ) کہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو (یعنی حرام چیز گناہ کی رغبت کے باعث نہ کھائے) تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے

تشریح: سورت کی پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ تم پر چوپائے حلال ہیں سوائے ان چوپایوں کے جو آگے بیان کئے جائیں گے۔ یہاں انھیں کا بیان ہے اور

گیارہ چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر کیا گیا ہے

یہاں سے حرام جانوروں کا ذکر شروع ہو رہا ہے جن کی طرف اس سورت کی آیت نمبر ایک میں اشارہ کیا گیا تھا۔

1۔ مردار: وہ مرا ہوا جانور جس کو شرعی طریقہ پر ذبح نہ کیا گیا ہو۔

2۔ بہا ہوا خون: وہ خون جو ذبح کے وقت بہتا ہے۔

3۔ خنزیر (اس کے متعلق تفصیلات اس حاشیہ کے آخر میں ملاحظہ کریں)
4۔ وہ جانور جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو (جملہ تفاسیر) یا اس کے ذبح کرنے سے غیر اللہ کی عبادت مقصود ہو تو ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے کیونکہ مشرکین لات وعزیٰ کے نام سے ذبح کیا کرتے تھے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے نام سے ذبح کیا جائے اور غیر اللہ کی عبادت مقصود نہ ہو تو ایسے جانور کا گوشت کھانا حلال ہے اگرچہ صدقہ، عقیقہ، قربانی، ایصال ثواب کے لیے اسے کسی بھی نام سے پکارا جائے حتیٰ کہ بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور (بحیرہ اور سائبہ وغیرہ) بھی اگر اہل ایمان کو مال غنیمت کی صورت میں مل جائیں اور وہ انھیں اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کر دیں تو ان کا کھانا بھی حلال ہے۔
5۔ وہ جانور جو گلا گھونٹنے یا گھٹنے سے مر جائے۔
6۔ پتھر یا لاٹھی وغیرہ لگنے سے مرا ہوا جانور۔
7۔ بلندی سے گر کر مرا ہوا جانور۔
8۔ جو جانور کسی اور جانور یا چیز کی ٹکر سے مر جائے۔
9۔ جس جانور کو کسی درندہ نے چیر پھاڑ کر مار ڈالا ہو۔
نوٹ: آخری پانچ قسم کے جانور یعنی نمبر پانچ سے نمبر نو تک کے جانور اگر زندہ حالت میں مل جائیں اور انھیں شرعی طریقہ سے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا حلال ہے۔
10۔ وہ جانور بھی حرام جو نصب پر ذبح کئے گئے ہوں۔ نصب سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی زمانہ جاہلیت میں عبادت کی جاتی تھی اور ان نصب (پتھروں) کے لیے جانور بھی ذبح کئے جاتے تھے۔ (تفسیر ابن جریر اور صفوۃ التفاسیر) اور اس سے مراد ہر ایسی جگہ بھی ہو سکتی ہے جو مشرکانہ رسوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص ہو۔
11۔ مشرکین جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتے تو کسی برتن یا کپڑے میں تین تیر ڈالتے۔ ایک پر لکھا ہوتا "میرے رب نے مجھے حکم دیا" دوسرے پر لکھا ہوتا "میرے رب نے مجھے منع فرمایا" اور تیسرا خالی ہوتا، پھر آنکھیں بند کر کے ہاتھ ڈالتے اور ایک تیر نکالتے، اگر حکم والا تیر نکلتا تو کام کرتے اور اگر نہیں والا تیر نکلتا تو اس کام سے اجتناب کرتے اور اگر خالی تیر نکلتا تو دوبارہ یہی کارروائی کی جاتی۔ (تفسیر بیضاوی)
اہل اسلام کو اس توہم پرستی سے روکا جا رہا ہے کیونکہ مسلمان کو کوئی کام کرنے سے پہلے قرآن سے مشورہ لینا چاہیے اور پھر قرآن کی رہنمائی میں اپنی عقل خداداد کو استعمال کرنا چاہیے۔ یہ عقل و دانش کی کتنی بڑی توہین ہے کہ کسی کام کے اچھا یا برا ہونے میں عقل سے کام نہ لیں اور محض اتفاقات پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھیں۔ حرام جانوروں کے سلسلے میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ یا بھیڑ بکری ذبح کرتے اور گوشت کی تقسیم جوئے کے تیروں سے کرتے تھے، جس میں کوئی تو بالکل محروم رہتا، کسی کو بہت زیادہ اور کسی کو اپنے حق سے کم ملتا تھا، اس لیے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کا بیان بھی کر دیا گیا تا کہ کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

قرآن مجید میں خنزیر کا بیان

قرآن مجید نے خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اور چار مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے: سورۃ نمبر 2 کی آیت نمبر 173، سورۃ نمبر 5 کی آیت نمبر 3، سورۃ نمبر 6 کی آیت نمبر 145، سورۃ نمبر 16 کی آیت نمبر 115۔

خنزیر اور بائبل:

قرآن سے بہت پہلے بائبل بھی خنزیر کے گوشت کو حرام اور ناپاک قرار دے چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

You may not eat their meat or even touch their dead bodies; they ard forbidden foods for you (-1

Thte Living Bible 1975: Levitcus: 11:8)

خنزیر کا گوشت نہ کھاؤ حتیٰ کہ اس کے مردہ جسم کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ یہ تمہارے لیے ممنوعہ خوراک ہے۔

it is nclean unto you: Ye shall not eat of their flesh, nor touch their dead ۔۔۔And the swine-2

(The Holy Bible 1954: Deuteronomy: 14:8)۔carcase

خنزیر۔۔ یہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ نہ ان کا گوشت کھاؤ اور نہ ان کے مردہ جسم کو ہاتھ لگاؤ۔

نوٹ: بائبل کے عہد نامہ قدیم کی اسی صراحت کی وجہ سے یہودی بھی خنزیر کا گوشت نہیں کھاتے۔

خنزیر انسانی صحت کے لیے خطرہ ہے

ویسے تو مسلمانوں کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خنزیر کا گوشت کھانا حرام کر دیا ہے، لیکن انھیں یہ بھی یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاصیات اور اس کے اثرات سے خوب آگاہ ہے۔ اس نے انسانی خوراک کے لیے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کے اعتبار سے نقصان ضرور ہوتا ہے چاہے لوگوں کو اس نقصان کا علم ہو یا نہ ہو۔ جس طرح ڈاکٹر جب ایک مریض کو کسی مخصوص خوراک سے منع کرے تو اس مریض کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اس خوراک سے باز آ جائے چاہے اس خوراک کے نقصان کا اسے ذاتی طور پر علم ہو یا نہ ہو۔ آج تک تو یہ یقین ایمان بالغیب کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب یہ ایمان بالشہادہ کا درجہ اختیار کر گیا ہے کیونکہ جدید میڈیکل سائنس اور خنزیر کھانے والوں کی اپنی تحقیق بتا رہی ہے کہ اس کے گوشت میں مضر صحت اجزاء موجود ہیں اور وہ کئی قسم کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ ان میں سے ایک اہم بیماری کا نام ٹری کی نوسز ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

Trichinosis/ Trichiniasis: A discorder resulting from infestion with the small roundworm -1

Trichinella spiralis, commonly acquired by humans by the eating of undercooked pork containing

.encapsulated larvea of the parasite

In the ۔Trichinosis is more common in Europe and the United States than in other parts of the world

.United States the incidence of infection may be as high as 15 to 20 percent

(The New Encyclopedia Britannica: 15th Edition 1995)

ٹریکی نوسز اایک بیماری ہے جو انسانوں میں عام طور پر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ خنزیر کا ایسا گوشت کھاتے ہیں جس میں ٹریکینہ کیڑے ہوں اور وہ گوشت اچھی طرح پکا ہوا نہ ہو۔ اچھی طرح پکا ہوا نہ ہو۔ سب سے زیادہ یہ بیماری یورپ اور امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ صرف امریکہ میں اس بیماری کے واقعات پندرہ سے بیس فیصد تک پائے جاتے ہیں۔

they give rise to the disease known as ---Trichina: Genus of Nematoda or threadworms-2

The eggs are hatched out in the intestines of the host, and the trichinae then migrate -Trichiniasis

to the muscles, where they become encysted and develop no further unless the flesh of the host is

They are then set free in the alimentary canal, where they become -eaten by some other animal

The New)-The natural host of the parasite is the rat, but it is often found in pigs-sexually mature

(London-Lte-Universal Encyclopedia: The Caxton Publishing Co

ٹریکینہ دھاگے کی طرح باریک کیڑے ہیں جن سے ٹری کی نوسز بیماری جنم لیتی ہے۔ ان کیڑوں کا اصل مقام تو چوہوں کا جسم ہے مگر خنزیر کے گوشت میں بھی اکثر پائے جاتے ہیں۔ جب کوئی انسان اس (چوہے یا خنزیر) کا گوشت کھاتا ہے تو یہ کیڑے اس کے جسم میں منتقل ہو کر اس بیماری کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

یہاں پر ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کیڑے جب تک اپنے اصلی مقام یعنی چوہے اور خنزیر کے گوشت میں رہتے ہیں تو ان (چوہے اور خنزیر) کے جسموں میں بیماری کا باعث نہیں بنتے کیونکہ یہ ان کے گوشت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں لیکن جب کوئی انسان ان کے گوشت کو کھاتا ہے تو یہ اپنی فطرت سے مختلف جسم میں جا کر بیماری کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو جانوروں (خنزیر اور چوہے) کا گوشت انسانوں کے کھانے کے قابل نہیں ہے۔

خنزیر اور اخلاقی بگاڑ

خنزیر کو پالنے اور اس کے گوشت کھانے سے نہ صرف یہ کہ انسانی جسم مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ روح انسانی بھی اس کے اثرات بد سے متاثر ہوتی ہے اور اخلاق میں زبردشت بگاڑ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ بری صحبت اور ناپاک غذا کا انسانی مزاج اور طبیعت پر اثر ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس حوالے سے The English Pig کے مصنف کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

(Similarly) Domestication -Domiestication alters the nature and behaviour of the controlled animal

The English Pig:)-also generates of familiarity with the animal that affects human consciousness

(Published by the Hambledon Press London 1998: Page No 129

جس طرح کسی جانور کو پالتو بنانے سے اس جانور کی فطرت اور چال ڈھال میں تبدیلی آ جاتی ہے اس طرح یہ عمل جانور کے ساتھ ایسی بے تکلفی بھی پیدا کرتا ہے جو انسان کے شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اس حقیقت کو اگر آپ مشاہدہ کرنا چاہیں تو یورپ (جہاں خنزیر کو بڑے اہتمام سے پالا جاتا ہے اور اس کا گوشت بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے) کی تہذیب پر ایک نظر ڈالیں، جہاں بے حیائی اور فحاشی عام ہے۔ عورت چوراہے کا گڑھا بن چکی ہے اور جنسی پیاسے قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کررہے ہیں اور یورپی مرد بے غیرتی کا اشتہار سینے پر آویزاں کئے یہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ سب کچھ خنزیر کی صحبت اور اس کے حرام اور ناپاک گوشت کا اثر ہے تو یہ بے جانہ ہوگا کیونکہ مشہور ہے کہ مادہ خنزیر کے ساتھ جب ایک خنزیر جفتی کررہا ہوتا ہے تو دوسرے خنزیر قریب کھڑے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کررہے ہوتے ہیں جبکہ دیگر سارے جانور اپنی مادہ کے بارے میں بڑے غیرت مند ہوتے ہیں اور دوسرے نر کو اس کے قریب نہیں آنے دیتے۔

خنزیر کیسا جانور ہے

خنزیر نہایت غلیظ، کاہل، قابل نفرت اور بے غیرت جانور ہے۔ ہم یہاں چند حوالے پیش کررہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ رائے ان لوگوں کی ہے جو خنزیر کو پالتے اور اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری۔

1-The pig is a fat, sleepy, stupid, dirty animal, wallowing constantly in the mire. (The English Pig: Published by the Hambeldon Press London 1998: page No.1)

خنزیر ایک موٹا، سست، بیوقوف اور گندا جانور ہے جو ہمیشہ کیچڑ اور غلاظت میں رہتا ہے۔

2- They will eat small quantities of many materials from a very early age, including feed, earth and the faeces of the dam. (Fream's Agriculture: Printed by Butler & Tanner Ltd London: 16th Edition 1983: Page No 684)

خنزیر بچپن ہی سے بہت چیزیں کھانا شروع کردیتے ہیں جن میں مٹی اور ان کی ماں کی غلاظت بھی شامل ہے۔

3-A man from St Helens, Lancashire, born in 1893, recalled of the houses there: ' Not only was there the open lavatory in the back yard, many of the people when I was young, kept a pig in the yard.' (The English Pig: Published by The Hambledon Press London 1998: page No 42)

برطانیہ میں لنکاشائر کا ایک آدمی جو 1893ء میں پیدا ہوا، وہ اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ لوگ گھروں کے پچھلے احاطہ میں قضائے حاجت کرتے تھے (یعنی بیت الخلاء نہیں تھے) تو بہت سے لوگ گھروں کے پچھلے احاطہ میں ایک خنزیر رکھتے تھے (جو ان کی غلاظت کھا جاتا تھا)۔

4- The pig is the Husbandman's best Scavenger, and the Huswives most wholsome sink; for his food and living is by that which will else rot in yard ---for from the Husbandman hed taketh pulse, chaff, barn dust, man's ordure, grabage, and the weeds of the such like, with which he will live and keep a good state of body, very sufficiently. (ibid Page No 34)

خنزیر کسان کا بہترین خاکروب کا بہترین خاکروب اور اس کی بیوی کے لیے سب سے بڑھ کر صحت بخش سنک ہے کیونکہ اس کی خوراک وہ چیزیں ہیں جو صحن میں گل سڑ جاتی ہیں، نیز یہ کسان سے بیج، چھلکے، اصطبل کی گرد و غبار، انسان کی غلاظت، کوڑا کرکٹ اور اس کے احاطہ میں گھاس پھونس لیتا ہے اور کسان کی بیوی سے شراب بنانے کا فضلہ، دودھ کی تلچھٹ اور ٹب کا گندا پانی لے کر خوب صحت مند رہتا ہے۔

5- The hog during life does not render the least service to mankind, except in removing that filth which other animals reject. (ibid Page No-30)

خنزیر اپنی زندگی میں انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کرتا سوائے اس گندگی ہٹانے کے جو دوسرے جانور رد کر دیتے ہیں۔

6- It would be more accurate to say that the pig was generally acknowledged to have a character, but that this character was not considered in any way attractive or admirable. (ibid Page No-1)

خنزیر کے متعلق زیادہ درست بات یہی ہے کہ اس میں کوئی قائل تعریف یا دلکش خاصیت نہیں ہے۔

خنزیر کا نام ہر تہذیب میں گالی ہے۔

مسلمان اور یہودی تو خنزیر کی ذات سے نفرت کرتے اور اس کے نام کو گالی سمجھتے ہی ہیں لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ خون انگریزی زبان میں خنزیر کا لفظ گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

Indeed, the pig was usually thought to be brutish, indensitive and filthy- so much so, in fact, that it became a commonplace metaphor for human greed, grosseness and intemperance. (ibid Page No-1)

درحقیقت خنزیر ایک ایسا احمق، بے غیرت اور گندا جانور ہے کہ جب کسی انسان کو اس کے نام سے پکارا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان لالچی، شرابی، بدپرہیز اور غیر مہذب ہے۔

انگریزی زبان میں خنزیر کے لیے Swine, Pig اور Hog کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو جب کسی انسان کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ انسان لالچی، گندا، بداخلاق، خود غرض، مکروہ، ناخوشگوار، بدبودار اور نفرت انگیز ہے۔ (Oxford Advanced Learner's Dictionary : 4th Edition 1989)

خنزیر کا گوشت کیوں حرام ہے؟

آپ پڑھ چکے ہیں کہ خنزیر کے لفظ اور اس کے معنی میں کوئی خیر کا پہلو ہے اور نہ ہی اس کی عادات اور خوراک میں کوئی اچھائی ہے۔ اس کا گوشت کھانے میں بیماری کے خطرات ہیں۔ وہ غلاظت کھانے کا اس قدر دلدادہ ہے کہ اگر اس کو صاف جگہ پر بند کر دیا جائے تو وہاں بھی اپنی غلاظت کھا کر اپنا ذوق بدپورا کر لیتا ہے۔ ایسے گندے جانور کو تو دیکھنا بھی طبیعت پر گراں گزرتا ہے چہ جائیکہ اس کا گوشت کھایا جائے۔

کفار روز اول سے ہی دین اسلام کو مٹانے میں سرگرم تھے۔ انھیں امید تھی کہ اسلام ایک دن ختم ہو جائے گا اور مسلمان پھر کفر کی طرف لوٹ آئیں گے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر ان کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے اور وہ اسلام کو مٹانے سے مایوس

ہو گئے بلکہ انھیں یقین ہو گیا کہ اسلام کی بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ وہ کبھی مٹ نہ سکے گا، نیز قرآن نے بھی اعلان کر دیا کہ اہل اسلام کو اب کفار سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھیں صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور اسلام پر عمل کرنے میں سر گرم رہنا چاہیے۔ اب کفار میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اسلامی معاملات میں مداخلت کر سکیں۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمان صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور اس پر استقامت کے باعث وہ کفار پر غالب آ گئے۔ اسی طرح اگر آج بھی مسلمان صرف اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اس پر ثابت قدم رہیں تو کوئی کافر طاقت ان پر غالب نہیں آ سکتی۔

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃالوداع کے موقع پر میدان عرفات میں نویں ذوالحجہ بروز جمعۃالمبارک عصر کے وقت نازل ہوئی۔ اس وقت میدان عرفات میں ایک لاکھ سے زائد مسلمان موجود تھے اور عرب کے اکثر علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ آیت امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ جس دین کو لے کر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے آج اس کے سارے احکام وفرائض، عقائد وآداب اور حلال وحرام کا بیان پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے دین ناقص تھا۔ دراصل دین ہر زمانہ میں کامل تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے دین ایک مخصوص زمانے اور علاقے کے لیے کامل تھا اور اب پوری دنیا میں قیامت تک کے لیے کامل ہے۔ (تفسیر کبیر) نیز تکمیل دین کی صورت میں نعمت خداوندی بھی پوری ہو گئی اور دین اسلام جو تمام سابقہ انبیاء ورسل کا دین تھا اور اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق کامل دین تھا وہی دین اپنی آخری اور عالمگیر کامل صورت میں تمہارے لیے پسند کیا گیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو خبر دی ہے کہ اسلام کامل دین ہے اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ یہ دین پورا ہے اس میں کوئی نقص نہیں۔ یہ پسندیدہ دین ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر) اور جو بھی اس دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین اپنائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوگا۔ (قرآن: 3: 85)

یہ آیت حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آخری نبی ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ جب دین مکمل ہو چکا اس کے احکام میں ردوبدل گنجائش نہ رہی تو پھر کسی دوسرے نبی کے آنے کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس آیت کو سن کر صحابہ کرام (رض) نے خوشی ومسرت کا اظہار کیا لیکن حضرت ابوبکر (رض) پر گریہ طاری ہو گیا اور رونے کی وجہ دریافت کرنے پر فرمایا: یہ آیت بتاتی ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کا وقت قریب آ گیا ہے کیونکہ تکمیل دین کے بعد بعثت نبوت کی ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر) چنانچہ فی الواقع ایسا ہی ہوا اور آنے والے چند ماہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کو پڑھا اور ان کے پاس ایک یہودی تھا، اس نے کہا: اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: یہ آیت دو عیدوں کے دن نازل ہے: جمعہ کے دن اور عرفات کے دن (یعنی یہ دونوں دن ہمارے لیے پہلے ہی عید کا درجہ رکھتے ہیں)۔ (ترمذی: 3044: ابواب تفسیر القرآن: سورۃالمائدہ) اس روایت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جس دن کوئی نعمت یا خوشی حاصل ہو اس دن کو خوشی کا دن منانا جائز ہے ورنہ حضرت ابن عباس (رض) صاف یہ ماد یتے کہ اسلام میں کسی نعمت یا خوشی والے دن کو بطور خوشی اور عید کے منانا بدعت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عید میلادالنبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منانا بھی جائز ہے کیونکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی پیدائش کی خوشی میں ہر سوموار کو رزہ رکھتے تھے۔ (مسند احمد: جلد 5: ص 299)

اگر کوئی شخص مجبور ہو جائے اور بھوک کی وجہ سے اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو وہ مذکورہ بالا حرام چیزوں سے بقدر ضرورت کھاسکتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی بحال رکھ سکے اور اس کی مجبوری کے باعث اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے گا۔ اس آیت سے اس بیماری کے حرام کھانے کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے جس کی بیماری کے لیے حرام کے سوا کوئی اور دوا نہ ہو۔ (امداد)

مردار کا معنی اور اس کے شرعی احکام

جو جانور طبعی موت مر جائے ' نہ اس کو ذبح کیا گیا ہو نہ شکار کیا گیا ہو ' اس کو میتۃ (مردار) کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں جو جانور بغیر ذبح کے مر جائے ' اس کو میتۃ کہتے ہیں۔ اس کو شریعت میں حرام کر دیا گیا ہے ' کیونکہ رگوں میں خون کے رک جانے یا کسی بیماری کی وجہ سے جسم میں زہریلے مادے پیدا ہو جاتے ہیں ' جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں اور اگر اس جانور کو ذبح کر لیا جائے تو اس کے جسم سے سارا خون بہہ جاتا ہے اور خون کے ساتھ زہریلے اور نقصان دہ اجزاء جسم سے نکل جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں طبائع سلیمہ مردار جانور کا گوشت کھانے سے متنفر ہوتی ہیں ' سو مردار جانور صحت کے اعتبار سے بھی مضر ہے اور دین کے اعتبار سے بھی ' کیونکہ اللہ کے نام سے اس کی جان نہیں نکلی۔ لہٰذا مردار جانور کو کھانا بالاتفاق حرام ہے۔ البتہ ! فقہاء احناف کے نزدیک اس کے بال اور اس کی ہڈیاں پاک ہیں اور اس کا استعمال کرنا جائز ہے۔ (بدائع الصنائع ' ج ا ص ٦٣ ' مطبوعہ کراچی) علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ امام احمد ' امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک مردار کی ہڈی نجس ہے۔ (المغنی ' ج ا ص ٥٦) اور امام شافعی کے نزدیک مردار کے پر اور بال بھی نجس ہیں ' کیونکہ حیوان کی نشو و نما سے وہ بڑھتے ہیں ' اور باقی اعضاء کی طرح ' اس کی موت سے نجس ہو جاتے ہیں اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک مردار کے پر اور بال پاک ہیں۔ کیونکہ امام دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مردار کی مشک میں کوئی حرج نہیں ہے ' جب اسے رنگ لیا جائے اور اس کے اون اور بالوں میں کوئی حرج نہیں ہے ' جب انھیں دھو لیا جائے۔ نیز اس پر موت طاری نہیں ہوتی ' اس لیے جانور کی موت سے یہ نجس نہیں ہوں گے ' جیسے انڈا نجس نہیں ہوتا۔ (المغنی ' ج ا ص ٦٠ ' مختصرا مطبوعہ بیروت)

مردار جانور حرام ہے ' لیکن اس کے عموم سے بالاتفاق مچھلی اور ٹڈی مستثنیٰ ہیں۔ امام ابن ماجہ متوفی ٢٧٣ ھ روایت کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں۔ مچھلی اور ٹڈی۔ • سنن ابن ماجہ ' ج ٣ رقم الحدیث : ٣٢١٨ ' مطبوعہ دارالمعرفہ ' بیروت)

لیکن

ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کے نزدیک تمام قسم کے سمندری جانور بغیر ذبح کے حلال ہیں ' ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا ' یا رسول اللہ ! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں اور ہمارے پاس بہت تھوڑا پانی ہوتا ہے۔ اگر ہم اس سے وضو کر لیں تو پیاسے رہ جائیں گے ' تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیا کریں۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے ' اور اس کا مرا ہوا جانور حلال ہے۔

(سنن ترمذی ' رقم الحدیث : '٦٩ 'سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : '٨٣ 'سنن نسائی ' رقم الحدیث : '٥٠ 'سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : '
٣٨٦ 'موطاامام مالک ' رقم الحدیث : '٤٣ 'مسند احمد ' ج ٣ ' ٢٣٧ ' المستدرک ' ج ١ ' ص ١٤٠)

خون کے شرعی احکام

اس آیت میں خون کو حرام کیا گیا ہے۔ اس سے مراد بہنے والا خون ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت میں بہنے والے خون کو حرام فرمایا ہے :

"(آیت) " قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ او دما مسفوحا"۔ الایہ (الانعام : ١٤٥)

ترجمہ : آپ کہئے کہ مجھ پر جو وحی کی جاتی ہے اس میں کسی کھانے والے پر جو وہ کھاتا ہو ' صرف مردار ' بہنے والے خون اور خنزیر کے گوشت کو میں حرام پاتا ہوں ' کیونکہ وہ نجس ہے ' یا نافرمانی کی وجہ سے جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذبح کے بعد گوشت میں جو خون عادتا باقی رہ جاتا ہے ' وہ حرام نہیں ہے اور جو خون جامد ہو جیسے کلیجی اور تلی ' وہ بھی حرام نہیں ہے۔ امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے لیے دو مردے حلال کیے گئے ہیں اور دو خون حلال کیے گئے ہیں رہے دو مردے تو وہ مچھلی اور ٹڈی ہیں اور رہے دو خون تو وہ کلیجی اور تلی ہیں۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٣٣١٤ 'مطبوعہ دارالمعرفہ ' بیروت)

بہنے والے خون کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خون نجس ہے اور اس میں جراثیم اور زہریلے اجزاء ہوتے ہیں ' اور اس کو ہضم کرنا مشکل ہے ' تمام قسم کی بیماریوں کے اجزاء اور جراثیم خون میں ہوتے ہیں۔ اس لیے مادی طور پر بھی خون کو کھانا صحت کے لیے سخت مضر ہے۔

خنزیر کے نجس اور حرام ہونے کا بیان

اس آیت میں فرمایا ہے تم پر مردار خون اور خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا ہے اسی طرح (الانعام : ١٤٥) میں بھی خنزیر کے گوشت کو حرام فرمایا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے :

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے سال مکہ میں فرمایا : اللہ اور اس کے رسول نے خمر (شراب) مردار ' خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام فرمایا دیا ہے۔ (صحیح البخاری ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٢٢٣٦ 'مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

سلیمان بن بریدہ اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جو شخص نرد شیر کے ساتھ کھیلا ' اس نے گویا اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور اس کے خون میں رنگ لیا۔ (صحیح مسلم ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٢٦٠ 'مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

اس حدیث میں آپ نے خنزیر کے خون اور گوشت سے نفرت دلائی ہے۔ خنزیر کا خون ' گوشت اور اس کے تمام اجزاء حرام ہیں قرآن مجید میں خنزیر کے گوشت کا ذکر کیا ہے ' کیونکہ کسی جانور کا اہم مقصود اس کا گوشت کھانا ہوتا ہے۔

خنزیر کے گوشت کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت گندہ اور نجس جانور ہے اور یہ بالعموم گندگی میں رہتا ہے۔اس کے جسم اور بالوں میں کیڑے ہوتے ہیں۔اس کا گوشت بہت ثقیل اور دیر ہضم ہوتا ہے 'اور اس میں چربی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے خون میں کلسڑول کی بہت زیادتی ہوتی ہے۔جس جانور کا گوشت کھایا جائے 'اس کے اوصاف کاانسان کی طبیعت پر اثر پڑتا ہے جانوروں میں خنزیر نہایت بے غیرت جانور ہے۔اس کی مادہ سے ایک خنزیر جفتی کرتا ہے اور باقی کئی خنزیر اس کے قریب کھڑے اپنی باری کے منتظر رہتے ہیں 'جبکہ دوسرے جانور اپنی مادہ کے قریب دوسرے نر کو آنے نہیں دیتے۔یہی وجہ ہے کہ جو اقوام خنزیر کا گوشت کھاتی ہیں وہ بھی بے غیرت ہوتی ہیں 'ان میں بہت زیادہ فحاشی اور بد چلنی ہوتی ہے۔بہر حال ! مسلمان کے لیے صرف یہ وجہ کافی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سختی کے ساتھ خنزیر کو حرام فرمادیا 'خواہ حرمت کی یہ وجوہ ہوں یا نہ ہوں۔ہم نے یہ وجوہ صرف اس لیے بیان کی ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس نے جن تمام چیزوں سے منع فرمایا ہے 'اس کی وجوہ نہایت معقول ہیں :۔

"ما اھل لغیر اللہ بہ "کا معنی اور اس کے شرعی احکام

(آیت) "ما اھل لغیر اللہ بہ "کا معنی ہے جس پر غیر اللہ کے نام کا ذکر کیا جائے اور یہ وہ جانور ہے جس کو بتوں کے لیے ذبح کیا جائے۔اھلال کا معنی ہے چاند دیکھتے وقت بلند آواز سے چلانا 'پھر ہر بلند آواز کو اھلال کہا گیا۔نوزائیدہ بچے کے رونے کو بھی اھلال کہتے ہیں۔(المفردات ص ' ۵۴۴ 'مطبوعہ المکتبۃالمر تضویہ 'ایران '۱۳۶۲ھ)

ملا احمد جون پوری متوفی ۱۱۳۰ھ لکھتے ہیں (آیت) "ما اھل لغیر اللہ بہ "کا معنی ہے جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو 'مثلالات 'عزی اور انبیاء (علیہم السلام) وغیر ہم کے نام پر۔(تفسیرات احمدیہ 'ص ۴۴ 'مطبوعہ مکتبہ حقانیہ 'پشاور)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں :

اس کا معنی ہے جانور کے ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام بلند آواز سے پکارنا اور اھلال کا معنی یہاں پر یہ ہے کہ جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے 'مثلا لات اور عزی اس کا ذبح کے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا (روح المعانی 'ج ۲ص ۵۷ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

"وآنچہ نام غیر خدا بوقت ذبح او یاد کردہ شود "۔

عام ازیں کہ ذبح کے وقت صرف غیر اللہ کا نام لیا جائے۔مثلا مسیح کا نام لے کر ذبح کیا جائے 'یا اللہ کے ساتھ بطریق عطف غیر اللہ کا نام لیا جائے۔مثلا یوں کہے کہ اللہ اور مسیح کے نام سے ذبح کرتا ہوں 'تو یہ ذبیحہ جائز نہیں ہے۔لیکن اگر غیر وقت ذبح میں غیر اللہ کے ساتھ وہ جانور نامزد ہو 'مثلا قربانی کے جانوروں کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ یہ محمود کا بکرا ہے 'یہ اسلم کا بکرا ہے 'یہ فہیم کی گائے ہے 'یا کسی نے اپنے والد عبدالرحیم کی طرف سے قربانی کرنے کے لیے کوئی بکرا موسوم کیا ہو 'اور کسی نے حضرت غوث اعظم کو ایصال ثواب کرنے کے لیے بکرا نامزد کیا ہو 'یا کسی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدیہ ثواب کرنے کے لیے کوئی بکرا نامزد کیا ہو 'پھر ان جانوروں کو اپنے اپنے وقت میں صرف اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو یہ ذبح جائز ہے 'اور ان کا گوشت حلال ہے اور ان کا ایصال ثواب کرنا صحیح ہے۔

حاکم یا کسی بڑے آدمی کی آمد کے موقع پر جانور ذبح کیا گیا تو یہ حرام ہے (اور اس ذبح سے جانور کا گوشت کھانا مقصود نہ ہو 'صرف اس کا خون بہانا مطلوب ہو) کیونکہ یہ (آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ " ہے۔ خواہ اس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو اور اگر مہمان کے لیے ذبح کیا گیا تو یہ حرام نہیں ہے 'کیونکہ یہ حضرت خلیل (علیہ السلام) کی سنت ہے اور مہمان کی تکریم اللہ تعالیٰ کی تکریم ہے اور وجہ فرق یہ ہے کہ اگر اس نے جانور کو اس لیے ذبح کیا 'تاکہ یہ اس سے کھائے تو یہ ذبح اللہ کے لیے ہوگا 'اور منفعت مہمان کے لیے 'یا دعوت کے لیے یا نفع کے لیے ہوگی اور اگر اس نے کھانے کے لیے نہیں ذبح کیا 'بلکہ اس لیے کہ کسی غیر کے آنے پر محض اس کو ذبح کرے (یعنی صرف خون بہائے) تو اس میں غیر اللہ کی تعظیم ہوگی 'سو یہ حرام ہوگا۔ کیا وہ شخص کافر ہو جائے گا؟ اس میں دو قول ہیں۔ (بزازیہ و شرح وھبانیہ) میں کہتا ہوں کہ منیہ کی کتاب الصید میں ہے کہ یہ فعل مکروہ ہے 'اور اس شخص کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ ہم کسی مسلمان کے ساتھ یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح کے ساتھ کسی آدمی کا تقرب (بطور عبادت کیونکہ یہی کفر ہے۔ شامی) حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ شرح الوھبانیہ میں ذخیرہ سے اسی طرح منقول ہے۔ (الدر المختار مع رد المختار ج ۵ ص ۱۹۷۔ ۱۹۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ اس کی شرح میں وجہ فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ "میں تعظیم اور غیر تعظیم کے لیے فرق یہ ہے کہ اگر دیوار چنتے وقت یا کسی مرض سے شفاء کے حصول کے وقت جانور ذبح کیا جائے تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ اس ذبح کا مقصد صدقہ کرنا ہے (حموی) اسی طرح کسی نے سفر سے سلامتی کے ساتھ آنے پر قربانی کی نذر مانی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (البحر الرائق) اب اس پر لازم ہے کہ اس گوشت کو فقط فقراء پر صدقہ کرے۔ (فتاوی الشلبی) اور جو شخص کسی کے آنے پر جانور کو ذبح کرے اور پھر اس کو یونہی چھوڑ دے 'یا اس میں سے کل یا بعض لے لے اور فرق کا مدار ابتداء ذبح کے وقت ہے۔ اگر اس نے مہمان کے اکرام اور اس کو گوشت کھلانے کے سبب سے جانور کو ذبح کیا ہے 'تو ذبیحہ حلال ہے اور اگر اس نے کسی بڑے آدمی کی آمد کے موقع پر اس کی تعظیم کے لیے محض خون بہانے کے قصد سے جانور کو ذبح کیا ہے تو یہ حرام ہے ' اور یہ فرق اس طرح مزید ظاہر ہوگا کہ اگر اس نے حاکم کی ضیافت کی اور اس کے آنے پر جانور کو ذبح کیا۔ اگر اس ذبح سے اس کو تعظیم کا قصد کیا تو یہ ذبیحہ حلال نہیں ہے 'اور اگر اس ذبح سے اس کی مہمانی اور اس کے اکرام کا قصد کیا تو یہ ذبیحہ حلال ہے۔ خواہ یہ ذبیحہ مہمان کے علاوہ کسی اور کو کھلا دے۔ جو شخص کسی بڑے آدمی کی آمد کے موقع پر اس کی تعظیم کے لیے جانور کو ذبح کرتا ہے تو یہ ذبیحہ حرام ہے 'لیکن یہ کفر نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کسی مسلمان کے ساتھ یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح کے ساتھ کسی آدمی کا تقرب علی وجہ العبادت حاصل کرے گا اور تکفیر کا اسی پر مدار ہے 'اور یہ مسلمان کے حال سے بہت بعید ہے۔ اس لیے ظاہر یہ ہے کہ اس کا یہ فعل دنیاداری کے لیے وقت اللہ کا نام لینا حکما خالص اللہ کے لیے نہ تھا 'اور یہ ایسے ہو گیا جیسے کوئی شخص ذبح کے وقت کہے 'اللہ کے نام سے اور فلاں کے نام سے 'اس لیے یہ ذبیحہ حرام ہوگا۔ لیکن حرمت اور کفر میں تلازم نہیں ہے۔ (رد المختار ج ۵ ص ۱۹۷۔ ۱۹۶ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت ۱۴۰۷ھ)

"المنخنقة" کا معنی اور اس کا شرعی حکم

منخنقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلا گھٹنے سے مر جائے 'عام ازیں کہ کسی نے قصداً اس کا گلا گھونٹ دیا یا کسی حادثہ سے اچانک اس کا گلا گھٹ گیا ہو 'یہ مردار ہے اور شرعاً مذبوح نہیں ہے۔ اس کو مردار میں شامل نہیں کیا 'بلکہ الگ ذکر کیا ہے۔ کیونکہ مردار وہ ہے جو بغیر کسی خارجی

سبب کے طبعی موت سے مر جائے اور گلا گھٹنے سے مرنے والا ایک خارجی سبب سے مرتا ہے 'لیکن یہ مذبوح نہیں ہے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور کے گلے پر چھری پھیری جائے جس سے اس کی چاروں رگیں کٹ جائیں اور جسم کا سارا خون بہہ جائے۔

"الموقوذة" کا معنی اور اس کا شرعی حکم:

جس غیر دھار والی بھاری چیز سے کسی جانور پر ضرب یا چوٹ لگائی جائے 'خواہ دور سے پتھر مارا جائے 'یا ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر اس سے مارا جائے۔ اس چوٹ کے نتیجہ میں وہ جانور مر جائے تو وہ بھی شرعاً مذبوح نہیں ہے۔ یہ جانور بھی مردار کے حکم میں ہے۔ اور زمانہ جاہلیت میں اس کو کھایا جاتا تھا۔

اسلام میں ثقیل شئے کی ضرب یا چوٹ سے جانور کو ہلاک کرنے سے منع کیا ہے 'اور کسی دھار والی چیز سے جانور کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ ' تاکہ جانور کو اذیت نہ پہنچے اور آسانی سے اس کی جان نکل جائے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا "منخنقہ "وہ ہے جس کا گلا گھونٹا جائے اور وہ مر جائے۔ "موقوذہ "وہ ہے جس کو لکڑی سے ضرب لگائی جائے اور وہ چوٹ کھا کر مر جائے "متردیہ "وہ ہے جو پہاڑ سے گر کر مر جائے اور "نطیحہ "وہ ہے جس کو دوسری بکری نے سینگھ مارا ہو 'اگر اس کی دم یا آنکھ مل رہی ہو تو اس کو ذبح کر کے کھالو۔ (صحیح البخاری 'ج ۶ کتاب الصید والذبائح '۶۲ 'باب ۱)

حضرت شداد بن اوس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے دو باتیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یاد رکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ نیکی کرنے کو فرض کر دیا ہے۔ پس جب تم قتل کرو تو درست طریقہ سے کرو اور جب تم ذبح کرو تو درست طریقہ سے ذبح کرو 'اور تم میں سے کسی شخص کو اپنی چھری تیز کر لینی چاہیے 'تاکہ ذبیحہ کو آسانی ہو۔ (صحیح مسلم 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۹۵۵)

جب چھری تیز ہو گی تو جلدی سے جانور ذبح ہو جائے گا اور مستحب یہ ہے کہ جانور کے سامنے چھری تیز نہ کی جائے اور ایک جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح نہ کیا جائے اور جانور کو گھسیٹ کر مذبح تک نہ لے جایا جائے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس چیز میں روح ہو 'اس کو (مشق کے لیے) نشانہ نہ بناؤ (صحیح مسلم 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۹۵۷)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معراض (بغیر پر کا تیر جس کا درمیانی حصہ موٹا ہو) کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا جب جانور اس کی دھار سے زخمی ہو تو اس کو کھالو اور جب جانور کو اس کی چوڑائی کی جانب تیر لگے اور وہ مر جائے تو اس کو مت کھاؤ کیونکہ ہو وقیذ (چوٹ سے مرا ہوا) ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۶ رقم الحدیث : ۵۴۷۶)

موقوذہ کی بحث میں بندوق سے کیے ہوئے شکار کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہ بحث تفصیل کے ساتھ شرح صحیح مسلم جلد سادس میں لکھ دی ہے اور (المائدہ : ۴) میں بھی انشاء اللہ اس پر گفتگو کریں گے۔

"المتردیة "کا معنی اور اس کا شرعی مفہوم:

جو جانور کسی پہاڑ سے یا کسی بلند جگہ سے مثلاً چھت سے گر جائے 'یا کنوئیں میں گرنے سے اس کی موت واقع ہو جائے اس کو متر دیہ کہتے ہیں۔ مردار کی طرح اس کا کھانا بھی جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس میں کچھ رمق حیات ہو تو اس کو ذبح کر لیا جائے۔

"النطیحة "کا معنی اور اس کا شرعی حکم:

جس جانور کو دوسرے جانور نے سینگھ مارا ہو 'اور وہ اس کے سینگھ مارنے سے مر گیا 'خواہ اس کے سینگھ مارنے سے وہ زخمی ہوا ہو 'اور اس کا خون بھی بہا ہو 'اس کا حکم بھی مردار کی طرح ہے اور اس کا کھانا شرعا جائز نہیں ہے۔

جس جانور کو درندے نے کھالیا ہو 'اس کا شرعی حکم

کسی درندے مثلا شیر 'چیتے یا بھیڑیے نے کس حلال جانور کو چیر پھاڑ کر زخمی کر دیا ہو اور اس کے کل یا بعض حصے کو کھالیا ہو 'تو اس کا کھانا بالاجماع جائز نہیں ہے۔ خواہ اس کے جسم یا اس کے ذبح کی جگہ سے خون بہہ رہا ہو۔ زمانہ جاہلیت میں بعض عرب درندہ کے پھاڑے ہوئے جانور میں سے بقیہ کو کھالیا کرتے تھے 'لیکن طبائع سلیمہ اس کو پسند نہیں کرتی تھیں۔

"الاماذ کیتم "کے مستثنی منہ کا بیان :

مردار 'خون 'خنزیر اور (آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ "کے علاوہ باقی جانوروں میں سے جو جانور زندہ مل جائیں اور ان کو شرعی طریقہ سے ذبح کر لیا جائے 'ان کا اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمالیا۔ اس مستثنی مینہ میں "المنخنقہ 'الموقوذہ 'المتردیہ 'النطیحہ 'اور جن کو درندہ نے کھالیا ہو 'داخل ہیں۔ اور بعض علماء نے (آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ "کو بھی اس میں داخل کر لیا ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جس جانور کے ذبح کا موقع تمہیں مل جائے 'بایں طور کہ اس کی دم ہل رہی ہو 'یا وہ آنکھ سے دیکھ رہا ہو 'اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کر دو 'وہ حلال ہے۔

قتادہ نے بیان کیا کہ "لحم الخنزیر "کے سوا باقی تمام کو "الاماذ کیتم "کا استثناء لاحق ہے۔ جب تم دیکھو کہ وہ جانور پلک جھپکا رہا ہے 'دم ہلا رہا ہے 'یا اس کی ٹانگ مضطرب ہو رہی ہے 'تو تم اس کو ذبح کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے لیے حلال کر دیا ہے۔ حضرت علی نے فرمایا جب تم موقوذہ 'متردیہ 'نطیحہ اور جس کو درندہ نے کھالیا ہو 'وہ تم پر حرام کر دیئے گئے ہیں 'لیکن اگر تم ان میں زندگی کے آثار دیکھو اور ان کے مرنے سے پہلے تمہیں ان کو ذبح کرنے کا موقع مل جائے تو وہ تمہارے لیے حلال ہیں 'تم ان کو ذبح کر کے کھالو۔

بعض علماء اہل مدینہ نے یہ کہا کہ یہ استثناء ان محرمات میں سے نہیں ہے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے 'بلکہ یہ تحریم سے استثناء ہے 'یعنی مردار 'خون 'خنزیر (آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ "اور باقی مذکورہ جانور تم پر حرام کر دیئے گئے۔ مگر جن حلال جانوروں کو تم شرعی طریقہ سے

ذبح کرلو ' وہ تم پر حلال ہیں۔ امام مالک کا یہی قول ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ ایک درندہ ایک بھیڑ پر حملہ کرتا ہے اور اس کی کمر توڑ ڈالتا ہے۔ تو اگر اس کو مرنے سے پہلے ذبح کرلیا جائے تو کیا اس کو کھانا جائز ہے ' امام مالک نے کہا اگر اس کی ضرب اس کے پیٹ ' جگر اور دل تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کا کھانا جائز نہیں ہے ' اور اگر اس کے ہاتھ ' پیر توڑے ہیں ' تو پھر اس کو ذبح کرکے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سے پوچھا گیا ' اگر وہ اس پر حملہ کرکے اس کی کمر توڑ دے ؟ امام مالک نے کہا : اس کے بعد جانور زندہ نہیں رہتا۔ میرے نزدیک اس کا کھانا بہتر نہیں ہے ' ان سے پوچھا گیا کہ بھیڑ یا بکری کا پیٹ پھاڑ دے ' لیکن اس کی آنتیں باہر نہ نکلیں ' امام مالک نے کہا جب اس کا پیٹ پھاڑ دیا جائے تو میری رائے میں اس کا کھانا جائز نہیں ہے ' اس تقدیر پر یہ استثناء منقطع ہے۔

امام ابو جعفر طبری کہتے ہیں کہ میری رائے میں (آیت) "مااھل لغیر اللہ بہ" سے کر آخر آیت تک یہ استثناء لاحق ہے ' کیونکہ ان تمام صورتوں میں موت سے پہلے وہ جانور ذبح کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مشرکین جب اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان جانوروں کو بتوں کے ناموں کے ساتھ منسوب کردیتے ہیں اور وہ غیر اللہ کی قربانی کہلاتی ہیں ' اس لیے وہ حرام ہوتی ہے۔ اس طرح جو جانور گلا گھٹنے سے مر جاتا ہے ' وہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن جس جانور کو بتوں کے ناموں کے ساتھ منسوب کیا گیا ہو ' اگر اس کو مرنے سے پہلے شرعی طریقہ سے ذبح کردیا جائے ' یا جس جانور کا گلا گھونٹا گیا ہو ' اگر اس کو مرنے سے پہلے شرعی طریقہ سے ذبح کرلیا گیا ہو تو وہ حلال ہوگا۔ لہٰذا جس حلال جانور یا پرندہ کی روح نکلنے سے پہلے اس کو شرعی طریقہ سے ذبح کرلیا جائے وہ حلال ہوگا۔ (جامع البیان ج ٦ ص ٩٩۔ ٩٦ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ١٤١٥ ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور جو بتوں کے تقرب کے لیے نصب شدہ پتھروں پر ذبح کیا گیا۔

نصب کا معنی اور اس کا شرعی حکم

قرآن مجید میں نصب کا لفظ ہے ' یعنی جو جانور نصب پر ذبح کیا گیا ' وہ بھی حرام ہے کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ پتھر نصب کیے گئے تھے ' اور زمانہ جاہلیت میں عرب اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان پتھروں کے پاس جانور ذبح کرتے تھے اور بیت اللہ کے سامنے جو خون بہتا ' اس کو ان پتھروں پر چھڑکتے تھے اور اس قربانی کو عبادت قرار دیتے تھے اور ان پر گوشت کے ٹکڑے پتھر پر رکھ دیتے تھے ' اس کو نصب اور انصاب کہا جاتا ہے۔ نصب ' نصیب کی جمع ہے۔ نصیب اس پتھر کو کہتے ہیں جس کو کسی شے پر نصب کیا جاتا ہے۔ (المفردات ' ص ٤٩٤) نصب بتوں کو نہیں کہتے ' نصب غیر منقوش پتھر ہوتے ہیں اور بت منقوش پتھر ہوتے ہیں ' اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس فعل سے منع فرما دیا اور جو جانور نصب پر ذبح کیے جاتے ہیں ' ان کا کھانا ان پر حرام کردیا۔ خواہ ان جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے ' تاکہ اس شرک سے اجتناب ہو جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کردیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : فال کے تیروں سے اپنی قسمت معلوم کرنا یہ (تمام کام) فسق ہیں۔ (المائدہ : ٢)

ازلام کا معنی

ازلام زلم کی جمع ہے۔ یہ تیر کی شکل کا لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس کی نوک پر لوہے کا وہ پھل نہیں ہوتا جو شکار کو زخمی کرتا ہے ' زمانہ جاہلیت میں مشرکین اس سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے تھے۔ امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ یہ تیر کاہنوں کے پاس ہوتے تھے ' جن میں سے کسی پر لکھا ہوتا تھا ' مجھے حکم دیا ہے اور کسی پر لکھا ہوتا تھا ' مجھے منع کیا ہے اور کوئی تیر سادہ ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا ' یا شادی کا ارادہ کرتا ' یا کسی نئے کام کرا ارادہ کرتا تو وہ کاہن کے پاس جاتا اور تیر سے فال نکالتا۔ اگر اس کا تقاضا ہوتا کہ وہ اس کام کو کرے تو وہ کام کرتا ' اور اگر اس کا تقاضا ہوتا وہ کام نہ کرے تو پھر وہ کام نہ کرتا اور اگر سادہ تیر نکل آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ (جامع البیان ' جز ٦ ص ١٠٣ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ١٤١٥ھ)

نجومیوں ' کاہنوں اور ستارہ شناسوں سے غیب کی باتیں دریافت کرنے کی ممانعت

جس طرح فال کی تیروں کے ذریعہ اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا اور امور غیبیہ کو دریافت کرنا ممنوع اور حرام ہے۔ اسی طرح نجومیوں سے قسمت کا حال معلوم کرنا ' یا جو لوگ ستارہ شناسی کے دعوی دار ہیں ' ان سے مستقبل کا حال معلوم کرنا بھی ممنوع اور حرام ہے۔ ہمارے بعض اخبارات اور رسائل میں اس عنوان سے کلام چھپتے ہیں آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا؟ اور اٹکل پچو سے غیب کی باتیں بتائی جاتی ہیں ' نجومی ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ طوطا اپنی چونچ سے لفافہ نکالتا ہے ' بعض صوفی باصفا قسم کے لوگ قرآن سے فال نکالتے ہیں۔ یہ تمام امور باطل ' ناجائز اور حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا ' یا جن امور پر وحی کے ذریعہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کو مطلع فرماتا ہے ' اس کے سوا اور کوئی غیب کو نہیں جانتا ' اولیاء اللہ کو جو الہام ہوتا ہے وہ ایک ظنی امر ہے ' قطعی چیز نہیں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں کافر اور مشرک کاہنوں کے پاس جاتے تھے اور انھیں مستقبل میں جس کام کے متعلق تردد ہوتا ' وہ ان سے معلوم کرتے اور وہ فال کے تیروں سے فال نکال کر اٹکل پچو سے ان کو غیب کی باتیں بتاتے۔ اسلام نے اس طریقہ کی ممانعت کر دی ' اب جو لوگ ستارہ شناسی کے دعوداروں ' نجومیوں اور طوطے والوں سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے اور مستقبل کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں ' ان کا بھی یہی حکم ہے۔

حضرت ابو مسعود انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کتے کی قیمت ' طوائف (رنڈی) کے معاوضہ اور کاہن کی مٹھائی دینے سے منع فرمایا۔ (صحیح البخاری ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٢٢٣٧ ' صحیح مسلم ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ١٥٦٧ ' سنن ابوداؤد ج ٢ ' رقم الحدیث : ٣٤٨١ ' سنن ترمذی ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٠٧٨ ' سنن ابن ماجہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٢١٥٩ ' سند احمد ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ١٧٠٦٩ ' سنن دارمی ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٢٥٦٨ ' شرح السنہ ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٠٣٠ ' المعجم الکبیر ' ج ١٧ ' رقم الحدیث : ' ٧٢٦ ' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ١٣٦٣ ' مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ٦ ص ٣ ٢٤٣ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ٦ ' ص ٦)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا اور اس کے قول کی تصدیق کی ' یا جس شخص نے حائضہ عورت کے ساتھ جنسی عمل کیا ' یا جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ عمل معکوس کیا ' تو وہ اس (دین) سے بری ہوگیا ' جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔ (سنن ابوداؤد ج ٣ ' رقم الحدیث : ٣٩٠٤)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے حائضہ عورت کے ساتھ جنسی عمل کیا 'یا جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ عمل معکوس کیا 'یا جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا 'اس نے اس (دین) کے ساتھ کفر کیا جو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث تغلیظ پر محمول ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ا 'رقم الحدیث: ۱۳۵ 'مسند احمد ج ۳ 'رقم الحدیث: ۹۳۰۱ 'سنن کبری للبیہقی ج ۷ 'ص ۱۹۸) امام بخاری نے کہا: اس حدیث کا کوئی متابع نہیں ہے اثرم کا حضرت ابوہریرہ سے سماع معروف نہیں ہے اور اثرم منکر الحدیث ہے۔ (التاریخ الکبیر 'ج ا 'ص ۱۸) امام ابن عدی نے اس کو ضعفاء میں بیان کیا ہے۔ (الکامل الضعفاء 'ج ۲ 'ص ۶۳۷) تاہم اس حدیث کے شواہد ہیں۔

اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ جو شخص کسی آدمی کے متعلق یہ یقین رکھے کہ اس کو غیب کا علم ہے اور پھر حلال اور جائز سمجھ کر اس سے غیب کی باتیں دریافت کرے 'وہ کافر ہو گیا اور اگر وہ ناجائز اور گناہ سمجھ کر یہ کام کرے 'تو پھر یہ گناہ کبیرہ ہے۔

عرب میں کاہن تھے اور وہ متعدد امور کی معرفت کا دعوی کرتے تھے 'ان میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ جن آکر ان کو خبریں دیتے ہیں 'اور بعض یہ دعوی کرتے تھے کہ وہ مستقبل کے امور کو اپنی عقل سے جان لیتے ہیں 'اور بعض عراف کہلاتے تھے جو قرائن اور اسباب سے مختلف چیزوں کا پتا چلا لیتے تھے۔ مثلا بتاتے فلاں شخص نے چوری کی ہے فلاں شخص نے فلاں عورت سے بدکاری کی ہے 'اور بعض نجومی اور ستارہ شناس کو کاہن کہتے تھے۔ حدیث میں ان تمام لوگوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے 'اور ان کے اقوال اور ان کی خبروں کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا ہے آج کل کے جعلی پیر بھی انہی میں سے ہیں کیونکہ وہ عراف ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ہر کام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر بدعقیدگی پیدا کرتے ہیں۔ جو اللہ سے دوری کا سبب بنتی ہے یہ لوگ ہرگز اولیاء اللہ نہیں یہ عوام کی غلطی ہے تو پھر اولیاء اللہ کون ہیں ان کے بارے ایک پہچان ہے

حضرت سعید بن جبیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اولیاء اللہ کون ہیں؟ فرمایا **ھم الذین یذ کر اللہ برؤیتھم.**

اولیاء اللہ وہ ہیں جن کے دیکھے سے اللہ یاد آجائے۔

○ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟ فرمایا:

الذین اذا رئووا ذکر اللہ.

جن کے دیکھے سے اللہ یاد آجائے۔

(علامہ اسماعیل بن کثیر الدمشقی (م 774ھ)، تفسیر القرآن العظیم، 422/2، طبع لاہور)

۔ (معالم السنن 'ج ۵ ص ۳۰۷۱-۳ 'مطبوعہ دارالمعرفہ 'بیروت)

کسی درپیش مہم کے متعلق استخارہ کرنے کی ہدایت

بہرحال! جو شخص بھی غیب کی خبروں کے جاننے کا دعوی کرے 'وہ کافر ہے۔ خواہ وہ کاہن ہو 'نجومی ہو 'یا دست شناس ہو 'اور جو شخص اس کی خبر کی تصدیق کرے 'وہ بھی کافر ہے۔ اور جن لوگوں کو مستقبل میں کسی کام کے متعلق تردد ہو 'مثلا کسی جگہ رشتہ کرنا ہے 'کسی شخص کے

ساتھ شراکت میں کوئی کاروبار کرنا ہے 'کسی جگہ سفر پر جانا ہے اور اب وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ کام اس کے حق میں بہتر ہیں یا نہیں 'تو اس کے لیے کسی نجومی وغیرہ کے پاس نہ جائے 'بلکہ شریعت نے اس کے لیے ہمیں استخارہ کی تعلیم دی ہے 'سو وہ اس کے لیے استخارہ کرے۔

حضرت جابر بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام کاموں میں ہمیں استخارہ کی اس طرح تعلیم دیتے تھے جس طرح آپ ہمیں قرآن مجید کی کسی سورت کی تعلیم دیتے تھے۔آپ فرماتے تھے جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کا قصد کرے تو وہ دو رکعت نفل پڑھے 'پھر یہ دعا کرے 'اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کو طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت سے قدرت طلب کرتا ہوں اور تیرے فضل عظیم سے سوال کرتا ہوں کیونکہ تو قادر ہے اور میں قادر نہیں ہوں اور تو عالم ہے اور میں عالم نہیں ہوں اور تو علام الغیوب ہے۔اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگی میں۔فرمایا: میری دنیا اور آخرت میں 'میرے لیے خیر ہو تو اس کام کو میرے لیے مقدر کردے 'اور میرے لیے آسان کردے 'پھر اس کام میں میرے لیے برکت ڈال اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگی میں یا فرمایا: میری دنیا اور میری آخرت میں میرے لیے شر ہو 'تو اس کام کو مجھ سے دور کردے 'اور مجھے اس کام سے دور کردے 'اور میرے لیے خیر کو مقدر کردے 'جہاں کہیں بھی ہو اور مجھ سے راضی رہ۔آپ نے فرمایا دعا میں اپنے اس کام کا نام بھی لے۔(صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث ۱۱۶۳ 'سنن ترمذی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۷۹ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۳۸۳ 'مسند احمد 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ۱۴۷۱۳)

استخارہ کرنے کا طریقہ

اگر ایک بار دعاء استخارہ کرنے کے بعد آدمی کا دل کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی طرف نہ جھکے تو آیا دوبارہ یہ عمل کرنا مشروع ہے یا نہیں 'حتیٰ کہ اس کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق شرح صدر ہو جائے۔میں کہتا ہوں کہ صلوۃ استخارہ اور دعا کو بار بار کرنا مستحب ہے۔ اس حدیث سے استدلال ہو سکتا ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی دعا کرتے تو تین بار دعا کرتے۔علامہ نووی نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ صلوۃ استخارہ کی پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد (آیت) "قل یایھا الکافرون "پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد (آیت) "قل ھو اللہ احد "پڑھے۔امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں اسی طرح لکھا ہے 'اور ہمارے شیخ زید الدین رحمۃ اللہ عنہ نے لکھا ہے 'صلوۃ استخارہ میں کسی سورت کی قرات کرنا معین نہیں ہے 'اور کسی حدیث میں اس تعیین کا ذکر نہیں ہے۔(عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۲۴ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ھ)

مستحب یہ ہے کہ دعا کے شروع اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ پڑھے اور پہلی رکعت میں قرات کے بعد یہ زیادہ پڑھے ("وربک یخلق ما یشاء ویختار ") اور اس کو "یعلنون "تک پڑھے اور دوسری رکعت میں ("وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ "الایہ) پوری آیت پڑھے اور استخارہ کا عمل سات مرتبہ کرے 'جیسا کہ امام ابن السنی نے (عمل الیوم واللیلہ میں) روایت کیا ہے اور شرح الشرعہ میں مذکور ہے کہ مشائخ سے یہ سنا گیا ہے کہ نماز استخارہ پڑھ کر اور دعاء مذکورہ کرنیکے بعد باوضو قبلہ کی طرف منہ کرکے سو جائے

'اگر اسے خواب میں کوئی سفید یا سبز چیز نظر آئے تو یہ کام اس کے لیے خیر ہے اور اگر اس کو سیاہ یا سرخ چیز نظر آئے تو یہ کام اس کے لیے شر ہے اور اس کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۴۶۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت ۱۴۰۷ھ)

بخاری شریف میں یوں طریقہ آیا ہے

حَدَّثَنَا مُطَرِّفُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ أَبُو مُصْعَبٍ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي الْمَوَالِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ، عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الِاسْتِخَارَةَ فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ الْقُرْآنِ: "إِذَا هَمَّ بِالْأَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ، اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي، أَوْ قَالَ فِي عَاجِلِ أَمْرِي، وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي، أَوْ قَالَ فِي عَاجِلِ أَمْرِي، وَآجِلِهِ، فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ رَضِّنِي بِهِ وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ." (بخاری: 6382)

ہم سے ابو مصعب مطرف بن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الرحمٰن بن ابی الموال نے بیان کیا، ان سے محمد بن منکدر نے اور ان سے جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تمام معاملات میں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے، قرآن کی سورت کی طرح) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جب تم میں سے کوئی شخص کسی) مباح (کام کا ارادہ کرے) ابھی پکا عزم نہ ہوا ہو (تو دو رکعات) نفل (پڑھے اس کے بعد یوں دعا کرے کہ اے اللہ ! میں بھلائی مانگتا ہوں) استخارہ (تیری بھلائی سے، تو علم والا ہے، مجھے علم نہیں اور تو تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے، اے اللہ ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے بہتر ہے، میرے دین کے اعتبار سے، میری معاش اور میرے انجام کار کے اعتبار سے یا دعا میں یہ الفاظ کہے »فی عاجل إمری وآجلہ «تو اسے میرے لیے مقدر کر دے اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے برا ہے میرے دین کے لیے، میری زندگی کے لیے اور میرے انجام کار کے لیے یا یہ الفاظ فرمائے »فی عاجل إمری وآجلہ «تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی مقدر کر دے جہاں کہیں بھی وہ ہو اور پھر مجھے اس سے مطمئن کر دے) یہ دعا کرتے وقت (اپنی ضرورت کا بیان کر دینا چاہئے۔

قرائن کی بناء پر مستقبل کے ظنی ادراک حاصل کرنے کا حکم

جب تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا فسق ہے تو اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فال (نیک شگون) کو پسند کرتے تھے اور تیروں سے اپنے سفر یا مستقبل کے کسی کام کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی ایک قسم کی فال ہے تو پھر تیروں کے ذریعہ فال نکالنے کو کیوں فسق فرمایا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ واحدی نے کہا ہے کہ تیروں سے فال نکالنا یا قسمت کا حال معلوم کرنا اس لیے حرام ہے کہ اس میں غیب کی معرفت کی طلب ہے اور یہ حرام ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "وماتدری نفس ماذاتکسب غدا"۔ (لقمان: ۳۴)
ترجمہ: اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔
(آیت) "قل لایعلم من فی السموت والارض الغیب الاالله " (النمل: ۶۵)
ترجمہ: آپ کہئے کہ اللہ کے اللہ سوا جو بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے 'وہ (بذاتہ) غیب کو نہیں جانتا۔
اور حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کاہن کے پاس گیا یا جس شخص نے تیروں کے ذریعہ قسمت کو معلوم کیا 'یا کسی چیز سے جو فال نکال کر سفر سے واپس ہوا 'وہ قیامت کے دن جنت کے بلند درجات کو نہیں دیکھ سکے گا۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۵۷ مطبوعہ دارالفکر بیروت '۱۳۹۸ھ)
اور کوئی معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر علامات متعارفہ کے ذریعہ ظنی علم حاصل کرنا (مثلا موسمی علامات کے ذریعہ درجہ حرارت 'یا بارش کے ہونے یا نہ ہونے کا علم حاصل کرنا 'یا جدید سائنسی آلات کے ذریعہ سورج اور چاند کے گہن لگنے کا علم حاصل کرنا) معرفت غیب کی طلب ہو 'تو پھر خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا علم بھی کفر ہونا چاہیے 'کیونکہ یہ بھی غیب کی طلب ہے 'اور کسی چیز سے نیک فال نکالنا بھی کفر ہونا چاہیے 'کیونکہ یہ بھی غیب کی طلب ہے 'اور جو اصحاب کرامات اور اولیاء اللہ الہام کا دعوی کرتے ہیں 'وہ بھی کافر ہونے چاہئیں 'اور یہ بداھۃ معلوم ہے کہ ان امور کا کفر ہونا باطل ہے 'کیونکہ یہ تمام امور شریعت سے ثابت ہے۔
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کی چیز میں بدشگونی نہیں ہے 'اور سب سے عمدہ چیز فال ہے۔ انھوں نے پوچھا 'یارسول اللہ! فال کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ اچھی بات جو تم میں سے کوئی شخص سنتا ہے۔ (صحیح البخاری '۵۷۵۵ 'صحیح مسلم '۲۲۲۳) کسی ناپسندیدہ قول یا فعل سے برا معنی لینا بدشگونی ہے۔ عرب جب کہیں جانا چاہتے تو وہ پرندہ یا کسی جانور کو ڈرا کر اڑاتے یا بھگاتے۔ اگر وہ دائیں جانب بھاگتا 'تو اس کو مبارک جانتے اور سفر پر چلے جاتے اور اگر وہ بائیں جانب جاتا تو اس کو منحوس جانتے اور سفر پر نہ جاتے 'یا جو کام کرنا ہوتا 'نہ کرتے 'اور فال کا معنی نیک اور اچھی بات ہے جس سے طبیعت میں خوشی ہو۔ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی کام کے لیے جاتے 'تو آپ یہ سن کر خوش ہوتے تھے 'یاراشد (اے ہدایت یافتہ) یا نجیح (اے کامیاب)۔ (سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۱۶۲۲)
عبداللہ بن بریدہ اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی چیز سے بدشگونی نہیں لیتے تھے۔ آپ جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے تو اس کو نام پوچھتے 'جب آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو آپ خوش ہوتے 'اور آپ کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی اور اگر آپ کو اس کو نام ناپسند ہوتا 'تو آپ کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوتی 'اور جب آپ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس کا نام پوچھتے۔ اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا 'تو آپ خوش ہوتے اور آپ کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی اور اگر آپ کو اس کا نام ناپسند تو آپ کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوتی۔ (سنن ابوداؤد ج ۳ 'رقم الحدیث: ۳۹۲۰ 'مسند احمد 'ج ا ص ۱۸۰ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت 'طبع قدیم)
سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں غیب کے جس علم کی طلب سے منع فرمایا ہے 'اس سے مراد غیب کا یقینی اور قطعی علم ہے اور علامات 'آلات اور علم تعبیر اور فال سے جو غیب کا ادراک حاصل ہوتا ہے 'وہ محض ظن ہے۔ بعض صورتوں میں یہ ظن قوی ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں یہ ظن ضعیف ہوتا ہے۔ اس آیت کی توجیہہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار کا عقیدہ یہ تھا کہ تیروں کے ذریعہ جو ان کو معلومات حاصل ہوتی ہیں 'وہ بتوں کے تصرف سے حاصل ہوتی ہیں اور ان کا یہ عقیدہ فسق تھا 'اس لیے فرمایا: کہ یہ فسق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : "آج کفار تمہارے دین (کی ناکامی) سے مایوس ہو گئے 'سو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو"۔ (المائدہ : ۲)

تدریجاً احکام کا نزول دین کے کامل ہونے کے منافی نہیں

یہ آیت حجۃ الوداع کے سال دس ہجری کو عرفہ کے دن نازل ہوئی ہے 'اور اس دن دین کامل ہوا ہے۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے دس سال تک دین ناقص رہا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں فرائض اور واجبات اور محرمات اور مکروہات پر مشتمل احکام کا نزول تدریجاً ہوا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا نزول بھی تدریجاً ہوا ہے اور اس آیت میں دین کے کامل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اصول اور فروع 'عقائد اور احکام شرعیہ کے متعلق جتنی آیات نازل ہونی تھیں 'وہ تمام آیات اللہ تعالیٰ نے نازل کر دی ہیں۔ عقائد کے باب میں تمام آیات نازل کر دی گئیں۔ اسی طرح قیامت تک پیش آنے والے مسائل اور حوادث کے متعلق تمام احکام کے متعلق آیات نازل کر دی گئیں 'اور ان کی تشریح زبان رسالت سے کر دی گئی ہے۔ دین اسلام تو ہمیشہ سے کامل ہے 'لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں کی آسانی کے لیے اس کا بیان تدریجاً فرمایا 'کیونکہ جو لوگ کفر اور برائی میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے تھے 'اگر ان کو یک لخت ان تمام احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا تو یہ ان کی طبیعت پر سخت مشکل اور دشوار ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی سہولت کی خاطر اس کا بیان رفتہ رفتہ اور تدریجاً فرمایا اور آج یہ بیان اپنے تمام و کمال کو پہنچ گیا۔

اسلام کا کامل دین ہونا ادیان سابقہ کے کامل ہونے کے منافی نہیں

اس آیت پر دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت میں اسلام کو کامل دین فرمایا ہے 'تو کیا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور دیگر انبیاء سابقین کا دین کامل نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام ادیان سابقہ اپنے اپنے زمانوں کے لحاظ سے کامل تھے۔ ان کے زمانوں میں تہذیب و تمدن کے جو تقاضے تھے اور ان کی رعایت سے جس طرح کے شرعی احکام ہونے چاہئیں تھے 'اللہ تعالیٰ نے ویسے ہی احکام نازل فرمائے 'پھر حالات کے بدلنے اور تہذیب و ثقافت کی ترقی سے تقاضے بدلنے لگے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر بعد کی شریعت میں پہلی شریعت کے بعض احکام منسوخ کر دیئے اور نسخ احکام کا یہ سلسلہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت تک جاری رہا 'بلکہ آپ کی شریعت میں بھی بعض احکام منسوخ کیے گئے۔ لیکن اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کوئی حکم منسوخ نہیں ہوگا اور اب جس قدر احکام ہیں 'وہ سب محکم ہیں اور ناقابل تنسیخ ہیں 'اور قیامت تک یہ تمام احکام نافذ العمل رہیں گے 'الا یہ کہ جس حکم کی مدت خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرما دی ہے۔ مثلاً جزیہ کی مدت نزول عیسیٰ (علیہ السلام) تک ہے 'اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس وقت سب مسلمان ہو جائیں گے۔ لہٰذا کسی سے جزیہ لینے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ادیان سابقہ میں سے ہر دین کامل ہے اور اس کا کمال حقیقی ہے 'یہ اپنے زمانہ نزول سے لے کر قیامت تک کے لیے کامل ہے 'تمام لوگوں کے لیے اور تمام دنیا کے لیے اب یہی دین ہے اور یہی کمال حقیقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(آیت) "وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا"۔ (سبا : ۲۸)

ترجمہ : اور ہم نے آپ کو قیامت تک کے تمام لوگوں کے لیے رسول بنایا درآنحالیکہ آپ خوشخبری دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں۔

(آیت) "تبرک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا"۔ (الفرقان : ۱)
ترجمہ : وہ برکت والا ہے جس نے اپنے (مقدس) بندہ پر کتاب فیصل نازل فرمائی تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔
(آیت) "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ"۔ (ال عمران : ۸۵)
ترجمہ : جس شخص نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو طلب کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : مجھے انبیاء پر چھ وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے مجھے جوامع الکلم (ایسا کلام جس میں الفاظ کم ہوں اور معنی زیادہ ہوں) عطا کیے گئے اور رعب سے میری مدد کی گئی اور غنیمتیں میرے لیے حلال کردی گئیں اور میرے لیے تمام روئے زمین کو پاک کرنے والی (آلہ تیمّم) اور مسجد بنادیا گیا ' اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر نبیوں کو ختم کردیا گیا اور حضرت جابر کی روایت میں ہے ہر نبی کو بالخصوص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے ہر کالے اور گورے کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۵۲۳۔۵۲۱ 'سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۵۵۹')
قرآن مجید کی آیات اور اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قیامت تک تمام لوگوں کے لیے رسول بنایا گیا ہے ' اور اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کی شریعت قیامت تک کے لیے ہے ' اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسلام کے سوا اور کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ سو واضح ہوگیا کہ باقی ادیان اپنے اپنے زمانوں کے اعتبار سے کامل تھے ' اور اسلام قیامت تک کے لیے کامل دین ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اسلام کے متعلق فرمایا : کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کامل کردیا۔

یوم میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عید ہونا۔

یہ آیت حجۃ الوداع کے سال یوم عرفہ کو بروز جمعہ نازل ہوئی ' اس کے بعد فرائض سے متعلق کوئی آیت نازل ہوئی ' نہ حلال اور حرام سے متعلق کوئی آیت نازل ہوئی اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف اکیس روز زندہ رہے۔ ابن جریج سے اسی طرح روایت کی گئی ہے۔ (جامع البیان 'جز ٦ ص ۱۰٦ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت '۱۴۱۵ھ)
عمار بن ابی عمار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے ایک یہودی کے سامنے یہ (آیت) "الیوم اکملت لکم دینکم "الایۃ تو اس یہودی نے کہا اگر ہم پر یہ آیت نازل ہوتی تو ہم اس دن تو عید بنا لیتے۔ حضرت عباس نے فرمایا یہ آیت دو عیدوں کے دن نازل ہوئی ہے۔ یوم الجمعہ کو اور یوم عرفہ کو۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۰۵۵)
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کا دن مسلمانوں کی عید ہے اور عرفہ کا دن بھی مسلمانوں کی عید ہے اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی صرف دو عیدیں ہیں ' انھوں نے اس حدیث پر غور نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشہور عیدیں صرف عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں جن کے مخصوص احکام شرعیہ ہیں۔ عید الفطر میں صبح افطار کیا جاتا ہے ' اس کے بعد دو رکعت نماز عید گاہ میں پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد خطبہ پڑھا جاتا ہے اور عید الاضحیٰ میں پہلے نماز اور خطبہ ہے اور اس کے بعد صاحب نصاب پر قربانی کرنا واجب ہے۔ جمعہ کا دن مسلمانوں کے اجتماع کا دن ہے اور اس میں ظہر کے بدلہ میں نماز اور خطبہ فرض کیا گیا ہے ' اور عرفہ کے دن غیر حجاج کے لیے روزہ رکھنے میں بڑی فضیلت ہے اور اس سے دو سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

عید اس دن کو کہتے ہیں جو بار بار لوٹ کر آئے اور شریعت میں عید کا دن یوم الفطر اور یوم النحر (قربانی کا دن) کے ساتھ مخصوص ہے 'اور جبکہ شریعت میں یہ دن خوشی کے لیے بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اس ارشاد میں متنبہ فرمایا ہے یہ کھانے پینے اور ازدواجی عمل کے دن ہیں اور عید کا لفظ ہر اس دن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کوئی خوشی حاصل ہو اور اس پر قرآن مجید کی اس آیت میں دلیل ہے:

(آیت) " قال عیسیٰ ابن مریم اللھم ربنا انزل علینا مآئدۃ من السمآء تکون لنا عیدا الاولینا واخرنا و یۃ منک (المائدۃ: ۱۱۴)

ترجمہ: عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے اللہ ہمارے رب! ہم پر آسمان سے (کھانے کا) خوان نازل فرما 'تاکہ (اس کے نزول کا دن) ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید اور تیری طرف سے نشانی ہو جائے۔ (المفردات ص ۳۵۲ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ 'ایران '۱۳۴۲ھ)

یہ بھی کہ جاسکتا ہے کہ شرعی اور اصطلاحی عید تو صرف عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں اور یوم عرفہ اور یوم عرفا عید ہیں اور جس دن کوئی نعمت اور خوشی حاصل ہو وہ بھی عرفا عید کا دن ہے اور تمام نعمتوں کی اصل سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے۔ سو جس دن یہ عظیم نعمت حاصل ہوئی 'وہ تمام عیدوں سے بڑھ کر عید ہے اور یہ بھی عرفا عید ہے 'شرعا عید نہیں ہے 'اس لیے مسلمان ہمیشہ سے اپنے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کے دن بارہ ربیع الاول کو عید میلاد النبی مناتے ہیں۔

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بارہ ربیع الاول نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یوم ولادت ہے اور بعض اقوال کے مطابق آپ کا یوم وفات بھی یہی ہے۔ تم اس دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت پر خوشی مناتے ہو۔ اس دن آپ کی وفات پر سوگ کیوں نہیں مناتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں نعمت پر خوشی منانے 'اس اظہار اور بیان کرنے کا تو حکم دیا ہے اور کسی نعمت کے چلے جانے پر سوگ منانے سے منع کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم غم اور سوگ کیوں کریں؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس طرح پہلے زندہ تھے 'اب بھی زندہ ہیں۔ پہلے دار التکلیف میں زندہ تھے 'اب دار الجزاء اور جنت میں زندہ ہیں 'آپ پر امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں 'نیک اعمال پر آپ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اور برے اعمال پر آپ امت کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ آپ زائرین کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ طالبین شفاعت کے لیے شفاعت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے مطالعہ اور مشاہدہ میں مستغرق رہتے ہیں اور آپ کے مراتب اور درجات میں ہر آن اور ہر لحظہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں غم کرنے کی کون سی وجہ ہے؟ جبکہ آپ نے خود یہ فرمایا ہے میری حیات بھی تمہارے لیے خیر ہے اور میری ممات بھی تمہارے لیے خیر ہے۔ (الوفاء باحوال المصطفیٰ 'ص ۸۱۰)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں:

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے یوم پیدائش کی عید میلاد منائی 'انکو دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیدائش پر عید میلاد النبی کے نام سے ایک عید بنادی 'اس روز بازاروں میں جلوس نکالنے اور اس میں طرح طرح کی خرافات کو اور رات میں چراغاں کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ جس کی کوئی اصل صحابہ و تابعین اور اسلاف امت کے عمل میں نہیں ملتی۔ (معارف القرآن ج ۳ ص ۳۵ 'مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی '۱۳۹۷ھ)

سید ابوالاعلی مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ نے ایک انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا سب سے پہلے تو آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ اسلام میں عید میلاد النبی کا تصور بھی ہے یا نہیں۔ اس تہوار کو جس کو ھادی اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منسوب کیا جاتا ہے حقیقت

میں اسلامی تہوار ہی نہیں۔اس کا کوئی ثبوت اسلام میں نہیں ملتا ٗحتی کہ صحابہ کرام نے بھی اس دن کو نہیں منایاافسوس ! اس تہوار کو دیوالی اور دسہرہ کی شکل دے دی گئی ہے ٗ لاکھوں روپیہ برباد کیا جاتا ہے۔ (ہفت روزہ قندیل ٗ لاہور ۳ جولائی ۱۹۶۶ء)

عام طور پر شیخ محمد بن عبدالوھاب کے متبعین اور علماء دیوبند یہ تاثر دیتے ہیں کہ بارہ ربیع الاول کو عید میلاد النبی منانا اھل سنت و جماعت کا طریقہ ہے اور ان کی ایجاد و اختراع ہے۔ جیسا کہ مذکور الصدر اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے ٗ لیکن یہ صحیح نہیں ہے ٗ بلکہ ہمیشہ سے اہل اسلام ماہ ربیع الاول میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرتے رہے ہیں ٗ اور ان ایام کو عید مناتے رہے ہیں۔

علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

ہمیشہ سے اہل اسلام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کے مہینہ میں محفلیں منعقد کرتے رہے ہیں اور دعوتیں کرتے رہے ہیں ٗ اور اس مہینہ کی راتوں میں مختلف قسم کے صدقات کرتے ہیں خوشی کا اظہار کرتے ہیں ٗ اور نیک اعمال زیادہ کرتے ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔اس کی برکت سے ان پر فضل عام ظاہر ہوتا ہے۔میلاد شریف منعقد کرنے سے یہ تجربہ کیا گیا ہے ٗ کہ انسان کو اپنا نیک مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے جس نے مولود مبارک کے مہینہ کی راتوں کو عیدیں بنادیا۔ (المواہب اللدنیہ ٗ ج ا ص ۷۸ ٗ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ٗ بیروت ۱۴۱۶ھ)

علامہ احمد قسطلانی نے علامہ محمد بن محمد ابن الجزری متوفی ۸۳۳ھ کی اس عبارت کو ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی مالکی متوفی ۱۱۶۶ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

علامہ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ قرون ثلاثہ میں اس محفل کے انعقاد کا اہتمام نہیں ہوتا تھا ٗ لیکن یہ بدعت حسنہ ہے۔اس عمل میں بعض دنیادار لوگوں نے جو منکرات شامل کر لیے ہیں ٗ علامہ ابن الحاج مالکی نے مدخل میں ان کا رد کیا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ اس مہینہ میں نیکی کے کام زیادہ کرنے چاہئیں اور صدقات ٗ خیرات اور دیگر عبادات کو بکثرت کرنا چاہیے ٗ اور یہی مولود منانے کا مستحسن عمل ہے۔

علامہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اربل کے بادشاہ ملک مظفر ابو سعید متوفی ۶۳۰ھ نے سب سے پہلے میلاد النبی کی محفل منعقد کی۔ یہ بہت بہادر عالم ٗ عاقل ٗ نیک اور صالح بادشاہ تھا ٗ یہ تین سو دینار خرچ کرکے بہت عظیم دعوت کا اہتمام کرتا تھا۔ (المواہب اللدنیہ ٗ ج ا ص ۱۳۹ ٗ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ٗ بیروت ۱۴۱۶ھ)

شرح صحیح مسلم جلد ثالث میں ہم نے بہت تفصیل سے میلاد النبی منانے پر بحث کی ہے اور علامہ سیوطی ٗ ملا علی قاری اور دیگر علماء نے کتاب وسنت سے جو میلاد النبی کی اصل نکالی ہے اور معترضین کے جوابات دیئے ہیں اور اس پر دلائل فراہم کیے ہیں ٗ ان کو تفصیل سے لکھا ہے۔

بعض شہروں میں میلاد النبی کے جلوس میں بعض لوگ باجے گاجے اور غیر شرعی کام کرتے ہیں اور ہمارے علماء ہمیشہ اس سے منع کرتے ہیں۔ تاہم اکثر شہروں میں بالکل پاکیزگی کے ساتھ جلوس نکالا جاتا ہے۔ میں دو مرتبہ برطانیہ گیا اور میں نے وہاں اس مہینہ میں متعدد جلوسوں میں شرکت کی۔ان جلوسوں میں نعت خوانی اور ذکر اذکار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ٗ کوئی غیر شرعی کام نہیں ہوتا اور تمام شرکاء جلوس باجماعت نماز پڑھتے ہیں اور بعد ازاں جلسہ ہوتا ہے ٗ جس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فضائل اور محامد بیان کیے جاتے ہیں۔

پہلے دیوبند اور جماعت اسلامی کے علماء عید میلاد النبی منانے اور جلوس نکالنے پر انکار کرتے تھے ٗ لیکن اب تقریبا پندرہ بیس سال کے عرصہ سے دیوبند اور جماعت اسلامی کے مقتدر علماء میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جلوس نکالنے اور اس میں شرکت کرنے لگے ہیں اور سپاہ صحابہ

کے اکابر علماء حضرت ابوبکر ٬حضرت عمر ٬اور حضرت عثمان کے ایام بھی منانے لگے ہیں۔ان دنوں میں جلوس نکالتے ہیں اور حکومت سے ان

ایام میں سرکاری تعطیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ عید میلادالنبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کارد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہیں قوم کے بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کا یا تخت نشینی کا دن منایا جاتا ہے ٬اور کہیں کسی خاص ملک یا شہر کی فتح اور کسی عظیم تاریخی واقعہ کا جس کا حاصل اشخاص خاص کی عزت افزائی کے سوا کچھ نہیں۔اسلام اشخاص پرستی کا قائل نہیں ہے ٬اس نے ان تمام رسوم جاہلیت اور شخصی یادگاروں کو چھوڑ کر اصول اور مقاصد کی یادگاریں قائم کرنے کا اصول بنادیا ہے۔(معارف القرآن ج ۳ ص ۳۴ ٬مطبوعہ ادارۃالمعارف کراچی ٬۱۳۹۷ھ)

لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ علماء دیوبند کی طرف سے نہ صرف ایام صحابہ منائے جاتے ہیں ٬بلکہ وہ اپنے اکابرین مثلاً شیخ اشرف علی تھانوی اور شیخ شبیر احمد عثمانی کے ایام بھی مناتے ہیں اور دیوبند کا صد سالہ جشن بھی منایا گیا۔ہم پہلے میلادالنبی کے جلسوں اور جلوسوں میں مقتدر علماء دیوبند کی شرکت کو باحوالہ بیان کریں گے۔پھر ایام صحابہ اور ایام اکابرین دیوبند کو ان حضرات کا منانا بیان کریں گے۔جماعت اسلامی کا ترجمان روزنامہ جسارت لکھتا ہے:

پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے کہا ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کے بعد قومی اتحاد نے وہ مثبت مقصد حاصل کرلیا ہے جس کے لیے اس نے ان تھک اور مسلسل تحریک چلائی تھی۔وہ آج یہاں مسجد نیلا گنبد پر نماز ظہر کے بعد قومی اتحاد کے زیراہتمام عید میلادالنبی کے عظیم الشان جلوس کے شرکاء سے خطاب کررہے تھے۔اس موقع پر قومی اتحاد کے نائب صدر نوابزادہ نصراللہ خان ٬امیر جماعت اسلامی پاکستان میں محمد طفیل ٬وفاقی وزیر قدرتی وسائل چودھری رحمت الٰہی اور مسلم لیگ چٹھہ گروپ کے سیکرٹری جنرل ملک محمد قاسم نے بھی خطاب کیا۔تقریروں کے بعد مفتی محمود اور دیگر رہنماؤں نے مسجد نیلا گنبد میں ہی نماز عصر ادا کی ٬جس کے بعد ان رہنماؤں کی قیادت میں یہ عظیم الشان جلوس مختلف راستوں سے مسجد شہداء پہنچ کر ختم ہوا ٬جہاں شرکاء جلوس نے مولانا مفتی محمود کی قیادت میں نماز مغرب ادا کی۔(روزنامہ جسارت ۱۱فروری۱۹۷۹ء)

جماعت اسلامی اور دیوبندی ارکان پر مشتمل قومی اتحاد کی حکومت کے دور میں عید میلادالنبی کے موقع پر روزنامہ جنگ کی ایک خبر کی سرخیاں ملاحظہ فرمایئے۔

جشن عید میلادالنبی آج جوش وخروش سے منایا جائے گا ٬تقریبات کا آغاز ۲۱ توپوں کی سلامی سے ہوگا ٬گورنر کی صدارت میں جلسہ ہوگا ٬شہر بھر میں جلوس نکالے جائیں گے ٬نشتر پارک آرام باغ اور دیگر علاقوں میں جلسے ہوں گے۔(روزنامہ جنگ ٬کراچی ٬۹فروری۱۹۷۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا (ہے)

سورۃ بقر،احکامات الٰہی،کا خلاصہ تھا جس سے عقائد کی اصلاح،حسن عمل کی تعلیم اس انداز سے دی گئی کہ انسان،حیوانیت کی کیفیات سے نکلے۔اور شاہراہ ایمان پر آجائے۔پھر سورۃ ال عمران میں توحید باری تعالیٰ کا بیان ہوا تثلیث کی گمراہیوں سے آگاہ کرکے توحید کی لذتوں سے آشنا کیا گیا۔سورۃ نساء میں معاشرت کے اصول سکھائے گئے،معاملات کا ذکر ہوا تاکہ حقوق کی حفاظت،ترکہ وراثت کے قاعدے،یتیموں کی نگہداشت کے آداب سے سیرت مومن مزین ہوجائے۔یہ پہلی منزل تھی۔

اب دوسری منزل کے پہلے ہی سورۃ میں مرد مومن کے لیے گویا نعمت کے دستر خوان سجائے جارہے ہیں جس میں جسمانی، ذہنی اور روحانی غذاؤں کی فراوانی ہے۔اس نعمت کدہ سے فیضیاب ہونے کے ضوابط مرتب کیے جارہے ہیں۔ پہلا ہی قاعدہ یہ بتایا جارہا ہے کہ ایمان والو، جو عہد کرو پورا کرو۔ جو اقرار کرتے جاؤ پورا کرتے جاؤ۔ خواہ یہ تمہارا اقرار اپنے رب سے ہو یا اس کے بندوں سے تاکہ تمہاری زندگی پاک سے پاک تر ہوتی جائے۔ دوسری تعلیم حلال وطیب پر نظر رکھنے کی ہے تاکہ تمہارا باطن منور ہوتا جائے۔ یہ سورۃ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے دل کی آنکھیں کھول دے۔ یہی وہ بابرکت سورۃ جس میں "الیوم اکملت لکم دینکم "کا مژدہ سنایا گیا۔ جس نے حج وداع میں مومنین کی آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے پر نم کر دیں، جس نے ان کے نورانی چہروں کو منور سے منور تر کر دیا۔ سچ ہے کہ جب اللہ عنایات کے دستر خوان سجاتا ہے تو تکمیل نعمت سے محروم نہیں رکھتا۔ یہی اس کی شان ربوبیت ہے۔

غرض یہ سورۃ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان اصولوں کی طرف جن کا بیان اجمالاً گزر چکا ہے مرد مومن کی توجہ مبذول کرتا اور جستہ جستہ ان کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ منشا یہ ہے کہ انسان اور بالخصوص مومن خواہش اور نفسانیت سے نکل کر امر پر آجائے۔ جو کہا گیا وہ کرتا جائے جس سے منع کیا گیا اس سے رک جائے تاکہ ابدی زندگی کی ابدی نعمتیں اس کا حصہ ہوں اور دنیا کی کوئی لذت، کوئی طاقت، اس کی فطرت بیدار کو غفلت اور جہالت میں مبتلا نہ کر سکے۔ قرآن اس کے لیے تمام کتب سماویہ کی تعلیمات کا خزانہ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مقدسہ رحمت الٰہی کا منبع رہے۔ آپ کی عطا کردہ شریعت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے اور نصرت الٰہی اس کی معاون ہو۔ اور مالک ارض وسماء کی قدرت کا تماشہ دیکھنے والا، جب اپنے رب کے پاس واپس جائے تو اس کو ان بزرگ ہستیوں کی زیادرت کا شرف حاصل ہو جنہیں (رض) ورضواعنہ کے خطاب سے نوازا گیا جو اس نعمت کے اولین حق دار بنے۔ (فیوض)

اس کا نزول صلح حدیبیہ کے وقت سے شروع ہوا اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس کا اختتام ہوا

یہ چند سال اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مدینہ کے افق پر خطرات کے جو سیاہ بادل ہر وقت منڈلایا کرتے تھے وہ آہستہ آہستہ ناپید ہو رہے تھے۔ کفار پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی تھی کہ اسلام ایک قوت ہے اس کو مٹانا اب ان کے بس کی بات نہیں۔ یہودیوں کا زور بھی اب ٹوٹ چکا تھا۔ مدینہ اور اس کے گردونواح میں ان کی سب بستیاں گڑھیاں اور قلعے مسلمانوں کے تصرف میں تھے۔ غرضیکہ مظلومیت کی طویل اور تاریک رات اب ختم ہو رہی تھی اور آفتاب اقبال طلوع ہو رہا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو کیا ہدایات فرمائیں۔

1۔ اس سورۃ کا آغاز تربیت اخلاق سے ہو رہا ہے اس لیے پہلے اسی عنوان پر غور کریں۔ اس سورۃ میں مختلف اقسام کے اخلاقی سبق دیئے گئے ہیں جن کا تعلق جس طرح ایک قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے اسی طرح ان کا تعلق بین الاقوامی معاملات اور تعلقات سے بھی ہے۔ سب سے پہلے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جو وعدہ کرو اس کو پورا کرو۔ خواہ یہ وعدہ نجی کاروبار کے متعلق ہو اپنے حلیفوں سے ہو یا حریفوں سے ہو اور خواہ اپنے رب ذوالمجد والعلی سے ہو۔ آج کل کی متمدن قومیں یہ درست ہے کہ اپنے انفرادی وعدوں کی کسی تک پابندی کرتی ہیں لیکن سیاسی زندگی میں اپنے وعدوں کی جو مٹی پلید کرتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ مسلمانوں کا رب انھیں حکم دیتا ہے کہ جو وعدہ کرو اسے پورا کرو خراہ وہ وعدہ حدیبیہ کے میدان میں دشمنان اسلام سے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔

اب جب قوت واقتدار مسلمانوں کے پاس آرہا ہے تو ان کو صاف صاف اور کئی کئی بار حکم دیا کہ جب قضا کی کرسی پر بیٹھو تو یاد رہے عدل وانصاف تمہارا شعار ہو۔ فریق مقدمہ تمہارا دشمن ذاتی نہیں بلکہ دینی دشمن ہی کیوں نہ ہو عدل کا دامن تمہارے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ نیز فرمایا کہ اقوام عالم سے تمہارے تعلقات کی بنیاد یہ ہو کہ نیکی اور بھلائی کے ہر کام میں انھیں تمہاری معاونت حاصل ہو اور گناہ ظلم کے کسی کام میں تم ان سے اشتراک نہ کرو۔ فرزندان آدم کا قصہ بیان کرکے بتایا کہ حسد بہت بری چیز ہے اس نے بھائی کو بھائی کا قاتل بنادیا تم اس مذموم خصلت سے احتراز کرنا۔

2۔ آسمانی کتابیں:۔ دوسری اہم چیز جس کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ توراۃ، انجیل اور قرآن الگ الگ نظریات کے علم بردار نہیں بلکہ یہ تینوں نہریں ایک ہی سرچشمہ فیض سے پھوٹی ہیں۔ توراۃ کے متعلق فرمایا کہ فیھاھدی ونور۔ انجیل کے متعلق بھی بعینہٖ یہی الفاظ فرمائے کہ فیہ ھدی ونور اور قرآن کے متعلق تو بار بار یہی فرمایا گیا۔ معلوم ہوا سب میں ہدایت ہے سب میں نور ہے۔ اور ہر ایک کتاب میں اپنے زمانہ کے مطابق شریعت کا مکمل ترین نظام اور اخلاقیات و معاملات کا واضح ضابطہ موجود تھا۔ اور ان سب کا جامع اور ان تمام بلند اخلاقی قدروں کا نقیب، محافظ اور نگہبان قرآن مجید ہے۔

3۔ حاملان قرآن کو تنبیہ فرمادی کہ دیکھو! ہدایت ونور یہود کے پاس بھی آیا اور نصاریٰ کے پاس بھی۔ لیکن انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اے غلامان مصطفیٰ! اب وہی ہدایت ونور اپنی پوری آب وتاب اور شوکت وجلال سے تمہارے مطلع حیات پر نمودار ہو رہا ہے۔ اور تمہیں اس سے استفادہ کا موقع دیا جارہا ہے کہیں تم بھی اپنے پیش رووں کی طرح اپنی خواہشات اور خود ساختہ مصلحتوں کی قربان گاہ پر اسے بھینٹ نہ چڑھادینا۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی پوری پوری تعمیل کرنا۔ کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے مطابق فیصلے کرتا ہے وہ منکر حق ہے۔ وہ نافرمان ہے وہ اپنے پر ظلم کرنے والا ہے۔ نیز فرمایا کہ یہود ونصارے خود تو بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں بھی جادہ حق سے بہلانے پھسلانے کی انتہائی کوشش کریں گے۔ خبردار! ہوشیار! ان کے دام فریب میں نہ پھنس جانا۔ واحذران ان یفتنوک عن بعض ماانزل اللہ الیک۔

معلوم ہوتا ہے اہل حق کو حق سے برگشتہ کرنے کی جو کوشش اس وقت شروع ہوئی تھی وہ بدستور جاری ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ تندی اور تیزی سے۔ اور اسی تحریک کے پیدا کردہ وہ وسوسے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی مملکتوں کے سربراہ اسلامی قانون کو اپنانے سے ہراساں ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ جس طرح پوری یک جہتی کے ساتھ ایک بار اللہ اکبر کہہ کر ہم نے ان فرنگی آقاؤں کی ظاہری غلامی کے زنجیر توڑے ہیں۔ بس ایک بار اور جی کڑا کرکے اللہ اکبر کہیں اور ذہنی غلامی کا طلسم بھی توڑ کر رکھ دیں۔ قوت یقین اور ذوق عمل کا ایک معجزہ چند سال ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اقوام عالم کو دکھایا ہے۔ فقط ایک اور معجزہ نمائی کی ضرورت ہے۔ وادی ایمن سے تو اب بھی یہ آواز دمادم آرہی ہے۔ لاتخف انک انت الاعلی۔ گھبرا نہیں تو ہی سرفراز وکامیاب ہے اور الق مافی یمینک کا حکم مل رہا ہے لیکن ہم ہیں کہ ساحر فرنگ کی شعبدہ بازیوں سے دم بخود ہوئے بیٹھے ہیں۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون (کیا تم جاہلیت کے قانون پر عمل کرنا چاہتے ہو؟) کی توبیخ سے یہ بتایا کہ اگر تمہاری غفلت کے باعث حق کا چراغ گل ہوگیا تو پھر " جاہلیت "کا اندھیرا چھا جائے گا۔ اور " جاہلیت "خواہ اس کے چہرہ کو علم وفن کی مشاطگی نے کسی دل آرام کی طرح بہت ہی دلکش ودلفریب بنادیا ہو۔ اس کی روح ظالم ہے اس کی فطرت بے رحم ہے وہ تمہاری ساری عزیز قدروں اور عقائد کو کچل دے گی روند ڈالے گی بلکہ خود تم سے روندوا ڈالے گی۔

4۔ قرآن جو شریعت لے کر آیا اس کی کئی جزئیات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ حج کے آداب۔ شعائر اللہ کی تعظیم، کرنے والوں اور چوری کرنے والوں کے لیے عبرتناک سزائیں وغیرہ۔ جن کا تفصیلی تذکرہ اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

5۔ لات و ہبل کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ان کے اپنے ماننے والے ان سے بد ظن ہو چکے تھے۔ اب صرف اتنی ہی دیر تھی کہ کوئی دھکا دے اور وہ دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر پڑیں۔ لیکن شرک کی ایک اور قسم دنیا کے ایک وسیع حصہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی یعنی عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث۔ جس کی اشاعت کے لیے شاہی خزانوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ جس کی حفاظت کے لیے بیشمار تلواریں بے نیام تھیں۔ اور جب کبھی کسی فکری بحران نے اسے دود چراغ محفل بنانا چاہا تو علماء فلسفہ یونان وروما کا حجاب اکبر تان کر کھڑے ہو جاتے۔ قرآن نے اس عقیدہ کا پہلے بھی محاسبہ کیا ہے۔ اور یہاں بھی بڑی بے تکلفی اور فطری سادگی سے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) خدا نہیں ہو سکتا۔ جو ماں کے شکم سے پیدا ہو۔ جو اپنی بقاکے لیے کھانے پینے کا محتاج ہو وہ بندہ ہو سکتا ہے مقبول ترین بندہ، محبوب ترین بندہ، لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ اور روز قیامت پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح کی زبانی توحید خالص کا اعلان کرا دیا۔

6۔ اس سورۃ کا طرہ امتیاز وہ آیت کریمہ ہے جو بتاریخ 9۔ ذی الحجہ 10ھ میدان عرفات میں رحمت عالمیاں، پیکر ہدایت، نور مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ دین کی تکمیل کا اعلان! اتمام نعمت کا مژدہ! اللہ اللہ! بلال (رض) کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہوں گی۔ ابوبکر (رض) کی جبین نیاز سجدہ میں جھک گئی ہو گی۔ عمر و عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چہرے فرط مسرت سے رشک مہ تاباں بن گئے ہوں گے اور حمزہ (رض) یاسر (رض) سمیہ (رض) اور خباب (رض) اپنے اپنے مزارات پرانوار میں رب ذوالجلال کی حمد وثنا معلوم نہیں کوثر و سلسبیل سے دھلے ہوئے کن نورانی کلمات سے کرنے لگے ہوں گے (رض) کائنات کا ذرہ ذرہ جھوم اٹھا ہوگا۔ اللہ رب السموات والارض کی ساری نوری مخلوقات اس کے حبیب، اس کے رسول، اس کے صفی اور اس کے "عبدہ" محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ سلم پر درود وسلام کے پھول نثار کر رہی ہو گی۔ (ضیاء)

فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین بجاہ سیدی ومولائی وحبیبی محمد الامین والہ الطیبین امین امین یارب العالمین۔

آیت مبارکہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

لغۃ القرآن: [يَسْـَٔلُوْنَكَ : وہ آپ سے پوچھتے ہیں][مَاذَآ : کیا چیز][اُحِلَّ : حلال کی گئی][لَهُمْ : ان کے لیے][قُلْ : فرما دیجیے][اُحِلَّ : حلال کی گئیں][لَكُمُ :

تمہارے لیے][الطَّيِّبٰتُ ۙ: پاکیزہ چیزیں][وَمَا : اور جو][عَلَّمْتُمْ : تم نے سدھائے][مِّنَ : سے][الْجَوَارِحِ : شکاری جانور][مُكَلِّبِيْنَ : شکار کرنے والے][تُعَلِّمُوْنَهُنَّ : تم ان کو سکھاتے ہو][مِمَّا : اس سے جو][عَلَّمَكُمُ : سکھلایا تمہیں][اللّٰهُ ۡ: اللہ][فَكُلُوْا : تو تم کھاؤ][مِمَّآ : اس سے جو][اَمْسَكْنَ : وہ روکیں][عَلَيْكُمْ : تم پر][وَاذْكُرُوا : اور ذکر کرو][اسْمَ : نام][اللّٰهِ : اللہ کا][عَلَيْهِ ۠: اس پر][وَاتَّقُوا اللّٰهَ :: اور اللہ سے ڈرو] [اِنَّ : یقیناً] اللّٰهَ : اللہ][سَرِيْعُ : جلد][الْحِسَابِ : حساب لینے والا ہے [

ترجمہ: لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں، آپ (ان سے) فرمادیں کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور وہ شکاری جانور جنہیں تم نے شکار پر دوڑاتے ہوئے یوں سدھار لیا ہے کہ تم انھیں (شکار کے وہ طریقے) سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھائے ہیں، سو تم اس (شکار) میں سے (بھی) کھاؤ جو وہ (شکاری جانور) تمہارے لیے (مار کر) روک رکھیں اور (شکار پر چھوڑتے وقت) اس (شکاری جانور) پر اللہ کا نام لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ حساب میں جلدی فرمانے والا ہے

تشریح:

شان نزول

یہ آیت عدی ابن حاتم اور زید بن مہلہل کے حق میں نازل ہوئی جن کا نام رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زید الخیر رکھا تھا، ان دونوں صاحبوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم لوگ کتّے اور باز کے ذریعہ سے شکار کرتے ہیں تو کیا ہمارے لیے حلال ہے تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

سابقہ آیات میں حرام کی ایک فہرست پڑھی گئی ہے اس لیے سوال پیدا ہوا کہ یہ چیزیں تو حرام ہیں لیکن حلال کونسی ہیں؟ اس کے بارے میں وضاحت نازل ہوئی کہ تمہارے لیے ہر طیب چیز حلال کر دی گئی ہے۔ سابقہ مذاہب میں یہ تھا کہ جو چیزیں ان کے مذہب میں حلال تھیں ان کے سوا باقی سب حرام تھا۔ دین اسلام نے اس کے خلاف فارمولا پیش فرمایا کہ حرام کے علاوہ تمام چیزیں اس شرط پر حلال ہیں کہ وہ پاک ہوں۔ پاک کے بارے میں اہل علم نے وضاحت کی ہے کہ جو شریعت کے کسی اصول کے تحت حرام نہ ہوں اور اسے فطرت سلیم کھانا پسند کرے۔ وہ جانور بھی حلال ہو گا جو شکاری کتے کے ذریعے شکار کیا گیا ہو۔ جسے تم نے سدھایا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سدھانے سے یہاں مراد شکار کرنے کے اصول و ضوابط ہیں۔ جس کی تین بنیادی شرائط ہیں۔

۱۔ کتا یا باز سدھایا ہوا ہو۔ جس کی فقہاء نے یہ صفت بیان کی ہے کہ جب اسے شکار پر چھوڑا جائے تو وہ شکار کرے اور جب اسے روکا جائے تو رک جائے۔ یہاں تک کہ اگر وہ شکار پکڑنے کے لیے دوڑے یا اڑے۔ مالک اسے رک جانے کا اشارہ دے تو وہ واپس آ جائے۔

۲۔ شکار خود کھانے کی بجائے مالک کے لیے شکار کرے اگر اس نے اس میں خود کھالیا تو وہ سدھایا ہوا تصور نہیں ہوگا اور نہ اس کا کیا ہوا شکار حلال ہوگا۔

۳۔ اسے چھوڑتے وقت "بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر "پڑھا گیا ہو۔ اس صورت میں شکار مر جائے تو پھر بھی حلال تصور ہوگا۔ یہی حکم بندوق سے شکار کرنے کا ہے۔

اس بات سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس کتے کے ایک دفعہ برتن چاٹنے سے اسے ایک دفعہ مٹی کے ساتھ اور چھ مرتبہ پانی کے ساتھ دھونا پڑتا ہے۔ صرف علم کی بنیاد پر وہ اپنی نسل سے اس قدر ممتاز ہوا کہ اس کے ہاتھوں مرا ہوا جانور بھی حلال قرار پایا ہے۔ آیت کے آخر میں "واتقواللّٰہ اور سریع الحساب "کے الفاظ استعمال فرما کر شکار کرنے والوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شکار ان شرائط پر پورا نہ اترے اور تم گوشت خوری کے شوق میں یونہی نوش کر جاؤ۔ ایسا کرنا حرام اور اللہ تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی۔ لہٰذا یاد رکھو اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔ اس سے ڈرتے رہو واتقواللّٰہ کا یہ مفہوم بھی اخذ کیا گیا ہے کہ شکار کے جنون میں آکر فرض نمازوں سے غافل نہ ہونا جیسا کہ عام شکاری سارا دن شکار کے پیچھے دوڑتے ہوئے نماز کا خیال نہیں کرتے۔

(عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ وَسَمَّيْتَ فَأَمْسَكَ وَقَتَلَ فَكُلْ وَإِنْ أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلَى نَفْسِهِ وَإِذَا خَالَطَ كِلَابًا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهَا فَأَمْسَكْنَ وَقَتَلْنَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي أَيُّهَا قَتَلَ وَإِنْ رَمَيْتَ الصَّيْدَ فَوَجَدْتَهُ بَعْدَ يَوْمٍ أَوْ يَوْمَيْنِ لَيْسَ بِهِ إِلَّا أَثَرُ سَهْمِكَ فَكُلْ وَإِنْ وَقَعَ فِي الْمَاءِ فَلَا تَأْكُلْ)

"حضرت عدی بن حاتم (رض) نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ذکر کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تو اللہ کا نام لے کر کتا شکار کے لیے چھوڑے تو وہ شکار کرکے تیرے لیے پکڑے رکھے تو اس کو کھالو۔ اگر وہ کتا اس کو تھوڑا بہت کھالے تو پھر نہ کھانا۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے شکار کیا ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی اور کتا شامل ہو جائے جس کو اللہ کا نام لے کر نہیں چھوڑا گیا اور وہ دونوں شکار کریں تو اس سے نہ کھانا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کس نے شکار کیا ہے۔ اگر تم تیر کے ساتھ شکار کرو اور تم اپنے شکار کو ایک یا دو دن بعد پاؤ (بشرطیکہ وہ کھانے کے قابل ہو) تو اگر اس پر صرف تیرے ہی تیر کا نشان ہے تو اس کو کھالو اور اگر وہ پانی میں گر گیا ہو تو پھر نہ کھانا۔ " [رواہ البخاری : کتاب الذبائح،] (فہم)

اسلام میں شکار کا طریقہ

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب دیا گیا ہے۔ سوال اختصار سے اور جواب وضاحت کے ساتھ ہے۔ یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے کہ وہ عموماً سوال ذکر ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو نہایت اختصار سے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ صحابہ (رض) اس قدر مزاج شناس قرآن اور مزاج شناس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہو چکے تھے کہ انھیں قرآن اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سمجھنے میں بہت کم دشواری پیش آتی

تھی۔اس لیے پورے قرآن پاک میں صحابہ کی طرف سے جو سوال ہوئے ہیں ' وہ کل نو ہیں۔ تیئس سالوں کے عرصے میں مجموعی طور پر جو سوالات ہوئے ہیں 'ان کی تعداد غالباً سترہ ہے۔ جس طرح آدمی کسی چیز کا مزاج آشنا ہو جاتا ہے اور وہ چیز اسے فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے ' بالکل اسی طرح صحابہ رضوان اللہ اجمعین مزاج شناس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی تھے اور مزاج شناس قرآن بھی۔ لیکن جب کہیں بات الجھتی تھی چونکہ معاملہ آخرت کا تھا 'اس لیے پوچھ بھی لیتے تھے۔ یہاں یہ بات الجھی کہ یہ جو کہا گیا کہ جس کو درندہ کھا لے اور وہ مر جائے تو حلال نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ تمہارے قابو میں آ جائے تو پھر تم ذبح کر کے اسے پاک کر سکتے ہو۔ اس سے سوال پیدا ہوا کہ اگر درندے کے زخمی کرنے سے وہ جانور مر جائے تو وہ حرام ہے تو کیا درندے کے ذریعے شکار کرنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ عربوں کی زندگی کے گذر بسر کا دارومدار تین باتوں پر تھا۔ ایک تجارت ' دوسرا گلہ بانی اور تیسرا شکار۔ ان کا شکار ہمارے ہاں کے جاگیر دار اور زمیندار کا سا نہیں تھا ' جنھیں کچھ اور نہیں سوجھتا تو شکار کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ عربوں کا تو یہ حال تھا کہ ان کی تو غذائی ضرورت ہی ایک حد تک شکار سے پوری ہوتی تھی۔

عدی بن حاتم طائی جب مسلمان ہوئے تو وہ بڑے شکاری تھے اور نجد کے علاقے میں شکار ہوتا بھی زیادہ تھا 'اس لیے ان کی گزر بسر کا بہت بڑا ذریعہ شکار تھا انھوں نے یہ سوال کیا کہ حضور! میں کتے کے ذریعے شکار کرتا ہوں اور کتا ایک درندہ ہے۔ جب وہ شکار پکڑے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ زندہ ہی میرے پاس لے آئے۔ جو جانور اس نے پکڑا ہے اگرچہ اپنی ذات میں وہ حلال ہے 'مگر اس کے پکڑنے سے اگر وہ مر گیا تو وہ اس آیت کے حوالے سے تو حرام ہو جائے گا؟ سوال تو صرف اتنا ہی تھا 'لیکن قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ اس سے ایک بوند مانگی جاتی ہے تو وہ بارش برسا دیتا ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ کتے کے ذریعے کیے جانے والے شکار کے بارے میں وضاحت ہو جائے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے شکار کے حوالے سے ساری اصولی باتیں بیان فرما دیں بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ ساتھ یہ بھی جان لو کہ حلال اور حرام کی بنیاد کیا ہے؟ کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھیں مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے 'انھیں تو جانے دیجئے۔ لیکن کچھ لوگ وہ ہیں جو مذہب کے بہت مخلص پیروکار ہیں لیکن ان کے گہرے تقشف کے باعث ان میں ایک خاص مزاج پروان (Develop) چڑھتا ہے 'ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب تک ان کو بتا نہ دیا جائے کہ شریعت نے اس چیز کو حلال کیا ہے ' وہ اس وقت تک وہم کا شکار رہتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ حلال ہے یا حرام۔ یعنی ان کی فکری بنیاد دراصل انھیں یہود سے ملی ہے 'جنھوں نے اپنی شریعت میں بہت پابندیاں لگا لی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر چیز حرام ہے 'بجز اس کے جسے شریعت نے حلال قرار دے دیا یعنی جب تک کسی چیز کے حلال ہونے کی سند ہمارے پاس نہیں ہے ' وہ چیز حرام ہے۔ قرآن کریم نے اس صورت حال کو بالکل بدل ڈالا اور یہی وجہ ہے کہ قیامت تک یہ دین چل سکتا ہے۔ فرمایا: لوگو! تمہارے لیے ہر چیز حلال ہے 'سوائے اس کے جسے اللہ نے حرام کر دیا۔ تم ڈھونڈتے ہو حلال کیا ہے حالانکہ تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حرام کیا ہے۔ البتہ! حلت کی چند شرطیں ہیں۔ اللہ نے چونکہ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے یہ دیکھو کہ وہ چیز طیب اور پاکیزہ ہے یا نہیں 'اگر وہ چیز طیب اور پاکیزہ ہے تو سمجھ لو کہ وہ حلال ہے اور اس میں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن اور حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے یا نہیں 'صرف اسے طیب ہونا چاہیے۔ جتنی چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں ' وہ ساری طیب ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ جانور ایسا نہیں ہونا چاہیے جس جانور کی شکل پر لوگوں کی شکلیں تبدیل یعنی بگاڑ دی گئیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب قوموں پر عذاب آیا تو بعض قوموں کے چہرے بگاڑ کے بعض جانوروں کی شکلوں جیسے بنا دیئے گئے ' یہ جانور مستقلاً حرام ہیں۔ مثلاً یہود کے ایک گروہ پر عذاب آیا

وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ

(انھیں اللہ نے بندروں اور خنزیروں کی شکل میں بدل دیا)
اس لیے سور اور بندر سارے حرام ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ جانور جو خود شکار کرتے ہیں اور گوشت کھاتے ہیں یعنی تمام کچلیوں والے جانور ،جنھیں ہم درندہ کہتے ہیں ،حرام ہیں۔اس طرح وہ سارے جانور جو پنجے رکھتے ہیں اور پنجوں کے ذریعے شکار پکڑتے ہیں ،جیسے باز ،عقاب اور شکرا وغیرہ سب حرام ہیں۔اسی طرح تمام مردار خور جانور حرام ہیں کیونکہ ان کی فطرت میں پاکیزگی کہاں رہ سکتی ہے ؟اس طرح وہ عام جانور جو زمین کھود کھود کر گندگی کھاتے ہیں ،حرام ہیں اور ہر وہ جانور جسے انسان کی فطرت سلیمہ قبول کرنے سے انکار کردے ،حرام ہے۔ایسی فطرت جو شریعت الٰہی کے مطابق عمل کرنے کی وجہ سے خاص قالب میں ڈھل جاتی ہے ،اس کا ایک مزاج بن جاتا ہے ،آپ اس کے سامنے کوئی ایسی چیز لائیں گے جو حرام کے قریب ہے تو وہ اس سے گھن کھائے گا ،اس کو وہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ اس طبیعت کی بات نہیں ہے جو شراب پی پی کر اپنا سب کچھ بگاڑ چکی ہے ،اسے تو چاۓ بری لگے گی شراب اچھی لگے گی۔ بات فطرت سلیمہ کی ہو رہی ہے اور فطرت سلیمہ کی نمائندہ شخصیات چونکہ دنیا میں اللہ کے نبی ہوتے ہیں ،وہ چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لیے جس چیز سے انھوں نے طبعاً اپنے آپ کو کھانے سے روکا ہے ،انسان کو اس سے رک جانا چاہیے ،

آیت کا خلاصہ

آیت سے جو معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے کتا یا شکرہ وغیرہ کوئی شکاری جانور شکار پر چھوڑا تو اس کا شکار چند شرطوں سے حلال ہے۔

(1)۔۔شکاری جانور مسلمان یا کتابی کا ہو اور سکھایا ہوا ہو۔

(2)۔۔اس نے شکار کو زخم لگا کر مارا ہو۔

(3)۔۔شکاری جانور بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ کہہ کر چھوڑا گیا ہو۔

(4)۔۔اگر شکاری کے پاس شکار زندہ پہنچا ہو تو اس کو بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ کہہ کر ذبح کرے اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی گئی تو حلال نہ ہوگا۔ مثلاً اگر شکاری جانور مُعَلَّم (یعنی سکھایا ہوا) نہ ہو یا اس نے زخم نہ کیا ہو یا شکار پر چھوڑتے وقت جان بوجھ کر بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ نہ پڑھا ہو یا شکار زندہ پہنچا ہو اور اس کو ذبح نہ کیا ہو یا مُعَلَّم (یعنی سکھائے ہوئے جانور) کے ساتھ غیر مُعَلَّم (یعنی نہ سکھایا ہوا جانور) شکار میں شریک ہو گیا ہو یا ایسا شکاری جانور شریک ہو گیا ہو جس کو چھوڑتے وقت بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ نہ پڑھا گیا ہو یا وہ شکاری جانور مجوسی کافر کا ہو، ان سب صورتوں میں وہ شکار حرام ہے۔

شکار کے دوسرے طریقے کا شرعی حکم

تیر سے شکار کرنے کا بھی یہی حکم ہے اگر بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ کہہ کر تیر مارا اور اس سے شکار مجروح (یعنی زخمی) ہو کر مر گیا تو حلال ہے اور اگر نہ مرا تو دوبارہ اس کو بِسْمِ اللہِ اللہُ اَکْبَرْ پڑھ کر ذبح کرے اگر اس پر بِسْمِ اللہْ نہ پڑھی یا تیر کا زخم اس کو نہ لگا یا زندہ پانے کے بعد اس کو ذبح نہ کیا ان سب صورتوں میں حرام ہے۔

نوٹ : شکار کے مسائل کی مزید تفصیل کیلئے بہار شریعت حصہ 17 کا مطالعہ فرمائیں۔

فوائد و مسائل

۱۔ تمام پاک و صاف چیزیں حلال ہیں۔
۲۔ سدھائے ہوئے جانور کا شکار حلال ہے۔
۳۔ شکار کرتے ہوئے بھی بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنا ضروری ہے۔
۴۔ اللہ تعالٰی کے احتساب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔
5 : یعنی کونسے جانور حلال ہیں جن کو شکار کرکے کھایا جاوے، خیال رہے کہ دریائی جانور سب حرام سوائے مچھلی کے خشکی کے بے خون والے جانور سب حرام سوائے مکڑی کے، خون والے چرندے کیل والے حرام ہیں، پرندے شکاری پنجہ والے حرام ہیں۔ طیبات سے مراد حلال چیزیں ہیں۔
6 : اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز شریعت حرام نہ کرے وہ حلال ہے۔ نیز لذیذ چیزیں چھوڑنا تقوی نہیں، حرام سے بچنا تقوی ہے نہ کہ حلال کو حرام کرلینا۔
7 : خواہ درندہ ہو جیسے کتا اور چیتا یا شکاری پرندہ جیسے شکرہ، باز، شاہین وغیرہ، جب وہ ایسے سدھائے جائیں کہ کتا اور چیتا تو بغیر دیئے ہوئے اس کا گوشت نہ کھائیں اور باز اور شکرہ اشارہ پر لوٹ آئیں اس سے معلوم ہوا کہ بلی کی ماری ہوئی مرغی حرام ہے۔
8 : یعنی تمہارے سدھائے ہوئے شکار کتے جب شکار کرکے لاویں اور اس میں کچھ نہ کھائیں تو اگرچہ جانور مر گیا ہو، حلال ہے بشرطیکہ انہیں چھوڑتے وقت بسم اللہ اکبر پڑھ لیا ہو اور اگر کتے نے کچھ کھالیا ہو تو حرام ہے کہ یہ اس نے اپنے لیے شکار کیا۔ تمہارے لیے نہ کیا۔
9 : یعنی ان شکار جانوروں کو چھوڑتے وقت بسم اللہ۔اللہ اکبر پڑھ دیا کرو۔
10 : کہ چند گھنٹوں میں ساری مخلوق کا حساب لے لے گا۔ قیامت کا باقی وقت شان مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اظہار میں گزرے گا۔

آیت مبارکہ:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ۧ

لغۃ القرآن: [اَلْيَوْمَ : آج][اُحِلَّ : حلال کردی گئیں][لَكُمُ : تمہارے لیے][الطَّيِّبٰتُ: پاکیزہ چیزیں][وَطَعَامُ : اور کھانا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اُوْتُوا : دیے گئے][الْكِتٰبَ : کتاب][حِلٌّ لَّكُمْ ۠: حلال ہے تمہارے لیے][وَطَعَامُكُمْ : اور تمہاراکھانا][حِلٌّ: حلال ہے][لَّهُمْ ۡ: ان کے لیے][وَالْمُحْصَنٰتُ : اور پاکباز][مِنَ : سے][الْمُؤْمِنٰتِ : مومنات][وَالْمُحْصَنٰتُ : اور پاکباز][مِنَ : سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اُوْتُوا : دیے گئے][الْكِتٰبَ : کتاب][مِنْ : سے][قَبْلِكُمْ : پہلے تم][اِذَآ : جب][اٰتَيْتُمُوْهُنَّ : تم ان کو دو][اُجُوْرَهُنَّ : ان کے مہر][مُحْصِنِيْنَ : نکاح میں لانے والے][غَيْرَ : علاوہ][مُسٰفِحِيْنَ : بدکاری کرنے والے][وَلَا مُتَّخِذِيْٓ: اور نہ بنانے والے][اَخْدَانٍ: خفیہ آشنائی][وَمَنْ : اور جو][يَّكْفُرْ : انکار کرے گا][بِالْاِيْمَانِ : ایمان کا][فَقَدْ : تو یقینا][حَبِطَ : ضائع ہوگیا][عَمَلُهٗ ۡ: اس کا عمل][وَهُوَ : اور وہ][فِي : میں][الْاٰخِرَةِ : آخرت][مِنَ : سے][الْخٰسِرِيْنَ : نقصان پانے والے]

ترجمہ: آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں، اور ان لوگوں کا ذبیحہ (بھی) جنھیں (اِلہامی) کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے، اور (اسی طرح) پاک دامن مسلمان عورتیں اور ان لوگوں میں سے پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (تمہارے لیے حلال ہیں) جب کہ تم انھیں ان کے مہر ادا کر دو، (مگر شرط) یہ کہ تم (انہیں) قیدِ نکاح میں لانے والے (عفت شعار) بنو نہ کہ (محض ہوس رانی کی خاطر) اِعلانیہ بدکاری کرنے والے اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والے، اور جو شخص (اَحکامِ الٰہی پر) ایمان (لانے) سے انکار کرے تو اس کا سارا عمل برباد ہو گیا اور وہ آخرت میں (بھی) نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا

تشریح:

طیبات پاکیزہ۔ خبائث ناپاک گندہ کی ضد ہے۔

اس جگہ طیبات کا لفظ مجمل ہے احادیث مبارکہ میں طیبات و خبائث کی تفصیل آئی ہے۔ طیب اور خبیث کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے۔ نص یعنی قرآن کریم نے جس کو حلال کہا اس کو طیب کہا جائے گا جس کو حرام کہا اس کو خبیث کہا جائے گا اور جن کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ خبیث فاسق ہے اور حرام ہے۔ مثلاً حضرت عباس (رض) سے روایت ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پانچ چیزیں ہیں جن کو حرم میں بھی احرام کی حالت میں مار دینے کا حکم ہے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ چوہا، کوا، چیل، بچھو، زہریلا کتا جو دیوانہ ہو جائے۔ (متفق علیہ)
حکم کا اعادہ اس آیت میں تاکیداً ہے اور وضاحت احکام بھی مقصود ہے یعنی پاک چیزیں تو حلال ہیں مگر اہل کتاب کا کھانا بھی حلال ہے اس پر بسیط بحث ہے جو صاحب روح المعانی نے کی. (حسنات)
آج کے دن سے مراد نو ذوالحجہ ہے جس کے بارے میں پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ یہ دن تکمیل دین، اتمام نعمت اور مسلمانوں کے لیے شوکت اسلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں یہ بھی اعلان ہوا کہ باقی حلال چیزوں کے ساتھ تمہیں یہ بھی اجازت دی جاتی ہے کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اہل کتاب کا کھانا جس طرح کا بھی ہو وہ مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا۔ بلکہ اس میں اسلام کی حلال و طیب کی شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ چیز نہ تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کی ہو اور ذبح کرتے وقت کسی غیر کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اہل کتاب سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں جو آسمانی کتابوں پر یقین رکھتے ہوں بیشک وہ عمل اور عقیدے کے اعتبار سے کمزور ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ جن اہل کتاب کے متعلق اجازت دی گئی ہے ان کے جرائم کی قرآن مجید طویل فہرست پیش کرتا ہے۔ عقیدہ میں شرک کی آمیزش، کتاب اللہ میں تحریف کرنے والے اور سود خور بھی تھے۔ تیسری اجازت اس بات کی دی گئی کہ اہل کتاب کی باکردار اور باحیا عورتوں سے مسلمان کے لیے نکاح کرنا جائز ہے بشرطیکہ ان کا حق مہر ادا کیا جائے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے جاری کیے ہوئے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کی وہ کفر کا مرتکب ہوا۔ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ نقصان پانے والوں میں سے ہو گا۔ اعمال ضائع ہونے سے یہ بھی مراد ہے کہ بدکردار عورت سے نکاح کرنے میں آدمی کا وقار، عزت اور غیرت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی عورت سے جو اولاد ہو گی اسے بھی تشکیک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جہاں تک اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرنے کا تعلق ہے وہ اتنا کھلا اجازت نامہ نہیں جس طرح کہ لوگوں نے اپنی عیاشی کے لیے سمجھ رکھا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال ہی کافی ہونی چاہیے۔

ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان (رض) جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظم (رض) کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہ (رض) نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لیے حرام ہے، تو پھر امیر المومنین فاروق اعظم (رض) نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانہ میں اس راہ سے فحاشی و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔ امام محمد بن حسن (رح) نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابو حنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری

مرتبہ فاروق اعظم (رض) نے جب حضرت حذیفہ (رض) کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے

(اعزم علیک ان لا تضع کتابی حتّٰی تخلی سبیلھا فانی اخاف ان یقتدیک المسلمون فیختار والنساء اہل الذمۃ لجمالھن وکفٰی بذلک فتنۃ لنساء المسلمین۔) (کتاب الآثار، ص: ۱۵۶)

”یعنی آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کر دو۔ کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں گے اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں گے۔ مسلمان عورتوں کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہو گی۔“

مؤرخ اس کے جواب میں لکھتا ہے کہ حضرت حذیفہ (رض) نے امیر المومنین کا خط پڑھتے ہی اپنی پسندیدہ بیوی کو طلاق دے دی۔ (فہم)

اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی حضرات کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا حلال ہے بشرطیکہ انھوں نے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہو، اور اگر اہل کتاب ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیں تو اس ذبیحہ کے متعلق حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی خود سنے کہ اہل کتاب نے غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا ہے تو وہ اسے نہ کھائے اور اگر خود نہ سنے تو اس کا کھانا حلال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اہل کتاب ذبح کے وقت کیا کہتے ہیں۔ (تفسیر روح المعانی) جواز کی حد تک یہ قول بہترین ہے تاکہ ضرورت کے وقت اہل کتاب کا ذبیحہ کھالیا جائے لیکن تقویٰ اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بلا ضرورت ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔ (ردالمختار: کتاب الذبائح) تاکہ ذہن کے کسی گوشے میں حرام کا کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔

بہرحال جو اہل کتاب جانور کو باقاعدہ ذبح نہ کریں اور اس کا خون نہ بہائیں بلکہ کسی اور طریقہ سے جانور کی زندگی ختم کر دیں تو اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا، نیز غیر اہل کتاب (بت پرست، مجوسی، مرتد، مشرک وغیرہ) کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حلال نہیں ہوگا کیونکہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی پر ایمان نہیں رکھتے۔ (ردالمحتار: کتاب الذبائح)

اہل کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان متعدد امور مشترک ہیں مثلاً دونوں مذاہب کی کتابیں آسمانی ہیں اور وہ دونوں اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام علیہم السلام، فرشتوں، قیامت، جنت اور دوزخ کے قائل ہیں۔ اسی طرح بائبل کے مطابق درج ذیل جانوروں کے حرام ہونے میں بھی مسلمان اور اہل کتاب مشترک ہیں، مثلاً: مردار، گلا گھونٹنے سے مرا ہوا جانور، درندے کے پھاڑنے سے مرا ہوا جانور، بتوں کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور اور خنزیر وغیرہ۔ (احبار: 24:7، احبار: 8:11، اعمال: 25:21)

اہل کتاب عورت سے نکاح کا مسئلہ

1۔ مسلمان کے لیے حلال ہے کہ وہ مسلمان عورت سے نکاح کرے یا اہل کتاب عورت سے لیکن دونوں صورتوں میں اس بات کا خیال رکھے کہ وہ عورت پاکدامن ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بدکار عورت سے نکاح حرام ہے بلکہ مرد کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ پاک دامن عورت کا انتخاب کرے تاکہ اس کے گھر کے معاملات اور اولاد کی تربیت میں کوئی خلل پیدا نہ ہو اور عورت کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ بدکاری سے اجتناب کرے وگرنہ کوئی شریف آدمی اس سے نکاح نہیں کرے گا۔

2۔ اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مردوں کے نکاح حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے عقائد اور جانوروں کے حلال و حرام ہونے میں متعدد امور مشترک ہیں جیسا کہ گزشتہ حاشیہ میں بیان کیا گیا ہے، نیز جن رشتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے اہل کتاب کے نزدیک بھی ان سے نکاح حرام ہے۔ تفصیل کے لیے بائبل: احبار: باب 18: آیات 7 تا 19 ملاحظہ ہوں، تاہم اہل کتاب مردوں سے مسلمان عورتوں کا نکاح جائز نہیں ہے کیونکہ:

(الف) خاوند اپنی بیوی پر حاکم ہوتا ہے اور مسلمان عورت پر کافر مرد کا غلبہ شرعاً ممنوع ہے۔

(ب) اولاد اکثر باپ کا مذہب اختیار کرتی ہے، لہٰذا اگر باپ کافر ہو گا تو مسلمان عورت کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کے کافر ہونے کا خطرہ ہے جس کو کوئی بھی مسلمان عورت برداشت نہیں کر سکے گی۔

(ج) کوئی بھی اہل کتاب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی نہیں مانتا۔ اگر اس کی بیوی مسلمان ہو تو وہ کسی بھی وقت حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں گستاخی کر سکتا ہے جو کہ مسلمان عورت کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا اور گھر میں فساد شروع ہو جائے گا، جبکہ اس کے برعکس اگر مرد مسلمان ہو اور اس کی بیوی اہل کتاب ہو تو مسلمان ہر نبی پر مکمل ایمان رکھتا ہے اور کسی بھی نبی کی توہین اس کے ایمان کے خلاف ہے، لہٰذا مسلمان کے گھر میں اہل کتاب عورت کو ایسی تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہونے کا خطرہ نہیں بلکہ مسلمان کی زبان سے پہلے انبیائے کرام (علیہم السلام) کی تعریف سن کر اہل کتاب عورت کے دل کو مزید سکون ملے گا۔

3۔ اہل کتاب کی تخصیص سے معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم عورت جو اہل کتاب نہیں اس سے نکاح حلال نہیں ہے۔ اس کی مزید تائید کے لیے قرآن مجید کی وہ آیت تلاوت کریں جس میں اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (قرآن: 2:221)

4۔ اہل کتاب عورتوں سے نکاح حلال ہے تاکہ مسلمان عورت نہ ملنے کی صورت میں اہل کتاب عورت سے نکاح کر لیا جائے لیکن تقویٰ اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بلا ضرورت اہل کتاب عورت سے نکاح نہ کیا جائے۔ (ردالمحتار: کتاب الذبائح) کیونکہ ایک گھر میں دو مذاہب کا وجود گھر کے سکون اور اولاد کے مستقبل کے خطرناک ہے۔ ایسی شادی خانہ آبادی کے بجائے بالآخر خانہ بربادی کا سبب بن سکتی ہے۔ آپ خود اندازہ کریں باپ بچوں کو اپنے ساتھ مسجد لے جائے اور ماں اپنے ساتھ چرچ میں لے جائے تو اولاد کس کا مذہب اختیار کرے گی بالخصوص غیر مسلم ممالک میں جہاں میاں بیوی کے حقوق میں برابری کا تصور کچھ ایسا ہے کہ بعض حالات میں خاوند کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ ہفتہ میں صرف ایک دو گھنٹوں کے لیے اپنے بچوں سے ملاقات کر سکتا ہے، نیز برطانیہ میں ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ جس اہل کتاب عورت نے اسلام قبول کیے بغیر کسی مسلمان سے نکاح کیا ہے۔ بعد میں کسی وجہ سے جب نکاح ٹوٹا تو اولاد قانونی طور پر عورت کے سپرد کر دی گئی اور

بالآخر وہ اولاد اسلام سے رشتہ توڑ بیٹھی۔ اپنا اور اپنی اولاد کا ایمان بچانا ہر مسلمان کا فرض ہے اور کسی مسلمان کو ایک جائز کام کے لیے اپنے فرض کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

5۔ حضرت عذیفہ (رض) نے (مدائن میں) ایک یہودی عورت سے نکاح کرلیا۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق (رض) نے انھیں خط لکھا کہ وہ یہودی عورت کو طلاق دیدیں۔ حضرت حذیفہ (رض) نے جواب میں لکھا: کیا وہ عورت میرے لیے حرام ہے؟ اس پر حضرت عمر (رض) نے لکھا کہ یہودی عورت سے نکاح حرام نہیں ہے، لیکن مجھے خطرہ ہے کہ تم لوگ اہل کتاب کی بدکار عورتوں سے بھی نکاح کر بیٹھو گے۔ (احکام القرآن للجصاص: باب تزوج الکتابیات) اس طرح مسلمان گھروں میں بدکاری پھیلنے کا خطرہ ہے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان اہل کتاب عورتوں کے حسن و جمال یا مال و دولت کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر اہل کتاب عورتوں کو ترجیح دینے لگیں جس سے مسلمان عورتوں کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ بہر حال اس کے متعلق میرا نقطہء نظریہ ہے کہ جس کو کوئی مسلمان عورت مل جائے وہ غیر مسلم عورت سے شادی نہ کرے اور جس کو کوئی مسلمان عورت نہ مل سکے وہ پاکدامن اہل کتاب عورت سے شادی کرلے مگر اپنے اور اپنی اولاد کے ایمان کو بچانے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرے۔

(17) مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک فطری امر ہے۔ اسلام اس تعلق کی قدر کرتا ہے اور باعزت طریق کار کی رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی مرد باقاعدہ لوگوں کے سامنے نکاح کرے، عورتوں کے حقوق کی پاسبانی کرے اور کسی بھی عورت (چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) سے اعلانیہ یا خفیہ بدکاری کا ارتکاب نہ کرے کیونکہ بدکاری اسلام میں حرام ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح عورت کے لیے پاکدامنی کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح مرد کے لیے بھی پاکدامن ہونا ضروری ہے۔

(18) کافر عورت سے نکاح کرنے میں ایمان کے ضائع ہونے کا احتمال تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو وارننگ دی ہے کہ جو مسلمان کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہو کر ایمان کے کسی رکن کا انکار کر بیٹھے تو اس کی ساری نیکیاں ضائع ہو جائیں گی اور آخرت میں نقصان ہی نقصان ہوگا، لہٰذا کسی اہل کتاب عورت کو نکاح میں لینے سے پہلے اس کے نتائج پر اچھی طرح غور و خوض کرنا بہت ضروری ہے۔ (امداد)

مسائل

۱۔ اہل کتاب کا کھانا حلال ہے۔ ۲۔ اہل کتاب کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

۳۔ اہل کتاب کی عورتوں سے مشروط نکاح جائز ہے۔

۴۔ ایمان لانے سے انکار کرنے والے آخرت میں نقصان اٹھائیں گے۔

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ
وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ
اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا
صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو][اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے][اِذَا : جب][قُمْتُمْ : اٹھو تم][اِلَى: طرف][الصَّلٰوةِ : نماز کی][فَاغْسِلُوْا : تو دھوؤ تم][وُجُوْهَكُمْ : اپنے چہرے : اپنے چہرے][وَاَيْدِيَكُمْ : اور اپنے ہاتھ][اِلَى: تک][الْمَرَافِقِ : کہنیوں][وَامْسَحُوْا : اور مسح کرو][بِرُءُوْسِكُمْ : اپنے سروں کا][وَاَرْجُلَكُمْ : اور اپنے پاؤں دھوؤ][اِلَى: تک][الْكَعْبَيْنِ: دونوں ٹخنہ][وَاِنْ : اور اگر][كُنْتُمْ : ہو تم][جُنُبًا : جنبی][فَاطَّهَّرُوْا: تو پاکیزگی حاصل کرو][وَاِنْ : اور اگر][كُنْتُمْ : ہو تم][مَّرْضٰٓى: مریض (جمع)][اَوْ عَلٰي : یا پر][سَفَرٍ : سفر][اَوْ : یا][جَاۗءَ : آئے][اَحَدٌ: کوئی][مِّنْكُمْ : تم سے][مِّنَ : سے][الْغَاۗىِٕطِ : قضائے حاجت][اَوْ : یا][لٰمَسْتُمُ : تم نے چھوا ہو][النِّسَاۗءَ : عورتوں کو "][فَلَمْ : تو نہ][تَجِدُوْا : پاؤ تم][مَاۗءً : پانی][فَتَيَمَّمُوْا : توتیمم

کرلو][صَعِيْدًا : مٹی][طَيِّبًا : پاک][فَامْسَحُوْا : پس تم مسح کرو][بِوُجُوْهِكُمْ : اپنے چہروں کا][وَاَيْدِيْكُمْ : اور اپنے ہاتھوں کا][مِّنْهُ: اس سے][مَا : نہیں][يُرِيْدُ : ارادہ کرتا][اللّٰهُ : اللہ کہ][لِيَجْعَلَ : کرے][عَلَيْكُمْ : تم پر][مِّنْ : سے][حَرَجٍ : تنگی][وَّلٰكِنْ : اور لیکن][يُّرِيْدُ : وہ ارادہ کرتا ہے][لِيُطَهِّرَكُمْ : کہ تم کو پاک کرے][وَلِيُتِمَّ : اور تاکہ پوری کرے][نِعْمَتَهٗ : اپنی نعمت][عَلَيْكُمْ : تم پر][لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم][تَشْكُرُوْنَ : شکر کرو]

ترجمہ: اے ایمان والو ! جب (تمہارا) نماز کیلیئے کھڑے (ہونے کا ارادہ) ہو تو (وضو کے لئے) اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں (بھی) ٹخنوں سمیت (دھو لو) ، اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو (نہا کر) خوب پاک ہو جاؤ، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم سے کوئی رفع حاجت سے (فارغ ہو کر) آیا ہو یا تم نے عورتوں سے قربت (مجامعت) کی ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو (اندریں صورت) پاک مٹی سے تیمّم کر لیا کرو۔ پس (تیمّم یہ ہے کہ) اس (پاک مٹی) سے اپنے چہروں اور اپنے (پورے) ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ وہ تمہارے اوپر کسی قسم کی سختی کرے لیکن وہ (یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کر دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ

تشریح:

اسلامی تہذیب کی بنیاد نماز ہے

اس سے پہلی آیتوں میں ہم نے کھانے پینے کی اشیاء اور عورتوں کے حوالے سے طیبات اور خبائث کا ذکر پڑھا۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ کونسی کھانے کی چیزیں ہمارے لیے طیب اور حلال ہیں اور کون سی خبیث ہیں۔ اسی طرح کن عورتوں سے نکاح ہو سکتا ہے اور کن سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گویا جنس اور شکم سے متعلق جسمانی ضرورتوں کی ایک تہذیب کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری معنوی ' اخلاقی اور روحانی بھی ایک تہذیب ہے ' جس کا سارا دارومدار نماز پر ہے۔ یعنی نماز سے اس تہذیب اور تطہیر کا آغاز ہوتا ہے جو قرآن کریم کے پیش نظر ہے اور نماز کے آغاز کے لیے ضروری ہے کہ وضو کیا جائے حالانکہ نماز سے مقصود تو انسان کی روحانی تطہیر ہے ' یعنی آدمی کے اندر کی پاکیزگی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ظاہر آدمی کے باطن پر اور باطن آدمی کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اگر آدمی ظاہری طور پر گندا ہو ' ممکن نہیں کہ وہ باطنی طور پر پاک رہ سکے اور جو باطنی طور پر گندا ہو ممکن نہیں کہ وہ ظاہری طور پر پاک ہو۔ اس لیے جا بجا قرآن کریم ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی صفائی کا حکم دیتا ہے۔ اسلام نے باطنی صفائی کے ساتھ ساتھ ظاہری صفائی پر جس قدر زور دیا ہے ' اتنا زور کسی اور مذہب یا تہذیب نے نہیں دیا۔ میرے علم میں نہیں کہ کسی بھی مذہب نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہو۔ طہارت کی جو تفصیلات ہمیں مہیا کی گئی ہیں ' ان کو دیکھتے ہوئے تو صاف نظر آتا ہے کہ جس قدر طہارت کی تفصیلات طے کرتے ہوئے اسلام نے عرق ریزی اور جزرسی سے کام لیا ہے ' دوسرے مذاہب میں اس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ اسلام میں جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا '

ہم نے ان کے بارے میں اتنی ہی زیادہ بے تعلّقی اختیار کر رکھی ہے۔ بہر حال تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور چونکہ نماز میں اللہ کے آگے حاضر ہونا ہے 'اس کے لیے ظاہری صفائی ضروری ہے۔ ظاہری صفائی کے دو ذرائع ہیں: ایک وضو اور دوسرا غسل۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وضو یا غسل کے لیے پانی نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پانی میسر ہو 'لیکن آدمی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو 'مثلاً کسی بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں جنھیں اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (روح)
انسان کے طبعی تقاضے دو چیزوں میں منحصر ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اور عمل از دواج اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں حلال ہیں اور کیا چیزیں حرام ہیں اور جنسی خواہشوں کی تکمیل کے لیے کون سی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں اور کون سی عورتیں حرام ہیں۔ اور اس آیت میں یہ بتایا کہ ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے لیے اس پر اللہ تعالیٰ کی عبادات فرض ہیں اور ان عبادات میں سب سے اہم نماز ہے اور نماز کی شرط طہارت ہے اور طہارت غسل اور وضو سے حاصل ہوتی ہے اور اگر پانی نہ مل سکے تو طہارت تیمّم سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اس آیت میں وضو 'غسل اور تیمّم کا بیان فرمایا ہے۔ (تبیان)

آیت وضو کا شان نزول

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ مقام بیداء میں میرا ہار گر گیا اس وقت ہم مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اونٹنی کو بٹھایا اور اونٹنی سے اتر گئے 'آپ نے میری گود میں سر رکھا اور سو گئے۔ حضرت ابو بکر آئے اور انھوں نے زور سے مجھے گھونسے مارے اور کہا تم نے تمام لوگوں کو ہار کی وجہ سے ٹھہرا دیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آرام میں خلل پڑنے سے مجھے موت کی طرح لگ رہا تھا 'حالانکہ حضرت ابو بکر نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی تھی پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیدار ہوئے اس وقت صبح ہو چکی تھی 'پانی کو تلاش کیا گیا تو پانی نہیں ملا 'اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (آیت) " یایھا الذین امنوا اذا قمتم الی الصلوۃ " الایہ (المائدہ: ٦) حضرت اسید بن حضیر نے کہا اے آل ابو بکر! اللہ نے لوگوں کے لیے تم میں برکت رکھی ہے تمہارا وجود ان کے لیے محض برکت ہے۔
(صحیح البخاری ج ٥ 'رقم الحدیث: ٤٦٠٨ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت)

وضو کے فرائض

وضو کے چار فرض ہیں: (1) چہرہ دھونا۔ (2) کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کا دھونا۔ (3) چوتھائی سر کا مسح کرنا۔ (4) ٹخنوں سمیت دونوں پاؤں دھونا۔

وضو کے چند احکام

(1)۔۔ جتنا دھونے کا حکم ہے اس سے کچھ زیادہ دھو لینا مستحب ہے کہ جہاں تک اعضائے وضو کو دھویا جائے گا قیامت کے دن وہاں تک اعضاء روشن ہوں گے۔ (بخاری، کتاب الوضوئ، باب فضل الوضوء والغرّ المحجّلون۔۔ الخ، ۱/۷۱، الحدیث: ۱۳۶)

(2)۔۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور بعض صحابہ کرام (رض) ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرمایا کرتے جبکہ اکثر صحابہ کرام (رض) جب تک وضو ٹوٹ نہ جاتا اسی وضو سے ایک سے زیادہ نمازیں ادا فرماتے، ایک وضو سے زیادہ نمازیں ادا کرنے کا عمل تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی ثابت ہے۔ (بخاری، کتاب الوضوئ، باب الوضوء من غیر حدث، ۱/۹۵، الحدیث: ۲۱۴۔۲۱۵، عمدۃ القاری، کتاب الوضوئ، باب الوضوء من غیر حدث، ۲/۵۹۰، تحت الحدیث: ۲۱۴)

(3)۔۔ اگرچہ ایک وضو سے بھی بہت سی نمازیں فرائض ونوافل درست ہیں مگر ہر نماز کے لیے جداگانہ وضو کرنا زیادہ برکت وثواب کا ذریعہ ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر نماز کے لیے جداگانہ وضو فرض تھا بعد میں منسوخ کیا گیا (اور جب تک بے وضو کرنے والی کوئی چیز واقع نہ ہو ایک ہی وضو سے فرائض ونوافل سب کا ادا کرنا جائز ہو گیا۔)

(مدارک، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶، ص ۲۷۴)

(4)۔۔ یاد رہے کہ جہاں دھونے کا حکم ہے وہاں دھونا ہی ضروری ہے وہاں مسح نہیں کر سکتے جیسے پاؤں کو دھونا ہی ضروری ہے مسح کرنے کی اجازت نہیں، ہاں اگر موزے پہنے ہوں تو اس کی شرائط پائے جانے کی صورت میں موزوں پر مسح کر سکتے ہیں کہ یہ احادیثِ مشہورہ سے ثابت ہے۔

وضو کے اجر وثواب کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کو قیامت کے دن "غیر محجل" (جس کا منہ اور ہاتھ پیر سفید ہوں) کہہ کر پکارا جائے گا 'اس کا سبب وضو کے آثار ہیں۔ سو تم میں سے جو شخص اپنی سفیدی زیادہ کرنا چاہتا ہو (وہ اعضاء وضو کو مقررہ حد سے زیادہ دھو کر) اپنی سفیدی کو زیادہ کرلے۔ (صحیح بخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۳۶ 'صحیح مسلم 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۲۴۶ 'سنن ابوداؤد 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۳۲۳۷ 'سنن نسائی ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۵۰ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۲۸۴)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بندہ مسلم (یا مومن) وضو کرتا ہے تو وہ جب چہرے کو دھوتا ہے تو پانی کے قطروں کے ساتھ اس کے چہرے سے ہر وہ گناہ دھل جاتا ہے جو اس نے آنکھوں سے کیا تھا اور جب وہ ہاتھوں کو دھوتا ہے تو پانی کے قطروں کے ساتھ اس کا ہر وہ گناہ دھل جاتا ہے جو اس نے ہاتھوں سے کیا تھا حتی کہ وہ گناہوں سے صاف ہو جاتا ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۱ "رقم الحدیث: '۲ 'صحیح مسلم ج ۱ 'رقم الحدیث: '۲۴۴ 'الموطا 'رقم الحدیث: '۳۳ 'سنن دارمی 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۸۳ 'مسند احمد 'ج ۳ "رقم الحدیث: '۸۰۲۶ 'سنن کبری للبیہقی 'ج ۱ 'ص ۸۱ 'صحیح ابن خزیمہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۴)

امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے جو شخص اچھی طرح وضو کرکے مسجد میں جائے اور اس کا مسجد میں جانا صرف نماز کیلیے ہو تو اس کے ہر قدم سے اللہ اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔ حتی کہ وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ا رقم الحدیث ' ۲۸۱ ' مطبوعہ دار الفکر بیروت ' ۱۴۱۵ھ)
حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اچھی طرح وضو کیا ' پھر کہا " اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداعبدہ ورسولہ ' اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین "۔ اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ جس دروازے سے چاہے ' جنت میں داخل ہو جائے۔ (سنن ترمذی ج ا ' رقم الحدیث : ' ۵۵ ' صحیح مسلم ' ج ا ' رقم الحدیث : ' ۲۳۴ ' سنن ابوداؤد ' ج ا ' رقم الحدیث : ' ۱۶۹ ' سنن ابن ماجہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ' ۴۷۰ ' مسند احمد ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ' ۱۷۳۱٦)
ابو عثمان بیان کرتے ہیں کہ میں سلمان کے ساتھ تھا ' انھوں نے ایک درخت کی خشک شاخ کو پکڑ کر ہلایا اور کہا ' میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ' جس شخص نے اچھی طرح وضو کیا تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ (المصنف ج ا ' ص ۸۔ ۷ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰٦ھ)

اس سے پہلے کھانے پینے اور نکاح وغیرہ کے احکام بتائے جو حدث اصغر (بے وضو ہونا) اور حدث اکبر (جنابت کا باعث ہوتے ہیں۔ اب یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جب تم اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کر چکو اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں آنا چاہو تو اس کے آداب کیا ہے۔ حدث اصغر کے لیے وضو اور حدث اکبر کے لیے غسل کا حکم دیا۔ یہاں قمتم بمعنی اردتم ہے یعنی جب تم نماز کا ارادہ کرو تو وضو کرو۔ اختصار کے لیے ارادہ جو سبب ہے اس کو ذکر نہیں کیا اور قیامت جو مسبّب ہے اس کو ذکر کر دیا اور یہ استعمال عال ہے جیسے اذا قربات القرآن فاستعذ باللہ۔ اس کا معانی بھی یہی ہے یکہ جب تم قرآن کی تلاوت کا ارادہ کرلو تو پہلے عوذ باللہ پڑھ لیا کرو بظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو سے ادا کی جائے لیکن کئی نمازوں کا ایک وضو سے ادا کرنا جائز ہے۔ فتح مکہ کے روز حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانچوں نمازیں ایک وضو سے ادا فرمائیں۔ حضرت عمر (رض) نے عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! آج تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا کام کیا ہے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ جواب ملا عمدا فعلتہ۔ اے عمر (رض) ! میں نے یہ کام (یعنی ایک وضو سے پانچ نمازیں) جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ امت کو یہ مسئلہ معلوم ہو جائے کہ ایک وضو سے متعدد نمازیں پڑھنا درست ہے۔
وضو کے فرائض چار ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں : (1) منہ کا دھونا۔ (2) ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا۔ (3) سر کا مسح کرنا۔ (4) اور ٹخنوں تک پاؤں کا دھونا۔ اس کے علاوہ وضو سے پہلے نیت کرنا، بسم اللہ پڑھنا، پہلے ہاتھ صاف کرنا، کلی کرنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا، کلی کرنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا، مسح کے علاوہ ہر کام کو تین تین مرتبہ کرنا دائیں طرف سے شروع ہونا، کان کا مسح کرنا۔ یہ سب اعمال حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معمول سے ثابت ہیں۔ فقہا نے ان سے بعض کو سنت اور بعض کو مستحب فرمایا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کی کیفیت اکثر صحابہ کرام سے مروی ہے۔ یہاں وہ تفصیل جو حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے بیان کی ہے اسی کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ابو حیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وضو کرتے دیکھا۔ آپ نے پہلے اپنے ہاتھوں کو خوب پاک صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ کلی کی۔ پھر تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا۔ پھر تین مرتبہ چہرہ مبارک دھویا پھر بازوؤں کو تین مرتبہ دھویا۔

پھر ایک مرتبہ سر کا مسح کیا پھر ٹخنوں تک پاؤں دھوئے اور اس کے بعد فرمایا احببت ان اریکم کیف کان طھور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (ترمذی وابن ماجہ) کہ میں چاہتا تھا کہ تمہیں دکھاؤں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کا کیا طریقہ تھا۔

الی بمعنی مع ہے یعنی ہاتھوں کو کہنیوں کے سمیت دھوئو۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وضو فرماتے تو کہنیوں کو بھی دھوتے عن جابران النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کان اذا توضأادار الماء علی مرفقیہ (دارقطنی۔

مسح کہتے ہیں ہاتھ پانی سے تر کرکے پھیرنا۔ تمام سر کا مسح مستحب ہے اور سر کے چوتھے حصہ کے برابر مسح کرنا فرض ہے۔ سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کا عطف ایدیکم پر ہے اور اس کا معنی ہے واغسلواار جلکم کہ اپنے پاؤں کو بھی دھوئو۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ کو پاؤں اچھی طرح دھونے کا حکم فرمایا کرتے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک قوم کو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں خشک ہیں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلند آواز سے فرمایا۔ ویل للاعقاب من النار اسبغواالوضوء۔ خشک رہ جانے والی ایڑیوں کو آگ جلائے گی۔ وضو عمدہ طریق سے کیا کرو تاکہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔ حاشیہ 24 میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کی کیفیت جو بیان کی گئی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پاؤں مبارک دھویا کرتے تھے۔ سید شریف رضی نے امیر االمومنین سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے بھی پاؤں کا دھونا ثابت ہے (نہج البلاغہ) اس کے بعد جھگڑے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ (مزید تحقیق کے لیے روح المعانی کا مطالعہ فرمائیں)۔

کتب شیعہ میں پاؤں دھونے کی متعدد روایات ائمہ سے منقول ہیں۔ حضرت امام موسیٰ کاظم (علیہ السلام) کے ایک عقیدت مند ابن یقطین نے وضو کی ترکیب کے متعلق استفسار کیا تو حضرت نے یہ جواب تحریر فرمایا۔ والذی اٰمرک بہ فی ذلک ان تتمضمض ثلاثا و تستنشق ثلاثا و تغسل وجھک ثلاثا و تخلل شعر لحیتک و تغسل یدیک الی المرفقین و تمسح راسک کلہ و تمسح ظاھر اذنیک و باطنھا و تغسل رجلیک الی الکعبین ثلاثا ولا تخالف ذلک الی غیرہ۔ ترجمہ :۔ اس بارے میں میں تمہیں یہ حکم دیتا ہوں کہ تین مرتبہ کلی کرو، تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالو، تین مرتبہ اپنے چہرہ کو دھوئو، اپنی ڈاڑھی کے بالوں کا خلال کرو، دونوں بازوؤں کو کہنیوں تک تین مرتبہ دھوئو، اپنے پورے سر کا مسح کرو، کانوں کے ظاہر و باطن کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک تین مرتبہ دھوئو۔ آخر میں فرمایا اس حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ (کشف الغمہ جلد 3 ص 24 ایران)۔ (ضیاء)

پیروں کے دھونے پر دلائل

قرآن مجید ٗاحادیث اور اجماع علماء سے وضو میں پیروں کے دھونے کی فرضیت ثابت ہے اور وضو میں پیروں پر مسح کرنا جائز نہیں ہے اور شیعہ اس کے قائل ہیں کہ وضو میں پیروں پر مسح کیا جائے ٗان کو دھویا نہ جائے ٗہماری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے "وار جلکم" اور لام پر نصب ہے اور اس کا عطف (آیت) "وجوھکم وایدیکم" پر ہے یعنی اپنے چہروں ٗہاتھوں اور پیروں کو دھوئو۔ صحابہ میں سے حضرت علی (رض) اور حضرت ابن مسعود (رض) کی یہی قرات ہے اور قراء میں سے ابن عامر ٗنافع ٗاور کسائی کی یہی قرات ہے اور عاصم سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ (الحاوی الکبیر ٗج ا ص ۴۹) اور اس قرات کا یہ تقاضا ہے کہ پیروں کا دھونا فرض ہو اور حسب ذیل احادیث میں بھی اس پر دلیل ہے کہ پیروں کا دھونا فرض ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں بیان کرتے ہیں ایک سفر میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سے پیچھے رہ گئے۔ پھر آپ ہم سے آملے، درآنحالیکہ ہم نے عصر کی نماز میں دیر کردی تھی، سو ہم وضو کرنے لگے اور پیروں پر مسح کرنے لگے، تو آپ نے بآواز بلند دو یا تین بار فرمایا: ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہو۔

یہ حدیث حضرت ابوہریرہ (رض) سے بھی مروی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جن ایڑیوں کو دھویا نہ گیا ہو، ان کو آگ کا عذاب ہو۔ (صحیح البخاری ج ۱، رقم الحدیث: ۱۶۵۔ ۱۶۳ صحیح مسلم، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۴۲۔ ۲۴۱۔ ۲۴۰، سنن ترمذی، ج ۱، رقم الحدیث: ۴۱، سنن ابوداؤد، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۷، سنن نسائی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۱۱، سنن ابن ماجہ ج ۱، رقم الحدیث: ۴۵۰، مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۴۵۷۰)

مغیرہ بن حنین بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا ایک شخص وضو کر رہا تھا اور وہ اپنے پیروں کو دھو رہا تھا، آپ نے فرمایا مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔

ابوقلابہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنے پیر میں ناخن جتنی جگہ کو دھونے سے چھوڑ دیا تھا، آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اپنے وضو اور نماز کو دہرائے۔ (جامع البیان، جز ۶ ص ۱۷۲، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ ھ)

پیروں کے دھونے پر علماء شیعہ کے اعتراضات کے جوابات:

شیعہ کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اس آیت کی دو قراءتیں ہیں۔ نصب کی قرات (ارجلکم) سے دھونا ثابت ہوتا ہے اور جر کی قرات (ارجلکم) سے مسح ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا عطف برؤسکم پر ہوگا۔ اس اعتراض کے کئی جواب ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ جر کی تقدیر پر بھی (آیت) "ارجلکم" کا عطف (آیت) "ایدیکم" پر ہے، اور اس پر جوار کی وجہ سے جر ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

(آیت) "انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم"۔ (ھود: ۲۶)

ترجمہ: بیشک میں تم پر دردناک عذاب کے دن کا خوف رکھتا ہوں۔

اس آیت میں (آیت) "الیم" عذاب کی صفت ہے، اس اعتبار سے اس پر نصب (زبر) ہونی چاہیے تھی لیکن چونکہ اس کے جوار میں یوم پر جر ہے، اس لیے اس کو بھی جر دی گئی۔ اس کو جر جوار کہتے ہیں اسی طرح (آیت) "ارجلکم" کا عطف (آیت) "وجوھکم" اور (آیت) "ایدیکم" پر ہے۔ اس وجہ سے اس پر نصب ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے جوار میں (آیت) "برء وسکم" چونکہ مجرور ہے، اس لیے اس کو بھی جر دی گئی۔ للذا یہ جر جوار ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ (آیت) "ارجلکم" کا عطف (آیت) "برء وسکم پر ہے، اور اس سے پہلے (آیت) "وامسحوا" مقدر ہے، لیکن (آیت) "وامسحوا برء وسکم، میں مسح کا معنی حقیقی مراد ہے۔ یعنی گیلا ہاتھ پھیرنا اور (آیت) "وامسحوا بارجلکم" میں مسح کا مجازی معنی مراد ہے، یعنی دودھونا۔ اہل عرب کہتے ہیں مسح المطر الارض بارش نے زمین کو دھو ڈالا۔ سو مسح مجازا دھونے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ معطوف علیہ میں حقیقت اور معطوف میں مجاز مراد ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی نظیر یہ آیت ہے:

(آیت) "یایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون ولا جنبا الا عابری سبیل حتی تغتسلوا"۔ (نساء: ۴۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، حتی کہ تم یہ سمجھنے لگو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت حالت میں مسجد کے قریب جاؤ حتی کہ تم غسل کرلو، الا یہ کہ تم نے (مسجد میں صرف) رستہ عبور کرنا ہو۔

اس آیت میں (آیت) "ولا جنبا "کا عطف (آیت) "لا تقربواالصلوۃ "پر ہے اور اس سے پہلے بھی (آیت) "لا تقربوالصلوۃ"۔ مقدر ہے ' لیکن معطوف علیہ میں الصلوۃ کا معنی حقیقتاً مراد ہے یعنی نماز اور معطوف میں الصلوۃ کا معنی مجازا مراد ہے 'یعنی مسجد اور محل صلوۃ۔ اسی طرح آیت وضو میں (آیت) "وامسحوابرء وسکم "میں مسح کا حقیقی معنی مراد ہے اور (آیت) "وامسحوا بار جلکم "میں مسح کا مجازی معنی مراد ہے 'یعنی دھونا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ (آیت) "ارجلکم "اور (آیت) "ارجلکم "دو متواتر قراءتیں ہیں اور جس طرح قرآن مجید کی آیات میں باہم تعارض نہیں ہے 'اسی طرح مجید کی قرات میں بھی باہم تعارض نہیں ہے اور (آیت) "ارجلکم "کا معنی ہے پیروں کا دھونا اور (آیت) "ارجلکم "کا معنی ہے پیروں پر مسح کرنا۔ اسی لیے (آیت) "ارجلکم "کی قرات اس حال پر محمول ہے جب اس نے موزے پہنے ہوئے ہوں۔ یعنی جب موزے پہنے ہوں 'تو پیروں پر مسح کرلو اور جب موزے نہ پہنے ہوں تو پیروں کو دھولو۔ اس طرح ان دونوں قراتوں میں کوئی تعارض نہیں رہے گا۔

علماء شیعہ نے کہا کہ قاعدہ یہ ہے کہ وضو میں ان اعضاء کو دھویا جاتا ہے جن پر تیمّم میں مسح کیا جاتا ہے اور جن اعضاء کو تیمّم میں ترک کردیا جاتا ہے 'ان پر وضو میں مسح کیا جاتا ہے۔ اگر وضو میں پیروں کو دھونے کا حکم ہوتا تو تیمّم میں پیروں پر مسح کیا جاتا اور جبکہ تیمّم میں پیروں کو ترک کردیا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ وضو میں پیروں کا حکم مسح کرنا ہے نہ کہ دھونا۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ قرآن مجید میں مذکور ہے نہ حدیث میں 'یہ محض ان کی ذہنی اختراع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضو میں جن اعضاء کو دھونے کا حکم دیا ہے اور وہ چہرہ 'ہاتھ اور پیر ہیں 'تو ان کو دھویا جائے 'اور جس عضو پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ سر ہے تو اس پر مسح کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے تیمّم یا وضو کے لیے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کا حکم نہیں دیا 'بلکہ دونوں کے الگ الگ صراحتا احکام بیان فرمائے اور ان دونوں کا تفصیلی حکم اسی آیت میں ہے۔ قیاس اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی چیز کا صراحتا حکم بیان نہ کیا گیا ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس اور قاعدہ غسل سے ٹوٹ جاتا ہے 'کیونکہ تیمّم جس طرح وضو کی فرع ہے 'اسی طرح غسل کی فرع ہے 'اور جب تیمّم میں چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا جاتا ہے اور باقی بدن کو ترک کردیا جاتا ہے 'تو چاہیے کہ غسل میں صرف چہرے اور ہاتھوں کو دھولیا جائے اور باقی بدن پر صرف مسح کرلیا جائے اور جب کہ بالاتفاق غسل میں ایسا نہیں کیا جاتا 'تو معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ اور قیاس فاسد ہے۔ (تبیان)

میڈیکل سائنس سے بھی ثابت ہے کہ پاؤں کو دھونا چاہئیے تاکہ بدبو پیدا نہ ہو کیونکہ نہ دھونے سے فنگس ہو جاتا ہے جس سے کئی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

{ وَاِن کُنتُم جُنُبًا : اور اگر تم حالت جنابت میں ہو۔} جنابت کا عام فہم مطلب یہ ہے کہ شہوت کے ساتھ منی کا خارج ہونا۔

جنابت کے اسباب اور ان کا شرعی حکم

جنابت کے کئی اسباب ہیں: (1) جاگتے میں شہوت کے ساتھ اچھل کر منی کا خارج ہونا۔ (2) سوتے میں احتلام ہو جانا۔ (3) ہم بستری کرنا اگرچہ منی خارج نہ ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ غسل کئے بغیر نماز پڑھنا، تلاوت قرآن کرنا، قرآن پاک کو چھونا اور مسجد میں داخل ہونا ناجائز ہے۔ جو کام جنابت کی حالت میں منع ہیں حیض ونِفاس کی حالت میں بھی منع ہوں گے لیکن جب تک عورت حائضہ یا نفاس کی حالت میں ہے

غسل کرنے سے پاک نہ ہو گی جبکہ جُنُبی غسل کرنے سے پاک ہو جاتا ہے، اسی طرح حیض و نفاس کی حالت میں بیوی سے صحبت کرنا بھی منع ہے جبکہ جنابت کی حالت میں صحبت کرنا منع نہیں۔

(احکام القرآن، سورۃ المائدۃ، باب الغسل من الجنابۃ، ۲/۴۵۷)

حیض و نفاس سے بھی غسل لازم ہو جاتا ہے۔ حیض کا مسئلہ سورۃ بقرہ آیت نمبر 222 میں گزر گیا اور نفاس سے غسل لازم ہونا اجماع سے ثابت ہے اور تیمّم کا بیان سورۃ نساء آیت نمبر 43 میں تفصیل سے گزر چکا۔ مزید تفصیل جاننے کیلئے فقہی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ (صراط)

فوائد

1: خیال رہے کہ یہاں قیام سے مراد وہ نہیں جو نماز میں فرض ہے کیونکہ وہ تو وضو سے پیچھے ہے، بلکہ نماز کے لیے اٹھنا اور چلنا مراد ہے، اسی لیے یہاں الی الصلوہ فرمایا فی الصلوۃ نہ فرمایا۔

2۔ معلوم ہوا کہ وضو میں نیت شرط نہیں سنت ہے کیونکہ یہاں ان اعضا کے دھونے کو مطلق رکھا گیا۔ نیز وضو میں کلی اور ناک میں پانی لینا فرض نہیں، کیونکہ قرآن کریم نے اس کا ذکر نہ فرمایا۔ بلکہ حدیث کی وجہ سے سنت ہے نیز پاؤں پر مسح نہ ہوگا بلکہ اسے دھویا جائے گا۔

3: اطھروا باب افعل سے ہے یعنی خوب پاک اور صاف ہوئ۔ اس سے معلوم ہوا کہ غسل میں ان اعضا کا دھونا بھی فرض ہے۔ جو بعض لحاظ سے ظاہر بدن ہیں۔ للذا کلی اور ناک میں پانی لینا غسل میں فرض ہے وضو میں نہیں، کیونکہ وضو میں مبالغہ کا صیغہ ارشاد نہیں ہوا۔

4: اگر عورت سے ننگا ہو کر چمٹا۔ تو وضو گیا اور اگر صحبت کر لی تو غسل گیا۔ ان دونوں صورتوں میں پانی نہ ملنے پر تیمّم کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ وضو اور غسل دونوں کا تیمّم یکساں ہے۔

5: پانی نہ ملنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پانی وہاں موجود نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ پانی تو ہو۔ لیکن اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو، یا بیماری سے، یا دشمن یا موذی جانور کی رکاوٹ کی وجہ سے، دیکھو امام حسین (رض) نے کربلا میں تیمّم سے نمازیں پڑھیں حالانکہ دریائے فرات سامنے تھا۔ کیونکہ آپ وہاں پہنچنے پر قادر نہ تھے۔

6: اس سے معلوم ہوا کہ مٹی اور مٹی کی جنس سے تیمّم جائز ہے۔ جنس مٹی وہ ہے جو زمین سے پیدا ہو۔ اور آگ میں نہ راکھ ہو نہ گلے۔ للذا پہاڑی نمک اور کان کے کوئلے سے تیمّم جائز ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۷﴾

لغۃ القرآن: [وَاذْكُرُوْا : اور تم یاد کرو][نِعْمَةَ : نعمت][اللّٰهِ : اللہ کی][عَلَيْكُمْ : تم پر][وَمِيْثَاقَهُ : اور اس کا پختہ عہد][الَّذِيْ : وہ جو][وَاثَقَكُمْ : اس نے تم سے وعدہ لیا][بِهٖٓ ۙ: اس کا][اِذْ : جب][قُلْتُمْ : تم نے کہا][سَمِعْنَا : ہم نے سنا][وَاَطَعْنَا ۡ: اور ہم نے مانا][وَاتَّقُوا : اور ڈرو][اللّٰهَ: اللہ سے][اِنَّ : یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][عَلِيْمٌۢ: جاننے والا ہے][بِذَاتِ : راز][الصُّدُوْرِ : سینوں کے]

ترجمہ: اور اللہ کی (اس) نعمت کو یاد کرو جو تم پر (کی گئی) ہے اور اس کے عہد کو (بھی یاد کرو) جو اس نے تم سے (پختہ طریقے سے) لیا تھا جب کہ تم نے (اقراراً) کہا تھا کہ ہم نے (االلہ کے حکم کو) سنا اور ہم نے (اس کی) اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سینوں کی (پوشیدہ) باتوں کو خوب جانتا ہے

تشریح:

دین اسلام کی تکمیل، حلال چیزوں کی فہرست میں وسعت وکشادگی، پاکیزگی کے احکامات، نعمتوں کی یاد دہانی کے بعد وہ عہد یاد کروایا ہے جو انسانیت نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں اپنی تخلیق کے وقت کیا تھا، کلمہ طیبہ اس عہد کی تائید ہے کیونکہ انسان اس میں یہ اقرار کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اس کی عبادت اور اس کے حکم میں شریک نہیں کروں گا۔ وہی عبادت کے لائق اور احکم الحاکمین ہے بندہ اس میں یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ میرے قائد اور پیشوا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ میں انہی کے فرمان اور طریقہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت اور زندگی کے تمام معاملات طے کرتا رہوں گا۔ مفسرین نے اس عہد سے مراد صحابہ کا صلح حدیبیہ کا عہد بھی لیا ہے۔

انسان جو بھی اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے اسے ہر حال میں پورا کرنا اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہیے۔ عہد کی پاسداری کے لیے یہاں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے بغیر صحیح معنوں میں نہ آدمی صالح کردار ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی عہد کی پاسداری کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات سے پوری طرح واقف ہے جس کا معنی یہ ہے کہ تمہارا

ظاہر اور باطن ایسا ہونا چاہیے کہ جس پر خدا خوفی کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہی اپنے عہد کی پاسداری کیا کرتا ہے۔

(عَنْ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ (رض) يَقُولُ قَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وَنَحْنُ فِي مَجْلِسٍ تُبَايِعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَسَتَرَهُ اللهُ فَأَمْرُهُ إِلَى اللهِ إِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ) [رواہ البخاری : باب بَيْعَةِ النِّسَاءِ]

"حضرت عبادہ بن صامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں ایک مجلس کے دوران فرمایا کہ تم ان باتوں پر میری بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نہ تم چوری اور نہ ہی زنا کرو۔ اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو اور تم کسی پر من گھڑت بہتان نہ باندھو۔ اور نہ ہی نیکی کے کاموں میں نافرمانی کرو۔ جس نے اس بیعت کی پاسداری کی اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جس کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں سزا دے گا جو اس کے لیے کفارہ ہوگا۔ جس نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے سزا دے اور چاہے تو اس سے درگزر فرمائے۔ ہم سب نے اس پر بیعت کی۔"

جب رسول مکرم ﷺ گفتگو فرماتے تو وہ خاموشی کے ساتھ سنتے۔ اور تعظیم کی بنا پر آپ ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر نہ بات کرتے۔ مکہ والوں کا نمائندہ عروہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹا تو کہا اے میری قوم میں وفود کے ساتھ بادشاہوں کے پاس گیا۔ مجھے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی جانے کا موقع ملا مگر اللہ کی قسم جتنی عزت و تعظیم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی اس کی کرتے ہیں کسی بادشاہ کی رعایا اتنی تعظیم اس کی نہیں کرتی۔ اللہ کی قسم وہ تھوک نہیں پھینکتے مگر وہ اس کے ساتھیوں کے ہتھیلیوں میں گرتی ہے اور وہ اسے اپنے چہروں اور جسم کے ساتھ مل لیتے اور جب وہ کسی کام کا حکم دیتے ہیں تو وہ اس کی تعمیل میں جلدی کرتے ہیں اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو قریب ہے کہ اس کے ساتھی اس کے وضو کے پانی پر لڑ پڑیں اور جب وہ کلام کرتا ہے تو وہ اپنی آوازوں کو پست کر لیتے ہیں اور آپ کی طرف آپ کی عظمت کی وجہ سے نگاہ نہیں اٹھاتے اور تحقیق اس نے تمہارے سامنے ایک عظیم چیز پیش کی ہے اسے قبول کر لو۔" (فہم)

ہر مسلمان جب دین اسلام کو قبول کرتا ہے تو وہ پہلے اقرار کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ اور اسلام کی سربلندی کے لیے کسی جانی اور مالی قربانی سے دریغ نہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو یاد کرا رہے ہیں کہ دیکھو ہم نے تم پر کتنا احسان فرمایا۔ تمہیں ہدایت کا راستہ دکھایا اور اس پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائی۔ اس نعمت کو اور کامل اطاعت کے وعدہ کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اور اس یقین کو پختہ سے پختہ تر کرتے رہو کہ تمہاری کوئی بات تمہارے ہمہ بیں اور ہمہ داں رب سے پوشیدہ نہیں۔ (ضیاء)

اصل سبق کی یاد دہانی

غالباً یہ عہد وہی ہے جو سورۃ بقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نقل فرمایا تھا۔ (**وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ**) جب صحابہ (رض) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے موافق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہمارے منشاء اور طبیعت کے موافق ہو یا خلاف۔ یہ تو عام عہد تھا۔ اس کے بعد بعض ارکان اسلام یا مناسب حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا گویا اس سورت کے شروع میں جو اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ فرمایا تھا، درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کرکے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے پھر وہی اصلی سبق یاد دلایا گیا۔

نعمتوں پر تکبر نہ کرو اللہ سے ڈرو

ایک شریف اور حیادار آدمی کی گردن اپنے محسن اعظم کے سامنے جھک جانی چاہیے۔ مروت و شرافت اور آئندہ مزید احسانات کی توقع اسی کو مقتضی ہے کہ بندہ اس منعم حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے، خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ عہد واقرار بھی کر چکا ہے ممکن ہے حق تعالیٰ کی بے انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہو جائے اس کی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول وقرار کی کوئی پروانہ کرے اس لیے فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے۔ بہر حال مروت، شرافت، امید اور خوف ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری مستعدی دکھلائیں۔ آگے وہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے ہم جو کچھ کریں گے وہ ہمارے اخلاص یا نفاق، ریاکاری یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے۔ فقط زبان سے سمعنا واطعنا کہنے یا شکر گزاری کی رسمی اور ظاہری نمایش سے ہم اس کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ (گلدستہ)

اللہ کی نعمت اور اس کے عہد و میثاق کا معنی

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے مسلمانو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم کو عطا فرمائی ہے کہ اس نے تم کو اسلام کی ہدایت دی اور اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا تھا۔ جب تم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ تمہیں خوشی ہو یا رنج ' سہولت ہو یا تنگی ' ہر حال میں تم اللہ کے احکام سن کر قبول کرو گے اور اس کی اطاعت کرو گے اور تم نے یہ کہا تھا کہ آپ ہمیں جس چیز کا حکم دیں گے ہم اس کو بجالائیں گے اور جس کام سے منع کریں گے ' اس سے باز رہیں گے اور تم یہ بھی اللہ کا انعام تھا کہ تم نے یہ عہد کیا ' سوائے مسلمانو! تم اپنے اس عہد کو پورا کرو ' تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں دائمی نعمتیں عطا فرمائے۔

تم اس عہد کو توڑنے یا پورا نہ کرنے کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو ' ایسا نہ کرنا کہ زبان سے اطاعت کا اقرار کرو اور دل میں اس کے خلاف ہو ' اور اپنے باطن میں اس عہد کی خلاف ورزی کرنے سے اللہ سے ڈرو ' کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کسی معین نعمت کا ذکر نہیں فرمایا ' بلکہ جنس نعمت کا ذکر فرمایا ہے اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ تم اللہ کی ان نعمتوں پر غور کرو جو اس نے تم کو عطا فرمائی ہیں۔ اللہ نے بندوں کو جو نعمتیں دی ہیں ' ان کا شمار کون کرسکتا ہے۔ اس نے حیات عطا فرمائی ' صحت دی ' عقل اور ہدایت دی۔ آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھا اور دنیا میں بہت اچھائیاں عطا فرمائیں ' بندوں کو چاہیے کہ اللہ کی ان نعمتوں پر غور کریں ' اس کا شکر بجالائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اس آیت میں فرمایا ہے تم ان نعمتوں کو یاد کرو ' اور یاد کرنا بھولنے کی فرع ہے ' یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔ دنیا، کی رنگینیوں میں اور نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے ' اور جب کوئی نعمت چلی جاتی ہے ' تو پھر اس نعمت کو یاد کرتا ہے۔ حالانکہ اسے چاہیے کہ وہ نعمت کی حالت میں اپنے منعم کو یاد رکھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کا ایک سبب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں اور اس کی طرف متنبہ کرنے کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد ومیثاق ہے۔ اس میثاق کی ایک تفسیر وہ ہے جس کو ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیعت کے وقت آپ کی اطاعت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے عہد اور میثاق لیا کہ وہ توراۃ پر ایمان لائیں اور توراۃ پر ایمان لائیں اور توراۃ میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارت ہے ' تو انھوں نے توراۃ کے ضمن میں آپ کی نبوت پر ایمان لانے کا بھی اقرار کیا تھا ' سو اس سے یہ میثاق مراد ہے ' اور اس کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں کو حضرت آدم کی پشت سے نکالا تو ان سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا ' اور چوتھی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور شریعت پر جو عقلی دلائل اور شرعی براہین قائم کی ہیں ' عہد اور میثاق سے وہ دلائل اور براہین مراد ہیں۔ (تبیان)

مسائل

(1)۔۔ انسان ہر نیکی رب عَزَّوَجَلَّ کی توفیق سے کرتا ہے لہٰذا اس پر فخر نہ کرے بلکہ ربِّ کریم عَزَّوَجَلَّ کا شکر ادا کرے۔

(2)۔۔ بیعتِ عقبہ اور بیعت رضوان والے سارے صحابہ کرام (رض) اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں جنہیں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اس بیعت کا شرف بخشا۔ اسی بیعت کو یہاں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نعمت قرار دیا گیا ہے۔

(3)۔۔ ان سارے صحابہ (رض) نے ان بیعتوں کے سارے وعدے پورے کئے اور صحابہ (رض) وعدے کے سچے تھے کیونکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے یہاں ان کے وعدے بغیر تردید ذکر فرمائے۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾

لغۃ القرآن: [يَآيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو !][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][كُوْنُوْا : ہوجاؤ][قَوّٰمِيْنَ : قائم رہنے والے][لِلّٰهِ : اللہ کے لیے][شُهَدَآءَ : گواہ (جمع)][بِالْقِسْطِ : انصاف کے ساتھ][وَلَا : اور نہ][يَجْرِمَنَّكُمْ : تم کو آمادہ کرے][شَنَاٰنُ : دشمنی][قَوْمٍ : قوم][عَلٰى : پر][اَلَّا : یہ کہ نہ][تَعْدِلُوْا : تم عدل کرو][اِعْدِلُوْا: تم عدل کرو][هُوَ: وہ][اَقْرَبُ : زیادہ قریب ہے][لِلتَّقْوٰى : پرہیزگاری کے][وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ سے ڈرو][اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ][خَبِيْرٌ: خبررکھنے والا ہے][بِمَا : ساتھ جو][تَعْمَلُوْنَ : تم کرتے ہو]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اللہ کے لیے مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے انصاف پر مبنی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو (کہ) وہ پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے، اور اللہ سے ڈرا کرو، بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خوب آگاہ ہے

تشریح:

شہادت

"شھدا" یا "قوامین" کے الفاظ جمع آئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ۔ انصاف کرنے اور کروانے کیلئے ایک جماعت کی ضرورت ہے جو اللہ کی راہ میں مضبوطی سے ڈٹ جائے۔ نہ کوئی خوف اسے ڈرا سکے نہ کوئی امید اسے کرید سکے۔ شہادت کے معنی صرف گواہی کے ہی نہیں ہیں جو

عدالت کے کٹہرہ میں کسی مقدمہ کے لیے دی جاتی ہے۔ شہادت کے معنی سچائی پر قائم رہنے کے وہ سارے اعمال ہیں جن سے قوم کا کردار بنتا ہے۔ جن سے سچائی قائم ہوتی ہے، جو ایمان اور اللہ کے خوف کی علامات ہیں۔ یہ شہادت ہر اس طریقے کے منافی ہے جو سچے انصاف تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی ہے مثلاً رشوت، بے ایمانی، دھوکا، جھوٹ، عدالت میں جھوٹا بیان، جھوٹے ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ، امتحانات میں جھوٹے نمبر اور تجارت میں دھوکا اور حرام کمائی، عورتوں، مزدوروں، ہاریوں اور کمزوروں کا حق مارنا، کام چوری کرنا، جھوٹی سفارش کرنا یا ماننا، اقتدار اور اختیار کا ناجائز استعمال وغیرہ وغیرہ۔ شہدا جمع ہے شہید کی۔ شہید اور شاہد میں فرق یہ ہے کہ شہید ایک ایسا شخص ہے جو سچ، سچائی، انصاف اور ایمان کا مستقل عادی ہے۔ یہ خوبیاں اس کی فطرت ثانیہ ہیں خواہ اس راہ میں اس کی جان ہی چلی جائے۔ شاہد وہ ہے جس نے ایک یا چند بار یہ خوبیاں دکھلا کر اپنا کردار پیش کیا ہو

سورۃالمائدہ کی آیت نمبر 8 سورۃالنساء کی آیت نمبر 135 کے مضمون کو مکمل کرتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ ہی کے لیے انصاف کی شہادت دینے والوں میں مضبوطی سے شامل ہو جاؤ خواہ تمہاری گواہی اور تمہارے انصاف کی زد تمہارے اپنے مفاد پر پڑے یا تمہارے والدین اور دیگر رشتہ داروں پر پڑے اور خواہ کوئی فریق معاملہ امیر ہو یا غریب۔ (بصیرت)

گواہی میں انصاف کا حکم

دنیا میں جو کام مشکل ہیں ان میں سے ایک حق کی گواہی دینا بھی ہے حق کی گواہی ہر زمانے ہی میں مشکل رہی ہے خصوصاً اس زمانے میں کہ جان کا خطرہ، عزت کا خطرہ ہمیشہ کی دشمنی مول لینی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے زور دار الفاظ کے ساتھ قرآن پاک میں گواہی کا حکم دیا ہے۔

فرمایا یَاَیُّہَاالَّذِینَ آمَنُوا: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مومنوں کو خطاب ہے۔ کُونُوا قَوَّامِینَ لِلّٰہِ: ہو جاؤ پابندی کے ساتھ قائم رہنے والے اللہ تعالیٰ کے لیے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کو ملحوظ رکھو۔ شُہَدَاءَ بِالْقِسْطِ: گواہی دینے والے انصاف کے ساتھ جب گواہی دو تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دو اور انصاف کے مطابق دو اور اس پر قائم بھی رہو کہ جو تمہاری آنکھوں نے دیکھا ہے اور تمہارے کانوں نے سنا ہے اس کو بیان کر دو اور جو چیزیں گواہی میں اہم ہیں ان میں سے کوئی رہ نہ جائے جس شخص کے حق میں گواہی دے رہے ہو نہ تو اس کے فائدے کو سامنے رکھو اور نہ جس کے خلاف دے رہے ہو اس کے نقصان کی پروا کرو۔ تمہارے سامنے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہونی چاہیے۔ بڑے گناہوں میں سے جھوٹی گواہی بھی ہے۔ (ذخیرہ)

صحیح اور سچی شہادت کی اہمیت

یہ آیت بھی سابقہ آیت سے متصل ہے اور اس سے مراد بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر برانگیختہ کرنا اس آیت میں دو حکم ہیں (حق پر) مضبوطی سے قائم رہنا اور انصاف کے ساتھ گواہی دینا ' اور اللہ کے تمام احکام کا خلاصہ بھی دو چیزیں ہیں۔ اللہ کی تعظیم اور بندوں پر شفقت کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور حق پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا ' اس کا تعلق اللہ کی تعظیم کے ساتھ ہے اور انصاف کے ساتھ

گواہی دینااس کا تعلق بندوں پر شفقت کے ساتھ ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے قرابت داروں اور دوستوں کی محبت کی وجہ سے شہادت دینے میں کوتاہی یا کمی نہ کرو 'اور اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے بغض کی وجہ سے شہادت میں کوئی ردوبدل نہ کرو 'صرف انصاف کی رو سے شہادت دو 'خواہ اس سے تمہارے دوستوں کو نقصان پہنچے یا تمہارے دشمنوں کو فائدہ پہنچے 'پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کسی قوم کی عداوت تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے۔

اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ایک تفسیر عام ہے 'اس کا معنی یہ ہے کہ کسی قوم کے ساتھ بغض تمہیں اس کے ساتھ بے انصافی کرنے پر نہ ابھارے 'بایں طور کہ تم حد سے تجاوز کرو 'بلکہ تم ان کے ساتھ انصاف کرو 'خواہ انھوں نے تمہارے ساتھ برائی کی ہو اور ان کے ساتھ نیکی اور اچھائی کے ساتھ پیش آؤ 'خواہ انھوں نے تمہارے ساتھ بدی اور برائی کی ہو 'اور مخلوق میں سے ہر ایک کے ساتھ عدل اور انصاف کرو 'اور کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہ کرو 'اور اس آیت کی

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ آیت کفار مکہ کے ساتھ مخصوص ہے 'کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کی چھ ہجری میں مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا 'اور حدیبیہ سے آگے نہیں جانے دیا تھا۔ سواس وجہ سے تم ان پر ظلم اور زیادتی نہ کرنا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مسلمانوں کو کفار پر ظلم اور زیادتی کرنے سے منع کیا گیا ہے 'حالانکہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکوں کو جہاں پائیں 'قتل کردیں اور میدان جنگ میں آنے والے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرلیں اور ان کے اموال لوٹ لیں تو پھر اور ظلم اور زیادتی کیسے ہوگی ؟اس کا جواب یہ ہے کہ ظلم یہ ہے کہ جب وہ اسلام لائیں تو ان کا اسلام قبول نہ کیا جائے 'ان کے بچوں کو قتل کیا جائے 'بڑوں کا مثلہ کیا جائے اور ان سے کیے ہوئے معاہدوں کو توڑ دیا جائے۔اس کے بعد فرمایا: تم عدل کرتے رہو 'وہ خوف خدا کے زیادہ قریب ہے۔

عدل تقوی کے زیادہ قریب ہے

اس کی بھی دو تفسیریں ہیں۔ تقوی کے معنی ہیں خوف خدا کی وجہ سے گناہوں سے اجتناب کرنا 'اور جو شخص عدل کرتا ہے 'وہ گناہوں سے اجتناب کے زیادہ قریب ہوتا ہے 'اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو شخص عدل کرتا ہے 'وہ عذاب اخروی سے بچنے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

اس آیت میں غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے 'حالانکہ وہ اللہ کے دشمن ہیں اور جب اللہ کے دشمنوں کے ساتھ عدل کرنا واجب ہے تو اللہ کے دوستوں کے ساتھ عدل کرنا کس قدر زیادہ مطلوب ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: اور اللہ سے ڈرتے رہو 'بیشک اللہ تمہارے کاموں کی بہت خبر رکھنے والا ہے۔ (المائدہ : ۸)

یعنی اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور وہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے 'سو اگر تم نے کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دی یا کسی کے حق میں جھوٹی گواہی دی اور بے انصافی کی 'تو وہ اللہ سے مخفی نہیں ہے۔ پھر صحیح اور سچی گواہی پر اجر وثواب کی بشارت دی اور جھوٹی گواہی پر عذاب کی وعید سنائی اور فرمایا: جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے 'ان سے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ (المائدہ : ۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ لوگ دوزخی ہیں۔ (المائدہ : ۱۰) (تبیان)

ظلم کا معنی

ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا۔ اور اس کا شرعی معنی ہے حق سے باطل کی طرف تجاوز کرنا اور اس کو جور کہتے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ غیر کی ملک میں تصرف کرنا ظلم ہے اور حد سے تجاوز کرنا ظلم ہے۔ (کتاب التعریفات ' ص ٦٢ ' مطبوعہ ایران ' النہایہ ' ج ٣ ' ص ٦١ ' المفردات ' ص ٣١٦ ـ ٣١٥)

اور ظلم بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظالموں پر لعنت فرمائی ہے:

(آیت) " الا لعنۃ اللہ علی الظلمین "۔ (ھود: ١٨)

ترجمہ: سنو: ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔:

اس لیے کسی ڈاکٹر کا صحت مند کو بیماری کا سرٹیفکیٹ دینا یا کسی افسر کا اناڑی کو ڈرائیونگ لائسنس دینا یا کسی ٹیکسی ڈرائیور کے غلط میٹر کی صحیح میٹر کا سند دینا یا رشوت لے کر کسی غیر ملکی کو قومی شناختی کارڈ بنا دینا یا کسی یونیورسٹی یا ادارہ کی جعلی سند جاری کر دینا اور اس نوع کی تمام جھوٹی اور جعلی دستاویزات ' جھوٹ اور ظلم پر مبنی ہیں ' اور گناہ کبیرہ ہیں۔ تاہم ان کو جھوٹی شہادت کے ذیل میں لانا صحیح نہیں ہے۔ خصوصا ممتحن کے نمبر لگانے کا معاملہ کسی طور پر شہادت نہیں ہے۔ اس کے لگائے ہوئے نمبر شہادت نہیں ' بلکہ ایک قسم کا فیصلہ ہیں ' اگر وہ غلط نمبر لگائے گا تو یہ اس کی عدالت کے خلاف ہوگا اور قرآن مجید میں ہے۔

(آیت) " ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی "۔ (المائدہ: ٨)

ترجمہ: کسی قوم کی عداوت تمہیں بےانصافی پر نہ ابھارے۔ تم عدل کرتے رہو ' وہ خوف خدا کے زیادہ قریب ہے۔

طالب علم کا پرچہ چیک کرکے جو نمبر لگاتا ہے وہ اس کی قضا اور فیصلہ ہے۔ اسی طرح جو افسر گاڑی کی فٹ نیس کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے ' یا میٹر کو صحیح قرار دیتا ہے ' یہ اس کی قضا اور فیصلہ ہے اور ڈاکٹر جو سرٹیفکیٹ دیتا ہے یہ اس کی ماہرانہ رائے ہے۔ یہ تمام امور مشابہ بالقضاء ہیں ' شہادت نہیں۔ پس شہادت دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کہے میں شہادت دیتا ہوں جیسا کہ ہم عنقریب باحوالہ بیان کریں گے۔ اس لیے اگر یہ لوگ غلط فیصلہ کریں گے اور خلاف واقعہ تحریر کریں گے ' تو عدل کے خلاف ہوگا ' اور ظلم اور جھوٹ ہوگا ' اور یہ کام موجب لعنت ہیں اور گناہ کبیرہ ہیں ' لیکن یہ شہادت کی تعریف میں نہیں آتے۔ اب ہم آپ کے سامنے شہادت کی تعریف اور ارکان بیان کر رہے ہیں۔

شہادت کی تعریف

قاضی کے سامنے ایک شخص کے دوسرے شخص پر حق کی لفظ شہادت کے ساتھ خبر دینا (مثلا کہے میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں آدمی کا فلاں شخص پر فلاں حق ہے) شریعت میں شہادت ہے۔ (کتاب التعریفات ' ص ٥٧ ' مطبوعہ ایران)

شہادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم علم اور یقین کے قائم مقام ہے ' اس میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ میں جانتا ہوں بلکہ یہ کہنا ضروری ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ دوسری قسم وہ ہے جو قسم کے قائم مقام ہے ' اس میں مثلا یہ کہے کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں کہ زید چلنے والا ہے۔

(امفردات ' ص ٢٦٨)

جب گواہ مسموعات کی جنس سے کوئی بات سنے مثلاً بیع ٬اقرار یا حاکم کے حکم کو سنے ٬یا مبصرات میں سے کسی چیز کو دیکھے مثلاً کسی کو قتل کرتے ہوئے دیکھے ٬یا کسی کو غصب کرتے ہوئے دیکھے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ گواہی دے کہ میں گواہی دیتا ہوں فلاں شخص نے بیع کی ٬ یا حاکم نے فیصلہ کیا خواہ اس کو گواہ نہ بنایا گیا ہو۔ (عنایہ مع فتح القدیر ٬ج ۷ ص ۷ ۳۵ ٬طبع بیروت ٬ ۱۴۱۵ھ)

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ نے لکھا ہے کہ شہادت میں لفظ شہادت (مثلاً میں شہادت دیتا ہوں) کہنا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اسی لفظ کے ساتھ شہادت دینے کا حکم فرمایا ہے۔

(آیت) "واشھدوا ذوی عدل منکم"۔ (الطلاق: ۲)

ترجمہ: اور تم میں سے دو نیک شخص شہادت دیں۔

(آیت) "واشھدوا اذا تبایعتم"۔ (البقرہ: ۲۸۲)

ترجمہ: جب تم آپس میں خرید و فروخت کرو شاھد (گواہ) بنالو۔

(آیت) "واستشھدوا شھیدین من رجالکم"۔ (البقرہ: ۲۸۲)

ترجمہ: اور تم اپنے مردوں میں سے دو شاہد طلب کرو۔

(آیت) "واقیموا الشھادۃ للہ"۔ (الطلاق: ۲)

ترجمہ: اور اللہ کے لیے گواہی قائم کرو۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شہادت کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم سورج کو دیکھ رہے ہو؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا اس کی مثل ہو تو شہادت دو ٬ورنہ چھوڑ دو۔ (المستدرک ٬ج ۴ ٬ص ۱۹۸ ٬ سنن کبری ٬ج ۱۰ ٬ص ۱۵۶)

ان تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ کسی سنی ہوئی بات یا کسی وقوع پذیر ہونے والے حادثہ کی لفظ شہادت کے ساتھ خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر جو کسی مریض کے متعلق اپنی رائے لکھتا ہے ٬یا ممتحن جو پرچہ پر نمبر لگاتا ہے ٬اس میں کسی واقعہ یا حادثہ کی خبر نہیں دی جاتی ٬ بلکہ اپنی طرف سے ایک رائے دی جاتی ہے یا ایک حکم لگایا جاتا ہے۔ اس لیے ان امور کو شہادت کے ذیل میں لانا صحیح نہیں ہے۔ البتہ! اگر بدنیتی کی وجہ سے صحیح رائے نہ لکھی جائے یا صحیح حکم نہ لگایا جائے تو یہ عدل کے خلاف ہے اور ظلم ہے ٬اور اگر اس نے دانستہ اپنی فی الواقع رائے کے خلاف لکھا تو یہ جھوٹ ہے اور بہر حال گناہ کبیرہ ہے۔

بحیثیت امت مسلمہ ہماری اصل ذمہ داری

مسلمانو! تم انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ جس طرح تم اللہ کے فرمان بردار بندے بن کر صرف اسی کے سامنے جھکتے ہو اسی طرح تمہارا کام انصاف کی علمبرداری بھی ہے۔ تم اللہ کے سامنے جتنا جھکو گے ٬اللہ تمہیں اتنا ہی سر بلند کرے گا اور تمہاری یہ سربلندی انصاف کو دنیا میں عام کرنے کے لیے ہوگی اور یہ انصاف کو عام کرنا "لِلّٰہِ شُھَدَآءَ" اللہ کے گواہ کی حیثیت سے ہوگا کیونکہ اللہ نے ہمیں عدل کی حکمرانی کے لیے چنا ہے۔ ہم جب انصاف عام کریں گے تو گویا اللہ کی صفت (عدل) کی گواہی دیں گے اور یہ گواہی دیتے ہوئے اگر کبھی ہمیں سر کٹوانے

تک بھی جانا پڑے تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس تعلق کو نبھانے کی پوزیشن میں نہیں یا نبھانا نہیں چاہتے۔ اقبال نے اس کو بڑی خوبصورت تعبیر دی ہے۔

مقامِ بندگی دیگر ' مقام عاشقی دیگر

ز نوری سجدہ می خواہی ' ز خاکی بیش ازاں خواہی

بندگی کا مقام فرشتوں کو ملا ہے اور ہم نمازیں پڑھتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں۔ بندے ہم بھی ہیں 'لیکن صرف بندے نہیں 'ہم اجتماعی زندگی میں کچھ اور بھی ہیں۔ لیکن فرشتے صرف بندے ہیں ' وہ بندگی سے انحراف کر ہی نہیں سکتے۔ ان کی کوئی اجتماعی زندگی نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں 'جس جس فرشتے کو جس عمل پر لگا دیا گیا ہے وہ صرف وہی کام کر رہا ہے 'اگر وہ قیام میں ہے تو قیام میں ہی اس کی ساری زندگی گزرے گی 'اگر قعود میں ہے تو قعود میں ہی اس کی ساری زندگی کٹے گی اور کسی دوسری ڈیوٹی پر ہے تو وہ تمام عمر وہیں پر لگا رہے گا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ مجھے اجتماعی زندگی کا حصہ بن کر کیا کرنا ہے؟ کہا: تمہارا ایک مقام تو بندگی کا ہے اور دوسرا مقام یہ ہے کہ تم صرف بندے ہی نہیں ہو بلکہ تم اللہ سے عشق کا دعویٰ بھی کرتے ہو۔ لہٰذا فرشتوں سے اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں 'مگر تم سے اللہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ مسلمانوں سے اللہ کے اس تقاضے کو اقبال یوں بیان کرتا ہے کہ

ازاں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا

شہادت بر وجودِ خود ز خون دوستاں خواہی

کہا: وہ اپنی ساری بے نیازیوں کے باوجود چاہتا یہ ہے کہ جو اس کے دوست اور نام لیوا ہیں 'جنھوں نے اس کا دین قبول کیا ہے اور "سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا" کہہ کر اپنا نام اس کے دوستوں کی فہرست میں لکھوالیا ہے 'جو اپنے آپ کو مومن اور مسلم کہتے ہیں 'ان سے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جو اب تک میرا نام لے کر مجھے یاد کرتے رہے ہیں اور لوگوں کو بتاتے رہے ہیں کہ اللہ ہے 'اب میں انھیں یہ کہتا ہوں کہ اگر تمہیں خون کا آخری قطرہ بہا کر بھی یہ ثابت کرنا پڑے کہ اللہ ہے 'تو تمہیں اس سے بھی دریغ نہیں کرنا۔ نوریوں سے اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ تم خون کا آخری قطرہ بہا ڈالو اور تم اس راستے میں اپنی جانیں دو بلکہ اس کا یہ تقاضہ خاکیوں سے ہے کہ تم سے میرا تعلق صرف آقا اور ملازم کی حد تک نہیں ' اگر میرے دین کی بالادستی کے لیے تمہیں کبھی تصادم کی حد تک بھی جانا پڑے 'جس میں تمہیں اپنی جان دینی ' سر کٹوانا پڑ جائے تو اللہ اس کا مطالبہ اپنے عاشقوں سے کرتا ہے کہ وہ میرے عشق میں اپنی جانوں کے نذرانے دیں۔ تو ہم سے بھی اس بات کا مطالبہ اس وقت ہو گا جب ہم دنیا میں عدل کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے اٹھیں گے۔ کہا: تمہارا کام یہ ہے کہ تم اللہ کے گواہ بن کر انصاف کی علمبرداری کے لیے اٹھو۔ تم خود تو بے انصافی کیا کرو گے 'کہیں اور بھی بے انصافی کی اجازت ہرگز مت دینا۔ اگر دنیا میں کہیں بے انصافی ہوتی ہے اور تم بے انصافی کرنے والوں کے معین بن جاتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو عہد کیا تھا 'تم اس پر قائم نہ رہے۔ تم تو "سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا" کا بھی انکار کر رہے ہو چہ جائیکہ کہ تم عدل کی حکمرانی کے لیے اپنا فرض انجام دو۔

یہ آیت سورۃ النساء میں بھی گزری ہے۔ اس میں پہلی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک دوسرے پیرائے میں کہی گئی ہے 'وہاں فرمایا تھا: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ" (النساء: ۱۳۵) مسلمانو! تمہیں انصاف کا گواہ بن کر اٹھنا ہے اور انصاف کی علمبرداری قائم کرنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ ہو سکتا ہے کہ جب تم انصاف کی گواہی دینے کے لیے اٹھو تو یہ تمہاری اپنی برادریوں اور

خود تمہارے یا تمہارے والدین کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے تمہارے اقرباء کے خلاف ہو ،لیکن تمہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ عدل اور انصاف کیا ہے ؟ بات جس کے بھی خلاف جائے ،تمہیں فیصلہ وہی کرنا ہے جو اسلام چاہتا ہے۔

دو چیزیں سب سے زیادہ عدل و انصاف کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

1۔اپنوں کے رشتے اور

2۔دوسروں کی دشمنی۔

فرمایا: اگر اپنوں کے رشتے بھی راستے میں رکاوٹ بنیں تو دیکھنا! اس کی پروا نہیں کرنا ،اگرچہ تم خود بھی اس کا ہدف کیوں نہ ہو ، چاہے اس کی ضرب اپنے پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ جیسے سید دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فاطمہ بنت قیس کے مقدمے میں فرمایا تھا ،جس کی سفارش کی گئی تھی کہ یہ قیس کی نوجوان لڑکی ہے ،آپ اسے چھوڑ دیں۔اس پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ناراض ہو کر فرمایا تھا کہ یہ تو فاطمہ بنت قیس ہے ،اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔اس لیے قرآن کریم یہ کہتا ہے: "وَلَوْ عَلَىٰٓ اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ "چاہے ضرب تمہارے اپنے آپ پر ، اپنے والدین پر اور اپنے عزیزوں پر کیوں نہ پڑتی ہو ،تمہیں بہر حال انصاف کو نافذ کرنا ہے۔اسی طرح اگر تم انصاف کے لیے اٹھتے ہو اور دیکھتے ہو کہ انصاف کا فائدہ میرے دشمن کو پہنچ رہا ہے ،اب بھی تم انصاف کو بروئے کار لاؤ گے ،چاہے دشمن کو فائدہ ہو اور تمہارے اپنوں کو نقصان پہنچے۔یہاں فرمایا: مسلمانو! عدل کے قائم کرنے والے ،اللہ کے گواہ بن کر اٹھو ،یعنی تم خدائی فوجدار بن کر اٹھو کیونکہ یہ تمہارا اپنا کام نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے۔(روح)

مسلمانوں کا مقصد جہاد

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا "اور تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کسی قوم کی دشمنی کہ تم عدل کرنے سے رک جاؤ" اگر دشمن قوم کا کوئی معاملہ ہو اور تم دیکھو کہ اس سے فائدہ دشمن قوم کو پہنچ رہا ہے تو لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے ہاتھ روک لو۔یہ جو قرآن کریم کہتا ہے کہ دشمنوں کا معاملہ بھی ہو ،تب بھی عدل کرو۔یہ صرف ایک نصیحت نہیں بلکہ مسلمانوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے عدل کی ایسی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔روس کی جو چھ ریاستیں آزاد ہوئیں ،یہ وہ علاقہ ہے جسے ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں مسلمانوں نے فتح کیا۔جب یہ علاقہ فتح ہو گیا اور اس کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو ان کو اس علاقے کے مذہبی رہنماؤں کی طرف سے ایک شکایت پہنچی کہ جب مسلمان کسی علاقہ پر چڑھائی کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ پیغام دیتے ہیں کہ یہ (اللہ کا دین) ایک ہوا ہے ،جسے تم روک کر بیٹھے ہو ،یہ ایک روشنی ہے ،جس کے تم دشمن بن گئے ہو۔تم اللہ کے اس دین کو قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو یا دوسروں کے لیے راستہ خالی کر دو اور حکومت ہمارے حوالے کر دو اور تم ہمیں اپنی حفاظت کے بدلے ایک ٹیکس دو ،جس کا نام جزیہ ہے (یہ بالعموم زکوۃ سے کم ہوتا ہے)۔اس کے بدلے میں ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے کہ تم فوجی خدمت سر انجام دو ،جبکہ مسلمان زکوۃ بھی دے گا اور فوجی خدمت بھی سر انجام دے گا۔اگر وہ لوگ ٹیکس دینے پر آمادہ ہو جائیں ،پھر ان سے حکومت تو لے لی جاتی ہے ،مگر پھر ان کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی ہے۔اگر وہ اس کے لیے بھی تیار نہ ہوں اور کہیں کہ ہم تو لڑیں گے ،اب یہ آخری مرحلہ ہے جس میں مسلمان لڑنے کے لیے تلوار نکالتا ہے۔پھر تلوار جو فیصلہ کرتی ہے ،وہی ہوتا ہے۔کہا: یہ ہے وہ شریعت ،جس کو

ہم نے آپ کے پیغمبر ﷺ کی تعلیم کی روشنی میں سمجھا ہے۔ لیکن جب آپ کی فوجیں ہمارے علاقے میں آئیں تو انھوں نے ہمیں اس قسم کا کوئی نوٹس نہیں دیا کہ ہماری یہ شرائط مان لو ورنہ ہم آپ پر حملہ کریں گے۔ وہ ایک طوفان کی طرح آئے اور ہمیں روندتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہم جانتے تو تھے کہ اسلامی افواج چلی آرہی ہیں ' ہم اس کے مقابل تیار بھی تھے ' لیکن انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیں روند ڈالا اور سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اب یہ اسلامی مملکت کا ایک حصہ تو ہے ' لیکن اس میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس علاقے کے فتح کرنے میں بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس یہ شکایت پہنچی تو آپ نے اس علاقے کے گورنر کو لکھا کہ صحیح صورت حال کے بارے میں مطلع کریں۔ وہ سچے لوگ تھے ' انھوں نے لکھا کہ یہ جو شکایت کی گئی ہے ' یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے، مسلمانوں کی آبادیاں بس گئیں ' مساجد بن گئیں ' رشتے قائم ہو گئے اور پراپر ٹیز بن گئیں۔ مسلمانوں کو یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ اب یہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ چند دنوں کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے حکم آیا کہ مسلمانو! تم نے سنت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر عمل نہ کرکے بہت بڑی خیانت کی ہے۔ تم نے ایک جرم کیا ہے اور میں چونکہ عدل قائم کرنے کے لیے اٹھا ہوں ' میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی فوجیں لے کر اس سارے علاقے سے اتنی دور نکل جاؤ کہ اگر دوبارہ انھیں تمہارا مقابلہ کرنا پڑے ' تو وہ تیاری کر سکیں۔ اس حکم کے بعد سینکڑوں میل کا علاقہ مسلمانوں نے اپنی قلمرو سے نکال دیا اور وہاں سے فوجیں لے کر بہت دور نکل گئے۔ انھیں موقع دیا گیا کہ تم جب تک تیاری کرنا چاہتے ہو ' کر لو۔ چنانچہ جب ان کی تیاریاں مکمل ہو گئیں ' اب ان کے سامنے پورا طریقہ (Process) بروئے کار لایا گیا اور ان کے سامنے اسلام پیش کیا گیا کہ اب بتلاؤ کیا کہتے ہو؟ اسلام کی برکتوں کا ذکر کیا گیا اور وہ چونکہ مسلمانوں کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے کہ یہ ہیں کیسے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے اور کچھ نہیں ہوئے تھے ' اب جب اس طریقہ (Process) پر عمل کیا گیا تو ایک آدمی بھی ایسا نہ بچا جسے اللہ نے اسلام کی توفیق نہ دی ہو۔

یہ تھا مسلمانوں کا طرز عمل جب وہ دنیا میں بالادست قوت تھے ' وہ نہ صرف غریبوں کو انصاف دیتے تھے بلکہ انھوں نے انصاف کی حکمرانی قائم کی تھی۔

عدل کے بغیر تقویٰ ممکن نہیں

فرمایا کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم عدل چھوڑ بیٹھو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ تقویٰ اصل میں پورے دین اسلام کی روح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو مسلمانوں میں پیدا کرنا مقصود ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ عقائد ' عبادات اور معاملات کے حوالے سے آدمی اللہ سے ڈرنے لگے اور کبھی اس کی نافرمانی کا سوچ بھی نہ سکے۔ یہ روح پیدا کرنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم اجتماعی زندگی میں تقویٰ پیدا کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو! وہ کبھی عدل کی حکمرانی کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ایک غریب کو اگر انصاف نہیں ملے گا تو وہ تقویٰ کہاں سے سیکھے گا؟ ایک جج عدالت میں بیٹھ کر انصاف نہیں کرتا تو وہ کہاں کا متقی ہے؟ گواہ جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں تو ان میں تقویٰ کہاں سے آئے گا؟ استاد اپنی تعلیم کو عبادت کی بجائے ' تجارت سمجھتا ہے تو اس میں تقویٰ کہاں ہے؟ اگر تم ہر شعبۂ زندگی میں تقویٰ لانا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ عدل کی حکمرانی ہو ' انصاف کی بالادستی ہو۔ اگر عدل وانصاف نہیں ہوگا تو تمہاری زندگیوں میں تقویٰ ہرگز نہیں

آ سکے گا؟اس طرح اسلام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ پیدا ہو۔ رہی یہ بات کہ تم کہو کہ ہم متقی ہیں۔ تو یاد رکھو ! تمہارے کہنے سے کیا ہوگا؟ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ تمہارے اعمال سے اس سے بڑھ کر کون واقف ہے۔ وہ جانتا ہے تم میں تقویٰ کی حکمرانی ہے یا غیر تقویٰ کی۔ (روح)

یہاں ایک اور بات کی طرف بھی غور کرنا ہے۔

نااہل کو ووٹ دینا

جو شخص علم اور عمل کے اعتبار سے نااہل ہو ' اس کو ووٹ دینا ہمارے نزدیک بھی ناجائز اور گناہ ہے ' لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ووٹ کسی کے حق میں شہادت ہے ' یا وکالت ہے ' یا شفاعت ہے ' اس کا شہادت نہ ہونا تو ہماری پہلی تقریر سے واضح ہو گیا۔ شہادت میں کسی دیکھے ہوئے یا سنے ہوئے واقعہ کی لفظ شہادت کے ساتھ خبر دی جاتی ہے ' اور ووٹ دینے کا معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ شفاعت اس لیے نہیں ہے کہ شفاعت میں کسی تیسرے شخص کے پاس کسی منصب کے لیے سفارش کی جاتی ہے ' اور اس تیسرے شخص کے اختیار میں یہ معاملہ ہوتا ہے کہ خواہ اس شفاعت کو قبول کرے خواہ رد کر دے ' جبکہ ووٹ کی حیثیت اس طرح نہیں ہے۔ جس نمائندہ کے ووٹ ڈالے گئے ہیں ' اگر اس کے ووٹ اپنے مقابل سے زیادہ ہوں تو وہ اسمبلی کا ممبر بن جائے گا۔ اس میں کسی کے قبول کرنے نہ کرنے کا کوئی معاملہ نہیں ہے ' اس طرح ووٹ وکالت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وکالت میں موکل کسی شخص کو وکیل بنانے کے بعد اس کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ (ھدایہ اخرین ' ص ۱۹۹) اور ووٹر کسی امیدوار کو ووٹ ڈالنے کے بعد اپنے ووٹ کو کینسل نہیں کر سکتا ' اور نہ ہی منتخب ہونے کے بعد اس امیدوار کو معزول کر سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی تعلق یا لالچ یا دباؤ کی وجہ سے کسی نااہل شخص کو ووٹ ڈال رہا ہے ' تو اس عمل کے ناجائز ہونے کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک منصب کے لیے نااہل شخص کو مقرر کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اور اسلام میں کسی نااہل کو منصب دینے سے منع کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آپ نے اپنی بات مکمل کر کے فرمایا: جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پوچھا امانت کیسے ضائع ہو گی؟ آپ نے فرمایا جب کوئی منصب کسی نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ (صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۵۹ ' مسند احمد بتحقیق احمد شاکر ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۸۷۱۴ ' الجامع الصغیر ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۸۸۷ ' الجامع الکبیر ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۸۹۵)

جو کسی ایسے شخص کو قومی یا صوبائی اسمبلی کے لیے ووٹ ڈالتا ہے ' جو دینی اور دنیاوی علوم سے بہرہ مند نہ ہو اور اس کا بدچلن اور بدکردار ہونا بالکل واضح ہو تو وہ اس نمائندگی کے لیے نااہل شخص کو منتخب کر رہا ہے اور نااہل کو منصب کے لیے منتخب کرنا اس حدیث کے مطابق قیامت آجانے کے مترادف ہے۔ نیز اس سلسلہ میں مزید احادیث ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے کسی آدمی کو کسی جماعت کا امیر بنایا ' حالانکہ اس جماعت میں اس سے زیادہ اللہ کا فرمان بردار بندہ تھا ' تو بنانے والے نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور جماعت مسلمین سے خیانت کی۔ حاکم نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (المستدرک ' ج ۴ ' ص ۹۳۔ ۹۲ ' مطبوعہ دارالباز ' مکہ المکرمہ)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس آدمی نے کسی شخص کو مسلمانوں کا عامل بنایا 'حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے بہتر شخص موجود ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول کا زیادہ جاننے والا ہے تو اس آدمی نے اللہ تعالیٰ 'اس کے رسول اور تمام مسلمانوں سے خیانت کی۔ (کنزالعمال 'ج ٦ ص ٧٩ 'مطبوعہ موسسہ الرسالہ بیروت '١٤٠٥ھ)

حضرت ابوایوب بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے 'جب کوئی اہل شخص دین کا والی ہو تو دین پر نہ رونا اور جب نااہل والی ہو تو پھر دین پر رونا۔ (علامہ احمد شاکر متوفی ١٣٧٧ھ نے لکھا ہے 'اس حدیث کی سند صحیح ہے 'مسند احمد 'ج ١٧ 'رقم الحدیث: ٢٣٤٧٦ 'امام حاکم اور امام ذہبی نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ المستدرک 'ج ٤ 'رقم الحدیث: ص '٤ 'ص ٥١٥ 'نیز امام طبرانی 'متوفی ٣٦٠ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ المعجم الاوسط ج ا رقم الحدیث: ٢٨٦ 'المعجم الکبیر ج ٤ 'رقم الحدیث ٣٩٩٩)

ان احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ جو شخص پیسوں کے لالچ 'برادری کے تعلق یا کسی بااثر آدمی کے دباؤ کی وجہ سے نااہل کو ووٹ ڈالتا ہے 'وہ اللہ اور اس کے رسول اور تمام مسلمانوں سے خیانت کرتا ہے۔ نیز اہل شخص کے ہوتے ہوئے نااہل شخص کو ووٹ ڈالنا 'ظلم ہے 'کیونکہ ظلم کا معنی ہی یہ ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا اور ظالموں پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے 'اور ظلم گناہ کبیرہ ہے۔

نیز جب کوئی بدکردار اور فاسق وفاجر یا بدمذہب شخص اسمبلی میں پہنچے گا اور اس کو قانون سازی کا اختیار ملے گا 'تو یہ ممکن ہے کہ وہ خلاف شرع قانون بنائے 'یا اس کے حق میں ووٹ دے۔ جیسے ایوب خان کے دور میں عائلی قوانین بن گئے جو سراسر غیر اسلامی ہیں اور ١٩٩٣ء تا ١٩٩٦ء کی وفاقی کابینہ نے یہ مسودہ قانون منظور کیا کہ عورت خواہ قاتل ہو 'اس کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی اور یہ صریح قرآن کے خلاف ہے۔

جن لوگوں نے ایسے بے دین لوگوں کو ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچایا 'یا جنہوں نے خلاف شرع قانون سازی کی 'وہ بھی برابر کے مجرم ہیں۔

اس لیے جو لوگ غیر متدین اور غیر صالح لوگوں کو ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچائیں گے 'وہ بھی برابر کے مجرم ہوں گے۔ اس لیے نااہل شخص کو ووٹ دینا بالکل جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت ہے 'ظلم ہے 'اور خلاف شرع قانون بنانے کا ذریعہ ہے۔

طلب منصب کی تحقیق

ہمارے ملک میں طریق انتخاب کی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ قومی یا صوبائی اسمبلی کی نشست کیلیے ہر امیدوار از خود کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں از خود عہدہ کی طلب کرنا ممنوع ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے دو عم زاد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ نے جن چیزوں پر آپ ﷺ کو ولایت دی ہے 'ان میں سے بعض پر ہمیں امیر بنادیں 'دوسرے نے بھی اسی طرح کہا: آپ ﷺ نے فرمایا بخدا! ہم اس شخص کو کسی منصب پر امیر نہیں بنائیں گے جو اس کا سوال کرے گا 'اور نہ اس کو جو اس کی حرص کرے گا۔ (صحیح مسلم 'ج ٣ 'رقم الحدیث: ١٧٣٣ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

طالب منصب کو منصب نہ دینے میں یہ حکمت ہے کہ طالب منصب کے ساتھ اللہ کی توفیق اور تائید شامل نہیں ہوتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ منصب کو طلب کرنا جائز ہے 'کیونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے بادشاہ سے اپنے لیے حکومت کا عہدہ طلب کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے :
(آیت) "قال اجعلنی علی خزآئن الارض انی حفیظ علیم"۔ (یوسف : ۵۵)
حضرت یوسف (علیہ السلام) نے (عزیز مصر سے) کہا 'ملک کے خزانے میرے سپرد کردیجئے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔
یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ شریعت سابقہ ہے اور شریعت سابقہ کے جو احکام ہماری شریعت کے خلاف ہوں 'وہ ہم پر حجت نہیں ہوتے۔ ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بخدا ہم اس شخص کو عامل نہیں بنائیں گے جو اس کو طلب کرے گا اور نہ اس شخص کو عامل بنائیں گے جو اس کی حرص کرے گا۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نبی تھے اور نبی کا تقوی قطعی اور یقینی ہوتا ہے 'نبی کو وحی کی تائید حاصل ہوتی ہے 'اور وہ اپنے افعال کے متعلق اللہ کی رضا سے مطلع رہتے ہیں 'جبکہ عام آدمی کا تقوی قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور غیر قطعی کو قطعی پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا عہدہ طلب کرنا اللہ تعالیٰ کی اجازت سے تھا 'جو ان کو وحی سے حاصل ہوئی اور عام آدمی کے حق میں یہ متصور نہیں ہے۔
بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی منصب کا اہل ہو 'اس کا محض خدمت کے لیے منصب کو طلب کرنا ضرورت کی بناء پر جائز ہے۔ ہمیں اس قاعدہ کی صحت سے انکار نہیں ہے 'لیکن جو چیز ضرورت کی بنا پر جائز کی گئی ہو 'اس کو صرف ضرورت کی حد تک محدود رکھنا صحیح ہے۔ اس کو عام رواج اور معمول بنالینا صحیح نہیں ہے 'مثلا جب کوئی حلال چیز کھانے کے لیے دستیاب نہ ہو تو ضرورت کی بنا پر شراب اور خنزیر کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے 'لیکن اگر کوئی شخص ضرورت کے حوالے سے خنزیر اور شراب کو کھانے پینے کا عام معمول بنالے 'تو یہ صحیح نہیں ہے۔
موجودہ طریقہ انتخاب کا غیر اسلامی ہونا :
پاکستان میں انتخاب کے موقع پر ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار از خود کھڑے ہوتے ہیں اور زر کثیر خرچ کرکے اپنے لیے کنویسنگ کرتے ہیں اور مخالف امیدوار کی کردار کشی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں غیبت 'افتراء اور تہمت کی تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں۔ اور یہ طریقہ اسلام میں بالکل ناجائز ہے 'اور ہر امیدوار کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضرورت کی بناء پر کھڑا ہوا ہے 'بداہۃ باطل ہے۔ کیونکہ ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چونکہ اور کوئی اہل ہی تھا 'اس لیے یہ سب امیدوار کھڑے ہوگئے ہیں۔

امیدوار کے لیے شرائط اہلیت نہ ہونے کے غلط نتائج

درحقیقت پاکستان کے آئین میں طلب منصب کی اجازت دینا ہی غیر اسلامی دفعہ ہے۔ جو امیدوار انتخاب کے لیے کھڑے ہوتے ہیں 'ان ہی میں سے منتخب افراد آگے چل کر وزیر اعظم 'صدر مملکت اور وزراء اعلی کا انتخاب کرتے ہیں اور یہی لوگ اسمبلی میں جاکر کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ملک کے سربرآوردہ علماء اور دانشوروں پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل اتفاق رائے سے کسی

قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتی ہے 'لیکن وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ قومی اسمبلی اس کو منظور نہ کرے اور قومی اسمبلی کے ممبروں کے لیے اسلامی علوم یا مروجہ علوم میں کسی علم کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نیکی اور تقوی کی مبہم شرائط رکھی گئی ہیں اور ان کا دیانت داری سے متعلقہ امیدواروں پر اطلاق بھی نہیں کیا جاتا۔ حال ہی میں صدر مملکت چیف الیکشن کمشنر اور بالواسطہ طور پر کہہ چکے ہیں کہ ان کا اطلاق کون کرے گا؟ اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ ایسے کڑے معیار پر کون اترے گا؟ گویا وہ بالواسطہ طور کہہ رہے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی دفعات ٦٢ اور ٦٣ نا قابل عمل ہیں۔ نیز سیاسی تجربہ اور تدبر کی حتی کہ مرد ہونے کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ دفتر میں کلرک بھرتی ہونے کے لیے بھی کم از کم میٹرک پاس ہونے کی شرط ہوتی ہے۔ بس چلانے والے ڈرائیور کے لیے بھی تجربہ کی شرط ہوتی ہے لیکن اس ملک کو چلانے کے لیے امیدواروں کے علم اور تجربہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ہر فاسق وفاجر 'جاہل اور نا تجربہ کار شخص خواہ مرد ہو یا عورت 'انتخاب کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے اور پیسہ اور اثر ورسوخ کے زور پر اسمبلی میں پہنچ کر صدر مملکت 'وزیر اعظم 'وزیر اعلی یا کسی بھی محکمہ کا وزیر بن سکتا ہے۔ اور وہ دینی علم 'تجربہ اور اچھے کردار کے بغیر بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی پیش کردہ سفارشات کو مسترد کر سکتا ہے 'اور کسی بھی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ (تبیان)

عدل وانصاف کے دو اعلیٰ نمونے

یہاں عدل وانصاف کے دو اعلیٰ نمونے پیش خدمت ہیں جس سے اسلام کی تعلیمات کا نقشہ سامنے آتا ہے۔

(1)۔۔ملک غسّان کا بادشاہ جبلہ بن ایہم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حضرت عمر فاروق (رض) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا، کچھ دنوں بعد امیر المومنین حضرت عمر فاروق (رض) حج کے ارادے سے نکلے تو جبلہ بن ایہم بھی اس قافلے میں شریک ہو گیا۔ مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ایک دن دوران طواف کسی دیہاتی مسلمان کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تو چادر کندھے سے اتر گئی۔ جبلہ بن ایہم نے اس سے پوچھا: تو نے میری چادر پر قدم کیوں رکھا؟ اس نے کہا: میں نے جان بوجھ کر قدم نہیں رکھا غلطی سے پڑ گیا تھا۔ یہ سن کر جبلہ نے ایک زوردار تھپڑ ان کے چہرے پر رسید کر دیا، تھپڑ کی وجہ سے ان کے دو دانت ٹوٹ گئے اور ناک بھی زخمی ہو گئی۔ یہ دیہاتی مسلمان حضرت عمر فاروق (رض) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور جبلہ بن ایہم کے سلوک کی شکایت کی۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے جبلہ بن ایہم کو طلب فرمایا اور پوچھا: کیا تو نے اس دیہاتی کو تھپڑ مارا ہے؟ جبلہ نے کہا: ہاں میں نے تھپڑ مارا ہے، اگر اس حرم کے تقدس کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا: اے جبلہ! تو نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے، اب یا تو تو اس دیہاتی سے معافی مانگ یا میں تم سے اس کا قصاص لوں گا۔ جبلہ نے حیران ہو کر کہا: کیا آپ (رض) اس غریب دیہاتی کی وجہ سے مجھ سے قصاص لیں گے حالانکہ میں تو بادشاہ ہوں؟ حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا: اسلام قبول کرنے کے بعد حقوق میں تم دونوں برابر ہو۔ جبلہ نے عرض کی: مجھے ایک دن کی مہلت دیجئے پھر مجھ سے قصاص لے لیجئے گا۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے اس دیہاتی سے دریافت فرمایا: کیا تم اسے مہلت دیتے ہو؟ دیہاتی نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ (رض) نے اسے مہلت دے دی، مہلت ملنے کے بعد راتوں رات جبلہ بن ایہم غسانی ملک شام کی طرف بھاگ گیا اور اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ (فتوح الشام، ذکر فتح حمص، ص ١٠٠، الجزء الاول)

(2)۔۔ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق (رض) اور حضرت ابی بن کعب (رض) کا آپس میں کسی بات پر اختلاف ہوا، دونوں نے یہ طے کیا کہ ہمارے معاملے کا فیصلہ حضرت زید بن ثابت (رض) کریں۔ چنانچہ یہ فیصلے کے لیے حضرت زید بن ثابت (رض) کے گھر پہنچے۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے ان سے فرمایا: ہم تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں تاکہ تم ہمارے معاملے کا فیصلہ کر دو۔ حضرت زید (رض) نے بستر کے درمیان سے جگہ خالی کرتے ہوئے عرض کی: اے امیر المومنین! یہاں تشریف رکھئے۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا: یہ تمہارا پہلا ظلم ہے جو تم نے فیصلے کے لیے مقرر ہونے کے بعد کیا، میں تو اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ یہ فرما کر حضرت عمر فاروق (رض) حضرت ابی بن کعب (رض) کے ساتھ حضرت زید (رض) کے سامنے بیٹھ گئے۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی، حضرت ابی بن کعب (رض) نے دعویٰ کیا اور حضرت عمر فاروق (رض) نے اس کا انکار کیا (حضرت ابی بن کعب (رض) اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے گواہ پیش نہ کر سکے تو اب شرعی اصول کے مطابق حضرت عمر فاروق (رض) پر قسم کھانا لازم آتا تھا) حضرت زید بن ثابت (رض) نے (حضرت عمر فاروق (رض) کی شخصیت اور رتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے) حضرت ابی بن کعب (رض) سے کہا: آپ امیر المومنین (رض) سے قسم لینے سے در گزر کیجئے۔
حضرت عمر فاروق (رض) نے فوراً حلف اٹھالیا اور قسم کھاتے ہوئے فرمایا: زید اس وقت تک منصب قضاء (یعنی جج بننے) کا اہل نہیں ہو سکتا جب تک کہ عمر (رض) اور ایک عام شخص اس کے نزدیک (مقدمے کے معاملے میں) برابر نہیں ہو جاتے۔ (ابن عساکر، ذکر من اسمہ زید، زید بن ثابت بن الضحاک۔۔الخ، ۳۱۹/۱۹)
مختصر یہ کہ مذکورہ دونوں آیتوں میں دو باتوں کی تاکید کی گئی ہے۔
-1 خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے ہر حال میں عدل وانصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ کسی سے کسی قسم کے تعلق کی بنا پر اس میں کمزوری نہیں آنی چاہیے اور نہ کسی دشمنی اور عداوت کی بناء پر اس میں کوتاہی کی جائے*۔ 2۔ سچی شہادت اور حق بات بیان کرنے سے گریز نہ کیا جائے تاکہ منصف کو صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔
قرآن کریم میں کئی جگہ اس کی تاکید آئی ہے کہ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ کی جائے چنانچہ سورۃ بقرہ آیت 283 میں نہایت صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔
ولا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانہ اثم قلبہ۔
(ترجمہ) اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپائے گا، اس کا دل گناہ گار ہوگا۔
گویا سچی گواہی دینا واجب اور اس کا چھپانا سخت گناہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم میں یہ تاکید بھی فرمادی گئی کہ:۔
ولا یضار۔۔ ولا شھید (بقرہ آیت 282)
معاملے کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یعنی ان کو بلاوجہ پریشان نہ کیا جائے اور کم سے کم وقت میں ان کا بیان لے کر فارغ کر دیا جائے۔ (احسن)

آیت مبارکہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۹﴾

لغۃ القرآن: [وَعَدَ اللّٰهُ : وعدہ کیا اللہ نے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][وَعَمِلُوا : اور انہوں نے عمل کیے][الصّٰلِحٰتِ ۙ: صالح (جمع)][لَهُمْ : ان کے لیے][مَّغْفِرَةٌ: بخشش][وَّاَجْرٌ: اور اجر][عَظِيْمٌ: بہت بڑا]

ترجمہ: اللہ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وعدہ فرمایا ہے (کہ) ان کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے

تشریح:

اللہ کی نعمتوں کی شکر گزاری اور عہد کی پاسداری کا صلہ، اس کے مقابلے میں ناقدری و عہد شکنی اور تکفیر و تکذیب کی سزا بیان کی گئی ہے۔
یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب بیان ہے کہ جب وہ اچھے اور برے اعمال کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اچھے کام کا اجر اور برے کام کے انجام کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ آدمی کے سامنے ہوں تاکہ اس کے لیے اچھے اور برے کی تمیز اور ان کے درمیان فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔ مراد یہ ہے جس ایمان پر قائم رہنے اور صالح کردار کو اختیار کرنے کا تم سے عہد لیا گیا ہے اگر اس پر پورا اترو گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم اور اس کی مغفرت و رحمت کے حق دار ہو گے۔ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کرو گے اور برے اعمال کے مرتکب ہو گے تو تمہیں دہکتی ہوئی جہنم میں رہنا ہو گا۔
اچھے اعمال سے مراد ہر وہ عمل ہے جو رضائے الٰہی کا سبب بنے۔ اس میں فرائض و واجبات، سنتیں، مستحبات، جانی و مالی عبادتیں، حقوق اللہ، حقوق العباد وغیرہ سب داخل ہیں۔

نیک اعمال کی ترغیب

ترغیب کیلئے ایک حدیث مبارک پیش کی جاتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل (رض) فرماتے ہیں "میں ایک سفر میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ تھا، ایک روز چلتے چلتے میں آپ کے قریب ہو گیا اور عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، مجھے ایسا عمل

بتایئے کہ جو مجھے جنت میں داخل کرے اور جہنم سے دور رکھے۔ حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تو نے مجھ سے ایک بہت بڑی بات کا سوال کیا البتہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسان فرمادے اس کے لیے آسان ہے، تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ شریف کا حج کرو۔ پھر ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں نیکی کے دروازے نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے بجھا (یعنی مٹا) دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھاتا ہے اور رات کے درمیانی حصے میں انسان کا نماز پڑھنا (بھی گناہوں کو مٹا دیتا ہے) پھر یہ آیت "تَتَجَافٰی جُنُوبُہُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ" (ترجمہ: ان کی کروٹیں بستروں سے الگ رہتی ہیں) سے لے کر "یَعۡمَلُوۡنَ" تک تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا:- میں تمہیں ساری چیزوں کا سر، ستون اور کوہان کی بلندی نہ بتادوں؟ میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ارشاد فرمایا: تمام چیزوں کا سر اسلام ہے اور اس کا ستون نماز اور کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں ان سب کے اصل کی خبر نہ دے دوں۔ میں نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر ارشاد فرمایا: "اسے روکو۔ میں نے عرض کی: اے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے نبی! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا زبانی گفتگو پر بھی ہمارا مؤاخذہ ہوگا؟ ارشاد فرمایا "تیری ماں تجھے روئے! لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں ان کی زبانوں کی کاٹی ہوئی کھیتی (یعنی گفتگو) گراتی ہے۔ (1)

(ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ، ۲۸۰/۴، الحدیث: ۲۶۲۵) (صراط)

سمع واطاعت اور اجتماعی عدل پر اللہ کا وعدہ

اوپر جو باتیں بیان فرمائی گئی ہیں 'ان کا نتیجہ یہاں بیان ہو رہا ہے کہ اگر تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کروگے اور وہ بھی اس طرح کہ عدل کی حکمرانی قائم کرنے کے بعد تم واقعی اپنے عہد و پیمان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تازہ رکھوگے اور اگر تم نے پوری زندگی اس طرح اختیار کی کہ تم نے جو اللہ سے اقرار کیا تھا کہ یا اللہ! تیری سنیں گے اور تیری اطاعت کریں گے۔ کسی اور کی نہ سنیں گے 'نہ اطاعت کریں گے۔-جیسے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا:

لا طاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق

(خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی)

چاہے وہ کتنا بڑا حکمران کیوں نہ ہو۔ اطاعت صرف اللہ کی ہو گی۔ حکمرانوں کی اطاعت صرف اس معاملے میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق حکم دیں۔ فرمایا کہ اگر تم نے اقرار کیا اور اجتماعی عدل کے مطابق زندگی گزاری 'یہ دو کام کیے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ تمہیں نہ صرف یہ کہ بخش دے گا بلکہ تمہیں تمہارے ان اعمال کا بہترین صلہ دے گا۔

ایمان اور عمل صالح کا اجر

بنیادی عقائد یعنی توحید ' رسالت اور آخرت کا زبان سے اقرار اور دل سے ان کی تصدیق ایمان کہلاتا ہے اور اس ایمان کے مطابق شریعت کے احکام پر عمل کو عمل صالح کہا جاتا ہے۔ عمل چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ نماز پڑھنے کو بھی عمل صالح اور عدل کی حکمرانی کو بھی عمل صالح کہتے ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی عمل صالح ہے ' اگر وہ اللہ کی شریعت کے مطابق ہو اور اس کی رضا کے لیے کیا جائے اور کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی جو پوری قوم اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کرتی ہے ' وہ بھی عمل صالح ہے۔ اس لیے کہ وہ اس عہد و قرار کے مطابق ہے جسے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر ذکر کیا گیا ہے ' کہا اگر تم نے ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کو پورا کیا تو ہم تمھیں بڑا انعام دیں گے۔

غور کیجئے ! دنیا کا معمولی حکمران بھی کبھی اپنے کسی ملازم سے کسی بات کا وعدہ نہیں کرتا اور اگر ملازم یہ کہے کہ جناب ! آپ وعدہ کریں کہ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے ' تو وہ اسے ویسے ہی نکال دے گا کہ بدبخت ! تو مجھ سے وعدے کا مطالبہ کرتا ہے ؟ تیری یہ جرات ! تجھے جو بھی میں دے دوں ' وہ تو میری عطا اور بخشش ہے۔ تو اس قابل کہاں کہ تو مجھ سے کسی وعدے کا مطالبہ کرنے لگے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ کہاں مخلوق اور کہاں خالق ' کہاں ایک بندہ اور کہاں اللہ کی ذات ' کہاں یہ دنیا کی بوسیدہ زمین پر رہتی ہوئی قومیں اور کہاں عرش معلیٰ پر جلوہ افروز اللہ کی ذات گرامی۔ میں جلوہ افروز اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اللہ وہاں بیٹھا ہوا ہے بلکہ اس لیے کہ عرش معلیٰ اس کی قدرتوں کی جلوہ گاہ اور اس کی ذات کی تجلی گاہ ہے۔ وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ بندوں کی کیا حیثیت کہ اس سے کسی بھی قسم کے وعدے کا مطالبہ کریں ؟ لیکن اللہ کا کرم دیکھئے ! فرمایا کہ اگر تم نے یہ دونوں کام اپنے ذمے لے لیے کہ ہم کبھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی مخالفت نہیں کریں گے اور کبھی عدل سے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے تو میں بھی تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزارو گے ' دو چیزیں تمہارے لیے ہوں گی ایک میں (اللہ) تمھیں مغفرت سے نوازوں گا۔ اس راستے میں تم سے کوئی چھوٹی موٹی کوتاہیاں بھی ہوں گی ' لیکن تم نے قصداً انھیں نہیں کیا ہوگا تو اللہ ان سے درگزر فرمائے گا اور دوسرا یہ کہ جو اچھے اعمال تم کرو گے ' اس کے بدلے اللہ بہت بڑا اجر دے گا۔

جب کوئی آدمی کسی چیز کو بڑی کہتا ہے تو اس کا بڑا کہنا اس کی ذات کی بڑائی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ جب کہتا ہے کہ مجھے بڑا کھلونا لا دو ' تو وہ بچے کے لحاظ سے بڑا ہوگا ' لیکن جب اس کا باپ کہتا ہے کہ میں کوئی بڑی چیز چاہتا ہوں تو ممکن ہے کہ وہ بڑی چیز شاید پوری آبادی میں نہ سما سکے۔ اسی طرح جب ایک بادشاہ کسی چیز کو عظیم کہتا ہے تو اس کی عظمت اس کی اپنی عظمت کا پرتو ہوگی۔

اب اندازہ فرمائیں کہ اگر ہر ایک کی وسعت اس کے اپنے مطابق ہے۔ تو اللہ کی وسعت کیا ہے ؟ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے ؟ جب وہ یہ کہتا ہے کہ لوگو ! تمہاری غلطیاں بھی معاف کروں گا۔ تم اقتصادی میدان میں بھی جو غلطیاں کرو گے میں اسے بھی درگزر کروں گا اور تمہاری ترقی کے پہیئے کو گھومنے سے نہیں روکوں گا۔ تم اجتماعی زندگی میں ٹھوکریں کھاؤ گے ' میں تمھیں اس کی بھی سمجھ عطا کروں گا۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا :

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (الانفال : ۲۹)

" اگر تم تقویٰ کی دولت حاصل کر لو تو اللہ تمھیں ایک ایسی قوت تمیز عطا کرے گا جس کے نتیجے میں تم اپنی زندگی میں اجتماعی غلطیوں سے بچ جاؤ گے "

یعنی اللہ تمہاری راہنمائی کرے گا اور تم ٹھوکریں نہیں کھاؤ گے ' صحیح راستے پر چلو گے اور اگر کبھی غلطیاں ہو بھی جائیں گی تو اللہ تمہاری ان برائیوں کو مٹا ڈالے گا۔ اس کا اللہ نے قرآن میں جا بجا وعدہ کیا ہے۔

فرمایا: دیکھو! میں تمہیں بہت بڑا اجر دوں گا اور یہ بڑا اجر تمہاری حیثیت کے لحاظ سے نہیں ' میری اپنی ذات کے حوالے سے ہوگا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ جب اللہ کسی کو بڑا اجر دے گا تو وہ کیا ہوگا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ دینے پر آتا ہے تو موسیٰ (علیہ السلام) آگ لینے جاتے ہیں اور اللہ انھیں پیغمبری دے دیتا ہے۔ شداد بدبخت سمندر میں بہتے ہوئے ایک تختے پر ایک بالکل بے بس اور بے کس بچہ پیدا ہوا تھا 'لیکن جب وہ دینے پر آیا تو اسے دنیا کی حکومت دے دی اور اس نے اللہ کے مقابلے میں جنت بنا ڈالی اور جب وہ چھیننے پر آیا تو اپنی ہی تیار کی ہوئی جنت دیکھنے کے لیے جب شداد آیا تو ابھی اس کا ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر ہی تھا کہ حکم دیا کہ اس کی جان قبض کر لو۔ کہا: میرا ان بندوں سے وعدہ ہے کہ اگر وہ ان دو وعدوں کو پورا کریں تو "لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ " "ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی 'لیکن ساتھ ہی یہ بھی اگلی آیت میں فرما دیا (روح)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے بخشش کا وعدہ فرمایا ہے۔

۲۔ نیک اعمال کرنے والوں کے لیے بہت زیادہ اجر ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرنے والے جہنم میں ہوں گے۔

۴: اس آیت سے مزید دو مسئلے معلوم ہوئے، ایک یہ کہ اعمال پر ایمان مقدم ہے کہ ایمان کا ذکر پہلے ہوا۔ دوسرے یہ کہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال بھی ضروری ہیں۔ پھل وہی کھا سکتا ہے جو جڑ اور شاخوں کی حفاظت کرے۔

۵: رب کے وعدے سچے ہیں، لیکن اعتبار خاتمہ کا ہے۔ ایمان سے نکل جانے والا خود اس وعدے سے نکل گیا۔ اللہ سچا ہے بندے جھوٹے ہو جاتے ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۰﴾

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][كَفَرُوْا : جنہوں نے کفر کیا][وَكَذَّبُوْا : اور انہوں نے جھٹلایا][بِاٰيٰتِنَآ : ہماری آیات کو][اُولٰٓئِكَ : یہ لوگ][اَصْحٰبُ : والے][الْجَحِيْمِ : جہنم]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ (میں جلنے) والے ہیں.

تشریح:

(ک ف ر) الکفر

اصل میں کفر کے معنی کیس چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیچ کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوات کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار یہ دین کے معنی میں اور کفور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ۔فَاَبٰی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا [الإسراء/99] توظالموں نے انکار کرنے کے سوا اسے قبول نہ کیا۔

(ج ح م) الجحمۃ آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے الجحیم (فعیل ہے جس کے معنی (دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں۔ اور جحمۃ النار سے بطور استعارہ جحم استعار ہوتا ہے جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے کہا جاتا ہے: ۔ جحم (ف) الاسد بعینیۃ شیر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیونکہ شیر کی آنکھیں بھی آگ کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

شان نزول

کلام خداوندی کا اسلوب ہے کہ ایک فریق (اور اس کے عواقب) کا ذکر کرنے کے بعد دوسرے فریق (اور اس کے نتائج) کا ذکر کرتا ہے (آیات مذکورہ بالا میں بھی یہی اسلوب پیش نظر رکھا گیا ہے)

بغوی نے اپنے سلسلہ سند سے مجاہد ' عکرمہ ' کلبی اور ابن بشار کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت منذر بن عمر ساعدی کو مہاجرین وانصار کی تیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ بنی عامر صعصعہ کی طرف (تبلیغ اسلام کے لئے) بھیجا یہ منذر وہی تھے جو

گھاٹی والی رات میں (انصار کے) نمائندوں میں سے ایک نمائندہ تھے حسب الحکم یہ لوگ گئے اور بنی عامر کے ایک چشمہ پر جس کا نام بیر معونہ تھا بنی عامر بن طفیل سے مقابلہ ہوا (بنی عامر نے فریب کیا اور سب کو قتل کر دینا چاہا) اور لڑائی ہو پڑی۔ نتیجہ میں حضرت منذر (رض) اور آپ کے ساتھی شہید ہو گئے صرف تین مسلمان بچے جو گم شدہ اونٹنی ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک عمرو بن امیہ ضمری تھے یہ بات دیکھ کر ان تینوں کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کچھ پرندے آسمان پر چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کی چونچوں سے خون کے لوتھڑے زمین پر گر رہے ہیں یہ سماں دیکھ کر ایک صاحب بولے ہمارے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ یہ کہہ کر اپنی جماعت کی طرف رخ کر کے دوڑتے ہوئے پلٹے پڑے راستہ میں ایک آدمی سے مقابلہ ہوا دونوں میں لڑائی ہونے لگی آخر ایک ضرب مسلمان کے کاری لگی تو انھوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا آنکھیں کھولیں اور فرمایا اللہ اکبر 'رب العالمین کی قسم میں جنت میں داخل ہو گیا اور دوسرے دونوں ساتھی بھی لوٹ پڑے ان کا مقابلہ بنی سلیم کے دو آدمیوں سے ہوا (بنی سلیم بنی عامر کی ایک شاخ تھی) ان دونوں آدمیوں نے اپنا نسب بنی عامر سے ملایا تو دونوں مسلمانوں نے (ان کو کافر سمجھ کر) قتل کر دیا 'مگر واقع میں بنی سلیم اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک معاہدہ صلح ہو چکا تھا 'جس کی وجہ سے بنی سلیم والے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی خدمت میں خون بہا مانگنے حاضر ہوئے (خون بہا ادا کرنے کو پیسہ نہ تھا اس لئے) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابوبکر (رض) 'حضرت عمر (رض) 'حضرت عثمان (رض) 'حضرت علی (رض) 'حضرت طلحہ (رض) اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ساتھ لے کر کعب بن اشرف (یہودی) اور بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے تاکہ دیت ادا کرنے میں ان سے مالی امداد لیں کیونکہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں لڑائی نہ ہو گی اور (اگر مسلمانوں کو ضرورت ہوئی تو) خون بہا ادا کرنے میں مسلمانوں کی مدد کریں گے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کا مطلب سمجھ کر یہودیوں نے کہا ' ہاں ابوالقاسم اب وقت آیا ہے کہ تم ہم سے آکر اپنی ضرورت مانگو۔ بیٹھو۔ اوّل ہم تم کو کھانا کھلائیں گے پھر جو کچھ مانگتے ہو وہ دیں گے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیٹھ گئے۔ یہودیوں نے باہم مشورہ کیا اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس قدر آج تمہارے قریب آ گئے ہیں آئندہ اتنے قریب کبھی نہیں آئیں گے 'اس وقت اگر کوئی ہوتا کہ اس مکان کی چھت پر چڑھ کر اوپر سے محمد پر ایک بڑا پتھر گرا دیتا تو (ہمیشہ کے لئے) ہم کو سکھ مل جاتا۔ عمرو بن حجاش نے کہا ایسا میں کروں گا چنانچہ وہ ایک بڑی چکی کے پاٹ نیچے گرا دینے کے ارادہ سے گیا۔ مگر اللہ نے یہودیوں کے ہاتھ باندھ دیئے اور جبرائیل (علیہ السلام) نے آکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خبر دے دی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) والا مدینہ کو لوٹنے کے ارادہ سے باہر آ گئے۔ پھر حضرت علی (رض) کو بلا کر فرمایا تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا اگر میرے رفقاء میں سے کوئی شخص تمہارے پاس آکر مجھے دریافت کرے تو کہہ دینا کہ وہ مدینہ کو گئے ہیں حضرت علی (رض) نے حکم کی تعمیل کی۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب ساتھی نکل آئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (مظہری)

حضور سید اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک منزل میں قیام فرمایا اور اصحاب علیہم رضوان جدا جدا اور درختوں کے سایہ میں آرام گزیں ہو گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی تلوار ایک درخت میں لٹکا دی ایک اعرابی غورث بن حارث نے اپنی قوم سے کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کئے دیتا ہوں۔ وہ تلوار درخت سے اتار کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بڑھا اور پکارا یا محمد من یمنعک منی۔ اے محمد اب آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرا اللہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمانا تھا کہ روح الامین نے اس کا ہاتھ روک لیا اور تلوار گرا دی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی وقت تلوار تھامی اور

فرمایاالان من یمنعک منی۔اب تامجھ سے تجھے کون بچانے والا ہے وہ اعرابی لرز گیااور کہنے لگا کوئی نہیں سوا آپ کے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تلوار نیام میں کی اور فرمایا جا۔ وہ دست بستہ کھڑا ہوااور کہنے لگا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد انک محمد رسول اللہ (تفسیر ابو السعود)

اور روح المعانی میں ہے ان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واصحابہ بعسفان قاموا الی الظہر معا فلما صلوا ندامواان لاکانوا اکوا علیھم وھموا ان یوا فعوا بھم اذا قاموا الی الصلوۃ العصر فرد اللہ تعالیٰ کید ھم بان انزل صلوۃ الخوف۔ مقام عسفان میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معہ صحابہ ظہر پڑھ رہے تھے۔ مشرکین نے دیکھا کہ اب ظہر پڑھ چکے ہیں تو بہت پچھتائے اور ارادہ کیا کہ جب عصر کے لیے کھڑے ہوں تو یکبارگی حملہ کرو اللہ تعالیٰ نے ان کا مکرر فرمایااور صلوۃ خوف کا طریقہ تعلیم فرمادیا۔اور نماز خوف کے احکام نازل ہوئے جس میں مسلمان دو ٹولیاں بنا کر نماز با جماعت پڑھتے ہیں آدھے نماز میں آدھے کفار کے مقابل ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھ لیتے ہیں، دوسری میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ (تفسیر خازن، تفسیر کبیر)

مفعل واقعہ گزشتہ صفحات میں رکوع تیرہواں سورۃ نساء میں واذا کنتم فیھم فاقمت لھم الصلوۃ فلتقم طآئفۃ منھم مع ولیاخذوآ اسلحتھم کے تحت گزر چکا۔ واتقوا اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ پر ہی اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔ (حسنات)

اور جنہوں نے کفر کیااور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ "یعنی انھوں نے ان آیات کی تکذیب کی جو حق مبین پر دلالت کرتی ہیں حالانکہ ان آیات نے حقائق کو بیان کر دیا تھا (اولئک اصحب الجحیم) "وہ جہنمی ہیں۔ "وہ جہنم کے ساتھ اس طرح لازم رہیں گے جس طرح دوست دوست کے ساتھ لازم رہتا ہے۔ (سعدی)

ان آیات کفر وایمان کے مال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مومن "اجر عظیم "اور مغفرت وبخشش کا مستحق ہے اور کافر ومنکر دوزخ وجہنم کا، اس لیے کہ دنیا میں مومن نے اپنے اعمال سے اور ایمان مستحکم سے ہمیشہ حصول جنت کی کوشش کی ہے اور کافر تکذیب وانکار کی وجہ سے آتشکدہ جحیم کے قریب ہوتا گیا ہے پس یہ ضرور تھا کہ آخرت میں یہ تفاوت راہ بین اور متمائز ہو۔

بات یہ ہے کہ ایمان وعمل صالح مرد مومن میں ایک زبردست قوت حیات پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی آخروی زندگی کامیابی و کامرانی سے گزرتی ہے اور کفر انکار چونکہ نام ہے مقدان عیش کے اسباب موجہ کا، اس لیے لازماً دوزخ وجہنم کی زندگی ہی کافر کے لیے سزاوار ہے۔ (سراج)

"اصحب الجحیم"۔ صاحب میں مفہوم عارضی وہنگامی اجتماع کا نہیں، بلکہ مستقل اور طویل تعلق کا پایا جاتا ہے۔اس لیے کافروں کو اصحاب دوزخ کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ وہ گویا دوزخ ہی کے لیے بنے ہیں یا دوزخ انہی کے لیے بنی ہے اگر صرف وعید کی صورت ہوتی تو کچھ امید نجات کی باقی بھی رہ جاتی۔ (ماجدی)

مفہوم عکس سے، یقینی طور پر معلوم ہوا کہ دوزخ میں ہیشگی صرف کافروں کے لیے ہے مومن کتنا ہی گناہ گار ہو دوزخ میں ہمیشہ نہ رہے گا۔ اشارۃً یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار کے چھوٹے بچے دوزخی نہیں کیونکہ انھوں نے آیتوں کو جھٹلایا نہیں۔ (نور)

آیت مبارکہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

لغۃ القرآن: [يَآيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو][اٰمَنُوا : ایمان لائے ہو][اذْكُرُوْا : یاد کرو تم][نِعْمَتَ : نعمت][اللّٰهِ : اللہ کی][عَلَيْكُمْ : تم پر][اِذْ : جب][هَمَّ : ارادہ کیا][قَوْمٌ: ایک قوم][اَنْ يَّبْسُطُوْٓا : یہ کہ وہ بڑھائیں][اِلَيْكُمْ : تمہاری طرف][اَيْدِيَهُمْ : اپنے ہاتھ][فَكَفَّ : اس نے روک دیا][اَيْدِيَهُمْ : ان کے ہاتھ][عَنْكُمْ : تم سے][وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور ڈرو اللہ][وَعَلَي اللّٰهِ : اور اللہ پر][فَلْيَتَوَكَّلِ : پس چاہیے کہ توکل کریں][الْمُؤْمِنُوْنَ : ایمان والے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم اللہ کے (اُس) انعام کو یاد کرو (جو) تم پر ہوا جب قوم (کفّار) نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے ہاتھ (قتل وہلاکت کے لئے) تمہاری طرف دراز کریں تو اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے

تشریح:

یہاں اللہ نے بار بار جس نعمت کا ذکر کیا ہے 'وہ ہے تکمیل دین کی نعمت۔ اسی تکمیل دین کے حوالے سے امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بہت سارے انعامات کی بشارت۔ اس حوالے سے ایک وعدہ بھی کیا گیا۔ اب اس وعدے کی مثال دی جارہی ہے۔ وعدہ یہ کیا تھا کہ لوگو ! ہم نے تم پر دین کو مکمل کردیا ہے اور تمہیں اتنی طاقت دے دی ہے کہ

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدۃ : ۳)

(آج دنیا اس بات سے مایوس ہوگئی ہے کہ وہ زبردستی تمہیں اپنے دین اور طریقے پر لاسکتے ہیں)

اب تمہارا دین ایک بالادست دین ہے۔ اب تمہارا ایک ایک بول دنیا میں غالب آئے گا۔ تم علم اور سیاست کے زور سے ایک بالادست قوت بن چکے ہو۔ البتہ ! صرف ایک احتیاط کرنا کہ ان باطل قوتوں میں سے کسی سے نہ ڈرنا ' جب بھی ڈرنا مجھ سے ڈرنا۔ اگر تم مجھ سے ڈرو گے ' یہ تمہارے خلاف (بھلے ہزار سازشیں کریں) ناکام رہیں گی۔
اب دیکھیں ! یہ باتیں کتنی واضح ہیں کہ اگر تم مجھ سے ڈرو گے تو یہ لوگ تمہارے خلاف کچھ بھی کرنا چاہیں ' کچھ نہیں کر سکیں گے۔ سازشیں ہوں گی ' لیکن میں تمہیں بچاؤں گا۔ اب اس کی مثال دی جارہی ہے۔ فرمایا : اے لوگو جو ایمان لائے ہو ! یاد کرو جب ایک قوم نے ارادہ کیا کہ وہ پھیلا دے تم تک اپنے ہاتھ۔ مطلب یہ کہ اس قوم کے کچھ لوگوں نے تم پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ' مگر تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اللہ نے کہا تھا کہ " مجھ سے ڈرنا " اب اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ تمہیں بچاتا۔ لہٰذا اس نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا۔ تمہارا وعدہ کیا ہے ؟ کہ تم میرے ہو کر جیو گے اور میرا وعدہ کیا ہے ؟ کسی کو تم پر غالب نہیں آنے دوں گا۔

شان نزول

اس آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام (رض) نے کئی واقعات بیان کیے ہیں کہ ایک جنگ میں صحابہ کرام (رض) میدان میں پھیل گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی ایک درخت پر تلوار لٹکا دی اور چادر ڈال کر نیچے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ کہیں سے دوسرے قبیلے کا کوئی فرد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ڈھونڈتا ہوا نکل آیا۔ اس نے تلوار اتاری اور نیام سے نکال کر کہنے لگا :
من یمنعك یا محمد ؟ (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! تجھے اب کون بچائے گا ؟)
اب اندازہ کریں کہ تلوار اس کے ہاتھ میں ہے اور اس بدو کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بڑے آرام سے فرماتے ہیں : میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ اس کے ہاتھ میں تھر تھری آئی۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال دی اور پاس بیٹھ کر معافیاں مانگنے لگا۔
اسی طرح ایک مرتبہ بنو نضیر نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک معاہدے کے لیے بلایا۔ جس دیوار کے نیچے بٹھایا ' اس پر لوگوں کو چڑھا دیا کہ اوپر سے پتھر گرا کر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں کو مار ڈالیں۔ جبرائیل (علیہ السلام) نے اطلاع دی جس پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اٹھ کر چلے آئے۔ جس سیاق وسباق میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں ' اس زمانے کی بات ہے جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عمرہ کرنے کی نیت سے گئے تھے۔ اس وقت بھی راستے میں خالد بن ولید نے دو سو آدمیوں کو لے کر اچانک نماز کی حالت میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حملہ کیا۔ نجانے کیا ہوا ؟ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کچھ نہیں بگاڑ سکے بلکہ سارے کے سارے گرفتار ہوگئے۔ یہ مختلف واقعات اس طرف اشارے ہیں کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں بچاؤں گا ' یہ میری ذمہ داری ہے ' لیکن تمہیں میرے ہو کر رہنا ہے۔ بس آئندہ بھی اللہ سے ہی ڈرتے رہنا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے اس وعدے کی بس دو ہی شرائط ہیں ' ایک اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور دوسرا اللہ پر توکل کرنا۔ یاد رکھیں توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تیاری نہ کرنا۔ بلکہ

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

توکل یہ نہیں کہ آپ پچاس سال سوئے رہیں اور جب حالات بگڑنے لگیں تو کبھی اس سے مدد مانگیں ' کبھی اس سے مدد مانگیں۔ یاد رکھیں ! جو حکمران بھی کسی اسلامی حکومت کو چلاتا ہو اور وہ علمی اور عملی لحاظ سے ملک کی حفاظت کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا ' اس کا سامان نہیں کرتا ' یقین جانئے ! وہ تارکِ صلوٰۃ سے بڑا مجرم ہے کیونکہ نماز نہ پڑھنا کسی ایک آدمی کا جرم ہے اور ملک کو دفاعی نقطۂ نظر سے کمزور رکھنا ' یہ اس کے مقابلے میں بہت بڑا جرم ہے کیونکہ اس کا بھی حکم قرآن میں اللہ نے دیا ہے۔ فرمایا :

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ (الانفال : ٦٠)

(یہ امر ہے کہ تیاری کرو ' اتنی تیاری کہ تمہارا دشمن تم سے کانپنے اور ڈرنے لگے)

فرمایا کہ تیاری کے بعد توکل کرو ' یعنی اسباب کی فراہمی میں کمی نہ رہے لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبّب الاسباب یعنی اللہ تعالیٰ پر ہو اور زندگی کے تمام اعمال اور تمام شعبے اسی کے تقویٰ کے آئینہ دار ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ پروردگار کی طرف سے تائید و نصرت کا نزول نہ ہو۔ (روح)

ٹھیک کہا ظفر علی خاں نے

یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو !

وہ جو خدا کے ہو گئے، ان کا خدا ہوا

اللہ تعالیٰ کا خوف اختیار کرنے سے مسلمان کے کردار میں پرہیزگاری اور نکھار پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے سے غیروں کے مقابلہ میں حوصلہ، جرات اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

(عَنۡ أَبِي مُوسٰى (رض) قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَثَلُ الَّذِي يَذۡكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذۡكُرُ رَبَّهُ مَثَلُ الۡحَيِّ وَالۡمَيِّتِ) [رواہ البخاری : کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل]

"حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان بیان کرتے ہیں کہ اپنے پروردگار کا ذکر کرنے والے کی مثال زندہ اور نہ کرنے والے کی مثال مردہ شخص کی سی ہے۔"

(عَنۡ أَبِي هُرَيۡرَةَ (رض) قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالَى أَنَا عِنۡدَ ظَنِّ عَبۡدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي فَإِنۡ ذَكَرَنِي فِي نَفۡسِهِ ذَكَرۡتُهُ فِي نَفۡسِي وَإِنۡ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرۡتُهُ فِي مَلَإٍ خَيۡرٍ مِنۡهُمۡ) [رواہ البخاری : کتاب التوحید، باب یحذرکم اللہ نفسہ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میں اپنے بندے کے ساتھ اپنے بارے میں اس کے ظن کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ وہ جب میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر وہ میرا ذکر اپنے دل میں کرتا ہے تو میں اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر کسی گروہ میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر گروہ میں کرتا ہوں۔"

(عَنۡ عَائِشَةَ قَالَتۡ كَانَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَذۡكُرُ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ أَحۡيَانِهِ) [رواہ مسلم : بابُ ذِكۡرِ اللّٰهِ تَعَالَى فِي حَالِ الۡجَنَابَةِ وَغَيۡرِهَا]

"حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر حال میں اللہ کا ذکر فرماتے تھے۔" (فہم)

بعض خصوصی احسانات

عمومی احسانات یاد دلانے کے بعد بعض خصوصی احسان یاد دلاتے ہیں۔ یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے مگر حق تعالیٰ کے فضل و رحمت نے ان کا کوئی داؤ چلنے نہ دیا۔ اس احسان عظیم کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان غلبہ اور قابو حاصل کرلینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل وانصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑیں جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے

مومن کی سیاست

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ گزرے کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بد باطنوں کی جرات بڑھ جانے کا قوی احتمال ہے اس کا ازالہ (وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ) سے فرمادیا۔ یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست تقویٰ اور توکل علی اللہ (خدا سے ڈرنا اور اسی پر بھروسہ کرنا) ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد واقرار کئے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو۔ پھر بجمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگلی آیت میں ہماری عبرت کے لیے ایک ایسی قوم کا ذکر فرمادیا جس نے خدا سے نڈر ہو کر بدعہدی اور غداری کی تھی وہ کس طرح ذلیل وخوار ہوئی۔

ترقی کے لیے دو وصف

جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو وصفوں کو اختیار کرے گا اس کو بھی ایسی ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت وحمایت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

نیز تقویٰ اور خوف خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو، عہد ومیثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کرسکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوف خدا نہیں ہوتا وہاں عہد ومیثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آج کل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لیے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے، وہاں بھی آخر آیت میں واتقوااللّٰہ فرمایا گیا تھا۔ (گلدستہ)

مسائل

ا۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے احسان یاد رکھنے چاہئیں۔
۲۔ اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔
۳۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والا ہے۔
۴۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمت یاد کرنا حکم ربانی ہے۔ محفل میلاد شریف میں بھی اللہ کی بڑی نعمت کی یاد جاتی ہے کیونکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت رب کی سب سے بڑی نعمت ہے، نیز نعمت کی یاد رب کا شکر ہے رب نے فرمایا واما بنعمۃ ربک فحدث اور فرمایا لئن شکرتم لازیدنکم۔
۵: خیال رہے کہ طبیبوں سے دوا، اور بزرگوں سے دعا کرانا توکل کے خلاف نہیں کہ یہ اسباب پر عمل ہے۔

آیت مبارکہ:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

لغۃ القرآن: [وَلَقَدْ : اور یقیناً][اَخَذَ : اس نے لیا][اللّٰهُ : اللہ][مِيْثَاقَ : پختہ عہد][بَنِيْٓ اِ سْرَاۗءِيْلَ : بنی اسرائیل][وَبَعَثْنَا : اور ہم نے مقرر کیے][مِنْهُمُ : ان سے][اثْنَيْ عَشَرَ :: بارہ][نَقِيْبًا: سردار][وَقَالَ : اور اس نے فرمایا][اللّٰهُ : اللہ][اِنِّىْ : یقیناً میں][مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہوں][لَىِٕنْ : اگر][اَقَمْتُمُ : تم قائم رکھو][الصَّلٰوةَ : نماز][وَاٰتَيْتُمُ : اور ادا کرو][الزَّكٰوةَ : زکوۃ][وَاٰمَنْتُمْ : اور ایمان لاؤ][بِرُسُلِيْ : میرے

رسولوں کے ساتھ][وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ : اور ان کو تقویت پہنچاؤ][وَاَقْرَضْتُمُ : اور تم قرض دو][اللّٰهَ : اللہ][قَرْضًا : قرض][حَسَنًا : اچھا][لَّاُكَفِّرَنَّ : تو میں ضرور مٹاؤں گا][عَنْكُمْ : تم سے][سَيِّاٰتِكُمْ : تمہاری برائیاں][وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ : اور میں ضرورداخل کروں گا تم کو][جَنّٰتٍ : باغات][تَجْرِيْ : چلتی ہیں][مِنْ : سے][تَحْتِهَا : نیچے اس کے][الْاَنْهٰرُ : نہریں][فَمَنْ : تو جو][كَفَرَ : اس نے انکار کیا][بَعْدَ : بعد][ذٰلِكَ : اس کے][مِنْكُمْ : تم سے][فَقَدْ : تو یقیناً][ضَلَّ : وہ بھٹک گیا][سَوَآءَ السَّبِيْلِ : سیدھا راستہ]

ترجمہ: اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیااور (اس کی تعمیل، تنفیذ اور نگہبانی کے لئے) ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے، اور اللہ نے (بنی اسرائیل سے) فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری خصوصی مدد و نصرت تمہارے ساتھ رہے گی)، اگر تم نے نماز قائم رکھی اور تم زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر (ہمیشہ) ایمان لاتے رہے اور ان (کے پیغمبرانہ مشن) کی مدد کرتے رہے اور اللہ کو (اس کے دین کی حمایت و نصرت میں مال خرچ کرکے) قرض حسن دیتے رہے تو میں تم سے تمہارے گناہوں کو ضرور مٹادوں گااور تمہیں یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کردوں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جس نے (بھی) کفر (یعنی عہد سے انحراف) کیا تو بیشک وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

تشریح:

دین کے بنیادی اصول ہمیشہ سے ایک رہے ہیں۔ انہی کا بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا۔ جس کے بڑے بڑے ذیل میں دیئے گئے ہیں، جن کی پاسداری کا اسلام نے حکم دیا ہے۔ لٰہذا یہود و نصاریٰ کو انہی پر ایمان لانا چاہیے۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد کی اٹھارہ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان پر عمل درآمد کروانے کے لیے کوہ طور کو ان کے
سروں پر منڈلایا گیااور ان کے قبائل کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں بارہ ۱۲ نقیب مقرر کیے۔ نقیب کا معنی ہے کڑی نگرانی اور دوسرے کے معاملات کو کنٹرول کرنے والا۔ ان نقباء کی تعیناتی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو تعینات فرمایا تھا۔ جن باتوں کا بنی اسرائیل سے بار بار عہد لیا گیا ان کا خلاصہ اس آیت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل اگر ان باتوں پر سختی سے عمل پیرا ہو جاؤ تو نہ صرف اللہ کی دستگیری اور معیت تمہیں حاصل ہو گی۔ بلکہ گناہوں کی معافی اور تمہارا جنت میں داخلہ یقینی ہوگا۔ جس نے اس عہد کی خلاف ورزی کی وہ ہماری دستگیری سے محروم اور صراط مستقیم سے گمراہ تصور ہوگا۔ ”سواء السبیل “سے مراد شریعت کا متوازن اور معتدل راستہ ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔

عہد کی بنیادی شرائط اور اہمیت

ا۔ نماز قائم کرنا: ہر دین میں نماز اللہ تعالیٰ کی نہایت ہی پسندیدہ عبادت رہی ہے۔ جو فکر و عمل کی پاکیزگی کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کے حقوق کی ترجمان ہے۔
۲۔ زکوۃ: یہ غرباء سے عملی ہمدردی کا مظہر، بخل کا علاج اور تزکیہ مال کے ساتھ غریبوں کے حقوق کی محافظ ہے۔
۳۔ انبیاء پر ایمان لانا اور ان کی تکریم و معاونت کرنا کیونکہ انبیاء ہی اللہ تعالیٰ کے ترجمان اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرکے دکھلانے والے ہیں۔ لہٰذا ان کی تکریم اور تابعداری فرض ہے۔ ایمان لانے اور تکریم کرنے میں بدرجہ اولیٰ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شامل ہیں۔ کیونکہ ہر نبی اور رسول آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کا اعلان کرتا رہا۔ اور سب انبیاء سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تائید کرنے کا عہد لیا گیا ہے۔

صدقہ سے مراد عام صدقہ بھی ہے اور زکوۃ بھی

صدقہ کرنے کی یہ کہہ کر تلقین فرمائی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کے مترادف ہے قرض کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا تاکہ دینے والے کے دل میں حوصلہ اور امید پیدا ہو کہ مجھے اس سے زیادہ ملنے والا ہے۔

عہد کی پاسداری کا صلہ

اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے عہد کی پاسداری کرتے رہو اس سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی دستگیری اور تائید حاصل ہوگی تمہاری بشری کوتاہیوں کو معاف کرکے تمہیں جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد کی شرائط:
ا۔ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔
۲۔ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا۔ والدین کے ساتھ احسان کرنا۔
۳۔ وَذِى الۡقُرۡبٰى۔ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ
۴۔ وَالۡيَتٰمٰى۔ یتیموں کے ساتھ
۵۔ وَالۡمَسٰكِيۡنِ۔ اور غریبوں کے ساتھ احسان کرنا۔
۶۔ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔
۷۔ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ۔ نماز قائم کرنا۔
۸۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ۔ زکوۃ ادا کرنا۔ (البقرۃ: ۸۳)
۹۔ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ۔ آپس میں خون نہ بہانا۔

۱۰۔ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ۔ کمزوروں کو ان کے گھروں سے نہ نکالنا۔ (البقرۃ: ۸۴)
۱۱۔ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ۔ اللہ کے احکام کو پوری قوت کے ساتھ پکڑے رکھنا۔
۱۲۔ وَاسْمَعُوْا۔ اللہ کے احکام سننا۔ (البقرۃ: ۹۳)
۱۳۔ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ۔ انھیں لوگوں کے سامنے بیان کرنا۔
۱۴۔ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ۔ انھیں ہرگز نہ چھپانا۔ (اٰل عمران: ۱۸۷)
۱۵۔ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ۔ اللہ کے انبیاء پر ایمان لانا۔
۱۶۔ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ۔ ان کی تعظیم کرنا۔
۱۷۔ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ اللہ کو قرض دینا یعنی صدقہ کرنا۔ (المائدۃ: ۱۲) (فہم)

اس سے پہلے سورۃ مائدہ کی ساتویں آیت میں مسلمانوں سے ایک عہد لیا گیا تھا جس میں زندگی کے انفرادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اجتماعی معاملات پہ بھی بہت واضح میثاق تھا۔ اس رکوع کے آغاز میں یہ بات بتانا مقصود ہے کہ مسلمان اس میثاق کو یونہی ایک فارمیلٹی نہ سمجھیں بلکہ تاریخ کے پس منظر میں اچھی طرح جانچ لیں کہ یہ عہد ومیثاق اس امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جب بھی کسی امت کو اس دعوت کے منصب پہ فائز کیا گیا 'ان سے ایسا ہی عہد لیا گیا 'اسی کے نتیجے میں ایک تاریخ مرتب ہوتی رہی اور اسی حوالہ سے جو جو نمایاں خدمات امتوں نے سرانجام دیں 'انہی کا صلہ ان امتوں کو ملا اور جہاں جہاں ان امتوں نے ٹھوکریں کھائیں 'انھیں کی پاداش میں ان کے ساتھ سزا اور عذاب کا معاملہ ہوتا رہا۔ اگر آج ہم اس آئینہ میں اپنی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس سے کوئی سبق نہ سیکھ سکیں۔

بنی اسرائیل سے جب یہ عہد ومیثاق لیا گیا تو وہ بارہ قبیلوں پر مشتمل ایک قوم تھی۔ یعنی پہلے سے نسلی اعتبار سے یا انتظامی نقطہ نگاہ سے وہ بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان میں موجود پہلے سے کسی انتظام کو مجروح نہ کیا جائے بلکہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس انتظام کی نوعیت بدل دی جائے۔ پہلے ان بارہ سرداروں کی عام ذمہ داریاں قبیلے کی خاندانی ضرورتوں کے حوالے سے ہوں گی 'لیکن اب ان میں ایک نیا شعور اور ایک نئی معنویت پیدا کی گئی جس کے اظہار کے لیے ایک نیا معنی خیز نام ان کے لیے تجویز کیا گیا جسے قرآن کریم نے "نقیب" کے نام سے ذکر کیا۔ تورات میں سردار کا لفظ آیا ہے 'ہوسکتا ہے اپنے نزول کے وقت جبکہ تورات عبرانی یا کسی اور زبان میں نازل ہوئی تو اس میں اسی کا ہم معنی لفظ ہو ' لیکن بعد میں ترجمہ در ترجمہ تورات جب ہم تک پہنچی تو وہ لفظ سردار کی صورت میں منقول ہوا حالانکہ سردار کے لفظ میں وہ وسعت نہیں ہے۔ سردار صرف سردار ہوتا ہے 'اس سے کسی معنویت کا اظہار نہیں ہوتا۔ جبکہ قرآن کریم نے "نقیب" کا لفظ استعمال کیا ہے 'جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل میں ان کو کیا ذمہ داریاں دی گئیں۔

نقیب

نَقَبَ: (کھوج لگانا 'ٹوہ لگانا 'جستجو کرنا 'حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور پھر اس کے مطابق آگے انتظامات کرنا) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی ذمہ داری یہ ٹھہرائی گئی تھی کہ تمہیں اچھی طرح اپنے قبیلے کے لوگوں کے بارے میں یہ کھوج لگانا ہے کہ ان سے جو عہد واقرار لیا گیا ہے 'اس اقرار میں یہ کہیں کمی بیشی تو نہیں کر رہے یا یہ اس میں کہیں کسی کمزوری کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ اب اصلاً ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے 'اللہ کے ساتھ عہد واقرار کی وابستگی کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد میں یہ لوگ کیسے ہیں؟ لہٰذا سرداروں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اس عہد کے معاملے

میں لوگوں کی ٹوہ میں رہنا ہے اور جستجو کرنا ہے' اس کے نتیجے میں جو ظاہر ہو وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچانا ہے اور پھر مل کر ان کی ساری کمزوریوں کا علاج کرنا ہے۔

نقیب کی ذمہ داریاں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی یہی سنت رہی ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اسی سنت پہ عمل کرتے ہوئے (بیعت عقبہ ثانیہ) کے وقت (مدینہ سے) آنے والے لوگوں پر بارہ آدمی بطور نقیب مقرر فرمائے تھے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حوالے سے بھی جو بارہ حواری مشہور ہیں' وہ بھی دراصل اس امت کے بارہ نقیب تھے' جن کے سپرد یہی ذمہ داری کی گئی تھی۔ امتوں کی روایت یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اپنے دور کے لوگوں میں کوئی حیثیت بخشتا ہے' خواہ وہ حیثیت سیاسی ہو یا مادی' برادری کے اعتبار سے ہو یا اجتماعیت عامہ کے اعتبار سے' ان تمام کو اللہ اس ذمہ داری کے حوالے سے ماتحت لوگوں پر نقیب بناتا ہے۔ یہ بات میں بڑے اصرار سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنے پورے معاشرتی نظام کو نہ صرف بری طرح توڑا ہے' بلکہ اس کی اسلامی روح کو بھی نکال باہر کیا ہے۔ تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاسی رہنما صرف سیاسی داؤ پیچ کے لیے نہیں تھے' بلکہ ان پر دینی' معاشرتی' معاشی' تہذیبی و تمدنی ذمہ داریاں تھیں اور ان کا کام یہ تھا کہ جو لوگ بھی ان کے پیروکار ہوں انھیں یہ چیک کریں کہ وہ لوگ اسلامی نقطہ نگاہ اور مصلحت عامہ کے حوالے سے کہاں تک صاحب الرائے اور عزم و ہمت کے حامل ہیں' کہاں تک ایفائے عہد کر رہے ہیں اور کہاں کہاں ان میں کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ کام نہ صرف سیاسی رہنماؤں بلکہ ارباب حکومت' بیوروکریٹس' برادریوں کے رہنماؤں اور علماء و مشائخ کو بھی کرنا تھا' لیکن دیکھ لیجئے کہ کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہا جنھوں نے یہ نقیب ہونے کا فرض انجام دیا ہو یا آج تک کوئی کوشش بھی کی ہو بلکہ ہر شعبہ اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے اپنا دائرہ اثر بڑھانے کی فکر میں تو لگا رہتا ہے' مگر اپنے اصل عہد و فرائض کا کسی کو احساس نہیں اور اللہ نے فرمایا:
(میں تمہارے ساتھ ہوں)

اللہ کن کے ساتھ ہوتا ہے

یہ اس عہد و میثاق کا بیان ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں نماز کے اہتمام' زکوۃ کی ادائیگی' آئندہ آنے والے رسولوں پر ایمان اور ان کی تائید اور خدا کی راہ میں انفاق کا عہد لیا گیا ہے اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن سب سے پہلے ذکر اپنی معیت کا کیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ میں اس کو دو طرح سے لیتا ہوں۔
اس کا ایک مطلب یہ ہے جس کا اظہار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس وقت فرمایا کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غارِ ثور میں گھر گئے اور صدیق اکبر (رض) کے سوا آپ کے ساتھ کوئی نہیں۔ دو فرد ہیں اور جان کے ہزاروں دشمن' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تلاش میں ہیں' حتیٰ کہ جب وہ غار ثور کے دھانے پر پہنچ گئے' اس قدر قریب کہ وہ لوگ باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے اور اندر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سن رہے تھے اور وہ غار نشیب میں تھا لہٰذا جب کوئی چٹان پر کھڑا ہوتا تو اس کی پنڈلیاں غار کے اندر نظر آتیں۔ صدیق اکبر (رض) دیکھ رہے تھے اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں اور ہم میں فاصلہ ہی کتنا ہے' ذرا بھی جھکے تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ لیکن اللہ کے کام نیارے ہیں۔ ذرا اندازہ فرمایئے! ہم ہمیشہ بڑی قوتوں پہ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے اس وقت مکہ کی سب سے بڑی قوت جو ہزارہا جنگجو افراد پر مشتمل ہے' ان کے نمائندہ لوگ

اس غار کے کمزور سے دھانے پہ کھڑے ہیں اور ان کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں 'اگر حائل ہے بھی تو کیا؟ صرف دو چیزیں: ایک یہ کہ اس غار کے منہ پر مکڑی نے (اللہ کے حکم سے) جالا بُن دیا (یہ پہلا قلعہ ہے جسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کے لیے بنایا گیا 'جسے قرآن خود کہتا ہے کہ "گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے"۔ لیکن اللہ جب کسی کو بچانے پہ آتا ہے تو وہ مکڑی کے کمزور گھر کے ذریعے بڑے بڑے قلعے والوں سے اس کو محفوظ کرلیتا ہے)۔ ڈھونڈنے والوں نے سوچا کہ رات کے کسی حصہ میں بھی اگر اس غار میں کوئی داخل ہوا ہوتا تو کیا یہ مکڑی کا جالا سلامت رہتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔ اب جب غار کے دوسرے دہانے پہ دیکھا تو وہاں فاختہ نے انڈے دے رکھے تھے 'انھوں نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ یہاں سے گزرتے تو گھونسلہ ضرور ٹوٹتا۔ یہ دو کمزور سی چیزیں ہیں 'جن کے ذریعے اللہ نے ایک بہت طاقتور دشمن کے مقابلے میں ان کی حفاظت فرمائی اور جب حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے کہا کہ حضور! دشمن تو سر پہ پہنچ گئے تو اسی سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا کہ لَاتَحۡزَنۡ "میری فکر نہ کرو"۔ "حزن" دوسرے کی فکر میں گھلنے اور اس کے لیے غم کھانے کو کہتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا "اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ تم جب اس عہد واقرار کو پورا کرنے کی فکر کرو تو یہ نہ بھولنا کہ اللہ جس طرح نصرت واعانت کی شکل میں تمہارے ساتھ ہے 'اسی طرح وہ نگراں کے طور پر بھی تمہارے ساتھ ہے یعنی یہ نہ سمجھنا کہ تم جو چاہو کر ڈالو 'تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تمہارے ساتھ ہے 'وہ ہر دم تمہیں دیکھ رہا ہے کہ کیا تم ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے واقعی اخلاص کا دامن تھامے ہوئے ہو 'تمہارے اندر کوئی چور دروازے تو نہیں ہیں 'ایسا تو نہیں کہ عمل کچھ اور ہے اور ارادے کچھ اور ہوں 'یہ تو نہیں کہ کہا کچھ جارہا ہے اور دل میں کچھ اور چھپا ہوا ہے ؟ اگر ایسا ہے تو پھر جان لو! یہ ساری باتیں اللہ سے ہرگز مخفی نہیں ہیں "اِنِّیۡ مَعَکُمۡ" (بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں) لہٰذا یاد رکھنا! تم کوئی کام چوری سے نہ کرسکوگے اور نیت کا فتور تمہیں بچا نہیں سکے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ ایمان ایسا پختہ ہو کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے قریب جانے اور اللہ کو اپنے قریب سمجھے۔ مشکلات میں ہو تو یقین رکھے کہ اس کی نگہبانی میں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا 'کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرے اور عمل کرتے ہوئے کبھی اس سے لاپرواہ نہ ہو۔ یہی وہ احساسات ہیں جنھیں ایمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"نماز" اللہ پر ایمان کے اظہار کی ابتدا

ایمان کے بعد ظاہر ہے کہ دوسرا مرحلہ عمل کا آتا ہے جو ایمان کے تمام مقتضیات کا حامل ہے۔ عمل 'ایمان کا نتیجہ بھی ہے اور ایمان کی دلیل بھی۔ عمل کی مختلف شکلیں ہیں جس کی تفصیل طوالانی ہے لیکن عمل کی اہم تر صورت نماز ہے۔ اس لیے یہاں قرآن کریم نے اعمال کے ضمن میں سب سے پہلے فرمایا کہ "لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوۃَ" یعنی تمہارے اس اقرار کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور اس پر تم چل بھی نہ سکوگے تاوقتیکہ تم یہ کام نہ کرو یعنی تم نماز قائم کرو اور یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تمہارا ساتھ دے گا۔ پورے اسلام کی روح کو جس ایک عمل میں بند کردیا گیا ہے 'وہ نماز ہے۔ یہ نماز ہی ہے جو ہمیں اسلامی زندگی پہ اکساتی اور آمادہ کرتی رہتی ہے 'بشرطیکہ ہم نماز کو سوچ سمجھ کر پڑھیں کیونکہ نماز کی اصل روح یہ ہے کہ اللہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے 'سیاسی طور پر بھی 'معاشی طور پر بھی 'تہذیبی وتمدنی طور پر بھی 'کوئی ذات اس سے بڑی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی سی بات قبول کرلی جائے تو سارے بکھیڑے ختم ہوجاتے ہیں۔ جب آدمی ایمان لاتا ہے تو جو چیز سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے 'وہ نماز ہے۔ یعنی فرض کریں کہ کسی نے دن چڑھے ایمان قبول کیا ہے 'اب جونہی ظہر کا وقت آئے گا تو سب سے پہلے اس پر نماز فرض ہوگی اور اگر عصر کے وقت کیا ہے تو عصر کی نماز فرض ہوگی۔ غرض کسی بھی لمحے ایمان قبول کیا جائے 'سب سے پہلے نماز ہی فرض ہوتی

ہے۔ نماز میں کھڑے ہو کر جب آدمی ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو گویا وہ ساری دنیا کو پیچھے پھینک دیتا ہے۔ نمازی کا یہ عمل اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اپنے عمل سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے دنیا کی تمام قوتو! میں تمھیں پس پشت پھینک کر اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد میری زندگی میں اللہ ہی سب سے بڑا ہے' للذا یہ سر تمہارے سامنے نہیں جھک سکتا' میں تمہاری قوتوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ تمہاری قوتیں اللہ کی قوت سے بڑی نہیں۔ میں تمہارے تخت کو خاطر میں نہیں لاتا' اس لیے کہ تمہارا تخت اللہ کے تخت سے بڑا نہیں ہے۔

جب ایک مومن اللہ اکبر کہتا ہے تو ایک نئی سحر طلوع ہوتی ہے۔ تمام تخت و تاج اچھل جاتے ہیں' تمام قوتیں سمٹ جاتی ہیں' انسانیت کا ایک نیا سرمایہ وجود میں آتا ہے اور ایک نماز پڑھنے والا جب کہتا ہے "اللہ اکبر" اور ہاتھ باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے تو اللہ ہی کی غلامی کا عہد کر کے تمام غلامیوں سے اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔ اس لیے پہلا اقرار یہ لیا کہ تمہیں نماز قائم کرنی ہے اور یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ جب بھی کبھی امت مسلمہ بنی ہے تو اس پر سب سے پہلے نماز فرض ہوئی ہے اور جب بھی ان کی معزولی کا وقت قریب آیا' یعنی انھوں نے اپنے آپ کو نااہل ثابت کیا اور ان کی جگہ اللہ نے دوسری قوموں کو اٹھایا تو اس کی وجہ نمازوں کا ضائع کر دینا ہی ٹھہرا ہے۔

" ترک نماز " امت مسلمہ کے زوال کی پہلی نشانی

قرآن کریم بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (مریم ۱۱: ۵۹)

(پھر اچھے لوگوں کے بعد برے جانشین آئے' انھوں نے نماز کو ضائع کر دیا)

" خلف "برے جانشین کو کہتے ہیں یعنی بنی اسرائیل کو معزول اس لیے کیا گیا کہ بعد میں آنے والے نالائق' ناخلف واقع ہوئے اور انھوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ نمازیں ضائع کر دیں۔

آج ہم میں بالخصوص بیوروکریٹس' حکمران' پڑھے لکھے طبقے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں جس چیز کی قدر و قیمت سب سے کم ہو گئی ہے' وہ نماز کی پابندی ہے۔ بڑی بڑی میٹنگز میں ایک ایک چیز پہ دھیان دیا جائے گا' چائے کے لوازمات تک کا خیال رکھا جائے گا' مگر جس بات کی پروا نہیں کی جاتی' وہ نماز ہے۔ اذانیں گونج رہی ہوتی ہیں مگر بہت کم نماز کی توفیق ہوتی ہے حالانکہ اسلامی معاشرے میں حکومت وقت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کرے اور اس میں ذرا نرمی نہ کرے۔

اسی لیے ایک دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا

" میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی کو جماعت کرانے کے لیے کہوں اور خود جا کر ان گھروں کو آگ لگا دوں جہاں لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور جماعت میں شامل نہیں ہوتے' میں ایسا ضرور کر گزرتا اگر مجھے گھروں میں عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور مریضوں کا خیال نہ ہوتا۔"

غور کریں کہ یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے ہیں جو کبھی دشمن کے لیے بھی بددعا نہیں کرتے' وہ اپنے لوگوں کے لیے سراپا غضب بنے ہوئے ہیں کیونکہ حضور جانتے تھے کہ یہی چیز اس امت کو امت بنانے والی اور اسلام میں ڈھالنے والی ہے اور یہی اگر نکل گئی تو پھر اس امت کی معزولی کو کوئی نہیں روک سکے گا۔

"زکوۃ "حبِ الٰہی کے اظہار کا دوسرا ذریعہ

وَاٰتَیۡتُمُ الزَّکٰوۃَ "اور تم زکوۃ ادا کرو "انسان کا ایک رشتہ تو اپنے اللہ سے قلب و دماغ کا رشتہ ہے جو اگر استوار ہو جائے تو باقی تمام رشتے خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن نجانے کیا بات ہے کہ انسان قلبی و ذہنی رشتے کو کسی حد تک استوار رکھتا بھی ہے 'لیکن مالی رشتے کے معاملے میں کمزور ثابت ہوتا ہے۔ ماں باپ سے انسان کتنی محبت رکھتا ہے 'لیکن اکثر دیکھا ہے کہ جب بچے کمانے لگیں تو والدین سے پیسہ چھپا چھپا کے رکھتے ہیں۔ پیسے کی محبت بعض اوقات جان کی محبت پہ غالب آ جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم جہاں نماز پہ زور دیتا ہے 'وہاں ساتھ ساتھ زکوۃ پہ بھی زور دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اسیّ (۸۰) مقامات پہ دونوں کو بیک وقت حکم کے انداز میں بیان فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے ایمان کو قائم نہیں رکھ سکتے تاوقتیکہ کہ تم نماز پڑھو اور زکوۃ ادا کرو۔ جب تک تمہارا کمایا ہوا مال 'جائیداد 'تمہاری ایک ایک مادی چیز 'جس سے تمہارے قلب و دماغ کے رشتے ہیں 'اللہ سے وابستہ نہ ہو جائے 'اس وقت تک تمہاری ایمانی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ اچھے اچھے نیک لوگ مادی معاملات میں آ کر کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ تہجد گزار لوگ تک اپنی وراثت میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ

" ہر امت کی ایک آزمائش ہے اور ہمیشہ امتیں آزمائش میں ناکام ہو کر گرتی رہی ہیں 'تمہاری آزمائش یہ ہے کہ تمہیں دولت دنیا سے آزمایا جائے گا۔"

آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مشہور حدیث ہے

ما الفقرُ اَخشیٰ علیکم ولٰکنی اخشیٰ اَن تُبسَطَ عَلَیکم الدُّنیا کما بُسِطت عَلیٰ من قبلکم فَتَنَا فَسُوھَا کما تَنَا فَسُوھَا فتُھلِککم کما اھلکتھم

(میں اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم بھوکوں مر جاؤ گے بلکہ مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ تم پر دولت دنیا کھول دی جائے گی جس طرح تم سے پہلی قوموں پر کھولی گئی پھر اس دنیا طلبی میں اور دوسروں سے آگے بڑھنے میں ایک ریس میں لگ جاؤ گے جس طرح پہلی قومیں لگی رہیں یہ صورت حال بالآخر تمہیں تباہ کر دے گی جیسا اس نے پہلی قوموں کو کیا)

اس حدیث پاک میں سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تمہیں وسائل کی کمی اور فاقہ کشی تباہ کر دے گی کیونکہ وسائل کی کمی نے قوموں کے لیے مشکلات تو پیدا کی ہیں ان کی تباہی کا سامان کبھی نہیں کیا اور اب امت مسلمہ کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری کافر قوموں کی طرح رات دن اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہے کہ ہم اپنے وسائل میں کس طرح اضافہ کریں کیونکہ اگر ہمارے وسائل ہماری آبادی کی تعداد کے مطابق نہ ہوئے تو ہم تباہ ہو جائیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم آبادی کی کمی کے لیے اور وسائل کی افزونی کے لیے کوشاں ہیں لیکن برسوں سے جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ یہ ہے کہ آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور وسائل بظاہر کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری بات آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ ارشاد فرمائی کہ مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ تم میں دولت کی ریل پیل ہو گی 'تمہارے وسائل میں اضافہ ہو گا تیل کے چشمے تمہارے پاؤں کے نیچے سے ابلیں گے 'زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دے گی لیکن جیسے جیسے ان وسائل میں اضافہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے تمہاری ہوس دنیا فزوں تر ہوتی جائے گی۔ دولت کی بہتات سے بجائے آسودگی پیدا ہونے کے استسقاء کے مرض کی طرح حب دنیا ایک بحران کی شکل اختیار کر لے گی۔ تم میں سے ہر شخص اپنی موجودہ حالت پر قناعت کی بجائے دوسرے جیسا بننے یا اس سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ سائیکل والا موٹر سائیکل کی خواہش میں 'موٹر سائیکل والا کار کی خواہش میں اور کار والا بڑی کار کی فکر میں یا ہر سال

ماڈل بدلنے کی ہوس میں اندھا ہو جائے گا۔ ہر گھر والا اس بات پر پریشان ہو گا کہ میرے گھر کی منڈیر دوسرے گھر کے برابر یا اونچی کیوں نہیں۔ اس کے نتیجے میں اگر وہ اپنا گھر اونچا کرے گا تو پڑوسی اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے اور ایک منزل اپنے گھر کی اٹھالے گا اس طرح یہ پورا معاشرہ ایک ایسی دوڑ میں لگ جائے گا جو پورے معاشرے کو تھکا کے مار ڈالے گی اور منزلیں اٹھانے کا مقابلہ بالآخر مکینوں سمیت مکانوں کو زمین بوس کر دے گا۔ آخر میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اسی ہوس دنیا اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر نے پہلی قوموں کو تباہ کیا یہی تمہیں بھی تباہ کر کے چھوڑے گی۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے آج کچھ مستشرقین اور اہل تشیع ایک سوال بہت اٹھاتے ہیں کہ عمل سیدنا ابوبکرؓ جو مانعین زکوۃ کے لئے تھا دست نہیں تھا اس سے وہ مسلمانوں کے درمیان تشکیک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ معروضی حقائق کیا تھے اس سے سرف نظر کرتے ہیں اس پر بھی مختصر بات کر لیتے ہیں۔

مشکوۃ شریف۔ جلد دوم۔ زکوۃ کا بیان۔ حدیث 286

مانعین زکوۃ سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اقدام

راوی:

عن أبي هريرة قال: لما توفي النبي صلى الله عليه وسلم واستخلف أبو بكر و كفر من كفر من العرب قال عمر: يا أبا بكر كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: " أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله فمن قال: لا إله إلا الله عصم مني ماله ونفسه إلا بحقه وحسابه على الله ". قال أبو بكر: والله لأقاتلن من فرق بين الصلاة والزكاة فإن الزكاة حق المال والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها إلى رسول الله صلى الله عليه و سلم لقاتلتهم على منعها. قال عمر: فوالله ما هو إلا أن رأيت أن قد شرح الله صدر أبي بكر للقتال فعرفت أنه الحق

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ قرار پائے تو اہل عرب میں جنہیں کافر ہو گئے یعنی زکوۃ کے منکر ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فیصلہ سن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ آپ لوگوں یعنی اہل ایمان سے کیونکہ جنگ کریں گے۔ جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ نہ کہیں (یعنی اسلام لے آئیں) لہٰذا جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا یعنی اسلام قبول کر لیا اس نے مجھ سے اپنی جان اور اپنا مال محفوظ کر لیا سوائے اسلام کے حق اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم میں اس شخص سے

ضرور جنگ کروں جو نماز اور روزہ کے درمیان فرق کرے کیونکہ جس طرح جان کا حق نماز ہے اسی طرح بلاشبہ مال کا حق زکوۃ ہے اور اللہ کی قسم اگر وہ لوگ جو منکر زکوۃ ہو رہے ہیں مجھے بکری کا بچہ بھی نہ دیں گے جو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیتے تھے تو میں ان کے اس انکار کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر کہنے لگے اللہ کی قسم اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہ میں نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنگ کرنے کے لئے الہام کے ذریعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دل کھول دیا ہے یعنی پر یقین کر دیا ہے لہٰذا مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہی یعنی منکرین زکوۃ سے جنگ ہی حق اور درست ہے۔

تشریح

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول قرار پائے تو کچھ نئے فتنوں نے سر ابھارنا چاہا۔ اس بارے میں ہم نے دسویں قسط میں تذکرہ صدیق کے تحت کچھ روشنی ڈالی تھی اور وہاں ان فتنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خصوصیت سے فتنہ ارتداد کا ذکر کیا تھا جس کے متعلق بتایا تھا کہ اس عظیم فتنہ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتنی جرات اور تدبر کے ساتھ ختم کیا اور وہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔

مذکورہ بالا حدیث میں اسی قسم کے ایک اور فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی صورت یہ ہوئی کہ کچھ قبائل مثلاً غطفان اور بنی سلیم وغیرہ نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا اس طرح انہوں نے اسلام کے اس اہم اور بنیادی فریضہ کا انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کسی فریضہ پر عمل نہ کرنا اور بات ہے مگر اس فریضہ کا سرے سے انکار ہی کر دینا ایک دوسرے معنی رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ منکرین زکوۃ کے بارے میں کفر حقیقی معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے ویسے اس لفظ کے بارے میں تفصیل یہ کی جاتی ہے کہ یا تو ان لوگوں کے بارے میں لفظ "کفر" (وہ کافر ہو گئے) حقیقی معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے کیونکہ زکوۃ کی فرضیت قطعی ہے اور فرضیت زکوۃ سے انکار کفر ہے یا یہ کہ ان لوگوں کو کافر اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے زکوۃ دینے سے انکار کیا لہٰذا ان کے اس سخت جرم پر بطریق تغلیظ و تشدید کفر کا اطلاق کیا گیا۔

حضرت ابو بکر کے پیش نظر اور سورۃ توبہ کی آیت تھی۔۔۔ حضرت ابو بکر کا اصرار اس آیت کی بنا پر تھا فان تابوا واقاموا الصلواہ وآتوا الزکواہ فاخوانکم فی الدین کہ اگر وہ تائب ہو جائیں، نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ جو نماز اور زکواہ کو الگ الگ کرے گا اس سے جہاد کروں گا۔ بعد میں دنیا بھر میں گورنمنٹ ٹیکس کی ادائیگی سے انکار کرنا سول نافرمانی اور بغاوت ٹھہری۔

منکرین زکوۃ کے کفر کے بارے میں رائے یہ ہے کہ یا تو ان لوگوں کے بارے میں لفظ "کفر" (وہ کافر ہو گئے) حقیقی معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے کیونکہ زکوۃ کی فرضیت قطعی ہے اور فرضیت زکوۃ سے انکار کفر ہے یا یہ کہ ان لوگوں کو کافر اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے

زکوۃ دینے سے انکار کیا لہٰذا ان کے اس سخت جرم پر بطریق تغلیظ و تشدید کفر کا اطلاق کیا گیا۔

عمرؓ کہا کرتے تھے:

یہ جواب سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لیے ابو بکرؓ کو شرح صدر عطا کیا ہے اور حق وہی ہے جو ابو بکرؓ کہتے ہیں۔

اس واقعے سے ملتا جلتا ایک واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا تھا۔ طائف سے قبیلہ ثقیف کا وفد آپ کی خدمت میں قبول اسلام کی غرض سے حاضر ہوا لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ انہیں نماز معاف کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہیں۔

ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض اولیں خیال کرتے تھے، انہوں نے بھی یہی فرمایا:

واللہ! میں ان لوگوں سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔

دشمن قبائل کے وفود

باغی قبائل عبس، ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور فزارہ نے جو مدینہ کے گردونواح میں آباد تھے، مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں اکٹھی کیں اور مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ قبائل دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصہ ربذہ کے قریب مقام ابرق میں خیمہ زن تھا اور دوسرا ذی القصہ میں جو محلہ کے قریب نجد کے راستے میں واقع ہے۔ ان فوجوں کے سرداروں نے پہلے اپنے وفود مدینہ روانہ کیے جنہوں نے وہاں پہنچ کر بعض لوگوں کے ذریعے سے ابو بکرؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہیں البتہ انہیں ادائے زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ لیکن ابو بکرؓ نے وہی جواب دیا جو پہلے عمرؓ کو دے چکے تھے یعنی اگر انہوں نے زکوٰۃ کی ایک رسی بھی ادا کرنے سے انکار کیا تو میں اس رسی کی خاطر ان سے جنگ کروں گا۔

چنانچہ یہ وفود خائب و خاسر ہو کر واپس اپنے اپنے لشکروں میں چلے گئے لیکن قیام مدینہ کے دوران میں انہوں نے وہاں کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کر لیا تھا اور انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں اہل مدینہ بہت کمزور ہیں اور شہر کو بیرونی طاقت کے حملے سے بچا نہیں سکتے۔

ابو بکرؓ کی ہدایات:

ابو بکرؓ کی دوربین آنکھ نے ان لوگوں کے ارادوں کو بھانپ لیا چنانچہ وفود کے واپس جانے کے بعد انہوں نے اہل مدینہ کو جمع کر کے فرمایا:

تمہارے چاروں طرف دشمن ڈیرے ڈالے پڑا ہے اور اسے تمہاری کمزوریوں کا علم ہو گیا ہے۔ نہ معلوم دن اور رات کے کس حصے میں وہ لوگ تم پر چڑھ آئیں۔ وہ تم سے ایک منزل کے فاصلے پر خیمہ زن ہیں۔ ابھی تک وہ اس امید میں تھے کہ شاید تم ان کی شرائط قبول کر لوگے۔ لیکن اب ہم نے ان کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ ضرور تم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو لڑائی کے لیے تیار رکھو۔

اس کے بعد آپ نے علیؓ، زبیر، طلحہؓ اور عبداللہ بن مسعود کو بلایا اور انہیں ایک ایک دستہ دے کر مدینہ کے بیرونی راستوں پر متعین کر دیا۔ دوسرے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مسجد نبوی میں پہنچ جائیں اور لڑائی کی تیاری کریں۔

حضرت سیدنا ابو بکرؓ کے نزدیک کسی ایک رکن اسلام کا انکار کفر تھا اور جس نے انکار کیا اس نے ارتداد کیا اور ارتداد کی سزا موت ہے۔ اسی لئے بنو غطفان اور بنی سلیم کے ساتھ جہاد کیا۔

اگر امت مسلمہ کو اس صورت حال سے بچنا ہے تو اسے وسائل رزق کو ضرورت سمجھ کر حاصل ضرور کرنا چاہیے اور دنیا کو ترقی دینا بھی کوئی گناہ نہیں لیکن یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ مسلمان کا اصل سرمایہ وہ عظمت کردار ہے جو اسلامی شریعت پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اور اللہ ' اس کے رسول۔ ' اس کے دین اور مخلوق خدا کی خدمت کو ترجیح دینے سے پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ہمیشہ امت مسلمہ کو زندگی کے ہر میدان میں فلاح و کامرانی سے نوازا۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
کہ جب بھی جوہر مراد نیا میں آشکار ہوا
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں
قلندری سے ہوا ہے ' تونگری سے نہیں

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہم جب بھی اٹھے ہیں بے سروسامانی سے اٹھے ہیں۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک بھی دور ہم پہ ایسا نہیں گزرا کہ جس کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہوں کہ ہم طاقتور ہو کر یا وسائل کی فراوانی کے ساتھ اٹھے ہوں۔ ہمیشہ ہمارے پاس وسائل کم رہے ' لیکن کردار کی عظمتیں زیادہ رہیں۔

افغانستان نے ولید بن عبدالملک کے زمانے میں خراج دینا بند کر دیا ' یہ بنی امیہ کا سنہری دور تھا۔ ولید بن عبدالملک نے سفارت بھیجی جنھوں نے آکے وہاں کے حکمران سے گفتگو کی تو اس حکمران نے ایک سوال کیا کہ "تم سے پہلے جو لوگ خراج وصول کرنے آتے تھے ' وہ چھوٹے قد کے گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے جبکہ تم بڑے قد و قامت کے ترکی گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے ہو۔ ان کی جوتیاں تک ٹوٹی ہوتی تھیں اور تم زرق برق لباس میں ملبوس ہو۔ ان کے چہرے عبادت کے نور سے روشن ہوتے تھے (واضح رہے یہ لوگ حضرت عمر (رض) کے زمانے میں مفتوح ہوئے تھے) لیکن ان کے پیٹ پچکے ہوئے تھے ' تم ماشاء اللہ خوب تنومند ہو۔ تم ہر لحاظ سے ان سے زیادہ خوشحال دکھائی دیتے ہو ' لیکن وہ اتنے خوشحال نظر نہیں آتے تھے۔ یہ فرق کیا ہے؟"

انھوں نے سینہ بجا کر کہاکہ وہ ہماری بدحالی کا زمانہ تھا ' یہ ہماری خوشحالی کا زمانہ ہے۔اب وہاں کوئی بھوکا نہیں 'اب تم ہر ایک کو ایسا ہی زرق برق لباس پہنے توانا و تندرست اور خوشحال دیکھوگے۔

اس حکمران نے یہ سن کر کہاکہ "ہاں ! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم ہر لحاظ سے ان سے زیادہ جسیم و کیم ہو 'تم ان سے زیاد تنومند اور طاقتور لوگ ہو 'مگر وہ تم سے زیادہ وعدے کے پکے تھے 'وہ تم سے زیادہ صاحب کردار تھے 'ان میں تم سے زیادہ معنوی اور روحانی قوت تھی 'وہی لوگ اس قابل تھے کہ ہم سے خراج وصول کر سکتے۔ تم ہم سے خراج وصول نہیں کر سکتے"۔ چنانچہ اس نے یہ کہہ کر مسلمانوں کی سب سے ترقی یافتہ حکومت کو خراج دینے سے انکار کر دیا اور اس طرح مسلمان پچاس سال تک اس حکومت سے خراج وصول نہ کر سکے۔

انسان کی سب سے بڑی چیز عظمت کردار ہے

قرونِ اولیٰ میں مسلمان اس یقین سے بہرہ ور تھے کہ جن لوگوں میں عہد واقرار کی پابندی ہو 'وہی نماز و زکوۃ کا اہتمام کرتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اس عہد کے پالن ہار اور اس عہد پر پورا اترنے والے ہیں 'یہی دنیا کی اصل طاقت ہیں 'دنیا ان کے سامنے سمٹتی ہے اور جب ان کے گھوڑے دوڑتے ہیں تو زمین ان کے سامنے لپٹنے لگتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں انھوں نے لاکھوں مربع میل علاقہ فتح کیا 'لیکن ایک بھی علاقہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کے خلاف بغاوت ہوئی ہو بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جو علاقے خلافت راشدہ میں فتح ہوئے 'وہ آج تک مسلمانوں کے علاقے ہیں۔ وہ عرب ملک نہیں تھے لیکن آج عرب ملک کے طور پر معروف ہیں۔ یہ لیبیا 'سوڈان 'مصر ' عرب ملک تو نہیں 'یہ تو افریقی ملک ہیں 'جو خلافت راشدہ کے زمانے میں زیر نگیں آئے 'انھوں نے اپنی زبانیں تک بدل ڈالیں اور آج خود کو عرب کہتے ہیں۔ انھیں زبان بدلنے پر کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ زبان ہی کیا 'ان ملکوں کا سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ لیکن ہندوستان اور اندلس جیسے ملک جو بعد کے لوگوں نے فتح کیے 'ان میں فاتحین گردنیں جھکاتے رہے لیکن دلوں کو جھکانے کی انھوں نے کوئی فکر نہیں کی 'نتیجہ یہ ہے کہ یہ ممالک آج بھی کافر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عظمت کردار سب سے بڑی حکومت ہے اور یہ عظمت کردار 'اقامت صلوٰۃ اور زکوۃ کی ادائیگی سے پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کروگے تو اس سے تمہارے دل اور اجڑے گھروندے آباد ہوں گے۔ یہ دونوں قوتیں جب ساتھ مل کر چلیں گی تو اسلامی معاشرے میں خوشحالی کی ایسی لہر اٹھے گی کہ کوئی کسی سے شاکی نہیں رہے گا 'لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظاہر ہے کہ وہی کچھ ہوگا جو آج ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ "اور تم میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے "یعنی اس دور کے لوگوں سے اقرار لینے کے بعد آنے والی نسلوں کے بارے میں خلاء نہیں چھوڑا گیا۔ یہ اقرار بنی اسرائیل سے اس لیے لیا گیا کیونکہ اس کے بعد بھی نبیوں اور رسولوں نے آنا تھا۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہاں اگرچہ آنے والے تمام رسولوں پر ایمان کا تذکرہ ہے 'لیکن بطور خاص اہل کتاب سے آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان کا عہد لیا جارہا ہے کہ دیکھو ! جب ہم نے تمہیں امت کی سرفرازی بخشی تو اسی دن کہا تھا کہ رسول آئیں گے 'آخر میں جا کر ختم الرسل آئیں گے 'خاص طور پر تمہیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ لیکن تم نے کیا کیا؟ تم نے مختلف اوقات و ادوار میں رسولوں کو 'انبیاء کو قتل کیا اور اب آخر میں جو کچھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کر رہے ہو 'وہ تو سب کے سامنے کی بات ہے۔ تم تو اپنے عہد واقرار سے پھر رہے ہو اور عہد بھی وہ جس سے تمہاری ملی زندگی کا آغاز ہوا۔

قرآن میں "ایمان" کے دو معنی

یہاں چونکہ ایمان کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ایمان کے مفہوم و معنی کو واضح کر دیا جائے۔ لغت میں ایمان کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔-1 اٰمَنَ لَہٗ -2 اٰمَنَ بِہٖ۔

1 اٰمَنَ لَہٗ کا معنی ھے صَدَّقَہٗ وَ اعْتَمَدَ عَلَیْہِ جس پر تم ایمان لائے ہو تم نے اس پر اعتماد کیا اور اس کی تصدیق کی یعنی تم اس کی جس جس بات کو بھی مان رہے ہو وہ اس لیے نہیں مان رہے کہ تمہاری عقل اسے تسلیم کرتی ہے یا تمہارا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے بلکہ تم اس کی ہر بات کو صرف اس کے اعتماد پر مانتے ہو۔ تم یہ تسلیم کر چکے ہو کہ اس کی زبان سے کبھی غلط لفظ نہیں نکل سکتا' اس کی کہی ہوئی بات کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر وہ ایسی بات کہے جو عقل و خرد کے لیے قابل تسلیم نہ ہو یا وقت کا چلن اس کے موافق نہ ہو تو ان دونوں چیزوں کو تم غلط سمجھ کر رد کر دو لیکن اس کی بات کو اس لیے قبول کر لو کہ تم اس پر اعتماد رکھتے ہو اس لیے اس کی بات کی تائید کے لیے تمہیں کسی اور طرف سے تائید کی ضرورت نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اس کے اعتماد پر تم جس چیز کو بھی مانو اسے دل کی تصدیق کے ساتھ مانو یعنی اسے صرف زبان کا اقرار اور دماغ کی تائید ہی شامل نہ ہو بلکہ دل کی تصدیق بھی اسے میسر ہو۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان کا یہی مفہوم ہے کہ ہم آپ پر ایمان لائے ہیں تو آپ کا ایک ایک ارشاد اور ایک ایک عمل اس لیے ہمارے لیے قابل تسلیم ہے وہ آپ کا ارشاد اور عمل ہے اور ہم نے دین کو آپ کے اعتماد پر قبول کیا ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہتی ہے اور خود میری عقل اس کو سمجھ سکتی ہے یا نہیں کیونکہ جب میں نے ان پر اعتماد کر لیا ہے کہ ان پر اللہ کی وحی اترتی ہے اور ان کی زبان سے خدا کا قانون بولتا ہے تو اب میرے لیے کسی اور کی طرف دیکھنا اس اعتماد میں خیانت ہے اور مزید یہ بات کہ میں آپ کی ہر بات کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کروں گا کیونکہ دل کی تصدیق ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ سود کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ مجھے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اور آپ کی زبان پر چونکہ اعتماد ہے اس لیے میں دل کی گہرائیوں سے اس حکم کو ماننے پر مجبور ہوں۔ اگر میں اس میں یہ بحث لے کر بیٹھ جاؤں کہ یہ حکم آج کے دور میں قابل عمل ہے یا نہیں اور اگر میں نے اسے قبول کر لیا تو غیر مسلم دنیا کے ساتھ ہمارے معاشی تعلقات متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور میں ان باتوں کو واقعی اہمیت دینا شروع کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول پر میرے ایمان میں کمزوری ہے میں نے ایمان کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

2 اٰمَنَ بِہٖ اس کا معنی ہے اَیْقَنَ بِہٖ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ جس پر ایمان لائے ہیں اس کی ہر ہر بات کو آپ صرف مان کے ہی نہیں دیں گے بلکہ اس پر یقین بھی لائیں گے یعنی آپ اس اطمینان سے بہرہ ور ہوں گے کہ میں جس بات کو مان رہا ہوں پورے یقین اور ایقان سے مان رہا ہوں اور یقین آدمی کے اطمینان کی آخری قوت کا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یقین کی سطح ایک نہیں ہوتی وہ کبھی علم الیقین ہوتا ہے کبھی عین الیقین اور کبھی حق الیقین۔ ہر صاحب ایمان اپنی اپنی ہمت اور مقدر کے مطابق ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ موصوف ہوتا ہے البتہ جو چیز ہر ایمان لانے والے کے لیے ضروری ہے وہ فی الجملہ ایسا یقین ہے جس میں کبھی کسی شک اور ارتیاب کا کانٹا نہ چبھ سکے۔ جس میں علم و دانش کے نام پر بڑے سے بڑا دباؤ بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ افراد اور قوموں کے لیے یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو ان کے لیے قوت کا سامان بنتی ہے۔ مشکل سے مشکل حالات میں ان کو سہارا دیتی ہے اور اگر یہ دولت میسر نہیں آتی تو پھر ایمان محض زبان کی ورزش' دماغ کا تعیش اور دل کا روگ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے اقبال نے بے یقینی قرار دے کر اسے غلامی سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

امت بنی اسرائیل سے تو عہد لیا گیا کہ آنے والے انبیاء و رسل پر ایمان لاؤ 'مگر ہم چونکہ آخری امت ہیں اس لیے ہم سے تمام انبیاء و رسل پر فی الجملہ ایمان کے ساتھ ایسا ایمان جو اطاعت و اتباع پر مشتمل ہو اس کا عہد صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں لیا گیا کہ ان کو یقین و اعتماد کے ساتھ مانو۔ ان کے سوا تمہارا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ تمہارا کوئی نصب العین نہیں 'سوائے اس کے جو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تمہیں دیا۔ تمہاری زندگی کا کوئی حوالہ معتبر نہیں 'سوائے ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے۔ انھوں نے جس طرح زندگی گزاری ہے 'اس کے پورے ادوار تمہارے سامنے ہیں۔ وہی تمہاری روشنی کا سامان ہیں 'وہی تمہارے لیے مینارہ نور ہیں۔ جب تک تم اس یقین سے بہرہ ور نہیں ہوگے 'تب تک نہ جانے کتنے ہیروز ہیں جو تمہاری منزل کھوٹی کرتے رہیں گے 'کتنے دانشور ہیں جو روز تمہاری دانش کو بگاڑیں گے۔

نبی کی مدد کرنے سے مراد

وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ "اور تم ان (آنے والے رسولوں) کی مدد بھی کروگے"۔ اس مدد کے معاملے میں بھی غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدد یہی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کی حفاظت کرو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ (رض) نے یہ فرض بھی اس طرح انجام دیا کہ کارلائل جیسے متعصب مورخ کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ

(عیسائی اس بات کو جتنی جلدی سمجھ لیں اچھا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھی مسیح کے حواری نہیں تھے 'جو اس کو لوگوں میں چھوڑ کر خود بھاگ گئے بلکہ انھوں نے تلواروں کی چھاؤں میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی 'ان کے دائیں سے 'بائیں سے 'آگے سے 'پیچھے سے۔ برابر ان کی نصرت و حفاظت کی اور سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے حتیٰ کہ ان کے لائے ہوئے دین کو بارہ لاکھ مربع میل کے علاقے میں غالب کردیا)

سید عطااللہ شاہ بخاری (رح) کہا کرتے تھے کہ صحابہ کرام (رض) کا تو یہ حال تھا کہ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کہیں یہ کہہ دیتے کہ اپنی کھالوں کے مجھے جوتے بنوادو تو یقیناً وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کی حفاظت میں انھوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن غیر معمولی حالات اور ناگہانی حوادث میں خود پروردگار نے فرشتوں کے ذریعے آپ کی حفاظت فرمائی صرف ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ایک دن ابوجہل نے حلفاً کہا کہ آج اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے سامنے نماز پڑھنے اور سجدہ کرنے کی کوشش کی تو میں (نعوذ باللہ) ان کا سر کچل دوں گا۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کعبہ تشریف لائے تو یہ لوگ انتظار میں تھے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب سجدے میں گئے تو وہ بدبخت آپ پر حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ جیسے ہی قریب ہوا تو ہاتھوں سے کسی چیز کو ہٹاتا ہوا 'نہایت سراسیمہ پیچھے ہٹا۔ لوگوں نے پوچھا: آخر ہوا کیا؟ اس نے کہا کہ جیسے ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریب ہوا تو میں نے دیکھا کہ آگ کی لپٹ اور کچھ پَر میری طرف بڑھ رہے ہیں 'کچھ برچھے میری طرف رخ کر رہے ہیں 'مجھے لگا کہ ایک لمحہ بھی میں یہاں رکا تو میری بوٹیاں اڑادی جائیں گی۔ بعد میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ خوش قسمت تھا بچ نکلا 'اگر مجھ پر حملہ کرتا تو فرشتے اس کے پرزے اڑادیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت اللہ کی جانب سے

اس کے فرشتے کرتے تھے اور جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں تو خطرات مکہ کی نسبت بہت بڑھ گئے تھے اور ان لوگوں سے واسطہ پڑ گیا تھا جن سے آج ہمیں واسطہ پڑا ہوا ہے یعنی یہود جیسے سازشی گروہ سے اور عیسائی ان کے آلہ کار تھے۔

یہ گروہ ہمیشہ سے سازشی گروہ رہا ہے۔ یہ خود تو کم سامنے آتا ہے، دوسروں کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے مدینہ میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب صحابہ کرام (رض) پریشان نہیں ہوتے تھے۔ حضور ذرا آنکھوں سے اوجھل ہوتے تو صحابہ کرام (رض) پریشان ہو جاتے اور تلاش شروع کر دیتے کہ کہیں آپ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عشاء کی نماز کے بعد فرمایا کہ آج کوئی آدمی پہرہ دے تاکہ میں دو گھڑی کے لیے سو جاؤں ' اندازہ لگایئے کہ خطرات کس قدر بڑھ گئے تھے ' چنانچہ سعد بن ابی وقاص (رض) نے ہتھیار باندھے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سر باہر نکالا اور کہا کہ "سعد ! چلے جاؤ ' اللہ نے میری حفاظت کا وعدہ کر لیا ہے اور یہ آیت پڑھی :

واللہ یَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط (اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا) (المائدۃ : ٦٧)

اب جبکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لے لی ' فرشتے ہمہ وقت حفاظت کرنے لگے ' اس لیے اس کی چنداں فکر نہ تھی۔ یہاں جو کہا جا رہا ہے "عَزَّرْتُمُوْھُمْ "تو مطلب یہ ہے کہ تم ان کا احترام بجالاؤ ' ان کی مدد کرو ' یعنی جس دین کو لے کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا میں تشریف لائے اور جسے دنیا میں نافذ و قائم کرنا تھا اور تمام پہلے ادیان کے مقابلے میں اس دین کو قوت دینا تھی اور ہر سطح پر اسے غالب کرنا تھا ' غلبہ عمومی سے لے کر غلبہ خصوصی تک کی فکر کرنا تھی ' اس کے لیے ظاہر ہے کہ آپ کو ہر موقع پر ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ مثلاً فوجیں اگر دشمنوں کے مقابلے میں بھیجنی ہیں ' مددگار نہیں ہوں گے تو کون جائے گا؟ عدالتوں میں عادل جج بٹھانے ہیں ' افراد نہیں ہوں گے تو پھر یہ کام کون کرے گا؟ شہر کی حفاظت کرنی ہے ' لوگ نہیں ہوں گے تو ناکہ بندی کون کرے گا؟ نمازیں پڑھنی ' پڑھانی ہیں ' ہر طرح کے فتنوں پر نگاہ رکھنی ہے اور پورے ملک کے ہر گوشے کو صحیح نہج پر استوار کر کے انتظام چلانا ہے ' اس کے لیے افراد کی ضرورت ہے۔ کہا کہ تمہارا اصل کام یہ ہے کہ تم وہ افراد بنو ' تمام دین کے غلبہ کے لیے پیغمبر کے دست و بازو بنو ' تم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکر بنو اور ان کے مشیر بنو۔ تم اگر قدم قدم پر مدد کرو گے تو یہ گاڑی آگے چلے گی ' ورنہ نہیں چل سکتی۔

نوح (علیہ السلام) اپنی امت کی اصلاح کیوں نہ کر سکے؟ اس لیے کہ ساڑھے نو سو سال میں صرف (٨٠) آدمی ایمان لائے۔ عیسیٰ (علیہ السلام) رومی قوت کے مقابلے میں کیوں نہ اٹھ سکے اور کیوں نہ اپنی حکومت قائم کر سکے؟ اس لیے کہ دس بارہ حواریوں اور چند عقیدت مندوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صورتحال کو کیسے بدلا جا سکتا تھا؟ انقلاب سب سے پہلے افرادی قوت کو دیکھتا ہے ' ان کے اخلاص اور کام کرنے والوں کی محنت کو دیکھتا ہے۔

چنانچہ حضور کی حیات مبارکہ میں بھی مسلمانوں نے یہ فرض انجام دیا اور آپ کے بعد بھی جب دین کے بقا استحکام اور اجرا و نفاذ کے لیے اس کی ضرورت پڑی تو اصحاب عزیمت ہمیشہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے اٹھتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب اسلامی نظام خلافت میں بگاڑ پیدا ہوا حالانکہ اس وقت فتوحات جاری تھیں ' حج ادا ہو رہے تھے ' نمازیں قائم تھیں ' لیکن اسلامی حکومت کا یعنی شورائیت کا اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کا حلیہ بگڑنے لگا تو سیدنا حسین ابن علی (رض) نے دیکھا کہ اسلام کے ایک شعبہ میں آج نقب لگائی جاری ہے ' اگر آج اسے نہ روکا گیا تو کل یہ پورا اسلام کا محل مسمار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے سوچا کہ آج اللہ کے دین کی مدد کے حوالے سے سب سے بڑی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نواسہ ہوں اور دنیا میری طرف دیکھ رہی ہے ' کوفہ والوں نے مجھے بلایا ہے حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ میں خطرات کی طرف بڑھ رہا ہوں اور جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی تو فرمایا کہ میں سب جانتا ہوں لیکن مجھے

فرض پکار رہا ہے۔ دیکھ لیں کہ صرف اس بات کو دہرانے کے لیے کہ دین کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے ؟ آپ (رض) نے اپنی جان کا نذرانہ تک دے دیا۔ اب قیامت تک کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ نامساعد حالات میں دین کی مدد کیونکر ہو سکتی ہے ؟ قریب میں علمائے بنگال نے ' اسی طرح علمائے دیوبند ' علمائے بریلی ' علمائے ندوہ اور 1857ء میں چودہ ہزار علماء نے پھانسی پر لٹک کر دین کی مدد کی تھی ' اسی طرح ہمیشہ دین کی مدد کی جاتی رہے گی۔ اس کے بعد فرمایا :

اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (اللہ کو قرض حسنہ دوگے)

اندازہ کر لیجئے کہ یہ عہد و اقرار بنی اسرائیل کے زمانے سے شروع ہو کر آج تک ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس راہ پر چلنے والے کو جان کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے اور مال کی قربانی بھی۔ صرف زکوۃ دینے سے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ زکوۃ دینے سے تو صرف ہمارے ضروری ادارے چل سکتے ہیں۔ رہی اجتماعی ذمہ داریاں تو اگر وہ حکومت ادا نہ کرے تو مسلمانوں کو خود ادا کرنا پڑتی ہیں۔ زکوۃ تو فرض عین ہے اور اس کے علاوہ باقی اجتماعی ذمہ داریوں کے لیے مال خرچ کرنا فرض کفایہ ہے۔

دیکھیں زکوۃ کا حکم پہلے گزر چکا ہے اور اب قرض حسنہ کی بات ہو رہی ہے اور یہ عہد و اقرار کا حصہ ہے۔ صرف یہ سوچنا کہ میں نے اڑھائی فیصد زکوۃ نکال دی ہے ' باقی سارے لاکھوں کروڑوں میرے اپنے ہیں ' میں ان کا جو چاہے کروں۔ ایسا نہیں ہے۔

اگر ملک پر حملہ ہو جائے اور حکومت ہم سے تقاضہ کرے کہ انڈیا بڑھتا چلا آ رہا ہے اور باقی قوتیں اس کی ہمنوا ہیں اور ہمارے وسائل کافی نہیں ہیں۔ تو ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم جائز حد تک تو اپنی آمدنی میں سے اپنی ضروریات کے لیے روکیں ' باقی سب کچھ حکومت کو دے دیں۔ یہ حکومت پر احسان نہیں بلکہ یہ ہماری شرعی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض کفایہ ہے۔ فرمایا کہ ایسے موقع پر تم اللہ کو قرض دو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے حالانکہ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے دیا تھا ' لاؤ واپس کرو۔

اللہ کو قرض حسنہ دینے کا فائدہ

قرض اس کو کہتے ہیں جس کی ادائیگی لازم ہو ' اللہ نے اس کا نام قرض شاید رکھا ہی اس لیے ہے کہ ہم قیامت میں واپسی کے لیے گزارش کر سکیں بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ فرض کریں میں فرض کفایہ میں مال دے کر کسی وجہ سے پریشان حال ہو جاتا ہوں تو تہجد میں میں اللہ سے کہہ سکتا ہوں کہ یا اللہ ! تو تو بڑا کریم ہے ' میں نے تجھے قرض دیا تھا ' تو تو بڑھا چڑھا کر لوٹانے والا ہے ' پھر یہ کیا بات ہے کہ میں پریشان حالی کا شکار ہوں۔ یقین جانو کہ اس کے بعد پریشانی زیادہ دیر تک نہ رہے گی۔

حدیث میں آتا ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز اشراق سے فارغ ہو کر اٹھنے لگے تو ایک صحابی ابوالدحداح (رض) آگے بڑھے اور کہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! کیا اللہ قرض مانگتا ہے ؟ فرمایا : ہاں ! بولے : کیا واقعی ؟ آپ اس کے گواہ ہیں ؟ فرمایا : ہاں ! میں اس کا گواہ ہوں۔ بولے : میرے پاس ایک باغ ہے ' جس میں میرا گھر بھی ہے۔ اس میں چھ سو پودے کھجور کے اور باقی دوسری فصلیں بھی ہیں ' یہ باغ بڑا ہی نفع دینے والا ہے اور اسی پر میری گزر بسر بھی ہے۔ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گواہ بنا کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ پر وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہ باغ اللہ کو بطور قرض دیتا ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اظہار تحسین فرمایا، دعا دی پھر وہ صحابی گھر پہنچے تو باغ کے کنارے کھڑے ہو کر (اپنی بیوی کو) آواز دی : یا اُم الدحداح ! ۔ وہ آئیں کہ خیریت تو ہے کہ اندر نہیں آتے ' باہر سے بلا رہے ہیں۔ کہنے لگے : سب

کچھ چھوڑ کر اور بچوں کو لے کر باہر نکل آؤ۔ میں نے یہ باغ ' مال اور گھر سمیت اللہ کو دے دیا ہے۔ وہ بولیں: ابوالدحداح! "تم نے بڑا اچھا کاروبار کیا ہے"۔ یہ ہے اللہ کو قرض دینا۔

فرمایا کہ جہاں تم باقی ذمہ داریاں ادا کروگے ' وہاں تمہیں یہ بھی ذمہ داری ادا کرنی ہے کہ وقت پڑنے پر تم اللہ کو قرض حسنہ بھی دو۔ قرض کی وضاحت تو میں نے کر دی اور "قرض حسنہ" اس دولت میں سے دینا ہے جو حلال ذرائع سے کمائی ہو اور پورے دل کی آمادگی کے ساتھ دینا ہے اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر دینا ہے۔ ضروری نہیں وہ لاکھوں میں ہو ' دمڑیوں میں بھی ہو لینے والا تو اللہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دینے والا کن جذبات کے ساتھ دے رہا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ تبوک کے لیے اپیل فرمائی تو عثمان غنی (رض) نے دل کھول کر مال دیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں سے کچھ اشرفیوں کو اپنے ہاتھوں پر الٹتے پلٹتے تھے اور ساتھ ہی فرماتے تھے کہ عثمان آج کے بعد تمہارا کوئی گناہ تمہیں نقصان نہ دے گا اور جنت کی بشارت دی۔ لیکن اسی دوران ایک صاحب ایسے بھی آئے جنھوں نے خشک کھجوروں کی ایک پوٹلی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیش کی اور کہا کہ میں تو بالکل مفلوک الحال آدمی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور یہ کھجوریں میں دن بھر مزدوری کر کے لایا ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پوٹلی کو لے کر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ لوگوں کے عطیات کا جو ڈھیر لگا ہے ان کھجوروں کو اس پر بکھیر دو۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ اس کے اخلاص کی وجہ سے اللہ سب کو قبول فرمائے گا۔

عہد وفا پورا کرنے والوں پر اللہ کا انعام

فرمایا کہ تم جب یہ سب کچھ کر گزروگے تو پھر اللہ تمہارے ساتھ ایک وعدہ کرتا ہے۔ دیکھئے! یہ وعدہ وہ ہستی کر رہی ہے جس کے وعدوں کے شکست ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہماری اور پچھلی قوموں (بنی اسرائیل) کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک ان قوموں نے اپنے یہ وعدے پورے کیے ' اللہ نے کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو ان سے روک کر رکھی ہو۔ امتوں کی سیادت تک سے نوازا اور جہاں تک ہماری تاریخ کا تعلق ہے۔ ہم تو اٹھے ہی صحرا و بیاباں سے تھے۔ جس میں سوائے محرومیوں کے کچھ بھی نہیں تھا ' خوشحالی کا نام و نشان نہیں ' یہاں تک کہ کبھی بھی دنیا کی کسی فاتح قوم نے اس طرف نظر تک نہ کی۔ نہ وہاں کوئی قانون تھا ' نہ اخلاقی قدریں۔ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی شریعت کو فراموش ہوئے صدیاں بیت گئیں تھیں۔ اڑھائی ہزار سال کے بعد وہاں سے ایک روحانی قوت اٹھی۔ ایسی بنجر سرزمین سے کسی غالب قوت کا اٹھ کھڑے ہونا ' یہ معمہ آج تک عمرانی ماہرین کے لیے ایک دردِ سر بنا ہوا ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ اللہ کے وعدوں کا ایفا اور اظہار ہے اس کا ہمیشہ سے یہ وعدہ ہے کہ جو اس عہد کی بنیادوں پہ اٹھے گا ' ہم اس کو توانائی عطا کریں گے ' اس کو عزت دیں گے۔ دیکھ لیں کہ مسلمانوں کو اللہ نے کیسے عزت بخشی ' عرب کے اونٹ چرانے والے بدو ' قیصر و کسریٰ کے گریبان نوچتے نظر آئے۔

اونٹوں کے چرانے والوں نے اس شخص کی صحبت میں رہ کر
قیصر کے تبختر کو روندا کسریٰ کا گریباں چاک کیا

انقلاب کے دوش پر سوار ہو کر جب کوئی قوم نکلتی ہے تو اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اس لیے فرمایا:

لَاُ كَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ

(اگر تم سے غلطیاں ہو بھی جائیں تو وہ میں تم سے دور کر دوں گا (مٹا دوں گا)

فرمایا کہ جب تم ان بنیادوں پر چلوگے تو ہم تمھیں سب کچھ عطا کریں گے اور اگر یہ سب کرتے ہوئے تم سے غلطیاں بھی ہوئیں ' جو ظاہر ہے کہ ضرور ہوں گی ' اس لیے کہ آدمی ہزار اخلاص سے کام کرے ' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر چال لڑکھڑاہٹ سے پاک ہو۔ ذات نبوت کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام (رض) کو اگرچہ اللہ نے محفوظ رکھا ' لیکن کہیں کہیں انھیں بھی ٹھوکریں لگیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ گناہوں ' خطاؤں پر اصرار کرنے والے نہیں تھے۔ فوراً اللہ کی طرف پلٹتے تھے۔ اس لیے فرمایا :

لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ

(اگر تم سے غلطیاں ہو بھی جائیں تو وہ میں تم سے دور کر دوں گا (مٹا دوں گا)

مٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انفرادی زندگی میں غلطیاں ہوں گی تو جنت میں جانے میں رکاوٹ نہیں بنیں گی اور اجتماعی زندگی میں ہوں تو میں اس کے اثرات کو ابھرنے نہیں دوں گا اور ہوتا یہی ہے کہ جب اجتماعی طور پر ملت کا شعور ٹھیک طور پر کام کر رہا ہو تو تھوڑے بہت غلط فیصلے بھی ہو جائیں تو یہ شعور ان کو اپنی لپیٹ میں لے کر ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

وَلَاُدۡخِلَنَّکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ

" اور میں تمھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہو گی "۔

اولاً تو یہ جنت کا وعدہ ہے اور اگر ہم اس کو استعارہ سمجھیں تو مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے عہد واقرار پر کاربند رہے تو میں تم کو ایسی آزادیاں دوں گا اور تمہارے معاشرے کو ایسی خوشحالی عطا کروں گا اور دلوں کو ایسا سکون بخشوں گا کہ ہر آدمی اپنی جگہ یوں محسوس کرے گا کہ جیسے وہ جنت میں ہے ' خواہ صحرا میں رہتا ہو ' مگر یوں محسوس کرے گا کہ میرے نیچے سے نہریں رواں ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) سے عراق کے لوگوں کی طرف سے وہاں کے گورنر نے مطالبہ کیا کہ مجھے فنڈ دیجئے ' میں چاہتا ہوں کہ اچھی حکومت آئی ہے اور اللہ نے خوشحالی دی ہے تو میں شہروں کو خوبصورت بناؤں۔ فرمانے لگے کہ " تم ان شہر والوں میں انصاف کرو ' جس کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے اور انصاف کے لیے گواہ بن کر رہو اور اگر تم نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا تو یہ شہر اور اس کے رہنے والے خود بخود خوبصورت ہو جائیں گے "۔ یعنی جہاں انسان ایک دوسرے کے غمخوار ہوں ' وہ شہر خوبصورت ہوتے ہیں اور جہاں آبادیاں خوبصورت ہوں ' لیکن ہر ایک دوسرے کے گھر کو لوٹنے کی فکر میں ہو ' وہاں خوبصورتی کے کیا معنی ؟ اگر ہم دولت کی کثرت کو خوبصورتی سمجھتے ہیں تو یاد رکھیئے جہاں بھی حبِّ دنیا کے نتیجے میں دولت آتی ہے وہاں پر یہ تقسیم بھی ضرور آتی ہے۔

اس طرف بھی آدمی ہیں ' اس طرف بھی آدمی
ان کے بوٹوں پہ چمک ہے ' ان کے چہروں پر نہیں

فَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ فرمایا : اے بنی اسرائیل اور امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لوگو ! (میں دونوں کو ساتھ ساتھ شریک کر رہا ہوں) تم میں سے جس کسی نے بھی ' انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اب اس کے بعد کفر کا راستہ اختیار کیا تو وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ پھر یاد رکھو !

سَوَآءَ السَّبِیۡلِ

فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ " وہ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ کو گم کر بیٹھا " عام طور پر " سَوَاءَ السَّبِیۡلِ " کا معنی سیدھا راستہ کیا جاتا ہے ' میں نے اس کا معنی " توسط واعتدال کی شاہراہ " کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے ' مگر حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا لفظ ہے۔

دیکھئے ! انسان اگر اپنے آپ پر غور کرے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ایک عالم اصغر رکھتا ہے 'جس میں اس کی بیشمار قوتیں اور توانائیاں ہیں۔ دماغی قوتیں 'قلبی توانائیاں 'احساسات کی دولت 'خواہشات کی فراوانی 'ناآسودہ امنگیں اور نہ جانے کیا کیا آرزوئیں ہیں 'ایک سمٹی ہوئی کائنات ہے جو اس کے اندر مضمر ہے۔ ظاہر ہے یہ اپنا ایک راستہ بھی بنانا چاہتی ہے۔ دنیا کے تمام انسان ان قوتوں سے مالا مال ہیں۔ یہ تمام مل کر جب ایک ایک راستہ بنانا چاہتے ہیں تو احساسات 'احساسات سے ٹکراتے ہیں 'توانائیاں 'توانائیوں سے الجھتی ہیں 'اس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ سب انسان ایک راستہ اختیار کریں 'ہر آدمی ایک مختلف راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ اگر اس کی قلبی امنگیں کوئی ایک راستہ اختیار کرتی ہیں تو خواہشات اس کو دوسری طرف ہانکتی ہیں۔ اگر اسے صحیح ماحول کا پس منظر میسر نہیں آتا تو دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر غلط رجحانات اس پہ غالب آ جاتے ہیں اور قلبی کیفیتیں دب کر رہ جاتی ہیں 'اگرچہ وہ کچھ وقت تک زور لگاتی ہیں کہ میں سیدھے راستے پر چلوں ' لیکن دوسرے عوامل انسان کو دوسری طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں 'حتیٰ کہ اس کو کھینچتے کھینچتے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بعض اوقات اس انتہا تک لے جاتے ہیں جہاں جا کر اسے احساس ہوتا ہے کہ میں تو غلط راستے پر آ گیا۔ اب پھر وہ پلٹ کے جب دوسرے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو وہ قوتیں اس کو کھینچ کھینچ کر دوسرے راستے پر لے جاتی ہیں اور اس کو دوسری انتہاء تک پہنچا دیتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کر سکے اس کی قوتیں 'توانائیاں 'احساسات اور اندر باہر کی قوتیں اس کو کھینچ کر کبھی ایک دیوار کے ساتھ لگا دیتی ہیں اور کبھی دوسری دیوار کے ساتھ 'انہی منحنی راستوں پر چلتے چلتے اس کی عمر بیت جاتی ہے۔

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا

ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو 'جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ ' اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ 'اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو 'جس کے اندر کوئی ٹیڑھ 'کوئی کجی 'کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو ' انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی و بامرادی سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف اللہ راہنمائی کر سکتا ہے اور اللہ نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اس راہ راست کی طرف انسان کی راہنمائی کریں۔ قرآن اسی راہ کو سَوَآءَ السَّبِیْلِ اور صراط مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بیشمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا 'وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا 'وہ یہاں غلط بیں 'غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے دوزخ میں جانا ہے کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ ہی کی طرف جاتے ہیں۔

سابقہ آیات سے ارتباط

یہ آیت سابقہ آیتوں کے ساتھ تین وجھوں سے مرتبط ہے:

(۱) اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا تھااور تم پر جو اللہ کی نعمت ہے اس کو یاد کرو اور اس عہد و پیمان کو جو اس نے پختگی کے ساتھ تم سے لیا ہے (المائدہ: ۹) اور اب یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی پختہ عہد لیا تھا 'لیکن انھوں نے اس عہد کو فراموش کر دیا اور پورا نہیں کیا 'تواے مسلمانو! تم اس برائی میں یہود کی مثل نہ ہو جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عہد شکنی کی پاداش میں تم بھی اللہ کے غضب 'اس کی لعنت کا مصداق بن جاؤ اور تم پر بھی ذلت اور مسکینی ڈال دی جائے۔

(۲) اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا تھا تم پر جو اللہ کی نعمت ہے اس کو یاد کرو 'جب ایک قوم نے تمہاری طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روک لیا (المائدہ: ۱۱) اور ہم نے اس آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر کے حوالے سے بیان کیا تھا۔ یہ آیت یہود کے متعلق ہے 'جب انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے بعض اصحاب کو قتل کرنے کاارادہ کیا تھا۔ سواسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی مزید شرارتیں اور خباثتیں بیان کیں کہ انھوں نے صرف اللہ کے نبی کے ساتھ ہی خباثت نہیں کی 'بلکہ انھوں نے خود اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد و میثاق کو بھی توڑ ڈالا تھا۔

(۳) اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اللہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی اور سرکشی سے باز رہیں۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہ ان کے لیے کوئی نیا حکم نہیں ہے 'بلکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کو بھی یہی حکم دیا تھا کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور سرکشی نہ کریں۔

حل لغات:

دیوار یا لکڑی میں سوراخ کو نقب کہتے ہیں۔ پہاڑوں میں جو سرنگ بنائی جائے 'اس کو منقبت کہتے ہیں 'کسی نیک انسان کے افعال کو بھی منقبت کہتے ہیں 'کیونکہ جس طرح لکڑی یا دیوار میں سوراخ موثر ہوتا ہے 'اسی طرح نیک آدمی کے افعال بھی دوسرے لوگوں میں تاثیر کرتے ہیں۔ قوم کا رئیس جو قوم کے احوال کی تفتیش کرتا ہے 'اور ان میں موثر ہوتا ہے 'اس کی نقیب کہتے ہیں۔ اس کی جمع نقباء ہے۔ اس آیت میں فرمایا: ہم نے بنو اسرائیل کے بارہ نقباء مقرر کیے ہیں یعنی ان کو بارہ گروہوں میں بانٹ دیا اور ہر گروہ کا ایک سردار مقرر کیا۔ (المفردات 'ص ۵۰۳ 'مطبوعہ ایران)

اس آیت میں فرمایا ہے (آیت) "وعزرتموھم "تم نے رسولوں کی تعزیر کی۔ تعزیر کا معنی ہے تعظیم کے ساتھ مدد کرنا 'تعزیر حد سے کم درجہ کی سزا کو بھی کہتے ہیں 'اور یہ بھی ایک قسم کی نصرت ہے 'کیونکہ جس شخص میں کوئی ایسی خصلت ہو 'جس سے اس کو دنیا یا آخرت میں ضرر پہنچے 'تعزیر کے ذریعہ اس خصلت کو مٹا کر اس کی نصرت کی جاتی ہے۔ اس طرح تادیب ہے اور انبیاء (علیہم السلام) کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس کا معنی تعظیم کے ساتھ مدد کرنا ہے۔ (المفردات 'ص ۳۳۳ 'مطبوعہ ایران)

قاسیہ کا معنی سخت جامد جو کسی قسم کی خیر کو قبول نہ کرے 'تحریف کا معنی ہے کسی شئے کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔

بنو اسرائیل کی عہد شکنی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنی قوم بنو اسرائیل کے بارہ سرداروں کو منتخب کر کے جبابرہ کی سرزمین شام میں بھیجیں 'تاکہ وہ اس قوم کے احوال کی تفتیش کر کے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو مطلع کریں 'اور اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنو اسرائیل کو اس قوم کا وارث بنائے اور اس سرزمین میں آباد کرے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کو قوم فرعون سے نجات دی تھی 'اور ان کو مصر سے نکال لیا تھا۔ تب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ کے حکم کے مطابق بارہ نقیبوں کو بھیجا 'یہ بارہ نقیب جبابرہ کی جاسوسی کرنے کے لیے روانہ ہوگئے 'ان کو راستہ میں ایک شخص ملا جس کا نام عاج تھا۔ (عوج بن عنق) وہ اس قدر لمبا اور جسیم تھا کہ اس نے ان بارہ نقیبوں کو پکڑ کر اپنے نیفہ میں اڑس لیا 'اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا 'وہ ان کو لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور کہا: دیکھو یہ لوگ اپنے زعم میں ہم سے لڑنے آئے تھے۔ پھر اس نے ان سب کو اپنے نیفہ سے نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا: کیا خیال ہے میں ان سب کو اپنے قدموں تلے روند کر پیس ڈالوں؟ اس کی بیوی نے کہا 'نہیں 'بلکہ ان کو چھوڑ دو 'تاکہ یہ اپنی قوم کو جا کر ہماری قوت اور طاقت کا حال بتائیں۔ جب یہ لوگ وہاں سے واپس ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا: اگر تم نے بنو اسرائیل کو اس قوم کا حال بیان کر دیا تو وہ سب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو چھوڑ جائیں گے اور مرتد ہو جائیں گے۔ اس لیے تم صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کو اس خبر سے مطلع کرنا۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے سے اس پر عہد و پیمان لیا لیکن ان میں سے صرف دو اس عہد پر قائم رہے۔ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا تھے 'اور باقی دس نے اس عہد کو توڑ کر تمام بنو اسرائیل سے عاج کا واقعہ بیان کر دیا۔ بنو اسرائیل کو جب جبابرہ کی قوت اور طاقت کا علم ہوا 'تو انھوں نے ان کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

(آیت) "فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون"۔ (المائدہ: ۲۴)

ترجمہ: آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں 'سو وہ جنگ کریں 'ہم یہاں بیٹھنے والے ہیں۔

(جامع البیان 'جز ٦ ص ٢٠٦' ۔ ٢٠٣ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت '١٤١٥ھ 'الوسیط 'ج ٢ ص ٢٦٦ 'طبع بیروت)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان بارہ نقیبوں سے یہ عہد اور میثاق لیا تھا کہ وہ جبابرہ کے جو بہت بڑے بڑے جسم دیکھ کر آئے تھے 'اس کی بنو اسرائیل کو خبر نہ دیں 'لیکن انھوں نے ان کو یہ خبر دے دی 'اور یہی ان کا عہد توڑنا تھا۔ (تفسیر کبیر 'ج ٣ 'ص ٣٨٢ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت)

ابو العالیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ میثاق لیا تھا کہ وہ اس کی اخلاص کے ساتھ عبادت کریں اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور مقاتل نے کہا ان سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ تورات کے احکام پر عمل کریں '۔ (زاد المیسر 'ج ٢ 'ص ٣١٠ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '١٤٠٧ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ نے فرمایا بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں: البتہ اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوۃ ادا کی اور تم میرے رسولوں پر ایمان لائے اور تم نے ان کی تعظیم کے ساتھ مدد کی اور اللہ کو اچھا قرض دیا تو میں ضرور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹا دوں گا۔ (المائدہ: ١٢)

بعض رسولوں کے انکار کی وجہ سے نجات نہیں ہوگی 'خواہ نیک عمل کیے ہوں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میں تمہارے ساتھ ہوں "اس کا معنی ہے میں علم اور قدرت سے تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بارہ نقیبوں سے خطاب ہو 'اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بنو اسرائیل کے ہر فرد سے خطاب ہو 'یعنی میں تمہارا کلام سن رہا ہوں اور تمہارے افعال دیکھ

رہا ہوں۔ اگر تم اس عہد کو پورا کروگے تو میں تم کو اس کی جزا دینے پر قادر ہوں اور اگر تم اس عہد کو پورا نہیں کروگے تو اس کی سزا دینے پر قادر ہوں۔ پھر جزا کا ذکر فرمایا 'میں نے تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا اور تم کو جنتوں میں داخل کروں گا 'پھر سزا کا ذکر فرمایا 'کہ ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ہم نے ان کے دلوں کو بہت سخت کر دیا۔

اس آیت میں نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کو پہلے ذکر کیا اور رسولوں پر ایمان لانے کو بعد میں ذکر کیا 'جبکہ بظاہر رسولوں پر ایمان لانے کا پہلے اور نماز اور زکوۃ کی ادائیگی کا بعد میں ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود اس کا اقرار کرتے تھے کہ نجات کے لیے نماز پڑھنا اور زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے 'اس کے باوجود وہ بعض رسولوں کے انکار پر اصرار کرتے تھے۔ اس لیے ان سے فرمایا: کہ تم میرے تمام رسولوں پر ایمان لاؤ 'ورنہ اس کے بغیر محض نماز پڑھنے اور زکوۃ ادا کرنے سے تمہاری نجات نہیں ہوگی۔ زکوۃ ادا کرنے کے بعد اللہ کو اچھا قرض دینے کا ذکر فرمایا ہے۔ 'کیونکہ زکوۃ سے مراد صدقات واجبہ ہیں اور اللہ کو اچھا قرض دینے سے مراد نفلی صدقات ہیں۔

مسائل

۱۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل اور بارہ سردار تھے۔

۲۔ نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے والوں کا اللہ مددگار ہوتا ہے۔

۳۔ نیکی کے کام کرنے سے برائیاں مٹ جاتی ہیں۔

۴۔ اللہ کے عہد کی پاسداری نہ کرنے والے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

۵۔ نیکی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے۔

آیت مبارکہ:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

لغۃ القرآن: [فَبِمَا : سو بسبب][نَقْضِهِمْ : ان کے توڑنا][مِّيْثَاقَهُمْ : عہد اپنا][لَعَنّٰهُمْ : ہم نے ان پر لعنت کی][وَجَعَلْنَا : اور ہم نے کیا][قُلُوْبَهُمْ : ان کے دلوں کو][قٰسِيَةً : سخت][يُحَرِّفُوْنَ : وہ بدلتے ہیں][الْكَلِمَ : کلمات][عَنْ : سے][مَّوَاضِعِهٖ : ان کے محل][وَنَسُوْا : اور وہ بھول گئے][حَظًّا : حصہ][مِّمَّا : اس سے جو][ذُكِّرُوْا : وہ نصیحت کیے گئے][بِهٖ : اس کی][وَلَا تَزَالُ : اور ہمیشہ][تَطَّلِعُ : مطلع ہوتے رہیں گے][عَلٰي : پر][خَآئِنَةٍ : خیانت][مِّنْهُمْ : سے ان][اِلَّا : مگر][قَلِيْلًا : تھوڑے][مِّنْهُمْ : ان سے][فَاعْفُ : تو آپ معاف کردیں][عَنْهُمْ : ان سے][وَاصْفَحْ: آپ درگزر کریں][اِنَّ : یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][يُحِبُّ : محبت کرتا ہے][الْمُحْسِنِيْنَ : نیکی کرنے والے]

ترجمہ: پھر ان کی اپنی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی (یعنی وہ ہماری رحمت سے محروم ہوگئے)، اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کردیا (یعنی وہ ہدایت اور اثر پذیری سے محروم ہوگئے، چنانچہ) وہ لوگ (کتاب الٰہی کے) کلمات کو ان کے (صحیح) مقامات سے بدل دیتے ہیں اور اس (رہنمائی) کا ایک (بڑا) حصہ بھول گئے ہیں جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی، اور آپ ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہیں گے سوائے ان میں سے چند ایک کے (جو ایمان لا چکے ہیں) سو آپ انھیں معاف فرمادیجئے اور درگزر فرمایئے، بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے

تشریح: بار بار عہد لینے، اور بارہ نگران مقرر کرنے کے باوجود بنی اسرائیل کو جو نہی کچھ ڈھیل حاصل ہوتی تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کی ایک ایک شق کو نہ صرف ٹھکراتے بلکہ اس کے مفہوم کو بدل دیتے یہاں تک کہ الفاظ بھی تبدیل کرکے ہر نصیحت اور سرزنش کو فراموش کر دیتے۔ جس کا بنیادی سبب ان کی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر پڑنے والی لعنت اور پھٹکار تھی۔ لعنت کا معنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور اور محروم ہونا ہے۔ جو شخص یا قوم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جائے ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ جس کے سبب اپنے آپ کو بدلنے کی بجائے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدلنے کے درپے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی یہ عادت خبیثہ اور فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، جس وجہ سے ان کی اکثریت ہر قسم کی خیانت کو جائز سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یہود کی تاریخ عہد شکنی، مالی اور اخلاقی خیانت سے بھرپور ہے۔ یہاں پھر اس بات کی وضاحت کر دی گئی کہ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو خیانت کے حوالے سے مستثنیٰ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ آیت کے آخر میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ تعلیم دی گئی ہے اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان سے الجھنے کی بجائے معاف کریں یا درگزر فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيْءَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ قَالَ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ) [رواہ الترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ ویل للمطففین]

"حضرت ابوہریرہ (رض) رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا بلاشبہ جب بندہ ایک غلطی کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے جب وہ توبہ استغفار کرتا ہے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس غلطی کا اعادہ کرتے ہوئے مزید گناہ کرے تو اس سیاہ نکتے میں اضافہ کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ پورے دل کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اور وہ زنگ ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ لگا دیا گیا ہے۔"

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يُنْصَبُ لِغَدْرَتِهِ)

[رواہ البخاری: بَابُ إِثْمِ الْغَادِرِ لِلْبَرِّ وَالْفَاجِرِ]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ ہر بد عہد کے لیے جھنڈا ہوگا جو اس کی بد عہدی کے مطابق نمایاں ہوگا۔" (فہم)

بنی اسرائیل نے عہدِ الٰہی کو توڑا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد آنے والے انبیاء (علیہ السلام) کی تکذیب کی اور انبیاء کرام (علیہ السلام) کو قتل کیا اور توراۃ کے احکام کی مخالفت کی نیز ان آیات کو بدل دیا جن میں سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت وصفت کا بیان تھا جو توراۃ میں بیان کی گئیں ہیں نیز انھوں نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بہت سی ہدایات کو فراموش کر دیا جو توراۃ میں دی گئی تھیں کہ وہ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کریں اور ان پر ایمان لائیں تو ان حرکتوں کے نتیجے میں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ان پر لعنت فرمائی اور ان کے دل سخت کر دیئے۔

گناہوں کی وجہ سے دل سخت ہو جاتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ بداعمالیوں کی وجہ سے بھی دل سخت ہو جاتے ہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذ (رح) فرماتے ہیں: آنسو دلوں کی سختی کی وجہ سے خشک ہوتے ہیں اور دلوں کی سختی گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہے اور عیب زیادہ ہونے کی وجہ سے گناہ کثیر ہوتے ہیں۔
(شعب الایمان، السابع والاربعون من شعب الایمان۔۔ الخ، فصل فی الطبع علی القلب اوالرین، ۴۴۶/۵، الحدیث: ۷۲۲۱)
اور حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "سخت دل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دور رہتا ہے۔ (ترمذی، کتاب الزہد، ٦٢۔ باب منہ، ۱۸۴/۴، الحدیث: ۲۴۱۹)
اللہ تعالیٰ ہمیں دل کی سختی سے محفوظ فرمائے۔ آمین
{وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ: اور آپ ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے۔} سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمایا گیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ ان لوگوں کی خیانتوں پر مطلع ہوتے رہیں گے کیونکہ دغا بازی، خیانت، عہد توڑنا اور رسولوں کے ساتھ بدعہدی ان کی اور ان کے آباء و اجداد کی قدیم عادت ہے۔ ہاں ان میں سے جو ایمان لانے والوں کی تھوڑی سی تعداد ہے یہ خائن نہیں ہیں اور ان لوگوں سے جو کچھ پہلے سرزد ہوا اس پر گرفت نہ کرو۔ (بیضاوی، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۱۳، ۳۰٦/۲)
بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے پہلے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عہد کیا پھر توڑ دیا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس پر مطلع فرمایا اور یہ آیت نازل کی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۱۳، ۴۷٦/۱)
اس صورت میں معنیٰ یہ ہیں کہ ان کی اس عہد شکنی سے در گزر کیجئے جب تک کہ وہ جنگ سے باز رہیں اور جزیہ ادا کرنے سے منع نہ کریں۔ (صراط)

کوئی سرکش گروہ اللہ کا چہیتا نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ ہمیشہ جب کسی قوم کو (خواہ وہ مسلمان ہوں یا بنی اسرائیل) داعی کے منصب پر فائز کرتا ہے تو ان سے ایک عہد لیا کرتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہمیں اس عہد کی یاددہانی کرائی گئی ہے کہ دیکھو! بالکل اسی طرح کا عہد ہم نے بنی اسرائیل سے بھی لیا تھا اور پھر جب انھوں نے اس سے انحراف کرتے ہوئے عہد شکنی کی تو ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ دراصل ان سب باتوں سے امت مسلمہ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اب تم جس منصب پر فائز ہو ' تمہارے علاوہ دوسری کوئی قوم اس منصب پر فائز نہیں۔ تم آخری رسول کی آخری امت ہو ' اگر تم نے اس منصب کی عہد شکنی کی تو کچھ عجب نہیں کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب الٰہی آجائے اور جس طرح آج تم بنی اسرائیل کی جگہ فائز کیے گئے ہو ' کل تمہاری جگہ کسی اور کو فائز کردیا جائے۔
اللہ نے ہمیشہ اپنے دین کا کام انسانوں ہی سے لیا ہے اور چونکہ اس کی کسی قوم سے رشتہ داری نہیں ہے ' لہٰذا نارواعنایت بھی کسی پر نہیں ہوتی۔ اللہ کا قانون اور سنت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اور گروہ اس کے ساتھ کیے گئے عہدوں کو پورا کرتا ہے ' تب تک اللہ کی بے پایاں عنایات اس کے شامل حال رہتی ہیں اور جب کوئی گروہ اس سے سرکشی کرتا ہے تو پھر وہ گروہ خواہ ہزارہا نبیوں کی اولاد ہی کیوں نہ ہو یا اس امت کا رشتہ نبی آخر الزماں ہی سے کیوں نہ ہو ' وہ ان کو اس عظیم منصب سے معزول کردیتا ہے۔

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ عربوں نے جب نااہلی کا ثبوت دیا تو بغداد سرنگوں ہوگیااور تاتاریوں کے ہاتھوں ان پر ایسی تباہی لائی گئی کہ لگتا تھا کہ دین اسلام کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا۔ لیکن اللہ کی یہی سنت غالب آئی اور اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور اس نے خود تاتاریوں کو اسلام کی دولت بخشی اور انہی میں سے ایسے لوگ اٹھائے جو تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے بالآخر خلافت عثمانیہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن جب انھوں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی برتی تو قدرت نے ان کو بھی ختم کردیا۔ نتیجتاً آج تمام امت مسلمہ اپنی گردن میں ذلت کا طوق ڈالے اپنی سزا سے گزر رہی ہے اور تاریخ اس بات کے انتظار میں ہے کہ دیکھیں ! امت مسلمہ کا کونسا گروہ اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ چون (54) سال پہلے اللہ نے اس ملک کے رہنے والوں کو شاید اسی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے چنا تھا۔

یہ آیات ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ لوگو ! اپنے منصب کو سمجھو ' اپنے میثاق کو یاد رکھو۔ اس میں تمہاری عزت و زندگی کی بقا ہے۔

ان آیات میں بتایا جارہا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا 'مگر انھوں نے جب عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان نکات پر نظر رکھتے ہوئے ہم ان آیات کو دیکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے جب یہ ذمہ داری ان پر ڈالی اور ان سے عہد لیا تو کہا تھا کہ

(میں تمہارے ساتھ ہوں 'ہر وقت تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن میری کچھ شرائط ہیں اور وہ یہ کہ تم نماز پڑھتے رہنا، زکوۃ ادا کرتے رہنا 'جو انبیاء ہم بھیجیں گے 'ان پر ایمان لانا 'ان کے دست راست بننا اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہنا)

مگر ان لوگوں نے ان میں سے ایک ایک عہد کو توڑا۔ نہ اللہ کے بھیجے ہوئے قاصدوں کی مدد کی 'نہ دین کے احیاء اور نفاذ کے لیے ہاتھ پاؤں ہلائے ' نہ اقامت صلوٰۃ کی پابندی کی اور نہ ہی اقامت زکوۃ پر قائم رہے یعنی ان کے ذمے صرف اللہ سے وفاداری کرنا تھا۔ جب انھوں نے اللہ کی وفاداری کو چھوڑ کر نجانے اور کس کس سے وفاداری شروع کردی تو انھیں سخت ترین سزا دی گئی۔ فرمایا کہ ہم نے سزا کے طور پر ان پر لعنت کی۔ ایک اور جگہ اس کی وضاحت کے لیے اللہ نے قرآن میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں :

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط (البقرۃ:٦١)

(ہم نے ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے)

یعنی لعنت کی ایک صورت ذلت 'مسکنت اور غضب ہے۔ گویا اللہ جس قوم کو سزا دینا چاہتا ہے 'اسے اپنی رحمت سے دور کردیتا ہے۔

اب بنی اسرائیل ہی کی تاریخ دیکھیں کہ کہاں تو وہ حال کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) سے لے کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کچھ زمانے قبل تک 'پھر موسیٰ (علیہ السلام) سے لے کر باقی پوری تاریخ میں اللہ نے اس قوم کو کتنی سربلندیوں سے نوازا 'اعزازات عطا کیے اور انھیں اپنا چہیتا بنا کر پالا 'یہاں تک کہ ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ شاید ہمارا اللہ سے کوئی رشتہ ہے اور کہاں پھر یہ حال کہ اللہ سے عہد شکنی اور بے وفائی اور اللہ کی بجائے دوسروں سے تعلقات استوار کرنے کے باعث اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا اور رحمت کی دوری کے باعث ان کے دل سخت کردیئے گئے۔

اللہ کے عذاب کی پہلی نشانی دلوں کا سخت ہو جانا ہے

جب بھی کوئی امت یا افراد اللہ کی رحمت سے دور کیے جاتے ہیں اور اس کے غضب کا شکار ہوتے ہیں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں کو سخت کردیتا ہے کیونکہ جب بھی کوئی اللہ سے کیے گئے عہد سے اعراض وانحراف کرتا ہے تو اللہ اس کے نفس لوّامہ کو حکم دیتا ہے کہ تم اس کو ملامت

کرو کہ یہ لوٹ آئے۔ لیکن جب آدمی ضمیر کی بات بھی نہیں سنتا اور قرآن سے دور ہوتا چلا جاتا ہے تو مسلسل اس کے اس عمل سے قانون قدرت حرکت میں آتا ہے اور غفلت کا ایک سیاہ دھبہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ اب اگر تو وہ شخص فوراً اللہ سے توبہ کرلے 'تو وہ دھبہ ہٹا دیا جاتا ہے اور اگر وہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ پھر بھی نیکی کی طرف نہیں آتا اور توبہ نہیں کرتا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ پھر اس شخص کا دل مسلسل داغ داغ ہوتا چلا جاتا ہے 'حتیٰ کہ ایک دن ایسا آتا ہے کہ اس کا دل قبولیت کی استعداد سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی کو دلوں پر مہر لگنا کہتے ہیں۔ یاد رکھئے ! مہر لگنے کا فیصلہ تو اللہ کی جانب سے ہوتا ہے 'مگر اس کا سبب وہ برا آدمی خود بنتا ہے جو مسلسل گناہ سے اپنے دل کے شفاف آئینے کو داغ دار کر کے اس کی نورانیت کھو دیتا ہے کیونکہ اللہ کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔

یہی معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی ہوا کہ انھوں نے اپنی مسلسل نافرمانیوں کے باعث خود کو اللہ کی رحمت سے دور کر لیا اور اللہ نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اب انھیں نصیحت بھی کرو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ کسی پتھر سے مخاطب ہیں۔ گویا ایک دیوار ہے جس سے آپ سر پٹخ رہے ہیں۔ جو لوگ دعوت و تبلیغ کا تجربہ رکھتے ہیں 'وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے کہ ان میں قبولیت کی کوئی رمق دکھائی نہیں دیتی اور انسان سوچتا ہے کہ کاش ! میں نے اس شخص کو دعوت ہی نہ دی ہوتی۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی محرومی کا فیصلہ کیا جا چکا ہوتا ہے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا جاتا ہے۔

اہل کتاب کے دل کی سختی تاریخ کے آئینے میں

بعض مقامات پر قرآن نے انسانوں کے دلوں کی سختی کو پتھروں سے بھی بڑھ کر بتایا ہے اور واقعی ایسا دیکھا گیا کہ انسان جب کسی پر ظلم توڑنے پر آتا ہے تو درندوں سے ہزار درجہ بڑھ کر درندہ بن جاتا ہے۔ مثلاً وہ لوگ یا حکومتیں جو دنیا میں حقوق کا چارٹر لیے پھرتے ہیں 'کسی ملک میں مارشل لاء آئے تو وہاں کے رہنے والوں کے حقوق کی فکر انھیں ستانے لگتی ہے 'لیکن خود جب انہی حقوق کے علمبرداروں کو کسی قوم پر حکومت یا جارحیت کا موقع ملتا ہے تو پھر ظلم کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں رہ جاتا جو توڑا نہ جاتا ہو۔ مثلاً کبھی جیتے جی انسانوں کو کسی مہذب قوم نے پنجروں میں بند نہیں کیا ہوگا 'کبھی کسی کے مسلمان ہونے کے جرم میں ان کی داڑھیاں نہیں مونڈھی ہوں گی 'کبھی ان کو برہنہ کر کے ان کی تصویریں نہیں لی گئی ہوں گی 'کبھی اسرائیل کی طرح کسی اور قوم نے زندہ بچوں کو اٹھا کر زندہ حالت میں ان کے اعضاء ان کے جسموں سے نکال کر ان کی لاشوں سے فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا۔ یہ بات کوئی نئی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی لیبیا کے جنگلوں میں انہی اہل کتاب کہ جن کا یہاں ذکر ہے (کہ ان کا دل سخت کر دیا گیا) انہی لوگوں نے طرابلس کے میدانوں میں ہوائی جہاز سے ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کو زندہ گرایا اور وہ لوگ تڑپ تڑپ کے بھوک سے مرے 'مگر ان حقوق کے علمبردار مہذب لوگوں نے کبھی نہ پوچھا کہ ان کی لاشیں کہاں گئیں۔ 1857ء میں صرف دہلی میں چودہ ہزار علماء کو اس طرح پھانسی پر لٹکایا گیا تھا کہ جب انھیں رسہ باندھ کر لٹکا دیا جاتا تو نیچے آگ سلگائی جاتی اور جب ان کی لاشیں جل کر چرڑ مرڑ ہو جاتیں تو انگریز عورتیں نیچے کھڑے ہو کر تالیاں پیٹتی تھیں کہ انگریزی کا آٹھ بن گیا۔

ہمارے دلوں کی کیفیت موجودہ حالات کے تناظر میں

ان اہل کتاب نے جب بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا تو ان کی فوج اس حال میں یروشلم اور بیت المقدس میں داخل ہوئی تھی کہ ان کے گھوڑوں کے صرف پاؤں ہی نہیں 'پنڈلیاں تک خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گلیوں میں خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ پھر جب انہی سے نوے (90) سال کے

بعد صلاح الدین ایوبی نے اللہ کے اس گھر کو آزاد کروایا تو مصنف سٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی صرف اپنے زمانے کا ہی نہیں بلکہ تمام زمانوں کا بڑا آدمی تھا۔ وہ لکھتا ہے :

صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس نے کسی ایک آدمی کی نکسیر تک بھی نہیں پھوٹنے دی اور پکڑے جانے والے تمام قیدیوں میں سے کچھ کو اس کے بھائی عادل نے اور زیادہ تر کو خود اس نے فدیہ دے کر آزاد کرایا بلکہ قیدیوں کو رخصت کرتے ہوئے ضرورت کا سامان اور پیسے تک دیئے کہ وہ حالات کی بہتری تک گذارہ کر سکیں۔

ہم تو ایسی تاریخ رکھنے والے لوگ ہیں ' مگر پھر بھی ہم نے کبھی حقوق کی پاسداری کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ لوگ جن کے دل اللہ نے سخت کر دیئے ' ہم نے ان کے چہرے کل تک تاریخ میں دیکھے تھے اور آج سورج کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ واقعی وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اور اپنے بھائی بندوں کو یہ بات سمجھانی چاہیے کہ جس طرح آج پورے عالم میں مسلمانوں پر ظلم کا بازار گرم ہے اور اس کے خلاف کسی اسلامی ریاست سے کوئی موثر آواز بلند نہیں ہو رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے دل بھی سخت ہو گئے ہوں ' کیونکہ قرآن ہم ہی سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے :

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَ لَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۔ (الحدید : ۱۶)

(کیا مسلمانوں پر ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پسیج جائیں اور نرم پڑ جائیں اور مسلمان کہیں ایسے نہ ہو جائیں جیسے کہ ان سے پہلے اہل کتاب تھے کہ جب انحراف اور معصیتوں کی عمر دراز ہوتی چلی گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور پھر ان کے بیشتر لوگ نافرمان ہی نکلے)

ہمیں فکر کرنی چاہیے کہ کہیں ہم بھی تو ایسے نہیں ہو گئے۔

ایسی قوم جس پر اللہ لعنت کر دے ' نتیجتاً اس کا دل اس حد تک سخت ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کتابیں بھی اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہتیں۔ چنانچہ جب اہل کتاب اس لعنت کا شکار ہوئے تو نماز جیسا فریضہ نہ صرف ان کے عمل سے نکل گیا ' بلکہ توراۃ سے اس کی فرضیت تک کا ذکر نکال باہر کیا۔ مسلمانوں سے دشمنی اور حسد کے مرض میں مبتلا ہو کر حضرت ابراہیم۔ ' ان کی دعوت ' مرکز دعوت ' ان کی عظیم قربانی اور بیت اللہ تک کی تاریخ بالکل بدل کر رکھ دی۔

پھر فرمایا کہ "انھوں نے بھلا دیا اس نصیحت کا بیشتر حصہ ' جو انھیں نصیحت کی گئی تھی"۔ قرآن کریم سے پہلے جس کتاب کو الکتاب کہا جاتا ہے ' وہ توراۃ ہے ' انجیل اس کا ضمنی ایڈیشن ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو توراۃ کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ' کیونکہ انجیل میں شریعت نہیں آئی۔ اس لیے جس کتاب میں تحریف کا ذکر ہے ' وہ توراۃ ہے اور اسی کے بیشتر حصہ کو بھلا دیا گیا تھا اور جب میثاق ہی توڑ ڈالا گیا تو پھر توراۃ سے ان کا کیا تعلق باقی رہتا؟ اسی میثاق کی بدولت تو وہ کتاب کے پابند کیے گئے تھے۔ مگر جب انھوں نے میثاق توڑا تو پھر کتاب سے جس طرح کا تعلق چاہا ' رکھا ' جب چاہا توڑ دیا۔ جو حکم چاہا لے لیا ' جو چاہا چھوڑ دیا۔

اور یہاں "حَظًّا" کا دوسرا معنی نصیب لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے جس چیز کے ذریعے ان کی قسمت بنائی ' اس کو بھلا کر یا اس کے بہت سے احکام عمل میں نہ لا کر اپنی قسمت بگاڑ لی۔

قرآن کریم اہل کتاب کے اس قصے اور روش کی داستان محض یونہی نہیں سنا رہا بلکہ دراصل اس سے امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کو تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ دیکھو ! تم یہ روش ہر گز اختیار نہ کرنا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا :

(جس راستے سے اہل کتاب میں کمزوریاں آئیں ' انہی راستوں سے تم میں بھی آئیں گی۔ دیکھنا! ان راستوں پر نہ چلنا یا ان دراڑوں کو نہ کھلنے دینا)
ایک اور جگہ فرمایا کہ
(مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم ان راستوں سے ضرور گزرو گے اور ان بلوں میں ضرور گھسو گے جن میں وہ (اہل کتاب) گھس کر رہے اور تباہ ہوئے)

اللہ کی کتاب اور ہماری روش

میں بار بار اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ہمیں اپنے آپ پر نظر رکھنی چاہیے کہ اعمال و احکام میں انھوں نے جس طرح توراۃ کو ایک کھیل بنا کر رکھ دیا تھا کہ جس بات پر عمل نہ کرنا چاہتے ' اسے تاویل کی سان پر چڑھا کر کچھ سے کچھ بنا دیتے اور جن چیزوں کو بالکل نظرانداز کرنا چاہتے ' تو ان کو سرے سے کتاب سے نکال دیتے اور اگر باقی رکھتے تو پھر اسے قانون کی شکل نہ بننے دیتے۔ کہیں ہمارا طرز عمل بھی ایسا تو نہیں؟ اگر صاف صاف بات کہی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ تو بالکل ہماری کہانی ہے۔ اللہ کی کتاب ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اس میں معاملات ' عبادات ' معاشرت ' معیشت ' سیاست ' قومی اور بین الاقوامی آداب سب کچھ موجود ہے۔ زندگی کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہے ' وہ تمام کی تمام اس کتاب اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت میں موجود ہیں۔ لیکن ہم نے اس سے عبادات تو لے لیں ' مگر اس نے عدالت کا جو نظام دیا تھا ' حدود اللہ اور شرعی قوانین دیئے تھے ' وہ کہاں ہیں؟ سیاست و حکمرانی کا جو ڈھانچہ اور خدوخال دیئے ' وہ کیا ہوئے؟ اس نے ہمیں پوری ایک معیشت دی تھی ' جس میں سود کا کوئی تصور نہیں تھا ' وہ کہاں گم ہو گئی؟ اس نے ہمیں ایک معاشرت دی تھی ' جس میں مرد و زن کے اختلاط کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے عورتوں کو حیاء کی ایک چادر پہنائی تھی ' غیرت کا غازہ بخشا تھا ' وہ قصہ پارینہ بن گیا۔ کتاب اللہ ہمارے گھروں میں تو موجود ہے ' مگر دلوں سے دور ہے۔ وہ جس زبان میں ہے ' ہم اس زبان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اسی کو اللہ فرماتا ہے کہ "انھوں نے اس کتاب کا بیشتر حصہ بھلا دیا یا یہ کہ بیشتر سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا۔ "ہم نے بھی یہی کیا ہے۔
اہل کتاب کی ان تمام حرکات سے آگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ "آپ برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہتے ہیں "یعنی ہم آپ کو مطلع کرتے رہتے ہیں تاکہ جہاں ضرورت ہو آپ اس کی اصلاح کر دیں تاکہ تکمیل دین کا کام انجام پذیر ہو۔
اس کے ساتھ ہی فرمایا: "آپ ان کو معاف فرما دیجئے اور درگزر کیجئے"۔ بات یہ ہے کہ جب مجھے یہ معلوم ہو کہ میرے فلاں ہمسائے نے میرے ماں باپ کے چھوڑے ہوئے خزانے میں سے خیانت کا ارتکاب کیا ہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے ذہن میں نفرت کا کیسا لاوا ابلے گا اور دل کبھی آمادہ نہ ہو گا کہ میں ان لوگوں سے ملوں ' چاہے وہ رشتے میں میرے چچا کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔۔ یہ بنی اسرائیل بنی اسماعیل کے چچازاد ہی تو تھے۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں نے قرآن کے ذریعے یہ جانا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے ' بالخصوص سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق جو کچھ توراۃ میں موجود تھا ' اس میں سے شاید ہی کوئی بات باقی چھوڑی ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ناگواری کی فضاء پیدا ہوئی ہو گی۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ دعوت کا اصول یہ ہے کہ دوسری طرف سے چاہے کیسی ہی باتیں سننے میں آئیں ' مگر آپ کبھی اشتعال کا شکار نہ ہوں ' بلکہ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دعوت جاری رکھیں۔

آگے فرمایا کہ "بیشک اللہ احسان کا معاملہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ اللہ کا اصول یہ ہے کہ وہ بدلہ لینے کی اجازت تو دیتا ہے 'مگر اس کے یہاں اس کی محبت کے مستحق وہ ہوتے ہیں جو احسان کیا کرتے ہیں۔

محسنین کی بہترین مثال

" محسنین "کے میں تین ترجے کرتا ہوں : نیکوکار 'خوب کار 'احسان کرنے والے۔ نیکی یہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ نیکی کریں 'لیکن اگر آپ گرفت کرلیں تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ آپ خوب کار ہوں اور خوب کاری یہ ہے کہ آپ ایسے معاملے میں جہاں بدلہ لیا جانا ہو 'وہاں رحم اور مروت کریں۔ تیسری بات یہ کہ صرف اسی پر اکتفانہ کریں کہ رحم و مروت کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ اس سے بڑھ کر ان کے ساتھ احسانات بھی کریں۔

ایک مرتبہ سیدنا حسن (رض) کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان کا غلام اندر سے کھانا لا رہا تھا کہ ایک گرم گرم شوربے کا پیالہ لیے وہ جب آپ کے قریب پہنچا تو نجانے کیسے وہ برتن ہاتھ سے چھوٹ کر آپ کی کمر پر جا گرا۔ ایسے لگا جیسے کھال تک اتر گئی ہو۔ حضرت حسن (رض) نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ غلام 'خاندان نبوت میں پلا تھا 'وہ جانتا تھا کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے ایک آیت قرآنی کا پہلا جملہ تلاوت کیا:

" وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ "

(جو اللہ والے ہوتے ہیں 'وہ غصے کو پی جایا کرتے ہیں)

بس یہ جملہ سننے کی دیر تھی کہ حضرت حسن (رض) نے سر جھکا دیا۔ غلام نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس نے فوراً آیت کا اگلا ٹکڑا پڑھا:

" وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ "(وہ لوگوں کو معاف بھی کر دیا کرتے ہیں)

حضرت حسن (رض) بولے: جا میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب اس غلام نے آیت کا تیسرا ٹکڑا پڑھا:

" وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ "(آل عمران : ۱۳۴)

(اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

کہنے لگے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔

یہی بات یہاں بیان کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر اخلاق کس کے ہیں 'اس لیے کہ جو سند قرآن نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جاری کی ہے 'وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی کہ "آپ تو خلق عظیم کے مالک ہیں "تو اسی لیے حکم ہوا کہ آپ تو خلق عظیم کے پیکر ہیں 'لہٰذا احسان کریں۔ (روح)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : تو ہم نے ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے ان پر لعنت کی اور ہم نے ان کے دلوں کو بہت سخت کر دیا '۔ (المائدہ : ۱۳)

اس آیت میں یہود کے عہد توڑنے کا ذکر فرمایا ہے 'ان کے عہد توڑنے کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بعض نبیوں کی تکذیب کرتے تھے اور ان کو قتل کرتے تھے۔ اور دوسری یہ کہ وہ 'توراۃ میں مذکور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات کو چھپاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے لعنت کرنے کی بھی کئی تفسیریں ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

دوسری یہ کہ ان کو مسخ کرکے بندر اور خنزیر بنادیا ' اور
تیسری یہ کہ ان پر جزیہ مقرر کردیا ' نیز فرمایا ہم نے ان کے دلوں کو سخت کردیا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں کو ایسا کردیا کہ وہ دلائل دیکھنے کے باوجود حق کو قبول نہیں کریں گے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وہ اللہ کے کلام کو اس کے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ (المائدہ : ۱۳)

توراۃ کی تحریف میں علماء کے نظریات

یہود نے توراۃ میں جو تحریف کی ہے ' اس کے متعلق کئی اقوال ہیں :
(۱) یہود توراۃ کی آیتوں میں ردوبدل کردیتے ہیں اور اپنی طرف سے عبارات بنا کر آیات میں شامل کردیتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔ حسب ذیل آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔
(آیت) " فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ "۔ (البقرہ : ۷۹)
ترجمہ : ان لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے جو اللہ کتاب میں (اپنی طرف سے) لکھیں ' پھر کہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔
(۲) تحریف کے متعلق دوسرا قول یہ ہے کہ وہ توراۃ کی آیتوں کی اپنی طرف سے باطل تاویل کرتے تھے۔ امام رازی کا یہی مختار ہے۔ وہ لفظی تحریف کے قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کتاب تواتر سے منقول ہو ' اس میں لفظی تغیر نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر کبیر ' ج ۳ ' ص ۳۸۳)
(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ توراۃ کی جن آیات میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات ہیں ' وہ ان کو چھپا لیتے تھے۔ (جامع البیان ' ج ۶ ' ص ۲۱۲ ' مطبوعہ بیروت)
تاریخ میں یہ معروف ہے اور یہود ونصاری نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ جو توراۃ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی تھی اور جس کی حفاظت کا انھوں نے حکم دیا تھا ' اس کا صرف ایک نسخہ تھا '۔ اور یہود ونصاری کے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب اہل بابل نے یہودیوں کو قید کیا اور ان میں لوٹ مار کی اس وقت وہ نسخہ گم ہوگیا اور ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی نسخہ نہیں تھا۔ اور جب اہل بابل نے ان کے ھیکل کو جلا دیا ' تو وہ اس نسخہ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔
اور وہ پانچ سورتیں جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف منسوب ہیں جن میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی حیات اور وفات کا ذکر ہے اور یہ کہ ان کے بعد کوئی ان جیسا نہیں ہوگا ' وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کا کافی عرصہ گزر جانے کے بعد ' بلکہ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ ان کو عذرا کاہن نے لکھا تھا ' جو بنو اسرائیل کے قید ہونے والے بوڑھوں میں سے بچ گیا تھا۔ اسی طرح نصاری کا اس پر اتفاق ہے کہ انجیل بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے کافی زمانہ بعد لکھی گئی تھی۔ (التفسیر المنیر ' ج ۶ ص ۱۲۶ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۱۱ ھ)
ہماری رائے یہ ہے کہ توراۃ اور انجیل کلیۃ ساقط الاعتبار نہیں ہیں۔ موجودہ توراۃ اور انجیل خواہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے بعد لکھی گئی ہوں ' لیکن ان میں بہر حال اصل توراۃ اور انجیل کی بہت آیات موجود ہیں اور بعد کی بنائی ہوئی آیات بھی ان میں موجود ہیں ' کیونکہ قرآن مجید نے ان کتابوں کا اعتبار کیا ہے اور قرآن مجید کو ان کا مصدق قرار دیا ہے۔ اور ان کتابوں کے حاملین کو اہل کتاب فرمایا ہے اور ہمارے

نزدیک ان کتابوں میں ہر طرح سے تحریف کی گئی ہے۔ اصل آیات نکال کر اور اپنی طرف سے آیات بنا کر ان میں داخل کی گئی ہیں ' اور اصل آیات کی باطل تاویلات بھی کی گئی ہیں ' اور جو آیات سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات اور آپ کی آمد کی بشارت پر مشتمل تھیں ان کو چھپایا اور نکالا بھی گیا ہے۔ حدود کی آیات میں حسب منشاء تغیر بھی کیا گیا اور بعض الفاظ کو توڑ مروڑ کر بھی پڑھا گیا ہے ' تاکہ معنی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جس کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کے بڑے حصے کو انھوں نے بھلا دیا۔ (المائدہ: ۱۳)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے توراۃ پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی وساطت سے ان سے جو عہد لیا تھا ' کہ وہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں گے ' اس عہد کو انھوں نے پورا نہیں کیا۔

اس کے بعد فرمایا: اور آپ ان کی خیانت پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے ماسوا چند لوگوں کے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ھ نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔ اس سے مراد یہود بنو نضیر ہیں ' جنہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کو اس دن قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا ' جب آپ عامریوں کی دیت وصول کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے مکر سے آگاہ کر دیا اور آپ وہاں سے بحفاظت سلامتی کے واپس آ گئے (جامع البیان ' ج ٦ ' ص ۲۱۴ ' مطبوعہ بیروت)

اس آیت میں فرمایا ہے ' ماسوا چند لوگوں کے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئے اور انھوں نے نیک عمل کیے ' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب ' آپ ان سے خیانت کا خوف نہ کریں '۔

اس کے بعد فرمایا آپ ان کو معاف کیجئے اور در گزر کیجئے۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہودیوں کے تین گروہ بنو قینقاع ' بنو النضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نیک سلوک کیا۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد آپ نے ان سے صلح کی اور یہ معاہدہ کیا کہ وہ نہ خود آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی مدد کریں گے اور وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مامون رہیں گے اور ان کے اموال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں گی اور وہ مکمل آزادی کے ساتھ مدینہ میں رہیں گے ' یہ معاہدہ میثاق مدینہ کہلاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہود نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ خیانت کی اور کفار قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے باوجود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو صرف حجاز سے جلاوطن کرنے پر اکتفاء کیا اور ان کے اس جرم پر ان کو قرار واقعی سزا نہیں دی۔

ایک قول یہ ہے کہ یہودیوں کو معاف کرنے اور ان سے در گزر کرنے کا حکم آیت سیف سے منسوخ ہو گیا۔ وہ آیت یہ ہے۔

(آیت) " فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم "۔ (التوبہ: ۵)

ترجمہ: تو تم مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ۔ (تبیان)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ وعدہ پورا نہ کرنے والوں پر لعنت کرتا ہے۔

۲۔ وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے دل سخت ہو جاتے ہیں۔

۳۔ نیکی کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔

۴۔ان لوگوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد پیغمبروں کا انکار کیا۔ بلکہ ان سے دشمنی کی۔ حضور کے اوصاف چھپائے جو توراۃ میں مذکور ہیں۔

۵: معلوم ہوا کہ گناہوں کا نتیجہ سختی دل ہے، ایسے ہی نیکیوں سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

۶: اس سے معلوم ہوا کہ کلام اللہ میں لفظی تحریف بھی جرم ہے۔ خواہ وہ تحریف ذاتی ہو یا وصفی، لہٰذا قرآنی حروف کو دیدہ و دانستہ صحیح مخارج سے ادا نہ کرنا ق کو، ک، اور ض، کو ظ، پڑھان سخت گناہ ہے۔

۷: اس سے معلوم ہوا کہ ذمی کافر جب تک جزیہ دیتا رہے، اس وقت تک اس کی معمولی بدعہدی سے در گزر کیا جائے، ہاں بعض بدعہدیاں وہ ہیں جن سے ذمہ ٹوٹ جاتا ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس قوم کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے پہلے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عہد کیا تھا پھر توڑ دیا اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو ان کی عہد شکنی سے مطلع فرمادیا اور در گزر کرنے کا حکم دیا (خزائن)

آیت مبارکہ:

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

لغۃ القرآن: [وَمِنَ : اور سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اِنَّا : یقیناً][نَصٰرٰٓى: ہم نصارٰی ہیں][اَخَذْنَا : ہم نے لیا][مِيْثَاقَهُمْ : ان سے وعدہ پختہ][فَنَسُوْا : تو وہ بھول گئے][حَظًّا : حصہ][مِّمَّا : اس سے جو][ذُكِّرُوْا : نصیحت کیے گئے وہ][بِهٖ ۠: اس کے ساتھ][فَاَغْرَيْنَا : توہم نے ڈال دی][بَيْنَهُمُ : ان کے درمیان][الْعَدَاوَةَ : دشمنی][وَالْبَغْضَاۗءَ : اور بغض][اِلٰي : تک][يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: دن قیامت][وَسَوْفَ : اور عنقریب][يُنَبِّئُهُمُ : وہ خبردے گا ان کو][اللّٰهُ : اللہ][بِمَا كَانُوْا : ساتھ اس کے جو وہ تھے][يَصْنَعُوْنَ : وہ کرتے]

ترجمہ: اور ہم نے ان لوگوں سے (بھی اسی قسم کا) عہد لیا تھا جو کہتے ہیں: ہم نصاریٰ ہیں، پھر وہ (بھی) اس (رہنمائی) کا ایک (بڑا) حصہ فراموش کر بیٹھے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔ سو (اس بدعہدی کے باعث) ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور کینہ روز قیامت تک ڈال دیا، اور عنقریب اللہ انھیں ان (اعمال کی حقیقت) سے آگاہ فرما دے گا جو وہ کرتے رہتے تھے

تشریح:

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اسکندر رومی کے تین سو چار سال بعد بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ بیت اللحم بیت المقدس سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے پھر ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم مصر لے آئیں جب آپ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو شام بستی ناصرہ میں لے آئیں۔ ناصرہ کے رہنے والوں کو ناصری یا نصاریٰ کہا جانے لگا پھر دین عیسائیت کا نام نصرانیت اور عیسائیوں کا نام نصاریٰ ہو گیا۔ (روح المعانی) میثاق پختہ وعدہ لیا تھا انجل میں نصاریٰ کہا جانے لگا پھر دین عیسائیت کا نام نصرانیت اور عیسائیوں کا نام نصاریٰ ہو گیا۔ (روح المعانی)

میثاق پختہ وعدہ لیا تھا انجیل میں نصاریٰ سے کہ ایک آنے والے رسول محتشم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد تشریف لائیں گے مگر آپ کی بعثت کے بعد انھوں نے تکذیب کی۔ فنسوا حظامما ذکروابہ۔ عیسائی انجیل کے عہد و پیمان کو بہت ہی جلد بھول گئے۔

اس کی تفسیر میں مفسرین فرماتے ہیں کہ بموجب قول قتادہ (رح) جب نصاریٰ نے انجیل کی بھی پروانہ کی اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیا اور رسولوں کی نافرمانی کرنے لگے اور حدود و احکام سے بے پروائی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی پھوٹ ڈال دی کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ عداوت۔ عدو سے بنا یعنی حد سے بڑھ جانا دشمنی کو عداوت اسی لیے کہتے ہیں۔

الی یوم القیمۃ۔ دوام کے لیے ہے یعنی قیامت تک محدود ہیں اس کے بعد کفار کی عداوتیں دوسری نوعیت کی ہوں گی۔ عیسائیوں کی فرقہ بندی کی عداوتیں قیامت تک ہوں گی۔ وسوف ینبئھم اللہ بما کانوا یصنعون۔ سوف یہ خبر ہے سزا دینے کی۔ بروز قیامت وہ اپنے کردار کا بدلہ پائیں گے۔ آسمانی کتابوں کی مخالفت کفر و معصیت نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب اور جو کچھ کرتے تھے قیامت کے دن اس کی سزا دے گا۔ (حسنات)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے نصاری سے بھی اس بات کا پختہ عہد لیا تھا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں گے اور آپ کی پیروی کریں گے اور آپ کی مدد کریں گے ' لیکن انھوں نے بھی یہود کی طرح اس عہد کو توڑ دیا اور انھوں نے اپنے دین کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی سزا یہ دی کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف عداوت اور بغض کو ڈال دیا ' اور وہ قیامت تک اسی مخالفت میں برقرار رہیں گے۔ عیسائیوں کے کئی فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں ' اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں ' اور عنقریب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو ان کے کاموں کی خبر دے گا ' جو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول پر افتراء باندھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹے کو منسوب کیا اور اس کا شریک بنایا اور آخرت میں ان کو ان کے اس شرک کی سزا دے گا (تبیان)

تو خواہ انھوں نے اپنے تئیں خود کو نصرانی کہا، یا نصران یا ناصر نام کے دیہات کی طرف اپنے کو منسوب کیا جہاں اس وقت حضرت عیسیٰ قیام پذیر تھے۔۔ یا۔۔ اس لیے کہ وہ اپنے کو انصار اللہ کہتے ہی تھے۔

لفظ نصاریٰ کے حوالے سے معترضین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کو تم لوگ بہت سنجیدہ کتاب کہتے ہو اور کہتے ہو کہ قرآن کسی کو آزار نہیں پہنچاتا تو پھر یہ لفظ "نصاریٰ" ہمارے لیے کیوں استعمال ہوا ہے؟ یہ تو توہین آمیز لفظ ہے۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ قران کریم یہ نہیں کہتا کہ تم نصاریٰ ہو' بلکہ یہ کہتا کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ "ہم نصاریٰ ہیں' ہم نے ان سے عہد لیا"۔ اب اگر لفظ نصاریٰ کے استعمال کی ذمہ داری ہے تو تمہارے ہی آباؤاجداد پر ہے' جنھوں نے یہ لفظ استعمال کیا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ قرآن تاریخ بیان کرتے ہوئے جھوٹ بولے' جیسے تم بولتے ہو؟ دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ اصلاً یہ لفظ "ناصری" کی جمع ہے اور یہ ناصرہ گاؤں کی طرف منسوب ہے جو گلیلی کے علاقے میں واقع ہے جہاں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ لوگوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ماننے والوں کی توہین وتذلیل کے لیے نصاریٰ کے نام سے انھیں پکارنا شروع کیا تھا' اب قرآن بھی اسی نسبت سے انھیں نصاریٰ کہہ رہا ہے۔ مگر ایسے لوگوں کو علم ہونا چاہیے کہ جب قرآن، نصاریٰ کہتا ہے تو اس کی نسبت "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ" کی طرف کرتا ہے، جن کی قرآن نے بار بار تعریف کی ہے اور جن کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواری کہا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے صحابہ تھے اور جن سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ سوال کیا تھا کہ

مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (الصّف : ۱۴)

(تم میں سے کون ہے جو اللہ کی دعوت پیش کرنے کے لیے میرا ساتھ دے گا)

مدد دین کی وجہ سے یہ لوگ انصار کہلائے' جیسے کہ اہل مدینہ بھی انصار کہلائے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے حواریوں نے ایک مدت تک اپنا کوئی نام نہیں رکھا۔ وہ خود کو بنی اسرائیل ہی سمجھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے لیے شاگرد' درویش یا پھر کبھی مقدس کا لفظ استعمال کیا۔

دین اخوت کی بنیاد ہے

فرمایا کہ "وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں' ان سے ہم نے عہد لیا"۔ مگر آگے چل کر سینٹ پال کے عقیدے پر چلنے والے لوگ جب آئے تو انھوں نے بھی وہی حرکت کی جو اس سے پہلے یہود کرچکے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

" فَاَغۡرَیۡنَا بَیۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِؕ وَسَوۡفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ"

(تب ہم نے ان میں بھڑکادی بغض اور عداوت قیامت کے دن تک کے لیے۔ اور عنقریب اللہ ان کو بتائے گا جو کرتوت وہ کرتے رہے)

یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کسی کے درمیان خود سے بغض وعداوت پیدا کرتا ہے' بلکہ یہ کہ دنیا میں اخوت پیدا کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو نہ تو وہ زبان ہے کیونکہ سب کی زبانیں ایک نہیں' نہ جغرافیہ کیونکہ ساری دنیا ایک جگہ پیدا نہیں ہوتی۔ رنگ ونسل بھی نہیں کیونکہ دنیا ایک رنگ ونسل سے تعلق نہیں رکھتی۔ مفادات اور رشتے بھی نہیں کہ یہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اگر اس کی کوئی بنیاد ہے تو وہ دین ہے۔

حضرت بلال (رض) حبش سے آئے' حضرت حسن (رض) بصرہ سے اور حضرت صہیب (رض) روم سے۔ یہ سب مسلمانوں کے سر کے تاج ہیں۔ لیکن ابولہب وابوجہل ان کے اپنے بھائی بندوں میں سے تھے' مگر راندہ درگاہ اور واجب القتل ٹھہرے۔ لہٰذا اخوت دین سے بنتی اور میثاق سے باقی رہتی ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ تم دین پر چلو اور اس پر عمل کرو 'اخوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوگی۔ دیکھیں کہ قران کریم کہتا ہے:

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ

(الانفال: ٦٣)

(اور الفت ڈال دی ان کے دلوں میں۔ اگر تم سب کچھ خرچ کردیتے جو زمین میں ہے ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے 'لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بیشک وہ غالب 'حکمت والا ہے)

یہ محبت دین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے 'جیسے مہاجر وانصار میں بھائی چارہ پیدا ہوا۔

قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! اگر آپ دنیا کا سارا مال خرچ کرکے بھی ان کے دلوں میں الفت ڈالنا چاہتے تو نہیں ڈال سکتے تھے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ان کو آپ کی معرفت دین دیا اور اسی کے حوالے سے ان کے دلوں میں گداز پیدا کیا (اور وہ بھائی بھائی بن گئے) ۔ وہ غالب 'حکمت والا ہے)

اسی لیے اس نے کہا کہ اگر تم دین قائم کروگے تو میں تمہارے درمیان محبت ڈالوں گا اور اگر دین نہیں رہے گا تو اخوت بھی نہیں رہے گی۔

اخوت چاہتے ہو تو دین کے واسطے سے اخوت پیدا کرو ورنہ قیامت تک بغض وعناد کا شکار رہوگے۔

ممکن ہے پڑھنے والوں کے دلوں میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ وہ تو اب اس موجودہ دور میں اکٹھے ہوگئے ہیں 'جبکہ ہم فرقہ فرقہ ہیں اور انھیں سزا ملی تو کیا ہمیں نہیں ملے گی؟

پہلی بات تو یہ کہ وہ اکٹھے ہوئے بے دین ہو کر۔ ان کے وقتی مفادات ہیں جن کی بنیاد پر وہ اکٹھے کھڑے ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً اکٹھے ہوتے تو اپنے ہم مذہبوں سے دو جنگیں کبھی نہ لڑتے۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ تیسری جنگ ہمارے یہاں لڑی جائے 'ورنہ وہ اکٹھے نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہاں یہ نہیں کہا جارہا کہ انھوں نے میثاق کو توڑا تو ان کو سزا ملی اور اے مسلمانو ! اگر تم بھی ایسا کروگے تو تمہیں سزا نہیں ملے گی 'بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس محفوظ ہے 'اگر تم نے بھی عہد ومیثاق کی پروا نہ کی تو تمہارا حال بھی کچھ ان سے مختلف نہ ہوگا۔

یہ قرآن مر کھپ جانے والوں کے قصے اسی لیے تو سناتا ہے کہ ہم اس سے نصیحت حاصل کریں اور خود کو ان برے اعمال اور نتائج سے بچالیں جو وہ پچھلے لوگ کر گزرے۔ اگر ہم بھی شیعہ و سنی بن کر اس میثاق کو توڑیں گے تو ہمارے درمیان بھی مستقل بغض وعداوت رہے گی۔ (روح)

بہر طور تقدیر (ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا) جس طرح یہود سے ہم نے لیا تھا تو وہ بھی بھول گئے اور نظر انداز کردیا وہ عظیم حصہ یعنی اتباع فارقلیط، بلفظ دگر احمد مرسل کی پیروی جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی عہد شکنی کی نحوست کے سبب ڈال دی ہم نے ان میں باہمی دشمنی اور بغض اور وہ بھی چندروز کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے، اور وہ اس طرح سے کہ نصاری کے تین فرقے ہوگئے۔

ا۔ نسطوریہ۔ جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں۔

۲۔ ملکانیہ جو کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں ایک خود اللہ، دوسرے حضرت عیسیٰ، اور تیسری ان کی والدہ مریم۔

۳۔ یعقوبیہ۔ جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خود خدا ہیں۔۔ ان میں ہر ایک فرقہ دوسرے فرقے کا جانی دشمن ہے۔

مذکورہ آیت زیر تفسیر کا یہ بھی معنیٰ کیا گیا ہے کہ ہم نے یہود و نصاری میں عداوت پیدا کر دی جس کے نتیجے میں ان میں آپس میں بڑی خونی معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں اور اگر کبھی کہیں ان میں ظاہری میل ملاپ نظر آیا، وہ خالص منافقانہ تھا، ہر شخص دوسرے کو تباہ وبرباد کرنے کی فکر میں مستقل لگا رہا اور اگر کسی کو اپنے مخالف کو نقصان پہنچانے کا ذرا بھی موقع میسر آیا تو اس نے اسے ضائع نہیں ہونے دیا، یہ سارے یہود ونصاری اس خام خیالی میں نہ رہیں کہ ان کے کرتوتوں کی کہیں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی، اور ان کے گندے کردار جو ان کی ذات میں ایسا راسخ ہوگئے گویا یہ افعال انہی کی صنعت ہیں ان کو ظاہر نہ کیا جائے گا۔

وہ غور سے سنیں کہ عنقریب (اور) بہت ہی جلد بروز قیامت اللہ تعالیٰ انھیں بتادے گا، اور آگاہ کردے گا کہ وہ جو کر چکے ہیں اور جس گندے کردار کے مرتکب ہو چکے ہیں اس کا بدلہ کیا ہے؟ اور اس کی سزا کیا ہے؟۔

اس سے پہلے آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ یہود ونصاری نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں کے احکام پر عمل نہیں کیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر اسلام کی دعوت دے رہا ہے اور یہ فرمایا کہ ہمارا نبی تم کو تمہاری کتاب کی وہ باتیں بتاتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو حالانکہ ہمارے نبی امی ہیں انھوں نے کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی، اس کے باوجود تمہاری کتاب کی باتوں کو بتانا ان کے معجزات میں سے ہے۔

یہود رجم کی آیت کو چھپاتے تھے اور جن یہودیوں نے منع کرنے کے باوجود ہفتہ کے دن شکار کیا اس کی پاداش میں ان کو بندر بنادیا گیا اس کو بھی وہ چھپاتے تھے اور ہمارے نبی نے ان امور کو بیان فرمادیا اور بہت سی ایسی باتیں جن کو یہود چھپاتے تھے ان کو نبی نے نہیں بیان فرمایا کیونکہ ان کے بیان سے دین کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی، اب انھیں کتابیوں کو مخاطب فرما کر فرمایا جارہا ہے۔ (اشرفی)

جو اللہ کی کتاب لوگوں کو متحد رکھنے کے لیے نازل ہوئی تھی جب اس میں تغیر و تبدّل کر دیا گیا تو وہ ناقابل اعتماد بن گئی اب اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ عیسائی بھی یہودیوں کی طرح کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اب ان کی باہمی مخاصمت اور عداوت قیامت تک باقی رہے گی جس کا انجام اللہ تعالیٰ ان کے سامنے لائے گا۔ باہمی عدوات سے مراد یہودیوں اور عیسائیوں کی عداوت بھی ہو سکتی ہے۔

(عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) افْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِينَ فِرْقَةً فَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ وَافْتَرَقَتِ النَّصَارَى عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً فَإِحْدَى وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَتَفْتَرِقَنَّ أُمَّتِي عَلَى ثَلاَثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً فَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ هُمْ قَالَ الْجَمَاعَةُ)

[رواہ ابن ماجۃ: باب افْتِرَاقِ الأُمَمِ]

”حضرت عوف بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہودی اکہتر فرقوں میں بٹے تھے ان کے ستر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں اور عیسائی بہتر فرقوں میں بٹے تھے ان میں سے اکہتر جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی ان میں سے بہتر جہنمی ہوں گے اور ایک جنتی، صحابہ نے عرض کی جنت میں جانے والے کون ہیں آپ نے فرمایا وہ جماعت (جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلنے والے) ہے۔“ (فہم)

جس طرح یہود نے کامل اطاعت کا وعدہ کرکے توڑ دیا اسی طرح جنھوں نے اپنے نبی کی دعوت پر خوشی سے نحن انصار اللہ کہہ کر دین الٰہی کی نصرت و تائید کا پر جوش وعدہ کیا تھا وہ بھی ثابت قدم نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کے بجائے تثلیث کے من گھڑت عقیدہ کو اپنا لیا۔ حضرت مسیح نے حضور خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کی بشارت دی تھی اور آپ پر ایمان لانے کی بار بار دعوت دی تھی اسے بھی یکسر فراموش کر دیا۔ حضرت مسیح دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا"۔ (یوحنا14 :16)

اب یہ ابد تک ساتھ رہنے والا مددگار بجز خاتم النبیین کے اور کون ہے؟ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیح کی زبان سے ملاحظہ ہو:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا"۔ (یوحنا16 : 7، 8)۔

"لیکن جب وہ سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا (یوحنا16 : 13) انجیل کی یہ آیت تو اس آیت کا بالکل ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ وماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔

اغرا کہتے ہیں کسی چیز پر چسپاں کرنا مسلط کر دینا۔ الاغراء بالشیی الالصاق بہ من جھۃ التسلیط علیہ (قرطبیؒ) یعنی جب انھوں نے ہدایت کی سیدھی راہ چھوڑ دی اور نفسانی خواہشات کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے اور گمراہی کا اندھیرا چھا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی یک جہتی اور اتحاد ختم ہو گیا۔ باہمی محبت و پیار کی جگہ بغض و عناد نے لے لی اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ایک دین کے ماننے والے مختلف فرقوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر اور ملحد کہنے لگ گیا اور سیاسی طور پر ان کی رقابتوں نے انسانی خون کے دریا بہا دیئے۔ ان کے سیاسی اختلافات رقابتوں اور عداوتوں کی شدت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جائے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بیس سال کی قلیل مدت میں انھوں نے ساری دنیا کو دو عالمی جنگوں میں جھونک دیا۔ کروڑوں کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں (ضیاء)

استخراج مسائل:

(١) یہود نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا تو اللہ نے ان پر لعنت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑنے کی سزا لعنت ہے۔

(٢) احکام شرعیہ کی تبلیغ کے لیے بنو اسرائیل میں بارہ نقیب مقرر کیے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خبر واحد حجت ہے۔

(٣) بارہ نقیبوں کو جبابرہ کے احوال کی تفتیش کے لیے شام بھیجا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کے علاقہ میں جاسوس بھیجنا جائز ہے۔

(٤) اللہ کے سب رسولوں پر ایمان لانا 'نماز پڑھنا 'زکوۃ ادا کرنا اور نفلی صدقات دینا گناہوں کی مغفرت اور دخول جنت کا سبب ہے۔

(٥) یہود اور نصاری نے اپنی کتابوں میں لفظی اور معنوی تحریف کر دی ہے۔

٦۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں کے بہت سے فرقے رہیں گے۔ جن میں ہمیشہ جنگ اور عداوت رہے گی اب بھی انگلستان جرمنی وغیرہ کا حال دیکھ لو کہ اگرچہ ان میں کبھی سیاسی خود غرضیوں کی بنا پر ظاہری اتفاق ہو جاتے ہیں لیکن دل سب کے علیحدہ رہتے ہیں، ان کی نااتفاق مرنے کے بعد بھی نہیں جاتی کہ ولایتی عیسائیوں کے قبرستان اور، مگر دیسیوں کے اور

٧: اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آسمانی کتب کے احکام سے واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ کون سے احکام اصلی ہیں اور کون سے جعلی، کسی کے چھپے بھید وہی ظاہر کر سکتا ہے جو بھید سے واقف ہو، لیکن حضور کو ان کتابوں کے درست کرنے کا حکم نہ تھا۔ کیونکہ وہ منسوخ ہو چکی تھی۔ بلکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آیت رجم وغیرہ کو درست فرما بھی دیا۔

آیت مبارکہ:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ۙ

لغۃ القرآن: [يَاَهْلَ الْكِتٰبِ : اے اہل کتاب][قَدْ : یقیناً][جَآءَكُمْ : آیا تمہارے پاس][رَسُوْلُنَا : ہمارا رسول][يُبَيِّنُ : وہ بیان کرتا ہے][لَكُمْ : تمہارے لیے][كَثِيْرًا : زیادہ][مِّمَّا : اس سے جو][كُنْتُمْ : تم تھے][تُخْفُوْنَ : تم چھپاتے][مِنَ الْكِتٰبِ : سے کتاب][وَيَعْفُوْا : اور وہ درگزر کرتا ہے][عَنْ : سے][كَثِيْرٍ : زیادہ][قَدْ : یقیناً][جَآءَكُمْ : آئی تمہارے پاس][مِّنَ اللّٰهِ : اللہ کی طرف سے][نُوْرٌ: روشنی][وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ: اور کتاب واضح]

ترجمہ: اے اہل کتاب ! بیشک تمہارے پاس ہمارے (یہ) رسول تشریف لائے ہیں جو تمہارے لیے بہت سی ایسی باتیں (واضح طور پر) ظاہر فرماتے ہیں جو تم کتاب میں سے چھپائے رکھتے تھے اور (تمہاری) بہت سی باتوں سے در گزر (بھی) فرماتے ہیں۔ بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آگیا ہے اور ایک روشن کتاب (یعنی قرآن مجید)

تشریح: یہاں یہودیوں اور عیسائیوں سب سے خطاب ہے۔ فرمایا گیا کہ اے اہل کتاب ! بیشک تمہارے پاس ہمارے رسول محمد مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے، وہ تم پر بہت سی وہ چیزیں ظاہر فرماتے ہیں جو تم نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی کتاب سے چھپا ڈالی تھیں جیسے رَجَم کی آیات اور سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف جو تم نے چھپا دیئے تھے لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمادیئے اور یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ ہے۔ تمہاری چھپائی ہوئی چیزیں بیان کرنے کے ساتھ بہت سی باتیں یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معاف فرمادیتے ہیں اور ان کا ذکر بھی نہیں کرتے اور نہ ان پر مؤاخذہ فرماتے ہیں کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسی چیز کا ذکر فرماتے ہیں جس میں مصلحت ہو۔ یہ سب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت وشان کا بیان ہے۔ (صراط)

یہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور علم کامل کی دلیل ہے۔ باوجود امی ہونے کے آپ ﷺ توراۃ اور انجیل کے ایسے مسائل اور احکام ظاہر فرمادیتے جنہیں علماء یہود و نصاریٰ ہمیشہ سے چھپائے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا رسول تمہاری ساری چھپی ہوئی باتوں کو ظاہر نہیں فرماتا بلکہ صرف انھیں امور کا ذکر کرتا ہے جن کے اظہار میں کوئی دینی فائدہ یا مصلحت عامہ ہو ویسے تمہاری دوسری خباثتیں جن کے اظہار سے بجز تمہیں رسوا کرنے کے اور کوئی فائدہ نہیں ان سے اغماض فرماتا ہے۔

شان نزول

حضرت عکرمہ (رض) فرماتے ہیں کہ ایک بار یہود کی ایک جماعت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی۔ اس نے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رجم کے بارے میں دریافت کیا کہ زانی کو سنگسار کرنا کیسا ہے حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تم میں بڑا عالم کون ہے انھوں نے اپنے پادری ابن صوریا کی طرف اشارہ کیا۔
حضور سیدنا نور مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابن صوریا تجھے قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ (علیہ السلام) پر توراۃ نازل فرمائی تجھے قسم ہے اس کی جس نے بنی اسرائیل کے سروں پر کوہ طور کو اٹھایا ابن سوریا کانپ گیا فرمایا سچ بتا توریت میں رجم کا حکم ہے یا نہیں۔ ابن صوریا بولا آپ نے حق کی قسم مجھے دی ہے ہاں توراۃ میں رجم کا تاکیدی حکم ہے۔ فرمایا پھر تم نے رجم کے حکم پر عمل کرنا کیوں چھوڑ دیا۔
اس نے جواباً عرض کیا ہماری قوم میں زنا بہت بڑھ گیا خصوصاً بڑے لوگ اس وباء میں مبتلا ہوگئے تب ہم نے اس کی سزا ہلکی کردی یعنی زانی کا سر مونڈ دینا۔ منہ کالا کردینا اور سو کوڑے مارنا اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تائید فرمائی گی۔ (روح المعانی)
آگے قد جآء کم من اللہ نور اس پر فرماتے ہیں۔ عظیم وھو نور الھدایۃ نور الانوار والنبی المختار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نور عظیم سے مراد نوروں کے نور جناب مصطفیٰ نبی مختار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ہے اور کتاب مبین سے مراد قرآن کریم ہے جو ہدایت دیتا ہے متعبین رضا کو جو سلامتی کی راہ چلتے ہیں انھیں یہ نور اور کتاب مبین کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر اللہ عزوجل کے حکم سے ایمان کی روشنی کی طرف لے جاتی ہے۔
نور وہ ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرے۔ نور کی دو قسم ہیں ایک نور حسی جیسے چاند۔ سورج۔ ستارے۔ چراغ۔ بجلی جس سے آنکھیں منور ہوتی ہیں۔ دوسرا نور عقلی جیسے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ کتاب اللہ یا علم جس سے عقل منور ہوتی ہے کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا۔ مبین کتاب کی صفت ہے ظاہر کرنے والی۔ قرآن کریم دینی۔ دنیاوی شرعی احکام ظاہر فرماتا ہے۔ اور صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ آگے فرق نصاریٰ کی تصریح اور ان کے عقائد بیان ہوئے اور اس کا رد کیا۔ (حسنات)
امام المفسرین ابن جریر لکھتے ہیں یعنی بالنور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الذی انار اللہ بہ الحق واظھر بہ الاسلام ومحق بہ الشرك فھو نور لمن استنار بہ (تفسیر ابن جریر) یعنی نور سے مراد یہاں ذات پاک محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والثناء ہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حق کو روشن کردیا۔ اسلام کو ظاہر فرمایا شرک کو نیست ونابود کیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نور ہیں مگر اس کے لیے جو اس نور سے دل کی آنکھوں کو روشن کرنا چاہے۔ اللہ تعالیٰ اس نور مجسم کی تابانیوں اور درخشانیوں سے ہمارے آئینہ دل کو منور فرمائے اور اپنے محبوب کی غلامی اور

محبت کی سعادت سے بہرہ اندوز فرمائے آمین۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو نور فرمارہا ہے تو کسی کو کیا اعتراض ؟کتاب مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔ نہ کہنا کہ ''نور '' سے بھی قرآن کریم مراد ہے درست نہیں کیونکہ واؤ عاطفہ تغایر پر دلالت کرتی ہے۔ (ضیاء)
ملا علی قاری نے شرح شفاء میں فرمایا کہ نور اور کتاب مبین دونوں حضور ہی ہیں، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مظہر صفات مظہر ذات مظہر احکام واخبار ہیں۔ لہٰذا یہ عطف تفسیری بھی ہو سکتا ہے حضور اللہ کا نور اس طرح ہیں کہ آپ ذات باری تعالیٰ سے سب سے پہلے فیض پانے والے ہیں اور آپ ﷺ کے ذریعہ سے دوسرے لوگ فیض لینے والے ہیں یہ بھی پتہ لگا کہ کوئی نور محمدی کو بجھا نہیں سکتا کیونکہ یہ اللہ کا نور ہیں جیسے چاند سورج نیز اس کی کوئی پیائش نہیں کر سکتا جیسے سمندر کا پانی اور ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے بغیر قرآن کی سمجھ ناممکن ہے کیونکہ بغیر نور کتاب نہیں پڑھی جاسکتی قرآن کے نقش چھونے کے لیے ضروری ہے کہ پانی سے جسم کا غسل کیا جائے اور قرآن کے اسرار چھونے کے لیے ضروری ہے کہ مدینہ طیبہ کے پانی سے دل کا غسل کیا جائے۔ (نور)
اللہ تعالیٰ نے اہل توراۃ اور اہل انجیل کو مخاطب کرکے فرمایا: تمہارے پاس نور اور کتاب مبین آ گئی۔ نور سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں جنہوں نے حق کو روشن کیا ' اسلام کو ظاہر کیا ' اور کفر کو مٹایا۔ اسی نور کی وجہ سے آپ وہ باتیں بیان فرمادیتے تھے جن کو یہودی چھپاتے تھے اور کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس نے ان چیزوں کو بیان فرمادیا جس میں ان کا اختلاف تھا۔ مثلا اللہ کی توحید ' حلال اور حرام اور شریعت کا بیان اور وہ کتاب قرآن مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمایا ' جس میں دین سے متعلق احکام کو بیان فرمایا:
(جامع البیان ' جز ٦ ص ٢٢٠ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ١٤١٥ھ)

نور مصطفےٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی محبوبیت

امام ابو عبدالرحمٰن الصقلی رحمۃ اللہ عنہ نے کتاب الدلالات میں نقل کیا ہے جس کی عبارت یہ ہے اللہ عزوجل نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کو اس امت سے زیادہ محبوب ہو اور نہ اس امت کے نبی سے زیادہ کوئی عزت والا پیدا کیا ہے اور ان کے بعد نبیوں کا مرتبہ ہے ' پھر صدیقین کا اور پھر اولیاء کرام کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور پیدا کیا اور وہ نور عرش کے ستون کے سامنے اللہ کی تسبیح اور تقدیس کرتا رہا ' پھر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور آدم (علیہ السلام) کے نور سے باقی انبیاء (علیہم السلام) کے نور کو پیدا کیا۔ (یہاں علامہ صقلی کی عبارت ختم ہوئی) اس کے بعد علامہ ابن الحجاج لکھتے ہیں ' فقیہہ خطیب ابو الربیع نے اپنی کتاب شفاء الصدور میں چند عظیم باتیں لکھی ہیں۔
ان میں سے یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارکہ کو پیدا کرنا چاہا ' تو اللہ سبحانہ نے جبرائیل (علیہ السلام) کو یہ حکم دیا کہ وہ زمین پر جائیں اور زمین کے قلب سے مٹی لے کر آئیں۔ جبرائیل (علیہ السلام) اور جنت کے فرشتے اور رفیق اعلیٰ کے فرشتے گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک کی جگہ سے سفید نورانی مٹی لائے اس کو جنت کی نہروں کے پانی سے گوندھا گیا ' حتیٰ کہ وہ سفید موتی کی طرح ہو گئی۔ اس مٹی کا نور تھا اور اس کی شعاع عظیم تھی۔ حتیٰ کہ فرشتوں نے اس مٹی کے ساتھ عرش ' کرسی ' آسمانوں ' زمینوں ' پہاڑوں اور سمندروں کے گرد طواف کیا اور فرشتوں نے اور تمام مخلوق نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی فضیلت کو پہچان لیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو ان کی پشت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

کے مادہ خلقت کی مٹی رکھی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنی پشت میں پرندوں کی آواز کی مانند اس کی آواز سنی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب! یہ کیسی آواز ہے؟ فرمایا: یہ محمد (علیہ الصلوۃ والسلام) کے نور کی تسبیح ہے 'وہ خاتم الانبیاء ہیں 'اللہ ان کو تمہاری پشت سے نکالے گا 'تم میرے عہد اور میثاق پر قائم رہنا اور ان کو صرف پاکیزہ رحموں میں رکھنا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا میں تیرے عہد اور میثاق پر قائم ہوں اور ان کو صرف پاکیزہ مردوں اور پاکیزہ عورتوں میں رکھوں گا۔ حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت میں چمکتا تھا۔ اور فرشتے ان کے پیچھے کھڑے ہو کر صف باندھے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو دیکھتے تھے اور سبحان اللہ کہتے تھے۔ (تبیان)

علامہ ابن الحاج اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس روایت میں یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو پیدا کیا اور یہ نور اللہ عزوجل کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس نور کے چار حصے کیے۔ پہلے حصہ سے عرش کو پیدا کیا 'دوسرے حصہ سے قلم کو پیدا کیا اور تیسرے حصہ سے لوح کو پیدا کیا۔ پھر قلم سے فرمایا: چل لکھ! اس نے کہا اے میرے رب میں کیا لکھوں؟ فرمایا: میں قیامت تک جو کچھ پیدا کرنے والا ہوں 'پھر قلم لوح پر چلنے لگا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا 'وہ لکھ دیا۔ پھر چوتھا حصہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اس نور کے چار حصے کیے۔ پہلے حصہ سے عقل کو پیدا کیا 'دوسرے حصہ سے معرفت کو پیدا کیا اور اس کو لوگوں کے دلوں میں رکھا اور تیسرے حصہ سے سورج اور چاند کے نور کو پیدا کیا اور آنکھوں کے نور کو پیدا کیا اور چوتھے حصہ کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے گرد رکھا 'حتیٰ کہ آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو یہ نور ان میں رکھا۔ پس عرش کا نور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور قلم کا نور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور لوح کا نور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور دن کا نور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور عقل کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور معرفت کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور سورج 'چاند اور آنکھوں کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے۔ (اس روایت کی عبارت ختم ہوئی)

اس کے بعد علامہ ابن الحاج لکھتے ہیں:

اس معنی میں بکثرت روایات ہیں۔ جو ان پر مطلع ہونا چاہے 'وہ ابوالربیع کی کتاب الشفاء کا مطالعہ کرے۔ اسی وجہ سے حضرت آدم (علیہ السلام) نے ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا: اے وہ! جو معنی میرے باپ ہیں اور صورۃ میرے بیٹے ہیں 'اور امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ فرمایا: ابھی آدم روح اور جسد کے درمیان تھے۔ (المدخل 'ج ۲ ص ۳۴۔ ۳۰ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

اول تخلیق

حکماء نے کہا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے جیسا کہ صریح حدیث میں وارد ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس حدیث اور دوسری دو حدیثوں میں مطابقت ہے۔ وہ حدیثیں یہ ہیں۔ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا 'اور اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا 'اور مطابقت اس طرح ہے کہ معلول اول اس لحاظ سے کہ صرف اس کی ذات کا بہ حیثیت مبداء تعقل کیا جائے تو وہ عقل ہے اور اس لحاظ سے کہ

وہ باقی موجودات اور نفوس علوم کے صدور میں واسطہ ہے تو وہ قلم ہے ' اور اس لحاظ سے کہ وہ انوار نبوت کے اضاضہ میں واسطہ ہے وہ سیدالانبیاء (علیہ الصلوۃ والسلام) کا نور ہے۔ (شرح مواقف 'ج ۷ 'ص ۲۵۴ 'مطبوعہ ایران '۱۳۲۵ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں :

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام احمد اور امام ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا 'پھر اس سے فرمایا : لکھ تو اس نے قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے 'اس کو لکھ دیا۔ حسن 'عطاء اور مجاہد کا یہی مختار ہے اور ابن جریر اور ابن جوزی کا بھی یہی مذہب ہے اور ابن جریر نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے نور اور ظلمت کو پیدا کیا 'پھر ان کو ممتاز کیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو پیدا کیا۔ تو ان مختلف روایات میں کس طرح موافقت ہوگی ؟ میں کہتا ہوں کہ ان میں موافقت اس طرح ہے کہ ہر چیز کی اولیت اضافی ہے اور ہر چیز اپنے بعد والوں کے اعتبار سے اول ہے۔ (عمدۃ القاری 'ج ۱۵ 'ص ۱۰۹ 'مطبوعہ بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب کے لیے اس اعتبار سے رحمت ہیں کہ آپ ممکنات پر ان کی صلاحیت کے اعتبار سے اللہ کے فیضان کا واسطہ ہیں 'اسی وجہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور اول المخلوقات ہے 'کیونکہ حدیث میں ہے 'اے جابر سب سے پہلے اللہ نے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۰۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

نیز علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں :

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ملکی ہے جس سے آپ فیض لیتے ہیں اور ایک حیثیت بشری ہے 'جس سے آپ فیض دیتے ہیں اور قرآن مجید آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح پر نازل کیا جاتا ہے کیونکہ آپ کی روح صفات ملکیہ کے ساتھ متصف ہے جن کی وجہ سے آپ روح امین سے فیض لیتے ہیں۔ (روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۲۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

نواب وحید الزمان (غیر مقلدین کے مشہور عالم) متوفی ۱۳۲۸ھ لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتداء نور محمدی سے کی 'پھر عرش کو پیدا کیا 'پھر پانی کو 'پھر ہوا کو 'پھر دوات 'قلم اور لوح کو پیدا کیا 'پھر عقل کو پیدا کیا۔ پس آسمانوں 'زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے 'ان کی پیدائش کا مادہ اولی نور محمد ہے۔ اس کے حاشیہ میں لکھا ہے :

وہ جو حدیث میں وارد ہے کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا 'اور سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا 'اس سے مراد اولیت اضافیہ ہے۔ (ھدیۃ المہدی ' ص ۵۶ 'مطبوعہ سیالکوٹ)

جس حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا 'بعض علماء نے کہا اس حدیث میں نور سے مراد روح ہے۔ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں :

ایک روایت میں ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا اور ایک روایت میں ہے سب سے پہلے میری روح کو پیدا کیا 'ان دونوں روایتوں سے مراد واحد ہے 'کیونکہ ارواح روحانی ہوتی ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح 'ج ۱ 'ص ۱۶۷ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ 'ملتان '۱۳۹۰ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور ہدایت ہونے پر دلائل :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور حسی ہونے کے متعلق علماء کے یہ نظریات ہیں 'جن کو ہم نے اختصار کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔ البتہ ظاہر قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انسان اور بشر ہیں 'لیکن آپ انسان کامل اور افضل البشر ہیں۔ اور نبی انسان اور بشر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہماری جنس سے مبعوث کیا ہے اور اسی کو ہمارے لیے وجہ احسان قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(آیت) "لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم "۔ (آل عمران: ۱۶۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔

یہ کتنی عجیب بات ہو گی کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمائے کہ ہمارا تم پر یہ احسان ہے کہ ہم نے رسول کو تم میں سے بھیجا اور ہم یہ کہیں کہ نہیں رسول ہماری جنس سے نہیں ہیں 'ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہم میں سے ہونا ہمارے لیے اس وجہ سے احسان ہے 'تاکہ آپ کے افعال اور آپ کی عبادات ہمارے لیے نمونہ اور حجت ہوں 'ورنہ اگر آپ کسی اور جنس سے مبعوث ہوتے تو کوئی کہنے کہہ سکتا تھا کہ آپ کے افعال اور آپ کی عبادات ہم پر حجت نہیں ہیں 'کیونکہ آپ کی حقیقت اور ہے اور ہماری حقیقت اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ افعال اور عبادات کر سکتے ہوں اور ہم نہ کر سکیں۔

(آیت) "لقد جآء کم رسول من انفسکم (التوبہ: ۱۲۸)

ترجمہ: بیشک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے۔

(آیت) "وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیھم "۔ (الانبیاء: ۷)

ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف مردوں ہی کو رسول بنایا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

کفار یہ کہتے تھے کہ کسی فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ اللہ تعالیٰ اس کے رد میں فرماتا ہے:

(آیت) "ولو جعلنه ملکا لجعلنه رجلا وللبسنا علیھم ما یلبسون"۔ (الانعام: ۹)

ترجمہ: اور اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اسے مرد (ہی کی صورت میں) بناتے اور ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جو شبہ وہ (اب) کر رہے ہیں۔

ان تمام آیات میں تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بشر 'انسان اور مرد ہیں لیکن آپ افضل البشر 'انسان کامل اور سب سے اعلی مرد ہیں 'اور اگر نور سے مراد نور ہدایت لیا جائے تو ان آیتوں میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے اور اکثر مفسرین نے نور ہدایت ہی مراد لیا ہے۔ اور اگر آپ کو چاند اور سورج کی طرح نور حسی مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ آپ کی حقیقت نور حسی ہے 'تو قرآن مجید کی ان صریح آیات کو ان اقوال کے تابع کرنا لازم آئے گا اور کیا قرآن مجید کی ان نصوص صریحہ کے مقابلہ میں ان اقوال کو عقیدہ کی اساس بنانا صحیح ہو گا؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بشریت اور نورانیت میں کوئی تضاد نہیں ہے 'کیونکہ حضرت جبرائیل حضرت مریم کے پاس بشری شکل میں آئے تھے ' لیکن اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا فرشتے اور حضرت جبرائیل چاند اور سورج کی طرح نور حسی ہیں؟ کیا رات کے وقت ہمارے ساتھ منکر نکیر نہیں ہوتے؟ پھر کیا ان کے ساتھ ہونے سے اندھیرا دور ہو جاتا ہے؟ کیا جب رات کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آتے تھے تو روشنی ہو جاتی تھی 'فرشتے نور سے بنائے گئے ہیں 'اللہ ہی جانتا ہے وہ کس قسم کے نور سے بنائے گئے؟ لیکن یہ بہر حال مشاہدہ سے ثابت ہے کہ وہ چاند اور سورج کی طرح نور حسی نہیں ہیں کیونکہ دنیا میں ہر جگہ 'ہر وقت فرشتے موجود ہوتے ہیں 'اس کے باوجود دنیا میں رات کو اندھیرا بھی ہوتا ہے۔

البتہ ! معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور حسی سے بھی وافر حصہ عنایت فرمایا تھا۔
امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین اور رنگ سب سے زیادہ روشن تھا۔ جو شخص بھی آپ کے چہرہ مبارک کے جمال کو بیان کرتا ' اس کو چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دیتا ' اور کہتا کہ آپ ہماری نظر میں چاند سے زیادہ حسین ہیں۔ آپ کا رنگ چمکدار اور چہرہ منور تھا اور چاند کی طرح چمکتا تھا۔ (دلائل النبوۃ ' ج ا ' ص ۳۰۰ ' مطبوعہ بیروت ' خصائص کبری ' ج ا ص ۶۷ ' مطبوعہ لائل پور)
امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کے دو دانتوں میں جھری (خلاء) تھی۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو آپ کے سامنے کے دانتوں سے نور کی طرح نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ (شمائل محمدیہ ' رقم الحدیث : ۱۵ ' المعجم الکبیر ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث : ۱۲۱۸۱ ' المعجم الاوسط ' ج ا ' رقم الحدیث : ۷۷ا ' دلائل النبوۃ للبیہقی ' ج ا ص ۲۱۵ ' مجمع الزوائد ' ج ۸ ص ۲۷۹ ' سنن دارمی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۵۸)
امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی متوفی ۲۵۵ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ کسی شخص کو سخی دیکھا ' نہ بہادر ' نہ روشن چہرے والا۔ (سنن دارمی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۵۹ ' حجۃ اللہ علی العالمین ' ص ۶۸۹)
امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت جابر بن سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک چاندی رات میں دیکھا ' میں کبھی آپ کی طرف دیکھتا اور کبھی چاند کی طرف۔ بخدا ! آپ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔ (شمائل محمدیہ ' رقم الحدیث : ۱۰ ' سنن دارمی ' ج ا رقم الحدیث : ۵۷ ' المعجم الکبیر ' ج ۲ رقم الحدیث : ۱۸۴۲ ' المستدرک ' ج ۴ ' ص ۱۸۶ ' حاکم اور ذہبی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے)
امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی متوفی ۲۵۵ ھ روایت کرتے ہیں :
ابو عبیدہ بن محمد بن عمار یاسر نے ربیع بنت معوذ بن عفراء سے کہا : ہمارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت بیان کیجئے۔ انھوں نے کہا اے میرے بیٹے اگر تم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھتے تو تم طلوع ہونے والے آفتاب کو دیکھتے۔ (سنن دامی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۶۰ ' المعجم الکبیر ' ج ۲۴ ' رقم الحدیث : ۶۹۶ ' حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے رجال کی توثیق کی گئی ہے۔ مجمع الزوائد ' ج ۸ ص ۲۸۰)
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حسن و جمال اور آپ کے حسی نورانیت سے متعلق ہم نے یہ احادیث تلاش کرکے نقل کی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاند اور سورج سے زیادہ حسین تھے۔ آپ کا چہرہ بہت منور اور روشن تھا اور آپ کے دانتوں کی جھری میں نور کی مانند کوئی چیز نکلتی تھی ' لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کا خمیر مٹی سے بنایا گیا تھا اور آپ انسان اور بشر تھے ' لیکن آپ انسان کامل اور سید البشر ہیں۔
امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ ھ لکھتے ہیں :

خطیب نے کتاب المتفق والمفترق میں عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت کی کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایاہر بچہ کے ناف میں اس مٹی کا حصہ ہوتا ہے جس سے وہ بنایا گیا 'یہاں تک کہ اسی میں دفن کیا جائے اور میں اور ابو بکر و عمر ایک مٹی سے بنے 'اسی میں دفن ہوں گے۔ (فتاوی افریقیہ 'ص ۱۰۰۔۹۹ 'مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی)

نیز امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

اور جو مطلقاً حضور سے بشریت کی نفی کرے 'وہ کافر ہے۔ قال تعالیٰ: (آیت) " قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا "۔ (فتاوی رضویہ 'ج ٦ ص ٦٧ 'مطبوعہ مکتبہ رضویہ 'کراچی)

اور صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ١٣٦٧ھ نے آپ کے نور ہدایت ہونے کی تصریح کی ہے۔ زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور فرمایا گیا 'کیونکہ آپ سے تاریکی کفر دور ہوئی اور راہ حق واضح ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ انسان کامل اور سید البشر ہیں 'کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہیں۔ آپ نور ہدایت ہیں اور نور حسی سے بھی آپ کو حظ وافر ملا ہے۔ جو آپ کو اپنی مثل بشر کہتے ہیں 'وہ بدعقیدگی کا شکار ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کی حقیقت نور حسی ہے اور صورت بشر ہے یا آپ لباس بشری میں جلوہ گر ہوئے اور حقیقت میں اس سے ماوراء ہے 'سو دلائل شرعیہ کی روشنی میں اس قول کو برحق ہونا ہم پر واضح نہیں ہو سکا۔

اہل کتاب کے لیے پیغام ہدایت

اس آیت میں تمام اہل کتاب کو خطاب کیا جاتا ہے کہ اے اہل کتاب! تم جو بہت سی باتیں اپنے مذہب کی چھپایا کرتے تھے مثلاً نبی آخر الزماں کی صفات اخلاق۔ حلیہ نبوت وغیرہ اور رجم کی طرح بعض دیگر احکامات کو پوشیدہ رکھتے تھے اب ہمارے رسول تمہارے پاس آگئے جو تمہاری اکثر تحریفات کی قلعی کھول کر رکھ دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے مخفی کردہ امور کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ہاں بہت سے وہ احکام جن کی اصلاح کی ضرورت نہیں ان سے وہ درگزر اور چشم پوشی کرتے ہیں۔ تم پہلے تاریکی اور گمراہی میں پڑے ہوئے تھے امور ہدایت کو چھپایا کرتے تھے اب خدا کی طرف سے تمہارے لیے روشنی آچکی ہے جس سے مراد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارک ہے اور ایک واضح اور روشن کتاب آچکی ہے جس سے مراد قرآن مجید ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کو واضح فرمادیا ہے اب جو شخص خدا تعالیٰ کی مرضی کا خواستگار ہو اور خوشنودی مولیٰ کا راستہ طلب کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ سے اس کو سلامتی اور نجات کے راستے دکھلادیں گے اور منزل مقصود تک پہنچادیں گے۔ اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکی اور گمراہی سے نکال کر روشنی اور ہدایت کی طرف لے آئیں گے اور ان کو خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ دکھادیں گے۔

بعض علمائے مفسرین نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس آیت میں خطاب حق تعالیٰ کا اہل کتاب سے ہے مگر سبق اس میں اہل اسلام کے لیے بھی ہے کہ وہ ایسے عالی شان رسول اور ایسی عالی قدر کتاب کی روشنی سے پورا فائدہ اٹھائیں اور اس نعمت عظمیٰ کی قدر کریں۔

دعا کیجئے: حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو جو رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتی ہونا نصیب فرمایا اور قرآن پاک جیسی کتاب ہماری ہدایت کے لیے عطا کی تو ہم کو ان نعمتوں کی صحیح قدر دانی کی توفیق بھی عطا فرمائیں۔

ہم کو ظاہر میں اور باطن میں اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع نصیب فرمائیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات کے موافق ہم کو اپنی زندگی گزارنا نصیب ہو۔ قرآن پاک کے احکامات کی اطاعت اور فرمان بر داری نصیب ہو۔ شریعت مطہرہ کی پابندی نصیب ہو اور دین و دنیا میں مولائے کریم کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہو۔

یا اللہ معصیت اور نافرمانی کی تاریکیوں سے نکال کر ہم کو اطاعت و فرمان بر داری کے نور کی طرف چلنا نصیب فرما۔

یا اللہ یہود و نصاریٰ نے اپنی بد بختی کے باعث نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی آخری کتاب قرآن مجید پر ایمان نہ لا کر اپنے کو دائمی اور ابدی نقصان میں مبتلا کیا۔

یا اللہ ہم کو اپنی رضا کا طالب بنا کر زندہ رکھئے اور اپنی ہی طاعت و فرمان بر داری پوری طرح زندگی میں نصیب فرمائے۔ آمین

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین (درس قرآن محمد اسحاق)

آیت مبارکہ:

يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾

لغۃ القرآن: [يَّهْدِيْ : وہ ہدایت دیتا ہے][بِهِ : اس کے ساتھ][اللّٰهُ : اللہ][مَنِ : جس][اتَّبَعَ : اس نے پیروی کی][رِضْوَانَهٗ : اس کی رضامندی][سُبُلَ : راستے][السَّلٰمِ : امن][وَيُخْرِجُهُمْ : اور وہ نکالتا ہے ان کو][مِّنَ : سے][الظُّلُمٰتِ : اندھیروں][اِلَى: طرف][النُّوْرِ : روشنی کی][بِاِذْنِهٖ : اپنے حکم سے][وَيَهْدِيْهِمْ : اور راہنمائی کرتا ہے ان کی][اِلٰي : طرف][صِرَاطٍ : راستہ][مُّسْتَقِيْمٍ : سیدھا]

ترجمہ: اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیرو ہیں، سلامتی کی راہوں کی ہدایت فرماتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے (کفر و جہالت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں سیدھی راہ کی سمت ہدایت فرماتا ہے

تشریح: اب یہود و نصاریٰ کو اکٹھا خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی جا رہی ہے کہ اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا آخری رسول آ پہنچا ہے جو توراۃ اور انجیل کی ایسی حقیقتیں منکشف کر رہا ہے جن کو تم نے کلی طور پر چھپا رکھا تھا اور بہت سی تمہاری ذاتی کمزوریوں سے صرف نظر کرتا ہے یقیناً تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا نور اور واضح کتاب پہنچ چکی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی خوشی کا طلب گار ہے اور اس کی جستجو کرتا ہے اللہ اپنے حکم سے اسے تاریکیوں سے نکال کر روشن فضا اور سیدھے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ سبل السلام سے مراد وہ سیدھا راستہ ہے جس کی صراط مستقیم کہہ کر وضاحت کی گئی ہے۔

سبل السلام

من اتبع رضوانہ سے اخلاص نیت کی اہمیت کو واضح فرمایا یعنی نور محمدی اور کتاب مبین سے اللہ تعالیٰ انھیں کی دستگیری اور رہنمائی فرماتا ہے جن کے دلوں میں اس کی رضا کی سچی طلب ہو۔ "سبل السلام" کا معنی اکثر علماء نے "سلامتی کے راستے" ہی بتایا ہے جن پر چلنے سے انسان دنیا و آخرت میں ناکامی سے بچ جاتا ہے اور لغزش اور بھٹک جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔ لیکن صراط مستقیم جس کا ذکر آیت کے آخر میں آرہا ہے وہ بھی تو سلامتی کا راستہ ہی ہے ایک چیز کو مکرر ذکر کرنے کا کیا فائدہ۔ اس لیے مجھے تو سبل السلام کا وہی معنی زیادہ پسند ہے جو قرطبیؒ نے امام حسن بصری (رح) سے نقل کیا ہے کہ السلام : اللہ عزوجل اور علامہ بیضاوی (رح) نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے او سبل اللہ (بیضاوی) یعنی معرفت الٰہی کے وہ خاص راستے جن پر چلنے سے قرب حق نصیب ہوتا ہے اور دوری کے حجاب اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ جو اپنے دل سے تمام خواہشات کو باہر نکال پھینکتا ہے اور اخلاص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے شب و روز تڑپتا رہتا ہے تو آفتاب محمدی کی شعاعیں اس کے لیے ان راہوں کو منور و روشن کر دیتی ہیں جن پر چلنے سے اسے قرب نصیب ہوتا ہے اور دوری کے حجاب اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اولیائے کاملین جن کو اس کا ذاتی تجربہ ہے ان سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ مصطفیٰ ﷺ کی رہنمائی کے بغیر اللہ تک پہنچانے والی راہ کا سراغ نہیں ملتا۔ لفظ السلام سے مقصود اگر وہی ہو جو حسن بصری (رح) کا خیال ہے تو پھر سبل السلام اگرچہ سالک کی آخری منزل ہے لیکن اسے سب سے پہلے اس لیے ذکر کیا تاکہ سالک کی آرزوؤں کا کعبہ اور امیدوں کا قبلہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہے اور اس سے کم درجہ پر قناعت نہ اختیار کرے۔

تاریکیاں اور اندھیرے کئی قسم کے ہیں۔ شرک و کفر کا اندھیرا، گناہ و سرکشی کا اندھیرا، نفس پرستی اور بدعت کی تاریکی غفلت اور سستی کی ظلمت اس لیے ظلمات جمع کا لفظ ذکر کیا۔ لیکن نور صرف ایک ہی ہے اس لیے واحد کا لفظ ہی استعمال فرمایا۔ صراط مستقیم یعنی شریعت محمدی کی اطاعت کی برکت سے انسان مختلف قسم کے اندھیروں سے نکل کر ہدایت کی روشنی میں آتا ہے۔ (ضیاء)

جب انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کا متلاشی اور ہدایت کے راستے کا راہی بنتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ یقیناً ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے۔ (فہم)

یہ کتاب ان لوگوں کو فائدہ پہنچائے گی جو ذہنی آلودگیوں سے ماورا ہو کر اللہ کی رضا چاہتے ہوں گے۔ ورنہ یہ کتاب ہاتھوں میں ہو گی بھی تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ صراط مستقیم صرف اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کی کتاب سے ملے گا ' جس سے تم سلامتی کی طرف چلو گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کی رضا کے طالب ہونا اور اسی سے توفیق مانگنا۔ اکبر نے ٹھیک کہا تھا۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا

ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو ہوا ' ہوا کرم سے تیرے
جو ہوگا تیرے کرم سے ہوگا
یہ کرم اللہ ہی کی توفیق ہے اور اسی کو ملتا ہے جو اس کو اللہ سے طلب کرے۔ (روح)

قرآن مجید کے فوائد اور مقاصد

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستہ پر چلاتا ہے جن کا مقصد محض دین کی پیروی کے لیے اللہ کے پسندیدہ دین پر عمل کرنا ہو اور جو بغیر غور وفکر کے صرف اپنے باپ دادا کے طریقہ پر چلنا چاہتے ہوں ' وہ اللہ کی رضا کے طالب نہیں ہیں۔ اللہ عزوجل کی رضا کا معنی کیا ہے ؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا اللہ کی رضا کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی عمل کو قبول کرلے اور اس کی مدح وثناء فرمائے۔ بعض علماء نے کہا اللہ جس کے ایمان کو قبول کرے اور اس کے باطن کو پاکیزہ کرے ' وہ اس سے راضی ہے اور بعض نے کہا اللہ جس پر ناراض نہ ہو ' وہ اس سے راضی ہے۔
سلامتی کے راستوں سے مراد وہ راستے ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع کیے ہیں اور جن پر چلنے کی بندوں کو دعوت دی ہے اور جن راستوں کی اس کے رسولوں نے پیروی کی ہے اور اس کا مصداق دین اسلام ہے۔ اللہ اسلام کے سوا اور کسی طریقہ کو قبول نہیں کرے گا۔ نہ یہودیت کو نہ عیسائیت کو اور نہ مجوسیت کو۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ سلامتی کے رستوں سے مراد سلامتی کے رستوں کا گھر ہے اور وہ جنت ہے۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ اللہ اس کتاب کے ذریعہ جنت کے راستوں پر ان لوگوں کو چلاتا ہے جو اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں۔
اللہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو کفر کے اندھیروں سے نکال کر نور ایمان کی طرف لاتا ہے۔ کفر کے اندھیرے اس لیے فرمایا کہ جس طرح انسان اندھیرے میں حیران اور پریشان ہوجاتا ہے ' اسی طرح کافر بھی اپنے کفر میں حیران ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ' وہ اپنے اذن سے اندھیروں سے نکالتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے وہ اپنی توفیق سے انھیں کفر کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی میں لاتا ہے۔ پھر فرمایا : انھیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد دین حق ہے ' کیونکہ دین حق واحد راستہ ہے اور اس کی تمام جہات متفق ہیں۔ اس کے برخلاف دین باطل میں متعدد جہات ہوتی ہیں اور اس کے راستہ میں کجی ہوتی ہے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تین فائدے بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص اللہ کی رضا کی پیروی کرے اس کو قرآن مجید آخروی عذاب سے سلامتی اور نجات کے راستہ کی ہدایت دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ مومنوں کو کفر اور شرک کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور توحید کی روشنی میں لاتا ہے اور تیسرا یہ کہ وہ دین کے احکام پر عمل کرنے کے لیے صحیح اور سیدھے راستہ کی ہدایت دیتا ہے۔ (تبیان)
" نور " سے خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور " کتاب مبین " سے قرآن کریم مراد ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو وحی الٰہی کی روشنی کو ضائع کرکے اہواء وآراء کی تاریکیوں اور باہمی خلاف و شقاق کے گڑھوں میں پڑے دھکے کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آ گئی اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر اجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے۔ اور جس کی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے صراط مستقیم کو بے تکلف طے کرلو گے۔ (عثمانی)

نور

اس (نور مجسم اور نور کتاب) سے اپنی رضا پر چلنے والوں کو سلامتی (اور نجات) کی راہوں پر لے جاتے ہے اور انھیں (گمراہی اور کفر و شرک کے) اندھیرے سے (اپنی توفیق) اپنے حکم سے روشنی میں نکال لاتا ہے (یعنی نور ایمان اور نور علم سے سرفراز کرتا ہے) اور ان کو سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔

نور، خود قائم نہیں، نور عرض ہے، صفت ہے اس لیے نور، اللہ کے حکم سے کام کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اس نور مجسم ہی سے اپنے بندوں کو راہ ہدایت دکھاتا ہے لیکن دیکھو غلو میں نہ آجانا اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ہے، نور صفت ہے۔ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کہا وہ کافر ہو گئے۔ (فیوض)

استخراج

1: معلوم ہوا کہ اللہ جس کسی کو ہدایت دیتا ہے یا دے گا وہ حضور ﷺ ہی کے ذریعہ سے ہے کوئی شخص حضور ﷺ سے مستغنی نہیں ہو سکتا اسی لیے فرمایا یھدی بہ۔

2: اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کفر بیشمار ہیں، ایمان صرف ایک، اسی لیے ظلمت کو جمع اور نور یعنی ایمان کو واحد فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ ہر کفر سے بچا جائے، تیسرے یہ کہ ایمان و کفر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ رب نے ایمان کو روشنی اور کفر کو تاریکی فرمایا۔ جیسے یہ دونوں ضدین ہیں ایسے ہی ایمان و کفر، لہٰذا کافر و مومن میں اتحاد و اتفاق ناممکن ہے۔

3: یعنی مومنوں کو نیک اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ کیونکہ عقائد کی ہدایت تو پہلے مذکور ہو چکی۔ (نور)

آیت مبارکہ:

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔـا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا‌ ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا‌ ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۷﴾

لغۃ القرآن: [لَقَدْ : یقیناً][كَفَرَ : کفر کیا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اِنَّ : تحقیق][اللّٰهَ : اللہ][هُوَ : وہ][الْمَسِيْحُ : مسیح][ابْنُ : بن][مَرْيَمَ: مریم][قُلْ : فرما دیجیے][فَمَنْ : پھر کون][يَّمْلِكُ : مالک ہے][مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے][شَيْـًٔا : کچھ بھی][اِنْ اَرَادَ : اگر وہ ارادہ کرے][اَنْ يُّهْلِكَ : یہ کہ ہلاک کرے][الْمَسِيْحَ : مسیح][ابْنَ : ابن][مَرْيَمَ : مریم][وَاُمَّهٗ : اور اس کی ماں][وَمَنْ : اور جو][فِي الْاَرْضِ : زمین میں][جَمِيْعًا: سب][وَلِلّٰهِ : اور اللہ کے لیے][مُلْكُ : حکومت][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ : اور زمین][وَمَا : اور جو][بَيْنَهُمَا: ان کے درمیان][يَخْلُقُ : وہ پیدا کرتا ہے][مَا : جو][يَشَآءُ: وہ چاہتا ہے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ :: پر ہر چیز][قَدِيْرٌ : قادر]

ترجمہ: بیشک ان لوگوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں کہ یقیناً اللہ مسیح ابن مریم ہی (تو) ہے، آپ فرما دیں: پھر کون (ایسا شخص) ہے جو اللہ (کی مشیت میں) سے کسی شے کا مالک ہو؟ اگر وہ اس بات کا ارادہ فرمالے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور سب زمین والوں کو ہلاک فرمادے گا (تو اس کے فیصلے کے خلاف انھیں کون بچا سکتا ہے؟) اور آسمانوں اور زمین اور جو (کائنات) ان دونوں کے درمیان ہے (سب) کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے

تشریح:

قرآن مجید یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ جب کوئی فرد یا قوم شرک میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ اس قدر زُود نگاہی اور کج فکری کا شکار ہوتی ہے کہ اسے خبر نہیں ہوتی کہ اس کے نظریات میں کس قدر تضاد اور الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال میں عیسائی مبتلا ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت مریم، حضرت عیسیٰ اور اللہ تعالیٰ کو ملا کر خدا مکمل ہوتا ہے غور فرمائیں کہ عیسائی ایک طرف اللہ تعالیٰ کی وحدت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسی زبان سے تثلیث پر بھی اصرار کیے جا رہے ہیں۔ جس چیز کو بنیاد بنا کر عیسائی تثلیث کا مغالطہ دیتے ہیں وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کا بن باپ پیدا ہونا ہے جن کے بارے میں ایک چھوٹے سے گروہ کو چھوڑ کر عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ہمارے گناہ معاف کروانے کی خاطر سولی پر لٹک چکے ہیں۔ یہ تو قرآن مجید کا عیسائیت پر احسان ہے کہ اس نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) نہ سولی چڑھائے گئے اور نہ ہی انھیں قتل کیا گیا ہے۔ تاہم قرآن مجید انھیں یہ باور کرا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ اور اس کی والدہ کو ہلاک اور زمین و آسمان کو نیست و نابود کرنا چاہے تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو انھیں بچا اور تحفظ دے سکے گی؟ (فہم)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ نجران کے عیسائیوں نے یہ بات کہی ہے اور نصرانیوں کے فرقہ یعقوبیہ وملکانیہ کا یہی مذہب ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ بتاتے ہیں کیونکہ وہ حُلُول کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد باطل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) میں حلول کیا ہوا ہے جیسے پھول میں خوشبو اور آگ میں گرمی نے، مَعَاذَ اللہ ثُمَّ مَعَاذَ اللہ۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم کفر دیا اور اس کے بعد ان کے مذہب کا فساد بیان فرمایا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُلُوہِیَّت کی تردید

اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی الوہیت کی کئی طرح تردید ہے۔

(1)۔۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو موت آسکتی ہے، اور جسے موت آسکتی ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

(2)۔۔ آپ (علیہ السلام) ماں کے شکم سے پیدا ہوئے، اور جس میں یہ صفات ہوں وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔

(3)۔۔ اللہ تعالیٰ تمام آسمانی اور زمینی چیزوں کا مالک ہے اور ہر چیز رب عَزَّوَجَلَّ کا بندہ ہے، اگر کسی میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہوتا تو وہ اللہ کا بندہ نہ ہوتا حالانکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔

(4)۔۔ اللہ تعالیٰ از خود خالق ہے، اگر آپ (علیہ السلام) میں اُلوہیت ہوتی تو آپ (علیہ السلام) بھی از خود خالق ہوتے۔ (صراط)

حضرت عیسیٰ کے خدا ہونے کا رد

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا مانتے ہیں اور اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ موجوہ چھپی ہوئی انجیل کے ٹائیٹل پر یہ لکھا ہوا ہے انجیل مقدس یعنی ہمارے خداوندا اور منجی یسوع مسیح کا نیا عہد نامہ۔

عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث پر مفصل بحث سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔ تثلیث کے عنوان پر انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کی یہ عبارت مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔

The Christian Doctrine of the trainity can be expressed in the words, the father is God. The son is "\ God and the Holy Ghost is God, and yet they are not three Gods but one God\" Ency Brittanica 479 volume 22

"مسیحیت کے عقیدہ تثلیث کو نہایت عمدگی سے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ باپ بھی خدا ہے بیٹا بھی خدا ہے اور روح القدس بھی خدا ہے۔ بایں ہمہ وہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے"۔ یہ معمہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

یہاں سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے الہ (خدا) ہونے کے عقیدہ کا بطلان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے کہ اگر وہ حضرت مسیح (علیہ السلام)، ان کی والدہ بلکہ سب مخلوق کو آن واحد میں موت کی نیند سلانا چاہے تو کوئی دم نہ مار سکے۔ حضرت مسیح (علیہ السلام) تو اپنی والدہ کی جان نہ بچاسکے اور جب ان کا مقرر وقت آئے گا تو وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے موت کے پیغام کو قبول کرلیں گے۔ جب ان کی یہ حالت ہے تو وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں یملک کا معنی قدرت رکھنا ہے یملك بمعنی یقدر من قولهم ملکت علی فلان امرہ ای اقتدرت علیه (قرطبیؒ)۔

ماں باپ کے ذریعے، ماں باپ دونوں کے بغیر اور باپ کے بغیر۔ یہ سب اسی کی قدرت بے پایاں کی اعجاز نمائیاں ہیں۔ کوئی چیز اس کے لیے مشکل نہیں۔ کوئی صورت اس کے لیے دشوار نہیں۔ (ضیاء)

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس زعم کارد کیا اور فرمایا

اے نبی آپ ان عیسائیوں سے یہ کہیئے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں سے موت کو دور کرنے پر کون قادر ہے؟ بلکہ اگر وہ تمام مخلوق کو فنا کرنے کا ارادہ کرے تو اس کو کون روک سکتا ہے؟ بیشک اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو ہلاک کرنے پر قادر ہے کوئی اس کے فیصلہ کو رد کرسکتا ہے ' نہ اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے۔ اس کی مشیت اور ارادہ کے مقابلہ میں کسی کا زور نہیں اور جب مسیح اپنے نفس سے اور اپنی ماں سے ہلاکت اور موت کو دور نہیں کرسکتے تو وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد فرمایا:

اللہ ہی مالک ہے آسمانوں اور زمینوں کا ' اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ' وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدار ہے۔ (المائدہ : ١٧)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ حقیقت میں وہ ہے جو مالک علی الاطلاق ہو اور اس کا تصرف آسمانوں اور زمینوں میں نافذ ہو اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان جو انسان ' جن ' فرشتے ' اور جس قدر بھی مخلوقات ہیں ' ان سب پر اس کی سلطنت اور حکومت ہو اور اللہ ہی اپنی حکمت اور ارادہ سے مخلوق کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اس نے انسان کی پیدائش کے لیے مرد اور عورت کے اختلاط کو ظاہری سبب بنایا ' لیکن اس نے چاہا تو مرد اور عورت دونوں کے بغیر حضرت آدم کو پیدا کردیا اور اس نے چاہا تو عورت کے بغیر حضرت حوا (علیہ السلام) کو پیدا کردیا اور اس نے چاہا تو مرد کے بغیر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو پیدا کردیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ ہر چیز پر ہر طرح قادر ہے۔ (تبیان)

المختصر۔۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ان سب کو موت و فنا کے ذریعہ ہلاک کرنے کا ارادہ ہو جائے تو کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادے سے اسے روک دے اور انھیں ان کی ہلاکت سے بچاسکے، جیسے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو موت دی تو کوئی مانع نہ ہوا۔۔ الغرض۔۔ آیت کریمہ میں حضرت بی بی

مریم صاحبہ کے ذکر سے نصرانیوں کے منہ بند کرنے کی تاکید مطلوب ہے اور واضح کرنا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو موت دینے کا ارادہ فرمالے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

تو اگر بالفرض اس وقت حضرت مریم باحیات ہوں اور پھر حق تعالیٰ ان پر وفات طاری کرنا چاہے تو کسی میں یہ قدرت نہیں کہ انھیں موت سے بچاسکے۔۔الحاصل۔۔ مسیح اور ان کی ماں دوسرے سارے ممکنات کی طرح مغلوب و مقہور و قابل فنا ہیں اور ایسے کو خدا جاننا نہ چاہیے۔ تو اے نصرانیو! جب تم لوگوں نے بی بی مریم کی موت پر اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھ لی تو پھر تم ہی غور کرو کہ باقیوں کی موت اس کے لیے کب ناممکن ہے ؟۔

(اور) ناممکن ہونے کا سوال ہی کہا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے ملکیت آسمانوں اور زمین کی اور ان کے درمیان کی آسمانوں اور زمینوں اور ان کے مابین جو کچھ ہے سب کا سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہے وہ ان سب پر قدرت تامہ اور مکمل قبضہ رکھتا ہے وہی تمام اشیاء پر ایجاد واعدام اواحیاء واماتۃ مطلّقا تصرف کا مالک ہے اس کے سوا کسی کو نہ استقلالا تصرف کا حق ہے نہ ہی اشتراکا۔ بنابریں۔ صرف وہی الوہیت کا مستحق ہے کسی کو اس کے سوا یہ استحقاق نہ حاصل ہے نہ ہو سکتا ہے۔ وہ انواع مخلوق میں پیدا فرمادے جو چاہے اور جس طرح چاہے اور ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چاہے پر قادر ہے وہ جو چاہے کرے۔

اگر چاہے تو اصل کے بغیر پیدا کرے جیسے آسمان وزمین کے اندر کی چیزیں چاہے تو کسی اصل سے لیکن اس کے جنس سے نہیں جیسے آدم اور دیگر بہت سے حیوانات کی تخلیق اسی طرح کسی ایسی اصل سے جو اس کی ہم جنس ہو لیکن مادہ سے جس میں نر کا دخل نہ ہو جیسے عیسیٰ کی تخلیق۔۔ یا۔۔ دونوں کا دخل ہو جیسے باقی تمام انسانوں کی تخلیق یا اس کی تخلیق میں کسی غیر کا واسطہ نہ ہو جیسے عام مخلوق کی تخلیق۔۔ یا۔۔ اپنی تخلیق میں کسی کو واسطہ بنائے، جیسے معجزے کے طور پر پرندوں کی تخلیق اور مردوں کو زندہ کرنے، کوڑھیوں اور مادر زاد اندھوں وغیرہ کو اچھا کرنے میں عیسیٰ کو واسطہ بنایا لیکن ان سب کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہو گی نہ کہ کسی اور کی طرف۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہو چکا کہ یہود نصاری مسلسل عہد شکنی اور سرکشی کرتے رہے اور خدائی عذاب وعتاب کا شکار بھی ہوتے رہے لیکن ان کو اپنے تعلق سے خوش فہمی بہت تھی یا وہ دوسروں کو بیوقوف بنانے کے لیے جان بوجھ کر ڈینگ ہانکنے کے عادی ہو چکے تھے۔ (اشرفی)

مسائل

۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینا کفر ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا نہیں۔

۳۔ زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

۵۔ جس کو اللہ تعالیٰ نقصان پہنچانا چاہے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔

آیت مبارکہ:

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ وَالنَّصٰرٰى نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ‌ؕ قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمۡ بِذُنُوۡبِكُمۡ‌ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ‌ؕ يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا‌ وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۸﴾

لغۃ القرآن: [وَقَالَتِ : اور کہا][الْيَهُوْدُ : یہودیوں][وَالنَّصٰرٰى: اور نصارٰی][نَحْنُ : ہم][اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ : بیٹے اللہ][وَاَحِبَّآؤُهٗ : اور اس کے پیارے][قُلْ : فرما دیں][فَلِمَ : پھر کیوں][يُعَذِّبُكُمْ : وہ تمہیں عذاب کرتا ہے][بِذُنُوْبِكُمْ: تمہارے گناہ کی وجہ][بَلْ : بلکہ][اَنْتُمْ بَشَرٌ: تم انسان][مِّمَّنْ : سے جو][خَلَقَ : اس نے پیدا کیا][يَغْفِرُ : وہ معاف کرے گا][لِمَنْ : اس کو][يَّشَآءُ : وہ جسے چاہے گا][وَيُعَذِّبُ : اور عذاب دے گا][مَنْ : جس کو][يَّشَآءُ : وہ چاہے گا][وَلِلّٰهِ : اور اللہ کے لیے][مُلْكُ : بادشاہی][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ : اور زمین][وَمَا : اور جو][بَيْنَهُمَا : ان دونوں کے درمیان][وَاِلَيْهِ : اور اس کی طرف][الْمَصِيْرُ : لوٹنا ہے]

ترجمہ: اور یہود اور نصارٰی نے کہا: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ آپ فرما دیجئے: (اگر تمہاری بات درست ہے) تو وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) جن (مخلوقات) کو اللہ نے پیدا کیا ہے تم (بھی) ان (ہی) میں سے بشر ہو (یعنی دیگر طبقات انسانی ہی کی مانند ہو)، وہ جسے چاہے بخشش سے نوازتا ہے اور جسے چاہے عذاب سے دوچار کرتا ہے، اور آسمانوں اور زمین اور وہ (کائنات) جو دونوں کے درمیان ہے (سب) کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور (ہر ایک کو) اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے.

تشریح:

شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اہلِ کتاب آئے اور انھوں نے دین کے معاملہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گفتگو شروع کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے سے اس کے عذاب کا خوف دلایا تو وہ کہنے لگے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ہمیں کیا ڈراتے ہیں ہم تو اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۱۸، ۱/۴۷۸) (صراط)

عربی میں بیٹے کے لیے عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ولد اور ابن۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ولد کا تو صرف اس لڑکے کو کہتے ہیں جو صلب سے پیدا ہوا ہو اور ابن صلبی بیٹے کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے اور جس چیز کا کسی کے ساتھ خصوصی تعلق ہو اس کو بھی ابن کہہ دیتے ہیں جیسے مسافر کو ابن السبیل اور جنگجو کو ابن الحرب وغیرہ۔ یہود اور عیسائی اس معنی میں اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے نہیں کہا کرتے تھے کہ وہ اس کی صلبی اولاد ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اس کے مقرب اور لاڈلے ہیں اور ان پر اللہ کی رحمت و شفقت اس طرح ہے جیسے باپ کی بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ امام رازی (رح) فرماتے ہیں ان لفظ الابن کما یطلق علی ابن الصلب فقد یطلق ایضا علی من یتخذ ابنا بمعنی تخصیصه بمزید الشفقة والمحبة فالقوم ادعوا ان عناية الله بهم اشد وا كمل من عناية بكل ما سواهم (کبیر) یہود و نصاریٰ کو جب اسلام کی دعوت دی جاتی تو وہ از راہ غرور کہا کرتے ہمیں اس دین کو قبول کرنے اور اس کے نبی ﷺ پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہم تو اللہ کے چہیتے اور محبوب ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ یہ کہہ کر فرما دیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم پر عذاب الٰہی کے بادل کیوں ہر وقت منڈلایا کرتے ہیں۔ کبھی دوستوں اور پیاروں کو بھی یوں ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے جیسے تمہیں کیا رہا ہے۔ (ضیاء)

خود کو اعمال سے مُستَغنی جاننا عیسائیوں کا عقیدہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو اعمال سے مُستَغنی جاننا عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ آج کل بعض اہلِ بیت سے محبت کے دعوے دار حضرات اور بعض جاہل فقیروں کا یہی عقیدہ ہے۔ ایسا عقیدہ کفر ہے کیونکہ قرآن کریم نے ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر فرمایا۔
{ فَلِمَ یُعَذِّبُکُم بِذُنُوبِکُم : پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں پر عذاب کیوں دیتا ہے؟} یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ہم چالیس دن دوزخ میں رہیں گے یعنی بچھڑے کی پوجا کی مدت کے برابر۔ اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم بیٹوں کی طرح اللہ عَزَّوَجَلَّ کو پیارے ہو تو تمہیں یہ سزا بھی کیوں ملے گی یعنی اس بات کا تمہیں بھی اقرار ہے کہ گنتی کے دن تم جہنم میں رہو گے تو سوچو کوئی باپ اپنے بیٹے کو یا کوئی شخص اپنے پیارے کو آگ میں جلاتا ہے! جب ایسا نہیں تو تمہارے دعوے کا جھوٹا اور باطل ہونا تمہارے اقرار سے ثابت ہے۔ (صراط)

یہود کے اس دعوی کارد کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں

عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس (یہود میں سے) نعمان بن رضاء 'بحری بن عمرو اور شاس بن عدی آئے اور آپ سے گفتگو کی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے بات کی اور ان کو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ انھوں نے کہا اے محمد! آپ ہمیں کیوں ڈرا رہے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں جس طرح عیسائیوں نے کہا تھا 'تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے اللہ تمہیں عذاب کیوں دے گا؟ اس کا معنی یہ ہے کہ اے جھوٹو! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اللہ تمہیں عذاب کیوں دے گا؟ کیونکہ کوئی شخص اپنے محبوب کو عذاب نہیں دیتا اور تم خود اقرار کرتے ہو کہ اللہ تمہیں عذاب دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ جتنے دن انھوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی 'اتنے دن ان کو عذاب ہوگا اور یہ مدت چالیس دن تھی۔ حالانکہ باپ اپنے بیٹے کو اور کوئی شخص اپنے دوست کو عذاب نہیں دیتا۔ (جامع البیان 'جز ٦ ص ٢٢٥۔ ٢٢٤ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت '١٤١٥ھ)

یہ شرک کی نحوست کا نتیجہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا ٹھہرایا۔ اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا جزء قرار دیا پھر آگے چل کر مذہبی تقدس کی دھاک بٹھانے اور سیاسی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے بزعم خود اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہونے کا اعلان کیا۔ اور یہ بھی باور کروایا کہ ہم اس کے ایسے بیٹے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کے جواب میں ان پر اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے پسندیدہ لوگ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب اور ذلت میں کیوں مبتلا کرتا رہا اور کرتا ہے۔ کوہ طور کے دامن میں موسیٰ (علیہ السلام) کی موجودگی کے باوجود تمہارے ستر زعماکا ہلاک ہونا۔ جنھیں موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کے بدلے میں حیات نو سے نوازا گیا۔ اصحاب سبت پر پھٹکار کا نازل ہونا جس کے بدلے میں انھیں ذلیل بندر بنا دیا گیا۔ تمہارے سروں پر کوہ طور کا منڈلایا جانا۔ اس طرح دیگر عذابوں کا نازل ہونا اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے پسندیدہ لوگ ہو تو یہ عذاب تم پر کیوں نازل ہوئے؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی مشفق اور مہربان باپ اپنی محبوب اور تابع فرمان اولاد کو اپنے ہاتھوں سے پریشانیوں اور عذاب میں مبتلا کرے؟ تم تو انسانوں کی طرح ہی انسان ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو پیدا کیا ہے۔ ایسے ہی اس نے تمہیں پیدا فرمایا۔ وہ جس کی چاہے خطاؤں کو معاف فرمادے اور جسے چاہے اس کی بداعمالیوں کی سزا دے۔ زمین وآسمانوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اللہ کی ملک ہے اور ہر کسی نے اس کے ہاں پلٹ کر جانا ہے۔ (فہم)

اس کے بعد فرمایا: آپ ان سے کہئے کہ جس طرح تم نے گماں کیا ہے اس طرح نہیں ہے 'بلکہ امر واقعی یہ ہے کہ تم عام لوگوں کی طرح بشر ہو۔ اگر تم ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو تو تم کو اجر وثواب ملے گا اور اگر ایمان نہیں لائے تو سزا پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے بخش دیتا ہے 'اور جس کو چاہتا ہے اپنے عدل سے سزا دیتا ہے۔ پھر فرمایا: اور اللہ ہی کی ملکیت میں ہے تمام آسمان اور زمینیں اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے 'تو تم بھی اللہ کے مملوک اور اس کے بندے ہو 'اس کے بیٹے اور اس کے محبوب نہیں ہو۔ (تبیان)

قرآن مجید کا فرمان ہے کہ جب کوئی فرد یا قوم شرک میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کی گمراہی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں مبتلا ہوا۔ (النساء: ١١٦)

جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا گویا وہ آسمان سے گرا اور پرندوں نے اسے نوچ ڈالا یا وہ تیز ہواؤں نے اسے کسی گہری کھڈ میں دے مارا۔ (الحج: ٣١)

یعنی ان کی اصل بیماری ان کا یہ زعم باطل ہے کہ ہماری دینوی اور اخروی کامیابی کے لیے ایمان و عمل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اور وہ اپنے بیٹوں اور اپنے چہیتوں سے کوئی بازپرس نہیں کیا کرتا۔ اس زعم باطل نے ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے یکسر بے نیاز کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایمان و عمل کا احساس ہی جاتا رہا تو پھر عہد و پیمان کی پابندی کیسے باقی رہتی۔ اس لیے کہ ان سے جو عہد و پیماں لیے جاتے رہے ان میں تو ان دو باتوں پر ہی زور دیا جاتا رہا ' ایک ایمان پر اور دوسرا مختلف قسم کے اعمال صالحہ پر۔ لیکن جب ان کے اندر اس بنیادی تصور نے جگہ بنا لی کہ تم سے کوئی بازپرس ہونے والی نہیں ہے بلکہ تمہیں یہاں بھی اپنے چہیتوں کی طرح رکھا جائے گا اور آخرت میں بھی تمہارا استقبال اللہ کے بیٹوں اور اس کے چہیتوں کی طرح ہوگا۔ یہ کہنے کو تو ایک زعم باطل اور محض ایک بیہودہ تصور ہے ' لیکن اگر یہ کسی بھی قوم کا عقیدہ بن جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت بے عملی سے نہیں روک سکتی حالانکہ دنیا میں ایک معمولی سے معمولی انسان بھی بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہاں آدمی کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے اپنے کرتوتوں ہی کا پھل اور اپنی کمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ اچھے اعمال کرتا ہے تو اچھے صلے سے نوازا جاتا ہے اور اگر وہ برے اعمال یعنی برائیاں ' بداخلاقیاں اور بداطواریاں اختیار کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے مختلف مصائب سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک فطری قانون ہے ' جس سے کسی کو بھی رستگاری نہیں کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بحیثیت قوم ہم تنزلی کا شکار کیوں؟

لیکن اگر کسی کم عقل آدمی کے دماغ میں یہ تصور سما جائے کہ میں کوئی سا کام کرنے کا بھی پابند نہیں ہوں بلکہ یہاں مجھے ہر چیز بغیر کیے کے ملے گی تو آپ ایسے آدمی سے کسی بھی عمل کی توقع نہیں کر سکتے ' وہ شخص دھرتی کا بوجھ بن جائے گا اور اپنے پرائے اسے ایک ناکارہ چیز سمجھ کر اپنے سے دور کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خدانہ کرے یہ برائی کسی قوم میں پھیل جائے تو وہ قوم باقی قوموں کے لیے ایک عبرت کا سامان بن جاتی ہے ' جب تک باقی رہتی ہے دوسروں کی دست نگر ہو کر جیتی ہے اور بالآخر جب اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے تو دوسرے ان کی تباہی پر غم کھانے کی بجائے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں "خس کم جہاں پاک " اور اگر یہ بیماری مذہبی معاملات میں پیدا ہو جائے تو پھر ایسی قوم نماز ' روزہ یعنی عبادات سے یکسر لاتعلق ہو کر نہ صرف بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ برائیوں کے جہنم میں ڈوب جاتی ہے اور انسانی معاملات میں تمام جذبات خیر سے تہی دامن ہو کر حقوق و فرائض سے یکسر لاتعلق ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان اہل کتاب کا بھی ہوا کہ ان کی مذہبی زندگی بھی تباہ ہوئی اور ان کی تہذیب اور تمدن بھی اس لعنت کے برے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بات نہایت بے عقلی اور بے سمجھی کی معلوم ہوتی ہے ' لیکن ہم جب بھی قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ قومیں جب بھی تنزلی کا شکار ہوتی ہیں تو ان میں اس برائی کو ہم پوری طرح کارفرما دیکھتے ہیں کہ وہ پھر ایسے ہی سہاروں کے ذریعے سے جیتی ہیں کیونکہ ہر وہ شخص جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے اندر یہ کسک کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے کہ یہ دنیا میں تو جیسی گزری سو گزری آخرت سے جب معاملہ پڑے گا تو وہاں کیا ہوگا۔ اس لیے وہ اپنی اس کسک کو بہلانے کے لیے اس طرح کے سہارے اختیار کرتا ہے جیسے ان اہل کتاب نے اختیار کر رکھے تھے کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں آخرت کی بازپرس سے ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

انتہائی بد قسمتی کی بات ہے کہ ایسے ہی سہارے اس امت نے بھی اختیار کر لیے ہیں جسے پوری دنیا کی امامت پر فائز کیا گیا ہے اور قیامت تک جس نے دنیا کو ہدایت دینے کا فرض انجام دینا ہے۔ اس میں وہ بگڑے ہوئے مذہبی لوگ جو علم کے بغیر نجات کے تصورات رکھتے ہیں 'ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے 'شکایت تو ان سے ہے جنھیں ہم اپنا دانشور طبقہ کہتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے لوگ نہایت خوبصورت پیرائے میں اس طرح کی بے سروپا باتیں کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر اسی تصور کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا 'فریب ہے امتیاز عقبیٰ

نمود ہر شے میں ہے ہماری 'کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

بلکہ مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جب ایک ایسا شخص جس کے آباؤاجداد عجمی ہیں اور جس کے نسب میں کوئی قابل فخر بات بھی نہیں پائی جاتی 'وہ اس طرح کی باتیں کہتا ہے تو پھر بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو انبیاء کی اولاد تھے 'وہ جب دیکھتے تھے کہ ہمارے آباؤاجداد میں ہزاروں انبیاء کرام آچکے ہیں اور ہمارے گھروں میں کتنی کتابیں اتر چکی ہیں تو وہ اس زعم باطل کو اختیار کرتے ہوئے کس طرح شرما سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں شریعت کی پابندی کا احساس اس وقت تک موجود رہا جب تک وہ اس طرح کے بیہودہ تصورات سے بچے رہے اور انھیں اللہ سے کیے ہوئے عہود اور مواثیق یاد رہے اور بار بار اس کی یاد دہانی ان کو ایمان و عمل پر آمادہ کرتی رہی۔ لیکن یہ تصور جب ان میں کمزور پڑ گیا تو پھر نہ صرف یہ لوگ عملی پابندیوں سے بے نیاز ہوئے بلکہ ان کی جسارتیں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انھوں نے اللہ کی کتابوں میں تحریف تک کر ڈالی اور احکام خداوندی کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنا ڈالا اور جب اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء نے انھیں سرزنش کی اور انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی تو ان بد بختوں نے انھیں قتل تک کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ ان کی صدیوں کی تاریخ اللہ کے عظیم بندوں پر ان کے مظالم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اور یہی حال ہم مسلمانوں کا بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی جب تک اللہ کے سامنے جواب دہی کا تصور پوری توانائی سے زندہ رہا 'ان کے حکمران تخت حکومت پر بیٹھ کر بھی لرزہ براندام رہتے تھے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم بار بار اس کی مثالیں دیکھتے ہیں اور شاید اسی احساس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مجبور کیا کہ آپ اس بنیادی کمزوری کی طرف بار بار امت کی توجہ دلائیں۔ چنانچہ جب بھی ایسا کوئی موقع آیا تو آپ نے ہمیشہ اس پر توجہ دلائی۔ حدیث میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دفعہ اپنے خاندان کے جستہ جستہ لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے سامنے خطاب کرتے ہوئے بطور خاص یہ بات فرمائی کہ

(اے میرے چچا! اور اے میری پھوپھی صفیہ (r) ! اور اے میری بیٹی فاطمہ (r) ! تم میرے مال میں سے جو چاہو میں تمہیں دینے کو تیار ہوں 'لیکن اگر تم نے ایمان و عمل کا سرمایہ اپنے یہاں جمع نہیں کیا تو میں کل قیامت کے دن اللہ کے سامنے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا) اس امت کو صرف ایمان اور عمل صالحہ ہی نہیں بچائیں گے بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کی عملی کوششیں اللہ کے یہاں سرخروئی کے لیے لازمی شرائط ہیں اور جہاں تک اس امت کے افراد کا تعلق ہے ان میں سب سے بڑی نسبی شرافت ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرابت کا تعلق ہے 'ابھی پیچھے حدیث گزر چکی ہے کہ یہ تعلق بھی ایمان و عمل کے بغیر کام نہیں آئے گا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ

ایمان و عمل کی توفیق بخشے تو یقیناً ایک سید زادہ اپنے درجات میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر ایمان و عمل سے بے نیاز رہا تو یہی قرابت داری اللہ کے یہاں زیادہ ناراضگی کا سبب بنے گی کیونکہ پروردگار ان سید زاروں اور اس امت کے بڑے لوگوں کو اسی نسبت سے پکڑے گا اور پوچھے گا کہ تم نہ صرف اپنے پاس اللہ کی کتاب رکھتے تھے بلکہ تمہیں صاحب کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نسبی تعلق بھی حاصل تھا۔ اس لیے جب تمہارے سامنے دین کی دھجیاں اڑائی جاتی تھیں تو تمہیں غیرت کیوں نہیں آتی تھی؟ تمہیں تو دوسروں سے بڑھ کر اللہ کے دین کے بارے میں غیرت مند ہونا چاہیے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کے مشہور ادیب احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کے جناب سید عطاءاللہ شاہ بخاری صاحب مرحوم کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات تھے اور دونوں سید بھی تھے۔ شاہ صاحب ایک دفعہ لاہور میں انہی کے مہمان تھے۔ جب واپس جانے لگے تو نجانے کیا خیال آیا 'شاہ صاحب نے پطرس مرحوم سے کہا کہ پطرس یہ قرآن تمہارے گھر میں نازل ہوا اور عجیب بات ہے کہ تم نماز بھی نہیں پڑھتے 'تم ہی اگر اس کی لاج نہیں رکھو گے تو اور کون رکھے گا؟ پطرس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ شاہ جی آج رک جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ان کی زندگی میں واضح تبدیلی آگئی۔ حاصل کلام یہ کہ قوموں میں مصنوعی سہارے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نہایت ہی مہلک ثابت ہوتے ہیں اور انہی سہاروں نے اہل کتاب کی مذہبی اور ملی زندگی میں نہایت تباہ کن کردار ادا کیا۔ (روح)

المختصر۔۔اللہ تعالیٰ خالق کل اور قادر مطلق ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے حکومت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کی اور بالآخر سب کو اسی کی طرف پھرنا ہے اور قیامت میں اس کی بارگاہ میں حاضری دینی ہے اس کے سوا نہ کوئی استقلالا مالک ہے اور نہ یہ اشتراکا قیامت میں جو ہر ایک کو جزا۔۔یا۔۔سزا ہوگی اسے کوئی روکنے والا نہیں۔

محبت الٰہی کا دعوی کرنے والو! سن لو کہ صرف زبانی دعوؤں کا نام محبت نہیں بلکہ سچی محبت کی چند علامتیں ہیں کتنی حیرت کی بات ہے کہ تم اللہ کی دم بھرتے ہو اور اس کی نافرمانی بھی کرتے ہو اگر تم اللہ کی محبت میں سچے ہوتے تو تم اس کی اطاعت کرتے اس لیے کہ وہ محب وہ ہوتا ہے جو اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے اور اسے راضی رکھتا ہے مگر یاد رکھو کہ اگر خدا کو راضی رکھنا ہے تو اسے خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے راضی کرنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ اسی سے پوچھو کہ اے میرے رب تو کس بات سے راضی ہوگا، (اشرفی)

دعا کیجئے: حق تعالیٰ کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہم کو یہودیت و نصرانیت سے بچا کر اسلام و ایمان سے نوازا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتی ہونا نصیب فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پکا اور سچا اور وفادار امتی بن کر جینا اور اسی پر مرنا نصیب فرمائیں۔

یا اللہ ہم کو اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سچی محبت و عظمت عطا فرما اور آپ کی محبت و عظمت کے ساتھ آپ کے اتباع کی بھی دولت نصیب فرما۔ آمین۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

مسائل

۱۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے نہیں ہیں۔

۲۔ سزا و جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۳۔ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کے لیے ہے۔

۴۔ سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے وہ جسے چاہے معاف فرمائے گا اور جسے چاہے عذاب کرے گا۔

آیت مبارکہ:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾

لغۃ القرآن: [يَاَهْلَ : اے اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][قَدْ : یقیناً][جَآءَكُمْ : وہ آیا تمہارے][رَسُوْلُنَا : ہمارا رسول][يُبَيِّنُ : وہ بیان کرتا ہے][لَكُمْ : تمہارے لیے][عَلٰي : پر][فَتْرَةٍ : موقوف][مِّنَ : سے][الرُّسُلِ : رسول (جمع)][اَنْ : یہ کہ][تَقُوْلُوْا : تم کہو][مَا : نہیں][جَآءَنَا : آیا ہمارے پاس][مِنْ: سے][بَشِيْرٍ : خوشخبری دینے والا][وَّلَا : اور نہ][نَذِيْرٍ : ڈرانے والا][فَقَدْ : یقیناً][جَآءَكُمْ : آیا تمہارے پاس][بَشِيْرٌ: خوشخبری دینے والا][وَّنَذِيْرٌ: اور ڈرانے والا][وَاللّٰهُ : اور اللہ][عَلٰي : پر][كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز][قَدِيْرٌ: قادر ہے]

ترجمہ: اے اہل کتاب ! بیشک تمہارے پاس ہمارے (یہ آخر الزمان) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیغمبروں کی آمد (کے سلسلے) کے منقطع ہونے (کے موقع) پر تشریف لائے ہیں، جو تمہارے لیے (ہمارے احکام) خوب واضح کرتے ہیں، (اس لئے) کہ تم (عذر کرتے ہوئے یہ) کہہ دوگے کہ ہمارے پاس نہ (تو) کوئی خوشخبری سنانے والا آیا ہے اور نہ ڈر سنانے والا۔ (اب تمہارا یہ عذر بھی ختم ہو چکا ہے کیونکہ) بلاشبہ تمہارے پاس (آخری) خوشخبری سنانے اور ڈر سنانے والا (بھی) آگیا ہے، اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے

تشریح: اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو اپنے عظیم ترین احسان کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ تک دنیا کسی بھی نبیؑ کی تشریف آوری سے خالی رہی، اس کے بعد سید المرسلین (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کی تشریف آوری تو ایسی نعمت ہے جیسے شدید پیاس میں خوشگوار، جاں بخش ٹھنڈا پانی یا شدید گرمی، تپش اور حَبُس میں خوشگوار بارش، تو ایسی انتہائی حاجت کے وقت تم پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت بھیجی گئی تو تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے کیونکہ اب تو تمہارے پاس یہ کہنے کا موقع بھی نہیں رہا کہ ہمارے پاس کوئی تَنْبِیہ کرنے والے تشریف نہیں لائے تھے۔ (نور)

شان نزول

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں حضرت معاذ بن جبلؓ، سعد بن عبادہؓ، عقبہ بن وہبؓ نے دو راہبوں سے کہا جن کا نام رافع بن حرملہ اور وہب بن یہودا تھا کہ تم لوگوں نے زمانہ جہالت میں ہم لوگوں کو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری کی بشارت دی تھی اور تم نے اوصاف حمیدہ بھی بیان کئے تھے اور جب آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے ہیں اور تمہاری بتائی ہوئی اوصاف بھی موجود ہیں تو تم ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ ہماری کتابوں میں کوئی خبر نہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔ ان کی اس بات کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں حضور سید یوم النشور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارت دی۔ اور علی فترۃ اس لیے فرمایا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد پانچ سو انہتر سال کی مدت زمانہ فترہے اتنی لمبی مدت نبی سے خالی رہی۔ اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تشریف لانے کا احسان رکھا اور فرمایا لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فہم رسولاً اور یہ احسان اس لیے فرمایا کہ نہایت حاجت کے وقت اللہ تعالیٰ عزوجل نے یہ عظیم نعمت عطا فرمائی اور منکرین کے الزام عدم اتیان بشیر ونذیر کا عذر بھی رفع فرمادیا۔

یہاں ایک رباعی عربی کی نہایت خوبی سے چسپاں ہو رہی ہے کہ ادھر اللہ تعالیٰ عزوجل کو ماننے اور ادھر اس کے ساتھ لم یلد ولم یولد کے خلاف عقیدہ بھی ظاہر کرے وہ کس طرح اللہ عزوجل کا محبوب ہو سکتا ہے۔

تعصی الالہ وانت تظہر حبہ ہذا العمری فی الخیال بدیع

لو کان حبك صادقاً لاطعتہ ان المحب لمن یحب مطیع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی کرتا ہے اور اس کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ تو عجیب خیال ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کا مطیع اور فرمان بردار ہوتا ہے۔

تحقیق لفظ فترۃ

روح المعانی میں ہے۔ فترۃ۔ یعنی رسولوں کی آمد کی بندش اور فترۃ فعلۃ کے وزن پر ہے جبکہ چلتا کام رک جائے فتر کا معنی ہے ٹھہر گیا اس میں اصل یہ ہے کہ جو کام پہلے ہو رہا تھا وہ رک جائے اور تمام مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولوں (علیہم السلام) کی آمد منقطع ہو گئی۔ مفردات راغب اصفہانی (رح) میں ہے۔ فتر کا معنی ہے تیزی کے بعد سکون اور سختی کے بعد نرمی اور طاقت کے بعد کمزوری۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے اہل کتاب بیشک آیا تمہارے پاس ہمارا رسول بیان کرتا ہے تمہارے لیے رسولوں کی بندش کے بعد یعنی جبکہ رسولوں کا آنا بند ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا فرشتے اللہ کی عبادت سے کبھی رکتے نہیں۔

خلاصہ یہ کہ فتور اس زمانہ تعطل کو کہتے ہیں جس میں وہ کام منقطع ہو جائے جو ہو رہا تھا اور مفسرین کے نزدیک وہ انقطاع مراد ہے جو مابین دو رسولوں کے ہو۔

مقدار زمانہ فترۃ بین عیسیٰ و سید الانبیاء (علیہما السلام)

روح المعانی میں ہے کہ اس مدت میں اختلاف ہے جو ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان ہے۔ قتادہ (رح) کہتے ہیں پانچ سو ساٹھ سال ہے۔ ابن جریج (رح) کے نزدیک پانچ سو سال ہے۔ ضحاک (رح) کہتے ہیں چار سو تیس سال اور چند سال ہیں اور بروایت ابن عساکر سلمان (رح) کے نزدیک چھ سو سال ہیں۔ (حسنات) (''بعض کہتے ہیں چھ سو بیس سال کا فاصلہ تھا۔ ان دونوں قولوں میں اس طرح تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ پہلا قول شمسی حساب سے ہو اور دوسرا قمری حساب سے ہو اور اس گنتی میں ہر تین سو سال میں تقریباً آٹھ کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اسی لیے اہل کہف کے قصے میں ہے۔ ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادو تسعا۔ وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو برس اور زیادہ کئے۔ پس شمسی حساب سے اہل کتاب کو جو مدت ان کی غار کی معلوم تھی، وہ تین سو سال کی تھی، نو بڑھا کر قمری حساب پورا ہو گیا'' (ابن کثیر))

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضور اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے مابین تین نبی اور بھی آئے جس کی طرف قرآن کریم میں اشارہ ہے۔

ارسلنا الیھم اثنین فکذبوھما فعززنا بثالث۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے مابین چار نبی (علیہم السلام) اور ہیں۔ تین تو وہ جن کی طرف آیہ کریمہ مذکورہ میں اشارہ ہے اور ایک عرب قبیلہ بنی عبس سے جن کا نام خالد بن سنان (علیہ السلام) ہے۔ جس کے متعلق حضور نے بھی فرمایا نبی صیعہ قومہ یہ نبی تھے۔ ان کی قوم نے ان کو ضائع کر دیا۔ پھر علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ تین نبی تو وہ ہیں جن کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے۔ لیکن خالد بن سنان عبسی ان کے متعلق راغب بھی متردد ہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ قبل عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں گے اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے۔

لا نبی بینی و بین عیسیٰ صلی اللہ علیہما وسلم۔

حضرت ابن عباس (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا میں دنیا و آخرت میں یحییٰ (علیہ السلام) کے ساتھ سب سے زیادہ قربات رکھتا ہوں۔ انبیاء علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں شریعتیں مختلف ہیں۔ دین سب کا ایک ہے اور ہم دونوں کے درمیان کوئی اور پیغمبر نہیں ہوا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) کے مابین مدت فترت

روح المعانی۔ وکان بین موسیٰ و عیسیٰ علیھما الصلوۃ والسلام الف وسبعمائۃ سنۃ فی المشھور۔ بروایت مشہورہ موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) کے مابین ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ فترت گزرا ہے۔ (حسنات)

دو نبیوں کے درمیانی زمانہ کو فترۃ کہا جاتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ظہور قدسی 570ء اور اعلان نبوت 610ء میں ہوا۔ گویا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا درمیانی عرصہ چھ سو سال کے قریب ہوا۔ اہل کتاب کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ نبی تشریف فرما ہو گیا جس کا تمہیں انتظار تھا۔ اب اگر اس کی اطاعت نہ کرو اور اس پر ایمان لا کر اپنی نجات کا سامان نہ کرو تو تمہاری مرضی۔ کل تمہارا یہ عذر نہ سنا جائے گا کہ اے رب! ہم کیا کرتے ہمیں تو راہ دکھانے والا کوئی آیا ہی نہیں۔ (ضیاء)

امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں :
یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت سماک بن حرب (رض) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خالد بن سنان کے متعلق پوچھا آپ نے فرمایا وہ نبی ہیں ' ان کی قوم نے ان کو ضائع کردیا۔ نیز حضرت سماک بن حرب نے کہا کہ خالد بن سنان کا بیٹا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرے بھتیجے مرحبا۔ امام حاکم نے یہ حدیث امام بخاری کی شرط پر صحیح ہے ' لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔ (المستدرک ' ج ۲ ' ص ۶۰۰۔ ۵۹۹)
حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! کیا حضرت آدم (علیہ السلام) نبی تھے ؟ فرمایا ہاں ! اس نے پوچھا ان کے اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے درمیان کتنا عرصہ ہے ؟ فرمایا : بیس صدیاں۔ اس نے پوچھا حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے درمیان کتنا عرصہ ہے ؟ آپ نے فرمایا دس صدیاں ! اس نے پوچھا یا رسول اللہ ! رسول کتنے ہیں ؟ آپ نے فرمایا تین سو پندرہ۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۴ ص ' ۲۲۵ مطبوعہ دارالفکر ' دمشق ' ۱۴۰۴ھ)
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان دس صدیاں ہیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان سترہ صدیاں ہیں۔ (تفسیر منیر ' ج ٦ ' ص ۱۴۰ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۴۱۱ھ)
اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک چھ ہزار تین سو سال کا زمانہ ہے۔ (تبیان)
فوائد
1 : اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ساری اہل کتاب امتوں کے نبی ہیں۔ کیونکہ حضور سارے انسانوں بلکہ ساری مخلوق الٰہی کے نبی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور کی تشریف آوری سے بہت عرصہ پہلے انبیاء کرام کا آنا بند ہوچکا تھا۔ چنانچہ حضور کی ولادت 569 ء میں ہوئی، اس درمیان میں دنیا میں کوئی نبی تشریف نہ لائے۔ خیال رہے کہ اسی درمیانی زمانہ کا نام زمانہ فترت ہے، اس زمانہ کے لوگوں کو صرف عیقدہ توحید کافی تھا۔ جیسے حضور کے والدین یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کے اس عرصہ میں نہ آنے میں بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کے اس عرصہ میں نہ آنے میں حضور کی انتہائی عظمت کا اظہار ہے بہت گہرے اندھیرے کو سورج ہی دور کرتا ہے۔
2 : خیال رہے کہ یہاں بشارت کو ڈرانے کے ساتھ جمع فرمایا نہ کہ تصدیق کے ساتھ، یعنی حضور کو بشیر و نذیر تو فرمایا۔ مصدق اور مبشر نہ فرمایا۔ کیونکہ حضور عذاب سے ڈرانے والے اور ثواب کی بشارت دینے والے ہیں۔ آپ کسی پیغمبر کے بشیر نہیں۔ کیونکہ آپ آخری نبی ہیں۔ لہٰذا آپ نے انبیاء کی تصدیق ہی کی ہے۔ بشارت کسی کی نہیں دی۔

آیت مبارکہ:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب][قَالَ : اس نے کہا][مُوْسٰى: موسیٰ][لِقَوْمِهٖ : اپنی قوم کے لیے][يٰقَوْمِ : اے میری قوم][اذْكُرُوْا : یاد کرو تم][نِعْمَةَ : نعمت][اللّٰهِ : اللہ][عَلَيْكُمْ : تم پر][اِذْ : جب][جَعَلَ : اس نے بنائے][فِيْكُمْ : تم میں][اَنْۢبِيَآءَ : انبیاء][وَجَعَلَكُمْ : اور تمہیں بنایا][مُّلُوْكًا : بادشاہ][وَّاٰتٰىكُمْ : اور تمہیں دیا][مَّا لَمْ : جو نہیں][يُؤْتِ : اس نے دیا][اَحَدًا : کوئی ایک][مِّنَ : سے][الْعٰلَمِيْنَ : اقوام عالم]

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کریں) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم اپنے اوپر (کیا گیا) اللہ کا وہ انعام یاد کرو جب اس نے تم میں انبیاء پیدا فرمائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ (کچھ) عطا فرمایا جو (تمہارے زمانے میں) تمام جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا تھا

تشریح:

حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور اس ضمن میں اللہ تعالی کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرمایا اور بطور خاص تین نعمتیں یہاں بیان فرمائیں:

(1)۔۔ بنی اسرائیل میں انبیاء (علیہ السلام) تشریف لائے۔

(2)۔۔ بنی اسرائیل کو حکومت و سلطنت سے نوازا گیا۔ بنی اسرائیل آزاد ہوئے اور فرعونیوں کے ہاتھوں میں قید ہونے کے بعد ان کی غلامی سے نجات پائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مُلوک یعنی بادشاہ سے مراد ہے خادموں اور سواریوں کا مالک ہونا۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) سے مروی

ہے کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں جو کوئی خادم اور عورت اور سواری رکھتا وہ ملِکْ کہلایا جاتا ہے۔
(در منثور، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۲۰، ۴۶/۳)

(3)۔۔ بنی اسرائیل کو وہ نعمتیں ملیں جو کسی دوسری قوم کو نہ ملیں جیسے من وسلویٰ اترنا، دریا کا پھٹ جانا، پانی سے چشموں کا جاری ہو جانا وغیرہا۔ (صراط)

تسلسل انبیاء نسل انسانی پہ اللہ کی رحمت

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ کی جو نعمتیں یاد دلا کر اس کی اطاعت کی طرف مائل کیا تھا، اس کا بیان ہو رہا ہے کہ فرمایا "لوگو اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے ایک کے بعد ایک نبی تم میں تمہیں میں سے بھیجا۔" حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بعد سے انہی کی نسل میں نبوت رہی۔ یہ سب انبیاء تمہیں دعوت توحید واتباع دیتے رہے۔ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ روح اللہ پر ختم ہوا، پھر خاتم الانبیاء والرسل حضرت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبوت کاملہ عطا ہوئی، آپ اسماعیل کے واسطہ سے حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے تھے، جو اپنے سے پہلے کے تمام رسولوں اور نبیوں سے افضل تھے۔ اللہ آپ پر درود وسلام نازل فرمائے اور تمہیں اس نے بادشاہ بنادیا یعنی خادم دیئے، بیویاں دیں، گھر بار دیا اور اس وقت جتنے لوگ تھے، ان سب سے زیادہ نعمتیں تمہیں عطا فرمائیں۔ یہ لوگ اتنا پانے کے بعد بادشاہ کہلانے لگتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا میں فقراء مہاجرین میں سے نہیں ہوں؟ آپ نے فرمایا تیری بیوی ہے؟ اس نے کہا ہاں گھر بھی ہے؟ کہا ہاں، کہا پھر تو تو غنی ہے، اس نے کہا یوں تو میرا خادم بھی ہے، آپ نے فرمایا پھر تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں "سواری اور خادم ملک ہے"۔ بنو اسرائیل ایسے لوگوں کو ملوک کہا کرتے تھے۔ بقول قتادہ خادموں کا اول رواج ان بنی اسرائیلیوں نے ہی دیا ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ان لوگوں میں جس کے پاس خادم، سواری اور بیوی ہو وہ بادشاہ کہا جاتا تھا۔ ایک اور مرفوع حدیث میں ہے "جس کا گھر ہو اور خادم ہو وہ بادشاہ ہے"۔ یہ حدیث مرسل اور غریب ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے "جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اس کا جسم صحیح سالم ہو، اس کا نفس امن وامان میں ہو، دن بھر کفایت کرے، اس کیلئے اتنا مال بھی ہو تو اس کیلئے گویا کل دنیا سمٹ کر آ گئی"۔ اس وقت جو یونانی قبطی وغیرہ تھے ان سے یہ اشرف وافضل مانے گئے تھے اور آیت میں ہے ہم نے بنو اسرائیل کو کتاب، حکم، نبوت، پاکیزہ روزیاں اور سب پر فضیلت دی تھی۔ حضرت موسیٰ سے جب انھوں نے مشرکوں کی دیکھا دیکھی اللہ بنانے کو کہا اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے اللہ کے فضل بیان کرتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ اس نے تمہیں تمام جہان پر فضیلت دے رکھی ہے۔ مطلب سب جگہ یہی ہے کہ اس وقت کے تمام لوگوں پر کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ یہ امت ان سے افضل ہے، کیا شرعی حیثیت سے، کیا احامی حیثیت سے، کیا نبوت کی حیثیت سے، کیا بادشاہت، عزت، مملکت، دولت، حشمت مال، اولاد وغیرہ کی حیثیت سے، خود قرآن فرماتا ہے آیت (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ) 3۔آل عمران: 110) اور فرمایا آیت (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُـوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا) 2۔البقرۃ: 143) یہ بھی کہا گیا ہے کہ "بنو اسرائیل کے ساتھ اس فضیلت میں امت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی شامل کرکے خطاب کیا گیا ہے" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "بعض امور میں انھیں فی الواقع علی الاطلاق فضیلت دی گئی تھی جیسے من وسلویٰ کا اترنا، بادلوں سے سایہ مہیا کرنا وغیرہ جو خلاف عادت چیزیں

تھیں "۔ یہ قول اکثر مفسرین کا ہے جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مراد اس سے ان کے اپنے زمانے والوں پر انھیں فضیلت دیا جانا ہے واللہ اعلم۔ پھر بیان ہوتا ہے کہ "بیت المقدس دراصل ان کے دادا حضرت یعقوب کے زمانہ میں انہی کے قبضے میں تھا اور جب وہ مع اپنے اہل و عیال کے حضرت یوسف کے پاس مصر چلے گئے تو یہاں عمالقہ قوم اس پر قبضہ جما بیٹھی، وہ بڑے مضبوط ہاتھ پیروں کی تھی۔ اب حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ تم ان سے جہاد کرو اللہ تمہیں ان پر غالب کرے گا اور یہاں کا قبضہ پھر تمہیں مل جائے گا لیکن یہ نامردی دکھاتے ہیں اور بزدلی سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان کی سزا میں انھیں چالیس سال تک وادی تیہ میں حیران و سرگرداں خانہ بدوشی میں رہنا پڑتا ہے، مقدسہ سے مراد پاک ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ وادی طور اور اس کے پاس کی زمین کا ذکر ہے۔ (ابن کثیر)

اپنی قوم کا مزاج دیکھتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ارض مقدّس میں داخل ہونے کا حکم دینے سے پہلے انھیں اللہ تعالیٰ کے انعامات اور ماضی کی عزت رفتہ اور اقتدار یاد دلا کر حکم دیا کہ میری قوم ارض مقدس کی طرف پیش قدمی کرو۔ اس کے ساتھ ہی خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے فتح کو یقینی بنا دیا ہے یہاں دوسرے انعامات کے ساتھ بالخصوص دو انعام کا نام لے کر یہ احساس دلایا کہ یہ مقدس زمین انبیاء کی سرزمین ہے اور یہاں تمہارے آباؤاجداد نے سینکڑوں سال تک حکومت کی ہے اور تمہیں وہ کچھ عنایت فرمایا تھا جو دنیا میں تم سے پہلے کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس یاد دہانی کرانے کا مقصد یہ تھا کہ اس سرزمین میں داخل ہونا تمہارا مذہبی اور سیاسی حق بنتا ہے لہٰذا پیچھے نہ ہٹنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ دشمن کے مقابلہ میں پیچھے ہٹنا کبیرہ گناہ ہونے کے ساتھ دنیا میں ذلت اٹھانا پڑتی ہے بسا اوقات ایسی قوم اپنا سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔ اس سے مورخین کی اس غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے کہ جن کا خیال ہے کہ فلسطین میں بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شروع ہوتی ہے جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) اپنے خطاب میں اپنے سے پہلے بنی اسرائیل کے شاندار ماضی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ جس کے بارے میں قرآن مجید نے واضح فرمایا ہے کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو عظیم مملکت سے نوازا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جناب موسیٰ (علیہ السلام) سے سینکڑوں سال پہلے گزر چکے تھے۔ یہاں اہل علم نے نکتہ وری کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے "فیکم" کے الفاظ استعمال کیے جس کا معنٰی ہے تم میں سے کچھ شخصیات کو نبی بنایا جس سے ثابت ہوا کہ نبوت لوگوں کا انتخاب نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جس کو چاہے نبوت کے لیے منتخب فرمائے "وجعلکم" کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں حکمران بنایا کسی قوم اور ملک کا حکمران تو ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن خبر جمع لائی گئی ہے جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ صحیح حکمران وہ ہوتا ہے جو لوگوں کو ساتھ لے کر چلے یعنی اپنے اقتدار میں عوام کو شرکت کا حق دے۔ (فہم)

میلاد منانے کا ثبوت

اس آیت میں بیان کی گئی پہلی نعمت سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کی تشریف آوری نعمت ہے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو اس کے ذکر کرنے کا حکم دیا کہ وہ بَرَکات و ثمرات کا سبب ہے۔ اس سے تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا میلاد مبارک منانے اور اس کا ذکر کرنے کی واضح طور پر دلیل ملتی ہے کہ جب انبیاء بنی اسرائیل عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ عَزَّوَجَلَّ سے تشریف آوری نعمت ہے اور اسے یاد کرنے کا حکم ہے تو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری تو اس سے بڑھ کر نعمت ہے کہ اسے تو اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: ۱۶۴)

بیشک اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا جب ان میں عظیم رسول مبعوث فرمایا۔
لہٰذا اسے یاد کرنے کا حکم بدرجہ اولیٰ ہوگا۔
اِقتدار ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ :
اس آیت میں بیان کی گئی دوسری نعمت سے معلوم ہوا کہ حکومت و سلطنت اور اقتدار بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کے شکر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلائی جائے، غریبوں کی مدد کی جائے، لوگوں کے حقوق ادا کئے جائیں، ظلم کا خاتمہ کیا جائے اور ملک کے باشندوں کو امن و سکون کی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

حکمرانوں کے لیے نصیحت آموز 4 اَحادیث

یہاں حکمرانی کرنے والوں کے لیے نصیحت آموز 4 احادیث ملاحظہ ہوں۔
(1)۔۔ حضرت معقل بن یسار (رض) سے مروی ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کسی رعایا کا حکمران بنایا ہو اور وہ خیر خواہی کے ساتھ ان کی نگہبانی کا فریضہ ادا نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا۔ (بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح، ۴/۴۵۶، الحدیث : ۷۱۵۰)
(2)۔۔ حضرت معقل بن یسار (رض) سے ہی مروی ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "مسلمانوں کو جس والی کی رعایا بنایا جائے، پھر وہ والی ایسی حالت میں مرے کہ اس نے مسلمانوں کے حقوق غصب کئے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام فرما دیتا ہے۔
(بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح، ۴/۴۵۶، الحدیث : ۷۱۵۱)
(3)۔۔ حضرت عائشہ صدیقہ (رض) فرماتی ہیں، میں نے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ دعا فرماتے ہوئے سنا "اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، میری امت کا جو شخص بھی کسی پر والی اور حاکم ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کر اور اگر وہ ان پر نرمی کرے تو تو بھی اس پر نرمی کر۔
(مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر۔۔۔ الخ، ص ۱۰۱۶، الحدیث : ۱۹(۱۸۲۸))
(4)۔۔ حضرت ابو مریم ازدی (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جسے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے کسی کام کا والی بنائے اور وہ ان کی حاجت مندی، بے کسی اور غریبی میں ان سے کنارہ کشی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت مندی، بے کسی اور غریبی میں اسے چھوڑ دے گا۔
(ابو داؤد، کتاب الخراج والفیء والامارۃ، باب فیما یلزم الامام من امر الرعیّۃ۔۔۔ الخ، ۳/۱۸۸، الحدیث : ۲۹۴۸) (صراط)
(عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ (رض) عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ

أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ فَقَالَ لَا مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ وَإِذَا رَأَيْتُمْ مِنْ وُلَاتِكُمْ شَيْئًا تَكْرَهُونَهُ فَاكْرَهُوا عَمَلَهُ وَلَا تَنْزِعُوا يَدًا مِنْ طَاعَةٍ) [رواہ مسلم : کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ وشرارھم]

"حضرت عوف بن مالک اشجعی (رض) فرماتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم پسند کرو اور وہ تم سے مروت رکھیں تم ان کے لیے رحمت مانگو اور وہ تمہارے لیے رحمت کی دعائیں مانگیں اور تمہارے برے حکمران وہ ہوں گے جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے نفرت کریں تم ان پر لعن طعن کرو اور وہ تمہیں ملعون قرار دیں۔ صحابی رسول فرماتے ہیں ہم نے عرض کیا کہ کیا ہم ان سے لڑائی نہ کریں ؟ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : نہیں جب تک وہ نماز قائم کریں جب تم اپنے حکمرانوں میں کوئی ایسی چیز دیکھو جس کو تم ناپسند کرتے ہو تو ان کے فقط اس عمل کو ناپسند کرو اور ان کی فرمان برداری سے ہاتھ نہ کھینچو۔ " (فہم)

اقتدار کے بوجھ سے اَشکبار

حضرت عمر بن عبدالعزیز (رض) کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں "جب آپ (رض) مرتبہ خلافت پر فائز ہوئے تو گھر آ کر مصلے پر بیٹھ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ یہ دیکھ کر میں نے عرض کی : اے امیر المومنین ! (رض)، آپ کیوں رو رہے ہیں ؟ آپ (رض) نے فرمایا "میری گردن پر تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے اور جب میں نے بھوکے فقیروں، مریضوں، مظلوم قیدیوں، مسافروں، بوڑھوں، بچوں اور عیالداروں، الغرض پوری سلطنت کے مصیبت زدوں کی خبر گیری کے بارے میں غور کیا اور مجھے معلوم ہے کہ میرا ربِّ عَزَّ وَجَلَّ قیامت کے دن ان کے بارے مجھ سے باز پرس فرمائے گا تو مجھے اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے ان کے بارے میں جواب نہ بن پڑے ! (بس اس بھاری ذمہ داری اور اس کے بارے میں باز پرس کی فکر کی وجہ سے) میں رو رہا ہوں۔ (تاریخ الخلفائ، عمر بن عبدالعزیز (رض)، ص ۱۸۹) (صراط)

فوائد

1 : اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کی اولاد میں ہونا اور پیغمبر کی قوم سے ہونا شرافت کا سبب ہے، خدا کی نعمت ہے جبکہ ایمان کے ساتھ ہو، لہٰذا سید حضرات دیگر قوموں سے اشرف ہیں، کیونکہ وہ حضور کی اولاد ہیں اس سے پہلے بنی اسرائیل اسی لیے تمام جہان سے افضل تھے۔ کہ وہ اولاد انبیاء تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ محفل میلا شریف اچھی چیز ہے کیونکہ اس میں حضور کی تشریف آوری کا ذکر ہوتا ہے۔

2 : معلوم ہوا کہ سلطنت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل میں بعض وہ پیغمبر ہیں جو نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی، جیسے حضرت یوسف و حضرت داؤد علیہم السلام۔

3 : اس طرح کہ تم میں اولیاء اللہ پیدا فرمائے۔ تم پر من و سلویٰ اتارا، تمہارے دشمن فرعون کو بحر قلزم میں ڈوبایا۔ تمہارے لیے دریا کو چیرا اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اچھا ہے گیارہویں شریف، بارہویں شریف، عرس بزرگان کا یہی منشا ہے۔ (نور)

مسائل

۱۔ انبیاء کو مبعوث فرمانا اور بادشاہت کا عطا فرمانا اللہ کا انعام ہے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو وہ کچھ عطا فرمایا جو پہلے اور ان کی ہم عصر اقوام کو نہیں دیا گیا تھا۔
۳۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکامات نہ ماننے والے نقصان اٹھائیں گے۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾

لغۃ القرآن: [يٰقَوْمِ : اے میری قوم][ادْخُلُوا : تم داخل ہوجاؤ][الْاَرْضَ : زمین][الْمُقَدَّسَةَ : مقدس][الَّتِيْ : جو][كَتَبَ ؛ اس نے لکھ دی][اللّٰهُ : اللہ][لَكُمْ : تمہارے لیے][وَلَا : اور نہ][تَرْتَدُّوْا : تم پھرنا][عَلٰٓي : پر][اَدْبَارِكُمْ ؛ اپنی پیٹھوں][فَتَنْقَلِبُوْا : تو تم پلٹوگے][خٰسِرِيْنَ : نقصان اٹھانے والے]

ترجمہ: اے میری قوم! (ملک شام یا بیت المقدس کی) اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پشت پر (پیچھے) نہ پلٹنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے بن کر پلٹو گے

تشریح:

ارض مقدس کا وعدہ

یعنی خدا نے پیشتر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دونگا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر پورا ہو۔

ارض مقدس کہنے کی وجہ

اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ کعب احبار نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی کتاب (غالباً توراۃ) میں دیکھا ہے کہ ملک شام پوری زمین میں اللہ کا خاص خزانہ ہے۔ اور اس میں اللہ کے مخصوص مقبول بندے ہیں۔ اس زمین کو مقدس اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء (علیہم السلام) کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم (علیہ السلام) لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔

حضرت کعب کا بیان ہے کہ میں نے اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب (یعنی توریت) میں پڑھا تھا کہ شام اللہ کی زمین کا خزانہ ہے اور شام کے رہنے والے اللہ کے بندوں میں خزانہ ہیں۔ مقدسہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ارض مذکور انبیاء کی قرارگاہ اور اہل ایمان کا مسکن ہے۔ (تفسیر مظہری)

بزدل بن کر غلامی نہ خریدو

یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں بزدلی اور پست ہمتی دیکھ کر غلامی کی زندگی کی طرف مت بھاگو۔

حضرت موسیٰ کی قیادت میں ارض مقدس کی آزادی

بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے وعدہ کر لیا تھا کہ ارض مقدسہ کا تم کو اور تمہاری قوم کو وارث بنایا جائے گا۔ ارض مقدسہ سے مراد سرزمین شام تھی پہلے وہاں مغرور ظالم کنعانی آباد تھے۔ فرعون کے کام سے فراغت کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تو اللہ نے ان کو اریحا علاقہ شام کو جانے کا حکم دیا 'اریحا ہی ارض مقدسہ تھی اس علاقہ میں ایک ہزار آبادیاں تھیں اور ہر بستی میں ہزار باغ تھے۔ میں کہتا ہوں شاید ہزار سے مراد کثیر تعداد ہے کوئی معین عدد مراد نہیں ہے اور اللہ نے فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) میں نے اس زمین کو تمہارا مسکن اور قرارگاہ مقرر کر دیا ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں کے باشندوں سے جہاد کرو۔ میں تم کو فتح عنایت کروں گا اور اپنی قوم میں سے بارہ سردار نمائندہ چن لو 'ہر سبط کا ایک نمائندہ ہو جو اپنی قوم کی طرف سے تعمیل حکم الٰہی کا ذمہ دار ہو۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے (بارہ) سردار چن لیے اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر چل دیئے 'جب اریحا کے قریب پہنچے تو سرداروں کو تلاش احوال اور فراہمی معلومات کے لیے اریحا کو روانہ کیا۔ راستہ میں ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو اسی جبار قوم میں سے تھا۔ اس کے قد کی لمبائی ۳۳۳۳ ہاتھ تھی اور ابر میں سوراخ کر کے پانی پیا کرتا تھا اور قعر سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر سورج کی ٹکیہ کے سامنے لے جا کر بھون کر کھایا کرتا تھا۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ پانی جب اتنا چڑھ جاتا کہ تمام پہاڑیاں اس میں ڈوب جاتی تھیں تو عوج بن عنق کے زانو سے اوپر نہیں آتا تھا یہ شخص ہزار برس جیا آخر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو ہلاک کیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے لشکر کے برابر عوج پہاڑ کا ایک پتھر اٹھا کر لایا تا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے کل لشکر پر ڈھانک دے اور (اس طرح سب کو پتھر کے نیچے دبا دے لیکن اللہ نے ایک ہدہد کو مسلط کر دیا۔ ہدہد نے پتھر کی چٹان میں اپنی چونچ سے سوراخ کر دیا اور پتھر عوج کے سر میں گھس کر گردن میں پھنس

گیا جس کی وجہ سے عوج زمین پر گر گیا اتنے میں موسیٰ سامنے سے آ گئے اور عوج کو زمین پر گرا ہوا پایا تو قتل کر دیا عنق عوج کی ماں کا نام تھا وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی بیٹی تھی اور ایک جریب زمین میں بیٹھتی تھی۔

غرض یہ کہ سرداروں کی جب عوج سے ملاقات ہوئی اس وقت اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھار کھا ہوا تھا۔ سرداروں کو پکڑ کر اس نے نیفہ میں اٹکا لیا اور اپنی بیوی کے پاس لے جا کر زمین پر بکھیر کر کہا دیکھ تو یہ لوگ ہم سے لڑنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو اپنے پاؤں سے دبا کر پیسے ڈالتا ہوں۔ بیوی نے کہا نہیں ان کو چھوڑ دو تاکہ جو کچھ انھوں نے یہاں دیکھا ہے اس کی اطلاع جا کر اپنی قوم کو دیں ' عوج نے بیوی کا قول مان لیا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ عوج سب کو آستین میں بھر کر بادشاہ کے پاس لے گیا اور اس کے سامنے لے جا کر بکھیر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا ' واپس لوٹ جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا اپنی قوم سے جا کر کہہ دو (ان کے ملک کے پھلوں کی یہ حالت تھی کہ) انگوروں کا ایک خوشہ کسی تختہ پر رکھ کر پانچ آدمی اٹھاتے تھے اور ایک انار کے دانے اگر نکال لیے جائیں تو (چھلکے میں اتنا بڑا خلا ہو جاتا تھا کہ) پانچ آدمی اس میں سما جاتے تھے۔

سرداران بنی اسرائیل جب لوٹ کر حضرت موسیٰ کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا تو آپ نے حکم دیا اس بات کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرنا اور کسی سپاہی کو اطلاع نہ دینا ورنہ سب پست ہمت ہو جائیں گے لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم کے خلاف سوائے دو شخصوں کے سب نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے بات کہہ دی۔ (گلدستہ بحوالہ تفسیر مظہری)

جناب ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں عوج بن عنق کا جو تذکرہ بغوی نے لکھا ہے اوس میں بہت ہی بعید از عقل مبالغہ کیا ہے۔ علماء حدیث نے اس خرافات کا انکار کیا ہے۔ صرف اتنی بات ضرور تسلیم کی گئی کہ اس دراز قامت قوم میں عوج سب سے بڑا اور قوی الجثہ شخص تھا۔ ساری قوم قدآور تھی اور طاقتور بھی۔

سرداران بنی اسرائیل جب لوٹ کر حضرت موسیٰ کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا تو آپ نے حکم دیا اس بات کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرنا اور کسی سپاہی کو اطلاع نہ دینا ورنہ سب پست ہمت ہو جائیں گے لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم کے خلاف سوائے دو شخصوں کے سب نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے بات کہہ دی۔ صرف یوشع بن نون بن افراہیم بن یوسف اور کالب بن یوقنا نے کسی سے کچھ نہیں کہا یوشع تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے خادم خاص تھے اور آیت : قال موسیٰ لفتاہ میں فتی سے مراد یوشع ہی ہیں اور کالب موسیٰ (علیہ السلام) کے بہنوئی مریم (علیہ السلام) بنت عمران (ہمشیرہ موسیٰ (علیہ السلام) کے شوہر تھے یہ یہوداکے سبط میں سے تھے۔ جب بنی اسرائیل کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی تو سب نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے کاش ہم مصر میں ہی مر جاتے 'کاش ہم کو موت آ جاتی اور یہاں نہ آتے کہ ہمارے بال بچے اور عورتیں اور مال متاع سب ان کے لیے مال غنیمت بنتا۔ بعض لوگ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے آؤ کسی اور کو اپنا سردار بنالیں اور (موسیٰ (علیہ السلام) کو یہیں چھوڑ کر) ہم مصر کو لوٹ چلیں۔ (مظہری)

کوہِ سینا پر بنی اسرائیل کی پرورش

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کو لے کر بحر قلزم سے نکلے اور جزیرہ نما سینا میں داخل ہوئے 'آپ کی منزل کوہ سینا تھی ' جسے ہم "کوہ طور "کہتے ہیں۔ آپ اس کے دامن میں جا کر ٹھہرنا چاہتے تھے۔ یہ صحرا ایسا نہیں تھا کہ سرے سے اس میں انسانوں کا نشان نہ ہو بلکہ راستے میں بہت سی بستیاں بھی تھیں جن میں بعض قبائل آباد تھے اور ان بستیوں کے نام بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ

آپ مارہ ٬ایلیم اور عیدیم کی بستیوں سے ہوتے ہوئے کوہ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے بھی زائد مدت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے۔ یہیں پر توراۃ کے بیشتر احکام نازل ہوئے اور یہیں وہ بڑے بڑے معجزات پیش آئے جس کا قرآن کریم نے بھی ذکر کیا ہے اور تاریخ بھی اس کا ذکر کرتی ہے۔ مثلاً ابر کا سایہ کرنا ٬چٹان سے بارہ چشموں کا پھوٹنا ٬من و سلویٰ کا نازل ہونا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ایسے ایسے احسانات کیے ہیں ٬جس کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ انسانوں کا یہ ہجوم کہ اسرائیلی روایات کے مطابق اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ اچانک صحرائے سینا میں پہنچا ہے ٬جہاں زندگی گزارنے کے کوئی امکانات نہیں۔ اگر اس طرح قدرت ان کی پاسبانی نہ کرتی اور ان کو زندگی گزارنے کے امکانات مہیا نہ کرتی تو یہ بھوک اور پیاس کی شدت اور موسمی حملوں سے ہلاک ہو جاتے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں کوئی ایسا بڑا حادثہ ہو جاتا ہے ٬جس کے نتیجے میں وہاں سے چند لاکھ مہاجرین نکلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو جس پڑوسی ملک میں مہاجرین کا یہ قافلہ داخل ہوتا ہے ٬وہ ملک سراپا احتجاج بن جاتا ہے اور نتیجتاً اس کی استعانت اور استمداد کا دائرہ پوری دنیا تک پھیل جاتا ہے ٬اقوام متحدہ حرکت میں آتی ہے ٬تب بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہونے پاتا حالانکہ آج کی دنیا کے پاس وسائل رزق اور وسائل مواصلات کی وہ فراوانی ہے جس کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن قدرت کی کارفرمائی دیکھئے کہ اس نے اتنی بڑی تعداد میں ایک امت کو زندہ رکھا اور اپنی طرف سے اس پر ایسے حیرت انگیز انتظامات کیے جس کا تصور بھی آج مشکل ہے۔

"من "یعنی ایک طرح کی گوند نما چیز زمین پر گرتی اور یہ اس کو اٹھا کر اس کی روٹی بنا لیتے جو حلوے سے زیادہ لذیذ ہوتی تھی۔ "سلوٰی "بٹیر کی طرح کا ایک پرندہ تھا جو ان کے خیموں سے ٹکرا ٹکرا کے گرتا اور یہ اس کے گوشت سے محظوظ ہوتے۔ پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے عصائے موسیٰ کی ضرب سے اللہ تعالیٰ نے ایک چٹان سے بارہ چشموں کی صورت میں ایسے رواں کر دیا کہ ہر قبیلے کے لیے الگ الگ گھاٹ مقرر کر دیئے گئے۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار

اسی کوہ سینا میں جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا کہ تم ارض مقدسہ یعنی فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو ٬اللہ نے اسے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ یعنی اسے تمہاری میراث بنا دیا ہے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیر اور حصیرات کے راستے جب دشت فاران میں تشریف لائے تو وہاں آپ نے اپنی قوم کو یہ حکم سنایا اور وہیں آپ نے ان میں سے بارہ نقیب مقرر فرمائے اور انھیں فلسطین کے حالات معلوم کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ بارہ افراد پر مشتمل وفد کئی دن گزارنے کے بعد (بعض روایات کے مطابق چالیس دن تک) فلسطین کے مختلف علاقوں کا جائزہ لینے کے بعد واپس آیا اور قادس جو دشت فاران کا آخری علاقہ ہے ٬وہاں آکر انھوں نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ نہایت حوصلہ شکن تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اس علاقے میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں ٬بڑا خوشحال علاقہ ہے ٬نعمتوں کی فراوانی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے وہاں بنی عناق کی نسل کے لوگوں کو دیکھا ہے (جن کو توراۃ اور قرآن کریم نے "جبار "کہا ہے) "جبار "عربی زبان میں کھجور کے ان درختوں کو کہتے ہیں جو بہت قدآور ہوں اور بڑا سایہ دیں۔ انسانوں میں بھی "جبار "بڑے مضبوط اور قدآور لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایسے قد و قامت کے لوگ ہیں کہ ہم ان کی نظروں میں ایسے لگتے تھے جیسے ٹڈے۔ کہنے لگے کہ اگر وہ لوگ وہاں نہ ہوں تو وہاں کی خوشحالی اور فارغ

البالی کے باعث ہم ہر وقت وہاں جانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی میں ہم وہاں جائیں ' یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کی موجودگی میں جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہاں جا کر ہم ان کی تلواروں کا قیمہ بنیں۔ چنانچہ یہ ساری قوم رات بھر روتی رہی اور موسیٰ (علیہ السلام) سے شکایت کرتی رہی کہ تم ہمیں یہاں اس لیے لائے تھے کہ ہمارا قیمہ بنواؤ اور اس کے بعد ہماری بیویاں اور بیٹیاں ان کی لونڈیاں اور بچے غلام بن جائیں اور پھر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ نقیبوں (سرداروں) میں سے جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے۔ دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انھوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا۔ صرف یہ ہونا چاہیے کہ تم خداوند خدا سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو اور ہمارے ساتھ خداوند ہے 'سو ان کا خوف نہ کرو۔ مگر قوم نے جواب یہ دیا کہ انھیں سنگسار کردو۔ (روح)

حضرت یوشع بن نون اور کالب نے بہت سمجھایا کہ نامرد نہ بنو، ذرا ہمت کرکے دشمن پر حملہ تو کرو پھر دیکھو نصرت الٰہی کس طرح تمہارے دشمنوں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ ان کی اس بزدلی اور پیغمبر کی نافرمانی کی وجہ سے اس ملک کا داخلہ ان پر بند کردیا گیا۔ چالیس برس تک مختلف بیابانوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرے۔ جب اس مدت میں غلامی کی گود میں پلے ہوئے اسرائیلی لقمہ اجل بن گئے اور آزادی کی فضا میں پیدا ہونے والے بچے پروان چڑے تو انھوں نے شام پر حملہ کرکے اسے فتح کیا۔ اس سے ہمیں بھی یہ حقیقت بتادی گئی کہ آزادی کی نعمت اسی قوم کو عطا فرمائی جاتی ہے جو اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو۔ (ضیاء)

اس کے ساتھ موسیٰ (علیہ السلام) نے بشارت دی تھی کہ یہ زمین اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ ارض مقدسہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ زمین ہے جو اکثر انبیاء کرام کا مسکن رہی ہے (روح المعانی) ارض مقدس وہ پاک وصاف سرزمین جہاں وبائی بیماریاں قحط اور آفات نہیں آتیں۔ اس سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلتا ہے کہ

جس زمین پر انبیاء (علیہم السلام) کی سکونت ہو وہ زمین شرف حاصل کرلیتی ہے اور اس زمین کی زیارت دوسروں کے لیے موجب برکت و سعادت ہے اور ذات اقدس سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس زمین میں جلوہ آرا ہوئے اسے تو اللہ تعالیٰ عزوجل نے مقسم بہ بنا کر لا اقسم بھذاالبدر وانت حل بھذاالبلد فرمایا۔

کلبی (رح) سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کوہ لبنان پر چڑھے تو آپ (علیہ السلام) کو حکم ہوا کہ یہاں سے آپ نظر ڈالیں تو جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی وہ تمام زمین مقدس ہوگی اور وہی آپ کی ذریت کی میراث بن جائے گی یہ زمین طور اور اس کے گردوپیش کی تھی۔ ایک قول میں ملک شام بھی ہے۔ اور ایک قول میں اردن ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی (رح) روح المعانی میں اس کے لگے یوں فرماتے ہیں۔ بیت المقدس ہے یا دمشق ہے یا فلسطین ہے یا ملک شام کا اونچا ٹیلہ اردن ہے یا زمین طور اور اس کے گرد کا حصہ ہے یا مابین فرات و عریش مصر ہے۔ (حسنات)

آیت مبارکہ:

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ فِیۡہَا قَوۡمًا جَبَّارِیۡنَ ٭ۖ وَ اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَا حَتّٰی یَخۡرُجُوۡا مِنۡہَا ۚ فَاِنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَا فَاِنَّا دٰخِلُوۡنَ ﴿۲۲﴾

لغۃ القرآن: [قَالُوْا : انہوں نے کہا][یٰمُوْسٰی: اے موسیٰ][اِنَّ : یقیناً][فِیْهَا : اس میں][قَوْمًا : ایک قوم][جَبَّارِیْنَ : زور آور][وَاِنَّا : اور یقیناہم][لَنْ : ہرگز نہیں][نَّدْخُلَهَا : ہم داخل ہوں گے][حَتّٰي : یہاں تک][یَخْرُجُوْا : وہ نکل جائیں][مِنْهَا : اس سے][فَاِنْ : تو اگر][یَّخْرُجُوْا : وہ نکل جائیں][مِنْهَا : اس سے][فَاِنَّا : توہم یقیناً][دٰخِلُوْنَ ؛ داخل ہونے والے]

ترجمہ: انھوں نے (جواباً) کہا: اے موسیٰ ! اس میں توزبردست (ظالم) لوگ (رہتے) ہیں اور ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ اس (زمین) سے نکل جائیں، پس اگر وہ یہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے

تشریح:

جبارین کا بیان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو ارض مقدسہ میں داخل ہونے کا حکم دیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور اس کی یہ وجہ بیان کی اس جگہ جبارین رہتے ہیں ' جن سے ہم لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان کو جبارین اس لیے کہا: کہ ان کے جسم بہت بڑے بڑے تھے۔ اصل میں جبار اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے اور دوسروں کے معاملات کی اصلاح کرنے والا ہو۔ پھر اس کے استعمال میں وسعت ہوئی اور ہر اس شخص کو جبار کہا جانے لگا جو زور اور طاقت سے نفع حاصل کرے ' خواہ وہ اس کا حق ہو یا نہ ہو۔

حضرت ابن عباس (رض) نے کہا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو جبارین کے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ روانہ ہوئے ' حتی کہ اس شہر کے قریب پہنچ گئے ' اس شہر کا نام اریحا تھا۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنو اسرائیل کے ہر قبیلہ سے ایک ایک آدمی کو چن لیا اور ان بارہ آدمیوں کو جبارین کی جاسوسی کے لیے ان کے شہر بھیجا ' جب وہ لوگ اس شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے غیر معمولی

جسامت والے انسان دیکھے۔ وہ ان میں سے کسی کے باغ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا: کہ باغ والا ' اپنے باغ سے پھل توڑ رہا ہے ' اس نے ان جاسوسوں کو دیکھ لیا۔ اس نے ان میں سے ایک ایک کو پکڑ کو اپنی آستین سے نکال کر ان کو زمین پر ڈال دیا ' بادشاہ نے ان سے کہا: تم نے ہماری جسامت اور طاقت کا حال دیکھ لیا ہے ' جاؤ جا کر اپنے سردار کو مطلع کردو۔ (جامع البیان 'جز ٦ ص ٢٣٨۔ ٢٣٧ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت '١٤١٥ھ)

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا تھا 'کہ ہم اس زمین میں داخل ہوں گے اور ان لوگوں پر غالب ہوں گے۔ پھر ان جاسوسوں نے آکر بیان کیا کہ ان جبارین کے بہت بڑے۔ بڑے جسم ہیں اور وہ بہت زور والے ہیں 'ہم تو ان کی نظروں میں ٹڈوں کی طرح ہیں ' یہ سن کر بنو اسرائیل آہ وبکا کرنے لگے۔ افسوس ! ہم یہاں آگئے، کاش ! ہم مصر ہی میں رہتے اور انھوں نے جبارین کے ساتھ لڑنے سے صاف انکار کردیا۔ (جامع البیان 'جز ٦ ص ٢٣٩ 'مطبوعہ بیروت '١٤١٥ھ) (تبیان)

غلامی "بنی اسرائیل کی بزدلی کی اصل وجہ

بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھ کر اور ان کی روداد پڑھ کر آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ ایک قوم جو اللہ کے نبی پر ایمان لا چکی ہے اور مسلسل اس پر اللہ کی نعمتیں برس رہی ہیں ' وحی الٰہی اتر رہی ہے اور آنے والے مستقبل کے لیے انھیں ایک قائد امت کے طور پر تیار کیا جارہا ہے۔ بایں ہمہ ان کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی بھی معرکہ کارزار میں اترنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اب تک ہر کام حضرت موسیٰ کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انجام پذیر ہوا ہے ' یہ مرحلہ بھی اسی طرح سر ہوجانا چاہیے۔ بحر قلزم اگر عصائے موسیٰ سے پایاب ہوسکتا ہے تو فلسطین بھی ایسے ہی معجزے سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں آخر اس مصیبت میں کیوں ڈالا جارہا ہے۔ ان میں یہ جو بزدلی اور اجتماعی کمزوری دکھائی دیتی ہے 'آدمی کو اس پر حیرت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو۔ جس آدمی نے بھی قوموں کی تاریخ پڑھی ہے ' وہ خوب جانتا ہے کہ آزادی قوموں کو خود اعتمادی دیتی ہے۔ اپنی قسمت آپ بنانے کا حوصلہ دیتی ہے اور اپنے قومی تشخص کو باقی رکھنے کے لیے بڑے سے بڑے معرکے میں اتر جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ وہ جانتے ہیں۔

؎ بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

لیکن جب کوئی قوم غلامی کا شکار ہوتی ہے تو وہ صرف قومی تشخص ہی سے نہیں ' بلکہ قومیت کے احساس سے بھی محروم ہوجاتی ہے۔ وہ انسانوں کا ایک ایسا ہجوم ہوتا ہے جن کی ضرورت صرف کھانا پینا اور زندہ رہنا ہے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ قومی آزادی ' قومی خود اعتمادی ' قومی وقار اور روئے زمین پر عزت و سربلندی سے زندہ رہنا کیا چیزیں ہیں۔ وہ ان چیزوں کو کتابی علم سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ اس لیے جب بھی انھیں کبھی کسی ایسے معرکے میں شامل ہونے کے لیے کہا جائے جہاں ایثار ' سرفروشی اور جاں سپاری کے مراحل درپیش ہوں۔ وہ ان سے کوسوں دور بھاگتی ہیں کیونکہ غلامی ان کے اندر ان خصائل میں سے کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیتی ' بلکہ وہ یہ تک بھول جاتی ہیں کہ حسن و خوبی کے معیارات کیا ہیں اور عزت اور ذلت کس چیز کا نام ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا تھا ؎

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی

جسے زیبا کہیں آزاد بندے ' ہے وہی زیبا

بنی اسرائیل چونکہ تاریخ کے اس جبر کا شکار تھے اور وہ آزادی کے خصائص سے یکسر محروم ہو چکے تھے اور اب تک انھوں نے ہر کام معجزات سے ہی ہوتا دیکھا تھا 'اس لیے وہ کسی بھی ایسے معرکہ کارزار میں شامل ہونے کو تیار نہ تھے 'جس میں انھیں خطرات سے دوچار ہونا پڑے۔ اس لیے باوجود اللہ کے اس وعدے کے کہ یہ فلسطین کی سرزمین تمہارے لیے مقدر کر دی گئی ہے 'بس ضرورت صرف یہ ہے کہ تم کسی حد تک اولوالعزمی کا ثبوت دو۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم ایسی کسی مہم میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں۔

ہر چند کہ یہ پوری قوم بزدلی کی تصویر بن گئی۔ لیکن اللہ کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیں ہزار تنزل کا شکار ہو جائیں 'ان میں کچھ نہ کچھ نمونے کے لوگ باقی رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ آخری دم تک قوم کے سامنے اتمام حجت کا فرض انجام دیتے رہیں۔ چنانچہ جو بارہ افراد کا ایک وفد فلسطین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا ان میں سے دو افراد ایسے تھے جنھوں نے ان کا حوصلہ بندھانے کی کوشش کی۔ (روح)

مسائل

۱۔ اللہ سے ڈرنے والوں پر اللہ کا انعام ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات ماننے والے غالب آتے ہیں۔

۳۔ مومن ہر حال میں اللہ تعالیٰ پہ توکل کرتے ہیں۔

۴۔ نیک لوگوں کو دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنی چاہیے۔

آیت مبارکہ:

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾

لغۃ القرآن: [قَالَ ؛ اس نے کہا][رَجُلٰنِ : دو آدمی][مِنَ : سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][يَخَافُوْنَ : وہ ڈرتے ہیں][اَنْعَمَ : انعام کیا][اللّٰهُ : اللہ][عَلَيْهِمَا ؛ ان پر][ادْخُلُوْا : تم داخل ہوجاؤ][عَلَيْهِمُ : ان پر][الْبَابَ : دروازہ][فَاِذَا : تو جب][دَخَلْتُمُوْهُ : تم داخل ہوگے اس میں][فَاِنَّكُمْ : یقیناتم][غٰلِبُوْنَ ؛ : غالب آنے والے ہو][وَعَلَي : اور

پر][اللّٰهِ : الله][فَتَوَكَّلُوْٓا : تم بھروسا کرو][اِنْ كُنْتُمْ : اگر تم ہو][مُّؤْمِنِيْنَ : مومن (جمع)]

ترجمہ: ان (چند) لوگوں میں سے جو (اللہ سے) ڈرتے تھے دو (ایسے) شخص بول اٹھے جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا (اپنی قوم سے کہنے لگے :) تم ان لوگوں پر (بلاخوف حملہ کرتے ہوئے شہر کے) دروازے سے داخل ہو جاؤ، سو جب تم اس (دروازے) میں داخل ہو جاؤ گے تو یقیناً تم غالب ہو جاؤ گے، اور اللہ ہی پر توکل کرو بشرطیکہ تم ایمان والے ہو۔

تشریح: بنی اسرائیل نے بزدلی دکھادی تھی مگر دو حضرات کالب بن یوقنا اور یوشع بن نون (رض) نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ یہ دونوں حضرات ان سرداروں میں سے تھے جنہیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جبّارین قوم کا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا اور انھوں نے حالات معلوم کرنے کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے فرمان کے مطابق جبارین کا حال صرف حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام سے عرض کیا تھا اور دوسروں کو نہ بتایا تھا۔ ان دونوں حضرات نے قوم کو جوش دلانے کیلئے فرمایا کہ اے لوگو! شہر کے دروازے سے ان جبارین پر داخل ہو جاؤ، اگر تم ہمت کرکے دروازے میں داخل ہو جاؤ تو تم ہی غالب ہوگے اور اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ کیا ہے اور اس کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ تم جبارین کے بڑے بڑے جسموں سے خوف نہ کھاؤ، ہم نے انھیں دیکھا ہے ان کے جسم بڑے ہیں اور دل کمزور ہیں ان دونوں نے جب یہ کہا تو بنی اسرائیل بہت برہم ہوئے اور بجائے جوش میں آنے کے الٹا انہی کے خلاف ہوگئے اور انھوں نے چاہا کہ ان پر پتھر برسادیں۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں پر انعام

(اللہ تعالیٰ) سے ڈرنے والوں میں سے دو شخصوں نے کہا) ایک حضرت یوشع اور دوسرے حضرت کالب (ان دونوں پر اللہ تعالیٰ) کا انعام ہوا جس کا یہ ثمرہ تھا کہ دونوں ہی اپنے ایمان اور اپنے عہد پر ثابت قدم رہے اور ان پر جبارین کا خوف طاری نہیں ہوا۔ چنانچہ۔۔انھوں نے بنی اسرائیل کو مشورہ دیا کہ داخل ہو جاؤ ان جبارین کے شہر، اریحا، کے دروازہ میں زبردستی اور اچانک تاکہ وہ صحرا میں جانے کا موقع پا نہ سکیں اور تم انھیں تنگ راستے سے ہی گھیر لو۔ پھر جب داخل ہو چکے تم اس دروازہ سے اور اسی طریقہ سے جو ہم نے کہا تو یقین جان لو کہ بیشک تمہیں جیتے اور فتح یاب ہوئے اس لیے کہ ہم نے انھیں غور وخوض سے دیکھا وہ دل کے نہایت کمزور ہیں اگرچہ جسموں کے لحاظ سے موٹے ہیں ان سے بالکل نہ گھبراؤ بلکہ ان پر تنگ راستوں میں حملہ کردو اس طرح انھیں بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ مل سکے گی۔۔ المختصر۔۔ان کا موٹاپا ان کے لیے بے فائدہ اور لاحاصل ہے۔

یہ بات انھوں نے الہام الٰہی سے جانی تھی یا حضرت موسیٰ کے خبر دینے سے، ان مشورہ دینے والوں نے اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلادی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ میں اہل ایمان کی کامیابی خود ان کے زور بازو کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد اور اسی کی نصرت سے حاصل ہوتی ہے تو پھر اپنی قوت وطاقت اور اپنے آلات حرب وضرب پر بھروسہ نہ کرو، بلکہ دشمنوں سے بے خوف ہو جاؤ (اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو

اگر اسے مانتے ہو اور اس کے وعدہ پر یقین رکھتے ہو اس لیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس پر لازماً توکل کرو مگر ان دونوں باتوں کی پرواکیے بغیر اپنی بات پر اصرار کرتے رہے۔(اشرفی)

حضرت یوشع حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نبوت سے سرفراز ہوئے۔ یہ دونوں کالب اور یوشعؑ بنی اسرائیل کی قوم سے ہی تعلق رکھتے تھے اور دونوں غلامی کے زخم بھی سہہ چکے تھے۔اس کے باوجود حیرت ہے کہ اللہ نے ان میں ایک اولوالعزم اور صداقت شعار قوم کے افراد کی خصوصیات زندہ رکھیں۔ایسی خصوصیات کا وجود غلام قوم کے افراد میں بجائے خود بہت نادر ہے۔ یہ اسی کے نصیب میں ہوتا ہے جس پر اللہ اپنا فضل فرمائے۔ چنانچہ ان پر بھی اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور انھوں نے قوم کو ڈھارس بندھانے اور اپنے فرض کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور ان کو دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب ایمان لوگوں کا اور ان کی طرف مبعوث ہونے والوں کا ہمیشہ یہ نشان رہا ہے کہ وہ اللہ کے سواہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والوں میں قرآن کریم نے جادوگروں کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے ایمان لانے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے 'اس میں بھی سب سے بڑی بات جس سے ہمارے ایمان کو روشنی ملتی ہے 'وہ یہ ہے کہ جب انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا کو معجزاتی شکل میں دیکھا اور سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں بلکہ نبوت ہے تو پھر انھوں نے فرعون کے سارے جاہ وجلال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے کا نہ صرف اعلان کیا بلکہ اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے۔فرعون نے جب ان کو اپنی قوت اور جبروت سے ڈرانے کے لیے دھمکیاں دیں تو انھوں نے صاف کہا کہ بادشاہ آپ جو چاہیں کر گزریں ہم اس ذات پر ایمان لا چکے ہیں جس کے بعد کسی اور سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ اہل حق کا یہ وہ قافلہ ہے جن کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوانہ کسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔

"توکل علی اللہ اور مقدور بھر کوشش" فضل الٰہی کے نزول کے لیے شرط

یہ دونوں نوجوان بھی اسی قافلہ حق کے مسافروں میں سے تھے۔انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ آپ کو دو کام کرنے ہیں۔ایک یہ کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فلسطین پر چڑھ دوڑو اور اس کی فصیل پر یلغار کرتے ہوئے اس کے بڑے گیٹ میں گھس جاؤ۔ وہاں تک پہنچنا تمہارا کام ہے 'اس لیے کہ تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ تمہارا کام نہیں بلکہ یہ سراسر اللہ کی ذات کا فیصلہ ہے۔اگر تمہارے اندر اخلاص ہوا اور تم نے توکل اور بھروسہ کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ کی تو یقیناً اللہ تمہیں فتح سے ہمکنار کرے گا اور تم میں سے جن لوگوں کو وہ زیادہ بلند مرتبہ دینا چاہے گا ان کو شہادت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ لیکن تمہارا کام یہ ہے کہ ایک دفعہ شہر پر چڑھ دوڑو۔ یہ بالکل اللہ کی وہی سنت ہے جو ہم یوسف (علیہ السلام) کے واقعے میں دیکھتے ہیں کہ زلیخا نے ان کو گناہ کی دعوت دی اور اس سے بچ نکلنے کے تمام امکانات ان کے سامنے مسدود کر دیئے۔اب بظاہر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اللہ کی طرف سے ان کے دل میں یہ خیال ڈالا گیا کہ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ہر بند دروازے تک دوڑتے ہوئے پہنچ جاؤ 'اس کے بعد اس کے تالوں کو توڑنا اور دروازوں کو کھولنا 'یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعتماد علی اللہ اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔

بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

چنانچہ حضرت یوسف (علیہ السلام) دروازے پر دوڑتے ہوئے پہنچتے تو دروازہ ان کے لیے کھل جاتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کی کوششوں کے نتیجے میں ان کو محفوظ رکھا۔

ہم اپنی اسلامی تاریخ میں بھی قدم قدم پر اس کے شواہد دیکھتے ہیں۔ خود جنگ بدر میں مسلمانوں کے پاس وسائل جنگ کے حوالے سے تہی دامنی کے سوا اور کیا تھا۔ افرادی قوت ایک تہائی سے بھی کم تھی۔ مقابلے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی اصل قوت کیا تھی؟ وہی جس کا ابھی ذکر ہو رہا ہے۔ حفیظ جالندھری نے اس کی ٹھیک منظر کشی کی ہے:

تھے ان کے پاس دو گھوڑے ' چھ زرہیں ' آٹھ شمشیریں

پلٹنے آئے تھے ' یہ آج دنیا بھر کی تقدیریں

نہتے تھے ' مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے

کہ ساماں پر نہیں ' ایمان پر ایمان رکھتے تھے

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یا اللہ! سالہا سال کی محنت کا ثمر آپ کے حضور لے آیا ہوں ' اب ان کو بچانا اور ان کی مدد فرمانا آپ کے ذمہ ہے۔ انہی حقائق کی طرف ان نوجوانوں نے اپنی قوم کو ہر چند متوجہ کیا۔ لیکن غلامی کی زخم خوردہ یہ قوم چونکہ ملی خصوصیات سے بالکل محروم ہو چکی تھی ' اس لیے انھوں نے نہ صرف اس نصیحت کو قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔

فوائد

1۔ کالب بن یوقنا اور یوشع بن نون جو ان نقبا میں سے تھے جنہیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جبابرہ کا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

2۔ ہدایت اور وفاء عہد کے ساتھ، انھوں نے جبابرہ کا حال صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کیا اور اس کا افشاء نہ کیا بخلاف دوسرے نُقَبا کے کہ انھوں نے افشاء کیا تھا۔

3۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ کیا ہے اور اس کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے، تم جبارین کے بڑے بڑے جسموں سے اندیشہ نہ کرو ہم نے انھیں دیکھا ہے ان کے جسم بڑے ہیں اور دل کمزور ہیں، ان دونوں نے جب یہ کہا تو بنی اسرائیل بہت برہم ہوئے اور انھوں نے چاہا کہ ان پر سنگ باری کریں۔

آیت مبارکہ:

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِیۡهَا فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾

لغۃ القرآن: [قَالُوْا : انہوں نے کہا][یٰمُوْسٰٓی: اے موسیٰ][اِنَّا : یقیناً ہم][لَنْ : بالکل نہ][نَّدْخُلَهَآ : ہم داخل ہوں گے اس میں][اَبَدًا : کبھی بھی][مَّا دَامُوْا : جب تک وہ موجود ہیں][فِیْهَا ؛ اس میں][فَاذْهَبْ : پس جاتو][اَنْتَ وَرَبُّكَ : تو اور تیرا رب][فَقَاتِلَآ : تم دونوں لڑو][اِنَّا : بیشک ہم][هٰهُنَا : یہیں][قٰعِدُوْنَ ؛ بیٹھے ہیں]

ترجمہ: انھوں نے کہا: اے موسٰی! جب تک وہ لوگ اس (سرزمین) میں ہیں ہم ہر گز کبھی بھی وہاں داخل نہیں ہوں گے، پس تم جاؤاور تمہارا رب (ساتھ جائے) سو تم دونوں (ہی ان سے) جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

تشریح:

موسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے حضور التجاء

جب ناہنجار اور نافرمان قوم نے نہ صرف موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم کا انکار کیا بلکہ پرلے درجے کی گستاخی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ تو اور تیرا رب جا کر قتال کریں۔ غور فرمائیں، جس قوم کے لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بیشمار مصائب وآلام برداشت کیے اور جس کے لیے اتنی جدوجہد کی کہ اس کا جواب کتنا گستاخانہ اور بزدلانہ ہے۔ یہ سن کر جناب موسیٰ (علیہ السلام) کے دل پر کیا گزری ہو گی؟ لیکن اس کے باوجود موسیٰ (علیہ السلام) نے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں کچھ کہنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کی کہ الٰہی! میں اپنی اور اپنے بھائی کی ذمہ داری لیتا ہوں جس کا یہ معنی ہے کہ ہم تو تیری راہ میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں اگر یہ نافرمان اپنے فائدے کی خاطر بھی تیرے راستے میں لڑنے کے لیے تیار نہیں۔ بس تو ہمارے اور ان کے درمیان علیحدگی فرما دیجیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ارض مقدس کو حرام کیا اور انھیں چالیس سال تک تیہ کے صحرا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا اور ساتھ ہی موسیٰ (علیہ السلام) کو فرمایا کہ

آپ کو نافرمان قوم پر افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ کچھ مدت کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون (علیہ السلام) یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے بعد یوشع بن نون کی قیادت میں بنی اسرائیل ارض مقدس میں داخل ہوئے لیکن اس وقت بھی انھوں نے بغاوت کا مظاہرہ کیا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ جغرافیہ دانوں نے اس صحرا کا رقبہ ۲۷ فرسخ طول اور ۹ فرسخ عرض بیان کیا جس کا مطلب ہے کہ یہ صحرا ۹۰۱ میل لمبا اور ۲۷ میل چوڑا ہے جس میں تقریباً ۷۰ لاکھ کے قریب بنی اسرائیل مقید کیے گئے جس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ صبح سے شام تک اس کوشش میں سرگرداں رہتے کہ کسی طرح وہ واپس پلٹ جائیں لیکن مغرب کے وقت اسی مقام پر ہوتے جہاں سے انھوں نے سفر شروع کیا ہوتا تھا گویا کہ وہ بغیر کسی دیوار اور بیڑیوں کے اللہ تعالیٰ کی جیل میں جکڑ دیے گئے تھے تاہم اس دوران انھیں صبح و شام کھانے کے لیے من اور سلویٰ دیا جاتا اور پینے کے بارہ چشموں کا انتظام اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے بادلوں کا سایہ کیا گیا۔

یہ مثلث نما جزیرہ ہے جو بحر الکاہل (بحیرہ روم) (شمال کی طرف) اور ریڈ سی بحر احمر (جنوب کی طرف) کے درمیان مصر میں واقع ہے اور اس کا رقبہ ساٹھ ہزار مربع کلومیٹر ہے اس کی زمینی سرحدیں سویز نہر مغرب کی طرف اور اسرائیل۔ مصر سرحد، شمال مشرق کی طرف ہیں۔ سینائی جزیرہ نما جنوب مغربی ایشیا میں واقعہ ہے اسے مغربی ایشیا بھی کہتے ہیں یہ زیادہ درست جغرافیائی اصطلاح ہے جبکہ مصر کا باقی حصہ شمالی افریقہ میں واقعہ ہے جغرافیائی و سیاسی مقاصد کے لیے زیادہ سینائی کو اکثر افریقہ کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ سینائی تقریباً مکمل طور پر صحرا ہے مگر تبا (Taba) میں سبا ساحل (Sabah Coast) کے ساتھ ساتھ واقع ہے (موجودہ اسرائیل قصبہ ایلٹ (eilat) کے نزدیک) جہاں ایک ہوٹل اور رقص گاہ (Casino) ہے جب ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف حرکت کی جائے تو وہاں نیوو یبا (N (علیہ السلام) weba) داھاب (Dahab) اور شرم الشیخ (Sharmel sheikh) واقع ہیں سینائی العریش (I Arishel) یں غزہ پٹی کے نزدیک شمالی ساحل پر واقع ہے۔ (فہم)

توراۃ میں ہے

(تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی ہائے کاش ! ہم مصر ہی میں مر جاتے کاش ! اس بیابان میں ہی مر جاتے۔ خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے)

اندازہ فرمائیے ! جس قوم کی بزدلی اور دہشت زدگی کا یہ عالم ہو ' انھیں سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) جیسا عظیم پیغمبر اور یوشع اور کالب جیسے مجاہد بھی اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زندہ قوموں میں اگر تنزل کے آثار ظاہر ہونے لگیں تو بڑے لوگوں کے پند و نصائح اور مجاہدین کی حوصلہ مندیوں سے ان کا ازالہ ممکن ہے۔ لیکن جو قوم تنزل کی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے ' وہ گویا مر جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں کسی مسیحائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھتے ہوئے اور ان کا آخری جواب سن کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی غم اور صدمے میں ڈوب گئے۔ (روح)

صحابہ کرام (رض) کی افضلیت

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرام (رض) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ والوں سے کہیں افضل ہیں کیونکہ ان حضرات نے کسی سخت موقعہ پر بھی حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ایسا روکھا جواب نہ دیا بلکہ اپنا سب کچھ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قربان کردیا جیسے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام نبیوں کے سردار ہیں ایسے ہی حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرام (رض) تمام نبیوں کے صحابہ کے سردار ہیں۔ صحابہ کرام (رض) کی جانثاری کے بارے میں جاننے کے لیے یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ جنگ بدر کے موقع پر سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) سے مشورہ فرمایا تو حضرت سعد بن عبادہ (رض) نے کھڑے ہو کر عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں سمندر میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمائیں تو ہم اس میں کود جائیں گے۔ (مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب غزوۃ البدر، ص ۹۸۱، الحدیث: ۸۳ (۱۷۷۹))

انصار کے ایک معزز سردار حضرت مقداد بن اسود (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ہم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کا خدا عَزَّوَجَلَّ جا کر لڑیں بلکہ ہم لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دائیں سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے لڑیں گے۔ یہ سن کر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ انور خوشی سے چمک اٹھا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب قول اللہ تعالیٰ: اذ تستغیثون ربکم۔۔ الخ، ۳/۵، الحدیث: ۳۹۵۲) (صراط)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ایمان افروز جذبات سن کر خوش ہوئے اور انھیں خوشخبری دی کہ میں کفار کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں جہاں وہ کل مرے پڑے ہوں گے۔

(ابن ہشام اور دیگر کتب سیرت) (امداد)

مسائل

۱۔ اللہ کے رسول کے حکم کو نہ ماننے والے فاسق ہیں۔

۲۔ اللہ کا حکم نہ ماننے والے رسوا ہوتے ہیں۔

۳۔ مغضوب قوم کے لیے زمین تنگ کردی جاتی ہے۔

۴۔ نافرمان لوگوں پر عذاب نازل ہو تو افسوس نہیں کرنا چاہیے۔

آیت مبارکہ:

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

لغۃ القرآن: [قَالَ : کہا اس نے][رَبِّ : اے رب !][اِنِّيْ : یقیناً میں][لَآ : نہیں][اَمْلِكُ : مالک میں][اِلَّا : مگر][نَفْسِيْ : اپنی جانکا][وَاَخِيْ : اور میرا بھائی][فَافْرُقْ : تو تفریق کر][بَيْنَنَا : ہمارے درمیان][وَبَيْنَ : اور درمیان][الْقَوْمِ : قوم][الْفٰسِقِيْنَ ؛ نافرمان (جمع)]]

ترجمہ: (موسٰی (علیہ السلام) نے) عرض کیا: اے میرے رب ! میں اپنی ذات اور اپنے بھائی (ہارون (علیہ السلام)) کے سوا (کسی پر) اختیار نہیں رکھتا پس تو ہمارے اور (اس) نافرمان قوم کے درمیان (اپنے حکم سے) جدائی فرمادے۔

تشریح:

بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بیزاری

علیحدگی کردینے کا مفہوم جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے ان کی قیادت واصلاح کے بار عظیم سے سبکدوش کردیا جائے کیونکہ اتنی طویل جدوجہد اور اتنے بیشار خوارق وعجائب کے بعد بھی ان کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں اور جنھیں اپنی زندگی کی بقاء اور اپنے خوردونوش کی فکر کے سوا اور کسی چیز کی فکر نہیں تو ایسے حیوانوں سے کون سے معرکے کی امید کی جاسکتی ہے اور ایسے پتھروں میں کیا جونک لگائی جاسکتی ہے۔ اس لیے مجھے ان کی ذمہ داریوں سے فارغ کردیا جائے۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) چونکہ خود اللہ کے مقرر کردہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے وزیر بھی تھے اور پیغمبر بھی 'اس لیے آپ نے بطور خاص اس کا ذکر کیا۔ اس لیے کہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے ان کے ایثار وسرفروشی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہی کی طرح معصوم تھے۔ اب اگر یہ دعا قبول کرلی جاتی اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اٹھالیا جاتا اور یا ان کو ہجرت کا حکم دے دیا جاتا تو اللہ کے قانون کے مطابق بنی اسرائیل پر عذاب نازل ہوجاتا۔ اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی یہ دعا تو قبول نہ فرمائی گئی اور اس طرح بنی اسرائیل کو ہلاکت کے عذاب سے تو بچالیا گیا۔ لیکن ان کی ناقدری اور بے یقینی کی سزا ان کو چالیس سال تک اس سرزمین میں سرگرداں رہنے اور فلسطین سے محرومی کی شکل میں دی گئی۔ (روح)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے جواب سے غمزدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ "مولا! مجھے صرف اپنی جان اور اپنے بھائی ہارون کا اختیار ہے، تو تو ہمارے اور نافرمان قوم کے درمیان جدائی ڈال دے اور ہمیں ان کی صحبت اور قرب سے بچا اور یہ کہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ (صراط)

اُدھر بنی اسرائیل اور اِدھر امت محمدی ﷺ میں

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد (مااحد من علی بنفسہ وذات یدہ من ابی بکر کسی شخص نے اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ ابو بکر (رض) سے بڑھ کر مجھ پر احسان نہیں کیا) یہ سن کر حضرت ابو بکر (رض) رو پڑے اور عرض کیا۔ "اللہ کے رسول ﷺ! میں اور میرا مال سب کچھ آپ ﷺ کے لیے ہے "یعنی آپ ﷺ مجھے جس طرح موڑیں گے میں مڑ جاؤں گا اور میرے مال میں آپ ﷺ جو تصرف کریں گے وہ جائز ہوگا۔

اسی طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص سے فرمایا تھا (انت ومالک لابیک تو اور تیرا مال سب کچھ تیرے باپ کا ہے) آپ نے یہاں ملکیت کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے تھے۔ (قرطبیؒ)

دعاء کی قبولیت اور معنوی جدائی

یعنی جدائی کی دعا حسی اور ظاہری طور پر تو قبول نہ ہوئی۔ ہاں معناً جدائی ہو گئی کہ وہ سب تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ وہارون (علیہما السلام) پیغمبرانہ اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد واصلاح پر قائم رہے جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو ان کے معالجہ، چارہ سازی اور تفقد احوال میں مشغول رہیں۔ اگر فافرق بیننا کا ترجمہ جدائی کر دے کی جگہ فیصلہ کر دے ہوتا تو یہ مطلب زیادہ واضح ہو جاتا۔

یہ قصہ سنانے کا مقصد

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخر الزمان کی رفاقت نہ کرو گے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہو گی چنانچہ نصیب ہوئی۔

دعوت فکر

ایک لمحہ کے لیے اس سارے رکوع کو سامنے رکھ کر امت محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے ان پر خدا کے وہ انعامات ہوئے جو نہ پہلے کسی امت پر ہوئے نہ آئندہ ہوں گے۔ ان کے لیے خاتم الانبیاء سیدالرسل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابدی شریعت دے کر بھیجا۔ ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کئے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ایسے ایسے خلفاء نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کے بعد امت کے قائد بنے جنہوں نے سارے جہان کو اخلاق اور اصول سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔ اس امت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ عمالقہ کے مقابلہ میں نہیں روئے زمین کے تمام جبارین کے مقابلہ میں۔ محض سرزمین شام فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ شرق وغرب میں کلمتہ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ کاٹنے کے لیے بنی اسرائیل سے خدا نے ارض مقدسہ کا وعدہ کیا تھا لیکن اس امت سے یہ فرمایا (وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا)۔

اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ (علیہ السلام) نے جہاد میں پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا تو اس امت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ)۔

انجام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے رفقا تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک کہہ گزرے کہ (فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ) تم اور تمہارا پروردگار جا کر لڑ لو ہم یہاں بیٹھے ہیں لیکن اصحاب محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ ﷺ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیحدہ نہیں رہے گا۔ امید ہے کہ خدا آپ ﷺ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ ہم اپنے پیغمبر ﷺ کے ساتھ ہو کر ان کے دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے ہر طرف جہاد کریں گے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہہ دیا تھا (فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ) اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر وادی تیہ میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب نے مشرق و مغرب میں ہدایت وارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ذٰلک لمن خشی ربہ۔

فتون کی مطول حدیث میں ابن عباس سے یہ سب مروی ہے۔ پھر حضرت ہارون کی وفات ہو گئی اور اس کے تین سال بعد کلیم اللہ حضرت موسیٰ بھی انتقال فرما گئے، پھر آپ کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون نبی بنائے گئے۔ اسی اثناء میں بہت سے بنی اسرائیل مر مرا چکے تھے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف حضرت یوشع اور کالب ہی باقی رہے تھے۔

آیت "قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ" سے معلوم ہونے والے مسائل

اس آیت سے 3 مسئلے معلوم ہوئے:

(1)۔۔بروں سے علیحدگی اچھی چیز ہے جس کی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا مانگی۔

(2)۔۔بروں کی برائی سے نیک بھی بعض اوقات مشقت میں پڑ جاتے ہیں جیسا کہ ان نافرمانوں کی وجہ سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی مقام تیہ میں قیام فرمانا پڑا اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ (علیہ السلام) کیلئے سہولت مُیَسّر فرما دی تھی۔

(3)۔۔اچھوں کی صحبت سے برے بھی فیض حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی برکت سے بنی اسرائیل کو مقام تیہ میں مَن و سَلْویٰ ملا، پتھر سے پانی کے بارہ چشمے ملے اور وہ لباس عطا ہوا جو اتنے عرصہ تک نہ گلا نہ میلا ہوا۔ (صراط)

فوائد

1: یہاں ملک سے مراد قابو اور اختیار ہے، نہ کہ عرفی ملکیت، کیونکہ کوئی شخص نہ اپنی جان کا مالک ہوتا ہے نہ نبی کا، مطلب یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے اور اپنے بھائی پر قابو ہے اور کسی پر نہیں۔ اس سے بنی اسرائیل کی سرکشی معلوم ہوئی کہ ان کے نبی بھی ان سے مایوس تھے۔

2: اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ بروں سے علیحدگی اچھی چیز ہے جس کی موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا مانگی، دوسرے یہ کہ بدوں کی بدکاری سے نیک کاروں پر بھی سختی آجاتی ہے، ان نافرمانوں کی وجہ سے موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی مقام تیہ میں قیام فرمانا پڑا۔ تیسرے یہ کہ اچھوں کی صحبت سے برے بھی فیض حاصل کرلیتے ہیں۔ دیکھو موسیٰ (علیہ السلام) کی برکت سے بنی اسرائیل کو مقام تیہہ میں من وسلوی ملا۔ پتھر سے پانی کے بارہ چشمے ملے وہ لباس عطا ہوا جو اتنے عرصہ تک نہ گلا نہ میلا ہوا۔

آیت مبارکہ:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾ ع

لغۃ القرآن: [قَالَ : کہا اس نے][فَاِنَّهَا ؛ یقیناً وہ][مُحَرَّمَةٌ ؛ حرام کی گئی ہے][عَلَيْهِمْ : ان پر][اَرْبَعِيْنَ سَنَةً : چالیس برس][يَتِيْهُوْنَ : پریشان پھریں گے][فِي الْاَرْضِ: میں زمین][فَلَا : لہٰذا نہ][تَاْسَ ؛ تم غم کرو][عَلَي ؛ پر][الْقَوْمِ : قوم][الْفٰسِقِيْنَ : نافرمان (جمع)]

ترجمہ: (ربّ نے) فرمایا: پس یہ (سرزمین) ان (نافرمان) لوگوں پر چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے، یہ لوگ زمین میں (پریشان حال) سرگرداں پھرتے رہیں گے، سو (اے موسٰی! اب) اس نافرمان قوم (کے عبرت ناک حال) پر افسوس نہ کرنا

تشریح:

جدوجہد آزادی اور ارض شام کی فتح

بغوی نے لکھا ہے اس روایت پر قصہ اس طرح ہوا کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی اور چالیس سال کی مدت گزر گئی تو اللہ نے حضرت یوشع کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت یوشع نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ نے عمالقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ سب نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت (جہاد) کرلی اور اریحا کی طرف روانہ ہو گئے' ساتھ ساتھ تابوت سکینہ بھی تھا۔ اریحا پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا اور چھ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا ساتواں مہینہ شروع ہوتے ہی سنکھ پھونکا گیا اور یکدم نعرہ مارا فوراً شہر پناہ کی دیوار گرپڑی اور بنی اسرائیل نے شہر میں گھس کر عمالقہ سے مار دھاڑ شروع کر دی آخر ان کو شکست دے دی اور یکدم حملہ کرکے قتل کرنے لگے۔ بنی اسرائیل کا گروہ کا گروہ ایک ایک عملیقی کی گردن پر چڑھ کر کاٹنے کے لیے زور لگاتا تھا مگر کاٹ نہ پاتا تھا۔ یہ جنگ جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ دن بھر جاری رہی پھر بھی شام تک پوری نہ ہوئی سورج غروب ہونے لگے اور سنیچر کا دن شروع ہونے والا تھا۔ حضرت یوشع نے دعا کی اے اللہ ! سورج کو میری طرف لوٹا دے اور سورج سے فرمایا تو اللہ کی تعمیل حکم میں لگا ہوا ہے اور میں بھی اسی کی فرماں پذیری میں مشغول ہوں تو ٹھہر جا تاکہ اللہ کے دشمنوں سے میں انتقام لے لوں یوں سورج کو لوٹا دیا گیا اور دن ایک گھنٹہ بڑھا دیا گیا۔ آخر حضرت یوشع نے سب کو قتل کر دیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوشع نے پھر شاہان شام کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ ۳۱ بادشاہوں کو قتل کیا اور تمام ملک شام پر تسلط حاصل کرلیا اور اپنی طرف سے حاکم ہر طرف مقرر کر دیئے اور مال غنیمت جمع کرلیا مگر (مال غنیمت کو جلانے کے لئے) آگ آسمان سے نہیں اتری (یوشع (علیہ السلام) پریشان ہوئے کہ خدا جانے کیا قصور ہو گیا) وحی آئی کہ کسی نے مال غنیمت میں کچھ چوری کی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم دو کہ وہ (از سرنو) تمہاری بیعت کریں۔ حسب الحکم سب نے بیعت کی۔ بیعت کرتے وقت ایک شخص کا ہاتھ حضرت یوشع کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ حضرت یوشع نے فرمایا تیرے پاس کیا ہے وہ شخص سونے کا بنا ہوا بیل کا ایک سرلے آیا جو جواہرات سے مرصع تھا' اس آدمی نے مال غنیمت میں سے اس کو چرایا تھا۔ حضرت یوشع نے وہ سر قربانی کے مال میں شامل کر دیا اور چور کو بھی اسی میں ڈال دیا اور (آسمان سے) ایک آگ آکر سب کو کھا گئی۔ پھر کچھ مدت کے بعد حضرت یوشع کی وفات ہو گئی اور کوہ افرائیم میں آپ کو دفن کیا گیا آپ کی عمر ۱۲۶ سال ہوئی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ۲۶ برس آپ نے بنی اسرائیل کا انتظام کیا۔

وادی تیہ میں قید ہونا

یتیھون فی الارض۔ یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام قرار دے دیگئی۔ اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جا سکیں گے۔ اور پھر یہ نہیں کہ ملک شام نہ جا سکیں گے بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جا سکیں گے بلکہ اس میدان میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدائے عزوجل کی سزاؤں کے لیے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے۔ بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و مکان اس کے لیے جیلر بن جاتے ہیں

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

با من و تو مردہ با حق زندہ اند

تیہ کا میدان

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہے جس کی پیائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیں فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہو جاتا ہے، اور بعض روایات کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل کے بیان کے موافق چھ لاکھ نفوس تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کر دیا کہ چالیس سال مسلسل اس تگ و دو میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں، یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پر پہنچ جائیں، مگر ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پر پہنچ گئے ہیں، جہاں سے صبح چلے تھے۔

اسی چالیس سالہ دور میں اول حضرت ہارون (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی اور اس کے ایک سال یا چھ مہینہ بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لیے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام ان کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی نا قابل قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔ (گلدستہ)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا بیس سال سے زیادہ عمر کا جو شخص بھی میدان تیہ میں داخل ہوا ' وہ مر گیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون بھی تیہ میں فوت ہو گئے۔ پہلے حضرت ہارون فوت ہوئے ' حضرت یوشع ان یہودیوں کی اولاد کے ساتھ ارض مقدسہ پر حملہ آور ہوئے ' جبارین سے مقابلہ کیا اور اس شہر کو فتح کر لیا۔ (جامع البیان ' جز ۳ ص ۲۴۹ ' مطبوعہ دار الفکر بیروت ' ۱۴۱۵ھ)

قوم فاسقین

فلا تاس علی القوم الفسقین اور ان بدکار لوگوں کا رنج نہ کرو۔ یہ خطاب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اس وقت کیا گیا جب آپ کو بد دعا کرنے پر پشیمانی ہوئی تھی۔

الفاسقین کے لفظ سے اس طرف واضح اشارہ ہے کہ فاسق ہونے کی وجہ سے لوگ اسی کے مستحق ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل چھ فرسخ کے اندر چالیس سال تک گھومتے رہے دن بھر کوشش کرکے چلتے لیکن شام کو اسی جگہ ہوتے جہاں سے چلنا شروع کرتے۔ ابو الشیخ العظمتہ میں اور ابن جریر نے وہب بن منبہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے لیکن اس روایت میں چھ فرسخ کا ذکر نہیں ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل چھ لاکھ جنگی سپاہی تھے بعض اقوال میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون ان کے ساتھ نہیں تھے مگر صحیح یہ ہے کہ ساتھ میں موجود تھے اور تیہ میں موجودگی آپ کے لیے بطور سزا نہ تھی بلکہ ترقی درجات کا باعث اور (اخروی)

راحت کا سبب تھی سزا تو صرف (نافرمان) بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ تیہ میں ابر کا سایہ تمام لوگوں پر پانچ یا چھ فرسخ تک ہوتا تھا۔ ابن جریر نے ربیع بن انس کا یہی قول نقل کیا ہے رات میں روشنی کا ایک ستون نمودار ہو جاتا تھا جس سے اجالا ہو جاتا تھا۔ کھانے کے لیے من و سلویٰ تھا اور پینے کے لیے اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلتا تھا جو بنی اسرائیل ساتھ لیے پھرتے تھے جب تیہ کی مدت ختم ہو گئی تو حکم ہوا۔ بستی میں جا کر اترو۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عمالقہ سے جہاد کیا اور اریحا کو فتح کیا اور حکم دیا گیا کہ (شہر کے) دروازہ میں سر جھکائے استغفار کرتے داخل ہو۔

عصائے موسیٰ

ابن جریر کی یہی دلیل ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا عصا دس ہاتھ کا تھا اور آپ کا قد بھی دس ہاتھ کا تھا اور دس ہاتھ زمین سے اچھل کر آپ نے عوج بن عنق کو وہ عصا مارا تھا جو اس کے ٹخنے پر لگا اور وہ مر گیا، اس کے جثّے سے نیل کا پل بنایا گیا تھا، جس پر سے سال بھر تک اہل نیل آتے جاتے رہے۔ نوف بکالی کہتے ہیں کہ اس کا تخت تین گز کا تھا۔

حضرت ہارون (علیہ السلام) کی وفات کا قصّہ

سدی نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ میں ہارون کو وفات دینے والا ہوں تم ان کو فلاں پہاڑ پر لے آؤ حسب الحکم موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون مقررہ پہاڑ کی طرف گئے وہاں ایک عجیب درخت دیکھا کہ ایسا درخت کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایک مکان بھی نظر آیا جس کے اندر تخت بچھا ہوا تھا اور تخت پر بستر لگا ہوا تھا جس سے خوشبو مہک رہی تھی۔ حضرت ہارون نے یہ منظر دیکھ کر پسند کیا اور بولے موسیٰ میں تو اس تخت پر سونا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا سو جاؤ۔ حضرت ہارون نے کہا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں گھر والا آ کر ناراض نہ ہو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اس کا اندیشہ نہ کرو، گھر والے سے میں نمٹ لوں گا۔ حضرت ہارون نے کہا موسیٰ (علیہ السلام)! میرے ساتھ آپ بھی سو جائیں۔ اب گھر والا آ جائے گا تو مجھ پر اور آپ پر دونوں پر غصہ ہو گا چنانچہ دونوں سو گئے اور (سوتے میں ہی) حضرت ہارون کی وفات ہو گئی۔ وفات سے پہلے موت کا احساس کر کے حضرت ہارون نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) میری آنکھوں کو بند کر دو۔ جب وفات ہو گئی تو وہ مکان درخت اور تخت سب آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تنہا بغیر ہارون کے لوٹ آئے۔ تنہا آتا دیکھ کر بنی اسرائیل بولے چونکہ قوم والے ہارون سے محبت کرتے تھے اس لیے موسیٰ (علیہ السلام) کو حسد ہوا اور انھوں نے ہارون (علیہ السلام) کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا ارے کم بختو! ہارون تو میرا بھائی تھا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نے اس کو قتل کر دیا جب لوگوں نے یہ بات بہت زیادہ کہی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی آپ کی دعا سے تخت اتر آیا اور لوگوں نے آسمان و زمین کے درمیان معلق تخت دیکھ لیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قول کی تصدیق کی۔

حضرت موسیٰ کی وفات کا قصہ

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو موت گوارا نہ تھی اور اللہ نے چاہا کہ موسیٰ کی نظر میں موت محبوب ہو جائے اس لیے یوشع بن نون کو پیغمبری سے سرفراز فرمایا۔ حضرت یوشع صبح شام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاتے تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ان سے پوچھتے تھے اے اللہ کے نبی اللہ نے آپ کے پاس کیا نیا پیام بھیجا۔ حضرت یوشع (علیہ السلام) کچھ نہیں بیان کرتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ اے نبی اللہ کیا اتنے اتنے سال میں آپ کی صحبت میں نہیں رہا تو کیا اتنی طویل مدت میں جب تک آپ نے خود ہی ذکر نہیں کیا میں نے کبھی آپ سے سوال کیا۔ اللہ نے کیا نیا پیام آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ نے اپنی طرف سے خود ہی بیان کر دیا تو کر دیا جب موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ جواب سنا تو زندگی سے نفرت اور موت سے رغبت ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا موت کا فرشتہ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آیا اور کہا اپنے رب کا بلاوا قبول کیجئے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ملک الموت کے طمانچہ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ملک الموت نے اللہ سے جا کر عرض کیا کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا تھا جو مرنا نہیں چاہتا اور اس نے میری آنکھ پھوڑ دی۔ اللہ نے دوبارہ ملک الموت کو آنکھ عطا کر کے حکم دیا کہ میرے بندے کے پاس واپس جا کر کہو کہ کیا تو زندہ رہنے کا خواستگار ہے اگر تیری خواہش یہی ہے تو اپنا ہاتھ کسی بیل کی پشت پر رکھ جتنے بال تیرے ہاتھ میں آئیں گے اتنے ہی سال تو زندہ رہے گا (ملک الموت نے جا کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا پیام پہنچا دیا) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پوچھا پھر کیا ہوگا۔ ملک الموت نے کہا پھر آپ کو مرنا ہوگا۔ حضرت موسیٰ نے کہا پھر تو ابھی صحیح اور دعا کی پروردگار! مجھے ارض مقدس کے اتنے قریب پہنچا دے کہ ایک اینٹ پھینکنے کے بقدر فاصلہ رہ جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر میں وہاں ہوتا تو تم کو موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر راستہ کے کنارہ پر سرخ ٹیلہ کے قریب دکھا دیتا۔ رواہ البخاری و مسلم۔

وہب نے بیان کیا حضرت موسیٰ کی عمر 120 برس کی ہوئی (تفسیر مظہری) (گلدستہ)

حضرت یوشع کے لیے سورج کو ٹھہرانا

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون کو نبوت عطا کی اور ان کو جبارین سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اسی مقابلہ میں سورج کو ٹھہرا دیا گیا، حتی کہ وہ شہر میں داخل ہو گئے اور اسی جنگ کا یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص کی خیانت کی وجہ سے آگ نے مال غنیمت کو نہیں جلایا۔ اس واقعہ کی تفصیل اس حدیث میں ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: انبیاء (سابقین) میں سے ایک نبی نے جہاد کیا اور اپنی قوم سے یہ کہا کہ جس شخص نے ابھی نکاح کیا ہو اور اس نے ہنوز شب زفاف نہ گزاری ہو اور وہ یہ عمل کرنا چاہتا ہو، وہ میرے ساتھ نہ جائے، اور نہ وہ شخص جائے جس نے مکان بنایا ہو اور اس نے ہنوز چھت بلند نہ کی ہو، اور نہ وہ شخص جائے جس نے بکریاں اور گابھن اونٹنیاں

خریدی ہوں اور وہ ان کے بچہ دینے کا منتظر ہو۔ پھر اس نبی (علیہ السلام) نے جہاد کیا اور عصر کی نماز کے وقت ' یا اس کے قریب وہ ایک دیہات میں پہنچے تو انھوں نے سورج سے کہا: تم بھی حکم الٰہی کے ماتحت ہو 'اور میں بھی حکم الٰہی کے ماتحت ہوں۔ اے اللہ ! اس سورج کو تھوڑی دیر میرے خاطر روک دے 'پھر سورج روک دیا گیا 'حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا کی۔ آپ نے فرمایا پھر انھوں نے مال غنیمت جمع کیا 'پھر اس مال کو کھانے کے لیے ایک آگ آئی 'لیکن اس نے مال کو نہ کھایا۔ اس نبی نے فرمایا تم میں سے کسی شخص نے خیانت کی ہے 'سو ہر قبیلہ کا ایک شخص مجھ سے بیعت کرے 'پھر سب نے بیعت کی اور ایک شخص کا ہاتھ نبی کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ نبی نے فرمایا خیانت کرنے والا تمہارے قبیلہ میں ہے۔ لہٰذا اب تمہارا پورا قبیلہ میری بیعت کرے 'انھوں نے بیعت کی 'آپ نے فرمایا پھر دو یا تین آدمیوں کا ہاتھ پیغمبر کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ نبی نے فرمایا تمہارے اندر خیانت ہے۔ بالاخر وہ گائے کے سر کے برابر سونا نکال کر لائے۔ نبی نے فرمایا اس کو مال غنیمت میں اونچی جگہ پر رکھ دو۔ پھر آگ نے آکر اس مال کو کھالیا (آپ نے فرمایا) سو ہم سے پہلے کسی کے لیے بھی مال غنیمت حلال نہیں تھا 'لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ہمارا اضعف اور عجز دیکھا تو ہمارے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا۔ (صحیح مسلم 'ج ۳ رقم الحدیث : ۱۷۴۷ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سورج کو لوٹانا

اس حدیث میں حضرت یوشع بن نون کے لیے غروب سے پہلے سورج کے ٹھہرانے کا ذکر ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غروب کے بعد سورج کو لوٹا دیا تھا۔

حضرت اسماء بنت عمیس (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف وحی کی جارہی تھی اور ان کا سر حضرت علی کی گود (رض) میں تھا۔ حضرت علی (رض) نے نماز نہیں پڑھی 'حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی : اے اللہ ! بیشک علی تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت میں مشغول تھے 'توان پر سورج لوٹا دے۔ حضرت اسماء (رض) نے کہا: میں نے دیکھا کہ سورج غروب ہوگیا تھا اور پھر غروب ہونے کے بعد وہ طلوع ہوگیا۔ (المعجم الکبیر 'ج ۲۴ 'رقم الحدیث : ۳۹۰ 'ص ۱۵۲۔۱۵۰ 'مشکل الآثار 'للطحاوی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۳۸۵۰ 'ص ۳۶۸ 'مختصر تاریخ دمشق ج ۱۷ 'ص ۳۷۸ 'سبل الھدی والرشاد 'ج ۹ 'ص ۴۳۹۔ ۴۳۵ 'التذکرہ 'ص ۱۷ 'شرح مشکل الآثار للطحاوی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۰۶۷۔۱۰۶۸)

یہ حدیث نبوت کی عظیم علامتوں میں سے ہے۔ کیونکہ حضرت علی (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے اپنے آپ کو پابند رکھا۔ اس لیے آپ نے ان کے لیے سورج لوٹانے کی دعا کی۔ اس سے نماز عصر کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے۔ (شرح مشکل الاثار 'ج ۳ 'ص ۹۸۔۹۷ 'مطبوعہ موسسہ الرسالہ بیروت)

حدیث رد شمس کی سند کی تحقیق

ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ ابن تیمیہ 'ابن القیم 'ذہبی 'ابن کثیر اور ابن حزم کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ (رض) حضرت علی بن ابی طالب (رض) اور حضرت ابوسعید خدری سے بھی مروی ہے۔ امام ابوالحسن فضلی متوفی ۴۰۷ ھ

نے اس حدیث کی تمام اسانید کو جمع کیا ہے اور ایک رسالہ لکھا ہے۔ "تصحیح حدیث رد الشمس" اور امام سیوطی نے ایک رسالہ لکھا ہے' کشف اللبس عن حدیث الشمس" اور امام محمد بن یوسف دمشقی نے ایک رسالہ لکھا ہے "مزیل اللبس عن حدیث رد الشمس"۔
اس حدیث کے متعلق امام احمد نے کہا اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے ان کی پیروی کرکے اس حدیث کو موضوعات میں درج کیا ہے۔ لیکن امام طحاوی اور صاحب الشفاء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ابن مندہ اور امام ابن شاہین نے اس کو اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے' اور امام ابن مردویہ نے اس کو حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس دن سورج کو لوٹایا' جس دن آپ نے اس قافلہ کے آنے کی خبر دی تھی۔ جس کو آپ نے شب معراج دیکھا تھا' اس روز دن غروب ہو رہا تھا اور ابھی تک قافلہ نہیں آیا تھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ایک ساعت سورج کو روک دیا گیا۔ (الخ)
(المقاصد الحسنہ' ص ۲۳۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۷ ھ)
ابن اسحاق کی مغازی میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے واقعہ معراج کی صبح کو جب کفار قریش کو یہ خبر دی کہ آپ نے ان کا قافلہ دیکھا ہے اور وہ طلوع آفتاب کے ساتھ آجائے گا' پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی' حتی کہ قافلہ آنے تک سورج ٹھہرا رہا۔ یہ حدیث منقطع ہے' لیکن امام طبرانی کی اوسط میں حضرت جابر (رض) سے یہ روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورج کو حکم دیا تو وہ کچھ دیر متاخر ہو گیا۔ اس حدیث کی سند حسن ہے اور مسند احمد میں جو روایت ہے کہ حضرت یوشع کے سوا اور کسی کے لیے سورج نہیں ٹھہرایا گیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء سابقین میں سے اور کسی کے لیے سورج نہیں ٹھہرایا گیا اور اس حدیث میں اس بات کی نفی نہیں ہے کہ حضرت یوشع کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے سورج ٹھہرایا گیا ہو اور امام طحاوی' امام طبرانی' امام حاکم' اور امام بیہقی نے حضرت اسماء بنت عمیس (رض) سے یہ روایت کیا ہے جب حضرت علی (رض) کے زانو پر سر رکھ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سو گئے اور حضرت علی کی نماز عصر فوت ہو گئی' تو سورج لوٹا دیا گیا حتی کہ حضرت علی (رض) نے نماز پڑھ لی' اور اس کے بعد سورج غروب ہو گیا اور یہ آپکا بہت عظیم معجزہ ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ ابن جوزی اور ابن تیمیہ نے اس حدیث کو موضوع قرار دینے میں خطا کی ہے۔ واللہ اعلم۔
البتہ قاضی عیاض نے جو یہ نقل کیا ہے کہ یوم خندق کو بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے سورج کو لوٹایا گیا تھا' حتی کہ آپ نے عصر کی نماز پڑھ لی تو اگر یہ ثابت ہو تو پھر یہ آپ کے لیے رد شمس کا تیسرا واقعہ ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۲۲۔ ۲۲۱' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور ۱۴۰۱ ھ)
علامہ بدر الدین عینی نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ابن جوزی کا رد کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ' ۴۳ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ ھ)
علامہ ابن الجوزی نے ابن عقدہ کی وجہ سے اس حدیث کو موضوع لکھا ہے کیونکہ وہ رافضی تھا اور صحابہ کو برا کہتا تھا۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ محض کسی راوی کے رافضی یا خارجی ہونے کی وجہ سے اس کی روایت کے موضوع ہونے کا یقین کر لینا صحیح نہیں ہے' جبکہ وہ اپنے دین کے لحاظ سے ثقہ ہو اور غالباً اسی وجہ سے امام طحاوی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اصل چیز راوی کی عدالت ہے۔ (شرح الشفاء علی ھامش نسیم الریاض' ج ۳ ص ۱۱' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)
خاتم الحفاظ حافظ سیوطی اور علامہ سخاوی نے کہا ہے کہ ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات کا اکثر حصہ مردود ہے' حتی کہ انھوں نے بکثرت احادیث صحیحہ کو بھی موضوعات میں درج کر دیا ہے۔ امام ابن الصلاح نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی

متعدد اسانید ہیں ' جو اس کی صحت اور صدق پر شاہد ہیں ' اور ان سے پہلے بکثرت ائمہ حدیث نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً امام طحاوی ' امام ابن شاھین اور امام ابن مندہ اور انھوں نے اس کو اپنی اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے ' اور امام طبرانی نے اس کو اپنی معجم میں روایت کیا ہے اور اس کو حسن قرار دیا ہے۔ (نسیم الریاض ' ج ۳ ' ص ۱۱ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

امام طبرانی نے اس حدیث کو کئی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حافظ ھیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے لکھا ہے امام طبرانی نے معجم اوسط میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورج کو ٹھہرنے کا حکم دیا ' تو وہ ایک ساعت ٹھہر گیا۔ (المعجم الاوسط ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۴۰۵۱) اس حدیث کی سند حسن ہے اور ایک حدیث کی سند صحیح ہے۔ وہ ابراہیم بن حسن سے مروی ہے اور وہ ثقہ راوی ہے۔ امام ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (ہم نے اس روایت کو درج کیا ہے) (المعجم الکبیر ' ج ۲۴ ' رقم الحدیث : ۳۹۰ ' مجمع الزوائد ' ج ۸ ' ص ۲۹۷۔ ۲۹۶ ' مطبوعہ الکتاب العربی ' بیروت ' ۱۴۰۲ھ)

امام احمد نے کہا اس حدیث کی کوئی اصل نہیں اور علامہ ابن الجوزی نے کہا یہ موضوع ہے ' لیکن ان کی خطا ہے۔ اسی وجہ سے حافظ سیوطی نے کہا اس حدیث کو امام ابن مندہ اور ابن شاھین نے حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے اور ان دونوں حدیثوں کی سند حسن ہے اور امام طحاوی اور قاضی عیاض نے کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی اور امام حاکم نے اور امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔ امام طحاوی نے کہا : احمد بن صالح کہتے تھے کہ جو شخص علم حاصل کرنا چاہتا ہو اس کو حضرت اسماء بنت عمیس (رض) کی اس حدیث کو نہیں چھوڑنا چاہیے ' کیونکہ وہ نبوت کی بہت بڑی علامت ہے۔ یہ حدیث متصل ہے اور اس کے تمام روای ثقہ ہیں اور ابن جوزی نے جو اس پر کلام کیا ہے ' اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ (کشف الخفاء ومزیل الالباس ' ج اص ۲۲۰ ' مطبوعہ مکتبہ الغزالی ' دمشق) (تبیان)

آیت مبارکہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

لغۃ القرآن: [وَاتْلُ : اور آپ بیان کریں][عَلَيْهِمْ : ان پر][نَبَاَ ؛ خبر][ابْنَيْ اٰدَمَ :: آدم کے دو بیٹے][بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ][اِذْ : جب][قَرَّبَا : دونوں نے پیش کی][قُرْبَانًا : قربانی][فَتُقُبِّلَ : تو قبول ہوئی][مِنْ : سے][اَحَدِهِمَا : دونوں کے ایک کی

][وَلَمْ :: اور نہ][يُتَقَبَّلْ : قبول ہوئی][مِنَ الْاٰخَرِ: سے دوسرا][قَالَ : کہا اس نے][لَاَقْتُلَنَّكَ: میں تجھے ضرور قتل کروں گا][قَالَ : کہا اس نے][اِنَّمَا : بیشک][يَتَقَبَّلُ : وہ قبول کرتا ہے][اللّٰهُ : اللہ][مِنَ : سے][الْمُتَّقِيْنَ : پرہیزگار (جمع)]

ترجمہ: (اے نبی مکرم ﷺ !) آپ ان لوگوں کو آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں (ہابیل و قابیل) کی خبر سنائیں جو بالکل سچی ہے۔ جب دونوں نے (االلہ کے حضور ایک ایک) قربانی پیش کی سوان میں سے ایک (ہابیل) کی قبول کرلی گئی اور دوسرے (قابیل) سے قبول نہ کی گئی تواس (قابیل) نے (ہابیل سے حسداً وانتقاماً) کہا: میں تجھے ضرور قتل کردوں گا،اس (ہابیل) نے (جواباً) کہا: بیشک اللہ پرہیزگاروں سے ہی (نیاز) قبول فرماتا ہے

تشریح: یہود اپنے حسد اور بغض کی وجہ سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جو ظالمانہ کارروائی کرتے تھے اور موقع بہ موقع آپ کو آزار پہنچانے کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے اور تورات کے ضمن میں انھوں نے آپ پر ایمان لانے کا جو عہد ومیثاق کیا تھا ٗاس کو توڑ چکے تھے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینے کے لیے اس سے پہلی آیتوں میں یہود کی عہد شکنیوں کو بیان فرمایا کہ یہود نے اللہ تعالیٰ سے عہد کرکے توڑ دیا ٗاور انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عہد کرکے اس کو توڑا۔ اب اللہ تعالیٰ ایک اور مثال بیان فرمارہا ہے کہ جس طرح یہود نے حسد کی وجہ سے آپ کی نبوت کو نہیں مانا ٗاور آپ کی مخالفت کی ٗاس طرح آدم کے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹے قابیل نے حسد کی وجہ سے ان کے دوسرے بیٹے ہابیل کو قتل کردیا۔ (تبیان)

ہابیل اور قابیل کا واقعہ

تاریخ کے علماء کا بیان ہے کہ حضرت حوا (علیہ السلام) کے ہر حمل میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے اور ایک حمل کے لڑکے کا دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ نکاح کیا جاتا تھا اور چونکہ انسان صرف حضرت آدم علیہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی اولاد میں مُنْحَصِر تھے تو آپس میں نکاح کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اسی دستور کے مطابق حضرت آدم (علیہ السلام) نے " قابیل " کا نکاح " لیودا " سے جو " ہابیل " کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اور ہابیل کا اقلیما سے جو قابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی کرنا چاہا۔ قابیل اس پر راضی نہ ہوا اور چونکہ اقلیما زیادہ خوبصورت تھی اس لیے اس کا طلبگار ہوا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے فرمایا " کیونکہ وہ تیرے ساتھ پیدا ہوئی ہے لہٰذا وہ تیری بہن ہے، اس کے ساتھ تیرا نکاح حلال نہیں۔ قابیل کہنے لگا " یہ تو آپ (علیہ السلام) کی رائے ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: اگر تم یہ سمجھتے ہو تو تم دونوں قربانیاں لاؤ، جس کی قربانی مقبول ہو جائے وہی اقلیما کا حقدار ہے۔ اس زمانہ میں جو قربانی مقبول ہوتی تھی آسمان سے ایک آگ اتر کر اس کو کھالیا کرتی تھی۔ قابیل نے ایک انبار گندم اور ہابیل نے ایک بکری قربانی کے لیے پیش کی۔ آسمانی آگ نے ہابیل کی قربانی کو لے لیا اور قابیل کی گندم کو چھوڑ دیا۔ اس پر قابیل کے دل میں بہت بغض و حسد پیدا ہوا اور جب حضرت آدم (علیہ السلام) حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو قابیل نے ہابیل سے کہا کہ " میں تجھے قتل کردوں گا۔ ہابیل نے کہا: کیوں؟ قابیل نے کہا: اس لیے کہ تیری قربانی مقبول

ہوئی اور میری قبول نہ ہوئی اور تو اقلیما کا مستحق ٹھہرا، اس میں میری ذلت ہے۔ ہابیل نے جواب دیا کہ "اللہ تعالیٰ صرف ڈرنے والوں کی قربانی قبول فرماتا ہے۔ ہابیل کے اس مقولہ کا یہ مطلب ہے کہ "قربانی کو قبول کرنا اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کام ہے وہ متقی لوگوں کی قربانی قبول فرماتا ہے، تو متقی ہوتا تو تیری قربانی قبول ہوتی، یہ خود تیرے افعال کا نتیجہ ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے ابتدا ہو حالانکہ میں تجھ سے قوی و توانا ہوں یہ صرف اس لیے کہ میں اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرتا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا یعنی میرے قتل کرنے کا گناہ اور تیرا گناہ یعنی جو اس سے پہلے تونے کیا کہ والد کی نافرمانی کی، حسد کیا اور خدائی فیصلہ کو نہ مانا یہ دونوں قسم کے گناہ تیرے اوپر ہی پڑ جائیں تو تو دوزخی ہو جائے۔ (صراط)

قابیل اور ہابیل کا واقعہ پڑھنے کا مقصد یہودیوں کو بتانا ہے کہ تمہارے اور قابیل کے کردار میں کوئی فرق نہیں جس طرح وہ اپنے بھائی پر ظلم کرنے کے بعد پچھتایا تھا۔ عنقریب تمہیں بھی اپنے کیے پر پچھتاوا ہوگا۔ کیونکہ تم بھی اپنے بعد والی امت پر ظلم کر رہے ہو۔

قربانی کا لفظ "قربان "بروزن "سلطان "سے نکلا ہے عربی محاورات میں قربان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے جیسا کہ امام ابو بکر جصاص مرحوم نے احکام القرآن میں نقل کیا۔ "والقربان مایقصد بہ القرب من رحمۃاللّٰہ تعالیٰ من اعمال البرّ ""قربان ہر اس نیک کام کو کہا جاتا ہے جس کا مقصد اللہ کی قربت حاصل کرنا ہو۔ "لیکن عرف عام میں دسویں ذوالحجہ کو بکرے، دنبے، گائے اونٹ ذبح کرنے کا نام قربانی ہے۔ واقعہ بیان کرنے سے پہلے اس کے متعلق گارنٹی دی گئی کہ واقعہ اور اس کے حقائق اتنے برحق ہیں کہ ان کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں یہ ہر لحاظ سے حق پر مبنی ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے جس طرح قابیل قتل کرنے کے بعد نادم اور پریشان ہوا تھا نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم کرنے والے بھی یقینی طور پر ندامت اور پریشانی کا سامنا کریں گے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخی واقعات کو من و عن اور بلا کم و کاست بیان کرنا چاہیے۔ جس میں نہ مبالغہ ہو اور نہ ہی کمی کی جائے۔

عَلَیْھِمْ ضمیر کا اشارہ یہود کی طرف ہے جس کا ذکر ان آیات کے سیاق و سباق سے واضح ہے مگر واقعہ میں جو نصیحت ہے وہ سب کے لیے ہے۔ یہود کو اس لیے مخاطب کیا کہ جس طرح آج تم اپنے سے بعد میں آنے والی امت محمدیہ جو کہ رشتہ انسانی کی ترتیب کے لحاظ سے تمہارے چھوٹے بھائی ہیں تم حسد و بغض کی وجہ سے ان کو ختم کرنے کے درپے ہو چکے ہو بالکل اسی طرح آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں میں صورت حال پیدا ہوئی کہ ایک نے دوسرے کی عزت اور شرف کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حسد و دشمنی میں بہت آگے نکل گیا نتیجتاً اللہ کی زمین پر قتل جیسا عظیم سانحہ پیش آیا اور سفاکانہ کردار رکھنے والے کو پچھتانا پڑا۔ (فہم)

فوائد

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ قربانی بڑی پرانی عبادت ہے کہ آدم (علیہ السلام) کے بیٹوں نے دی۔ دوسرے یہ کہ پچھلی امتوں میں قربانی کا گوشت کھانا جائز نہ تھا، ان کی مقبول قربانی کو قدرتی آگ جلا جاتی تھی اور مردود قربانی ویسے ہی پڑی رہتی تھی، قربانی کا گوشت کھانا ہماری امت کی خصوصیت ہے۔

مسائل

۱۔ ہر نیک کام اخلاص سے کرنا چاہیے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ متقین کے اعمال قبول کرتا ہے۔
۳۔ آدم (علیہ السلام) کے ایک بیٹے کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی مسترد کردی گئی۔
۴۔ نیکی قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

آیت مبارکہ:

لَئِنۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

لغۃ القرآن: [لَئِنْۢ: البتہ اگر][بَسَطْتَّ : تو بڑھائے گا][اِلَيَّ : میری طرف][يَدَكَ : اپنا ہاتھ][لِتَقْتُلَنِيْ : تاکہ تو مجھے قتل کرے][مَآ اَنَا : نہیں میں][بِبَاسِطٍ : بڑھانے والا][يَّدِيَ : اپنا ہاتھ][اِلَيْكَ : تیری طرف][لِاَقْتُلَكَ : کہ میں تجھے قتل کروں][اِنِّيْٓ: یقیناً میں][اَخَافُ ؛ ڈرتا ہوں][اللّٰهَ : اللہ][رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ : پالنے والا جہانوں کا]

ترجمہ: اگر تو اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لیے میری طرف بڑھائے گا (تو پھر بھی) میں اپنا ہاتھ تجھے قتل کرنے کے لیے تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کیونکہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے.

تشریح: قابیل کے چھوٹے بھائی ہابیل نے جب یقین کرلیا کہ قابیل مجھے قتل کرنے کا مصمّم ارادہ کرچکا ہے تو اس نے بڑے ادب سے کہا کہ اگر آپ مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں گے تو میں آپ کو قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ جس میں یہ احساس دلانا مقصود تھا کہ میں تجھ سے لڑنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا تجھے بھی مجھ پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔ پھر بھی تمہیں اس بات کا احساس نہیں تو یاد رکھنا تیرے گناہ کے ساتھ میرا گناہ بھی تیرے ذمہ ہوگا اس کا معنی یہ نہیں کہ انھوں نے اپنا دفاع نہیں کیا ہوگا بلکہ اپنی جان بچانا، عزت و مال کی حفاظت کرنا، ہر کسی کا فطری حق اور شرعی طور پر ایسا کرنا لازم ہے، ہابیل نے قابیل کو ظلم سے روکنے کے لیے پانچ باتیں کہی تھیں۔
۱۔ اللہ تعالیٰ متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تجھے مفاد کے بجائے اخلاص کے ساتھ قربانی پیش کرنا چاہیے تھی۔
۲۔ تیرے ہاتھ بڑھانے کے باوجود میں تیری طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔

۳۔ میں ظالم بننے کی بجائے مظلوم بننا پسند کروں گا۔
۴۔ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ جس کا معنیٰ یہ ہے کہ تجھے بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔
۵۔ اگر تو ظلم سے باز نہ آئے گا تو تیرا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

(عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ)

[رواہ الترمذی : کتاب الدیات، باب ما جاء فیمن قُتِلَ دُونَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیدٌ]

”حضرت سعید بن زید (رض) فرماتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، جو کوئی اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، جو کوئی اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔“

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ (رض) قَالَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ بِالدِّمَاءِ)

[رواہ البخاری : کتاب الرقاق، باب القِصَاصِ یَوْمَ القِیَامَۃِ]

”حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون کا فیصلہ کیا جائے گا (”فہم)

تو اگر تم میرے بھائی ہو کر بھی صرف اتنی بات پر کہ تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی اور میری قربانی قبول کرلی گئی اور تم میرے قتل کے درپے ہوگئے ہو تو دیکھو اگر تم مجھ پر دست درازی کرو گے ' تاکہ تم مجھے قتل کردو تو میں تمہیں قتل کرنے کے لیے تم پر دست درازی نہیں کروں گا۔ یعنی میں اس رشتے کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے اور تیرے درمیان ہے۔ ایک تو یہ کہ تم میرے بھائی ہو ' دوسرا یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک دین کا رشتہ ہے اور تیسری بات یہ کہ بغیر کسی وجہ کے کوئی انسان کسی انسان کو قتل نہیں کرسکتا۔ (روح)

امت محمدیہ کا پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کرکے دکھایا

یعنی میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ خدا سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کروں ایوب سختیانی فرماتے تھے کہ امت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کرکے دکھلایا حضرت عثمان بن عفان (رض) ہے (ابن کثیر) جنہوں نے اپنا گلا کٹوا دیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے بھی بلوائیوں سے مقابلے کی پوری طاقت و قوت رکھنے کے باوجود مقابلہ نہیں کیا اور شہید ہوگئے اس طرح ان سے حضرت ہابیل کی سنت ادا ہوگئی کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے انھوں نے بھی راہ عزیمت ہی کو پسند فرمایا۔۔ الحاصل۔۔ اس طرح کی شہادتیں خودکشی نہیں۔ حضرت ہابیل نے قضائے الٰہی اور رضائے خداوندی کے لیے سرنیاز خم کرکے فرمادیا کہ (میں تو ڈرتا ہوں اللہ کو جو پالنے والا ہے سارے جہان کا کہ کہیں وہ ہم سے ناراض نہ ہوجائے (اشرفی)

تفسیر روح القرآن میں یہ واقعہ بھی درج ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں کچھ مسلمانوں نے چند خوارج کو باتیں کرتے ہوئے سنا کہ وہ حضرت علی (رض) کے قتل کی قسمیں کھا رہے تھے کہ اگر ہمیں موقع ملا تو ہم انھیں قتل کرکے چھوڑیں گے۔ مسلمان انھیں پکڑ کر حضرت علی (رض) کی خدمت میں لے گئے اور بتلایا کہ یہ آپ کے قتل کا ارادہ کر رہے تھے 'اس لیے آپ انھیں قتل کروادیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں کس جرم میں انھیں قتل کروادوں؟ کیا انھوں نے واقعی مجھے قتل کردیا ہے؟ اندازہ فرمایئے کہ اس آیت میں بھی پہلی نسل انسانی کا ایک شخص کس قدر پر حکمت باتیں کہہ رہا ہے۔

امام احمد، ابو داؤد، ترمذی اور اس کو حسن نے بھی کہا ہے اور حاکم نے (اور اس کو صحیح بھی کہا ہے) سعد بن ابی وقاص (رض) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب فتنہ ہوگا بیٹھنے والا بہتر ہوگا کھڑے ہونے والے سے۔ اور کھڑا ہونے والا بہتر ہوگا چلنے والے سے اور چلنے والا بہتر ہوگا دوڑنے والے سے، پھر پوچھا آپ بتایئے اگر کوئی میرے گھر میں داخل ہوجائے اور میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے تاکہ مجھ کو قتل کردے۔ آپ نے فرمایا آدم کے بیٹے کی طرح ہوجاؤ۔ اور یہ آیت پڑھی لفظ آیت انی ارید ان تبوا باثمی واثمک

امام احمد مسلم اور حاکم نے ابوذر (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گدھے پر سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے بٹھایا پھر فرمایا اے ابوذر! تم بتاؤ اگر لوگوں کو بھوک پہنچ جائے اور تو اپنے بستر سے مسجد کی طرف اٹھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر تو کیسے کرے گا؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابوذر! پاک دامن رہ۔ پھر فرمایا بتاؤ اگر لوگوں کو شدید موت پہنچ جائے جس سے بندہ کا گھر قبر ہو۔ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے ابوذر صبر کرو، پھر فرمایا تم بتاؤ اگر لوگ بعض کو قتل کرنے لگیں یہاں تک کہ حجارۃ الزیت خون سے غرق ہوجائے تو پھر تو کیا کرے گا۔ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے پھر فرمایا اپنے گھر میں بیٹھ کر دروازہ بند کرلے میں نے کہا اگر مجھے پھر بھی نہ چھوڑا جائے؟ آپ نے فرمایا لفظ آیت فات من انق منھم فکن فیھم میں نے کہا میں اپنا ہتھیار لے لو؟ فرمایا تب بھی تو ان میں شریک ہوجائے گا ان کے اس کام میں جن میں وہ ہیں۔ لیکن اگر تو ڈرے اس بات سے کہ وہ تجھ تو خوف زدہ کریں گے تلوار کی چمک سے تو اپنے چہرہ پر اپنی چادر کے ایک کنارے کو ڈال لے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اور تیرے گناہ کا مستحق ہوجائے۔ اور وہ دوزخ والوں میں سے ہوجائے گا۔

امام بیہقی نے ابو موسیٰ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا توڑ دو اپنی تلواروں کو یعنی فتنہ میں۔ اور کاٹ دو اپنی کمان کی تانتوں کو اور گھروں کے اندر (بیٹھ جانے کو) لازم پکڑو اور اس میں آدم (علیہ السلام) کے بیٹوں میں سے خیر کی طرح ہوجاؤ۔ (در منثور)

جرائم اور ان کی سزائیں

دنیاکے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات کا نام دیا جاتا ہے جیسے تعزیرات پاکستان، خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہو، تعزیرات پاکستان، تعزیرات ہند، وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، وہ ہر قسم کے جرائم اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں، لیکن شریعت اسلام میں معاملہ ایسا نہیں، بلکہ جرائم کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئیں۔

حدود، قصاص، تعزیرات، ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک یہ بات جان لیناضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے، اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لیے ہر ایسے جرم میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے۔

لیکن بعض جرائم میں حق العبد کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور بعض میں حق اللہ کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، اور احکام میں مدارِ کار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے۔

دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے خاص خاص جرائم کے علاوہ باقی جرائم کی سزاؤں کے لیے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مکان اور ہر ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا انسداد جرم کے لیے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی اسلامی حکومت شرعی قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے اختیارات پر کوئی پابندی لگاوے اور جرائم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کر دے، جیسا کہ قرون متاخرہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت رائج ہے تعزیری جرائم کی تفصیلات کو بیان رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حکام وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا کو بطور حق اللہ متعین کرکے جاری کیا ہے ان کو حدود کہتے ہیں، اور جن کو بطور حق العبد جاری فرمایا ہے ان کو قصاص کہتے ہیں، اور جن جرائم کی سزا کا تعین نہیں فرمایا اس کو تعزیر کہتے ہیں، سزا کی ان تینوں قسموں کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جو لوگ اپنے عرف عام کی بناء پر ہر جرم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور شرعی اصطلاحات کے فرق پر نظر نہیں کرتے ان کو شرعی احکام میں بکثرت مغالطے پیش آئے ہیں۔

تعزیری سزائیں حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جاسکتی ہیں، سخت سے سخت بھی اور معاف بھی کی جاسکتی ہیں، ان میں حکام کے اختیارات وسیع ہیں، اور حدود میں کسی حکومت یا کسی حاکم و امیر کو ادنیٰ تغیر و تبدّل یا کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے، اور نہ زمان و مکان کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی امیر و حاکم کو اس کے معاف کرنے کا حق ہے،

شریعت اسلام میں حدود صرف پانچ ہیں، ڈاکہ، چوری، زنا، تہمت زنا کی سزائیں، یہ سزائیں قرآن کریم میں منصوص ہیں، پانچویں شراب خوری کی حد ہے، جو اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے، اس طرح کل پانچ جرائم کی سزائیں معین ہوگئیں، جن کو حدود کہا جاتا ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حاکم و امیر کم یا معاف نہیں کرسکتا، اسی طرح توبہ کرلینے سے بھی دنیوی سزا کے حق میں معاف نہیں ہوتی، ہاں آخرت کا گناہ مخلصانہ توبہ سے معاف ہو کر وہاں کا کھاتہ بیباق ہو جاتا ہے، ان میں سے صرف ڈاکو کی سزا میں ایک استثناء ہے کہ ڈاکو اگر فتاری سے قبل توبہ کرے اور معاملات سے اس کی توبہ پر اطمینان ہو جائے تو بھی یہ حد ساقط ہو جائے گی، گرفتاری کے بعد کی توبہ معتبر نہیں، اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے قبل ہو یا بعد میں، تمام تعزیری جرائم میں حق کے

موافق سفارشات سنی جاسکتی ہیں، حدود اللہ میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں، اور ان کا سننا بھی جائز نہیں، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں، اور ان کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے، کہ ان میں کسی کو کسی کمی بیشی کی کسی حال میں اجازت نہیں، نہ کوئی ان کو معاف کرسکتا ہے، جہاں سزا اور قانون کی سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو معتدل کرنے کے لیے تکمیل جرم اور تکمیل ثبوت جرم کے لیے شرطیں بھی نہایت کڑی رکھی گئی ہیں، ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے، بلکہ ادنیٰ سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے، اسلام کا مسلم قانون اس میں یہ ہے کہ الحدود تندرء بالشبھات یعنی حدود کو ادنیٰ شبہ سے ساقط کر دیا جاتا ہے۔

ایک اہم وضاحت

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جن صورتوں میں حد شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرات پیدا ہو، بلکہ حاکم اس کے مناسب حال اس کو تعزیری سزا دے گا اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں، جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسداد جرائم کا مکمل انتظام ہے، فرض کیجیے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے، اور گواہ عادل ثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہو سکتا، مگر ازروئے قانون شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی جاری نہیں ہو گی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دے دیجائے، بلکہ حاکم وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہو گی، یا چوری کے ثبوت کے لیے جو شرائط مقرر ہیں اس میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے اس پر حدّ شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہو سکتی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہو گیا، بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسب حال دی جائیں گی۔

قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن میں متعین ہے، کہ جان کے بدلہ میں جان لی جائے زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دی جائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت حق اللہ نافذ کیا گیا ہے، اگر صاحب حق انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہو گا، اور حد ساقط نہ ہو گی، مثلاً جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کر دے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہو گی، بخلاف قصاص کے کہ اس میں حق العبد کی حیثیت کو قرآن وسنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہو جانے کے بعد اس کو ولی مقتول کے حوالہ کر دیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے، اور اس کو قتل کرا دے، اور چاہے معاف کر دے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لیے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاء مقتول کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرات بڑھ جائے گی اور قتل کی واردات عام ہو جائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کر دیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لیے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کر سکتی ہے۔ (گلدستہ)

اپنا دفاع نہ کرنا

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ کا مقتول بندہ ہو جا قاتل بندہ نہ ہو۔ اخرجہ ابن سعد فی الطبقات من حدیث عبداللہ۔ ہماری شریعت میں بھی خود سپردگی اور عدم دفاع جائز ہے جیسا حضرت عثمان (رض) نے کیا ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) نے فرمایا میں محاصرہ خانہ کے زمانہ میں حضرت عثمان (رض) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں آپ کی مدد کرنے حاضر ہوا ہوں (آپ جس طرح حکم دیں مدد کر سکتا ہوں) فرمایا ابوہریرہ (رض) کیا تم کو یہ بات پسند ہوگی کہ تم سب لوگوں کو جن کے اندر میں بھی شامل ہوں قتل کر ڈالو میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو بس اگر ایک آدمی کو بھی قتل کروگے تو گویا سب کو قتل کر دیا۔

نکتہ: لئن بسطت کی جزا میں ہابیل نے، ماانا بباسط، ارادہ قتل کی بھی نفی کر دی اور ارادہ قتل کا جس عمل سے ظہور ہو سکتا تھا اس کا بھی انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قتل کے ارادے سے تیری طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ (تفسیر مظہری)

مسائل

۱۔ کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ ہر وقت اللہ رب العالمین سے ڈرنا چاہیے۔ ۳۔ ظالم کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۴۔ کسی پر زیادتی کرنے کی وجہ سے اس کے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

آیت مبارکہ:

اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۹﴾

لغۃ القرآن: [اِنِّیْ: یقیناً میں][اُرِیْدُ : چاہتا ہوں][اَنْ : یہ کہ][تَبُوْٓاَ : تو لوٹے][بِاِثْمِیْ : میرے گناہ کے ساتھ][وَاِثْمِكَ : اور اپنے گناہ][فَتَكُوْنَ : تو تو ہوجائے][مِنْ : سے][اَصْحٰبِ : والا][النَّارِ : آگ][وَذٰلِكَ : اور یہ][جَزٰٓؤُا : بدلہ ہے][الظّٰلِمِیْنَ : ظلم کرنے والے]

ترجمہ: میں چاہتا ہوں (کہ مجھ سے کوئی زیادتی نہ ہو اور) میرا گناہ (قتل) اور تیرا اپنا (سابقہ) گناہ (جس کے باعث تیری قربانی نامنظور ہوئی سب) تو ہی حاصل کرلے پھر تو اہل جہنم میں سے ہو جائے گا، اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔

تشریح: گزشتہ آیات میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کا قصہ شروع کیا گیا تھا اور بتلایا گیا تھا کہ جب ہابیل کی نذر مقبول ہو گئی اور قابیل کی نذر نامقبول رہی تو قابیل کو حسد ہوا اور اس نے ہابیل کے قتل کا خیال ظاہر کیا ہابیل نے برادرانہ نصیحت کے طور پر کہا کہ اگر تیری نذر قبول نہ ہوئی تو اسمیں میرا کیا قصور ہے جو تجھے میرے قتل کا خیال پیدا ہوا مزید براں ہابیل نے اپنی نیک نیتی اور خوف خدا کے باعث قابیل سے یہ بھی کہا کہ میں کوئی انتقامی کارروائی نہیں کروں گا، اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا تب بھی میں بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے لیے ہرگز نہیں بڑھاؤں گا، ہابیل کا یہاں تک کہنا گزشتہ آیہ میں بیان ہو چکا ہے۔

اب آگے ان آیات میں قصہ کا بقیہ حصہ بیان فرمایا گیا ہے قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا

اب آگے ان آیات میں قصہ کا بقیہ حصہ بیان فرمایا گیا ہے اور بتلایا جاتا ہے کہ ہابیل نے قابیل سے یہ بھی کہا کہ میں تو یوں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ کا کام نہ ہو گو تو مجھ پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے اگر تو میرے قتل سے باز نہ آیا تو قیامت کے دن تیری گردن پر تیرے گناہ کا بھی بوجھ ہوگا اور میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا اس لیے کہ قیامت کے دن مقتول مظلوم کی برائیاں اور گناہ ظالم قاتل پر ڈال دی جائیں گی اس طرح دونوں کا بوجھ تجھی کو اٹھانا پڑے گا کیونکہ خدا کے ہاں قاتل کی یہی سزا ہے کہ اس کے ذمہ اس کا گناہ بھی لکھا جائے اور اس کے مقتول کا بھی اور اس کو دوہری سزا دی جائے۔ ہابیل نے یہ سب اس لیے کہا کہ شاید قابیل یہ سن کر گناہ سے رک جائے اور قتل کے خیال سے باز آجائے مگر قابیل تو پہلے ہی قتل کا ارادہ کر چکا تھا بھائی کی برادرانہ نصیحت و موعظت کا کوئی اثر نہ ہوا اور اب جو یہ سنا کہ مدافعت اور انتقامی کارروائی بھی نہیں کرے گا تو بجائے اس کے کہ اس پر دل نرم ہو جاتا وہ اور بھی بے فکر ہو گیا اور اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر پوری طرح آمادہ کر دیا۔ اور بالآخر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے وہ بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔

بھائی کے قتل کا دینی و دنیاوی نقصان

اس قتل سے اس کو دین و دنیا کا بڑا خسارہ ہوا۔ دنیا کا نقصان تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوت بازو بنتا ہاتھ سے کھویا۔ والدین کی ناراضگی مول لی گھر والوں کی لعنت و ملامت ملی اور دنیا میں قیامت تک بدنام ہوا اور بقول بعض مفسرین کے اس کے بدن کا سیاہ پڑ جانا دل کا قابو میں نہ رہنا، مخبوط الحواس ہو جانا اور اسی بدحواسی اور پریشانی میں مر جانا یہ سب تو دنیا کا نقصان و بربادی اور آخرت کا یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اور ظلم قطع رحمی قتل عمد اور بدامنی کا دروازہ دنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستوجب ہوا۔ اور آئندہ بھی دنیا میں جتنے اس نوعیت کے گناہ کئے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اس کی شرکت رہے گی۔

ہابیل کی تدفین

اب چونکہ مظلوم ہابیل کے قتل سے پہلے دنیا میں کوئی انسان مرا نہ تھا اس لیے قتل کے بعد قابیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے جس سے یہ راز پوشیدہ رہے اور بعض روایات میں ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو عرصہ تک اس کے لاشہ کو پشت پر لادے پھرا کیونکہ یہ سب سے پہلی موت تھی جو روئے زمین پر واقع ہوئی اور اس وقت تک میت کے چھپانے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ بالاخر اللہ تعالی نے دو کوے بھیجے جو آپس میں لڑے اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا پھر قاتل کوے نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کر کرید کر اس میں ایک گڑھا بنایا اور مقتول کوے کو اس میں ڈال کر مٹی سے چھپایا۔ قابیل نے یہ تمام کیفیت دیکھی اور اس کوے سے دفن کا طریقہ سیکھا اور اپنی حالت پر سخت ندامت ہوئی کہ میں عقل و فہم میں اس جانور سے بھی گیا گزرا ہوا۔ ہائے میری شامت مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کوے ہی جیسا ہو جاتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔ الغرض اپنی اس بدحالی پر قابیل بڑا شرمندہ ہوا۔ مگر یہ جاننا چاہیے کہ یہ ندامت اور پشیمانی توبہ کی ندامت نہ تھی کیونکہ جو ندامت خدا کے خوف سے ہو وہ توبہ ہے اور جو ندامت و پشیمانی دنیا کی ذلت کے ڈر سے ہو اور ایک امر طبعی ہے اور وہ شرعی توبہ نہیں۔ ان آیات زیر تفسیر میں یہی مضمون بیان فرمایا گیا ہے۔

(درس قرآن محمد اسحاق)

ہابیل کے اس قول کی توجیہہ کہ میرا اور تیرا گناہ تیرے ذمہ لگے

احنف بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں اس شخص (حضرت علی) کی مدد کے لیے روانہ ہوا ' میری حضرت ابوبکرہ سے ملاقات ہوئی ' انھوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: میں اس شخص کی مدد کے لیے جارہا ہوں۔ انھوں نے کہا واپس جاؤ ' کیونکہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان تلواروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو قاتل ہے ' مقتول کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بھی تو اپنے حریف کے قتل پر حریص تھا۔ (صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۳۱)

گویا کہ ہابیل نے یہ ارادہ کیا کہ میں تمہارے قتل پر حریص نہیں ہوں۔ پس وہ گناہ جو میرے حریص ہونے کی صورت میں مجھے لاحق ہوتا ' میرا ارادہ ہے کہ وہ بھی تم کو لاحق ہو ' کیونکہ صرف تم میرے قتل پر حریص ہو۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ (رض) نے کہا ہم میں مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ پیسے ہوں اور نہ سامان ہو۔ آپ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں ' روزے اور زکوۃ لے کر آئے اور اس نے کسی کو گالی دی ہو ' کسی پر تہمت لگائی ہو اور کسی کا مال کھایا ہو اور کسی کا خون بہایا ہو ' اور کسی کو مارا ہو تو اس کو اس کی نیکیوں میں سے دیا جائے گا ' اور اگر ان کے حقوق پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو ان کے گناہ اس شخص پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : المسلسل ۲۵۸۱ ' رقم الحدیث : الکتاب ۵۹)

اس حدیث کے اعتبار سے ہابیل کے قول کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جب تم مجھے قتل کرو گے تو تمہاری نیکیاں مجھے مل جائیں گی ' اور پھر بھی حق پورا نہ ہوا تو میرے گناہ تم پر ڈال دیئے جائیں گے ' سو تم میرے اور اپنے گناہوں کے ساتھ لوٹو گے اور دوزخ میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ نیز قرآن مجید ہے :

(آیت) "ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم"۔ (العنکبوت : ۱۳)

ترجمہ : اور وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کو بھی ظلما قتل کیا جائے گا ' تو اس کے خون (کے گناہ) کا ایک حصہ پہلے ابن آدم پر ہوگا ' کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کو ایجاد کیا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۳۳۳۴ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۶۷۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۲۶۸۲ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۳۹۹۶ ' سنن ابن ماجہ ۲۶۱۶ ' مسند احمد ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۶۳۰ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : ۱۹۷۱۸ ' مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ۹ ص ۳۶۴ ' سنن کبری ' ج ۸ ' ص ۱۵)

ابوالحسن بن کیسان سے سوال کیا گیا ایک مسلمان یہ ارادہ کس طرح کرسکتا ہے کہ اس کا بھائی گناہ گار ہو اور دوزخ میں داخل ہوجائے۔ انھوں نے کہا کہ ہابیل نے یہ ارادہ اس وقت کیا تھا جب قابیل ان کی طرف قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پھر ان سے سوال کیا گیا ہابیل نے یہ کیسے کہا : میرے گناہ اور تمہارے گناہ ' جبکہ انھیں ظلما قتل کیا گیا تھا اور انھوں نے گناہ نہیں کیا تھا ؟ انھوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرے قتل کا گناہ اور تمہارا وہ گناہ جس کی وجہ سے تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی ' تم ان دونوں گناہوں کا بوجھ اٹھاؤ گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تم مجھ کو قتل کرنے کا گناہ اٹھاؤ گے اور مجھ پر زیادتی کرنے کا گناہ اٹھاؤ گے۔ (الجامع الاحکام القرآن ' ج ۳ ص ۹۳ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۱۵ ھ) (تبیان)

یا اللہ ان قرآنی واقعات سے ہم کو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی سعادت عطا فرما اور نفسانی و شیطانی حرکات جیسے
حسد، تکبر، ظلم و ستم بدعہدی، قتل ناحق وغیرہ کے کبیرہ گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

بار الہا ! ہمارے قلوب کو حسد وغیرہ اخلاق ذمیمہ سے پاک فرما نفس و شیطان کے مکر وفریب سے ہماری حفاظت فرما۔ اور ہر حال میں ہم کو اپنی اور اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت و فرمان برداری نصیب فرما یا اللہ اس وقت امت مسلمہ میں جو افتراق واختلاف اور حسد وعناد کی بیماری پھیل رہی ہے اس لعنت سے ہم کو نجات عطا فرما اور ہم کو ظاہر و باطنا شریعت مطہرہ کی پابندی ہر حال میں ہر آن عطا فرما۔ یا اللہ اس وقت امت مسلمہ میں جو ناحق قتل کی وبا پھیلی ہوئی ہے اسے اپنی رحمت سے دور فرمادے۔ اور ایک دوسرے کی جان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ یا اللہ ان قرآنی واقعات سے ہم کو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی سعادت عطا فرما اور نفسانی و شیطانی حرکات جیسے حسد، تکبر، ظلم و ستم، بدعہدی، قتل ناحق وغیرہ کے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

آیت مبارکہ:

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾

لغۃ القرآن: فَطَوَّعَتْ : پھر آمادہ کیا اسے][لَهٗ : اس کے لیے][نَفْسُهٗ : اس کا نفس][قَتْلَ : قتل کرنا][اَخِيْهِ : اپنے بھائی کو][فَقَتَلَهٗ : تو اس نے اسے قتل کردیا][فَاَصْبَحَ : پھر ہوگیا][مِنَ ؛ سے][الْخٰسِرِيْنَ : نقصان پانے والے]

ترجمہ: پھر اس (قابیل) کے نفس نے اس کے لیے اپنے بھائی (ہابیل) کا قتل آسان (اور مرغوب) کر دکھایا، سو اس نے اس کو قتل کر دیا، پس وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔

تشریح: طوع کا معنی ہے آسان بنا دینا (قرطبیؒ) سگے بھائی کا قتل کوئی آسان بات نہ تھی۔ جب قابیل کو اس کا پہلے خیال آیا ہو گا تو بھائی کی محبت، اس کی نیکی اور پاکیزگی، باپ کی ناراضگی اور اللہ کا غضب یہ سب چیزیں راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی ہوں گی۔ نہ معلوم قتل کرنے کی خواہش میں اور ان عوامل میں کتنی دیر کشمکش جاری رہی ہو گی۔ لیکن آخر حسد کا جذبہ غالب آگیا اور اس نے بھائی کے قتل کو عین مصلحت بنا کر پیش کیا۔ اور قابیل اس کو خوشی سے کرنے پر آمادہ ہو گیا پہلے جس کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ ہر مجرم جرم کرنے سے پہلے ایسی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر نیکی کی قوت غالب آ گئی تو جرم کرنے سے باز آگیا اور گناہ سے بچ گیا۔ اور اگر خدانخواستہ شر کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر حضرت انسان بایں غالب آ گئی تو جرم کرنے سے باز آگیا اور گناہ سے بچ گیا۔ اور اگر خدانخوستہ شر کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر حضرت انسان بایں جبہ و دستار بہمہ علم و فراست چاروں شانے چت زمین پر آ گرتا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ اس موقع پر شیطان زوردار قہقہ لگا کر نعرہ کرتا ہو مسجودِ ملائک زندہ باد! (ضیاء)

قابیل کے قتل کرنے کی کیفیت

ابن جریج نے بیان کیا کہ جس وقت ہابیل بکریاں چرا رہے تھے تو قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ قابیل ' ہابیل کے پاس گیا اور اس کو یہ سمجھ نہیں آ سکا کہ وہ اس کو کس طرح قتل کرے۔ اس نے ہابیل کی گردن مروڑی اور اس کے سر کے بالوں کو پکڑ لیا ' تب شیطان آیا ' اس نے کسی جانور یا پرندے کو پکڑا اس کا سر ایک پتھر پر رکھا ' پھر دوسرا پتھر اس کے سر پر دے مارا ' قابیل دیکھ رہا تھا ' اس نے بھی اسی طرح ہابیل کو قتل کر دیا۔

امام ابن جریر نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کردیا اور یہ خبر چاہیے جتنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتلایا ہے۔
(جامع البیان ٗجز ٦ص ٣١ٗ ۔ ٣٠ مطبوعہ دارالفکر بیروت ٗ ١٤١٥ھ)

ہر نیک اور بد کام کے ایجاد کرنے والوں کو بعد والوں کے عمل سے حصہ ملتا رہتا ہے

ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کو بھی ظلما قتل کیا جائے گا ٗ تو اس کے خون (کے گناہ) کا ایک حصہ پہلے ابن آدم پر ہوگا ٗ کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کو ایجاد کیا۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو شخص کسی برائی کا موجد ہو تو قیامت تک اس برائی کرنے والوں کے گناہ میں اس کا بھی حصہ ہوگا ٗ اسی طرح شیطان وہ پہلا شخص اور تکبر کرنے والوں کے گناہوں میں شیطان کا بھی حصہ ہوگا۔ اسی طرح جو شخص دین میں کسی بدعت سیہ کو نکالے ٗ جیسے رافضیوں نے صحابہ کو برا کہنے اور ماتم کرنے کو ایجاد کیا اور اس کو دین میں داخل کرلیا اور کار ثواب قرار دیا ٗ ان کا بھی یہی حال ہے اور جس نے اسلام میں کسی اچھے اور پسندیدہ طریقہ کی ابتداء کی تو قیامت تک اس نیک کام کرنے والوں کی نیکیوں میں اس کا حصہ ہوگا۔ جیسے حضرت عمر (رض) نے رمضان کی تمام راتوں میں باجماعت تراویح ابتداء کی اور اس میں قرآن مجید پڑھوانے کا اہتمام کیا۔ حضرت عثمان غنی (رض) نے جمعہ کے دن خطیب کے سامنے دی جانے والی اذان سے پہلے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے ایک اور اذان کا اضافہ کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مسجد میں محراب بنانے کی ابتداء کی۔ حجاج بن یوسف نے قرآن مجید پر اعراب لگائے۔ مروجہ محفل میلاد کی ابتداء اربل کے بادشاہ ابوسعید مظفر متوفی ٦٣٠ ھ نے کی ٗ اور اذانوں کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ وسلام پڑھنے کی ابتداء ٧٨١ ھ میں سلطان صلاح الدین ابوالمظفر یوسف بن ایوب کے امر سے ہوئی۔ اس سے پہلے ایک بادشاہ کے بھانجہ پر سلام پڑھا جاتا تھا۔ "السلام علی الامام الظاھر"۔ سلطان ابوالمظفر نے یہ سلسلہ موقوف کرایا ٗ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ وسلام پڑھنے کے طریقہ کو شروع کرایا۔ علامہ سخاوی ٗ علامہ ابن حجر مکی ٗ علامہ علاء الدین حصکفی ٗ علامہ طحطاوی اور شامی نے اس کو بدعت حسنہ قرار دیا۔ یہ تمام نیکی کے کام ہیں اور ہر نیکی ایجاد کرنے والوں کو قیامت تک کی جانے والی نیکیوں اور ہر برائی ایجاد کرنے والے قیامت تک کی جانے والی برائیوں میں سے اپنا اپنا حصہ ملتا رہے گا ٗ حدیث میں ہے

حضرت جریر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے اسلام میں نیک طریقہ ایجاد کیا اور اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کیا گیا ٗ اس کے لیے بھی اس پر عمل کرنے والوں کی مثل اجر لکھا جائے گا ٗ اور ان کے اجروں میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی ٗ اور جس نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو ایجاد کیا اور اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا ٗ اس کے لیے بھی اس پر عمل کرنے والوں کی مثل گناہ لکھا جائے گا اور ان کے گناہوں میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم ٗ ج ٤ ٗ رقم الحدیث : ٢٦٧٤ ٗ ٢٦٧٣ ٗ سنن ابوداؤد ٗ رقم الحدیث : ٣٦٠٩ ٗ سنن ترمذی ٗ رقم الحدیث : ٢٦٨٣ ٗ سنن ابن ماجہ ج ١ ٗ رقم الحدیث : ٢٠٧ ٗ موطا امام مالک ٗ رقم الحدیث : ٥٠٧ ٗ مسند احمد ٗ ج ١٤ ٗ رقم الحدیث : ١٩٠٥٧ ٗ ج ٩ ” رقم الحدیث : ١٠٥٠٤ ٗ بتحقیق احمد شاکر ٗ سنن دارمی ٗ ج ١ ٗ رقم الحدیث : ٥١٣ ٗ)

حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو یہ نصیحت کی مجھے تم پر جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے ٗ وہ گمراہ کرنے والے ائمہ ہیں۔ (مسند احمد ٗ ص ٤١١ ٗ طبع قدیم ٗ بیروت ٗ علامہ احمد شاکر نے کہا ٗ اس حدیث کی سند صحیح ہے ٗ مسند احمد ٗ بتحقیق احمد شاکر ٗ ج ١٨ ٗ رقم الحدیث : ٢٧٣٥٨ ٗ مطبوعہ دارالحدیث ٗ قاہرہ)

تاہم ہر برائی کی ابتداء کرنے والے کو بعد کے عمل کرنے والوں کی مثل گناہ اس وقت ہوگا جب وہ اس گناہ سے توبہ نہ کرے ' اور اگر وہ اس گناہ اس گناہ سے توبہ کرلے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) پر یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود انسانوں میں سے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی 'کیونکہ قرآن مجید نے خود شہادت دی ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) بھول گئے تھے۔ "(آیت) "فنسی ولم نجدلہ عزما " (طہ : ۱۱۵) "سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کی نافرمانی کا قصد نہیں پایا اس کے باوجود حضرت آدم (علیہ السلام) نے توبہ کرلی تھی اور بھولنے والے اور توبہ کرنے والے سے مواخذہ نہیں ہوتا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) سب سے پہلے توبہ کرنے والے ہیں اور بعد کے تائبین کے عمل سے ان کو حصہ ملتا رہے گا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسد بہت سنگین نفسانی مرض ہے۔اس حسد کی وجہ سے قابیل نے ہابیل کے ساتھ خونی رشتہ کا لحاظ نہیں کی اور اپنے سگے بھائی کو قتل کردیا۔ (تبیان)

ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے حاصل ہونے والے اسباق

یہ واقعہ بہت سی عبرتوں اور نصیحتوں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک یہ کہ انسان نے جو سب سے پہلے جرائم کئے ان میں ایک قتل تھا، اور دوسری یہ ہے کہ حسد بڑی بری چیز ہے، حسد ہی نے شیطان کو برباد کیا اور حسد ہی نے دنیا میں قابیل کو تباہ کیا۔

حسد، قتل اور حسن پرستی کی مذمت

اس واقعے سے تین چیزوں کی مذمت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

(1)-- حسد۔ حضرت زبیر (رض) سے روایت ہے، سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "تم میں پچھلی امتوں کی بیماری سرایت کر گئی، حسد اور بغض۔ یہ مونڈ دینے والی ہے، میں نہیں کہتا کہ بال مونڈتی ہے لیکن یہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔ (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، ۵۶۔ باب، ۲۲۸/۴، الحدیث : ۲۵۱۸)

(2)-- قتل۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں کہ "ناحق حرام خون بہانا ہلاکت کرنے والے اُن اُمور میں سے ہے جن سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔

(بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ : ومن یقتل مومناً۔۔الخ، ۳۵۶/۴، الحدیث : ۶۸۶۳)

(3)-- حسن پرستی۔ حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "عورت کے محاسن کی طرف نظر کرنا ابلیس کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

(نوادر الاصول، الاصل الرابع والثلاثون، ۱/۱۷۴، الحدیث : ۲۱۳) (صراط)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نفس انسانی کی تین حالتیں بیان کی ہیں۔ بعض نے نفس کی سات اقسام ہیں جنکے نام درج ذیل ہیں :

1۔ نفس امارہ

2۔ نفس لوامہ

3۔ نفس ملھمہ

4۔ نفس مطمئنہ

5۔ نفس راضیہ

6۔ نفس مرضیہ

7۔ نفس کاملہ

نفس امارہ پہلا نفس ہے یہ سب سے زیادہ گناہوں کی طرف مائل کرنے والا اور دنیاوی رغبتوں کی جانب کھینچ لے جانے والا ہے۔ ریاضت اور مجاہدہ سے اس کی برائی کے غلبہ کو کم کرکے جب انسان نفس امارہ کے دائرہ سے نکل آتا ہے تو لوامہ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو باطنی طور پر ہدایت کا باعث بنتا ہے جب نفس لوامہ کا حامل انسان کسی گناہ یا زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا نفس اسے فوری طور پر سخت ملامت کرنے لگتا ہے اسی وجہ سے اسے لوامہ یعنی سخت ملامت کرنے والا کہتے ہیں۔ سورۃ یوسف میں اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف ۵۳) بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس نفس کی قسم کھائی ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِO

”اور میں نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں۔“

القیامۃ، 75 :2

تیسرا نفس نفس ملھمہ ہے۔ جب بندہ ملھمہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس کے داخلی نور کے فیض سے دل اور طبعیت میں نیکی اور تقوی کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے چوتھا نفس مطمئنہ ہے جو بری خصلتوں سے بالکل پاک اور صاف ہو جاتا ہے اور حالت سکون و اطمینان میں آ جاتا ہے۔

یہ نفس بارگاہ الوہیت میں اسقدر محبوب ہے کہ حکم ہوتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُO ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ.

”اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔“

الفجر، 89 :27،28

یہ نفس مطمئنہ اولیاء اللہ کا نفس ہے یہی ولایت صغریٰ کا مقام ہے۔ اس کے بعد نفس راضیہ، مرضیہ اور کاملہ یہ سب ہی نفس مطمئنہ کی اعلیٰ حالتیں اور صفتیں ہیں اس مقام پر بندہ ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتا ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًO

”اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہو۔‘

الفجر، 89 :28

(منہاج الفتاوہ)

بعض نے اسکی پانچ قسمیں بتائی ہیں لیکن مفسرین کے مطابق چونکہ لفظ نفس کے ساتھ تین کا ہی تذکرہ ہے لہٰذا اسکی اقسام تین ہوئیں باقی انہی کی حالتیں ہیں۔

ا۔ نفس مطمئنہ۔ ہر حال میں مطمئن یعنی نیکی پر قائم رہنے والا نفس۔ (الفجر : ۲۷)

۲۔ نفس لوّامہ۔گناہ پر ملامت کرنے والا نفس (القیامۃ : ۲)

۳۔ نفس امّارہ۔گناہ پر ابھارنے والا نفس (یوسف : ۵۳)

یہ انسان کے دل کی تین حالتیں ہیں نفس مطمئنہ صرف انبیاء کو نصیب ہوتا ہے باقی انسانوں کے نفس کی دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔ (ا) نفس امارہ اور نفس لوامہ۔ ان کے درمیان مقابلہ رہتا ہے اگر نفس لوامہ جیت جائے تو انسان کو نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے۔ جب نفس امارہ غالب آجائے تو آدمی برائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ "فطوعت لہ نفسہ" سے یہی کشمکش مراد ہے۔ چنانچہ قابیل نے وہی کیا جس کا وہ اعلان کر چکا تھا۔ قتل کرنے کے بعد اس کے دل کا سکون جاتا رہا۔ رہتی دنیا تک بدنامی اس کے مقدر میں آئی، ظلم و زیادتی کی بری روایت قائم کی۔ آخرت میں جہنم کا ایندھن اور ظالموں کا ساتھی بنا۔ اس سے زیادہ اور نقصان کیا ہو سکتا ہے اور جب بھی کوئی شخص ظلم کرتا ہے اسے ایسی ہی کیفیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ نیکی میں اطمینان اور برائی میں پریشانی و پشیمانی ہوا کرتی ہے۔

(عَنْ عَبْدِاللّٰهِ(رض) قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی الله علیه وآله وسلم) لَيْسَ مِنْ نَفْسٍ تُقْتَلُ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْهَا وَرُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ مِنْ دَمِهَا لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ أَوَّلًا) [رواہ البخاری : کتاب الاعتصام بالکتاب و السنه، بَاب إِثْمِ مَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ أَوْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً]

"حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آدم (علیہ السلام) کے پہلے بیٹے پر ہر ظلم کے ساتھ قتل کیے جانے والے کے گناہ کا حصہ ہے اور شاید سفیان نے خون کا لفظ بولا ہے کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کرنے کی بنیاد رکھی۔"

حسد ایک شدید ترین جذبہ ہے :

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ

(بالآخر اسے اس کے نفس نے آمادہ کر ہی لیا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس انتہائی اقدام پر آسانی سے تیار نہیں ہو گیا 'بلکہ اسے ایک بڑی کشمکش سے گزرنا پڑا کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ اللہ نے انسان میں دو طرح کے داعیات رکھے ہیں۔ ایک اس کو نیکی کی طرف بلاتا ہے اور دوسرا اس کو برائی کی دعوت دیتا ہے اور جب آدمی اس برائی کی دعوت کو قبول کرنے لگتا ہے اور کسی برے فعل کے ارتکاب کے لیے اقدام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا خیر کا جذبہ اسے اس سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہم نفس لوامہ یا ضمیر کہتے ہیں۔ جسے قدرت نے ایک چوکیدار کی طرح انسان کے اندر بٹھا دیا ہے۔ اگر کبھی اس کی عقل خواہشات نفس سے مغلوب ہو کر یا مفادات کی اسیر ہو کر اسے برائی پر آمادہ کرتی ہے تو ضمیر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اس فعل کے ارتکاب سے روکے۔ چنانچہ ہم اپنے تجربات سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ایک ملازم آدمی پہلے پہل رشوت لینے کا ارادہ کرتا ہے تو نجانے اسے کتنی دفعہ اپنے ارادے کو توڑنا پڑتا ہے۔ آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اس سے باز آجاتا ہے یا اسے کر گزرتا ہے۔ پہلی دفعہ گناہ ہمیشہ ایسے ہی مراحل سے گزرتا ہے اور جب بار بار آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر نفس لوامہ خاموش ہو جاتا ہے 'کیونکہ انسان کو جس آزمائش میں ڈالا گیا ہے 'اس میں جس طرح اس کے لیے نیکی کے مراحل آسان کیے گئے ہیں 'اسی طرح برائی کے ارتکاب سے بھی اسے جبراً نہیں روکا

جاتا ٗصرف نفس لوامہ اور ضمیر سے اسے رکنے کے اشارے ملتے ہیں اور جب وہ ان اشاروں کی پرواہ نہیں کرتا تو پھر اس کا راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہابیل نے نجانے کتنے دن اس کشمکش میں گزارے آخر وہ ایک پیغمبر کا بیٹا تھا اپنے اندر خیر کے جذبات بھی رکھتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے حسد کا جذبہ اتنا شدید ہے جو گھر کی تربیت ٗآغوش مادر کے اثرات ٗ باپ کی نصیحتیں ٗہر چیز کو مٹا کے رکھ دیتا ہے۔اس سے بنی اسرائیل کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ یہی حسد کا جذبہ ہے ٗجس نے تمہیں ہر طرح کے خیر کے جذبات سے عاری کردیا ہے۔ تم اپنی کتابوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نشانیاں دیکھتے ہو۔ بجائے ان سے اثر لینے کے تمہارے حسد کے جذبے میں اضافہ ہوتا ہے۔اس لیے تمہیں قابیل کے انجام کو دیکھتے ہوئے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں تم بھی اس کی طرح اپنی تخریبی کاروائیوں کے نتیجے میں نامراد ہو کر نہ رہ جاؤ۔ قابیل اپنے اس جذبہ حسد پر قابو نہ پاسکا بالآخر اپنے بھائی کو قتل کردیا اور نامرادوں میں سے ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے ٗدنیا میں دو ہی قافلے ہیں۔ایک بامراد لوگوں کا قافلہ ہے ٗجو نیکی کی دعوت کو سمجھتا ہے ٗاللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتا ہے اور بالآخر فوز وفلاح سے بہرہ ور ہوجاتا ہے اور دوسرا ایسے نامرادوں کا قافلہ ہے کہ جب وہ اندھوں کی طرح برائی کی راہوں پر بڑھتا چلا جاتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ ہم پھر ان پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں ٗجو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔

قصہ ہابیل و قابیل سے کیا سبق ملتا ہے

تمام اعمال صالح کی قبولیت کی بنیاد "تقویٰ" ہے

جب ہم اس پورے واقعہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں چند چیزیں نہایت واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں بات تقویٰ ہے۔ ہابیل اپنے بھائی قابیل کو اس نہایت اہم حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ دیکھو ! اللہ کے یہاں اعمال بھی اور دعائیں بھی صرف تقویٰ کے طفیل قبول ہوتی ہیں۔ یہی تمام عبادات کا حاصل ہے ٗیہی بندگی کی روح اور یہی ہر مذہب کی جان ہے۔ تم اگر اپنے اندر تقویٰ یعنی اللہ کا خوف ٗنیکی کی طرف میلان ٗخوشنودیٔ رب کی تڑپ اور برائی کے انتہادرجے کا تنفر پیدا کرلو تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب آگیا ہے۔ یہی بات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک سے زیادہ مواقع پر ارشاد فرمائی اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمیشہ اس کو حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ ایک صحابی (رض) کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ آخری لمحوں میں نہایت رقت کا شکار تھے۔ کسی نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اللہ نے آپ کو عظیم اعمال خیر کی سعادت بخشی ہے۔ سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ آپ جہاد میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو اللہ کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے ٗایسی دل گرفتگی کی کیا وجہ ہے ؟ فرمانے لگے تم نے نہیں سنا :

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ

(اللہ صرف متقین سے اعمال قبول کرتا ہے)

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم نے جیسے کچھ اعمال کیے ہیں ٗاس میں تقویٰ کہاں تک شامل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) ہمیشہ لوگوں کو تقویٰ کی نصیحت فرماتے اور بار بار اس پر توجہ دلاتے تھے کہ "لوگو ! تقویٰ کی دعوت دینے والے تو بہت ہیں ٗلیکن تقویٰ پر عمل کرنے والے تھوڑے ہیں "۔ ہم اپنی عملی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ قدم قدم پر خواہشات کا ہجوم ہوتا ہے ٗ مفادات کی ہوس اکساتی ہے ٗحرام ذرائع سے دنوں

میں دولت مند ہو جانے کی خواہش بار بار راہ سے ہٹاتی ہے ایسے تمام مواقع پر اگر کوئی چیز آدمی کو راہ راست پر رکھتی ہے تو وہ صرف تقویٰ یعنی اللہ کا خوف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف ہابیل اپنے بھائی کو متوجہ کر رہا ہے بلکہ انسانی اقدار کی تاریخ کے اوراق پر تقویٰ و خشیت کا اولین سبق لکھ رہا ہے۔

دوسری چیز جو ہابیل کے کردار سے بہت نمایاں ہے وہ اس کا رویہ ہے۔ جس سے تقویٰ چھن چھن کر نکل رہا ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے بھائی کو آخر حد تک اس گناہ سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دی۔ حتیٰ کہ اس راستے میں جان دے کر آنے والی نسلوں کو بتا رہا ہے کہ میں یہ رویہ اس لیے اختیار کر رہا ہوں کہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہی باتیں پوری انسانی زندگی کو بدلنے کی ضامن ہیں اور اللہ کے اس عظیم بندے نے تاریخ کے پہلے ورق کے طور پر نوع انسانی کو یہ ہدیہ کی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ چند سطروں میں قرآن کریم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے وہ پہلو جو نصیحت اور عبرت کے لیے ضروری تھے 'اس نے ان کو ذکر کر دیا اور غیر متعلقہ باتوں کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس ہم توراۃ کو دیکھتے ہیں تو اس میں واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کسی نصیحت اور کسی عبرت پر زور دینا تو دور کی بات ہے 'سرسری طور پر بھی کسی نصیحت یا عبرت کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ توراۃ میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

لغۃ القرآن: [فَبَعَثَ :[تو بھیجا][اللّٰهُ : اللہ نے][غُرَابًا : ایک کوا][يَّبْحَثُ : وہ کریدتا تھا][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][لِيُرِيَهٗ : تاکہ وہ اسے دکھائے][كَيْفَ : کس طرح][يُوَارِيْ : وہ چھپائے][سَوْءَةَ : لاش][اَخِيْهِ: اپنے بھائی کی][قَالَ : کہا اس نے][يٰوَيْلَتٰى: ہائے افسوس !][اَعَجَزْتُ : میں عاجز ہوں][اَنْ : کہ][اَكُوْنَ : میں ہوں][مِثْلَ : جیسا][هٰذَا الْغُرَابِ : یہ کوا][فَاُوَارِيَ : کہ میں چھپا دیتا][سَوْءَةَ : لاش][اَخِيْ : میرا بھائی][فَاَصْبَحَ : تو وہ ہوگیا][مِنَ : سے][النّٰدِمِيْنَ : نادم ہونے والے]

ترجمہ:

پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے، (یہ دیکھ کر) اس نے کہا: ہائے افسوس! کیا میں اس کوے کی مانند بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا، سو وہ پشیمان ہونے والوں میں سے ہو گیا

تشریح:

قابیل کا انجام

ضحاک بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا قابیل ہابیل کو ایک جراب (چرمی تھیلا) میں ڈال کر ایک سال تک اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا 'اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لاش سے کس طرح گلو خلاصی حلاصی حاصل کرتے 'حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کرید رہا تھا 'پھر اس نے زمین میں اس مردہ کوے کو دفن کر دیا۔ تب اس نے کہا ہائے افسوس! میں اس کوے جیسا بھی نہیں ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔ پس وہ پچھتانے والوں میں سے ہو گیا۔ (جامع البیان 'جز ٦ ص ٢٦٨ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت '١٤١٥ھ)

قابیل کا پچھتانا اس کی توبہ نہیں تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اس پر افسوس کر رہا تھا کہ اس کے دفن کرنے کے طریقہ کو نہیں جان سکا تھا 'اس کے قتل کرنے پر افسوس نہیں کیا تھا 'حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اگر وہ اس کے قتل پر نادم ہوتا تو یہ ندامت توبہ ہو جاتی 'وہ اس وجہ سے نادم تھا کہ اس قتل سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا 'ماں باپ 'بہن اور بھائی ناراض ہوئے اور مقصود حاصل نہ ہوا 'یا اس وجہ سے کہ ایک سال تک بھائی کی لاش دفن نہ ہو سکی۔ (تبیان)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی ندامت کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ماں باپ اس سے بے زار ہو گئے تھے اور اس کا سارا بدن سیاہ ہو گیا تھا اور ایک آواز سنی کہ کوئی کہتا ہے کہ، کن خائفا ابدا، یعنی ہمیشہ خائف رہ، پھر یہ حال ہو گیا کہ قابیل جس کو دیکھتا تھا ڈر جاتا تھا کہ کہیں یہ مجھے قتل نہ کر دے، اور آخر اپنے ہی ایک اندھے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ قابیل کی ندامت اس کی اپنی پریشانی کم فہمی اور اپنے رسوا کن حالات کی وجہ سے تھی۔۔ الغرض۔۔ اس کی یہ ندامت گناہ کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ کے خوف سے نہیں تھی اور چونکہ یہ ندامت توبہ کے طور پر نہ تھی اس لیے اس کی ندامت نے اسے کوئی فائدہ نہیں دیا۔ قابیل وہابیل کے قصے سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

١)۔۔ قتل کے فعل میں اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانی اور اس کی ناراضگی ہے۔

٢)۔۔ قتل کرنے والا دوزخی ہے نقصان اٹھانے والا ہے اور پچھتانے والا ہے۔

۔۔ تو چونکہ قتل کرنا ان خرابیوں کا سبب ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر قتل میں قصاص یعنی بدلہ لینے کو واجب کر دیا تاکہ لوگ کسی کو ناحق قتل کرنے سے باز رہیں یہی وہ اصل مقصد تھا جس کو بیان کرنے سے پہلے ہابیل و قابیل کا قصہ بطور تمہید ذکر کر دیا گیا اور اس کو علت قرار دیا گیا حکم قصاص کی۔ (اشرفی)

روایت ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حواء (علیہ السلام) ہابیل کی قبر پر گئے اور کئی دن تک روتے رہے ' پھر قابیل ایک پہاڑ کی چوٹی پر گیا ' وہاں ایک بیل نے اس کو سینگھ مار کر نیچے گرا دیا اور وہ مر گیا۔ ایک روایت یہ ہے حضرت آدم (علیہ السلام) نے اس کے خلاف دعا کی ' تو وہ زمین میں دھنس گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ہابیل کو قتل کرنے کے بعد جنگلوں میں چلا گیا ' وہ کسی جانور کو بلندی سے زمین پر گرا دیتا اور اس کے مرنے کے بعد اس کو کھالیتا ' چوٹ کھانے سے مرا ہوا جانور اس دن سے حرام کر دیا گیا۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا بنو آدم (علیہ السلام) میں سے سب سے پہلے جہنم میں جانے والا قابیل ہے۔ اس ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو آدم میں جو شخص سب سے پہلے فوت ہوا ' وہ ہابیل تھا۔ اسی وجہ سے قابیل اس کے دفن کرنے کے طریقہ کو نہیں جان سکا۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۷ ۹ مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ' ۱۴۱۵ ھ)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حسد سب سے بڑی خرابی اور بہت بڑا جرم ہے۔ قابیل نے اس حسد کی آگ کی وجہ سے اپنے سگے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ (آیت ۲۹) میں ہے۔ ' ہابیل نے قابیل سے کہا اور تو جہنمیوں سے ہو جائے اور یہ ظالموں کی سزا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قابیل معذب ہوگا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ظالم تھا کافر نہیں تھا۔ آیت ۲۸۔ ۲۷ میں ' ہابیل نے قابیل کو قتل کرنے سے باز رہنے کے تین محرکات بیان کیے۔ اول : یہ کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں ' ثانی : یہ کہ قتل کرنے سے پہلے اور قتل کے گناہ قابیل کے ذمہ لگیں اور وہ دوزخ کا سزاوار ہو ' اور ثالث : یہ کہ وہ ظلم کرنا نہیں چاہتے۔ سو جو شخص بھی کسی گناہ سے باز رہنا چاہے ' اس کو گناہ سے باز رکھنے کے یہی تین محرکات ہوں گے۔ خوف خدا ' دوزخ کی سزا اور ارتکاب ظلم سے بچنا۔ (تبیان)

کوے کے اس عمل نے قابیل کے سامنے ایک طریقہ واضح کیا کہ تم اگر اس لاش کو ٹھکانے لگانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم زمین کو کھودو ' اس میں گڑھا بنا کر ' اس میں لاش کو رکھ کر اوپر مٹی ڈال دو۔ اس طرح لاش انسانی نگاہوں سے چھپ بھی جائے گی اور ٹھکانے بھی لگ جائے گی۔ اس سے ایک عجیب بات ذہن میں آتی ہے کہ پروردگار نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں تاکہ انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ لیکن انسان کی فطرت عجیب واقع ہوئی ہے یہ اللہ کے نبیوں کی راہنمائی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پھر نتیجتاً کوے کی راہنمائی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی راہنمائی کو قبول نہیں کرتے ' وہ ہر گری پڑی راہنمائی کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ انسان کا ایسا حیرت انگیز رویہ ہے جس کی تاویل کرنا مشکل ہے کہ وہ انکار کرنے پر آتا ہے تو اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے اور جب جھکنے پہ آتا ہے تو پتھروں کے سامنے جھک جاتا ہے۔ یعنی خالق کائنات سے سرتابی اور سرکشی اور بتوں کے سامنے بندگی اور عبادت۔ اگر واقعی یہی انسان کی کہانی ہے تو پھر پیغمبروں کی راہنمائی سے انحراف کرکے آخر انسان اپنی منزل کو کیسے پا سکتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے آخری لفظ سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ انسان وقتی طور پر خواہشات نفس کا اسیر ہو کر بعض دفعہ ایسا کام کر گزرتا ہے جسے کرنے پر اسے بے حد اصرار ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ کام اس کی فطرت کی آواز نہیں ہوتا اور نہ عقل و شعور اسے تسلیم کرتے ہیں۔ خواہشات کا غلبہ ایسی شدید چیز ہے کہ وہ وقتی طور پر انسان سے اپنی اطاعت کروالیتا ہے۔ جب یہ غلبہ اپنا اثر کھونے لگتا ہے یا جب

آدمی وہ عمل کر گزرتا ہے تو پھر اسے اس پر ندامت ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ندامت اصلًا اس کی انسانیت کا دوسرا نام ہے اور اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس لیے جب بھی کسی کو اس راستے پر چلنے اور انسانوں کو راہنمائی دینے کا موقع میسر آئے تو اسے لوگوں کی معصیت میں ڈوبی ہوئی زندگی کو دیکھ کر کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسے کام جاری رکھنا چاہیے اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے 'جب یہ معصیت کا بحران اپنی عمر گزار کے ٹلے اور ندامت کا مرحلہ آئے تو یہ ٹھیک وہ وقت ہوگا جب بگڑے ہوئے انسانوں کو دوبارہ ان کی منزل کی طرف لایا جاسکتا ہے۔

ہابیل اور قابیل کے اس واقعہ نے اگرچہ ہمارے سامنے بہت ساری حکمتیں اور عبرتیں نمایاں کی ہیں لیکن ان میں جو بالکل ایک سامنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کی یہ سرشت ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر دو طرح کے جذبات رکھتا ہے اور انہی حوالوں سے دو انسانی رویے وجود میں آتے ہیں۔ ایک ہے خدا ترسی اور حق و عدل پر قائم رہنے کا رویہ اور دوسرا ہے سنگدلی اور دوسروں کے خون بہانے کا رویہ۔ ہابیل اور قابیل انہی دونوں رویوں کے نمائندہ ہیں اور آج تک سبھی انسان انہی دونوں رویوں کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے صحیح رویے کی حفاظت اور غلط رویے کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ وحی الٰہی کی راہنمائی ظہور میں آتی جس میں صحیح رویے پر جزا اور انعام کا ذکر ہوتا اور غلط رویے پر گرفت ہوتی۔ (روح)

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے قتل اور فوت ہونے والا شخص ہابیل تھا اس لیے قابیل کو معلوم نہ تھا کہ میت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اس بات کے ساتھ اس کا دوسرا مفہوم بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جو واقعہ کے ساتھ گہری نسبت رکھتا ہے جب قاتل کسی شخص کو قتل کرتا ہے تو وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے لاش کو آگے پیچھے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ممکن ہے قابیل اسی کشمکش میں مبتلا ہو گھبراہٹ اور بے قراری کے عالم میں اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔ کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگائے جس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے یہ کام کروایا۔ ایک کوّے نے دوسرے کوّے کو مار کر اس کی لاش زمین میں دفن کی جب قابیل نے یہ نقشہ دیکھا تو سخت پریشانی کے عالم میں پکار اٹھا ہائے افسوس میں تو کوّے سے بھی کم تر ثابت ہوا۔ بعد ازاں اس نے اپنے بھائی کو زمین میں دفن کیا اسی وقت سے لے کر فطری اور شرعی طریقہ یہی ہے۔ جلانے کی بجائے میّت کو عزت و احترام کے ساتھ دفنانا چاہیے۔ اسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ نہ صرف میت کو دفنانے کا حکم دیتا ہے بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اچھی طرح غسل دینے کے بعد صاف اور اجلا سفید رنگ کا کفن پہنا کر خوشبو لگائی جائے اور نہایت اخلاص کے ساتھ نماز جنازہ پڑھ کر، دفنانے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا کی جائے اور میّت کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ)

[رواہ مسلم: کتاب الوصیہ، بَاب مَا يَلْحَقُ الْإِنْسَانَ مِنَ الثَّوَابِ بَعْدَ وَفَاتِهِ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع کر دیے جاتے ہیں مگر صرف تین ذرائع سے اسے اجر ملتا رہتا ہے۔ (۱) صدقہ جاریہ۔ (۲) ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ (۳) نیک اولاد جو اس کے لیے دعائیں کرے۔"

(عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ (رض) أَنَّهُ قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ أُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ قَالَ الْمَاءُ قَالَ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ هَذِهِ لِأُمِّ سَعْدٍ) [رواہ ابوداؤد: کتاب الزکاۃ، بَاب فِي فَضْلِ سَقْيِ الْمَاءِ]

"حضرت سعد بن عبادہ (رض) نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استفسار کیا اے اللہ کے رسول ! ام سعد وفات پا گئی ہیں کونسا صدقہ سب سے افضل ہے آپ نے فرمایا پانی پلانا۔ حضرت سعد نے کنواں کھدوایا اور کہا یہ ام سعد کے لیے ہے۔"

(عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّ سَعْدَ بْنَ أَبِي وَقَّاصٍ (رض) قَالَ فِي مَرَضِهِ الَّذِي هَلَكَ فِيهِ الْحَدُوا لِي لَحْدًا وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبِنَ نَصْبًا كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

[رواہ مسلم : کتاب الجنائز، باب فی اللحد ونصب اللبن علی المیت]

"عامر بن سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد (رض) نے اپنے مرض الموت کے وقت حکم دیا کہ میرے لیے لحد بنانا اور لحد کے اوپر کچی اینٹیں رکھنا جس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کیا گیا تھا۔" (فہم)

مسائل

۱۔ میت کو دفنانا چاہیے۔

۲۔ قاتل کف افسوس ملتارہ جاتا ہے اور ندامت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

۳۔ حسد بری بلا ہے اسی نے شیطان کو راندہ کیا اسی کی وجہ سے قتل ہوا۔ اس سے بچنا چاہئے اور ہر وقت اللہ کریم جل شانہ سے نیکی کی توفیق اور برائیوں سے بچنے کی دعا کرنی چاہیے۔

آیت مبارکہ:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

لغۃ القرآن: [مِنْ : سے][اَجْلِ : وجہ][ذٰلِكَ ة : وہ][كَتَبْنَا : ہم نے لکھا][عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ : پر بیٹے اسرائیل][اَنَّهٗ : یقینا][مَنْ : وہ جو][قَتَلَ : اس نے قتل کیا][نَفْسًۢا : کوئی جان][بِغَيْرِ : علاوہ][نَفْسٍ : جان][اَوْ : یا][فَسَادٍ : فسادپھیلائے][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][فَكَاَنَّمَا : تو گویا][قَتَلَ : اس نے قتل کیا][النَّاسَ :

لوگ][جَمِيْعًا : سب][وَمَنْ : اور جو][اَحْيَاهَا : بچائے اس کو][فَكَاَنَّمَآ : تو گویا][اَحْيَا : اس نے بچا لیا][النَّاسَ : لوگ][جَمِيْعًا: سب][وَلَقَدْ : اور تحقیق][جَآءَتْهُمْ : آئے ان کے پاس][رُسُلُنَا : ہمارے رسول][بِالْبَيِّنٰتِ : کھلے دلائل کے ساتھ][ثُمَّ : پھر][اِنَّ : یقیناً][كَثِيْرًا : بہت زیادہ][مِّنْهُمْ : ان سے][بَعْدَ ذٰلِكَ : بعد وہ][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][لَمُسْرِفُوْنَ : حد سے بڑھنے والے]

تشریح:

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِکَ ۚ کَتَبۡنَا عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ : اس کے سبب ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا۔} بنی اسرائیل کو یہ فرمایا گیااور یہی فرمان ہمارے لیے بھی ہے کیونکہ گزشتہ امتوں کے جو احکام بغیر تردید کے ہم تک پہنچے ہیں وہ ہمارے لیے بھی ہیں۔ بہر حال بنی اسرائیل پر لکھ دیا گیا کہ جس نے بلااجازت شرعی کسی کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حق، بندوں کے حق اور حدود شریعت سب کو پامال کر دیااور جس نے کسی کی زندگی بچالی جیسے کسی کو قتل ہونے یاڈوبنے یا جلنے یا بھوک سے مرنے وغیرہ اسباب ہلاکت سے بچالیا تواس نے گویا تمام انسانوں کو بچالیا۔

قتل ناحق کی 2 وعیدیں

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کسی مومن کو قتل کرنے میں اگر زمین وآسمان والے شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم میں دھکیل دے۔

(ترمذی، کتاب الدیات، باب الحکم دی الدمائ، ۳/۱۰۰، الحدیث : ۱۴۰۳)

(2)۔۔ حضرت براء بن عازب (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ” اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیاکا ختم ہو جانا ایک مسلمان کے ظلماً قتل سے زیاد سہل ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً، ۳/۲۶۱، الحدیث : ۲۶۱۹)

امن وسلامتی کا مذہب

یہ آیتِ مبارکہ اسلام کی اصل تعلیمات کو واضح کرتی ہے کہ اسلام کس قدر امن وسلامتی کا مذہب ہے اور اسلام کی نظر میں انسانی جان کی کس قدر اہمیت ہے۔ اس سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو اسلام کی اصل تعلیمات کو پس پشت ڈال کر دامن اسلام پر قتل وغارت گری کے حامی ہونے کا بدنما دھبا لگاتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی نصیحت حاصل کرنی چاہیے جو مسلمان کہلا کر بے قصور لوگوں کو بم دھماکوں اور خود کش حملوں کے ذریعے موت کی نیند سلا کر یہ گمان کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے دی۔

قتل کی جائز صورتیں

قتل کی شدید ممانعت کے ساتھ چند صورتوں کو اس سے جدا رکھا ہے اور آیت مبارکہ میں بیان کردہ وہ صورتیں یہ ہیں:
(1)۔۔ قاتل کو قصاص میں قتل کرنا جائز ہے۔
(2)۔۔ زمین میں فساد پھیلانے والے کو قتل کرنا جائز ہے اس کی تفصیل اگلی آیت میں موجود ہے۔
اس کے علاوہ مزید چند صورتوں میں شریعت نے قتل کی اجازت دی ہے۔
(1) شادی شدہ مرد یا عورت کو زنا کرنے پر بطور حد رجم کرنا، (2) مرتد کو قتل کرنا۔ (3) باغی کو قتل کرنا۔ (صراط)
اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسی وجہ سے ہم نے بنواسرائیل پر لکھ دیا کہ جس شخص نے بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد پھیلانے کے لیے کسی شخص کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا ' اور جس نے کسی شخص کو مرنے سے بچالیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچالیا'۔
(المائدہ: ۳۲)

آیات سابقہ سے مناسبت

اس آیت پر یہ سوال ہوتا ہے کہ قابیل اور ہابیل کے قصہ میں اور بنواسرائیل پر قصاص کے وجوب میں کیا مناسبت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قابیل اور ہابیل کے قصہ سے یہ معلوم ہوا کہ قتل کے فعل میں اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانی اور اس کی ناراضگی ہے۔ نیز اس قصہ سے معلوم ہوا کہ قتل کرنے والا دوزخی ہے۔ نقصان اٹھانے والا ہے اور پچھتانے والا ہے 'تو چونکہ قتل کرنا ان خرابیوں کا سبب ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر قتل میں قصاص (بدلہ لینے) کو واجب کر دیا 'تاکہ لوگ قتل کرنے سے باز رہیں۔
اس آیت پر دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ بنواسرائیل سے پہلی امتوں پر بھی قتل کرنا حرام تھا اور ان پر قصاص واجب تھا۔ پھر اس آیت میں بنو اسرائیل کا خصوصیت سے کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی امتوں میں ان کے انبیاء (علیہم السلام) زبانی وجوب قصاص کا ذکر فرماتے تھے اور بنواسرائیل میں سب سے پہلے اس حکم کو کتاب میں نازل کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قابیل نے ہابیل کو حسد کی وجہ سے قتل کیا تھا اور بنواسرائیل میں بھی حسد بہت زیادہ تھا 'اور انھوں نے بیشتر قتل حسد کی بناء پر کیے تھے جب۔ انھوں نے حسد کی وجہ سے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کیا 'اور دو مرتبہ آپ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ ایک مرتبہ مدینہ میں جب آپ بنوقینقاع کے پاس ایک مسلمان کی دیت وصول کرنے کے سلسلہ میں گئے تھے 'اور دوسری مرتبہ خیبر میں جب ایک یہودی بڑھیا نے آپ کو زہر آلود گوشت کھانے کے لیے دیا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ عموماً قتل کا سبب قساوت قلبی 'یعنی سنگ دلی اور عدوان اور سرکشی ہوتا ہے اور بنواسرائیل میں یہ سبب بہ درجہ اتم موجود تھا 'حتی کہ انھوں نے متعدد انبیاء (علیہم السلام) کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

ایک انسان کو قتل کرنا تمام انسانوں کے قتل کے برابر کس طرح ہو گا؟

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ جس نے بغیر قصاص یا بغیر زمین میں فساد کے قتل کیا 'اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک وجہ قصاص ہے 'دوسری وجہ کسی کافر کا مسلمان سے جنگ کرنا ہے 'تیسری وجہ ارتداد ہے 'چوتھی وجہ شادی شدہ کا زنا کرنا ہے 'اور پانچویں وجہ زمین میں ڈاکہ ڈالنا ہے۔ پہلی وجہ کا اس آیت میں صراحتا ذکر ہے اور پانچویں وجہ یعنی ڈاکہ کا اس آیت کے بعد والے حصہ میں تفصیلی بیان آرہا ہے۔ باقی ماندہ تین وجوہات زمین میں فساد پھیلانے کے ضمن میں آگئیں۔ اس لیے فرمایا: جس نے بغیر قصاص یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے کے قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔

اس آیت میں یہ سوال ہے کہ ایک انسان کو قتل کرنا تمام انسانوں کو قتل کرنے کے کیسے مساوی ہو سکتا ہے؟ حتی کہ اس آیت میں ایک انسان کے قتل کو تمام انسانوں کے قتل کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ مقصود ہے کہ ایک بے قصور انسان کو عمدا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے 'جتنا تمام انسانوں کو قتل کر دینا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو عمدا قتل کرنے کی سزا جہنم مقرر کی۔ اس پر اپنا غضب نازل کیا اور لعنت کی اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار کیا اور اگر کوئی شخص تمام انسانوں کو قتل کر دیتا 'تب بھی اس کی یہی سزا ہوتی۔ نیز اگر تمام انسان کسی ایک بے قصور انسان کے قتل میں عمدا شریک ہوں تو ان سب کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی ایک بے قصور انسان کو عمدا قتل کرنا اتنا سنگین جرم ہے تو تمام انسانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔

دوسرا جواب جو شخص کسی بے قصور انسان کو عمدا قتل کرتا ہے 'اس کی طبیعت پر غضب کا غلبہ ہے 'اور جو اپنے جوش غضب سے مغلوب ہو کر ایک شخص کو قتل کر سکتا ہے 'وہ اس کے بعد دوسرے شخص کو 'پھر تیسرے شخص کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض اس کے لیے ممکن ہو تو وہ اپنے جوش غضب میں تمام انسانوں کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ امریکہ کے ایک صدر کے فیصلہ نے ہروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تھے ' جس سے لاکھوں انسان ہلاک ہو گئے۔ اس طرح اب بھی اگر جوش غضب سے مغلوب ہونے والا کوئی امریکی صدر ہو تو اس کے پاس اب ایسے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں جن سے پوری دنیا کو ہلاک اور تباہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک انسان کا تمام انسانوں کو ہلاک کرنا ممکن ہے۔ سو جو شخص جوش غضب سے مغلوب ہو کر ایک بے قصور انسان کو ہلاک کر سکتا ہے 'اگر اس کے بس میں ہو تو وہ تمام انسانوں کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔

پھر فرمایا: جس شخص نے ایک انسان کو مرنے سے بچالیا 'اس نے گویا تمام انسانوں کو بچالیا۔ مثلا کوئی شخص آگ میں جل رہا تھا 'یا دریا میں ڈوب رہا تھا 'یا بھوک سے مر رہا تھا 'یا شدید سردی میں ٹھٹھر کر مرنے والا تھا اور کسی انسان نے اس کو اس مصیبت سے نکال کر اس کی جان بچالی 'تو اللہ کے نزدیک اس کی یہ نیکی اتنی عظیم ہے جیسے کسی شخص نے تمام انسانوں کو موت کے چنگل سے آزاد کرالیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں ڈاکے ڈالتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو چن چن کر قتل کیا جائے یا ان کو سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ ایک جانب سے اور پیر دوسری جانب سے کاٹ دیے جائیں یا ان کو (اپنے وطن کی) زمین سے نکال دیا جائے'۔

شان نزول

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مدینہ آئے ' انھیں وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا: اگر تم چاہو تو صدقہ کی اونٹنیوں کی چراگاہ میں جاؤ اور ان کا دودھ اور پیشاب پیو ' انھوں نے اسی طرح کیا اور تندرست ہوگئے۔ پھر انھوں نے اونٹوں کے چرواہوں پر حملہ کیا اور ان کو قتل کردیا اور دین اسلام سے مرتد ہوگئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اونٹ لے کر بھاگ گئے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں لوگوں کو بھیجا ' ان کو پکڑ کر لایا گیا۔ آپ ﷺ نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کو کٹوا دیا اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں اور ان کو تپتے ہوئے میدان میں چھوڑ دیا ' حتی کہ وہ مرگئے۔ (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ١٦٧١ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ١٥٠١ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ٧٢ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ٤٣٦٧ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ٤٠٣٦ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ٢٥٧٨ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ١٦٣ ' ١٠٧)

امام رازی شافعی نے اسی آیت کی تفسیر میں چار قول ذکر کیے ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ آیت عرینیین کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ابوبرزہ اسلمی کی قوم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اس کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ تھا ' لوگوں نے ان کو قتل کردیا اور ان کا مال لوٹ لیا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت بنو اسرائیل کے قاتلوں اور مفسدوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ' اور چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت مسلمان ڈاکوؤں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ' اور اکثر فقہائے اسلام کا یہی نظریہ ہے اور اس کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل ہیں :

(الف) مرتد کو قتل کرنا ' زمین میں فساد کرنے اور اللہ اور رسول سے جنگ کرنے پر موقوف نہیں ہے ' جبکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول سے جنگ کرے اور زمین میں فساد کرے ' اس کو قتل کیا جائے گا۔

(ب) مرتد کے ہاتھ اور پاؤں کاٹنے اور اس کو شہر بدر کرنے پر اقتصار کرنا کافی نہیں ہے ' جبکہ اس آیت کی رو سے یہ جائز ہے۔

(ج) مرتد کو سولی پر چڑھانا مشروع نہیں ہے ' اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت مرتد کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

(د) اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہوں اور زمین میں فساد کرتے ہوں ' ان کو یہ سزائیں دی جائیں۔ خواہ وہ لوگ کافر ہوں یا مسلمان ' زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے ' لیکن اہل علم سے مخفی نہیں کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے ' خصوصیت مورد کا نہیں ہوتا۔ (تفسیر کبیر ' ج ٣ ص ٣٩٦ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ١٣٩٨ ھ)

حرابہ (ڈاکہ) کا لغوی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں ' حرب کا معنی ہے جنگ۔ صلح کی ضد ' اور حرب کا معنی ہے کسی انسان کا سارا مال لوٹ لینا اور اس کو بالکل تہی دست چھوڑ دینا۔ (تاج العروس ' ج ٣ ' ص ٣٩٦)

ڈاکہ کی اصطلاحی تعریف

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں ' باغیوں اور محاربین (ڈاکوؤں) میں فرق یہ ہے کہ باغی کسی تاویل سے حکومت کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ڈاکو بغیر کسی تاویل کے قتل اور غارت گری کرتے ہیں۔

فقہاء احناف نے حرابہ (ڈاکہ) کی تعریف کو سرقہ (چوری) کی تعریف کے ساتھ لاحق کر دیا ہے۔ کیونکہ ڈاکہ بڑی چوری ہے 'مگر یہ مطلقا چوری نہیں ہے 'کیونکہ خفیہ طریقہ سے کسی چیز کو لینا چوری کہلاتا ہے۔ چور 'محافظ 'امام یا مالک سے چھپ کر کوئی چیز لیتا ہے اور ڈاکو اعلانیہ مار دھاڑ کرکے لوٹتا ہے 'اس لیے ڈاکہ کا ضرر چوری سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ کی سزا بھی چوری سے زیادہ رکھی گئی ہے۔

ڈاکو (قاطع الطریق یا محارب) ہر وہ مسلمان یا ذمی شخص ہے جس کی جان ڈاکہ ڈالنے سے پہلے محفوظ اور مامون ہو اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص نے قتل کیا اور مال لوٹا اس پر حد قائم کرنا واجب ہے اور ولی مقتول کے معاف کر دینے اور لوٹا ہوا مال واپس کر دینے سے اس کی حد ساقط نہیں ہوگی اور ڈاکہ ہر اس فعل کو کہتے ہیں 'جس میں اس طریقہ سے مال کو لوٹا جائے کہ عادتا اس مال کو بچانا مشکل ہو۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ 'ج ٦ ص ١٢٩۔ ١٢٨)

ڈاکہ کا رکن

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں کہ ڈاکہ کا رکن یہ ہے کہ کوئی شخص غلبہ سے مسافروں کا مال لوٹنے کے لیے اس طرح نکلے کہ مسافروں کا اس راستہ پر سفر کرنا مشکل ہو جائے۔ خواہ ڈاکہ ڈالنے والا ایک فرد ہو یا جماعت 'جبکہ ڈاکو کے پاس ڈاکہ ڈالنے کی قوت ہو 'خواہ اس کے پاس ہتھیار ہوں یا لاٹھی یا اینٹ یا پتھر ہوں 'کیونکہ ان میں سے ہر چیز کے ساتھ ڈاکہ ڈالا جاسکتا ہے 'خواہ سب حملہ کریں یا بعض حملہ کریں اور بعض معاون ہوں۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ ڈاکو اس فرد یا گروہ کو کہتے ہیں جس کے پاس ایسی قوت ہو جس کا مقابلہ کرنا مسافروں کے لیے مشکل ہو 'اور وہ اپنی قوت سے مسافروں کا مال لوٹنے کا قصد کریں۔ (بدائع الصناء 'ج ٧ 'ص ٩٠)

ڈاکہ کی شرائط

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی نے ڈاکہ کی حسب ذیل شرائط بیان کی ہیں:

(١) ڈاکہ ڈالنے والا عاقل اور بالغ ہو۔ اگر وہ بچہ یا مجنون ہے تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔

(٢) ڈاکو مرد ہو 'اگر عورت نے ڈاکہ ڈالا ہے تو اس پر حد نہیں ہے 'لیکن امام طحاوی کے نزدیک اس میں عورت اور مرد برابر ہیں 'اور دونوں پر حد ہوگی۔ روایت مشہورہ کی وجہ یہ ہے کہ غلبہ سے مال کو ٹنا عادتا عورتوں سے متصور نہیں ہے 'اور امام طحاوی کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح باقی حدود میں مردوں کی تخصیص نہیں ہے 'عورتوں پر بھی حد جاری ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈاکہ میں بھی مردوں کی تخصیص نہیں ہوگی۔

(۳) جن پر ڈاکہ ڈالا ہے 'وہ مسلمان یا ذمی ہوں 'اگر ان غیر مسلموں پر ڈاکہ ڈالا ہے جو پاسپورٹ کے ذریعہ دار السلام میں آئے ہوں تو ڈاکوؤں پر حد نہیں ہے (بلکہ تعزیر ہے)

(۴) جن پر ڈاکہ ڈالا وہ ڈاکوؤں کے محرم نہ ہوں۔

(۵) جس چیز پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے وہ قیمت والا مال ہو اور محفوظ ہو 'اس میں کسی اور کا حق نہ ہو 'نہ اس میں لینے کی کوئی تاویل ہو اور نہ تاویل کا کوئی شبہ ہو 'نہ اس میں ڈاکو کی ملکیت ہو نہ ملکیت کی تاویل یا شبہ ہو اور وہ مال دس درہم کی مالیت سے کم نہ وہ (یعنی ۲۵، ۲ تولہ چاندی ہو جو ۶۱۸، ۳۰ گرام چاندی کے برابر ہے) اگر متعدد ڈاکو ہوں تو ہر ڈاکو کے حصہ دس درہم کی مالیت کا مال ہو اور ہر ڈاکو کے حصہ میں اتنا مال نہ آئے تو حد واجب نہیں ہو گی۔

(۶) جس جگہ ڈاکہ ڈالا گیا 'وہ جگہ دار الاسلام ہو 'اگر دار الحرب میں ڈاکہ ڈالا ہے تو واجب نہیں ہو گی۔ کیونکہ حد کو حاکم اسلام جاری کرتا ہے اور دار الحرب حاکم اسلام کی ولایت اور تصرف میں نہیں ہے اس لیے وہ دار الحرب میں حد جاری کرنے پر قادر نہیں ہے۔ (علامہ کاسانی نے جو وجہ بیان کی ہے 'اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دار الحرب میں جا کر ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کریں 'اور یہ کہ ناجائز طریق سے کفار کا مال لینا بہر حال گناہ ہے خواہ ان کا مال سود کے ذریعہ لیں یا قمار کے یا رشوت کے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۷) جس جگہ ڈاکہ ڈالا گیا ہے 'وہ جگہ شہر نہ ہو۔ اگر کسی نے شہر میں ڈاکہ ڈالا ہے تو اس پر حد واجب نہیں ہو گی۔ خواہ دن میں ڈاکہ ڈالا ہو یا رات میں اور خواہ ہتھیاروں کے ذریعہ ڈاکہ ڈالا ہو یا بغیر ہتھیاروں کے 'یہ استحسان ہے اور یہی امام حنیفہ اور امام محمد کا قول ہے اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ شہر میں ڈاکہ ڈالنے سے بھی حد واجب ہو گی اور یہ امام ابو یوسف کا قول ہے۔ قیاس کی وجہ یہ ہے کہ حد واجب ہونے کا سبب ڈاکہ اور جب ڈاکہ ثابت ہو گیا تو حد واجب ہو گی۔ خواہ شہر میں ڈاکہ ڈالا ہو اور استحسان کی وجہ یہ ہے قطع الطریق (ڈاکہ) سفر میں ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ شہر میں راستے منقطع نہیں ہوتے کیونکہ اگر شہر میں ڈاکہ پڑے تو اس سے راستے منقطع نہیں ہوتے۔ ایک قول یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے غیر شہر کی قید اپنے زمانہ کے اعتبار سے لگائی ہے کیونکہ اس زمانہ میں شہر والے ہتھیاروں سے مسلح رہتے تھے 'اس لیے ڈاکوؤں کو شہر میں ڈاکہ ڈالنے کی قدرت نہیں تھی اور اب شہر کے لوگوں نے ہتھیار رکھنے کی عادت چھوڑ دی ہے۔ اس لیے اب شہر میں ڈاکہ ڈالنے سے بھی حد واجب ہو گی۔ (رض) اجمعین

(۸) جس جگہ ڈاکہ ڈالا ہے اس جگہ اور شہر کی درمیان مسافت سفر ہو (یعنی اکسٹھ میل چھ سول چالیس گز) یہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے قول پر شرط ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

ڈاکہ کے جرم کی تفصیل

ڈاکو کی سزاؤں میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ آیا یہ سزائیں جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں یا یہ قاضی کی صوابدید پر موقوف ہیں 'ڈاکو کے جرم کے اختلاف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) صرف لوگوں یا مسافروں کو ڈرانا اور دھمکانا کسی کو قتل کرنا 'نہ مال لوٹنا۔

(۲) صرف مال لوٹنا۔

(۳) صرف قتل کرنا۔
(۴) مال لوٹنا اور قتل کرنا۔
ان میں سے ہر جرم کی ائمہ کے نزدیک ایک الگ سزا ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ اگر ڈاکو نے قتل نہیں کیا ہے تو قاضی قتل اور پھانسی کی سزا میں سے کوئی بھی سزا اپنے اجتہاد سے دے سکتا ہے۔ اس کی سزا قتل بھی ہو سکتی ہے اور قتل اور پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ ان سزاؤں میں قاضی کو اختیار ہے اور باقی سزاؤں میں اس کو اختیار نہیں ہے۔ اور غیر مقلدین کا یہ نظریہ ہے کہ ڈاکو کا جو بھی جرم ہو قرآن مجید کی بیان کردہ سزاؤں میں سے قاضی اپنے اجتہاد سے کوئی بھی سزا دے سکتا ہے۔

مذاہب اربعہ کی روشنی میں ڈاکو کے صرف ڈرانے کی سزا

جب ڈاکو صرف ڈرائے اور دھمکائے ' نہ مال لوٹے اور نہ قتل کرے تو امام احمد وغیرہ کے نزدیک اس کی سزا شہر بدر کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (آیت) "اوینفوا من الارض " یا ان کو شہر بدر کر دیا جائے "
علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں جب ڈاکو راستہ میں ڈرائیں اور دھمکائیں نہ قتل کریں اور نہ مال لوٹیں تو ان کو زمین سے نکال دیا جائے گا ' کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (آیت) "اوینفوا من الارض " (مائدہ : ۳۶) اس حالت میں جلا وطن کرنا حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے اور یہی نخعی ' قتادہ اور عطاء خراسانی کا قول ہے اور زمین سے نکالنے کا معنی یہ ہے کہ ان کو تمام شہروں اور قصبوں سے نکال دیا جائے اور ان کے لیے کسی شہر میں رہنے کا ٹھکانا نہ ہو ' اس طرح کی تفسیر حسن اور زہری سے مروی ہے اور حضرت ابن عباس (رض) یہ اس کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھیج دیا جائے جس طرح زانی کو شہر بدر کیا جاتا ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا قول یہ ہے کہ جس شہر میں اس کو بھیجا جائے ' اس میں اس کو قید کر دیا جائے۔ جس طرح زانی کے متعلق ان کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اس کو زمین سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو قید کرلیا جائے حتیٰ کہ وہ توبہ کرے۔ امام شافعی کا بھی اسی قسم کا قول ہے۔ کیونکہ انھوں نے کہا کہ اس صورت میں امام اس کو تعزیز لگائے اور اگر اس کی رائے ڈاکو کو قید کرنا ہو تو اس کو قید کر دے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ نفی کا معنی یہ ہے کہ امام ڈاکوؤں پر حدود جاری کرنے کے لیے ان کو طلب کرے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے ایک روایت ہے۔ ابن شریح نے کہا ڈاکوؤں کو ان کے شہر کے علاوہ کسی اور شہر میں قید کر دے۔ یہ قول امام مالک کے قول کی مثل ہے اور یہ زیادہ بہتر ہے ' کیونکہ اگر ان کو کسی اور شہر میں بھیجیں گے تو وہ وہاں جا کر ڈاکہ ڈالیں گے اور لوگوں کو ایذاء پہنچائیں گے۔ ان لیے ان کو قید کرنا بہتر ہے۔
نیز علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں "ہماری دلیل ظاہر آیت ہے کیونکہ نفی کا معنی نکالنا ' دور کرنا اور بھگانا ہے اور قید کا معنی روکنا ہے۔ اگر ان کو کسی غیر معین جگہ کی طرف نکال دیا جائے تو اس کی دلیل ' (آیت) "اوینفوا من الارض " (مائدہ : ۳۶) کیونکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کو تمام زمینوں سے نکال دیا جائے ' باقی ہمارے اصحاب نے یہ نہیں لکھا کہ اسے کتنی مدت کے لیے شہر بدر کیا جائے ؟ تاہم اس کو اتنی مدت کے شہر بدر کرنا چاہیے جس میں اس کی توبہ ظاہر ہو جائے اور اس کا چال چلن ٹھیک ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک سال کے لے شہر بدر کیا جائے۔ (المغنی مع الشرح الکبیر ' ج ۱۰ ص ۳۰۸۔ ۳۰۷)
علامہ ابوبکر رازی جصاص حنفی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ' زمین سے نکالنے کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ڈاکو کو تمام زمینوں سے نکال دیا جائے۔

دوسری یہ کہ جس شہر میں اس نے ڈاکہ ڈالا ہو وہاں سے نکال دیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے۔

پہلی صورت مراد لینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ تمام زمینوں سے نکال دینا اسی صورت میں متصور ہو سکتا ہے جب اس کو قتل کر دیا جائے اور قتل کرنے کا ذکر اس آیت میں پہلے آ چکا ہے۔ دوسری صورت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اگر ڈاکو کو دوسرے شہر کی طرف نکالیں گے تو وہ وہاں جا کر ڈاکے ڈالے گا' اور لوگوں کو ضرر پہنچائے گا' اور تیسری صورت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کو دارالحرب میں بھیجنا صحیح نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہاں نفی من الارض کا معنی یہ ہے کہ اس کو تمام زمینوں سے نکال کر اس زمین میں رکھا جائے جس میں اس کو قید کیا جائے جہاں پر اس کا فساد کرنا متصور نہ ہو۔ (احکام القرآن 'ج ۲ ص ۴۱۲)

شمس الائمہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں کہ جب ڈاکو صرف راستہ میں ڈرائیں اور دھمکائیں 'نہ قتل کریں اور نہ مال لوٹیں تو ان کو تعزیر لگانے کے بعد اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ توبہ نہ کرلیں 'اور اللہ کے قول (آیت) "اوینفوا من الارض " سے بھی یہی مراد ہے۔ یعنی ان کو قید کرلیا جائے۔ اس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ (علامہ سرخسی نے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ جس شخص نے قتل کیا 'نہ مال لوٹا صرف ڈرایا اور دھمکایا اس نے معصیت کا ارادہ کیا اور قتل کرنا 'ہاتھ پیر کاٹنا 'انتہائی سزائیں ہیں اور جس شخص نے معصیت کا صرف ارادہ کیا ہو اس کو یہ سزائیں نہیں دی جائیں گی۔ جس طرح چوری میں چوری کا صرف ارادہ کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جاتا۔ اسی طرح یہاں بھی صرف ڈرانے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر نہیں کاٹے جائیں گے۔ (مبسوط للسرخسی 'ج ۹ 'ص ۱۹۵) اور یہ امام شافعی کی تفسیر سے بہتر ہے۔ یعنی ان کو طلب کرنا تاکہ ان کو ہر جگہ سے بھگا دیا جائے 'کیونکہ قید کرکے سزا دینے کی شریعت میں نظیر ہے اور جس چیز کی شریعت میں نظیر ہو 'اس پر عمل کرنا اس کی بہ نسبت بہتر ہے جس کسی شریعت میں نظیر نہ ہو۔ (المبسوط 'ج ۹ 'ص ۱۹۹)

اگر ڈاکو نے صرف مال لوٹا ہو اور قتل نہ کیا ہو تو امام ابو حنیفہ 'امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک ڈاکو ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹ دیا جائے گا۔ یعنی سیدھا ہاتھ اور الٹا پیر 'اس سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی۔ اگر اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر پہلے کٹا ہوا تھا تو اب اس کا ہاتھ اور پیر نہیں کاٹا جائے گا 'بلکہ اس کو تعزیرا قید کیا جائے گا اور اگر اس کا پہلے ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا تو اب صرف پیر کاٹا جائے گا اور اگر پہلے ایک پیر کٹا ہوا تھا تو اب صرف ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ حکم امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک ہے اور امام مالک کے نزدیک اس صورت میں امام کو اختیار ہے کہ وہ ڈاکو کو قتل کر دے یا سولی دے۔ یا مخالف جانب سے اس کے ہاتھ اور پیر کاٹ دے۔ البتہ اس صورت میں اس کو شہر بدر کرنے یا قید کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

امام شافعی کے نزدیک بھی دوبارہ ڈاکہ ڈالنے پر اس کے بقیہ ہاتھ اور پیر کو کاٹ دیا جائے گا۔

قاضی ابن رشد مالکی لکھتے ہیں کہ جب ڈاکو مال لوٹے اور قتل نہ کرے تو امام کو اسے قید یا شہر بدر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ البتہ اس کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس کو قتل کرے یا سولی دے یا مخالف جانب سے اس کے ہاتھ اور پیر کاٹ دے۔

علامہ سحنون مالکی لکھتے ہیں کہ امام ابن قاسم نے کہا ہے کہ امام مالک نے فرمایا: کہ جس ڈاکو کا ایک ہاتھ اور پیر کاٹا جا چکا ہے 'اور وہ دوبارہ ڈاکہ ڈالے تو امام کو اختیار ہے کہ وہ اس کا دوسرا ہاتھ اور پیر بھی کاٹ دے۔ (بدایہ المجتہد 'ج ۲ ص ۳۴۱)

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں "جس ڈاکو نے مال لیا ہو اور قتل نہ کیا ہو 'اس کا ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹ دیا جائے گا"۔ (بدائع الصنائع 'ج ۷ 'ص ۹۳)

علامہ یحی بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں "اگر ڈاکو نے چوری کے نصاب کے مطابق مال لیا ہو تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹ دیا جائے گا اور اگر وہ دوبارہ ڈاکہ ڈالے تو اس کا بایاں ہاتھ اور دایاں پیر کاٹ دیا جائے گا اور اگر نصاب سے کم مال لیا تو اس کے ہاتھ اور پیر کاٹ دے 'پھر اس جگہ کو داغ نہ لگائے یونہی چھوڑ دے 'حتی کہ وہ مر جائے۔ (بدائع الصنائع 'ج ۷ 'ص ۹۳)

علامہ ابو الحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں کہ امام محمد نے یہ کہا ہے کہ ڈاکو کو قتل کیا جائے یا سولی دی جائے اور اس کا ہاتھ اور پیر نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ یہ ایک جرم ہے 'اس سے دو حدیں واجب نہیں ہوں گی۔ نیز قتل سے کم سز قتل میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حد سرقہ 'حد رجم میں داخل ہو جاتی ہے۔ (مثلا کسی نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو اس کو سرف رجم کیا جائے گا اور اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ سعیدی غفرلہ) امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ ہاتھ اور پیر کاٹنا اور قتل کرنا ایک سزا ہے 'اور چونکہ ڈاکہ کا جرم زیادہ ہے 'اس لیے اس کی سزا بھی زیادہ ہے 'کیونکہ جو ڈاکو لوگوں کو قتل کرتا ہے اور ان کا مال لوٹتا ہے 'وہ امن میں خلل ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ میں ہاتھ اور پیر دونوں کاٹنا ایک حد ہے جبکہ چوری میں دونوں کاٹنا دو سزائیں ہیں 'اور امام محمد نے جو حد رجم اور حد سرقہ کی مثال دی ہے 'وہاں دو حدوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا گیا ہے 'اور یہاں ایک حد میں بحث ہو رہی ہے۔ امام ابو یوسف سے ایک روایت یہ ہے کہ سولی میں اختیار نہیں ہے 'اس کو ترک نہ کیا جائے 'کیونکہ اس کی قرآن مجید میں تصریح ہے اور مقصود یہ ہے یہ اس سزا کو شہرت دی جائے 'تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں اور امام ابو حنیفہ کی جانب سے جواب یہ ہے کہ اصل شہرت قتل سے حاصل ہو جاتی ہے اور سولی پر چڑھانے میں مبالغہ ہے 'لہذا اس میں اختیار دیا جائے گا۔ (ہدایہ اولین 'ص ۵۳۶)

علامہ سحنون مالکی لکھتے ہیں میں نے امام ابن قاسم مالکی سے پوچھا اگر ڈاکو قتل کرے اور مال لے 'تو کیا اس کا ہاتھ اور پیر کاٹا جائے گا 'اور اس کو قتل کیا جائے گا 'یا اس کو صرف قتل کیا جائے گا 'اور اس کا ہاتھ اور پیر نہیں کاٹا جائے گا؟ اس میں امام مالک کا کیا قول ہے؟ امام ابن قاسم نے فرمایا اس کو ہر صورت میں قتل کیا جائے گا۔ (خواہ قاضی کی رائے میں اس کا ہاتھ اور پیر کاٹنا ضروری ہو یا نہ ہو) (المدونۃ الکبری 'ج ۴ 'ص ۴۲۹)

علامہ یحی بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں اگر ڈاکو نے قتل کیا اور مال لیا تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اس کو سولی دی جائے گی اور یہ اس وقت ہے جب مال نصار کے برابر ہو اور مذہب یہی ہے۔ ابن سلمہ کا قول یہ ہے کہ اس کا ہاتھ اور پیر کاٹا جائے گا اور قتل کیا جائے اور اس کو سولی دی جائے گی اور صاحب تقریب نے کہا کہ اس کا ہاتھ اور پیر کاٹا جائے گا اور قتل کیا جائے گا اور سولی نہیں دی جائے گی۔ (روضۃ الطالبین 'ج ۱۰ 'ص ۱۵۷۔۱۵۶)

علامہ ابو القاسم خرقی حنبلی لکھتے ہیں: جس ڈاکو نے قتل کیا اور مال لیا اس کو قتل کیا جائے گا۔ خواہ صاحب مال معاف کر دے اور اس کو سولی دی جائے گی 'حتی کہ اس کی شہرت ہو جائے اور اس کی لاش ڈاکوؤں کے حوالے کر دی جائے گی۔ (المقنع مع المغنی والشرح 'ج ۱۰ 'ص ۲۹۹)

(تبیان)

آیت مبارکہ:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۳۳﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّمَا : یقیناً][جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ : سزا وہ لوگ][یُحَارِبُوْنَ : وہ لڑتے ہیں][اللّٰهَ : اللہ][وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کا رسول][وَیَسْعَوْنَ : اور کوشش کرتے ہیں][فِي الْاَرْضِ : زمین میں][فَسَادًا : فساد کرنا][اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا : یہ کہ وہ قتل کردیے جائیں][اَوْ : یا][یُصَلَّبُوْٓا : وہ سولی چڑھائے جائیں][اَوْ : یا][تُقَطَّعَ : کاٹ دیے جائیں][اَیْدِیْهِمْ : ان کے ہاتھ][وَاَرْجُلُهُمْ : اور ان کے پاؤں][مِّنْ : سے][خِلَافٍ : خلاف][اَوْ : یا][یُنْفَوْا : وہ نکال دیے جائیں][مِنَ : سے][الْاَرْضِ : زمین][ذٰلِكَ : وہ][لَهُمْ : ان کے لیے][خِزْیٌ: رسوائی][فِي : میں][الدُّنْیَا : دنیا][وَلَهُمْ : اور ان کے لیے][فِي الْاٰخِرَةِ : میں آخرت][عَذَابٌ عَظِیْمٌ : عذاب بڑا]

ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد انگیزی کرتے پھرتے ہیں (یعنی مسلمانوں میں خونریز رہزنی اور ڈاکہ زنی وغیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں) ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں یا (وطن کی) زمین (میں چلنے پھرنے) سے دور (یعنی ملک بدر یا قید) کر دیئے جائیں۔ یہ (تو) ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے۔

تشریح:

الَّذِینَ یُحَارِبُونَ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ : جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں۔} اس سے پچھلی آیات میں قتل کی ایک نَوعِیّت یعنی ناجائز قتلوں کا ذکر کیا گیا اب دوسری نوعیت یعنی جائز قتلوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

شانِ نزول

عُرَینہ قبیلے کے کچھ لوگ مدینہ منورہ میں حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، انھیں وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا: صدقہ کی اونٹنیوں کی چراگاہ میں جاؤ اور ان کا دودھ اور پیشاب پیو، انھوں نے اسی طرح کیا تو تندرست ہوگئے۔ پھر وہ مرتد ہوگئے، چرواہوں پر حملہ کرکے انھیں قتل کردیا اور اونٹ لے کر بھاگ گئے۔ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے پیچھے لوگوں کو بھیجا جو انھیں گرفتار کرکے لے آئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوادیئے، ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں پھر انھیں تپتے ہوئے میدان میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مرگئے۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب قصۃ عکل وعرینۃ، ۳/۸۷، الحدیث: ۴۱۹۲، تفسیرات احمدیہ، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۳۳، ص ۳۵۰)

ڈاکو کی سزا کی شرائط

اس آیت کریمہ میں راہزن یعنی ڈاکو کی سزا کا بیان ہے۔ راہزن جس کے لیے شریعت کی جانب سے سزا مقرر ہے اس میں چند شرطیں ہیں:

(1)۔۔ان میں اتنی طاقت ہو کہ راہ گیر ان کا مقابلہ نہ کرسکیں اب چاہے ہتھیار کے ساتھ ڈاکہ ڈالا یا لاٹھی لے کر یا پتھر وغیرہ سے۔

(2)۔۔بیرونِ شہر راہزنی کی ہو یا شہر میں رات کے وقت ہتھیار سے ڈاکہ ڈالا۔

(3)۔۔دارُ الاسلام میں ہو۔

(4)۔۔چوری کی سب شرائط پائی جائیں۔

(5)۔۔توبہ کرنے اور مال واپس کرنے سے پہلے بادشاہ اسلام نے ان کو گرفتار کرلیا ہو۔

(عالمگیری، کتاب السرقۃ، الباب الرابع فی قطاع الطریق، ۲/۱۸۶)

ڈاکو کی 4 سزائیں

جن میں یہ سب شرطیں پائی جائیں ان کے لیے قرآن پاک میں چار سزائیں بیان کی گئی ہیں

(1)۔۔انھیں قتل کردیا جائے۔

(2)۔۔ سولی چڑھا دیا جائے۔

(3)۔۔ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے۔

(4)۔۔ جلاوطن کر دیا جائے، ہمارے ہاں اس سے مراد قید کر لینا ہے۔

اس سزا کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی کو قتل کیا اور مال نہ لیا تو انھیں قتل کیا جائے۔ اگر قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا تو بادشاہ اسلام کو اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر ڈالے یا سولی دیدے یا ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کرے پھر اس کی لاش کو سولی پر چڑھا دے یا صرف قتل کر دے یا قتل کرکے سولی پر چڑھا دے یا فقط سولی دیدے۔ اگر قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا تو ان کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے۔ اگر نہ مال لوٹا نہ قتل کیا صرف ڈرایا دھمکایا تو اس صورت میں انھیں قید کر لیا جائے یہاں تک کے صحیح توبہ کر لے۔ (عالمگیری، کتاب السرقۃ، الباب الرابع فی قطاع الطریق، ۱۸۶/۲، در مختار، کتاب السرقۃ، باب قطع الطریق، ۱۸۱/۶۔ ۱۸۳، ملخصاً)

اسلامی سزاؤں کی حکمت

اسلام نے ہر جرم کی سزا اس کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف رکھی ہے، چھوٹے جرم کی سزا ہلکی اور بڑے کی اس کی حیثیت کے مطابق سخت سزا نافذ کی ہے تاکہ زمین میں امن قائم ہو اور لوگ بے خوف ہو کر سکون اور چین کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بیشمار حکمتیں ہیں۔

ایک اس ڈاکہ زنی کی سزا ہی کو لے لیجئے کہ جب تک اس پر عمل رہا تو تجارتی قافلے اپنے قیمتی ساز و سامان کے ساتھ بے خوف و خطر سفر کرتے تھے جس کی وجہ سے تجارت کو بے حد فروغ ملا اور لوگ معاشی اعتبار سے بہت مضبوط ہو گئے اور جب سے اس سزا پر عمل نہیں ہو رہا تب سے تجارتی سرگرمیاں سب کے سامنے ہیں، جس ملک میں تجارتی ساز و سامان کی نقل و حمل کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں وہاں کی برآمدات اور درآمدات انتہائی کم ہیں جس کی وجہ سے ان کی معیشت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اب تو حالات اتنے نازک ہو چکے ہیں کہ بینک سے کوئی پیسے لے کر نکلا تو راستے میں لٹ جاتا ہے، کوئی پیدل جا رہا ہے تو اس کی نقدی اور موبائل چھن جاتا ہے، کوئی بس کا مسافر ہے تو وہاں بھی محفوظ نہیں، کوئی اپنی سواری پر ہے تو وہ خود کو زیادہ خطرے میں محسوس کرتا ہے، سرکاری اور غیر سرکاری املاک ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ نہیں۔

اگر ڈاکہ زنی کی بیان کردہ سزا پر صحیح طریقے سے عمل ہو تو ان سب کا دماغ چند دنوں میں ٹھکانے پر آ جائے گا اور ہر انسان پر امن ماحول میں زندگی بسر کرنا شروع کر دے گا۔ (صراط)

مجرموں کے مناسب حال دیکھے وہ ان پر جاری کرے۔

اب آج کل عام طور پر اس طرح کے مسلح حملوں میں صرف مال کی لوٹ کھسوٹ۔ یا قتل و خون ریزی ہی پر اکتفا نہیں ہوتا بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت دری اور اغوا وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں تو اگر بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہنچ جائے تو حد زنا جاری کی جاوے گی اور اگر نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا۔

آخرت کا عذاب

آیت کے اخیر میں فرمایا گیا ہے لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم یعنی یہ سزائے شرعی جو ان پر دنیا میں جاری کی گئی ہے یہ تو دنیا کی رسوائی اور ذلت ہے اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور عذاب عظیم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود و قصاص، یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی۔ ہاں سزا یافتہ شخص دل سے اس گناہ اور جرم سے توبہ بھی کرے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی۔

ڈاکو کی توبہ

اگلی آیت میں ایک میں ایک استثنا ان سزاؤں سے ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ ڈاکو یا رہزن اگر حکومت کے قبضہ میں آنے اور گرفتاری سے پہلے جب کہ اس کی قوت اور طاقت بحال ہے اگر توبہ کر کے ڈاکہ و رہزنی سے خود ہی باز آجائے تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی ان سے ساقط ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر ڈاکو یا رہزن اپنی گرفتاری سے پہلے ہی اپنے گناہ سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کو معاف فرمادیں گے باقی حقوق عباد وہ بغیر بندوں کے معافی کے ساقط نہیں ہوتے پس اگر کسی کا مال لیا ہے تو اس کا ضمان دینا پڑے گا اور اگر کسی کی جان لی ہے تو قصاص لازم ہوگا مگر اس ضمان اور قصاص کے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو حاصل ہوگا اور ولی مقتول اگر اس کو قتل کرے تو وہ قتل بطور قصاص کے ہوگا نہ کہ بطور حسد۔ (درس اسحاق)

دعا کیجئے: حق تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائیں کہ ہم جملہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا کرنے والے ہوں۔ احکام شریعت پر چلنے اور چلانے والے ہوں۔ خدائی احکام کی پابندی کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جہان میں رسوائی اور ذلت سے ہم کو محفوظ و مامون فرمائیں اور اپنی مغفرت و رحمت سے دونوں جہان میں نوازیں۔ یا اللہ اس وقت جو روئے زمین فسادیوں سے بھر گئی ہے ان کے دنیا سے دور ہونے کی غیب سے صورتیں ظاہر فرمادے اور دنیا کو پھر امن چین سکون عطا فرمادے۔ آمین۔ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

لغۃ القرآن: [اِلَّا :[مگر][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][تَابُوْا : جنہوں نے توبہ کی][مِنْ قَبْلِ : سے پہلے][اَنْ : یہ کہ][تَقْدِرُوْا : تم قابو پالو][عَلَيْهِمْ : ان پر][فَاعْلَمُوْٓا : پس تم جان لو][اَنَّ : یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][غَفُوْرٌ : بخشنے والا][رَّحِيْمٌ : مہربان ہے]

ترجمہ: مگر جن لوگوں نے، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا جاؤ، توبہ کرلی، سو جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے

تشریح: اسلامی سزاؤں کا فلسفہ یہ ہے کہ جرائم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ مگر صرف سزا کا نفاذ ہی اصلاح کا ذریعہ نہیں ہوا کرتا اگر مجرموں کو سزا پر سزا دی جاتی رہے تو بسا اوقات وہ قومی مجرم اور پیشہ ور لٹیرے ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے دوسرے جرائم کی طرح سنگین جرائم کے مرتکب افراد کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ لیکن اس کی ایک بڑی شرط یہ ہے کہ وہ انتظامیہ کی پکڑ میں آنے اور عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے سے پہلے تائب ہو جائیں۔ اس میں بھی کچھ صورتوں کو ناقابل معافی قرار دیا گیا ہے۔ اگر ایسے شخص نے کوئی قتل کیا ہے تو اسے قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اس نے کسی کا مال لوٹا ہو تو اس سے واپس لے کر اس کے مالک کو دلوانا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ یہ طریقہ کار فوجداری اور دیوانی مقدمات میں ہوگا۔ اخلاقی مقدمات مثلاً زناکاری کے مقدمہ میں نہ بدلہ ہے اور نہ ہی شہادتیں قائم ہونے کے بعد عدالت معافی دے سکتی ہے۔ توبہ کا دروازہ کھولتے ہوئے اعلان فرمایا ہے کہ اگر یہ لوگ آئندہ کے لیے سچے دل سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور نہایت ہی مہربانی کرنے والا ہے۔ اگر یہ لوگ اسلامی سزا کے بعد یا عدالت میں پہنچنے سے پہلے اخلاص کے ساتھ توبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمادے گا۔

(عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ عَبْدِ اللهِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)

[رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزہد، باب ذکر التوبۃ]

"حضرت ابوعبیدہ بن عبداللہ (رض) اپنے والد سے بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو "

(عَنۡ أَبِي مُوسَى (رض) عَنۡ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ يَبۡسُطُ يَدَہُ بِاللَّيۡلِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ النَّهَارِ وَيَبۡسُطُ يَدَہُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ اللَّيۡلِ حَتَّى تَطۡلُعَ الشَّمۡسُ مِنۡ مَغۡرِبِهَا) [رواہ مسلم: کتاب التوبہ، باب قبول التوبۃ من الذنوب]

"حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کو اپنا دست رحمت پھیلاتا ہے تاکہ دن بھر کا گناہ گار توبہ کرلے اور دن کو دست شفقت بڑھاتا ہے تاکہ رات بھر کا گناہ گار توبہ کرلے، سورج کے مغرب سے نکلنے یعنی قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

(عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍو (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَقۡبَلُ تَوۡبَةَ الۡعَبۡدِ مَا لَمۡ يُغَرۡغِرۡ)

[رواہ ابن ماجۃ: باب ذِکۡرِ التَّوۡبَۃِ]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ بندے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے جب تک اس کا سانس حلق میں نہیں اٹک جاتا۔"

(عَنۡ أَنَسٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيۡرُ الۡخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ)

[رواہ ابن ماجۃ: باب ذِکۡرِ التَّوۡبَۃِ]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آدم کا ہر بیٹا خطاکار ہے اور ان میں سے بہتر وہ ہے جو خطا کرنے کے بعد توبہ کرنے والا ہے۔ ("فہم)

اس رکوع کی اختتامی آیت میں (جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں) حرابہ کی حد کا ذکر کیا گیا ہے۔ نئے رکوع میں تین آیات کے بعد سرقہ یعنی چوری کی حد کا ذکر آرہا ہے۔ لیکن اس کے درمیان میں تنبیہ اور تذکیر پر مشتمل تین آیات آرہی ہیں۔ جس میں ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا آخر وہ اسلوب کیا ہے کہ جس میں ہم یہ حیرت انگیز بات دیکھتے ہیں کہ قانونی دفعات کا ذکر کرتے ہوئے دفعتاً تنبیہ و تذکیر شروع ہو جاتی ہے۔

قرآن کا طرز خطاب فطری اور نفسیاتی ہے

بات یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے اسلوب کلام میں دنیا کی واحد کتاب ہے ' جس کی نقل کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام کتابیں کسی نہ کسی ایک موضوع پہ لکھی جاتی ہیں۔ اس کی تمام ضمنی باتیں اور تمام تر تفصیلات اسی موضوع سے متعلق ہوتی ہیں لیکن قرآن کریم کسی ایک موضوع پر بند نہیں۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کو زیر بحث لاتا ہے ' پھر اس پر محاکمہ کرتا ہے اور اس کے بارے میں رہنمائی دیتا ہے۔ زندگی کے مسائل چونکہ متنوع ہیں اور شاخ در شاخ پھیلے ہوئے ہیں ' اس لیے بظاہر اس میں ایک بےترتیبی کا احساس ہوتا ہے اور لوگ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ قرآن مجید ایک غیر مربوط کتاب ہے حالانکہ قرآن کریم کا بھی ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے حضرت انسان۔ اس لیے انسان کے حوالے سے جب بحث کی جائے گی تو اس کے احساسات اور انفعالات سے لے کر اس کی قومی اور بین الاقوامی ضرورتوں تک کو زیر بحث لایا جائے گا۔ اس لیے جیسے

جیسے اس کی ضرورت کا تقاضا ہوگا ' ویسے ویسے بحث طویل ہوتی جائے گی اور اس کا اسلوب بدلتا جائے گا۔ مزید یہ کہ قرآن کریم کسی انسان کی تصنیف نہیں ' بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کلام کا متکلم چونکہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کا خالق ہے ' اس لیے وہ اس کو بہ تمام و کمال جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ انسانی طبیعتیں کسی بھی پابندی کو آسانی سے قبول نہیں کرتیں ' تاوقتیکہ ان کے دل و دماغ اس کی قبولیت کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ اس لیے جب وہ کسی بات کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ تقویٰ کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ پھر اپنی ذات کا حوالہ دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پھر اپنی نعمتوں اور احسانات کا ذکر کرکے اس پر جواب طلبی کا احساس اور اس کی جوابدہی کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اس طرح دل میں گداز کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی اور سوز کی ایسی روح مچلنے لگتی ہے ' جس کے بعد کسی بھی حکم کو قبول کرنا انسانی طبیعت کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ہم اسی اسلوب کلام کو ملاحظہ کر رہے ہیں اور پھر مزید یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرے کو صحیح نہج پر استوار کرنے اور صحیح راہ پر چلانے کے لیے احکام و قوانین کی صورت میں ہدایات بھی دی جا رہی ہیں اور عمل نہ کرنے یا مخالفت کرنے کی شکل میں حدود اور سزاؤں کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے کیونکہ کوئی بھی انسانی معاشرہ محض نصیحت یا محض قانون دینے پر زندگی کے سفر کو ہموار نہیں رکھ سکتا۔ تاوقتیکہ اسے قانون توڑنے کی صورت میں اپنی سزا اور دارو گیر کا یقین نہ ہو۔ جب کہ دوسرے تمام معاشرے قوانین کی تفہیم پر تو زور دیتے ہیں ' لیکن اس کے لیے ایمانی قوت یعنی دلوں میں آمادگی پیدا نہیں کرتے۔ نتیجتاً اپنے سارے وسائل کی فراوانی کے باوجود قانون کی بالادستی اور اس پر عمل کو بروئے کار لانے میں ناکام رہتے ہیں۔

غالباً 1925ء کی بات ہے کہ امریکہ نے شراب خانہ خراب کے معاشرے پر اثرات بد کو دیکھتے ہوئے اس پر پابندی کا بل پارلیمنٹ ہاؤس سے منظور کروایا۔ پھر اس پر عمل کی ترغیبات کے لیے اپنے تمام ذرائع ابلاغ کو وقف کر دیا۔ جو کاوشیں ممکن ہو سکتی تھیں کی گئیں۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کی عادت بد میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور شراب پینے والوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ شراب خانے سرکاری طور پر تو بند کر دیے گئے تھے ' لیکن اب گھر گھر میں شراب کی بھٹیاں کھل گئیں اور شراب کشید ہونے لگی۔ بالآخر انہی برعکس اثرات کو دیکھتے ہوئے امریکہ کی پارلیمنٹ نے آٹھ سال کے بعد شراب کے اس بل کو واپس لے لیا۔ اس کے برعکس صدیوں پہلے مدینہ منورہ میں شراب کی ممانعت کا ایک تجربہ ہوا۔ قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں ' جن میں حرمت شراب کا ذکر کیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان آیات کے کانوں تک پہنچنے کی دیر تھی کہ لبوں تک آئے ہوئے جام گر گئے اور چھلکتی ہوئی شراب کے مٹکے ٹوٹ گئے۔ لوگوں نے نہ صرف پینا پلانا چھوڑا بلکہ اس کی تجارت تک ممنوع ہو گئی۔ اس کے برتن تک توڑ ڈالے۔ ان دونوں طرح کے طرز عمل کو جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم فطری اور نفسیاتی اسلوب کیوں اختیار کرتا ہے ' جس میں احکام کے ساتھ ساتھ وہ طبیعتوں کے گداز کا سامان بھی کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔ (روح)

اللہ کا حق توبہ سے معاف ہو جاتا ہے

یعنی مذکور بالا سزائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر تھیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کر لینے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی کا مال لیا تھا تو ضمان دینا ہوگا، قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائے گا۔ ہاں ان چیزوں کے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو حاصل ہے (تنبیہ) اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد شرب خمر، حد سرقہ، حد قذف توبہ سے مطلقاً ساقط نہیں ہوتیں۔

ڈاکوؤں کی سزا

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جو شخص مسلمانوں پر تلوار اٹھائے، راستوں کو پر خطر بنادے، امام المسلمین کو ان تینوں سزاؤں میں سے جو سزا دینا چاہے اس کا اختیار ہے۔ ہاں ایک حدیث میں کچھ تفصیل سزا ہے، اگر اس کی سند صحیح ہو تو وہ یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب ان محاربین کے بارے میں حضرت جبرائیل سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جنھوں نے مال چرایا اور راستوں کو خطرناک بنادیا ان کے ہاتھ تو چوری کے بدلے کاٹ دیجئے اور جس نے قتل اور دہشت گردی پھیلائی اور بدکاری کا ارتکاب کیا ہے، اسے سولی چڑھادو۔

قبیلہ مراد کا ایک آدمی

قبیلہ مراد کا ایک شخص حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس کوفہ کی مسجد میں جہاں کے یہ گورنر تھے، ایک فرض نماز کے بعد آیا اور کہنے لگا اے امیر کوفہ فلاں بن فلاں مرادی قبیلے کا ہوں، میں نے اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی لڑی، زمین میں فساد کی کوشش کی لیکن آپ لوگ مجھ پر قدرت پائیں، اس سے پہلے میں تائب ہو گیا اب میں آپ سے پناہ حاصل کرنے والے کی جگہ پر کھڑا ہوں۔ اس پر حضرت ابو موسیٰ کھڑے ہو گئے اور فرمایا اے لوگو! تم میں سے کوئی اب اس توبہ کے بعد اس سے کسی طرح کی لڑائی نہ کرے، اگر یہ سچا ہے تو الحمد للہ اور یہ جھوٹا ہے تو اس کے گناہ ہی اسے ہلاک کر دیں گے۔ یہ شخص ایک مدت تک تو ٹھیک ٹھیک رہا لیکن پھر بغاوت کر گیا، اللہ نے بھی اس کے گناہوں کے بدلے اسے غارت کر دیا اور یہ مار ڈالا گیا۔

قبیلہ عکل کا آدمی

چنانچہ بخاری مسلم میں ہے کہ قبیلہ عکل کے آٹھ آدمی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے، آپ نے ان سے فرمایا اگر تم چاہو تو ہمارے چرواہوں کے ساتھ چلے جاؤ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب تمہیں ملے گا چنانچہ یہ گئے اور جب ان کی بیماری جاتی رہی تو انھوں نے ان چرواہوں کو مار ڈالا اور اونٹ لے کر چلتے بنے، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ کو ان کے پیچھے دوڑایا کہ انھیں پکڑ لائیں، چنانچہ یہ گرفتار کئے گئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے پیش کئے گئے۔ پھر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے اور آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں اور دھوپ میں پڑے ہوئے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

توبہ کی اجازت کی حکمت

ایک طاقتور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا، اس لیے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا، کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو اور ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہے اس لیے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی

علی اسدی کی توبہ

اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھہ جمع کرکے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی، (آیت) یعبادی الذین اسرفوا۔ قاری کے پاس پہنچے، اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی، اور رہزنی سے توبہ کرکے مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابوہریرہ (رض) ان کا ہاتھ پکڑ کر امیر مدینہ کے پاس لے گئے، اور قرآن کی آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ حکومت بھی ان کے فساد و رہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کو خوشی ہوئی۔

حارثہ بن اسد

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کرکے نکل گیا، اور قتل و غارت گری کو پیشہ بنالیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کرکے واپس آیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

حد کی معافی سے بندوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے

یہاں یہ بات قابل یادداشت ہے کہ حد شرعی کے معاف ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہوجائیں، بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد ہے تو اولیاء مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے سے معاف ہوجائے گا، اور جو کوئی مالی نقصان کسی کو پہنچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف کرانا لازم ہے، امام اعظم ابوحنیفہ (رح) اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا خود توبہ کا ایک جز ہے، بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی، اس لیے کسی ڈاکو کو تائب اسی وقت مانا جائے گا جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرالے۔ (تفسیر مفتی اعظم) (گلدستہ)

مسائل

۱۔ گرفتاری سے پہلے توبہ کرنے والوں کو اللہ معاف فرمادیتا ہے۔

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا : اے وہ][الَّذِيْنَ : لوگ جو][اٰمَنُوا : ایمان لائے][اتَّقُوا : تم ڈرو][اللّٰهَ : اللہ سے][وَابْتَغُوْٓا : اور تلاش کرو][اِلَيْهِ : اس کی طرف][الْوَسِيْلَةَ : قرب ذریعہ][وَجَاهِدُوْا : اور جہاد کرو][فِيْ : میں][سَبِيْلِهٖ : اس کی راہ][لَعَلَّكُمْ : تاکہ][تُفْلِحُوْنَ : تم فلاح پاؤ]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس (کے حضور) تک (تقرب اور رسائی کا) وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ

تشریح:

آیات سابقہ سے مناسبت

اس سے پہلے متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی سرکشی اور عناد اور اللہ کی نافرمانی کرنے پر ان کی جسارت اور دیدہ دلیری کو بیان فرمایا تھا ' اور اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے سے ان کے بعد اور دوری کا ذکر فرمایا تھا۔ اللہ کے قرب کا وسیلہ اور ذریعہ اس کے خوف سے گناہوں کا ترک کرنا اور عبادات کا بجالانا ہے ' یہود نے اس وسیلہ کو حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تمہارا طریقہ یہود کے برعکس ہونا چاہیے ' تم اللہ کے خوف سے گناہوں کو ترک کرکے اور اس کی اطاعت اور عبادات کرکے اس کے قرب کا وسیلہ تلاش کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے ذکر فرمایا تھا کہ یہود کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور اپنے باپ دادا کے اعمال پر فخر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتایا کہ تمہیں اپنے اکابر اور اسلاف پر فخر کرنے کے بجائے نیک اعمال میں کوشش کرنی چاہیے ' اور عبادات کے ذریعہ اس کے قرب اور نجات کے وسیلہ کو تلاش کرنا چاہیے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس سے متصل آیت میں اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر فرمایا تھا اور فرمایا تھا کہ اللہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے ' اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ قبولیت توبہ کے لیے اس کی بارگاہ میں وسیلہ تلاش کرو۔ (تبیان)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تین چیزوں کا حکم دیا ہے جن کی پیروی میں انسان کی فلاح کا راز مضمر ہے :
1 ۔ تقویٰ اختیار کرو یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرو۔ (تفسیر صاوی)
2 ۔ ایسا وسیلہ تلاش کرو جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب لے جائے۔ ان وسائل میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اولیاء کی محبت ، اللہ والوں کی زیارت ، صدقات ، دعا اور ذکر وغیرہ شامل ہیں۔
(تفسیر صاوی)
3 ۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو یعنی کفار حملہ کردیں تو ان کے مقابلہ میں نکلو اور میدان جنگ میں داد شجاعت دو۔ یہ چھوٹا جہاد ہے اور اگر شیطان تمہارے نفس کو برائیوں پر اکسائے تو اس کے خلاف سینہ سپر ہو جاؤ اور اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرو۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ (امداد)
حضرت شاہ ولی اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس آیت میں وسیلہ سے مراد مرشد کی بیعت ہے۔ (قول جمیل) اور اسی آیت کی تشریح میں مولوی اسماعیل صاحب دہلوی لکھتے ہیں : اہل سلوک کے نزدیک وسیلہ سے مراد مرشد ہے جس کی رہنمائی کے بغیر راہ حقیقت کا ملنا شاذ و نادر ہے۔ (صراط مستقیم)
ااسلام میں دو قسم کی بیعت کا تصور پایا جاتا ہے : ایک سربرہ حکومت کی بیعت تاکہ اس کی اطاعت کا باضابطہ اعلان کیا جائے اور دوسرا پیر کامل کی بیعت تاکہ اس کی رہنمائی میں قرب خداوندی کی منازل طے کی جائیں اور پیر کامل میں درج ذیل چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ جس میں یہ چار شرائط نہ ہوں اس کی بیعت کرنا جائز نہیں ہے۔ ان شرائط کی بنیاد بہار شریعت اور امام احمد رضا خاں (رح) کے فتاویٰ افریقہ میں دیکھی جاسکتی ہی یعنی پیر کامل وہ ہے :
1 ۔ جو مسلمان ہو اور اس کا عقیدہ صحیح ہو یعنی اہل سنت وجماعت ہو کیونکہ کسی کافر و بد عقیدہ کی بیعت جائز نہیں۔
2 ۔ جو عالم دین ہو یعنی قرآن وحدیث اور فقہ کا عالم ہو تاکہ مریدین کے مسائل کا اسلامی حل بیان کرسکے۔
3 ۔ جو قرآن وسنت پر عمل پیرا ہو اور کوئی ایسا کام نہ کرتا ہو جو اسلام میں ناپسندیدہ ہو تاکہ مریدین پورے اطمینان کے ساتھ اس کی اطاعت کریں ، کیونکہ بزرگ کہتے ہیں : اگر کوئی شخص ہوا میں اڑتا ہوا آرہا ہو اور سنت نبوی کا تارک ہو تو وہ جادوگر تو ہوسکتا ہے مگر پیر کامل نہیں ہوسکتا۔
4 ۔ جس کے مشائخ کا سلسلہ بیعت حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک متصل ہو اور فیضان نبوت کی یہ کڑیاں کہیں سے منقطع نہ ہوں یعنی اس کے پیر نے اپنے پیر کی ، پھر اس کے پیر نے اپنے پیر کی بیعت کی ہو حتیٰ کہ یہ سلسلہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہنچتا ہو تاکہ نسبت کی برکتیں شامل حال رہیں اور قرب خداوندی کی منازل آسانی سے طے ہوں۔
جن خوش نصیب حضرات میں مذکورہ بالا چار شرائط پائی جائیں ان کی تلاش میں سفر کرنا اور ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارنا اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چند ارشادات کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے :
1 ۔ جو شخص نیک لوگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا ہے وہ خوش قسمت ہے اور اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری : 6408 : کتاب الدعوات : باب 66)

2۔ بنی اسرائیل کی ایک شخص نے نیک لوگوں کے پاس جانے کی نیت سے اپنا سفر شروع کیا، اگرچہ ان تک نہ پہنچ سکا اور راستہ میں ہی فوت ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے سو قتل جیسے جرائم کو معاف کر کے اسے جنت کا مستحق بنا دیا۔ (مسلم: 7008: کتاب التوبہ: باب 8) (امداد)

وسیلہ کی حقیقت

اردو میں وسیلہ کا معنی ہے ذریعہ اور واسطہ جس سے بیشمار مسلمانوں کو قرآن کے لفظ وسیلہ کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے جبکہ قرآن مجید میں اس کا معنی اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنا ہے۔ تقوی اور نیکی کے کاموں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کی کوشش کرنا۔ حدیث میں وسیلہ کا معنی مقام علیا ہے جس پر فائز ہو کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کے دن رب کریم کے حضور سجدہ ریز ہو کرامت کی سفارش کریں گے اس کا تذکرہ اذان کے بعد کی دعا میں موجود ہے۔آپ ﷺ نے اسی مقام کے لیے دعا کرنے کی تلقین کی ہے۔

یہ دنیا عالم اسباب ہے اس کا پورا انظام اسباب اور وسائل پر چل رہا ہے جب تک وسائل کو بروئے کار نہیں لایا جائے گا اس وقت تک دنیا کے معاملات صحیح سمت پر چلنے تو در کنار زندگی کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ ایک شخص کتنا ہی متوکل علی اللہ کیوں نہ ہوا گر پیاس کے وقت پانی نہیں پیتا اور بھوک کے وقت کھانا نہیں کھاتا تو موت کا لقمہ بن جائے گا۔ بیمار کے لیے پرہیز اور دوائی لازم ہے۔ بغیر اسباب کے کسی چیز کو باقی رکھنا یہ صرف خالق کائنات کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

لہٰذا شریعت نے کمزور کے ساتھ تعاون اور بے سہارا کو سہارا دینا اور بے وسیلہ کا وسیلہ بننے کا حکم دیا ہے۔ (فہم)

آیت میں وسیلہ کا معنی یہ ہے کہ "جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادات چاہے فرض ہوں یا نفل، ان کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو۔ اور اگر تقویٰ سے مراد فرائض و واجبات کی ادائیگی اور حرام چیزوں کو چھوڑ دینا مراد لیا جائے اور وسیلہ تلاش کرنے سے مُطْلَقًاہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کا سبب بنے مراد لی جائے تو بھی درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء (علیہ السلام) اور اولیاء (رح) سے محبت، صدقات کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی زیارت، دعا کی کثرت، رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا اور بکثرت ذِکْرُ اللہ عَزَّوَجَلَّ میں مشغول رہنا وغیرہ بھی اسی عموم میں شامل ہے۔ اب معنی یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قریب کر دے اسے لازم پکڑ لو اور جو بارگاہ الٰہی سے دور کرے اسے چھوڑ دو۔

(صاوی، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۳۵، ۲/۴۹۷)

نیک بندوں کو وسیلہ بنانا جائز ہے

یاد رکھئے ! رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے نیک بندوں کو وسیلہ بنانا، ان کے وسیلے سے دعائیں کرنا، ان کے تَوَسُّل سے بارگاہ ربِّ قدیر عَزَّوَجَلَّ میں اپنی جائز حاجات کی تکمیل کے لیے التجائیں کرنا نہ صرف جائز بلکہ صحابہ کرام (رض) کا طریقہ رہا ہے۔ چنانچہ اس سے متعلق یہاں 3 روایات ملاحظہ ہوں:

(1)۔۔ صحیح بخاری میں حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عمر بن خطاب (رض) حضرت عباس بن عبدالمطلب (رض) کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے اور عرض کرتے "اللّٰھُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّنَا فَتَسْقِیْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا "اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وسیلہ پکڑا کرتے تھے تو تو ہم پر بارش برسا دیتا تھا اور اب ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچاجان (رض) کو وسیلہ بناتے ہیں کہ ہم پر بارش برسا۔ تو لوگ سیراب کیے جاتے تھے۔ (بخاری، کتاب الاستسقائ، باب سؤال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا، ۱/۳۴۶، الحدیث : ۱۰۱۰)

(2)۔۔ حضرت اوس بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے لوگ سخت قحط میں مبتلا ہوگئے تو انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے اس کی شکایت کی۔آپ (رض) نے فرمایا: رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر انور کی طرف غور کرو، اس کے اوپر (چھت میں) ایک طاق آسمان کی طرف بنادو حتّٰی کہ قبر انور اور آسمان کے درمیان چھت نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا کیا تو ہم پر اتنی بارش برسی کہ چارہ اگ گیا اور اونٹ موٹے ہوگئے حتّٰی کہ چربی سے گویا پھٹ پڑے، تو اس سال کا نام عَامُ الْفَتْق یعنی پھٹن کا سال رکھا گیا۔

(سنن دارمی، باب ما اکرم اللہ تعالٰی نبیہ۔۔ الخ، ۱/۵۶، الحدیث : ۹۲)

(3)۔۔ بلکہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے وسیلے سے اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا کرنے کی تعلیم ایک صحابی (رض) کو دی، چنانچہ حضرت عثمان بن حُنَیف (رض) سے روایت ہے کہ ایک نابینا شخص بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہو کر دعا کے طالب ہوئے تو ان کو یہ دعا ارشاد فرمائی "اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ قَدْ تَوَجَّہْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ ہٰذِہٖ لِتُقْضٰی اللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ "اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف نبی رحمت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلے سے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف اپنی اس حاجت میں توجہ کی تاکہ میری حاجت پوری کر دی جائے، اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، میرے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت قبول فرما۔

(ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنّۃ فیہا، باب ما جاء فی صلوۃ الحاجۃ، ۲/۱۵۶، الحدیث : ۱۳۸۵)

نوٹ : جو شخص اس حدیث پاک میں مذکور دعا پڑھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ اس دعا میں ان الفاظ "یَا مُحَمَّد" کی جگہ "یَا نَبِیَّ اللہ" یا "یَا رَسُوْلَ اللہ" پڑھے۔ (صراط)

ابن منظور لفظ وسیلہ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ الوسیلہ فی الاصل ما یتوصل بہ الی الشیء ویتقرب بہ الیہ (لسان العرب) یعنی جس چیز کے ذریعہ کسی تک پہنچا جائے اور اس کا قرب حاصل ہو اسے وسیلہ کہتے ہیں۔ والوسیلۃ کل ما یتقرب بہ (کشاف) ۔ایمان، نیک اعمال، عبادات، پیروی سنت اور گناہوں سے بچنا یہ سب اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں اور مرشد کامل جو اپنی روحانی توجہ سے اپنے مرید کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی اتار دے۔ دل میں یاد الٰہی کی تڑپ پیدا کردے اس کے وسیلہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ کاملین امت نے ایسے مرشد کی تلاش میں سینکڑوں، ہزاروں کوس کی مسافت کو پاپیادہ طے کیا ہے۔ اور ان کی رہنمائی اور دستگیری سے آسمان معرفت وحکمت پر مہر وماہ بن کر چمکے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ (رح) نے تصریح فرمائی ہے کہ اس آیت میں وسیلہ سے مراد بیعت مرشد ہے (قول جمیل) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے شاہ اسماعیل صاحب دہلوی کو بھی لکھنا پڑا۔ "اہل سلوک ایں آیت را اشارت بسلوک مے فہمند و وسیلہ مرشد را مے دانند پس تلاش مرشد بنا بر فلاح حقیقی وفوز تحقیقی پیش از مجاہدہ ضروری ست وسنت اللہ بر ہمیں منوال جاریست لہٰذا بدون مرشد راہ یابی نادر است"۔ (صراط

مستقیم) یعنی سالکان راہ حقیقت نے وسیلہ سے مراد مرشد لیا ہے۔ پس حقیقی کامیابی اور کامرانی حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ وریاضت سے پہلے تلاش مرشد از بس ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے سالکان راہ حقیقت کے لیے یہی قاعدہ مقرر فرمایا ہے۔ اسی لیے مرشد کی رہنمائی کے بغیر اس کاملنا شاذو نادر ہے۔

مولوی ہر گز نشد مولائے روم تاغلام شمس تبریزی نشد (رومی)

دم عارف نسیم صبحدم ہے اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (اقبال)

اللہ تعالیٰ کاقرب حاصل کرنے کے لیے تقویٰ اختیار کرنے، وسیلہ تلاش کرنے کے علاوہ ہر دم مصروف جہاد رہنا بھی ضروری ہے جہاد اصغر بھی اور جہاد اکبر بھی۔ کفار سے بھی اور نفس امارہ سے بھی۔ اور ان تمام نظریات اور افکار سے بھی جو کسی حیثیت سے اسلامی عقائد اور مسلمات سے ٹکر اتے ہیں۔ تب جا کر فلاح و کامرانی نصیب ہو گی۔

چومی گویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلات لاالہ را (اقبال) (ضیاء)

المختصر۔۔ اپنے سر سے پیر تک میں پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ، یا بلفظ دیگر تم خود سر سے پیر تک اسلام میں داخل ہو جاؤ اپنے ظاہری اور باطنی ہر ہر حصے کو مسلمان بنالو تم کو کوئی کسی زاویئے سے اور کسی بھی نظر سے دیکھے تم اسے مسلمان ہی نظر آؤ، یہ ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا۔ مگر خیال رہے کہ ایمان واعمال صالحہ کو اپنا کر مطمئن نہ ہو جاؤ اور یہ نہ سمجھ لو کہ منزل تک پہنچ گئے بلکہ اٹھو اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ یعنی وہ چیز جس کے اس کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کے واسطے وسیلہ کر سکیں۔

جامع بات اس باب میں یہ ہے کہ جناب الٰہی میں تقرب حاصل کرنے کے لیے اوامر نواہی کا لحاظ رکھنا وسیلہ کلی ہے اس سلسلے میں بعض عارفین کے بصیرت افروز اور چشم کشاارشادات ہیں۔

۱) ریا سے اعمال کی تجرید۔ عجب سے احوال کی تفرید، اور طلب حظوظ سے انفاس کو خالص کرلینا وسیلہ قرب الٰہی ہے۔

۲)۔۔ عابدوں کا وسیلہ فضائل ہیں عالموں کا وسیلہ دلائل ہیں اور عارفوں کا وسیلہ ترک وسائل ہے عابد تو معاملہ سے توسل ڈھونڈتا ہے اور عالم مکاشفہ سے راہ چلتا ہے اور عارف معائنہ سے راہ دیکھ لیتا ہے عابد تو اس آیت میں فکر کرتا ہے کہ۔۔ کھڑے بیٹھے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور عالم اس آیت پر نظر کرتا ہے۔ کیا ملکوت وسماوات میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے۔ اور عارف اس بات سے در گزر نہیں فرماتا۔ بس اللہ کہو، پھر ماسوی اللہ کو نظر انداز کردو۔

(۳)۔۔ ایک عارف تو یہاں تک کہہ دیا کہ الٰہی تیرے طرف وسیلہ بھی تو ہی ہے اگر کسی نے طلب سے تجھے پایا تو میں نے خود طلب تجھی سے پائی۔ المختصر۔۔ ہر اس شخص پر جو الذین آمنو کا مصداق ہے وسیلہ کا طلب کرنا لازمی ہے۔ پس جو جس درجے کا مومن ہو گا اس کا وسیلہ اس کی شایان شان ہو گا۔ جس کا مطلوب جتنا اعلی ہو گا اس مطلوب تک پہنچے کے لیے اس کا وسیلہ بھی اتنا ہی اعلی ارفع ہو گا جو اسکو اسے مطلوب تک پہنچاسکے رہ گیا ہم جیسے گناہ گاروں اور غفلت شعاروں کا معاملہ جن کی زبان حال یہ کہنے پر مجبور ہے۔ فقط تمہارا شفاعت کا آسرا ہے حضور ہمارے پاس گناہوں کے ماسوا کیا ہے۔ ایسوں کے لیے ان کے اپنے طور پر انجام دیئے ہوئے اعمال صالحہ یعنی امتثال اوامر اور اجتناب نواہی کا بذات خود بارگاہ الٰہی میں مقبول ہونا، خود انہی کے نزدیک غیر یقینی ہے ان کی ان فطری ممکنہ کوتاہیوں کے سبب جو گویا ان کے خمیر کا حصہ ہو گئی ہے اور

ظاہر ہے صرف نامقبول اعمال کو قرب الٰہی کا وسیلہ بنانا اور اسی پر بھروسہ کرلینا، ہرگز ہرگز دانش مندی نہیں تو ہم جیسوں پر لازم ہے کہ ان نفوس قدسیہ رکھنے والوں کو بھی اپنا وسیلہ اور سفارشی قرار دیں، جن کا مقبول بارگاہ الٰہی ہونا یقینی ہے۔
اور وہ انبیاء صدیقین اور شہداء صالحین ہیں ان سے قلبی تعلق، باطنی، ربط وضبط مخلصانہ عقیدت محبت۔ان کے ذکر کی کثرت ان کی پیروی و اطاعت اور ان کی سچی ارادت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں تاکہ اگر خدانخواستہ میدان حشر میں یہ ظاہر ہو کہ ہمارے اپنے سارے اعمال کسی بھی سبب سے نامقبول ہوگئے ہیں تو اس کھٹن گھڑی میں ان مقبولوں کی سفارش ہماری نجات کا سبب بن جائے اب ارشاد قرآنی کا حاصل ہوا کہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو خواہ وہ مقبول اعمال صالحۃ کا وسیلہ ہو اور خواہ مقبول افراد صالحین کا وسیلہ ہو۔
(اور جہاد کرو اس کی راہ میں) ظاہری اعداء اور باطنی اعداء دونوں کے ساتھ پھر امید رکھو کہ ان اعمال کے سبب بفضلہ تعالیٰ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فلاح کو چار چیزوں سے متعلق کیا کہ بے ان چار چیزوں کے اصلی چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔
پہلے:۔۔ ایمان: کہ ابتداء خلقت میں نور پہنچاتا ہے اور یہ بندہ کو شرک کی تاریکیوں کے پردوں سے خلاصی دیتا ہے۔
دوسرے:۔۔ تقوی: کہ اعمال شرعیہ کا منبع اور خلاق مرضیہ کا منشا ہے سالک اس کے سبب سے گناہ کی ظلمت سے نجات پاتا ہے۔
تیسرے: وسیلہ ڈھونڈنا اور ظاہر ہے کہ فنائے ناسوت ہے بقائے لاہوت میں، اور عارف اس کے سبب ہستی کی تاریکی سے باہر آتا ہے۔
چوتھے:۔۔ جہاد اور وہ انانیت کو مضمحل اور ہویت کو ثابت کرتا ہے اور موحد اس مقام پر پہنچ کر وجودگی تیرگی سے چھوٹ کر شہود کے نور میں پہنچ جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے وسیلے کی تلاش ضروری ہے لیکن وسیلہ اسی کو بنایا جائے جو حقیقتاً وسیلہ بن سکے اب اگر کوئی اپنی مرضی سے اپنے مشرکانہ وکافرانہ اعمال کو بارگاہ خداوندی میں پہنچنے کا وسیلہ گمان کرنے لگے، اور سمجھنے لگے کہ ہم اپنے کافر آباء واجداد اور اپنے اموال اور سرمایہ کے وسیلے سے دوزخ کے دائمی درد دینے والے عذاب سے بچ جائیں گے تو یہ سب اس کی خام خیالی ہے۔(اشرفی)

آیت مبارکہ:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک][الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو][كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا][لَوْ اَنَّ : اگر بیشک][لَهُمْ : ان کے لیے][مَّا فِي : جو میں][الْاَرْضِ : زمین][جَمِيْعًا : سب][وَّمِثْلَهٗ : اور اس جیسا][مَعَهٗ : اس کے ساتھ][لِيَفْتَدُوْا بِهٖ : کہ وہ معاوضہ دیں اس کو][مِنْ : سے عَذَابِ : عذاب][يَوْمِ : دن][الْقِيٰمَةِ : قیامت][مَا : نہیں][تُقُبِّلَ : قبول کیا جائے گا][مِنْهُمْ : ان سے][وَلَهُمْ : اور ان کے لیے][عَذَابٌ: عذاب][اَلِيْمٌ : اذیت ناک]

ترجمہ: بیشک جو لوگ کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں اگر ان کے پاس وہ سب کچھ (مال و متاع اور خزانہ موجود) ہو جو روئے زمین میں ہے بلکہ اس کے ساتھ اتنا اور (بھی) تاکہ وہ روز قیامت کے عذاب سے (نجات کے لئے) اسے فدیہ (یعنی اپنی جان کے بدلہ) میں دے دیں تو (وہ سب کچھ بھی) ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح:

(ک ف ر) الکفر

اصل میں کفر کے معنی کیس چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوات کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار یہ دین کے معنی میں اور کفور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے : ۔فَاَبَی الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا کُفُوۡراً [الاِسراء/99] توظالموں نے انکار کرنے کے سوااسے قبول نہ کیا۔

مناظر علمی برائے انتباہ

بطور فرض انسان جو تصور کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اہل کفر کے پاس زمین کے تمام خزانے ہوں اور اسی قدر مزید ان کے لیے فرض کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم ان کے لیے یہ بھی فرض کرتا ہے کہ اس جہان جیسا ایک دوسرا جہان بھی ان کے پاس ہو۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ فرض کرتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن یہ تمام مفروضہ دولت بطور فدیہ اور کفارہ کفر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔ قرآن کریم ایک ایسا منظر نظروں کے سامنے لاتا ہے کہ وہ آگ سے کس طرح نکلنا چاہتے ہیں مگر وہ نکل نہیں سکتے۔ وہ اپنے اس مقصد اور ہدف میں ناکام رہتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں زندہ رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے اندر کئی مناظر ہیں اور جس میں کئی مسلسل حرکات ہیں۔ ایک منظر کفار کا ہے وہ اپنے پاس اس پورے جہان کی دولت لیے ہوئے ہیں پھر اچانک یہ دولت دوگنی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس دولت کو لے کر اسے بطور فدیہ دینے کی پیشکش کرتے ہیں۔ پھر ان کا یہ منظر سامنے آتا ہے کہ وہ یہ مقصد حاصل کرنے میں ناکام لوٹتے ہیں اب انھیں یہ مقصد حاصل کرنے کی کوئی آس بھی نہیں رہتی۔ پھر وہ اچانک آگ میں داخل ہوتے ہیں اور وہ اس سے باہر بھاگنا چاہتے ہیں مگر بھاگ نہیں سکتے۔ پھر ان کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں باقی رہیں۔ اب پردہ گرتا ہے اور وہ یہاں ہی فروکش ہو جاتے ہیں۔ (دیکھئے کتاب التصویر الفنی میں فصل طریقہ القرآن)

قیامت کے دن اہل کفر کو عذاب کا سامنا اور جان چھڑانے کیلئے سب کچھ دینے پر راضی ہونا

اس کے بعد اہل کفر کے بارے میں فرمایا کہ جب قیامت کے دن عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے تو ان کی یہ آرزو اور تمنا ہوگی کہ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اور اس کے ساتھ اس کے بقدر اور بھی ہو اور یہ سب دے کے خلاصی پالیں اور جان چھڑالیں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اول تو وہاں کچھ ہونے کا ہی نہیں تاکہ اس کو جان کے بدلہ میں دیا جاسکے اور بالفرض ہو بھی اور اس کو دے کر جان چھڑانا چاہے تو کوئی بدلہ اور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور جو دردناک عذاب ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بہر حال اس عذاب میں ہمیشہ رہنا ہی ہوگا۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا (اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افۡتَدٰى بِهٖ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ وَّمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ) (یعنی بیشک جنھوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اس حالت میں مر گئے کہ کافر تھے تو ان سے ہرگز بھی زمین بھر کر سونا قبول نہ کیا جائے اگرچہ وہ اس کو جان کے بدلہ میں دینا چاہیں، یہ لوگ ہیں جن کو دردناک عذاب ہوگا اور کوئی بھی ان کا مددگار نہ ہوگا) اور سورۃ رعد میں فرمایا (وَالَّذِيۡنَ لَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهٗ لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا وَّمِثۡلَهٗ مَعَهٗ لَافۡتَدَوۡا بِهٖ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ وَمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ) (اور جنھوں نے اس کا کہنا نہ مانا اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور

اسی قدر اس کے ساتھ اور ہو تو یہ لوگ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کو دے ڈالیں، ان لوگوں کے لیے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے)۔

اور سورۃ زمر میں فرمایا (وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ) (اور ظلم کرنے والوں کے پاس اگر دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان کے ساتھ اسی قدر اور بھی ہو تو یہ لوگ قیامت کے دن برے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنی جان کے بدلہ میں دینے کو تیار ہوں گے) قیامت کے دن جب عذاب دیکھیں گے تو نہ صرف مال بلکہ آل اولاد واعزہ واقرباء سب کو اپنی جان پر قربان کرنے اور اپنی جان کو عذاب سے چھڑانے کی آرزو کریں گے۔ سورۃ معارج میں فرمایا (يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ كَلَّا) یعنی اس دن مجرم تمنا کرے گا کہ کاش اس دن عذاب سے چھوٹنے کے عوض میں بیٹوں کو اور اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی اور اپنے کنبہ کو جس میں رہا کرتا تھا نیز جتنے لوگ زمین پر ہیں سب کو دیدے پھر یہ معاوضہ اس کو بچالے، نہیں۔

کافر دوزخ سے نکلنا چاہیں گے مگر کبھی نہ نکل سکیں گے۔ (انوار البیان)

آخرت کی کامیابی تقویٰ سے مل سکتی ہے

پچھلی آیت میں بتلایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے۔ اس آیت میں متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے بھی زائد خرچ کر ڈالینگے اور فدیہ دے کر عذاب الٰہی سے چھوٹنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ غرض وہاں کی کامیابی تقویٰ ابتغائے وسیلہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔ (گلدستہ)

حدیث میں آتا ہے کہ ایک جہنمی کو جہنم سے نکال کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیگا، تو نے اپنی آرام گاہ کیسی پائی؟ وہ کہے گا بدترین آرام گاہ ہے اللہ تعالیٰ فرمائیگا کیا تو زمین بھر فدیہ دے کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا پسند کرے گا؟ وہ اثبات میں جواب دیگا، اللہ تعالیٰ فرمائیگا میں نے تو دنیا میں اس سے بھی کم کا تجھ سے مطالبہ کیا تھا، تو نے وہاں اس کی پروا نہیں کی، اور اسے دوبارہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم صفۃ القیامہ بخاری شریف کتاب الرقاق والانبیاء)۔ (جلالین)

یعنی اگر کافر دنیا کا مالک ہو اور اس کے ساتھ اس کے برابر دوسری دنیا کا مالک ہو اور یہ سب کچھ اپنی جان کو قیامت کے دن کے عذاب سے چھڑانے کے لیے فدیہ کردے تو اس کا یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور قیامت کے دن کافروں کو عذاب ضرور ہوگا، اس دن ان کے پاس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۳۶، ۱/۴۹۱)

حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن جب کافر کو پیش کیا جائے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ اگر تیرے پاس اتنا سونا ہو کہ اس سے زمین بھر جائے تو کیا تو اسے اپنے بدلے میں دینے کو تیار ہو جاتا؟ وہ اثبات میں جواب دے گا تو اس سے کہا جائے گا: تم سے اس کی نسبت بہت ہی آسان چیز کا مطالبہ کیا گیا تھا (یعنی ایمان کا)۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب من نوقش الحساب عذّب، ۴/۲۵۷، الحدیث: ۶۵۳۸)

حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص سے فرمائے گا جسے جہنم میں سب سے کم عذاب ہوگا کہ اگر تیرے پاس زمین کی ساری چیزیں ہوں تو کیا تو انھیں اپنے بدلے میں دے دیتا۔ وہ جواب دے گا: جی ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا "میں نے اس سے بھی آسان چیز تجھ سے چاہی تھی جب کہ تو آدم کی پشت میں تھا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا تو تو نے انکار کیا اور میرے ساتھ شرک کرتا رہا۔ (بخاری، کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنّۃ والنار، ۴/۲۶۱، الحدیث: ۶۵۵۷)

ایمان کی حفاظت کی فکر کرنا بہت ضروری ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان ہوگا تو ہی قیامت کے دن اعمال کا اجر ملے گا، تبھی شفاعت کا فائدہ ہوگا، تبھی رحمت الٰہی متوجہ ہوگی اور تبھی جہنم سے چھٹکارا ملے گا، اس لیے ایمان کی حفاظت کی فکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے بزرگان دین نیک اعمال کی کثرت کے باوجود ہمیشہ برے خاتمے سے ڈرتے رہتے تھے، چنانچہ:

جب حضرت سفیان ثوری (رح) کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ بے حد بے قرار اور مُضْطَرب ہوئے اور زار و قطار رونے لگے۔ لوگوں نے عرض کی: حضور! ایسی گریہ وزاری نہ کریں، اللہ تعالیٰ کی بخشش اور مغفرت آپ کے گناہوں سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ (رح) نے جواب دیا: مجھے اس بات کا یقین نہیں کہ میرا خاتمہ بالخیر ہوگا، اگر یہ پتا چل جائے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہوگا تو مجھے پہاڑوں کے برابر گناہوں کی بھی پروانہ ہوگی۔

حضرت امام حسن بصری (رض) سے پوچھا گیا: آپ کا کیا حال ہے؟ آپ (رض) نے فرمایا "جس شخص کی کشتی دریا کے درمیان جا کر ٹوٹ جائے، اس کے تختے بکھر جائیں اور ہر شخص ہچکولے کھاتے تختوں پر نظر آئے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ عرض کی گئی: بے حد پریشان کُن۔ آپ (رض) نے فرمایا "میرا بھی یہی حال ہے۔

ایک بار آپ (رض) ایسے دل گرفتہ ہوئے کہ کئی سال تک ہنسی نہ آئی۔ لوگ آپ (رض) کو ایسے دیکھتے جیسے کوئی قید تنہائی میں ہے اور اسے سزائے موت سنائی جانے والی ہے۔ آپ (رض) سے اس غم و حزن کا سبب دریافت کیا گیا کہ آپ اتنی عبادت و ریاضت اور مجاہدات کے باوجود فکرمند کیوں رہتے ہیں؟ آپ (رض) نے فرمایا "مجھے ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے اور وہ فرمادے کہ "تم جو چاہے کرو مگر میری رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوگی۔ بس اسی وجہ سے میں اپنی جان گھلا رہا ہوں۔ (1) (کیمیاء سعادت، رکن چہارم: منجیات، اصل سیم در خوف ورجا، ۲/۸۲۵-۸۳۲)

ایمان پہ موت بہتر او نفس
تیری ناپاک زندگی سے (صراط)

آیت مبارکہ:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

لغۃ القرآن: [يُرِيْدُوْنَ : وہ لوگ چاہیں گے][اَنْ : کہ][يَّخْرُجُوْا : وہ نکلیں][مِنَ النَّارِ : آگ سے][وَمَا : حالانکہ][هُمْ : هم][بِخٰرِجِيْنَ : نکلنے والے نہیں ہیں][مِنْهَا : اس سے][وَلَهُمْ : اور ان کے لیے][عَذَابٌ: عذاب] [مُّقِيْمٌ: ہمیشہ رہنے والا]

ترجمہ: وہ چاہیں گے کہ (کسی طرح) دوزخ سے نکل جائیں جب کہ وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے

تشریح: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ڈاکو کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیے جائیں گے اور اب اگلی آیت میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے اب اگر اس نے دوسری چوری کی تو حدیث کے حکم سے اس کا پیر کاٹ دیا جائے۔۔ نیز۔۔اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کی جان کی اہمیت بیان کی تھی کہ ایک انسان کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک گویا سارے انسانوں کا قتل کرنا ہے پھر فرمایا کہ اگر یہی انسان ڈاکہ ڈالے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اب آگے یہ فرمایا ہے کہ یہی انسان چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا تو کسی تامل کے بغیر (اشرفی)

کافر کیلئے دوزخ کا دائمی عذاب

سو ارشاد فرمایا گیا کہ ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا کہ نہ وہ عذاب کبھی ختم ہوگا اور نہ ایسے کافروں کے لیے اس سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن ہوگی۔ والعیاذ باللہ۔ بلکہ ان کو ہمیشہ اسی میں پڑے جلنا ہوگا۔ سو کافر کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوزخ کا عذاب ہے۔ اور وہ بڑا ہی بدبخت اور برا انسان ہے۔ والعیاذ باللہ۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں جابجا اور طرح طرح سے اس کی تصریح فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ البینۃ میں ارشاد فرمایا گیا۔ { اولئک ھُم شَر البریۃ } ۔ (البینۃ: 6) یعنی کفار خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا دوسرے کھلے مشرکوں میں سے ان سب کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے جس میں ان کو ہمیشہ کیلئے رہنا ہوگا۔ اور یہی لوگ ہیں جو سب سے بری مخلوق ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ سو جن لوگوں نے ایمان و یقین کی دولت سے محروم رہ کر کفر و باطل ہی کی راہ کو اپنائے رکھا اور متاع عمر کو اسی میں گنوا دیا وہ بڑے ہی محروم اور سیاہ بخت لوگ ہیں۔ خواہ دنیاوی اعتبار سے وہ کتنے ہی بڑے عیش و عشرت میں کیوں نہ رہے ہوں۔ پس اصل دولت ایمان و یقین کی دولت ہے۔ اللّٰھُمَّ فَزِدْنَا مِنْہُ وَثَبِّتْنَا عَلَیْہِ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

"عذاب مقیم"۔ وہ عذاب پائدار و مستقل ہے، جو کبھی ہٹنے والا اور مٹنے والا نہیں۔ معناہ دائم ثابت لا نزول ولا یحول (قرطبیؒ) عذاب دائم ثابت لا یزول عنھم ولا ینتقل ابدا"۔ (ابن جریر) (آیت) "یریدون ان یخرجوا من النار"۔ عذاب اور وہ بھی عذاب الیم !۔ ظاہر ہے کہ دوزخیوں کو کیسی کچھ تڑپ، کیسی کچھ حسرت، کیسی کچھ تمنا اس عذاب سے نکل بھاگنے کی ہوگی ! (آیت) "ماھم بخرجین منھا ولھم عذاب مقیم"۔ اس ارشاد سے ان حسرت نصیبوں کی حسرت نصیبی پر گویا مہر لگ گئی۔ عذاب سے نکلنے کا نہ کوئی امکان ہے، نہ کوئی تدبیر کام دے سکتی ہے، بلکہ اب یہ بھی سنا دیا گیا کہ یہ عذاب جس درجہ کا شدید و ہول ناک ہوگا، اسی طرح لازوال بھی ہوگا، اشتداد عذاب قبل کی آیت میں بیان ہو چکا، امتداد عذاب اب بتا دیا گیا، اس عذاب دائمی کی خصوصیت چونکہ کافروں کے ساتھ بیان ہوئی، اس سے متکلمین نے یہ نتیجہ اور صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ مخلص کلمہ گو ہر صورت عذاب سے مخلصی پا جائے گا، احتج اصحابنا بھذہ الایۃ علی انہ تعالیٰ یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ علی سبیل الاخلاص (کبیر) اور امام رازی (رح) نے یہ بات بھی خوب فرمائی ہے کہ (آیت) "ولھم عذاب مقیم"۔ کی ترکیب خود حصر پر دلالت کر رہی ہے، یعنی یہ عذاب دائمی صرف کافروں کے لیے ہوگا، نہ کہ غیر کافروں کے لیے، وھذا یفید الحصر فکان المعنی ولھم عذاب مقیم لا لغیر ھم (کبیر) (ماجدی)

کافر آگ سے نکلنا چاہیں گے لیکن نہیں نکل سکیں گے، کیوں ؟ ان کا عذاب ابدی ہو گا

دنیا میں ان کو بار بار بتایا گیا اور مثالیں دے دے کر سمجھایا گیا لیکن وہ اتنے ضدی تھے کہ انھوں نے ہر سنی بات کو اَن سنی کر دیا اور کسی کی مطلق پروانہ کی پھر ان کی یہ ضد کیا تھی ؟ ان کی یہ ضد ان کا ایک عمل ہی تو تھا پھر جب ہر عمل کے ساتھ اس کا نتیجہ باندھ دیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل کا نتیجہ نہ پائیں فرمایا جب وہ اس عمل کے نتیجہ سے دوچار ہوں گے تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ مجھ میں اور میرے عمل میں یعنی عمل کے نتیجہ میں اتنی دوری ہو جائے جتنے آسمان و زمین ایک دوسرے سے دور ہیں یا جس قدر مشرق و مغرب ایک دوسرے سے دور رکھے گئے ہیں۔ فرمایا اس وقت ان کی یہ کوشش اکارت جائے گی اور ہزار کوشش کے باوجود بھی اس عذاب سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ اس سے نجات حاصل کرنے کا وقت نکل گیا اور "گیا وقت پھر ہاتھ کب آتا ہے ؟ "اس مضمون کو سورۃ الحج میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ :

"وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک سب گل جائیں گے اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے جب کبھی وہ گھبرا کر اس کھائی سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو ان پر گرز سے مار پڑے گی اور وہ اس میں پھر دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے والی آگ کا مزہ۔" (الحج ۲۲ : ۱۹ تا ۲۲) ایک جگہ اس طرح ارشاد ہوا کہ :

"اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اس آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔" (الم السجدہ ۳۲ : ۲۰)

زیر نظر آیت میں بھی یہی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ : "وہ چاہیں گے کہ آہ سے باہر نکل آئیں لیکن اس سے باہر ہونے والے نہیں۔ "ظاہر ہے کہ دوزخیوں کو کیسی کچھ تڑپ، کیسی کچھ حسرت، کیسی کچھ تمنا اس عذاب سے نکل بھاگنے کی ہوگی۔ "لیکن وہ اس سے باہر ہونے والے نہیں ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ "اس ارشاد سے ان بے نصیبوں پر گویا مہر لگ گئی کہ عذاب سے نکلنے کا نہ کوئی امکان ہے اور نہ ہی کوئی تدبیر کام دے سکتی بلکہ اب تو یہ بھی سنا دیا گیا کہ یہ عذاب جس درجہ کا شدید اور ہول ناک ہوگا اسی طرح لازوال بھی ہوگا۔ بلاشبہ یہ ابدی عذاب انہی

لوگوں کے لیے ہوگا جو کفر کی موت مرے ہوں گے اور عاصی اور خطاکار مسلمانوں کو معاف کر دینے کا اعلان الٰہی بھی دوسری جگہ موجود ہے۔ بہر حال اس جگہ انہی بد بختوں کا ذکر ہو رہا ہے جو ابدی دوزخ کے مستحق ہو چکے ہوں گے اور یہ بات "عذاب مقیم" سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عذاب پائیدار و مستقل ہے جو کبھی ہٹنے والا اور مٹنے والا نہیں۔ امام رازی (رض) نے اس جگہ خوب تقریر فرمائی ہے اور کہا ہے کہ و لھم عذاب مقیم کی ترکیب خود حصر پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ عذاب دائمی صرف کافروں کے لیے ہوگا۔ لایغیر ھم (کبیر) پیچھے اہل کتاب کا ذکر کر کے ان اہل کتاب کی طرف مضمون منتقل کیا تھا جو اہل کتاب ہونے کے باوجود عرف میں اہل کتاب کے نام سے معروف نہیں یعنی مسلمانوں کو مخاطب کر لیا پھر مسلمانوں کی اندرونی خرابیوں کی طرف اشارات کرتے ہوئے مضمون کو آخرت کی طرف منتقل کر دیا گیا اب مضمون کو آخرت کی طرف منتقل کر کے دنیا کی معاشرتی زندگی کی طرف لایا جا رہا ہے جہاں اعمال ہی اعمال ہیں اور پھر اعمال میں سے اچھے اور برے اعمال کی پہچان کرائی جا رہی ہے پھر برے اعمال کی دینوی سزا بھی سنا دی تاکہ اسلامی معاشرہ کی اصلاح کا کام مکمل ہو سکے۔ (عروہ)

سو ایسے لوگ دوزخ کے اس دائمی عذاب سے کبھی نہیں نکل سکیں گے جنہوں نے کفر کیا۔ اور ان کیلئے وہاں پر دائمی عذاب ہوگا۔ سو ایسے کافروں کو جن کا اخروی انجام یہ ہونے والا ہے، ان کو اگر دنیاوی زندگی کی اس محدود فرصت میں روئے زمین کی تمام دولت بھی مل جائے تو بھی ان کو کیا ملا؟ اور ان سے بڑھ کر بد بخت اور کون ہو سکتا ہے؟ کہ ان کا انجام تو یہ ہونے والا ہے، والعیاذ باللہ العظیم اور اس کے بر عکس جن اہل ایمان کو دوزخ کے عذاب سے بچا کر جنت کی اَبدی اور سدا بہار نعمتوں سے سرفراز کر دیا جائے گا ان سے بڑھ کر خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے؟ اگرچہ دنیا میں ان کو نان جویں بھی میسر نہ رہی ہو؟ کہ وہ وہاں پر دائمی اور ابدی نعمتوں میں رہیں گے۔ سو اصل دولت ایمان و یقین کی دولت ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دنیاوی زندگی کی یہ مختصر و محدود فرصت کس قدر عظمت و اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اہل ایمان کی طرف سے کیا جانے والا معمولی سے معمولی صدقہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں شرف قبولیت پائے گا اور وہ ان کو کئی گنا بڑھ کر واپس ملے گا جبکہ وہ صدق و اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہو۔ مگر وہاں پر روئے زمین کی دولت اور اسی کے ساتھ اتنی ہی دولت اور بھی مل جائے تو وہ بھی کسی سے قبول نہیں ہو گی، اور اس کی بھی وہاں پر کوئی قدر و قیمت نہیں ہو گی۔ پس بڑے ہی سخت خسارے میں ہیں وہ لوگ جو حیات دنیا کی اس فرصت محدود و مختصر کی اس عظمت شان سے غافل و بے خبر ہیں اور وہ اس کو کفر و انکار کے ساتھ یونہی لہو و لعب اور لایعنی و بے مقصد امور میں ضائع کرتے ہیں، اللہ اپنی پناہ میں رکھے اور زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی رضا و خوشنودی کی راہوں میں صرف کرنے کی توفیق بخشے، کفر و انکار کے ہر شائبے سے ہمیشہ محفوظ، اور نفس و شیطان کے ہر مکر و فریب سے ہمیشہ اور ہر حال میں، اور ہر اعتبار سے اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے، آمین ثم آمین یارب العالمین (مدنی)

آیت مبارکہ:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

لغۃ القرآن: [وَ : اور][السَّارِقُ : چور مرد][وَالسَّارِقَةُ : اور چور عورت][فَاقْطَعُوْٓا : سو تم کاٹ دو][اَيْدِيَهُمَا : ان دونوں کے ہاتھ][جَزَآءً : بدلہ][بِمَا : ساتھ جو][كَسَبَا : ان دونوں نے کیا][نَكَالًا : عبرتناک سزا][مِّنَ : سے][اللّٰهِ: اللہ][وَاللّٰهُ : اور اللہ][عَزِيْزٌ : غالب][حَكِيْمٌ: حکمت والا]

ترجمہ: اور چوری کرنے والا (مرد) اور چوری کرنے والی (عورت) سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو اس (جرم) کی پاداش میں جو انھوں نے کمایا ہے۔ (یہ) اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا (ہے)، اور اللہ بڑا غالب ہے بڑی حکمت والا ہے۔

تشریح:

شان نزول

یہ آیت کریمہ طعم بن ابیرق کے متعلق نازل ہوئی جس نے مدینہ منورہ میں ایک گھر سے آٹے کا تھیلہ اور زرہ چوری کرکے ایک یہودی پر تہمت لگادی۔ مفصل تفصیل پارہ پانچ سورۃ نساء میں بیان ہوچکی ہے۔اس کا قانون حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں نافذ فرمایا کہ جب چوری دو مرتبہ کے اقرار یا دوسروں کی شہادت سے قاضی اسلام کے سامنے ثابت ہو جائے اور جو مال چرایا ہے وہ دس درہم کی مالیت سے کم نہ ہو تو اس کا داہنا ہاتھ پہلے کاٹا جائے اور دوبارہ پھر ارتکاب جرم سرقہ ہو تو بایاں پاؤں اس کے بعد بھی اگر ارتکاب جرم سے باز نہ آئے تو قید کیا جائے یہاں تک کہ وہ توبہ کرے۔

مزید توضیح

فاقطعوآ ایدیھما۔ قرأت ابن مسعود میں ایمانہما وارد ہے۔اس پر فقہاء نے کہا کہ ثبوت جرم کے بعد محض ہاتھ کاٹنا واجب ہے اور مال مسروقہ اگر موجود ہو تو واپس کرنا بھی واجب ہے اور اگر مال مسروقہ ضائع ہوگیا تو ضمان واجب نہیں۔ تفسیر احمدی۔ (حسنات)

اس سے پہلے ہتھیار بند ڈاکوؤں اور رہزنوں کی سزائیں بتائیں گئیں۔اب چوروں کی سزا بیان کی جارہی ہے۔پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ اہل عرب کے نزدیک جن کی زبان اور محاورات کے مطابق قرآن حکیم نازل ہوا۔سارق (چور) کس کو کہتے ہیں۔السارق عندالعرب ھو من جاء مستترا الی حرز فاخذ منہ مالیس لہ (قرطبیؒ) یعنی اہل عرب سارق اس کو کہتے ہیں جو پوشیدہ طور پر کسی محفوظ جگہ میں آئے اور وہاں سے ایسا مال لے جائے جو اس کا اپنا نہیں۔اس وضاحت کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ فقہاء اسلام نے چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے جن شرائط کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے وہ ان کا اپنا اضافہ نہیں بلکہ لفظ سارق کے لغوی مفہوم سے ماخوذ ہیں۔(ضیاء)

چور سے مراد وہ مرد یا عورت ہے جو کسی دوسرے انسان کی ملکیت سے کم از کم ایک ڈھال کی مالیت کے برابر کوئی چیز دانستہ چوری کر لے۔اسلام میں اس چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ اس کی کلائی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے، لیکن ڈھال کی مالیت سے کم چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ حاکم وقت جو مناسب سمجھے اس سے کم درجہ کی کوئی اور سزا دیدے جس سے چور کی حوصلہ شکنی ہو۔

"پہلی دفعہ چوری کرنے والے سے مال وصول کرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔اگر دوسری دفعہ چوری کرتا ہے۔تو اس کا بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا۔بعض لوگ غیر مسلموں کے پروپیگنڈہ میں آ کر اسلام کی مقرر کردہ سزاؤں کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ایسے لوگ اپنے آپ کو مہذب سمجھنے کے باوجود مظلوم کی خیر خواہی کرنے کی بجائے ڈاکو، چور اور بدکار لوگوں کی حمایت کرتے ہیں۔جو اخلاق، دین اور معاشرتی آداب کے کسی اصول کے مطابق نہیں ہے۔قرآن مجید جرائم کی بیخ کنی کے لیے سنگین جرائم کی نہ صرف سخت ترین سزا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ اس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ایسے لوگوں کو سر عام سزا دی جائے گی۔اس آیت میں لفظ "نکالًا "کا یہی مفہوم ہے۔(فہم)

حضرت ایمن (رض) بیان کرتے ہیں کہ ڈھال کی قیمت میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت ایک دینار (جو کہ تقریباً4۔36 گرام سونے کے برابر ہے) یا دس درہم (جو کہ تقریباً30۔50 گرام چادی کے برابر ہے) تھی۔(سنن نسائی : 4950:کتاب قطع السارق : باب 10) مزید تفصیلات کے لیے فقہ کی کتابیں ملاحظہ کریں۔(امداد)

اس حکم کے مجاز کون ہو سکتے ہیں۔

(آیت) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تمام امور کے ذمہ دار جیسے بادشاہ یا جسے بادشاہ حدیں قائم کرنے کی اجازت دے اور قاضی اور حاکم۔(حسنات)

مختصرا ان شرائط کا ذکر کرتا ہوں قطع ید کے لیے جن کا پایا جانا چور، چوری شدہ مال اور چوری ہونے کی جگہ میں ضروری ہے۔

چوری کرنے کا شرعی حکم اور اس کی وعیدیں

چوری گناہ کبیرہ ہے اور چور کے لیے شریعت میں سخت وعیدیں ہیں، چنانچہ

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "چور چوری کرتے وقت مومن نہیں رہتا۔ (مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی۔۔الخ، ص ۴۸، الحدیث: ۱۰۰(۵۷))

انہی سے روایت ہے، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اگر اس نے ایسا کیا (یعنی چوری کی) تو بیشک اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے اتار دیا پھر اگر اس نے توبہ کی تو اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔

(نسائی، کتاب قطع السارق، تعظیم السرقۃ، ص ۷۸۳، الحدیث : ۴۸۸۲) (صراط)

چور کے متعلق تو یہ شرطیں ہیں

(1) بالغ ہونا بالغ نہ ہو۔ (2) عاقل ہو پاگل اور دیوانہ نہ ہو۔ (3) مال مسروقہ کا مالک نہ ہو سارے کا نہ اس کے کسی حصہ کا۔ مال مسروقہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم سے کم نہ ہو۔ اور جہاں سے چوری کی گئ ہے وہ محفوظ جگہ ہو گھر ہو، دکان ہو کوئی اور مکان ہو۔ یا اس مال کی حفاظت کے لیے کوئی پہرے دار مقرر ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تفصیلات ہیں جن کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (ضیاء)

چوری سے متعلق 2 شرعی مسائل

(1)۔۔ چوری کے ثبوت کے دو طریقے ہیں (1) چور خود اقرار کرلے اگرچہ ایک بار ہی ہو۔ (2) دو مرد گواہی دیں، اگر ایک مرد اور دو عورتوں نے گواہی دی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(2)۔۔ قاضی گواہوں سے چند باتوں کا سوال کرے، کس طرح چوری کی، اور کہاں کی، اور کتنے کی کی، اور کس کی چیز چرائی؟ جب گواہ ان امور کا جواب دیں اور ہاتھ کاٹنے کی تمام شرائط پائی جائیں تو ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔

تنبیہ : حدود و تعزیر کے مسائل میں عوام النّاس کو قانون ہاتھ میں لینے کی شرعاً اجازت نہیں۔ چوری کے مسائل کی تفصیلی معلومات کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیجئے۔ (صراط)

قرآن مجید نے چور کی سزا یہ مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اس کی دو وجوہات بھی بیان کی ہیں

1۔ یہ سزا اس مال کا بدلہ نہیں جو اس نے چوری کیا کیونکہ ہو سکتا ہے وہ مال بالکل معمولی ہو بلکہ دراصل یہ قانون شکنی کی جرات اور چوری کرنے کے اس فعل کی سزا ہے جس نے لوگوں کے امن وسکون کو غارت کیا ہے۔

2۔ یہ سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس لیے ہے تاکہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو اور کوئی بھی چوری کرنے کی جرات نہ کرے۔

سزا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے یعنی اس کا حق اسے واپس دلایا جائے اور مجرم کو اس کی بری عادت سے بچانے کے لیے اس پر ایسی سختی کی جائے کہ وہ بھی اس جرم سے باز آجائے اور دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہوا اور وہ اس جرم کے قریب نہ جائیں، اور یہ حکم صرف قرآن ہی کا نہیں بلکہ بائبل کا بھی یہی حکم ہے : "اور اگر تمہارا دایاں ہاتھ گناہ کرنے کا سبب بنے تو اس کو کاٹ کر دو پھینک دو۔ تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ تم اپنے جسم کے ایک حصہ سے محروم ہو جاؤ بجائے اس کے کہ تمہارے پورے جسم کو جہنم میں جنا پڑے۔" (Matthew:5:30: New Testament & Psalms, Edition 2001 by The Gideons)

اسلام صرف ترغیب ہی نہیں دیتا بلکہ ترہیب سے بھی کام لیتا ہے

انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ دعوت و نصیحت سے وقتی اثر ضرور قبول کرتی ہے لیکن حالات کا دباؤ اور خواہشات کی فراوانی اس اثر کو دیر پا نہیں رہنے دیتی اس کے لیے ضروری ہے کہ ترغیب کے ساتھ ساتھ ترہیب سے بھی کام لیا جائے۔ ترہیب کا سب سے اہم عنصر منکرات کے ارتکاب پر سزا کا نفاذ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو انسان کو برائی کے ارتکاب سے پہلے سوچنے اور رکنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب چور کو یہ بات معلوم ہو کہ میں اگر چوری کے جرم میں پکڑا گیا تو مجھے سخت سزا ملے گی تو وہ کبھی بھی چوری کے ارتکاب میں جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ مزید برآں معاشرے کو اس لعنت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کو ملنے والی سزا اس کے لیے سامان عبرت بن جائے۔ وہ جب بھی اس سزا کے تصور کو ذہن میں تازہ کرے تو اس کے جسم پر کپکپی چھوٹ جائے اور اس کے دل کی حرکت رک رک کر چلنے لگے۔ اگر ان دو باتوں کا اہتمام کر لیا جائے تو پھر امید کی جا سکتی ہے کہ افراد معاشرہ بہت حد تک اس لعنت سے بچ جائیں گے۔ اس لیے قرآن پاک کی اس آیت کریمہ میں ان دونوں باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے فرمایا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ یہ چوری کی سزا چور کے لیے اس کے عمل کا بدلہ ہے 'لیکن معاشرے کے لیے سامان عبرت ہے۔ چور نے جو حرکت کی ہے 'اس کے لیے چونکہ اس نے دراز دستی سے کام لیتے ہوئے حدود سے تجاوز کیا ہے 'اس لیے اس کا ہاتھ اب باقی نہیں رہ سکتا اور چونکہ خطرہ ہے کہ دیگر افراد معاشرہ بھی اس کا ارتکاب نہ کرنے لگیں 'اس لیے علانیہ ہاتھ کاٹنا لوگوں کو عبرت دلانے کی ایک ترکیب ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو چوری کی وارداتیں کبھی نہیں رکیں گی۔ جیسا کہ آج پوری دنیا میں چوری کے مجرموں کو قید و بند کی سزائیں بھی ملتی ہیں 'جرمانے بھی ہوتے ہیں 'مار پیٹ بھی ہوتی ہے 'مگر یہ جرم ہے کہ روز بروز دیگر جرائم کی طرح بڑھتا ہی جا رہا ہے جیلیں جرائم کی درسگاہیں بن کر رہ گئی ہیں اور معاشرہ اس بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ چوری کا یہ جرم صرف ایک جرم نہیں بلکہ کئی جرائم کا عنوان ہے۔ اگر اس کو نہ روکا جائے تو بہت سارے جرائم کو وقوع پذیر ہونے اور بہت ساری محرومیوں کو معاشرے میں درآنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ (روح)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان کا ہاتھ کاٹ دینا بڑی وحشیانہ اور غیر مہذب سزا ہے۔ اس سلسلہ میں میری گزارش یہ ہے کہ ایک میاں بیوی ساٹھ سال کی عمر تک پردیس میں کرائے کے مکان میں رہتے ہوئے مزدوری کر کے زیورات، کپڑوں اور نقدی کی صورت میں اتنی دولت اکٹھی کر لیں کہ وہ اپنے رہنے کے لیے مکان، اپنی بیٹیوں کی شادی اور بڑھاپے کے انتظامات کر سکیں اور اچانک رات کو ایک چور آئے اور ان بوڑھے میاں بیوی کی زندگی بھر کی کمائی چوری کر کے لے جائے تو اب اس بوڑھے میاں بیوی پر کیا گزرے گی جن کی زندگی کی کمائی بھی گئی اور ہاتھوں میں مزید کمانے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ ہو سکتا ہے وہ بوڑھے والدین اس حادثہ کو برداشت نہ کر سکیں اور حرکت قلب بند ہونے کی صورت میں ان کی بچیاں یتیم ہو جائیں اور اگر وہ زندہ بچ بھی جائیں تو بڑھاپے کی وجہ سے ان ہاتھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ پال سکیں اور بالآخر بھیک مانگنے یا خود کشی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ اگر آپ ان بوڑھے والدین کی جگہ پر ہوں تو اس چور کے متعلق کیا سزا تجویز کریں گے؟ کیا اس چور نے مہذب کام کیا ہے یا واضح بربریت کا مظاہرہ کر کے ایک خوشحال گھرانے پر قیامت صغریٰ برپا کر دی ہے؟ ظاہر ہے وہ انسانی شکل میں ایک درندہ ہے اور درندوں والی سزا کا مستحق ہے تاکہ اسے اپنی درندگی کا احساس ہو اور دوسروں کے لیے بھی باعث عبرت ہو اور بائبل نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ چور کو قتل کرنا بھی جائز ہے۔ "اگر چور کسی گھر میں چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور اسے قتل کر دیا جائے تو اس چور کا قاتل مجرم نہیں ہوگا۔" (خروج: 22:2)

چور کا ایک ہاتھ جو سینکڑوں دیگر ہاتھوں کی کمائی چھین کر انھیں شل کر دیتا ہے، عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ اسی ایک ہاتھ کو کاٹ دیا جائے تاکہ دیگر بیشمار ہاتھ سلامت رہیں اور انسانی خدمت میں سر گرم عمل رہیں۔ تاریخ شاہد ہے جہاں کہیں بھی چور کے ہاتھ کاٹے گئے وہاں چوری کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسلام کے ابتدائی سو سال میں گنتی کے چند افراد کے ہاتھ کاٹے گئے اور پورا معاشرہ امن کی نیند سویا۔ (فی ظلال القرآن)

فرض کریں ایک بیوہ جس نے اپنی بیٹی کو پالتے ہوئے عمر کا بیشتر حصہ گزارا ' جب بیٹی جوان ہو گئی تو اس نے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے گھروں میں برتن مانجھے ' کپڑے دھوئے ' پیسہ پیسہ جمع کیا اور اپنی حیثیت کے مطابق اس کے لیے جہیز بنایا۔ شادی کے دن طے ہو گئے تو چور نے آکر اس کے گھر کی روشنی بجھا دی۔ اب یہ بظاہر ایک جرم ہے ' لیکن حقیقت میں اس جرم کے نتیجے میں ایک بیوہ کی آرزوؤں اور ایک جوان لڑکی کے سپنوں کی شکست وریخت کا جو صدمہ چھپا ہوا ہے اور جس کے نتائج نامعلوم کس طرح اخلاقی تباہی کی شکل میں نکلیں گے ' اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے گردوپیش میں ایسی کئی کہانیاں ہیں جن کو سن کر اور دیکھ کر ' بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور بیوہ ماں نے اس لیے اپنی زندگی بھر کا زیور اور اثاثہ چھپا کے رکھا تھا کہ میرا بیٹا ' جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کالج یا یونیورسٹی جائے گا تو اس کے اخراجات میں کام آئیں گے۔ لیکن ایک چور کا ہاتھ جہاں ماں کی ساری امیدوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے ' وہاں عین ممکن ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے دروازے پر کھڑا ہونے والا یہ نوجوان معاشرے سے انتقام لینے کے لیے ایک خطرناک مجرم کی صورت اختیار کر جائے۔ اس لیے ہمارا پروردگار ' جو خالق فطرت ہے۔ وہ ہمارے دانشوروں سے زیادہ جانتا ہے کہ معاشرے کو ان محرومیوں سے بچانے کے لیے کیسی سزائیں ہونی چاہئیں ' جس سے واقعی جرائم کا راستہ روکا جا سکے۔ لیکن مشکل یہ ہو گئی ہے کہ جب ایک دانشور یہ سنتا ہے کہ کسی معاشرے میں کسی چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو ندامت سے اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے جھلملانے لگتے ہیں ' لیکن پوری دنیا جس طرح ایسے جرائم کے ہاتھوں اخلاقی موت کا شکار ہو رہی ہے ' اس سے ہمارے دانشوروں کی پیشانیاں کبھی پسینے سے نہیں بھیگتیں حالانکہ یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ اگر چند ہاتھوں کے کٹ جانے سے ہزاروں سر ' ہزاروں گھر اور ہزاروں قسمتیں محفوظ ہو سکتی ہیں تو یہ سودا نہ صرف یہ کہ مہنگا نہیں بلکہ انسانیت کے لیے باعث رحمت ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاہ فیصل مرحوم امریکہ کے دورے پر گئے۔ وہاں انھوں نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ اس پر ہجوم پریس کانفرنس میں بڑے بڑے اخباروں کے رپورٹروں نے حدود اللہ کے حوالے سے چبھتے ہوئے سوالات کیے اور بار بار یہ بات کہی کہ آپ انسانوں کے ہاتھ کاٹ کر اور حدود اللہ کو نافذ کر کے بہت بڑی انسان دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں ' اس سے بڑھ کر ظالمانہ سزائیں اور کیا ہو سکتی ہیں ؟ شاہ فیصل نے جواب میں فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ تمہیں اور پورے مغرب کو انسانوں اور انسانیت سے ہمدردی نہیں بلکہ جرائم اور مجرموں سے ہمدردی ہے۔ اگر تمہیں انسانیت سے ہمدردی ہوتی تو تم نے انسانیت کے تحفظ کی کوشش کی ہوتی۔ تمہیں چونکہ جرائم اور مجرموں سے ہمدردی ہے ' اس لیے تم اس کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے ہو اور اس میں تم کامیاب بھی ہو۔ مزید فرمایا کہ میں تمہیں ڈالروں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس دیتا ہوں اور پھر تمہیں میں اسی شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے بغیر کسی باڈی گارڈ کے جانے کا حکم دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد مجھے خبر ملے گی کہ تمہیں یا تو قتل کر دیا گیا ہے یا تمہارا بریف کیس چھین لیا گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے اور تم جانتے ہو کہ ایسا ہی ہے تو پھر تمہیں سوچنا چاہیے کہ تم نے سزاؤں کے نام سے جو ایک تماشہ رچا رکھا ہے ' اس نے آخر تمہیں اور پوری دنیا کو کیا دیا ہے ؟ کہ جرائم میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانوں کے دکھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس میں تمہیں اپنے ملک چلنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تم میرے ملک میں آؤ ' میں تمہیں سونے سے لاد دوں گا اور دولت کا ایک بڑا انبار تمہارے ساتھ کر کے ' تمہیں حکم دوں گا کہ پورے

ملک کی سیر کرو۔ اگر اس سیر میں تمہارا کوئی نقصان ہو یا تمہاری طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کرے تو پھر میں مان لوں گا کہ تم اسلامی سزاؤں کو جو ظالمانہ سزائیں کہتے ہو اور بظاہر انسانیت سے جو محبت جتاتے ہو ' یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر تم دولت کا ایک انبار رکھتے ہوئے بھی اور تن تنہا پورے ملک میں سفر کرتے ہوئے بھی ' کسی حادثے کا شکار نہیں ہوتے اور کوئی تمہیں نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرتا تو تمہیں مان لینا چاہیے کہ اسلام کی سزائیں جو بقول تمہارے سخت سہی ' سراسر رحمت ہیں ' اس نے انسانوں کو کچھ دیا ہے چھینا نہیں۔ کیا ایسا نہیں کہ جب کبھی یہ تجربہ ہوا ہے ' وہ چودہ سو سال پہلے ہوا ہو یا آج ' اس نے ہمیشہ انسانوں کی جان ' مال ' عزت ' آبرو ' حتیٰ کہ انسانیت کی حفاظت کی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ تم اگر انسانیت سے ہمدردی رکھتے ہو تو تمہیں اسلام کا دیا ہوا سزاؤں کا نظام قبول کرنے میں آخر تامل کیوں ہے؟ (روح)

کوئی انسان اپنا ہاتھ کٹانا پسند نہیں کرتا لیکن اگر کسی انسان کی انگلی میں کینسر ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ یہ بیماری پورے جسم میں پھیل جاتی ہے جو بالآخر انسان کی زندگی ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح چوری بھی عوام کے امن اور سکون کے لیے کینسر کی حیثیت کی حیثیت رکھتی ہے اور جو ہاتھ کئی خوش حال گھرانوں کی زندگیاں برباد کر دے اگر اسے نہ کاٹا گیا تو کئی دوسرے لوگوں کو بھی راتوں رات امیر بننے کی یہ بیماری لگ جائے گی جو بالآخر پورے معاشرہ کا امن و سکون تباہ کر دے گی، للذا ایسے مجرم ہاتھ پر ترس کھانا دراصل بے گناہ معاشرہ پر ظلم کرنے کے برابر ہے۔
آج کل عام طور پر چور کو کچھ عرصہ جیل میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن قید کی سزا نہ تو نفسیاتی طور پر چور کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور نہ ہی جسمانی طور پر۔ اسی لیے جن ممالک میں چوری کی سزا قید ہے وہاں پر پولیس گشت، سیکورٹی سٹاف، الارم، کیمرہ اور کتوں وغیرہ کے باوجود چوری کی واردات یا تو بہت زیادہ ہیں یا ترقی پذیر ہیں، کیونکہ قید کی سزا پوری ہونے کے بعد اس کے ساتھ کوئی ایسا مانع نہیں ہے جو اسے چوری سے باز رکھے۔ ہاتھ سلامت ہیں، نیز لوگوں کو علم نہیں کہ یہ چور ہے، للذا لوگ اس پر اعتماد کریں گے اور اس کے لیے چوری کرنا آسان ہو گا جبکہ ہاتھ کٹنے کی سزا چور کی نفسیاتی طور پر شرمندہ کر دیتی ہے اور دیکھنے والے بھی محتاط ہو جاتے ہیں کہ یہ چور ہے، نیز ہاتھ کٹنے سے اس کی چوری کی صلاحیت بھی ناقص ہو جاتی ہے، للذا اگر تو سزا دینے کا مقصد یہ ہے کہ چور چوری سے باز آجائے تو سب سے زیادہ موثر سزا ہاتھ کاٹنا ہے اور اگر مقصد یہ ہے کہ چور کو معمولی سی سزا بھی مل جائے اور چوری کا سلسلہ بھی جاری رہے تو پھر قید خانہ میں چور کو چند دنوں کے لیے حکومت کا مہمان بنانا اچھی سزا ہے۔
آج اکیسویں صدی میں سعودی عرب نے یہ سزا نافذ کر رکھی ہے۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حج یا عمرہ کی غرض سے سعودی عرب جاتے ہیں۔ کیا کسی نے کبھی کسی ایسے عربی کو دیکھا ہے جس کا چوری کی وجہ سے ہاتھ کٹا ہوا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں چوری بالکل نہیں ہوتی لیکن پورے ملک میں صرف گنتی کے چند افراد کے ہاتھ کٹتے ہیں اور سارے لوگ آرام کی نیند سوتے ہیں۔ مجھے کئی بار حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ہے مجھے کہیں بھی کوئی ہاتھ کٹا دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ اتنا مشاہدہ ضرور کیا ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو سونے، چاندی اور قیمتی سامان سے بھری ہوئی دکانوں کے دروازے کھلے چھوڑ کر دکاندار نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ پر سکون نماز پڑھتے ہیں کہ ان کی دکان سے کوئی چوری نہیں ہو گی۔ یہ سب اسلام کی حکیمانہ سزا کی برکتیں ہیں کہ انسان چوری کرنے کے تصور سے بھی گھبراتا ہے، نیز جس چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے وہ انسداد چوری کا ایسا عمل اور موثر اشتہار ہو گا جس کا مقابلہ ہزاروں پونڈ کی انسداد چوری کی اشتہارث مہم نہیں کر سکے گی اور اس کا کٹا ہوا ہاتھ دیکھ کر ہر ایک ہر وقت ایسی عبرت حاصل ہوتی رہے گی کہ کوئی دوسرا چوری کا تصور بھی نہیں کر سکے گا۔
نوٹ: اگر کوئی انسان قحط سالی یا بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ شبہات سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر حاطب کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چوری کر لی۔ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے ان کے ہاتھ کاٹنے کی سزا

ساقط کردی اور غلاموں کے مالک پر اونٹنی کی قیمت سے دگنی قیمت بطور تاوان عائد کردی کیونکہ وہ اپنے غلاموں کو بھوکا رکھتا تھا اور غلاموں نے بھوک سے تنگ آکر چوری کا ارتکاب کیا تھا۔ (امداد)

اگر ملک بھر میں دس بیس چلو پچاس ہی چوروں کے ہاتھ کٹ جائیں اور آپ کا ملک چوری کی لعنت سے نجات حاصل کرلے اور آپ کی نئی پود میں یہ مجرمانہ خیالات سر ہی نہ اٹھائیں تو میرے ناقص خیال میں تہذیب وشائستگی کا یہ مظاہرہ اس مظاہرہ سے بدرجہا بہتر ہوگا کہ ہمارے ملک میں کسی کا مال محفوظ نہ ہو۔ ہماری جیلوں میں سوسائٹی کے ان کرم فرماؤں (چوروں) کے لیے قومہ اور پلاؤ پک رہا ہو۔

یعنی جس خدا نے چور کی یہ سزا تجویز کی ہے وہ عزیز بھی ہے یعنی سب پر غالب ہے اور حکیم بھی ہے یعنی اس کا ہر حکم سینکڑوں حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ ان دو صفات کے ذکر کرنے سے معترضین کے تمام شکوک کا جواب بھی آگیا۔ (ضیاء)

آیت مبارکہ:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۹﴾

لغۃ القرآن: [فَمَنْ : پھر جو][تَابَ : توبہ کی اس نے][مِنْۢ: سے][بَعْدِ : بعد][ظُلْمِهٖ : اس کا ظلم][وَاَصْلَحَ : اور اصلاح کی][فَاِنَّ : تو بیشک][اللّٰهَ : اللہ][یَتُوْبُ : توبہ قبول کرتا ہے][عَلَیْهِ : اس پر][اِنَّ : یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][غَفُوْرٌ: بخشنے والا][رَّحِیْمٌ : مہربان]

ترجمہ: پھر جو شخص اپنے (اس) ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کرلے تو بیشک اللہ اس پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمانے والا ہے۔ یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے

تشریح:

شانِ نزول

احمد ' ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ایک عورت نے چوری کی ' اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا ' عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کیا میری توبہ بھی ہو گئی ' فرمایا ہاں آج تو اپنے گناہ سے ایسی (پاک) ہو گئی جیسی پیدا ہونے کے دن تھی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (گلدستہ)

مجرموں کے لیے توبہ اور اصلاح کا دروازہ کھلا رکھ کر انھیں توبہ اور اصلاح کی ترغیب دی گئی ہے۔

دنیا کے دساتیر اور قوانین میں اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ ایک مجرم کو سزا دینے کے بعد اس کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اعزاز بھی صرف دین اسلام کو حاصل ہے کہ وہ مجرم کو سزا دینے کے بعد نہ صرف اسے اپنی اصلاح کا موقع دیتا ہے بلکہ وہ اسے اس بات کی یقین دہانی کرواتا ہے کہ جو شخص بھی سچے دل اور اصلاح کے ارادے کے ساتھ توبہ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو رحیم و کریم پائے گا۔ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجرم کو توبہ کی تلقین کیا کرتے تھے۔

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ كَانَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ إِنْسَانًا ثُمَّ خَرَجَ يَسْأَلُ فَأَتَى رَاهِبًا فَسَأَلَهُ فَقَالَ لَهُ هَلْ مِنْ تَوْبَةٍ قَالَ لَا فَقَتَلَهُ فَجَعَلَ يَسْأَلُ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ ائْتِ قَرْيَةَ كَذَا وَكَذَا فَأَدْرَكَهُ الْمَوْتُ فَنَاءَ بِصَدْرِهِ نَحْوَهَا فَاخْتَصَمَتْ فِيهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى هَذِهِ أَنْ تَقَرَّبِي وَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى هَذِهِ أَنْ تَبَاعَدِي وَقَالَ قِيسُوا مَا بَيْنَهُمَا فَوُجِدَ إِلَى هَذِهِ أَقْرَبَ بِشِبْرٍ فَغُفِرَ لَهُ) [رواہ البخاری : کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار]

"حضرت ابو سعید خدری (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ننانوے قتل کیے تھے۔ پھر وہ توبہ کے لیے استغفار کر رہا تھا وہ ایک راہب کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے ؟ راہب نے جواب دیا نہیں۔ اس نے اسے بھی قتل کر دیا۔ پھر وہ مسئلہ پوچھنے گیا، اسے اس شخص نے ایک بستی کی طرف رہنمائی کی۔ راستے میں اس کو موت نے آلیا تو وہ اپنے سینے کے بل اس بستی کی طرف گرا۔ اس شخص کے بارے میں رحمت اور عذاب کے فرشتے جھگڑنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو حکم دیا کہ مرنے والے کے قریب ہو جائے اور چھوڑی ہوئی بستی کو اس سے دوری کا حکم دیا۔ پھر دونوں کے درمیان فاصلہ ناپنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ منزل مقصود کے بالشت بھر قریب پایا گیا اس لیے اس کو معاف کر دیا گیا۔"

(عَنْ أَبِي مُوسَى (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ اللَّيْلِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا)

[رواہ مسلم : کتاب التوبہ، باب قبول التوبۃ من الذنوب]

"حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کو اپنا دست رحمت پھیلاتا ہے تاکہ دن بھر کا گناہ گار توبہ کرلے اور دن کو دست شفقت بڑھاتا ہے تاکہ رات بھر کا گناہ گار توبہ کرلے، سورج کے مغرب سے نکلنے یعنی قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

(كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ) [رواہ ابن ماجۃ : کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ]

"آدم کی ساری اولاد خطاکار ہے اور بہترین خطاکار توبہ کرنے والے ہیں۔"
(مَنۡ تَابَ قَبۡلَ اِنۡ یُغَرۡغِرَ نَفۡسُہٗ قَبِلَ اللّٰہُ مِنۡہُ) [احمد: کتاب باقی مسند المکثرین، باب احادیث رجال من اصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]
"جس نے موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کرلی اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔"
(اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنۡبِ کَمَنۡ لَّا ذَنۡبَ لَہٗ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزھد]
"گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔" (فہم)

صحیح توبہ

یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہو گیا ہو تو ضمان دے اور ضمان نہ دے سکے تو معاف کرائے۔ اور اپنے فعل پر نادم ہوا اور آئندہ کے لیے اس سے مجتنب رہنے کا عزم رکھے۔ تو اس طرح کی توبہ سے امید ہے کہ حق تعالیٰ اخروی عقوبت جس کے مقابلہ میں دنیاوی سزا کی کچھ حقیقت نہیں اس پر سے اٹھالے۔

توبہ کا مطلب

فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ پھر جس نے اپنی بے جا حرکت کے بعد توبہ کرلی اور عمل درست کرلیا تو کوئی شک نہیں کہ اللہ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔
توبہ سے مراد ہے کئے ہوئے گناہ پر پشیمانی اور اس کے لیے استغفار اور استغفار کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا عہد اور اصلاح سے مراد ہے، اپنے اعمال کو درست کرلینا (توبہ کا معنی ہے لوٹنا جب اس کے بعد لفظ علیٰ آتا ہے اور اللہ کی طرف توبہ کی نسبت کی جاتی ہے تو رحمت کے ساتھ بندہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ قبول کرنے کے معنی ہوتے ہیں پس) یَتُوۡبُ عَلَیۡہِ کا معنی یہ ہے کہ اللہ بندہ پر رحم کرے گا اور اس کی توبہ قبول کرے گا اور آخرت میں اس کو عذاب نہیں دے گا۔
مسئلہ: حاکم کے پاس مقدمہ دائر ہونے اور جانے سے پہلے اگر چور نے چوری کا مال مالک کو واپس کر دیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، اوّل قول کی وجہ یہ ہے کہ چوری ہونے کے لیے دعویٰ ضروری ہے للذا ہاتھ کاٹنے کے لیے بھی حاکم تک مقدمہ کا پہنچنا شرط ہے اور جب مال واپس دے دیا تو دعویٰ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ہاں اگر دعویٰ دائر ہونے گواہان ثبوت پیش ہونے اور فیصلہ ہو چکنے کے بعد مال واپس کیا تو ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیعت

حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارد گرد صحابہ کی جماعت موجود تھی، آپ نے فرمایا مجھ سے بیعت کرو اس شرط پر کہ کسی کو (ربوبیت، معبودیت اور خصوصی صفات میں) اللہ کا شریک نہ بناؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی

اولاد کو قتل نہ کروگے ' دیدہ ودانستہ کسی پر بہتان تراشی نہ کروگے اور کسی بھلائی میں نافرمانی نہ کروگے 'تم میں سے جو شخص اس معاہدہ کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگا اور جو شخص مذکورہ افعال میں سے کسی فعل میں مبتلا ہو جائے گا اور اس کو دنیا میں اس کی سزا دے دی جائے گی تو اس کے گناہ کا اتار ہو جائے گا 'اور اگر مذکورہ افعال میں سے کوئی فعل کرنے کے بعد اللہ اس کے فعل پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا 'چاہے معاف کرے 'چاہے سزا دے۔ متفق علیہ۔

حد کے بعد بھی توبہ کی ضرورت ہے

بغوی نے لکھا ہے 'صحیح یہ ہے کہ حد شرعی (قطع دست) جرم کی سزا ہے 'توبہ کرنے کی اس کے بعد ضرورت ہے 'اس کا ثبوت حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے ملتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے اور داغنے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو حکم دیا تھا اللہ سے توبہ کرو اور اس نے عرض کیا میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں 'آپ نے فرمایا تو اللہ نے بھی تیری توبہ قبول فرمالی۔ (گلدستہ)

امام شافعی (رح) اور چند علماء اور احناف کا یہی مذہب ہے کہ چوری کے بعد حد تو ضرور لگے گی۔ لیکن اگر اس نے توبہ کی تو قیامت کا عذاب معاف کردیا جائے گا۔ اور توبہ کی صورت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس چوری کا مال موجود ہو تو اس کے مالک کو واپس کردے نہیں تو اس کی قیمت ادا کرے اور اگر یہ دونوں نہیں کرسکتا تو پھر مالک سے معاف کرالے۔ (ضیاء)

توبہ کے بعد ایک مجرم سے اسلامی معاشرے کا سلوک

تمام قوموں اور انسانی معاشروں میں یہ معمول رہا ہے کہ جب کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے تو اس کے بارے میں طبیعتوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ دوبارہ ایسے آدمی کو قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ اب وہ شخص یا تو محرومیوں کی پوٹ بن کر زندگی گزارتا ہے یا مایوسیوں کا شکار ہو کر خودکشی کی موت قبول کرلیتا ہے۔ لیکن ہمارا پروردگار چونکہ خالق فطرت اور انسانی جبلت کو جاننے والا ہے ' وہ انسانیت کا یہ نقصان کیسے گوارا کرسکتا ہے۔ اس لیے جہاں اس نے جرم کی سزا دے کر معاشرے پر پڑنے والے اس کے برے اثرات سے معاشرے کو بچایا 'وہیں اس نے مجرم کو معاشرے سے کٹ جانے اور دوبارہ معاشرے کے اسے قبول نہ کرنے جیسے نقصان سے بچا کر نہ صرف اس مجرم کی بلکہ جمیع انسانیت کی حفاظت کا اہتمام فرمایا۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(اور جس شخص نے اس ظلم و سرکشی کے بعد توبہ کرلی اور اپنے عمل کی اصلاح کرلی 'اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے 'یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں 'رحم کرنے والے ہیں)

یعنی ایک مجرم کے لیے نہ اسلامی معاشرے کے دروازے بند ہوتے ہیں اور نہ اللہ کی رحمت کے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے معافی مانگے 'اپنے فعل بد پر ندامت کا اظہار کرے 'اپنے اس بگڑے ہوئے رویے کی پوری طرح اصلاح کرے اور تجدید عہد کرتے ہوئے یقین دلا دے کہ دوبارہ ایسی حرکت کا صدور نہیں ہوگا تو اللہ فرماتا ہے کہ میری مغفرت جھوم کر اس پر برسے گی اور میری رحمت اسے اپنی آغوش میں لے لے گی 'اس لیے کہ کسی انسان کا ٹھوکر کھا جانا ایسا جرم نہیں 'جس کی اصلاح ممکن نہ ہو۔ اصل جرم 'جرم کو جرم نہ سمجھنا اور اس پر اصرار

کرتے ہوئے اسے جاری رکھنا ہے' جس کے نتیجے میں اس کے اندر کی انسانیت تباہ ہو جاتی ہے اور انسانی معاشرہ نہ صرف اپنے ایک کارکن سے محروم ہو جاتا ہے' بلکہ اس کے برے اثرات دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس جرم کا دائرہ کہیں سے کہیں پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ مجرم ' مجرم نہ رہے' بلکہ نادم ہو کر اصلاح کی طرف لپکے تو نہ صرف یہ کہ انسانی معاشرے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ غلطی کرنے والوں کے سامنے ایک نمونہ آجاتا ہے' جس سے ان کے لیے واپس پلٹنے کی ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔ (روح)

سچ کہا ماہر القادری مرحوم نے

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو' جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے

ایک بار خطا ہو جاتی ہے' سو بار ندامت ہوتی ہے

آیت مبارکہ:

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۰﴾

لغۃ القرآن: [اَلَمْ : کیا نہیں][تَعْلَمْ : تمہیں علم ہوا][اَنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][لَهٗ : اس کے لیے][مُلْكُ : حکمرانی][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ: اور زمین کی][يُعَذِّبُ : وہ عذاب دیتا ہے][مَنْ يَّشَاۗءُ : جسے وہ چاہتا ہے][وَ : اور][يَغْفِرُ : وہ بخش دیتا ہے][لِمَنْ : جس کے لیے][يَّشَاۗءُ : وہ چاہتا ہے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][عَلٰي : پر][كُلِّ : ہر][شَيْءٍ : چیز][قَدِيْرٌ : قدرت والا]

ترجمہ: (اے انسان !) کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی (ساری) بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے

تشریح:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر چور نے توبہ نہ کی اور وہ پکڑا گیا تو اس پر حد بھی جاری ہو گی اور آخرت میں عذاب میں ہو گا اور اگر اس نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی تو اللہ آخرت کی سزا معاف فرما دے گا۔ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب دینا یا معاف فرما دینا '

اس وجہ سے ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے۔ جس کو چاہے ' معاف کردے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ اس کا عذاب دینا بھی حسن اور حکمت پر مبنی ہے اور اس کا معاف فرمانا بھی حسن اور کرم پر مبنی ہے۔ اہل سنت کا مذہب ہے عذاب دینا اس کا عدل ہے اور معاف فرمانا اور ثواب عطا فرمانا اس کا کرم ہے ' اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے ہم اس کے عذاب سے اس کی پناہ طلب کرتے ہیں اور اس کے عفو و در گزر اور رحم و کرم کو طلب کرتے ہیں۔ (تبیان)

اس آیت کریمہ میں پورے سلسلہ مضمون کو سامنے رکھتے ہوئے ' ایک جامع بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے قانون کی تعمیل میں حیل و حجت کرنا یا اس کی حکمتوں کو سمجھنے میں پس و پیش کرنا ' پھر اس کے نفاذ میں بہانے تراشنا ' اُخروی نجات کے لیے مصنوعی سہارے تلاش کرنا اور سمجھنا کہ بخشش اور مغفرت میں شاید ان کا بھی کوئی دخل ہے ' یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ زمین وآسمان پر حکومت کس کی ہے ' یہ پوری کائنات کس کے حکم سے زندگی کا رزق پا رہی ہے ؟ ظاہر ہے وہ پروردگار عالم ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے حکم سے وجود میں آیا ہے اور اسی کے حکم سے باقی ہے۔ حاکمیت بھی اسی کو زیب دیتی ہے کیونکہ کبریائی اور حاکمیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب حکومت اور حاکمیت کا حق اس کا ہے تو پھر وہ جسے چاہے سزا دے اور جس کی چاہے مغفرت کرے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے ' اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس کے احکام کی تعمیل میں پس و پیش کرنا یا اس کے قانون کے مقابلے میں دوسرے سہارے تلاش کرنا ' جس کے نتیجے میں خرابیوں کا سلسلہ چل نکلتا ہے ' کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ یہی ساری نافرمانیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے جب تک اس پر قابو نہیں پایا جائے گا اور اس حقیقت کو مذہب و دین کی روح کے طور پر قبول نہیں کیا جائے گا ' اس وقت تک نہ حدود اللہ کی حکمت سمجھ میں آئے گی اور نہ صحیح ذوق عمل نصیب ہوگا۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب دیکھتے تھے کہ اہل کتاب اس بنیادی حقیقت کو ' جس کا ابھی ذکر ہوا ' بخوبی جانتے ہیں کیونکہ یہی ہر مذہب کی اساس ہے ' لیکن ان کا رویہ اعتقاد اور عمل دونوں کے حوالے سے اس کے بالکل برعکس ہے تو آپ کو شدید صدمہ ہوتا تھا۔ آپ دیکھتے تھے کہ اوس اور خزرج میں سے جو لوگ بظاہر مسلمان ہوئے ہیں ' لیکن تاحال یہودیوں کے زیر اثر ہیں ' اسی طرح وہ لوگ بھی جو یہود میں سے نام کے مسلمان ہیں ' لیکن دراصل دونوں گروہ منافق ہیں ' وہ زندگی کے ہر اہم مسئلے میں بجائے اس کے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رجوع کریں ' ان کی کوشش یہ ہوتی کہ یہودیوں سے راہنمائی حاصل کریں اور یہود کی عدالتوں سے فیصلے کروائیں ' حالانکہ ایمان کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ آدمی راہنمائی اور فیصلہ لینے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے ' لیکن جب تک کسی میں حقیقی ایمان پیدا نہیں ہوتا ' اس میں یہ نفاق کی سب سے بڑی علامت زندہ رہتی ہے کہ وہ انفرادی عبادات میں بعض دفعہ شریک بھی ہوتا ہے ' لیکن اجتماعی زندگی میں اور راہنمائی اور قانون کے حوالے سے کبھی بھی اسے یک سوئی نصیب نہیں ہوتی۔ ان منافقین کا بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ ایک طرف تو ایمان لانے کے دعوے دار تھے اور دوسری طرف بار بار یہود کے پاس جا کر ان سے رہنمائی لیتے تھے اور انہی کے سکھانے ' پڑھانے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں آکر مسائل بھی پیدا کرتے تھے۔
قرآن کریم نے بعض دوسری سورتوں میں بھی منافقین کی اس روش کا بار بار نوٹس لیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا :
(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں ' وہ چاہتے یہ ہیں کہ زندگی کے فیصلے طاغوت سے حاصل کریں حالانکہ انھیں طاغوت سے ہر طرح لاتعلق ہونے کا حکم دیا گیا ہے) (النساء ۴ : ۶۰)

پھر آگے چل کر پروردگار نے قسم کھا کر نہایت تاکید سے یہ بات فرمائی کہ :

(تم کبھی بھی حقیقی مومن نہیں ہو سکتے 'تاوقتیکہ اپنے متنازعہ معاملات میں صرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فیصل تسلیم نہ کرلو اور ان کے فیصلوں کے سامنے گردن نہ جھکاؤ) (النساء ۴: ۶۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش ہر دور کے منافقین کی رہی ہے۔آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں اسلام کا بڑا دعویٰ ہے لیکن وہ اپنی تہذیبی 'تمدنی اور قانونی زندگی میں کبھی اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ راہنمائی صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ہی لی جاسکتی ہے۔

جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں 'اس وقت ایک مشکل یہ تھی کہ ابھی تک اسلام کی اس نوزائیدہ ریاست کا دائرہ بہت محدود تھا۔ یہود کے دو قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ مدینہ کے مضافات میں رہتے تھے اور زندگی کے بیشتر معاملات میں انھیں اپنے فیصلے خود کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں 'جن میں وہ یہود کے فیصلے کرتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام عدل اور مساوات کا، فی الواقع علمبردار ہے اور بارگاہ رسالت سے ہر ایک کو انصاف مل سکتا ہے تو بعض دفعہ ان کے عوام یا ان میں سے وہ لوگ 'جو بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے 'وہ اپنے فیصلہ طلب مسائل میں آنخضرت کی خدمت میں آنے کی کوشش کرتے تو ان کے لیڈر اور راہنما ان کو یہ پٹی پڑھا کر بھیجتے کہ دیکھو! اگر تمہیں وہاں سے فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق ملے تو اسے قبول کرنا 'ورنہ رد کر دینا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے اس طرز عمل کو دیکھ کر سخت غمزدہ ہوتے کہ ایک طرف تو یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا پیروکار کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشات کے سوا کسی چیز کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی طرف آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کو متوجہ فرمایا۔ (روح)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ : اے رسول][لَا : نہ][يَحْزُنْكَ : پریشان کریں آپ کو][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][يُسَارِعُوْنَ : وہ جلدی کرتے ہیں][فِي : میں][الْكُفْرِ : کفر][مِنَ : سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے][بِاَفْوَاهِهِمْ : ساتھ اپنے مونہوں][وَلَمْ : اور نہیں][تُؤْمِنْ : ایمان لائے][قُلُوْبُهُمْ : ان کے دل][ڔ وَمِنَ : اور سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][هَادُوْا : جو یہودی ہوئے][سَمّٰعُوْنَ : سننے والے ہیں][لِلْكَذِبِ : جھوٹ کو][سَمّٰعُوْنَ : سننے والے][لِقَوْمٍ : قوم اس کے][اٰخَرِيْنَ ۙ: دوسری][لَمْ : نہیں][يَاْتُوْكَ : وہ آئیں گے آپ کے پاس][ۭيُحَرِّفُوْنَ : وہ بدلتے ہیں][الْكَلِمَ : باتوں کو][مِنْۢ: سے][بَعْدِ : بعد][مَوَاضِعِهٖ : ان کی جگہ][يَقُوْلُوْنَ : وہ کہتے ہیں][اِنْ : اگر][اُوْتِيْتُمْ : تم دیے جاؤ][هٰذَا : یہ][فَخُذُوْهُ : تو

اسے لے لو][وَاِنْ : اور اگر][لَّمْ : نہ][تُؤْتَوْهُ : دیے جاؤتم وہ][فَاحْذَرُوْا: تو بچو][وَمَنْ : اور جو][يُّرِدِ : ارادہ کرے][اللّٰهُ : اللہ][فِتْنَتَهٗ : اس کا فتنہ][فَلَنْ : تو ہرگز نہیں][تَمْلِكَ : آپ اختیار رکھتے][لَهٗ : اس کے لیے][مِنَ : سے][اللّٰهِ : اللہ][شَيْـًٔا: کچھ بھی][اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ : وہی لوگ][لَمْ : نہیں][يُرِدِ : ارادہ کرتا][اللّٰهُ : اللہ][اَنْ : یہ کہ][يُّطَهِّرَ : پاک کرے][قُلُوْبَهُمْ : ان کے دل][لَهُمْ : ان کے لیے][فِي : میں][الدُّنْيَا : دنیا][خِزْيٌ : رسوائی][وَّلَهُمْ : اور ان کے لیے][فِي : میں][الْاٰخِرَةِ : آخرت][عَذَابٌ : عذاب][عَظِيْمٌ : بہت بڑا]

ترجمہ: اے رسول ! وہ لوگ آپ کو رنجیدہ خاطر نہ کریں جو کفر میں تیزی (سے پیش قدمی) کرتے ہیں ان میں (ایک) وہ (منافق) ہیں جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے، اور ان میں (دوسرے) یہودی ہیں، (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لیے (آپ کو) خوب سنتے ہیں (یہ حقیقت میں) دوسرے لوگوں کے لیے (جاسوسی کی خاطر) سننے والے ہیں جو (ابھی تک) آپ کے پاس نہیں آئے، (یہ وہ لوگ ہیں) جو (اﷲ کے) کلمات کو ان کے مواقع (مقرر ہونے) کے بعد (بھی) بدل دیتے ہیں (اور) کہتے ہیں: اگر تمہیں یہ (حکم جو ان کی پسند کا ہو) دیا جائے تو اسے اختیار کرلو اور اگر تمہیں یہ (حکم) نہ دیا جائے تو (اس سے) احتراز کرو، اور اللہ جس شخص کی گمراہی کا ارادہ فرمالے تو تم اس کے لیے اللہ (کے حکم کو روکنے) کا ہرگز کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ نے ارادہ (ہی) نہیں فرمایا۔ ان کے لیے دنیا میں (کفر کی) ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے.

تشریح:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے رسول: آپ کو وہ لوگ غم زدہ نہ کریں جو کفر میں تیزی کے ساتھ سرگرم ہیں`۔ (المائدہ: ۴۱)
اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ڈاکہ اور چوری سے متعلق احکام شرعیہ ارشاد فرمائے ' اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ مخالفین بہت گرم جوشی کے ساتھ کفر کا اظہار کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر کی تلقین کی۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ کفر میں ان کے سرگرمیوں کی پرواہ نہ کریں ' ان میں سے بعض منافقین ہیں جو کفر کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں ' آپ ان کو اہمیت نہ دیں۔ اللہ عزوجل آپ کے لیے کافی ہے ' اور ان کے مکروفریب کے خلاف آپ کی مدد فرمائے گا۔ اسی طرح آپ یہود کی ریشہ دوانیوں کی بھی فکر نہ فرمائیں ' یہ دونوں فریق یہود کے احبار اور رہبان سے دین اسلام کے متعلق جھوٹی باتیں بہت سنتے ہیں۔ آپ کی نبوت میں شبہات اور توراۃ میں تحریف پر مشتمل باتیں خوب سنتے ہیں اور ان کو قبول کرتے ہیں۔ اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو یہودی آپ کے پاس نہیں آتے یہ ان کے جاسوس ہیں ' آپ پر جھوٹ باندھنے کے لیے یہ آپ کی باتیں سنتے ہیں ' تاکہ جو کچھ آپ سے سنیں اس میں تغیر اور تبدل کرکے اور اپنے پاس سے جھوٹ ملا کر یہودیوں کو پہنچائیں۔

قرآن مجید میں دو جگہ آپ کو (آیت) "یاایھاالرسول "کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔ایک یہ جگہ ہے (المائدہ: ۴۱) اور دوسری آیت یہ ہے (آیت) "یاایھاالرسول بلغ ماانزل الیک "۔(المائدہ: ٦٧) ان کے علاوہ باقی ہر جگہ آپ کو (آیت) "یاایھاالنبی "کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت مہتم بالشان آیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اللہ کے) کلام کو اس کی جگہوں سے بدل دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ (حکم) دیا جائے تو اس کو مان لو' اور اگر یہ (حکم) نہ دیا جائے تو اس سے اجتناب کرو'۔(المائدہ: ۴۱)

یہود توراۃ میں لفظی تحریف بھی کرتے تھے اور معنوی بھی۔ لفظی تحریف یہ تھی کہ کسی لفظ کو درمیان سے چھوڑ دیتے تھے' یا کسی لفظ کو دوسرے لفظ سے بدل دیتے تھے' یا اس لفظ کو زبان مروڑ کر اس طرح پڑھتے تھے کہ اس کا معنی بدل جاتا تھا' اور معنوی تحریف یہ تھی کہ کسی آیت کی الٹ تفسیر بیان کرتے یا باطل تاویل کرتے' اگر ان سے آخری نبی کی صفات پوچھی جاتی تو دجال کی صفات پڑھ کر سنا دیتے۔

امام ابو جعفر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے بیان کیا ہے کہ یہود بنو قریظہ اپنے آپ کو بنو نضیر سے افضل کہتے تھے۔اگر بنو قریضہ کا کوئی شخص بنو نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو وہ قصاص کے لیے تیار نہ ہوتے' صرف دیت دیتے تھے اور اگر بنو نضیر کا کوئی شخص بنو قریضہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا' تو پھر اس سے قصاص لیتے تھے۔جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ آئے تو وہ اسی طریقہ پر کاربند تھے۔ بنو قریظہ نے بنو نضیر کے کسی آدمی کو عمدا قتل کر دیا۔اس وقت منافقوں نے کہا کہ اگر یہ (نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیت ادا کرنے کا حکم دیں تو مان لینا' ورنہ ان کے حکم سے اجتناب کرنا۔اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان: ج ٦ 'ص ۳۲۳) (تبیان)

دراصل یہاں نیا خطاب شروع ہوتا ہے۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شب و روز کی پرخلوص محنت کے باوجود منافق آپ کو تکلیف دینے، مسلمانوں کا مذاق اڑانے اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے میں آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ان کے ساتھ یہودیوں کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جھوٹ سننے اور اسے آگے پھیلانے کا مستقل مشغلہ اختیار کر رکھا تھا۔

۱۔ یہودی اپنے علماء سے جھوٹے مسائل سنتے اور ان کو آگے پھیلاتے تھے۔

۲۔ یہودی جھوٹ سننا پسند کرتے اور جھوٹی باتیں لوگوں تک پہنچاتے تھے تاکہ لوگ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام سے دور رہیں۔

یہودیوں کی دوسری بدترین عادت یہ تھی اور ہے کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر اور قرآن کو اس کے سیاق وسباق سے ہٹ کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ اسلام کے بارے میں تشکیک کا شکار رہیں حتی کہ آج بھی مستشرقین ایسا کر رہے ہیں۔اور لوگوں کو یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے عقائد کے مطابق مسائل بیان کریں تو انھیں قبول کرلو اگر ایسا نہ کریں تو ہر گز قبول نہ کرو۔اس کا صاف مطلب تھا اور ہے کہ دین ان کی مرضی کے مطابق نازل ہونا چاہیے اس صورت حال پر نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بتقاضائے طبیعت رنجیدہ خاطر ہوتے جس پر آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اے پیارے رسول ﷺ آپ ﷺ کو لوگوں کی ہرزہ سرائی اور بداعمالیوں پر دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔یاد رکھیں جسے اللہ اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا کر دے تو وہ سمجھنے سے قاصر ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کے دلوں کو نفاق اور گندگی سے کبھی پاک نہیں کرے گا، ان کے لیے دنیا میں ذلت اور آخرت میں بڑا عذاب ہوگا۔

جن لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں زمینی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ انہیں ہدایت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ لوگ اپنے قلوب واذہان کو اس گندگی سے پاک نہیں کرنا چاہتے۔ جس وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی انھیں طہارت قلبی کی توفیق نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کے لیے بالآخر دنیا میں ذلت ورسوائی ہے۔ اور آخرت میں انھیں عذاب الیم میں مبتلا کیا جائے گا۔

"حضرت حفص بن عاصم (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کرے۔" [رواہ مسلم : فی المقدمۃ]

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ الصِّدْقَ یَهْدِی إِلَی الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ یَهْدِی إِلَی الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقُ حَتَّی یَکُونَ صِدِّیقًا، وَإِنَّ الْکَذِبَ یَهْدِی إِلَی الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ یَهْدِی إِلَی النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذِبُ، حَتَّی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ کَذَّابًا)

[رواہ مسلم : باب قُبْحِ الْکَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ وَفَضْلِهِ]

"حضرت عبداللہ (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا بیشک سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں سچا لکھ دیا جاتا ہے اور بیشک جھوٹ برائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور برائی آگ کی طرف لے جاتی ہے اور بیشک آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے حتی کہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔ (فہم)"

شان نزول

شان نزول یہ ہے کہ خیبر کے معزز شمار کئے جانے والے یہودیوں میں سے ایک شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت نے زنا کیا۔ اس کی سزا توراۃ میں سنگسار کرنا تھی، یہ انھیں گوارانہ تھا اس لیے انھوں نے چاہا کہ اس مقدمے کا فیصلہ سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کرائیں، چنانچہ ان دونوں مجرموں کو ایک جماعت کے ساتھ مدینہ طیبہ بھیجا اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ اگر حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حد یعنی کوڑے مارنے کا حکم دیں تو مان لینا اور سنگسار کرنے کا حکم دیں تو نہ ماننا۔ وہ لوگ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودیوں کے پاس آئے اور سمجھے کہ یہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہم وطن ہیں اور ان کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صلح بھی ہے لہٰذا ان کی سفارش سے کام بن جائے گا، چنانچہ یہودی سرداروں میں سے کعب بن اشرف، کعب بن اسد، سعید بن عمرو، مالک بن صیف اور کنانہ بن ابی الحقیق وغیرہا انھیں لے کر تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ دریافت کیا۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "کیا میرا فیصلہ مانوگے؟" انھوں نے اقرار کیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رجم یعنی سنگسار کرنے کا حکم دیدیا۔ یہودیوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا تو حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تم میں ایک نوجوان اِبنِ صوریا ہے، کیا تم اس کو جانتے ہو؟ کہنے لگے، ہاں۔ سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "وہ کیسا آدمی ہے؟ یہودی کہنے لگے کہ آج روئے زمین پر یہودیوں میں اس کے پائے کا کوئی عالم نہیں، توراۃ کا یکتا ماہر ہے۔ ارشاد فرمایا "اس کو بلاؤ۔ چنانچہ اسے بلایا گیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، کیا تو ابن صوریا ہے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ ارشاد فرمایا، کیا یہودیوں میں سب سے بڑا عالم تو ہی ہے؟ اس نے عرض کی: لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہودیوں سے فرمایا "کیا اس معاملہ

میں تم اس کی بات مانوگے ؟ سب نے اقرار کیا۔ تب سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابن صوریا سے فرمایا "میں تجھے اس اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر توراۃ نازل فرمائی اور تم لوگوں کو مصر سے نکالا اور تمہارے لیے دریا میں راہیں بنائیں اور تمہیں نجات دی، فرعونیوں کو غرق کیا اور تمہارے لیے بادل کو سائبان بنایا، "منّ وسلوٰی" نازل فرمایا اور اپنی کتاب نازل فرمائی جس میں حلال وحرام کا بیان ہے، کیا تمہاری کتاب میں شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سنگسار کرنے کا حکم ہے ؟ ابنِ صوریا نے عرض کی: بیشک یہ حکم توراۃ میں ہے، اسی کی قسم جس کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے ذکر کیا۔ اگر مجھے عذاب نازل ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اقرار نہ کرتا اور جھوٹ بول دیتا، مگر یہ فرمایئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کتاب میں اس کا کیا حکم ہے ؟ سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جب چار عادل اور معتبر گواہوں کی گواہی سے زنا صراحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو سنگسار کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ ابن صوریا نے عرض کی: خدا عَزَّوَجَلَّ کی قسم، بالکل ایسا ہی توراۃ میں ہے۔ پھر حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابن صوریا سے دریافت فرمایا کہ: حکمِ الٰہی میں تبدیلی کس طرح واقع ہوئی ؟ اس نے عرض کیا کہ "ہمارا دستور یہ تھا کہ ہم کسی امیر کو پکڑتے تو چھوڑ دیتے اور غریب آدمی پر حد قائم کرتے، اس طرز عمل سے امراء میں زنا کی بہت کثرت ہو گئی یہاں تک کہ ایک مرتبہ بادشاہ کے چچازاد بھائی نے زنا کیا تو ہم نے اس کو سنگسار نہ کیا، پھر ایک دوسرے شخص نے اپنی قوم کی عورت سے زنا کیا تو بادشاہ نے اس کو سنگسار کرنا چاہا، اس کی قوم اٹھ کھڑی ہوئی اور انھوں نے کہا جب تک بادشاہ کے بھائی کو سنگسار نہ کیا جائے اس وقت تک اس کو ہر گز سنگسار نہ کیا جائے گا۔ تب ہم نے جمع ہو کر غریب اور امیر سب کے لیے بجائے سنگسار کرنے کے یہ سزا نکالی کہ چالیس کوڑے مارے جائیں اور منہ کالا کرکے گدھے پر الٹا بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جائے۔ یہ سن کر یہودی بہت بگڑے اور ابن صوریا سے کہنے لگے "تو نے انھیں یعنی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بڑی جلدی خبر دیدی اور ہم نے جتنی تیری تعریف کی تھی تو اس کا مستحق نہیں۔ ابن صوریا نے کہا کہ " حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے توراۃ کی قسم دلائی، اگر مجھے عذاب کے نازل ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خبر نہ دیتا۔ اس کے بعد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے ان دونوں زناکاروں کو سنگسار کیا گیا اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۴۱، ۱/۴۹۴-۴۹۵) (صراط)

مسائل

۱۔ کفر کی طرف راغب ہونے والے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

۲۔ یہودی جھوٹ گھڑتے اور بولتے ہیں۔

۳۔ یہودی اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ جس کو آزمائش میں مبتلا کرے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

۵۔ جھوٹ گھڑنے والے اور کلام اللہ میں تحریف کرنے والوں کے دل پاک نہیں ہوتے۔

۶۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں ذلت اور آخرت میں عظیم عذاب ہوگا۔

آیت مبارکہ:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

لغۃ القرآن: [سَمّٰعُوْنَ : سننے والے ہیں][لِلْكَذِبِ : جھوٹ کو][اَكّٰلُوْنَ : کھانے والے][لِلسُّحْتِ: حرام کو][فَاِنْ : پھر اگر][جَآءُوْكَ : آئیں آپکے پاس][فَاحْكُمْ : آپ فیصلہ کریں][بَيْنَهُمْ : ان کے درمیان][اَوْ : یا][اَعْرِضْ : اعراض کرلیں][عَنْهُمْ : ان سے][وَاِنْ : اور اگر][تُعْرِضْ : آپ منہ پھیرلیں][عَنْهُمْ : ان سے][فَلَنْ : تو ہرگز نہیں][يَّضُرُّوْكَ : وہ بگاڑ سکیں گے آپ کا][شَيْئًا : کچھ بھی][وَاِنْ : اور اگر][حَكَمْتَ : آپ فیصلہ کریں][فَاحْكُمْ : تو فیصلہ کریں][بَيْنَهُمْ : انکے درمیان][بِالْقِسْطِ : انصاف کے ساتھ][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][يُحِبُّ : پسند کرتا ہے][الْمُقْسِطِيْنَ : انصاف کرنے والے]

ترجمہ: (یہ لوگ) جھوٹی باتیں بنانے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں (مزید یہ کہ) حرام مال خوب کھانے والے ہیں۔ سو اگر (یہ لوگ) آپ کے پاس (کوئی نزاعی معاملہ لے کر) آئیں تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ فرمادیں یا ان سے گریز فرمالیں، اور اگر آپ ان سے گریز (بھی) فرمالیں تو (تب بھی) یہ آپ کو ہرگز کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور اگر آپ فیصلہ فرمائیں تو ان کے درمیان (بھی) عدل سے (ہی) فیصلہ فرمائیں (یعنی ان کی دشمنی عادلانہ فیصلے میں رکاوٹ نہ بنے)، بیشک اللہ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے

تشریح: جب جھوٹ سننا اور حرام کھانا کسی فرد یا قوم کی عادت ہو جائے تو پھر اس کی اصلاح کے تمام راستے مسدود ہو جایا کرتے ہیں کیونکہ صالح کردار کے لیے اکل حلال اور صدق مقال شرط ہے۔ جھوٹ بولنے اور حرام کھانے میں کوئی قوم یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی بعض مفسرین نے "سُحْتَ" کا معنٰی رشوت خوری بھی کیا ہے۔

رشوت کا لین دین ہو یا حرام خوری کا معاملہ یہودی اس سلسلہ میں ہمیشہ سرفہرست دکھائی دیں گے۔ (فہم)

جھوٹ اور رشوت کی تباہ کاریاں

منافقین اور یہود کی سیرت و کردار اور طور اطوار کی مذمت کرنے کے بعد اور ان کے رہنماؤں کی سازشوں سے پردہ اٹھانے کے بعد اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کی طرف پھیرا جارہا ہے اور یہ توجہ دلائی جارہی ہے کہ یہ اہل کتاب جو کبھی حامل دعوت امت رہ چکے ہیں ' یہ تو اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں تم پر جو قیامت تک اس عظیم منصب کی ذمہ داریاں ڈالی جارہی ہیں تمہیں اس امت کے خدوخال کو اچھی طرح پہچان کر اپنے بارے میں ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔ اس لیے ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ یہ جو اپنے منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے نااہل ثابت ہوئے ہیں تو بہت ساری خرابیوں کے ساتھ ساتھ 'ان میں دو بنیادی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ

(یہ لوگ جھوٹ کے رسیا اور پرلے درجے کے حرام خور ہیں)

" اَکَّالُ ' " اسم مبالغہ ہے۔ اس کا معنی ہے "بہت کھانے والا" اور "سُحتِ" کہتے ہیں "حرام کمائی" کو۔ لیکن امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں "سُحتِ" سے مراد "رشوت" ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ انسان کے انفرادی کردار کی سب سے بڑی بنیاد 'سچائی ہے۔ جھوٹ 'اس بنیاد کو اکھاڑ دینے والی چیز ہے۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جب پوچھا گیا تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا ایک مسلمان چور ہو سکتا ہے 'ڈاکو ہو سکتا ہے 'زانی ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہو سکتا ہے یعنی یہ برائیاں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں میں پیدا ہو جائیں۔ لیکن جب پوچھا گیا کہ کیا مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا مسلمان کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ اہل کتاب جب دینی اعتبار سے اپنے زوال کی انتہا کو پہنچے تو جھوٹ ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا 'جس نے ان کی اخلاقی زندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں سب سے اہم رول ادا کیا۔

اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی کی استواری اور ہمواری کے لیے جو چیز انتہائی ناگزیر ہے 'وہ ہر سطح پر اور ہر لحاظ سے کسب حلال ہے اور اس میں سب سے اہم چیز رشوت سے بچنا ہے لیکن جب کسی قوم کو زوال آگھیرتا ہے 'پھر وہ آہستہ آہستہ رزق حلال سے محروم ہوتی جاتی ہے اور حرام کے سارے دروازے اس پر کھلتے جاتے ہیں اور آخری وہ چیز 'جو اس کی اجتماعی زندگی کو مکمل طور پر تباہ کر دیتی ہے 'وہ اس کے اجتماعی اداروں میں ہر سطح پر رشوت کا داخل ہو جانا ہے۔ مسلمانوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ اہل کتاب اور منافقین جھوٹ کے رسیا بن کر انفرادی زندگی میں ہر طرح کے اخلاق سے عاری ہوگئے اور اجتماعی اداروں میں رشوت کے بازار گرم ہونے کی وجہ سے 'اجتماعی اخلاق سے محروم ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق سے تعلق تو ٹوٹا ہی تھا 'حقوق کی بازیابی کے لیے آخری سہارا ادارے اور عدالتیں ہوتی ہیں 'وہ رشوت کی نذر ہو کر 'اپنا اصل کردار ادا کرنے سے معطل ہو کر رہ گئیں۔ مسلمانوں سے یہی بات اس سورۃ کے آغاز میں کہی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز (المائدۃ ۵: ۸)

اے مسلمانو! تمہاری منصبی ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ تم دو ذمہ داریاں ادا کرو۔ ایک یہ کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے بنو اور دوسرا یہ کہ قانون عدل و قسط کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے تم میں موجود ہونے چاہئیں۔

یہ دونوں چیزیں 'نظام حق وانصاف اور قیام عدل وقسط کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور جھوٹ اور رشوت 'ان دونوں کے لیے سم قاتل ہیں اور اس پورے نظام کو تباہ کردینے والی ہیں۔ شاید اسی لیے عربی زبان میں 'سُحت 'جو رشوت کے لیے استعمال ہوتا ہے 'حقیقت میں اس کا معنی " استیصال کردینا " ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے : " فَیُسۡحِتَکُمۡ بِعَذَاب "کہ اللہ تمہیں عذاب کے ذریعے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ رشوت وہ لعنت ہے 'جو انسانی تہذیب وتمدن اور اجتماعیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں یہ رشوت کی چاٹ 'جب اداروں کو لگ جاتی ہے تو پھر اس معاشرے کو تباہی سے بچانا بہت مشکل ہوجاتا ہے اور مسلمان جس عظیم منصب پر فائز کیے گئے ہیں 'اس میں ظاہر ہے 'یہ جھوٹ اور رشوت اگر عام ہوجائے تو پھر مسلمانوں کو اس تباہی سے کون بچاسکتا ہے۔ (روح)

سَمّٰعُونَ لِلۡکَذِبِ : بہت جھوٹ سننے والے۔} سابقہ آیت میں جھوٹ سننے والوں سے مراد یہودی عوام تھی جو پادریوں اور سرداروں کے جھوٹ سن کر اس پر عمل کرتے تھے اور اس آیت میں جھوٹ سننے والوں سے مراد یہودی حکمران اور پادری ہیں جو رشوتیں لے کر حرام کو حلال کرتے اور شریعت کے احکام کو بدل دیتے تھے۔

رشوت کا شرعی حکم اور اس کی وعیدیں

رشوت کا لینا دینا دونوں حرام ہیں اور لینے دینے والے دونوں جہنمی ہیں، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں "رشوت لینا مطلقًا حرام ہے، جو پرایا حق دبانے کے لیے دیا جائے (وہ) رشوت ہے یونہی جو اپنا کام بنانے کے لیے حاکم کو دیا جائے رشوت ہے لیکن اپنے اوپر سے دفع ظلم (یعنی ظلم دور کرنے) کے لیے جو کچھ دیا جائے (وہ) دینے والے کے حق میں رشوت نہیں، یہ دے سکتا ہے، لینے والے کے حق میں وہ بھی رشوت ہے اور اسے لینا حرام۔

(فتاوی رضویہ، ۵۹۷/۲۳)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "رشوت لینا مطلقًا گناہِ کبیرہ ہے، لینے والا حرام خوار ہے، مستحق سخت عذاب نار ہے، دینا اگر بمجبوری اپنے اوپر سے دفع ظلم کو ہو تو حرج نہیں اور اپنا آتا وصول کرنے کو ہو تو حرام ہے اور لینے دینے والا دونوں جہنمی ہیں اور دوسرے کا حق دبانے یا اور کسی طرح ظلم کرنے کے لیے دے تو سخت تر حرام اور مستحق اَشَد غضب وانتقام ہے۔

(فتاوی رضویہ، ۴۶۹/۱۸)

اَحادیث میں رشوت لینے، دینے والے کے لیے شدید وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں

(1)۔۔ حضرت ابو حمید ساعدی (رض) فرماتے ہیں : نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو بنی سُلَیم سے زکوۃ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا جسے اِبْنِ لُتْبِیَہ کہا جاتا تھا۔ جب اس نے آکر حساب دیا تو کہا : یہ آپ کا مال ہے اور یہ میرا تحفہ ہے۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اچھا ! تم اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھے رہتے اور دیکھتے کہ تمہارے لیے (وہاں سے) کتنے تحفے آتے ہیں اور تم

اپنے بیان میں کتنے سچے ہو۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے خطاب کیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا "جب میں تم میں سے کسی کو کسی جگہ کا عامل بناتا ہوں جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے تو وہ میرے پاس آکر کہتا ہے: یہ آپ کا مال ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے تحفۃً دیا گیا ہے۔ یہ کیوں نہ کیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھا رہتا یہاں تک کہ اس کے پاس تحفے آتے۔ خدا کی قسم! تم میں سے جو کوئی بغیر حق کے کسی چیز کو لے گا وہ اسے اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا۔ میں اچھی طرح پہچانتا ہوں کہ جب تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اس نے اونٹ اٹھایا ہوا ہوگا جو بلبلاتا ہوگا یا گائے جو ڈکراتی ہوگی یا بکری جو ممیاتی ہوگی۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا دست مبارک بلند فرمایا یہاں تک کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگی اور کہنے لگے: اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، کیا میں نے (تیرا حکم) پہنچا دیا؟

(بخاری، کتاب الحیل، باب احتیال العامل لیہدی لہ، ۳۹۸/۴، الحدیث: ۶۹۷۹)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "رشوت لینے اور دینے والے دونوں جہنمی ہیں۔ (معجم الاوسط، باب الالف، من اسمہ احمد، ۵۵۰/۱، الحدیث: ۲۰۲۶)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو گوشت سحت سے پلا بڑھا تو آگ اس کی زیادہ حق دار ہے۔ عرض کی گئی: سُحت سے کیا مراد ہے؟ ارشاد فرمایا: فیصلہ کرنے میں رشوت لینا۔ (جمع الجوامع، قسم الاقوال، حرف الکاف، ۳۹۱/۵، الحدیث: ۱۵۹۰۴)

رشوت سے حاصل کئے ہوئے مال کا شرعی حکم

جس نے کوئی مال رشوت سے حاصل کیا ہو تو اس پر فرض ہے کہ جس جس سے وہ مال لیا انھیں واپس کر دے، اگر وہ لوگ زندہ نہ رہے ہوں تو ان کے وارثوں کو وہ مال دیدے، اگر دینے والوں کا یا ان کے وارثوں کا پتا نہ چلے تو وہ مال فقیروں پر صدقہ کر دے۔ خرید و فروخت وغیرہ میں اس مال کو لگانا حرام قطعی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ مال رشوت کے وبال سے سبکدوش ہونے کا نہیں ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۵۵۱/۲۳، ملخصاً)

یہاں چونکہ رشوت پر کچھ تفصیلی کلام کیا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حوالے کچھ مزید فقہی وضاحت کر دی جائے چونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ رشوت شاید وہی ہے جو سرکاری محکموں میں دی جاتی ہے یا جو غلط کام کروانے کیلئے دی جاتی ہے یا جو رشوت کا نام لے کر دی جائے حالانکہ مذکورہ بالا صورتیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں رشوت میں ہی داخل ہیں خواہ رشوت کا نام لیا جائے یا نہیں۔ ایک آدھ صورت مُستَثنیٰ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ رشوت کے بارے میں اسی طرح کی غلط فہمیوں کے ازالے کیلئے یہاں فتاویٰ رضویہ سے ایک اہم فتویٰ نقل کیا جاتا ہے چنانچہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں "جو شخص بذات خود خواہ از جانب حاکم کسی طرح کا قہر و تسلُّط (دوسروں پر اختیار) رکھتا ہو جس کے سبب لوگوں پر اس کا کچھ بھی دباؤ ہو اگرچہ وہ فی نفسہ ان پر جبر و تعدی نہ کرے

دباؤنہ ڈالے اگرچہ وہ کسی فیصلہ قطعی بلکہ غیر قطعی کا بھی مجاز نہ ہو جیسے کوتوال، تھانہ دار، جمعدار یا دہقانیوں کے لیے زمیندار مقدم پٹواری یہاں تک کہ پنچایتی قوموں یا پیشوں کے لیے ان کا چودھری، ان سب کو کسی قسم کے تحفہ لینے یا دعوت خاصہ (یعنی وہ دعوت کہ خاص اسی کی غرض سے کی گئی ہو کہ اگر یہ شریک نہ ہو تو دعوت ہی نہ ہو) قبول کرنے کی اصلاً اجازت نہیں مگر تین صورتوں میں، اول اپنے افسر سے جس پر اس کا دباؤ نہیں، نہ وہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی طرف سے یہ ہدیہ و دعوت اپنے معاملات میں رعایت کرانے کے لیے ہے۔ دوم ایسے شخص سے جو اس کے اس منصب سے پہلے بھی اسے ہدیہ دیتا یا دعوت کرتا تھا بشرطیکہ اب سے اسی مقدار پر ہے ورنہ زیادت روا (جائز) نہ ہوگی مثلاً پہلے ہدیہ و دعوت میں جس قیمت کی چیز ہوتی تھی اب اس سے گراں قیمت (زیادہ قیمتی)، پر تکلف ہوتی ہے یا تعداد میں بڑھ گئی یا جلد جلد ہونے لگی کہ ان سب صورتوں میں زیادت موجود اور جواز مفقود، مگر جبکہ اس شخص کا مال پہلے سے اس زیادت کے مناسب زائد ہوگیا ہو جس سے سمجھا جائے کہ یہ زیادت اس شخص کے منصب کے سبب نہیں بلکہ اپنی ثروت بڑھنے کے باعث ہے۔ سوم اپنے قریب محارم سے، جیسے ماں باپ اولاد بہن بھائی نہ چچا ماموں خالہ پھوپھی کے بیٹے کہ یہ محارم نہیں اگرچہ عرفاً انھیں بھی بھائی کہیں۔ محارم سے مطلقاً اجازت ظاہر عبارت قدوری پر ہے ورنہ امام سغناقی نے نہایہ پھر امام محقق علی الاطلاق نے فتح القدیر میں اسے بھی صورت دوم ہی میں داخل فرمایا کہ محارم سے بھی ہدیہ و دعوت کا قبول اسی شرط سے مشروط کہ پیش از حصول منصب بھی وہ اس کے ساتھ یہ برتاؤ برتتے ہوں مگر یہ کہ اسے یہ منصب ملنے سے پہلے وہ فقرا تھے اب صاحب مال ہوگئے کہ اس تقدیر پر پیش از منصب عدم ہدیہ و دعوت بربنائے فقر سمجھا جائے گا اور فی الواقع اظہر من حیث الدلیل یہی نظر آتا ہے کہ جب باوصف قدرت پیش از منصب عدم یا قلّت وبعد منصب شروع باکثرت بربنائے منصب ہی سمجھی جائے گی اس تقدیر پر صرف دو ہی صورتیں مستثنیٰ رہیں پھر بہرحال جو صورت مستثنیٰ ہوگی وہ اسی حال میں حکم جواز پاسکتی ہے جب اس وقت اس شخص کا کوئی کام اس سے متعلق نہیں ورنہ خاص کام پڑنے غرض متعلق ہونے کے وقت اصلاً اجازت نہیں خواہ وہ افسر ہو یا بھائی یا پہلے سے ہدیہ وغیرہا دینے والا بلکہ ایسے وقت عام دعوت میں شریک ہونا بھی نہ چاہیے نہ کہ خاص، پھر جہاں جہاں ممانعت ہے اس کی بنا صرف تہمت واندیشہ رعایت پر ہے حقیقۃً وجود رعایت ضرور نہیں کہ اس کا اپنے عمل میں کچھ تغیر نہ کرنا یا اس کا اس کی عادت بے لوثی سے آگاہ ہونا مفید جواز ہوسکے۔ دنیا کے کام امید ہی پر چلتے ہیں، جب یہ دعوت و ہدایا قبول کیا کرے گا تو ضرور خیال جائے گا کہ شاید اب کی بار کچھ اثر پڑے کہ مفت مال دینے کی تاثیر مجرب و مشاہد ہے اس بار نہ ہوئی اس بار ہوگی، اس بار نہ ہوئی پھر کبھی ہوگی، اور یہ حیلہ کہ اس کا ہدیہ و دعوت بربنائے اخلاق انسانیت ہے نا بلحاظ منصب، اس کا رد خود حضور اقدس سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرما چکے ہیں، جب ایک صاحب کو تحصیل زکوۃ پر مقرر فرما کر بھیجا تھا انھوں نے اموال زکوۃ حاضر کئے اور کچھ مال جدا رکھے کہ یہ مجھے ملے ہیں فرمایا اپنی ماں کے گھر بیٹھ کر دیکھا ہوتا کہ اب کتنے تحفے ملتے ہیں یعنی یہ ہدایا صرف اسی منصب کی بناپر ہیں اگر گھر بیٹھا ہوتا تو کون آکر دے جاتا، اس مسئلہ کی تفاصیل میں اگرچہ کلام بہت طویل ہے مگر یہاں جو کچھ مذکور ہوا بعونہ تعالیٰ خلاصہ تنقیح و صالح تحویل ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۱۸/۱۷۰۔۱۷۱)

فَاِنۡ جَآءُوۡكَ: تو اگر وہ تمہارے پاس آئیں۔} یہاں سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اختیار دیا گیا کہ اہل کتاب آپ کے پاس کوئی مقدمہ لائیں تو آپ کو اختیار ہے فیصلہ فرمائیں یا نہ فرمائیں۔ (صراط)

شان نزول۔۔احکام قصاص و دیت میں یہودیوں کی خیانت

آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے قرب وجوار میں یہود کے دو قبیلہ بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے۔ان میں بنو نضیر مال و دولت قوت شوکت و عزت کے لحاظ سے بنو قریظہ سے زیادہ تھے۔اس لیے آئے دن قبیلہ بنو نضیر والے قبیلہ بنو قریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور بنو قریظہ چاروناچار اس کو برداشت کرتے رہتے تھے۔بنو قریظہ کو اس کمزوری کے باعث اس ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا گیا کہ اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی شخص کو قتل کردے تو اس کا قصاص یعنی جن کے بدلہ میں جان لینے کا ان کو حق نہ ہوگا بلکہ صرف ۸۰ وسق کھجوریں اس کے خون بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی۔(وسق اس زمانہ میں عربی تول کا ایک پیمانہ تھا جو پاکستان وزن کے اعتبار سے تقریباً ۵ من دس سیر کا ہوا(معارف القرآن) اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی شخص کو قتل کردے تو اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے گا اور اس سے خون بہا بھی لیا جائے گا اور وہ بھی بنو نضیر کے خون بہا سے دگنا یعنی ۱۴۰ وسق کھجوریں اور اگر بنو نضیر کی کوئی مقتول عورت ہوگی تو اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے ایک مرد کو قتل کیا جائے گا اور اگر بنو نضیر کے غلام کو قتل کیا گیا ہے اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے آزاد کو قتل کیا جائے گا اور اگر بنو نضیر کے آدمی کا کسی نے ایک ہاتھ کاٹا تو بنو قریظہ کے آدمی کا ایک کان کاٹا گیا ہے تو بنو قریظہ کے آدمی کے دونوں کان کاٹے جائیں گے۔بہر حال اسلامی قوانین سے پہلے یہ ظلم وجور کا قانون ان دونوں قبیلوں میں مدینہ میں رائج تھا اور قبیلہ بنو قریظہ اپنی کمزوری کی بنا پر اس کے ماننے پر مجبور تھے۔

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اور مدینہ دارالاسلام بن گیا تو یہ دونوں قبائل جو ابھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے اور نہ کسی معاہدہ کی رو سے اسلامی احکام کے پابند تھے مگر اسلامی قوانین کا عدل وانصاف اور سہولتیں سب دیکھ رہے تھے۔اس عرصہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی نے بنو قریظہ کے کسی آدمی کو مار ڈالا تو بنو نضیر نے اپنے رائج پرانے معاہدہ کے مطابق خون بہا کا مطالبہ کیا اور دوگنی دیت طلب کی۔بنو قریظہ اگرچہ اس وقت تک اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے اور نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس وقت ان کا کوئی معاہدہ تھا لیکن چونکہ۔یہ یہود اہل کتاب تھے ان میں کے پڑھے لکھے لوگ بہت سے اپنی توراۃ کی پیشین گوئیوں کے مطابق جانتے تھے آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی نبی آخر الزمان ہیں جن کے آنے کی بشارت اور خوشخبری توراۃ نے دی ہے مگر اس وقت تک مذہبی تعصب یا دنیوی لالچ کی بناء پر ایمان نہ لائے تھے مگر اسلام کی خوبیاں،اسلامی مساوات اور عدل وانصاف کو وہ بھی علانیہ دیکھ رہے تھے اس لیے بنو نضیر کے قبیلہ کے ظلم سے بچنے کے لیے انھوں نے اسلامی قانون کا سہارا لیا اور دوگنی دیت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم تم ایک ہی خاندان سے ہیں۔ایک ہی وطن کے باشندے ہیں اور دونوں کا ایک ہی مذہب یعنی یہودیت ہے لٰہذا یہ غیر منصفانہ اور ظلم وجور کا معاملہ جو آج تک تمہاری زبردستی اور ہماری کمزوری کے باعث ہوتا رہا اب ہم اس کو گوارا نہ کریں گے۔اس پر بنو نضیر میں بڑا اشتعال پیدا ہوا اور قریب تھا کہ دونوں قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے مگر ان کے کچھ بڑے بوڑھوں کے مشورہ سے آپس میں یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کرایا جائے۔بنو قریظہ کی تو یہ دلی خواہش تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنو نضیر کے ظلم کو برقرار نہ رکھیں گے۔بنو نضیر بھی باہمی گفت وشنید اور صلح کی بنا پر اس کے لیے مجبور تو ہوگئے مگر اس میں یہ سازش کی کہ آپ کے پاس مقدمہ لے جانے سے پہلے کچھ ایسے لوگوں کو آگے بھیجا جو حقیقت میں تو انہی کے ہم مذہب یہودی تھے مگر منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرکے اور اسلام کے مدعی ہو کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آتے جاتے تھے اور اس سے غرض ان کی یہ

تھی کہ وہ لوگ اس معاملہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عندیہ اور نظریہ پہلے سے معلوم کرلیں تاکہ اگر فیصلہ ہمارے مطالبہ کے موافق ہونے کی امید ہو تو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو قبول کرلیا جائے اور اگر ان کے خلاف حکم ہونے کی امید ہو تو آپ کے فیصلہ ماننے کا وعدہ نہ کیا جائے۔ یہی واقعہ ان آیات کے نزول کا سبب ہوا جن میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اطلاع دی گئی کہ یہ لوگ مخلصانہ طور پر آپ کو حکم نہیں بنا رہے بلکہ ان کی نیتوں میں فساد ہے بہر حال آپ کو اختیار دیا گیا کہ آپ چاہیں تو ان کے معاملہ کا فیصلہ فرمادیں اور نہ چاہیں تو ان کو ٹال دیں اور اگر آپ ان کو ٹال ہی دیں تو یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید ناخوش ہو کر عداوت نکالیں کیونکہ ان کی مجال نہیں کہ ذرا بھی آپ کو ضرر پہنچا سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے نگہبان ہیں اور اگر آپ کی رائے فیصلہ کرنے پر قرار پائے تو ان میں عدل یعنی قانون اسلام کے موافق فیصلہ کیجئے۔ بیشک حق تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ یہاں یہود کی چند بری خصلتوں کا بیان فرما کر مسلمانوں کو سنایا گیا اور متنبہ کیا گیا کہ وہ ان باتوں سے محفوظ رہیں اور ان کافرانہ خصلتوں سے بچنے کا اہتمام کریں ان آیات اور گزشتہ آیات میں یہود اور منافقین کے چند اعمال بالخصوص ذکر کئے گئے۔ (درس اسحاق)

بربادی کا ایک سبب

لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بہت بڑی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار، چست و چالاک ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو بہتر سے بہتر ڈاکٹر حکیم کو تلاش کرتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل بیرسٹر ڈھونڈھ لاتے ہیں، کوئی مکان بنانا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکٹیکٹ اور انجنیئر کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور کرتہ دیکھا اور کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن لیا، اس کو مقتداء، عالم، مفتی، رہبر بنالیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس نے باقاعدہ کسی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے یا نہیں؟ علماء ماہرین کی خدمت میں رہ کر علم دین کا کچھ ذوق پیدا کیا ہے یا نہیں، کچھ علمی خدمات کی ہیں یا نہیں، سچے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر کچھ تقویٰ وطہارت پیدا کی ہے یا نہیں؟

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل واعظوں اور دکاندار پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جاپڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ کہانیاں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر زد نہ پڑے، وہ خوش ہیں کہ ہم دین پر چل رہے ہیں۔

رشوت نظام مملکت کی بربادی کا سبب ہے

رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے بلکہ پورے ملک وملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہوگیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لیے شریعت اسلام میں اس کو سحت فرما کر اشد حرام قرار دیا

ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لیے امراء وحکام کو جو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام کر دیا گیا ہے (جصاص)۔

رشوت سے متعلقہ تمام افراد پر لعنت

اور ایک حدیث میں رسول کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں اور اس شخص پر بھی جوان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے (جصاص)

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے، وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے، یا صوم وصلوٰۃ اور حج اور تلاوت قرآن عبادات ہیں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، ان پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے۔ تعلیم قرآن اور امامت اس سے مستثنیٰ ہیں (علیٰ فتوی المتاخرین)۔

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت لینے کا گناہ گار ہے اور یہ مال اس کے لیے سحت اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوسرا شدید جرم، حق تلفی اور حکم خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔

ناجائز فیصلے کے لیے رشوت

مسروق کا بیان ہے میں نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کیا فرمایئے کیا ناجائز فیصلہ کے لیے رشوت لینا سحت ہے۔ فرمایا نہیں وہ تو کفر ہے۔ سحت تو یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس کسی کو قرب و عزت حاصل ہو اور کسی شخص کی بادشاہ سے کوئی ضرورت وابستہ ہو مگر یہ مصاحب سلطانی بغیر کچھ ہدیہ تحفہ لیے صاحب غرض کے کام نہ کرے۔

سحت کے دو طریقے

حضرت عمر (رض) : کا ارشاد منقول ہے سحت کے دو طریقے ہیں جن سے لوگ (حرام) کھاتے ہیں (ناجائز) فیصلہ کی رشوت اور زانیہ کی بھاڑ۔

حضرت عمرؓ کی احتیاط

لیث کی روایت ہے کہ (کسی مقدمہ کے دونوں فریق) مدعی اور مدعیٰ علیہ حضرت عمر (رض) کی طرف آگے بڑھے۔ حضرت عمر (رض) نے ان کو ٹھہرا دیا وہ پھر بڑھے۔ حضرت نے پھر ٹھہرا دیا (تیسری بار) وہ پھر آگے بڑھے تو آپ نے ان کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا

(پہلی بار) دونوں آگے آئے تھے تو مجھے ایک کی طرف اپنے اندر ایسا جھکاؤ محسوس ہوا جو دوسرے کی طرف نہ تھا۔ میں نے اس حالت میں فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسری مرتبہ بڑھے تب بھی کچھ کیفیت مجھے اندر محسوس ہوئی اس حالت میں بھی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آخر میں جب تیسری بار بڑھے تو اول کیفیت بالکل زائل ہو چکی تھی اس وقت میں نے فیصلہ کر دیا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے اللہ کی لعنت فیصلہ کے لیے رشوت دینے اور لینے والے پر۔ رواہ احمد والترمذی وصححہ والحاکم عن ابوہریرہ۔ بغوی نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے بھی یہ حدیث مرفوعاً بیان کی ہے۔

امام احمد نے ضعیف اسناد سے حضرت ثوبان کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اللہ لعنت کرے رشوت دینے والے اور رشوت دلوانے والے پر جو رشوت کے لین دین میں دوڑا پھرتا ہے۔

رشوت کی اقسام

ابن ہمام نے لکھا ہے رشوت چند طرح کی ہوتی ہے (۱) رشوت دے کر مقام قضا حاصل کرنا۔ اس صورت میں قاضی قاضی نہیں ہو سکتا (یعنی رشوت دے کر قاضی بننا ناجائز ہے۔ ایسا قاضی اختیارات قضاء کا مالک نہیں ہو سکتا) (۲) رشوت لے کر قاضی کا فیصلہ اس مقدمہ میں نافذ نہ ہوگا۔ خواہ فیصلہ اپنی جگہ حق ہی ہو کیونکہ بغیر کچھ لیے اجر حق قاضی پر لازم ہوتا ہے۔ مال کا لین دین دونوں ناجائز ہیں۔ (۳) اگر تحصیل منفعت (جائزہ) یا دفع مضرت کے لیے کسی کو رشوت دی کہ حاکم وقت سے سفارش کرکے وہ معاملات ٹھیک کرا دے تو یہ مال لینے والے کے لیے حرام ہے۔ دینے والے کے لیے یہ فعل جائز ہے۔ لینے والے کے لیے جواز کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے ایک دو دن محنت کرنے اور اپنا وقت صرف کرنے کا معاوضہ طے کرے اور وقت کو صرف کرنے اور محنت کرنے کی اجرت لے لے۔ اس صورت میں وہ مال سفارش کی رشوت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر جان و مال کا کسی سے ڈر ہو اور اس ڈر سے اس شخص کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لیے حرام ہے ' دینے والے کے لیے جائز ہے۔

یہی حکم اس وقت ہے کہ مدعی حق پر ہو لیکن اس کو اندیشہ ہو کہ حاکم بغیر رشوت لیے میرا حق نہیں دلوائے گا اور فریق ثانی کے ظلم کو دفع نہیں کرے گا تو اس صورت میں رشوت دینا جائز ہے لیکن حاکم کے لیے حق کا فیصلہ دینے کے لیے رشوت لینا بھی ناجائز ہے۔ (تفسیر مظہری)

موجودہ توراۃ میں آیت رجم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ زنا کرنے والوں کے لیے رجم (سنگسار) کرنے کا حکم توراۃ میں موجود ہے اور اس سے پہلے ہم صحیح مسلم حدیث نمبر (۱۶۹۹) ۴۳۵۷ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس یہودی دو زانیوں (مرد اور عورت) کا مقدمہ لے کر آئے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا توراۃ کو پڑھو ' جب یہودی عالم نے توراۃ کو پڑھنا شروع کیا تو اس نے رجم کی آیت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت عبداللہ بن سلام (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا ' اس سے فرمائیں یہ اپنا ہاتھ ہٹائے ' ہاتھ ہٹایا تو اس کے نیچے رجم کی آیت تھی۔ اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی ' اور اب ۱۴۱۷ سال گزر گئے ' اس عرصہ میں توراۃ میں بہت تحریفات کی گئیں ' لیکن یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ توراۃ میں آج بھی یہ آیت اسی طرح موجود ہے۔

پھر اگر یہ بات سچ ہو کہ لڑکی میں کنوارے پن کے نشان نہیں پائے گئے تو وہ اس لڑکی کو اس کے باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں ' اور اس کے شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں کہ وہ مر جائے ' کیونکہ اس نے اسرائیل کے درمیان شرارت کی 'کہ اپنے باپ کے گھر میں فاحشہ پن کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا ' اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے ' تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں ' یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔ یوں تو اسرائیل میں سے ایسی برائی دفع کرنا۔

اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا ' اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں ' لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنی ہمسایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا ' یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا۔

(کتاب مقدس) (پرانا عہد نامہ ') باب : ۲۲ آیت ۲۴۔۲۱ ' مطبوعہ بائبل سوسائٹی ' لاہور) (تبیان)

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے اور پھر بھی مومن ہو ' یا وہ اللہ کے قانون پر راضی نہ ہو اور پھر بھی یہ زعم رکھتا ہو کہ وہ مومن ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی ایمان لاتا ہے تو اسے اپنی پوری زندگی میں شریعت کا نفاذ کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے اور اس کا موقف اس قطعی نص کی بالکل ضد ہے۔ (آیت) " وماّاولئک بالمومنین " (۵ : ۴۳) (یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے) یہ معاملہ فقط اس حد تک نہیں ہے کہ حکام کی جانب سے اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اگر محکوم لوگ بھی جن پر شریعت کا نفاذ ہوتا ہے ' شریعت کے نفاذ پر راضی نہیں تو بھی وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوں گے اگرچہ زبانی طور پر وہ ایمان کا دعوی کریں۔

یہ آیت سورۃ نساء کی آیت کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے۔

(آیت) " (فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما " (۴ : ۶۵)

" خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تنازعات کا فیصلہ آپ سے نہ کرائیں۔ پھر یہ اپنے دل میں آپ کے فیصلے پر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں) ان دونوں آیات کا تعلق محکوم عوام الناس سے ہے ' حکام سے نہیں ہے جبکہ دونوں ایمان سے نکل جاتے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور رسول کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے ان کے بارے میں یہ آیات کہتی ہیں کہ یہ مومن نہیں رہتے یا اگر رسول فیصلہ کریں اور یہ لوگ روگردانی کر دیں اور تسلیم نہ کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے جیسا کہ اس سبق کے آغاز میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ اللہ کی حاکمیت کے اقرار کا مسئلہ ہے۔ اللہ کی حاکمیت ' اس کی قیومیت اور انسان پر اس کی نگرانی و نگہبانی کے اقرار کا مسئلہ ہے یا اس کے انکار کا مسئلہ ہے اور اللہ کی شریعت کو قبول کرنا اور اس کے مطابق فیصلے کرانا اللہ کی حاکمیت ' اس کی نگہبانی کے اقرار کا ایک مظہر اور ثبوت ہے اور شریعت پر فیصلے نہ کرانا اس کے انکار کا مظہر اور ثبوت ہے۔

یہ تو فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے قبول نہیں کرتے۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حکام اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ان کے بارے میں فتوی کیا ہے اور یہ فتوی ان تمام ادیان کا ہے جو اللہ کی جانب سے نازل ہوتے ہیں (ظلال)

خواہ کوئی دشمن ہو انصاف نہ چھوڑو

قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر ظالم اور بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کے سہارے زمین وآسمان کا نظام قائم رہ سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے شخصی مذہبی معاملات :

جنزل قانون میں طبقات یا مذاہب کی وجہ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ مثلاً چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر باشندہ ملک کے لیے یہی سزا ہوگی۔ اسی طرح قتل وزنا کی سزائیں بھی سب کے لیے عام ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر مسلموں کے شخصی اور خالص مذہبی معاملات کا فیصلہ بھی شریعت اسلام کے مطابق کرنا ضروری ہو۔

خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شراب اور خنزیر کو مسلمانوں کے لیے تو حرام قرار دیا اور اس پر سزا مقرر فرمائی، مگر غیر مسلموں کو اس میں آزاد رکھا۔ غیر مسلموں کے نکاح، شادی وغیرہ شخصی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں فرمائی۔ ان کے مذہب کے مطابق جو نکاح صحیح ہیں ان کو قائم رکھا۔

مقام ہجر کے مجوسی اور نجران اور وادی قرای کے یہودی ونصاریٰ اسلامی حکومت کے ذمی بنے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ معلوم تھا کہ مجوسیوں کے نزدیک اپنی ماں بہن سے بھی نکاح حلال ہے، اسی طرح یہود ونصاریٰ میں بغیر عدت گزرائے یا بغیر گواہوں کے نکاح معتبر ہے۔ مگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے شخصی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرمائی اور ان کے نکاحوں کو برقرار تسلیم کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے باشندے ہیں ان کے شخصی اور ذاتی اور مذہبی معاملات کا فیصلہ انہی کے مذہب وخیال پر چھوڑا جائے گا اور اگر فصل مقدمات کی ضرورت پیش آئے گی تو انہی کے مذہب کا حاکم مقرر کرکے فیصلہ کرایا جائے گا۔

مسلم حکام کو اب بھی اختیار ہے کہ چاہیں تو اہل کتاب کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کردیں ' نہ چاہیں نہ کریں لیکن اگر کریں تو اسلامی فیصلہ کریں۔ نخعی ' شعبی ' عطاء اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک کفار کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کرنا مسلم حاکم پر واجب ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نے ارشاد فرمایا انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے ممبروں پر ہوں گے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عمر بن خطاب (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے اعلیٰ مرتبہ والا منصف خوش اخلاق حاکم ہوگا اور بدترین مرتبہ والا ظالم جاہل حاکم ہوگا۔ (تفسیر مظہری) (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَ كَيۡفَ يُحَكِّمُوۡنَكَ وَعِنۡدَهُمُ التَّوۡرٰىةُ فِيۡهَا حُكۡمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۳﴾

لغۃ القرآن: [وَ : اور][كَيْفَ : کس طرح][يُحَكِّمُوْنَكَ : وہ آپ کو منصف بنائیں][وَعِنْدَهُمُ : اور انکے پاس][التَّوْرٰىةُ : تورات][فِيْهَا : اس میں][حُكْمُ : حکم][اللّٰهِ : اللہ][ثُمَّ : پھر][يَتَوَلَّوْنَ : وہ پھرجاتے ہیں][مِنْۢ بَعْدِ : اس کے بعد][ذٰلِكَ : وہ][وَمَآ : اور نہیں][اُولٰٓئِكَ : وہی][بِالْمُؤْمِنِيْنَ : مومن]

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ کو کیوں کر حاکم مان سکتے ہیں درآنحالیکہ ان کے پاس توراۃ (موجود) ہے جس میں اللہ کا حکم (مذکور) ہے، پھر یہ اس کے بعد (بھی حق سے) رُوگردانی کرتے ہیں، اور وہ لوگ (بالکل) ایمان لانے والے نہیں ہیں.

تشریح:

ایک قاری جب ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچتا ہے تو اسے حیرت ہونے لگتی ہے کہ جب ان کے پاس خود اللہ کی کتاب 'توراۃ موجود ہے اور پھر اس میں اللہ کا حکم بھی موجود ہے 'یعنی اس مقدمہ کے بارے میں جو اس وقت ان کے سامنے ہے تو پھر یہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عدالت میں کیوں آنا چاہتے ہیں اور پھر مزید تعجب اس بات پر ہے کہ جب آپ کو حَکَم بنالیتے ہیں تو پھر آپ جو فیصلہ فرماتے ہیں 'اس سے روگردانی کرتے ہیں یعنی اسے ماننے سے انکار کردیتے ہیں حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانون خداوندی کے عین مطابق ہے کیونکہ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے 'قرآن اور توراۃ کے قانون تعزیرات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ معمول تھا کہ جب تک قرآن کریم میں کسی قضیے کے بارے میں حکم نازل نہیں ہوتا تھا 'آپ توراۃ کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے کیونکہ جب تک قرآن توراۃ کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتا تو وہ واجب العمل ہے۔ ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود حیرانی ہے کہ وہ آپ کو حَکَم بناتے ہیں اور پھر آپ کے فیصلے کو صحیح جانتے ہوئے بھی ماننے سے انکار کردیتے ہیں 'اولاً تو حکم بنانا ہی تعجب خیز ہے کیونکہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ کے رسول نہیں سمجھتے ہیں اور پھر حَکَم بنانے کے بعد فیصلہ قبول نہ کرنا 'جبکہ وہ توراۃ کے مطابق بھی ہو "یہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ لیکن ہمیں اس تعجب کو سمجھنے میں اس لیے دشواری نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہمارا اپنا رویہ اس سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے 'ہم قرآن کریم کو اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کو اللہ کا آخری رسول جانتے ہیں ' بایں ہمہ ہم کسی ایسے قرآنی فیصلے کو قبول کرنے کو تیار نہیں 'جو ہماری اپنی خواہشات ' رسوم ورواج یا ملکی قانون کے خلاف ہو۔ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے تو ہم قرآن کریم کو تراویح میں بھی سنتے ہیں اور شبینہ میں بھی ' پھر اس کو شوق وذوق سے پڑھتے بھی ہیں۔ کوئی مر جاتا ہے تو اس کو پڑھ پڑھ کر بخشتے ہیں 'لیکن اسے اپنی عدالتوں اور اپنے ایوان ہائے حکومت سے دور رکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو جن لوگوں کا یہ رویہ ہوا نھیں اہل کتاب کے اس رویے کو سمجھنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔ ہم شاید خود تو اسے قبول نہ کریں 'لیکن قرآن کریم نے اس اصل بیماری کا نام دے دیا ہے 'جس میں اہل کتاب بھی مبتلا تھے اور ہم بھی مبتلا ہیں۔ وہ بیماری ہے "وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ " یہ اس لیے آپ کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکاری ہیں کہ یہ توراۃ پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایمان کا دعویٰ ضرور ہے 'لیکن حقیقی ایمان سے یہ محروم ہیں۔ یہ باتیں چونکہ امت مسلمہ کو سنائی جارہی ہیں 'اس لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم بھی اپنے رویوں پر نظر ثانی کریں اور یہ سوچنے کی کوشش کریں کہ کیا ہم بھی اسی صورت حال سے دوچار تو نہیں۔

تیری ہر ادا میں بل ہے 'تیری ہر نگاہ میں الجھن
میری آرزو میں لیکن 'نہ پیچ ہے نہ خم ہے (روح)

آیت مبارکہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّآ : بیشک ہم][اَنْزَلْنَا : ہم نے نازل کی][التَّوْرٰىةَ : تورات][فِيْهَا : اس میں][هُدًى: ہدایت] وَّنُوْرٌ : اور روشنی][يَحْكُمُ : وہ فیصلہ کرتے ہیں][بِهَا : اس کے ساتھ][النَّبِيُّوْنَ : انبیاء][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اَسْلَمُوْا : مطیع ہوئے][لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے][هَادُوْا : وہ یہودی ہوئے][وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ : اور اللہ والے][وَالْاَحْبَارُ :

اور علماء][بِمَا : ساتھ جو][اسْتُحْفِظُوْا : نگران بنائے گئے][مِنْ : سے][كِتٰبِ : کتاب][اللّٰهِ : اللہ][وَكَانُوْا : اور وہ تھے][عَلَيْهِ : اس پر][شُهَدَاۗءَ : گواہ][فَلَا : پھر نہ][تَخْشَوُا : ڈرو][النَّاسَ : لوگوں سے][وَاخْشَوْنِ : اور مجھ سے ڈرو][وَلَا : اور نہ][تَشْتَرُوْا : تم بیچو][بِاٰيٰتِيْ : میری آیات][ثَمَنًا : قیمت][قَلِيْلًا : تھوڑی][وَمَنْ : اور جو][لَّمْ : نہیں][يَحْكُمْ : وہ فیصلہ کرتا ہے][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][فَ اُولٰۗىِٕكَ : پھر وہی][هُمُ : وہ][الْكٰفِرُوْنَ : انکار کرنے والے]

ترجمہ: بیشک ہم نے توراۃ نازل فرمائی جس میں ہدایت اور نور تھا، اس کے مطابق انبیاء جو (اللہ کے) فرمان بردار (بندے) تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے اور اللہ والے (یعنی ان کے اولیاء) اور علماء (بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے رہے)، اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے اور وہ اس پر نگہبان (و گواہ) تھے۔ پس تم (اقامت دین اور احکام الٰہی کے نفاذ کے معاملے میں) لوگوں سے مت ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرا کرو اور میری آیات (یعنی احکام) کے بدلے (دنیا کی) حقیر قیمت نہ لیا کرو، اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ (و حکومت) نہ کرے سو وہی لوگ کافر ہیں۔

تشریح:

تورات، انجیل اور قرآن مختلف اور متضاد اور ایک دوسرے کی تردید اور تکذیب کرنے والی کتابیں نہیں

اس رکوع میں دو چیزوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ تورات، انجیل اور قرآن مختلف اور متضاد اور ایک دوسرے کی تردید اور تکذیب کرنے والی کتابیں نہیں اور نہ یہ کہ جب تک دو کا انکار نہ کیا جائے تیسری پر ایمان درست نہیں ہو سکتا بلکہ یہ سب ایک سرچشمہ فیض کی نہریں ہیں۔ ہر ایک میں نور ہے جو گمراہی کے اندھیروں کے لیے پیغام موت ہے۔ ہر ایک میں ہدایت ہے جو طالبان مولا کی دستگیری کرکے شاہد مقصود تک پہنچا دینے والی ہے۔ دوسری چیز یہ کہ یہود نے توراۃ اور نصاریٰ نے انجیل سے فائدہ نہ اٹھایا اور احکام الٰہی کی جگہ اپنی ہوا و ہوس کے پرستار بن کر رہ گئے۔ اے حاملان قرآن! وہ ایڑی چوٹی کا زور صرف کریں گے کہ تمہیں بھی اپنی کتاب سے دور کردیں۔ خبردار! کہیں تم بھی ان کے دام فریب میں پھنس کر اس سنہری موقع کو ضائع نہ کر دینا۔

یہود کو تورات جس میں نور و ہدایت تھی عطا کی گئی تھی۔ مدت دراز تک ان کے انبیاء، ان کے اولیا اور ان کے علماء اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری جو ان پر عائد کی گئی تھی اس کو ادا کرتے رہے۔ لیکن بعد میں جب یہ ہدایت و نور کا صحیفہ دنیا پرست علماء اور نفس پرور

زاہدوں کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے نہ اس پر عمل کیا اور نہ اس کی حفاظت کی۔ استحفظوا کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اولیاء اور علماء کے سپرد کی تھی۔ جب تک وہ اس ذمہ داری کو بجالاتے رہے تورات ہر تحریف اور ردوبدل سے محفوظ رہی۔ جب عبادت گزاروں اور علم والوں میں اخلاص اور للّٰہیت نہ رہی بلکہ جاہ طلبی اور دنیا طلبی کا غلبہ ہو گیا تو یہ ہدایت و نور کا صحیفہ رہبان و احبار کی جاہ طلبی اور دنیا پرستی کی نذر ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے اپنی مطلب برآری کے لیے اس میں ردوبدل کر دیا۔

95ف اس میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہو رہی ہے کہ علماء یہود کی طرح بادشاہوں اور امیروں سے ڈر کر تم بھی قرآن کے معانی میں ہیر پھیر نہ شروع کر دینا بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا جس نے اگر پکڑ لیا تو کوئی چھوڑا نہ سکے گا۔ اگر اس کی نگاہ لطف و کرم سے محروم کر دیئے گئے تو دنیا تنگ ہو جائے گی اور کہیں گوشہ عافیت نہ ملے گا۔

یہاں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اسی رکوع کی آیت نمبر 45 میں ایسے لوگوں کو ظالم کہا گیا اور آیت نمبر 47 میں ایسے لوگوں کو فاسق کہا گیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ آیات صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ کسی خاص شخص کے متعلق کسی آیت کے نازل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ آیت بس اسی سے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ اس کا حکم اب کسی دوسرے شخص پر نافذ نہیں ہوگا۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ اسے یہود کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے بلکہ اس کا مفہوم عام رکھا جائے۔ چنانچہ علماء اہل سنت نے **من لم یحکم بما انزل اللہ مستھینا بہ منکر الہ**۔ یعنی جو شخص اللہ کے حکم کی توہین اور تحقیر کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ کافر ہوگا۔ کیونکہ احکام شرعیہ کی توہین اور تحقیر کی صرف وہی جرات کر سکتا ہے جس کا دل ایمان و یقین کے نور سے خالی ہو۔ علامہ بیضاوی (رح) نے ایسے شخص کو کافر، ظالم اور فاسق کہنے کی بڑی لطیف وجہ بیان کی ہے فرماتے **ھیں فکفرھم لانکارہ وظلمھم بالحکم بخلافہ وفسقھم بالخروج عنہ**۔ یعنی اس وجہ سے کہ انھوں نے احکام الٰہیہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہ کافر ٹھہرے۔ اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اس قانون کو چھوڑ دیا جو عین عدل و انصاف تھا وہ ظلم کے مرتکب ہوئے اور اس لیے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حدوں کو توڑا وہ فاسق کہلائے۔ اس کے بعد بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ تینوں لفظ کفر، ظلم اور فسق احکام الٰہیہ سے سرتابی کرنے والوں کے مختلف حالات کے پیش نظر کہے گئے ہوں۔ یعنی اگر اس نے یہ سرتابی از راہ تمرد و تحقیر کی تو وہ کافر ہے اور اگر دل میں انکار تو نہیں بلکہ ویسے حکم عدولی ہو گئی تو وہ ظالم و فاسق ہوگا۔ **ویجوز ان یکون کل واحدۃ من الصفات الثلاث باعتبار ھال انضمت الی الامتناع عن الحکم بہ ملائمۃ لھا** (بیضاوی) سچ تو یہ ہے کہ ان آیات کے بعد کسی مسلمان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنے لئے، اپنی قوم اور رعایا کے لیے ایسے قوانین تجویز کرے جو احکام خداوندی کے خلاف ہوں۔ (ضیاء)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک ہم نے توراۃ کو نازل کیا جس میں ہدایت اور نور ہے۔ (المائدہ: ۴۴)

شرائع سابقہ کا ہم پر حجت ہونا

اس آیت میں ہدایت سے مراد احکام شرعیہ ہیں اور نور سے مراد اصول اور عقائد ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ہدایت سے مراد دین حق کی طرف رہنمائی ہے اور نور سے مراد ان احکام کو کھول کر بیان کرنا ہے جو ان پر مخفی تھے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ہدایت سے مراد وہ مسائل ہیں جن کو وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھتے تھے اور نور سے مراد اس بات کا بیان ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) برحق نبی ہیں۔اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ ہم سے پہلی شریعت بھی ہم پر لازم ہے 'تاوقتیکہ اس کا منسوخ ہونا ہم کو معلوم ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے 'تورات میں ہدایت اور نور ہے۔اگر تورات کے احکام حجت نہ ہوں تو وہ ہدایت اور نور نہیں رہے گی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ زانیوں کا جو مقدمہ لے کر یہ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے ہیں 'انبیاء سابقین جو اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمان بردار تھے 'وہ ایسے مقدمات کا تورات کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں 'اور اولیاء اور علماء بھی اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں 'اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان زانیوں کے متعلق جو رجم کا فیصلہ کیا ہے 'وہ بھی تورات کے مطابق ہے 'اور ان علماء سے تورات کی حفاظت کرائی گئی ہے اور یہ علماء اس کی شہادت دیتے تھے کہ نبیوں نے جو یہودیوں کے مقدمات میں تورات کے مطابقہ فیصلہ کیا ہے 'وہ صحیح ہے۔حضرت ابن عباس (رض) نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ اللہ والے اور علماء نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق شہادت دیتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے برحق نبی ہیں 'آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے کلام نازل ہوا ہے 'اور یہودیوں کے اس مقدمہ میں آپ ﷺ نے جو فیصلہ کیا ہے 'وہ صحیح ہے اور تورات کے مطابق ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کے علماء اور راہبوں سے فرمایا: سو تم لوگوں سے نہ ڈرو 'مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی قیمت نہ لو 'یعنی امیر لوگوں پر اللہ کی حدود نافذ کرنے کے سلسلہ میں تم یہ خوف نہ کرو 'کہ پھر تمہارے نذرانے اور وظیفے جو امیروں سے ملتے تھے 'وہ بند ہو جائیں گے 'بلکہ اس بات سے ڈرو کہ اگر تم نے اللہ کی حدود کو نافذ نہ کیا اور امیروں کے نذرانوں کے لالچ میں تورات کی آیتوں کا غلط مطلب بیان کیا تو پھر آخرت میں تم کو بہت ہولناک اور دائمی عذاب ہوگا۔اس آیت کے اس حصہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ تورات کے جو احکام قرآن اور حدیث میں بغیر انکار کے بیان کیے گئے ہیں 'وہ بھی ہم پر حجت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ کافر ہیں۔(المائدہ: ۴۴)

قرآن کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کا کفر ہونا۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے موافق حکم نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے 'کفر نہیں ہے۔اور اس آیت میں اس کو کفر قرار دیا ہے۔اور اس سے بظاہر خوارج کے مذہب کی تائید ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص جائز اور حلال سمجھتے ہوئے اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے موافق فیصلہ نہ کرے 'وہ کافر ہے اور اس آیت سے یہی مراد ہے 'اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ جو قرآن کا انکار کرتے ہوئے یا قرآن کا رد کرتے ہوئے یا قرآن مجید کی توہین کرتے ہوئے 'اس کے موافق فیصلہ نہ کرے 'وہ کافر ہے۔یا اس سے مراد ہے کہ جو شخص اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے موافق فیصلہ نہ کرے 'وہ کافر کے مشابہ ہے۔ایک جواب یہ ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق یہود کے متعلق ہے 'سو یہ وعید یہود کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کریں 'سو وہی لوگ فاسق ہیں۔(المائدہ: ۴۷)

اور ان آیتوں کا مفہوم عام ہے 'کیونکہ قرآن مجید کے موافق فیصلہ نہ کرنا ظلم اور فسق ہے 'خواہ فیصلہ نہ کرنے والا مسلمان ہو یا یہودی ہو یا عیسائی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکام پر تین باتیں فرض کی ہیں :

(۱) فیصلہ کرنے میں اپنی نفسانی خواہشات کی اتباع نہ کریں 'بلکہ اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ کریں۔

(۲) فیصلہ کرنے میں لوگوں سے نہ ڈریں 'اللہ سے ڈریں۔

(۳) اللہ کی آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی قیمت نہ لیں۔

اس کا معنی یہ ہے کہ رشوت یا نذرانہ لے کر عدل کو ترک کرکے بے انصافی سے فیصلہ نہ کریں 'اس سلسلہ میں یہ حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے کسی شخص کو لوگوں کا خوف حق گوئی یا عظیم نصیحت کرنے سے باز نہ رکھے۔ جب اسے اس کا علم ہو 'کیونکہ یہ خوف نہ موت کو نزدیک کر سکتا ہے نہ رزق کو دور کر سکتا ہے۔ (مسند ابو یعلی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۱۴۱۱' المعجم الاوسط 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۸۲۵' المطالب العالیہ '۴۵۴۶' ۴۵۴۶' حافظ الہثیمی نے کہا ہے 'کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد 'ج ۷ 'ص ۲۷۴۔۲۷۲) (تبیان)

توراۃ کی تعلیمات کی مزید وضاحت۔ قانون کی بالادستی اور حدود اللہ کا نفاذ۔

حدود الٰہی کو دل و جان سے تسلیم کرنا مجرمانہ ذہنیت کے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا ہے۔ انسانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ جب کسی معاشرے میں جرم سرزد ہوتا ہے تو وہ سخت نفرت کا اظہار اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن جونہی کچھ عرصہ گزر جائے تو اکثریت کی ہمدردیاں مظلوم کے ساتھ نہ صرف ختم ہو جاتی ہیں بلکہ مجرم کو سزا دینے کے وقت ان کو مجرم پر ترس آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے سورۃ نور آیت ۲ میں حکم دیا کہ جب مجرموں کو سزا دی جائے تو مومنوں کو اس پر ترس نہیں آنا چاہیے۔ حدود کے نفاذ اور اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں توراۃ کی روشن تعلیمات کا ذکر کرنے سے پہلے "انا انزلنا "کے الفاظ لائے گئے ہیں کہ اس کے نفاذ اور تعلیم میں ذرّہ برابر شک اور رعایت کی گنجائش نہیں کیونکہ توراۃ اور اس میں نازل ہونے والے احکامات اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمائے ہیں۔ جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے اتنے واضح اور روشن ہیں کہ ان میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں پایا جاتا۔ انھی ہدایات پر انبیاء (علیہ السلام) بنی اسرائیل اور ان کے صالح کردار حکمران عمل پیرا تھے اور آج بھی منصفانہ مزاج رکھنے والے لوگ توراۃ کی سچی تعلیمات اور اس میں درج شدہ حدود کی شہادت دیتے ہیں۔ جب یہ ہدایت روشن اور فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ تو پھر اس پر عمل کرنے میں لوگوں سے ڈرنے کی بجائے، صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنا چاہیے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی بجائے لوگوں سے ڈرتے اور دنیا کے فائدے کو اللہ تعالیٰ کی آیات پر مقدم جانتے ہوئے ان کا نفاذ نہیں کرتے وہ لوگ کافر ہیں۔

(عَنْ عَائِشَةَ (رض) أَنَّ قُرَيْشًا أَهَمَّهُمْ شَأْنُ الْمَرْأَةِ الْمَخْزُومِيَّةِ الَّتِي سَرَقَتْ فَقَالَ وَمَنْ يُكَلِّمُ فِيهَا رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالُوا وَمَنْ يَجْتَرِءُ عَلَيْهِ إِلَّا أُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ حِبُّ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَكَلَّمَهُ أُسَامَةُ

فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللّٰہِ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَايْمُ اللّٰہِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا) [رواہ البخاری: کتاب الحدود، باب حَدِيثُ الْغَارِ]

"حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ قریش کے قبیلہ بنو مخزومیہ کی عورت جس نے چوری کی تھی اس کی وجہ سے خفت محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کے ہاں کون سفارش کرے گا؟ تو انھوں نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیارے صحابی اسامہ بن زید (رض) کو اس کی ہمت والا پایا۔ اسامہ بن زید (رض) نے اس عورت کی سفارش کی تو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تم اللہ کے مقرر کردہ حد کے متعلق سفارش کرتے ہو۔ پھر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کی وجہ یہ بھی تھی جب ان میں معزز قبیلے کا فرد چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا اور جب کوئی کمزور کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس پر قانون کا نفاذ کرتے۔ اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ (رض) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔" (فہم)

تورات

توراۃ: یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کے لیے ہدایت کا اور شبہات و مشکلات کی ظلمت میں پھنس جانے والوں کے لیے روشنی کا کام دیتی ہے۔

اللہ والوں اور اہل علم کا دستور العمل

یعنی توراۃ میں ایسا عظیم الشان دستور العمل اور عین ہدایت تھا کہ کثیر التعداد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے اور نزاعات کے فیصلے کرتے رہے۔

ربانین اور احبار

پہلے ربانیون دوسرے احبار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ والا، اور احبار، حبر کی جمع ہے، یہود کے محاورہ میں عالم کو حبر کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ بات بظاہر ہے کہ جو اللہ والا ہو گا ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہو سکتا، اور بغیر احکام الٰہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ والا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، ورنہ وہ عالم جو احکام آلہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض و واجبات پر بھی عمل نہیں کرتا نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ ورسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے۔ مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرما کر اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ اگرچہ اللہ والے کے لیے علم ضروری اور عالم کے لیے عمل ضروری ہے، لیکن جس پر جس رنگ کا غلبہ ہو اس کے اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات و عمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہے اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کر لیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے

نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص عملی مہارت پیدا کرکے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض و واجبات اور سنن موکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔
علماء وصوفیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت وطریقت اور علماء و مشائخ کی اصلی وحدت کو بھی بتلا دیا، اور طریقہ کار اور غالب مشغلہ کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کر دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ علماء اور صوفیاء کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت و فرمان برداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے طریق کار صورۃً متغائر نظر آتے ہیں۔

یہودیوں پر توراۃ کی ذمہ داری

یعنی توراۃ کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ قرآن کریم کی طرح انا لہ لحافظون کا وعدہ نہیں ہوا۔ تو جب تک علماء و احبار نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا، توراۃ محفوظ و معمول رہی۔ آخر دنیا پرست علمائے سوء کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہوئی۔

اے یہودی امراء اور علماء توراۃ میں تحریف نہ کرو

یعنی لوگوں کے خوف یا دنیاوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیل و تحریف مت کرو۔ اس کے احکام و اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ توراۃ کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو ان رؤسا و علمائے یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔ کیونکہ انھوں نے حکم رجم سے انکار کر دیا تھا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے معنی میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں امت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال و جاہ میں پھنس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا۔ چنانچہ اس امت نے بحمد اللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا کم نہیں کیا اور آج تک اس کو مبطلین کی تغییر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے اور ہمیشہ رہیں گے۔
جو آدمیوں سے وابستہ ہو اللہ اس کو انھیں حوالے کر دیتے ہیں
ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ اگر آدمی آدمی سے ڈرے تو اس شخص پر اسی آدمی کو مسلط کیا جاتا ہے۔ جس سے وہ ڈرتا ہے اور اگر آدمی اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو تو اللہ اپنے سوا کسی کو اس پر قابو نہیں دیتا اور جو آدمی آدمی سے امید رکھتا ہے اس کو اسی سے وابستہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھے تو اللہ اپنے سوا کسی اور کے سپرد اس کو نہیں کرتا۔
(تفسیر مظہری)

احکام الٰہی کے خلاف فیصلہ کرنا

مآانزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالبًا یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کردے اور اس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرلے۔ جیسا کہ یہود نے حکم رجم کے متعلق کیا تھا۔ تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ مآانزل اللّٰہ کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملًا اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہوگا۔ یعنی اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے۔ (گلدستہ)

مسائل

۱۔ یہودی توراۃ نہیں مانتے۔

۲۔ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرنے والے کافر ہیں۔

۳۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات کو نہ ماننے والا مومن نہیں ہوسکتا۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ﴿۴۵﴾

لغۃ القرآن: [وَكَتَبْنَا : اور ہم نے لکھا][عَلَيْهِمْ : ان پر][فِيْهَآ : اس میں][اَنَّ : بیشک][النَّفْسَ : جان][بِالنَّفْسِ : جان کے بدلے][وَالْعَيْنَ : اور آنکھ][بِالْعَيْنِ : آنکھ کے بدلے][وَالْاَنْفَ : اور ناک][بِالْاَنْفِ : ناک کے بدلے][وَالْاُذُنَ : اور کان][بِالْاُذُنِ : کان کے بدلے][وَالسِّنَّ : اور دانت][بِالسِّنِّ : دانت کے بدلے][وَالْجُرُوْحَ :

اور زخم][قِصَاصٌ: بدلہ][فَمَنْ : پھر جو][تَصَدَّقَ : اس نے صدقہ کردیا][بِهٖ : اس کو][فَهُوَ : پھر وہ][كَفَّارَةٌ : کفارہ ہوگا][لَّهٗ : اس کے لیے][وَمَنْ : اور جو][لَّمْ : نہیں][يَحْكُمْ : وہ فیصلہ کرتا ہے][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ نے][فَ اُولٰۗىِٕكَ : پھر وہی][هُمُ : وہ][الظّٰلِمُوْنَ : ظلم کرنے والے]

ترجمہ: اور ہم نے اس (توراۃ) میں ان پر فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے عوض آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے عوض کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں (بھی) بدلہ ہے، تو جو شخص اس (قصاص) کو صدقہ (یعنی معاف) کر دے تو یہ اس (کے گناہوں) کے لیے کفارہ ہوگا، اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ (وحکومت) نہ کرے سو وہی لوگ ظالم ہیں

تشریح:

توراۃ میں جو حدود و قصاص کے احکامات کی تفصیل

یہاں توراۃ میں جو حدود و قصاص کے احکامات کی تفصیل بیان فرمائی ہے انجیل کا اس لیے ذکر نہیں کہ انجیل توراۃ ہی کا تتمہّ ہے۔
پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جن احکامات کا توراۃ میں ذکر ہے اگر وہ قرآن مجید میں من و عن یا ان کا جو حصہ قرآن مجید میں بطور نفاذ ذکر کیا گیا ہو تو اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ یہاں تورات اور قرآن مجید کی متفق علیہ حدود کا ذکر کرنے سے پہلے نصیحت کی گئی کہ لوگوں سے ڈرنے کی بجائے صرف اللہ سے ڈرا کرو اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو دنیاوی مفادات کے لالچ میں آکر ہرگز نہ چھوڑو کیونکہ ان کا نفاذ اللہ تعالیٰ نے سب پر فرض قرار دیا ہے۔
"ھم" کی ضمیر بظاہر تو یہود و نصاریٰ کی طرف ہے لیکن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان پر عمل پیرا ہونا امت کے لیے لازم قرار دیا ہے آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں ان حدود کو عملاً نافذ فرمایا کیونکہ جو حاکم جان بوجھ کر ان پر عمل نہیں کرتا۔ وہ کافر، ظالم اور فاسق یعنی کسی ایک زمرے میں ضرور شامل ہوگا۔ البتہ اس بات کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے کہ فوجداری مقدمات عدالت میں آنے سے پہلے مجروح یا مقتول کے وارث معاف کر دیں تو یہ معافی ظالم کے لیے اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی۔ اگر معافی کی صورت نہ نکلے تو حاکم کا فرض ہے کہ قصاص دلوائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو حاکم ظالموں میں شمار ہوں گے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے مظلوم اپنے حق سے محروم ہوا اور معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہوگا۔

(عَنْ أَنَسٍ (رض) قَالَ كَسَرَتِ الرُّبَيِّعُ وَهِيَ عَمَّةُ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ فَطَلَبَ الْقَوْمُ الْقِصَاصَ فَأَتَوُا النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَأَمَرَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِالْقِصَاصِ فَقَالَ أَنَسُ بْنُ النَّضْرِ عَمُّ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ لَا وَاللّٰهِ لَا تُكْسَرُ سِنُّهَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَا أَنَسُ كِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ

فَرَضِيَ الْقَوْمُ وَقَبِلُوا الْأَرْشَ فَقَالَ رَسُولُ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ) [رواہ البخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ والجروح قصاص]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں حضرت انس بن مالک کی چچی نے انصار کی ایک بچی کا دانت توڑ دیا تو انھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قصاص کا حکم دیا۔ انس بن نضر (رض) جو کہ انس بن مالک کے چچا ہیں۔ انھوں نے کہا اللہ کی قسم ! اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے انس قصاص اللہ کا حکم ہے اچانک قوم دیت لینے پر راضی ہوگئی تو رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں اگر قسم اٹھالیں تو اللہ اس کو بری کردیتے ہیں۔"

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حَدٌّ يُعْمَلُ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ مِنْ أَنْ يُمْطَرُوا ثَلَاثِينَ صَبَاحًا) [رواہ النسائی: بَابُ التَّرْغِيبِ فِي إِقَامَةِ الْحَدِّ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا زمین میں اللہ کی ایک حد پر عمل کرنا زمین والوں کے لیے تیس دن کی بارش سے بہتر ہے۔" (فہم)

قصاص کے حکم کا شان نزول

ابن جریج بیان کرتے ہیں جب بنو قریظہ نے یہ دیکھا کہ یہود اپنی کتاب میں رجم کو چھپاتے تھے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے درمیان رجم کا فیصلہ کردیا تو بنو قریظہ نے کہا اے محمد ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان اور ہمارے بھائی بنو نضیر کے درمیان فیصلہ کردیجئے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تشریف لانے سے پہلے بنو نضیر اپنے آپ کو بنو قریظہ سے افضل 'برتر اور عزت دار سمجھتے تھے۔ اگر بنو نضیر میں سے کوئی شخص قتل کردیتا 'تو اس سے پوری دیت لیتے تھے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قریظی کا خون نضیری کے برابر ہے۔ یہ سن کر بنو نضیر غضب ناک ہوگئے اور انھوں نے کہا ہم رجم کے معاملہ میں آپ کی اطاعت نہیں کریں گے اور ہم اپنی ہی حدود کو جاری کریں گے 'جن پر پہلے عمل کرتے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کیا تم جاہلیت کے حکم کو طلب کر رہے ہو ؟ (المائدہ ٥٠) اور یہ آیت نازل ہوئی اور ہم نے ان پر تورات میں یہ فرض کیا تھا کہ جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ (الایہ) تبیان)

اور ہم نے تورات میں ان پر واجب کیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بدلہ ہے تو جو خوشی سے بدلہ کر دے تو وہ اس کے گناہ اتار دے گا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم پر فیصلہ نہ دے تو وہی ظالم ہیں۔

اگرچہ یہ بیان جو تورات میں یہود کے لیے تھا۔ تورات کے ہی حوالہ سے کلام پاک میں وارد ہوا مگر چونکہ ہمیں ان کے ترک کرنے یا اس کے منسوخ ہونے کی کوئی خبر نہیں ملی اس لیے ہم پر بھی احکام لازم وواجب ہیں۔ اس لیے کہ شریعت مطہرہ میں یہ اصول ہے کہ شرائع سابقہ کے جو احکام ہم تک پہنچیں گے اور وہ منسوخ بھی نہ ہوئے ہوں تو وہ ہمارے لیے بھی بحالہ واجب ولازم ہیں جیسا کہ پہلی آیتوں میں بیان ہوچکا دوسری واضح صورت آیۃ کریمہ سے یہ نکلی کہ شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی وہی حکم ہے جو شریعت موسوی (علیہ السلام) میں تھا

کہ اگر کسی نے کسی کو قتل کر دیا تو اس کی جان مقتول کے بدلہ میں ماخوذ کی جائے گی۔ خواہ وہ مقتول مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام۔ مسلم ہو یا ذمی۔ اس لیے حکم میں اطلاق ہے اور المطلق یجری علی اطلاقہ اصول ہے۔ شان نزول بھی یہی بتارہے کہ یہود نے حکم میں جو تبدیلی کی کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہ کترے تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور ان کی اس رسم کارد کیا۔ (مدارک رواداابن عباس)

شان نزول بھی یہی بتارہا ہے کہ یہود نے حکم میں جو تبدیلی کی کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہ کرتے تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور ان کی اس رسم کارد کیا۔ (مدارک رواہ ابن عباس) دوسرے یہ بھی واضح ہوا کہ مماثلت و مساوات کی رعایت ضروری ہے یعنی آنکھ کے مجرم کو آنکھ کی سزا۔ ناک کے مجرم کو ناک کی۔ کان کے مجرم کو کان کی دانت کے مجرم کو دانت کی اور ہر زخم کے بدلے زخم کی سزا شریعت میں ہے۔ نہ یہ کہ برسوں مہینوں حوالات میں رکھ کر مہینوں برسوں کی سزا دے کر چھوڑ دیا جائے۔

تیسرے یہ بھی واضح ہوا کہ قاتل یا جنایت کرنے والے اپنے جرم پر نادم ہو کر وبال آخرت سے بچنے کے لیے بخوشی اپنے اوپر حکم شرع جاری کرائے تو صرف قصاص ہی یعنی دنیا کی سزا ہی اس کے جرم کا کفارہ ہو جائے گا اور آخرت میں اس کی گرفت میں عذاب نہ ہوگا۔ (جمل وجلالین) بعض مفسرین مثل روح المعانی۔ مدارک رحمہم اللہ وغیرہ کہ اس طرف گئے کہ صاحب حق اگر قصاص معاف کر دے تو یہ معافی اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور تفسیر احمدی میں ہے کہ یہ تمام قصاص جب ہی واجب ہوں گے جب صاحب حق معاف نہ کرے اور اگر معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔

دیلمی (رح) نے ابن عمر (رض) سے اس پر یہ حدیث نقل کی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا یہ وہ آدمی ہے کہ اس کا دانت توڑا گیا یا اس کا جسم مجروح کیا گیا پھر اس نے معاف کر دیا تو اپنے جسم کی جتنی دیت اس نے معاف کی ہے اسی مقدار کے مطابق اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر وہ آدھی دیت ہے تو اس کے آدھے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر چوتھا حصہ دیت ہے تو اس کے چوتھا حصہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر تیسرا حصہ دیت ہے تو اس کے تیسرا حصہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر پوری دیت ہے تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور عدی بن ثابت سے مروی ہے کہ عہد معاویہ میں ایک مقدمہ پر یہ حدیث سنائی گئی۔ روح المعانی

ایک آدمی نے امیر معاویہ (رض) کے زمانہ میں ایک آدمی کا منہ زخمی کر دیا اس نے دیت دی اس نے قصاص کا مطالبہ کیا تو اس نے دیت دگنی کر دی اس نے پھر انکار کر دیا اس نے دیت تین گناہ کر دی۔ اس نے پھر انکار کر دیا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ میں سے ایک صحابی نے یہ حدیث سنائی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو آدمی خون کا یا اس سے کم کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے پیدائش سے لے کر مرنے تک کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو معاف کر دے اللہ کے واسطے کسی کا خون وہ اس کے لیے پیدائش کے دن سے مرنے کے دن تک کے لیے کفارہ ہے۔

نہ یہ کہ انگریزی قانون کی طرح کہ صاحب حق کو حق معافی ہی نہیں بلکہ اس کی مدعی خود حکومت ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر وعید سنایا گیا کہ جو حکم الٰہی عزوجل کے خلاف حکم دے وہ ظالم ہیں۔ اب احکام توراۃ کا بیان کر کے احکام انجیل کا ذکر شروع ہوا۔ اس میں بتایا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مصدق توراۃ تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ وہ منزل من اللہ عزوجل ہے اور نسخ ہے قبل اس پر عمل واجب تھا۔ پھر شریعت عیسوی میں جو اس کے بعض احکام منسوخ ہوئے وہ منسوخ مانے گئے۔ (حسنات)

ابن جریج نے کہا قرآن مجید گزشتہ کتاب الٰہیہ کا امین ہے اگر اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ بیان کریں اور وہ بیان قرآن میں بھی ہو تو اس کی تصدیق کرو ورنہ جھوٹ سمجھو یعنی اگر قرآن میں اس کی تصدیق ہو تو اس کو صحیح سمجھو اور قرآن میں تکذیب ہو تو اس کو غلط قرار دو اور اگر

قرآن اس کے معاملہ میں خاموش ہو تو تم بھی خاموش رہو نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کیونکہ اہل کتاب کے بیان میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے۔ (گلدستہ)

مسائل

۱۔ توراۃ کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ ۲۔ توراۃ میں ہدایت اور روشنی ہے۔
۳۔ انبیاء (علیہ السلام) کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ ۴۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔
۵۔ کتاب اللہ کا حکم نہ ماننے والے کافر، ظالم، فاسق ہیں۔ ۶۔ یہودیوں پر بھی قصاص فرض تھا۔

آیت مبارکہ:

وَقَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ‌ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ؕ‏ ﴿۴۶﴾

لغۃ القرآن: [وَقَفَّيْنَا : اور ہم نے پیچھے بھیجا][عَلٰٓي : پر][اٰثَارِهِمْ : ان کے قدم][بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ : عیسیٰ ابن مریم][مُصَدِّقًا : تصدیق کرنے والا][لِّمَا : اسکی جو][بَيْنَ : درمیان][يَدَيْهِ : انکے ہاتھ][مِنَ : سے][التَّوْرٰىةِ : تورات][۠وَاٰتَيْنٰهُ : اور ہم نے ان کو دی][الْاِنْجِيْلَ : انجیل][فِيْهِ : اس میں][هُدًى: ہدایت][وَّنُوْرٌ : اور روشنی][وَّمُصَدِّقًا : اور تصدیق کرنے والی][لِّمَا : اس کے لیے][بَيْنَ : درمیان][يَدَيْهِ : انکے ہاتھ][مِنَ : سے][التَّوْرٰىةِ : تورات][وَهُدًى : اور ہدایت][وَّمَوْعِظَةً : اور نصیحت][لِّلْمُتَّقِيْنَ : پرہیزگاروں کے لیے]

ترجمہ: اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے پیچھے ان (ہی) کے نقوش قدم پر عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی (کتاب) توراۃ کی تصدیق کرنے والے (مصدق) تھے اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور تھا اور (یہ انجیل بھی) اپنے سے پہلے کی (کتاب) توراۃ کی تصدیق کرنے والی (تھی) اور (سراسر) ہدایت تھی اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت تھی

تشریح:

توراۃ کے بعد انجیل کی ہدایات اور اس کے احکامات کی اہمیت کا بیان

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کے دو قسم کے اعراض بیان فرمائے تھے۔ ایک یہ کہ انھوں نے زنا کی حد میں تحریف کر دی پھر وہ حرج میں مبتلا ہوئے اور اس معاملہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاکم بنایا۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے قصاص کے حکم میں تحریف کر دی اور بنو نضیر کے خون کی پوری دیت اور بنو قریظہ کے خون کی آدھی دیت مقرر کی۔ اب اللہ تعالیٰ ان کے تیسرے اعراض کو بیان فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے نبیوں ' ربانیین اور علماء کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھیجا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) 'حضرت زکریا (علیہ السلام) کے بعد مبعوث کیے گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) توراۃ کے مصدق تھے 'کیونکہ بنو اسرائیل نے توراۃ کے جن احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان احکام کو زندہ کیا۔ یہ حقیقی تصدیق ہے اور انجیل نے جو توراۃ کی تصدیق کی ہے 'اس کا معنی یہ ہے کہ انجیل کے احکام توراۃ کے موافق ہیں 'ماسوا ان احکام کے جن کو انجیل نے منسوخ کر دیا۔ نیز فرمایا: انجیل متقین کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے 'یعنی وہ ناپسندیدہ اعمال سے منع کرتی ہے اور پسندیدہ اعمال کی طرف ہدایت دیتی ہے۔ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور ان کاموں سے اجتناب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا موجب ہیں۔ (تبیان)

اس سے متصل پہلی آیات میں توراۃ کے منزل من اللہ ہونے اور اس کے احکامات کے نفاذ کا ذکر ہوا تھا اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کا ثبوت اور انجیل کا توراۃ کی تائید کرنا ثابت کیا گیا ہے۔ اس لیے انجیل کی ہدایات اور احکامات کو انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن الفاظ میں توراۃ کی اہمیت اور ہدایات کا تعارف کروایا گیا ہے۔ یہ کتب اپنے اپنے وقت میں لوگوں کے لیے روشنی کا مینار اور ہدایت کا سرچشمہ تھیں یاد رہے جو الفاظ توراۃ اور انجیل کے بارے میں آئے ہیں ایسے ہی الفاظ قرآن مجید کے بارے میں ارشاد ہوئے ہیں۔ (فہم)

اس آیت کریمہ میں انجیل کے لیے لفظ ھدیً دو جگہ ارشاد ہوا۔ پہلی جگہ ضلالت و جہالت سے بچانے کے لیے رہنمائی مراد ہے۔ دوسری جگہ ھدیً سے حضور سید یوم النشور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری کی بشارت مراد ہے اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رونق افروزی کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی طرف لوگوں کی رہنمائی ہدایت ہے۔ نور سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی ہم نے وہ انجیل دی جس میں ہدایت و نور تھا۔ اسی بناء پر فرمایا ولیحکم اھل الانجیل بمآانزل اللہ فیہ۔ یعنی چونکہ انجیل میں حضور (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت تسلیم کرنے کا حکم ہے لہٰذا اس پر عمل کرتے ہوئے اس کی تصدیقف کرو اور جو نہ مانے اور اپنی مرضی سے حکم دے وہ فاسق یعنی کافر ہے۔

اہل انجیل سے مراد عیسائی ہیں بما انزل اللہ سے مراد انجیل کے احکام پر فیصلہ کرنا ہے۔ قرآن پاک نے انجیل کی تصدیق فرمادی۔

فاولٓئك هم الفسقون۔ بدعقیدگی جو کفر تک پہنچ جائے فسق ہے یعنی جو حکم الٰہی عزوجل کو غلط سمجھ کر اس پر فیصلہ نہ کرے اور رواج کے قانون کو ٹھیک سمجھے وہ کافر ہے۔ (حسنات)

توراۃ اور انجیل بھی ہدایت اور نور تھیں

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ کہ ہم نے ان کے پیچھے ' انہی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔ یعنی جو مقصد حیات لے کر اور جو دعوت لے کر ' اس سے پہلے انبیاء اور رسل آچکے تھے ' بالکل انہی کے نقش قدم پر ' اسی کام کے کرنے اور اسی ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لیے حضرت عیسیٰ کو بھی بھیجا گیا۔

" اثار "کا معنی ہوتا ہے ' نقوش قدم۔ یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انہی رسولوں کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے ' اسی فریضہ کی انجام دہی کے لیے تشریف لائے ' جس فریضہ کو اس سے پہلے رسول انجام دیتے رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام انبیاء و رسل میں ان کی شخصیت ' ان کے مزاج ' ان کے کردار ' ان کی دعوت اور ان کے مقاصد دعوت میں کوئی جوہری فرق نہیں ہوتا۔ وقت کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے طریق دعوت اور اسلوب دعوت میں فرق ہو سکتا ہے ' لیکن دعوت اور مقاصد دعوت میں کسی فرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک شجرہ طیبہ کے برگ و بار ' باہم نہایت تشابہ اور یکسانیت رکھتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آم کے درخت کو ایک طرف آم لگیں تو دوسری طرف انگور لگنا شروع ہو جائیں۔ اسی طرح ' اللہ کی طرف سے آنے والے تمام انبیاء جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ' ایک دوسرے سے مشابہہ اور یکساں دعوت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

(پیشتر سے موجود توراۃ کے وہ مصدق بن کے آئے۔)

یعنی انھوں نے توراۃ کی محفوظ شریعت کی تصدیق و تائید کی ' بلکہ اپنی امت کو اللہ کی طرف سے اسی شریعت کا پابند ٹھہرایا کیونکہ اللہ نے ان پر جو انجیل نازل فرمائی ' اس میں شرعی احکام نہیں تھے بلکہ احکام کی حکمت بیان کی گئی تھی۔ کیونکہ یہود اپنے پاس کسی نہ کسی حد تک شریعت تو رکھتے تھے ' لیکن حکمت شریعت سے محروم ہو چکے تھے۔ عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسی شریعت کو باقی رکھتے ہوئے ' حکمت شریعت کو عام کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور اسی لیے فرمایا:

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو انجیل دی ' جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ بھی توراۃ کی تصدیق کرنے والی تھی۔ یعنی جس طرح عیسیٰ (علیہ السلام) توراۃ کی تصدیق کر رہے تھے ' اسی طرح انجیل بھی توراۃ کی تصدیق کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اپنی دعوت سے الگ کسی طور نہیں ہوتا (دونوں ایک دوسرے سے منطبق ہوتے ہیں)۔ کتاب اور پیغمبر ' دونوں مل کر انسانوں کی اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ پیغمبر کی

زبان سے کتاب بولتی ہے اور پیغمبر کا عمل کتاب کی شرح ہوتا ہے۔ اسی طرح کتاب ' ہو بہو پیغمبر کی سیرت کا عکس ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ پیغمبر اور کتاب دونوں ایک ہی مقصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں اور دونوں کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے ' وہ ہے اللہ کی زمین اور انسانوں پر اللہ کی شریعت کو نافذ کرنا اور انسانوں سے اس کی حاکمیت کا اعتراف کروانے کے بعد ان کی اصلاح کے عمل کو مکمل کرنا۔ چنانچہ عیسیٰ (علیہ السلام) اور انجیل ' دونوں مل کر اس کام کی تکمیل کر رہے تھے۔

مزید فرمایا کہ جیسے توراۃ میں اللہ نے افکار اور اعمال کی رہنمائی کے لیے ہدایت اور نور رکھا ہے اسی طرح انجیل کو بھی انہی دونوں صفات سے مرصع کیا گیا تھا۔ ہم نے یہاں " مصدق " کا معنی ' بار بار تصدیق کرنے والا کیا ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا معنی ' جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے ' وہ ہے مصداق۔ یعنی عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان پر نازل ہونے والی کتاب ' توراۃ کا مصداق تھی۔ یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی اور ان پر نازل ہونے والی کتاب کی جو جو علامتیں اور نشانیاں بیان کی گئ تھیں ' حضرت عیسیٰ اور انجیل بالکل ویسے ہی تھے۔ یعنی توراۃ میں عیسیٰ (علیہ السلام) کی خرق عادت ولادت اور خلاف معمول آپ کا بچپن میں باتیں کرنا اور پھر بچپن ہی میں نبوت کا اعلان کرنا ' یہ من جملہ نشانیوں میں سے چند نشانیاں ہیں ' جس کی خبر توراۃ نے دی تھی اور عیسیٰ ' ان تمام علامتوں کا مصداق تھے۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ یہود آپ کو دیکھ کر پہچان لیں کہ ان کی کتاب میں جس آنے والے کی خبر دی گئ ہے ' وہ آپ ہی ہیں تاکہ جو ہدایت اور موعظہ اپنے ساتھ وہ لے کر آئے ہیں ' اس سے وہ فائدہ اٹھائیں اور فائدہ وہ اسی صورت میں اٹھا سکتے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ ان کے دلوں میں ہو ورنہ جو دل اللہ سے بے نیاز ہوگا ' وہ کبھی بھی پیغمبر کی دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے فرمایا :

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔

(یہ انجیل ہدایت اور نصیحت ہے ' متقین کے لیے۔)

اس مکمل تعارف کے بعد اہل انجیل کو وہی پیغام اور وہی حکم دیا جا رہا ہے ' جو اہل توراۃ کو دیا گیا تھا کہ ان پر واجب ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے کریں اور اس انجیل کو حاکمانہ حیثیت دے کر زندگی کے تمام مسائل میں اور زندگی کی ہر سطح پر ' اس طرح اس کی راہنمائی قبول کریں کہ وہی ان کے لیے سب سے بڑا علم بھی ہو اور وہی اجتماعی معاملات میں قانون کی حیثیت بھی رکھتی ہو اور وہی ان کے لیے آداب زندگی کا درس بھی دیتی ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ انھوں نے واقعی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت کو قبول کیا اور انجیل کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن اگر انھوں نے اس کتاب کے مطابق اور توراۃ کی شریعت کے مطابق ' فیصلے نہ کیے اور زندگی میں اس کی آئینی حیثیت اور اس کی بہ ہمہ وجوہ راہنمائی کو قبول نہ کیا تو پھر یہی لوگ تو فاسق ہیں کیونکہ ان پر توراۃ کی شریعت کا اختیار کرنا لازم ہے اور اس کے بارے میں فرمایا جا چکا ہے کہ جو لوگ اس شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے ' وہ کافر بھی ہیں اور ظالم بھی اب چونکہ اسی شریعت کی یاد دہانی کے لیے اللہ کے عظیم رسول حضرت عیسیٰ ابن مریم اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل آ چکے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے فریضہ کی ادائیگی میں زیادہ ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس لیے اب اگر انھوں نے اس میں تساہل برتا یا انحراف کا راستہ اختیار کیا تو یہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کنوئیں میں گرنے والی بات ہوگی۔ اس لیے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اب بھی اگر یہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے تو یہ فاسق ہوں گے۔

فاسق کون ہوتا ہے؟

" فاسق "کا لفظ فقہی اصطلاح کے معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ یہ قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے ' جس کا معنی ہے ' حد سے گزر جانے والا اور اللہ کی شریعت کا باغی و نافرمان کیونکہ عربی لغت میں فسق اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عرب ایک محاورہ بولتے ہیں "فسقت الرطبۃ عن القشرۃ "اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تازہ کھجور کو انگوٹھے کے پور پر رکھ کر انگلی سے دبائیں تو اس کی گٹھلی پھدک کر باہر نکل جاتی ہے۔ یہ پھدکنے اور اچھلنے کو ' یہاں فسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے "فاسق "وہ ہوگا ' جو تمام حدود کو پھلانگ جائے اور شریعت کے کسی حکم کی اس کو پروانہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہود جن کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے ' اگر وہ توراۃ رکھتے ہوئے اس کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یقیناً وہ کافر اور ظالم ہیں اور اس کے بعد عیسائی اپنے پاس توراۃ اور انجیل رکھتے ہوئے اگر شریعت کی پروا نہیں کرتے تو وہ دوہرے اور انتہائی مجرم ہیں۔
اس لیے ان کو یہاں فاسق سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کو سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے کہ اگر توراۃ اور انجیل کے نزول کے بعد اللہ کی شریعت کے عدم نفاذ سے کفر ' ظلم اور فسق لازم آتے ہیں تو قرآن کریم جو اللہ کی آخری کتاب ہے اور سرکار دو عالم۔ ' جو اللہ کے آخری رسول ہیں ' ان کے تشریف لے آنے کے بعد اور قرآن کریم کے نزول کے بعد ' اگر یہی رویہ مسلمان ان کے ساتھ اختیار کریں تو پھر ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے ' جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اگلی آیتیں پڑھنے سے پہلے اس کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔
بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں بلکہ سیاق و سباق اس پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ ان آیات سے مسلمانوں کو الرٹ کیا جا رہا ہے ' تاکہ وہ پوری طرح بیدار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ میں اس بات کو مستحضر کر لیں کہ ہمیں پہلی امتوں کی داستان ' ان کی گمراہیوں اور ان کے انجام سے اسی لیے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ہم اس راستے پر چلنے سے احتراز کریں۔ جس راستے پر چل کر وہ گمراہ بھی ہوئے اور معذب بھی ٹھہرے۔ اسی لیے جب حضرت حذیفہ (رض) سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور وہ انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یعنی اللہ کی کتابوں کے مطابق انھوں نے اگر فیصلہ نہیں کیا تو وہ اس کی وجہ سے کافر ' ظالم اور فاسق ٹھہرے تو یہ تہدید صرف ان کے لیے ہے ' مسلمانوں کے لیے نہیں۔ اس پر حضرت حذیفہ (رض) نے فرمایا:

نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل آن کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلاّ واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراك

(کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے۔ ہرگز نہیں ' اللہ کی قسم! تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلوگے۔)
یعنی تم اگر وہی رویہ اختیار کروگے تو تمہارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہ ہوگا۔ اس لیے آنے والی آیات کو پڑھنے سے پہلے مسلمانوں کو اپنے دل و دماغ میں ان تصورات کو پوری طرح مستحضر کر لینا چاہیے ' تاکہ وہ ان آیات سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ (روح)

یہ قرآن مجید کی حقانیت اور اس کی کشادہ ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہونے کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ جس طرح توراۃ اور انجیل اپنے اپنے دور میں لوگوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ اور روشنی کا مینار تھیں اسی طرح ہی آج قرآن مجید لوگوں کے لیے ہدایت کا منبع، روشن قندیل ہے اور اس کے

احکامات رہتی دنیاتک قابل عمل اور نافذ العمل رہیں گے۔ توراۃ وانجیل اپنے دور کے لیے لوگوں کے نصیحت و موعظت کا مرقع تھیں اور اب قرآن ان کے بنیادی احکامات اور ہدایات کا ترجمان اور لوگوں کے لیے راہ عمل ہے جس طرح توراۃ وانجیل کے احکامات نافذ نہ کرنے والے درجہ بدرجہ کافر، ظالم اور فاسق تھے اگر آج مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی نظام میں قرآن نافذ نہیں کرتے تو وہ بھی اسی زمرے میں سمجھے جائیں گے جس طرح توراۃ وانجیل پر عمل نہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ٹھہرے تھے۔ (فہم)

مسائل

۱۔ ہر نبی پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا تھا۔

۲۔ عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے انجیل عطا کی تھی۔

۳۔ انجیل میں ہدایت اور روشنی ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے فاسق ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

لغۃ القرآن: [وَلْيَحْكُمْ : اور وہ فیصلہ کریں][اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ : اہل انجیل][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : اس نے نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][فِيْهِ: اس میں][وَمَنْ : اور جو][لَّمْ : نہیں][يَحْكُمْ : فیصلہ کرتا][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][فَ اُولٰۗىِٕكَ : پھر وہی][هُمُ : وہ][الْفٰسِقُوْنَ : نافرمان (جمع)]

ترجمہ: اور اہل انجیل کو (بھی) اس (حکم) کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے اس میں نازل فرمایا ہے، اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ (وحکومت) نہ کرے سو وہی لوگ فاسق ہیں۔

تشریح: سابقہ کتب سماویہ کے ذکر کے بعد مناسب تھا کہ اس آسمانی کتاب کا بھی ذکر کیا جائے جو ان کتب سماویہ کی محافظ و نگہبان رہی اور اس بات کی مضبوط دلیل رہی کہ وہ آسمانی کتابیں واقعی طور پر آسمانی اور الہامی کتابیں ہیں ان کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چونکہ توراۃ، زبور، انجیل میں کمی و بیشی اور تحریف کی جاتی رہے جس سے ان کا الہامی کتاب ہونا مشکوک ہوگیا تھا قرآن کریم نے آکر اس شک کو دور کردیا کہ گو اس میں کمی بیشی کی گئی ہے اور تحریف سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ کتابیں الہامی ہی ہیں جو منجانب اللہ نازل کی گئی ہیں اسمیں وہ سارے حصے جو غیر محرف ہیں وہ کلام خداوندی ہیں۔
قرآن کریم کی یہ شہادت ایک ایسی کتاب کی شہادت ہے جس کی مکمل حفاظت کو خود قادر مطلق نے اپنے ذمہ کرم میں رکھ لیا تھا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کرنے اور اس کی مثال و نظیر پیش کرنے کو ناممکن بنادیا تھا، توجب اس شان کی کتاب نے توراۃ وانجیل اور زبور کو آسمانی کتابیں قرار دیدیا تو ان کا بھی وجود ثابت ہوگیا، کیونکہ اگر قرآن مجید نہ ہوتا تو محض ان کتابوں سے ان کا آسمانی کتابیں ہونا ظاہر نہ ہوتا، کیونکہ ہر دور میں ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے حتی کہ اب وہ عبرانی نسخے میں موجود نہیں ہیں جس عبرانی زبان میں یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔۔(اشرفی)
وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ: اور انجیل والوں کو حکم کرنا چاہیے۔} اس آیت کا ایک معنی یہ ہے کہ انجیل والوں کو بھی اسی کے مطابق حکم کرنا چاہیے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے یعنی سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانا چاہیے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق کرنی چاہیے کیونکہ انجیل میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جب ہم نے عیسائیوں کو انجیل عطا کی تو اس وقت ان کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ان احکام پر عمل کریں جو انجیل میں مذکور ہیں۔
(خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۴۷، ۱/۵۰۰، ملخصاً)

انجیل پر عمل کرنے سے متعلق ایک اعتراض کا جواب

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید کے نزول کے بعد انجیل پر عمل کرنے کے حکم کی کیا توجیہ ہوگی؟ تو اس کے چند جوابات ہیں:
(1)۔۔انجیل میں تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے جو دلائل موجود ہیں اہل انجیل کو چاہیے کہ وہ ان دلائل کے مطابق ایمان لے آئیں۔
(2)۔۔اہل انجیل ان احکام پر عمل کریں جن کو قرآن نے منسوخ نہیں کیا۔
(3)۔۔انجیل کے احکام پر عمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انجیل میں تحریف نہ کریں جس طرح یہودیوں نے توراۃ میں تحریف کردی تھی۔
(تفسیر کبیر، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۴۷، ۴/۳۷۱)
لیکن تحقیق یہی ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے انجیل کو نازل کیا تھا اور نزول قرآن کے بعد قرآن مجید کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر عمل جائز نہیں ہے، اور اسلام کے علاوہ کوئی اور دین مقبول نہیں ہے۔ (صراط) (تبیان)

آیت مبارکہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

لغۃ القرآن: [وَاَنْزَلْنَآ : اور ہم نے نازل کی][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][الْكِتٰبَ : کتاب][بِالْحَقِّ : ساتھ حق کے][مُصَدِّقًا : تصدیق کرنے والی][لِّمَا : واسطے جو][بَيْنَ : درمیان][يَدَيْهِ : ان کے پاس][مِنَ : سے][الْكِتٰبِ : کتاب][وَمُهَيْمِنًا : اور نگہبان][عَلَيْهِ : اس پر][فَاحْكُمْ : پس آپ فیصلہ کریں][بَيْنَهُمْ : انکے درمیان][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][وَلَا : اور نہ][تَتَّبِعْ : آپ اتباع کریں][اَهْوَآءَهُمْ : ان کی خواہشات][عَمَّا : اس سے جو][جَآءَكَ : جو آیا تیرے][مِنَ : سے][الْحَقِّ: حق][لِكُلٍّ : سب کے لیے][جَعَلْنَا : ہم نے کیا][مِنْكُمْ : تم سے][شِرْعَةً : ایک دستور][وَّمِنْهَاجًا : اور ایک طریقہ][وَلَوْ : اور اگر][شَآءَ : وہ چاہے][اللّٰهُ : اللہ][لَجَعَلَكُمْ : تو تم کو کردیتا][اُمَّةً : امت][وَّاحِدَةً : ایک][وَّلٰكِنْ : اور لیکن][لِّيَبْلُوَكُمْ : تاکہ وہ تمہیں آزمائے][فِيْ : میں][مَآ : جو][اٰتٰىكُمْ : تم کو دی][فَاسْتَبِقُوا

: پس ایک دوسرے سے بڑھو][الْخَیْرٰتِ : نیکیاں][اِلَی: طرف][اللّٰہِ : اللہ][مَرْجِعُکُمْ : تم نے لوٹنا ہے][جَمِیْعًا : سب][فَیُنَبِّئُکُمْ : پس وہ تمہیں بتائے گا][بِمَا : ساتھ جو][کُنْتُمْ : تھے تم][فِیْهِ : اس میں][تَخْتَلِفُوْنَ : اختلاف کرتے]

ترجمہ: اور (اے نبی مکرّم !) ہم نے آپ کی طرف (بھی) سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس (کے اصل احکام و مضامین) پر نگہبان ہے، پس آپ ان کے درمیان ان (احکام) کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے نازل فرمائے ہیں اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، اس حق سے دور ہو کر جو آپ کے پاس آ چکا ہے۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ شریعت اور کشادہ راہ عمل بنائی ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو (ایک شریعت پر متفق) ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں ان (الگ الگ احکام) میں آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں (تمہارے حسب حال) دیئے ہیں، سو تم نیکیوں میں جلدی کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے، پھر وہ تمہیں ان (سب باتوں میں حق و باطل) سے آگاہ فرمادے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے.

تشریح: نبوت اور قرآن کریم کے نزول کے یہود و نصاریٰ اور مشرکین منکر تھے۔ تئیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا اسی لیے نزلنا فرمایا گیا۔ بعض آیات بلاواسطہ بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوئیں جیسے سورۃ بقرہ کی آخری آیات شب معراج وغیرہ میں الیک فرمایا گیا۔ یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔ الرسول سے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور کتاب سے قرآن کریم مراد ہے۔ بالحق۔ قرآن کریم حق ہے۔ (حسنات)

سب آسمانی کتابیں ہدایت و نور کا سرچشمہ ہیں ان کا نازل کرنے والا بھی ایک ہے اور ان کا مقصد و مدعا بھی ایک ہے۔ اسی لیے وہ عقائد و کلیات جن پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے وہ تمام آسمانی کتابوں میں یکساں ہیں لیکن شریعت کے احکام و اعمال میں اختلاف کی وجہ مختلف ادوار کے مخصوص حالات تھے یا اس کی ایک مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا مریض صحت مند ہو جائے لیکن ایک ہی مرض میں مبتلا دو مریضوں کے لیے ان کے طبعی اور جسمانی احوال کے پیش نظر دو مختلف علاج تجویز کرتا ہے یعنی ایک مریض کو اپریشن کا مشورہ دیتا ہے جبکہ دوسرے کے لیے دوا تجویز کرتا ہے کیونکہ اس کی صحت اپریشن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں مختلف احکام نازل فرمائے اور مقصد ایک ہی تھا کہ انسان اپنے خالق حقیقی کا فرمان بردار بندہ بن جائے جو کہ اس کی پیدائش کا اصل مقصد ہے۔ (امداد)
پہلی آیات میں توراۃ اور انجیل کے نفاذ کا حکم ان کے حاملین کو دیا گیا تھا۔ اب قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد وہ کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ البتہ ان کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرنی چاہیے۔ توراۃ اور انجیل کے بنیادی احکام جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو براہ راست ان کے بارے میں حکم دیا گیا ہے ان کا نفاذ کریں تاکہ اس شبہ کا ازالہ ہو سکے کہ ان احکام کا نفاذ پہلی امتوں کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ یہ امت ان کے نفاذ میں اتنی ہی پابند ہے جتنا پہلی امتوں کو پابند کیا گیا تھا۔ لہٰذا قرآن مجید کے نفاذ میں کسی کے منفی خیالات اور رجحانات کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ حق پہنچ چکا اور نفاذ دین کے بغیر مسلمانوں کا اجتماعی نظام مستحکم نہیں ہو سکتا اور ان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ جس کی اہمیت کے پیش نظر براہ راست نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کا من و عن نفاذ کریں اور کسی کی خواہش اور

مخالفت کو خاطر میں نہ لائیں۔ فرمان کے آخر میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہر امت کے لیے اس کی الگ، الگ شریعت اور علیحدہ طریقہ تھا۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ لوگوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل تھا بلکہ مصلحت اور حکمت یہ تھی کہ لوگوں کو اس بات میں آزمایا جائے کہ وہ نئے نبی اور اس کی شریعت پر ایمان لاتے ہیں یا اپنے اپنے مذہب اور ملتوں کے ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ اس میں یہ حکمت بھی پنہاں تھی کہ پہلی امتوں کے مزاج اور ان کے حالات کے مطابق انھیں شریعت اور اس پر عملدرآمد کا طریقہ وہی دیا جائے جس کو اپنانا ان کے لیے آسان تھا۔ جس کی اہل علم نے یہ توجیہ فرمائی ہے کہ دین ایک ہونے کے باوجود شریعتوں کا مختلف ہونا انسانی ذہن کی ارتقاء کی بنا پر کیا گیا ہے۔ لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان اختلافات میں الجھنے اور اپنی صلاحیتیں ضائع کرنے کی بجائے نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہیے۔ کار خیر میں مسابقت ہی زندہ اور بیدار قوموں کا شعار ہوا کرتا ہے۔ قرآن مجید مسلمانوں کو صرف نیکی کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کا فرمان ہے کہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ کیونکہ جس شعبہ میں مسابقت ختم ہو جائے وہ شعبہ زندگی کی روح کھو بیٹھتا ہے اس لیے سورۃ التکاثر میں ان لوگوں کو سخت انتباہ کیا ہے جو دنیا کے لیے اس قدر ہلکان کا شکار ہو گئے کہ قبر کی دیواروں تک دنیا ہی کے پیچھے بھاگتے رہے اور اپنی آخرت کو تباہ کر بیٹھے۔ اس لیے حکم فرمایا کہ مسلمانوں نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ نیکی میں سبقت کرنے والے ہی اللہ کے مقرب ہوں گے۔ حقیقت آشکارا ہونے کے باوجود خواہ مخواہ اختلافات میں الجھنے والوں کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے درمیان ان کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائیں گے۔ (فہم)

توراۃ وانجیل کے بعد قرآن اور اس کی چند خصوصیات کا ذکر فرمایا

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کا نزول حق کے ساتھ ہوا ہے۔ لفظ حق کی پوری تشریح آل عمران کے حاشیہ نمبر 3 میں گزر چکی ہے۔ علامہ راغب کے اس قول کا اعادہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ کوئی فعل یا قول اس وقت حق کہلاتا ہے جب کہ وہ اس طرح پایا جائے جیسے چاہیے۔ اس اندازے سے پایا جائے جتنا مناسب اور موزوں ہو اور اس وقت پایا جائے جب اس کی ضرورت ہو (مفردات) اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ بالحق کے لفظ کو پڑھیں تو قرآن کی جلالت شان واضح ہوگی۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن ان کتب پر مہیمن بن کر آیا ہے۔ مھیمن متعدد معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ محافظ، نگہبان، نگران، شاہد اور امین۔ یہاں مہیمن کے یہ سارے معانی لیے جا سکتے ہیں یعنی دین کے عقائد اور اصول جو سابقہ آسمانی کتب میں بیان کئے گئے تھے جن سے بعض فراموش کر دیئے گئے اور بعض میں ردوبدل کر کے انھیں کچھ کا کچھ بنا دیا گیا قرآن ان کا محافظ ہے ان کو صحیح رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اور اپنے صفحات میں ان کی ایسی حفاظت ونگہبانی کر رہا ہے کہ اب وہاں کسی محرف کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن آسمانی کتب کا رقیب ونگران بھی ہے۔ کیونکہ قرآن ہی ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ موجودہ تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں حق کی کتنی مقدار جوں کی توں موجود ہے۔ قرآن اس بات پر گواہ بھی ہے کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل پر نازل فرمائی تھیں۔ قرآن امین بھی ہے۔ گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کو جوں کا توں پیش کرتا ہے۔ ان میں کسی قسم کا تصرف اور کمی بیشی نہیں کرتا۔ (ضیاء)

قرآن مجید کا سابقہ آسمانی کتابوں کا محافظ ہونا

اس آیت میں قرآن مجید کو سابقہ کتب سماویہ کا محافظ اور نگہبان فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات ‘ زبور اور انجیل میں کمی بیشی اور تحریف ہوتی رہی۔ اس لیے ان کتابوں کا آسمانی اور الہامی کتاب ہونا مشکوک ہوگیا۔ اس لیے کسی ایسی مستحکم دلیل کی ضرورت تھی ‘ جس سے ان کا آسمانی کتاب ہونا ثابت ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل فرمایا اور یہ دعوی کیا کہ اس میں کمی نہیں ہوسکتی۔

(آیت) ”انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون“۔ (الحجر : ٩)

ترجمہ : بیشک ہم نے ہی قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

نیز قرآن مجید نے دعوی کیا کہ اس میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرمایا :

(آیت) ”لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ“۔ (حم السجدہ : ٤٢)

ترجمہ : اس میں باطل نہیں آسکتا ‘ نہ اس کے سامنے سے نہ ان کے پیچھے سے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے چیلنج فرمایا کہ کوئی شخص قرآن مجید کی یا اس کی کسی ایک سورت کی مثل نہیں لاسکتا :

(آیت) ”وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھدآء کم من دون اللہ ان کنتم صدقین“۔ (البقرہ : ٢٣)

ترجمہ : اگر تم اس (کلام) کے متعلق شک میں ہو جو ہم نے اپنے (مقدس) بندے پر نازل کیا ہے تو اس کی مثل کوئی سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمائیتوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔

چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور دن بدن علم و فن میں ترقی ہو رہی ہے اور اسلام کے مخالف بھی بہت زیادہ ہیں ‘ لیکن آج تک کوئی شخص قرآن مجید میں کسی کلمہ کی زیادتی بتاسکا ‘ نہ کمی اور نہ اس کی کسی سورت کی کوئی مثال لاسکا۔ اس لیے ہر دور میں قرآن مجید کا کلام اللہ ہونا ثابت اور مسلم رہا ‘ اور چونکہ قرآن مجید نے تورات ‘ انجیل اور زبور کو آسمانی کتابیں قرار دیا ہے ‘ اس لیے ان کا وجود بھی ثابت ہوگیا۔ اس طرح ظاہر ہوگیا کہ قرآن مجید سابقہ آسمانی کتابوں کا مصدق اور محافظ ہے ‘ کیونکہ اگر قرآن مجید نہ ہوتا تو محض ان کتابوں سے تو ان کا آسمانی کتابیں ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر دور میں ان میں تغیر اور تبدل ہوتا رہا ہے۔

حتی کہ اب وہ عبرانی نسخے بھی موجود نہیں ہیں جس عبرانی زبان میں یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ (تبیان)

شرائع سابقہ کے حجت ہونے کی وضاحت

اس آیت میں منہاج سے مراد دین ہے اور دین سے مراد وہ عقائد اور اصول ہیں جو تمام انبیاء (علیہم السلام) میں مشترک رہے۔ مثلا توحید ‘ اللہ تعالیٰ کی صفات ‘ نبوت ‘ آسمانی کتابوں ‘ فرشتوں ‘ مرنے کے بعد اٹھنے اور جزا اور سزا پر ایمان لانا ‘ اور جو احکام سب میں مشترک رہے ‘ مثلا قتل ‘ جھوٹ اور زنا کا حرام ہونا اور شریعت سے مراد ہر نبی کے بیان کیے ہوئے عبادات اور معاملات کے مخصوص طریقے ہیں :

بعض علماء نے یہ کہا ہے ‘ شرائع سابقہ ہم پر حجت نہیں ہیں اور انھوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہر نبی کی الگ الگ شریعت ہوتی ہے۔ اگر سابقہ شریعت ہم پر حجت ہو تو پھر ہمارے نبی کی الگ شریعت کیسے ہوگی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) نے سابقہ شرائع کے جو احکام بغیر انکار کے ہم سے بیان فرمائے ' وہ دراصل ہماری ہی شریعت ہیں ' کیونکہ ان کو ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے۔ ہم ان احکام پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ وہ پچھلی شریعتوں کے احکام ہیں۔ بلکہ ہم ان پر اس لیے عمل کرتے ہیں کہ ان کو ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً حج کے اکثر وبیشتر اعمال حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ الصلوۃ والسلام) کی یادگار ہیں 'قربانی کرنا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہے 'اسی طرح وضو میں کلی کرنا 'ناک میں پانی ڈالنا اور طہارت کی دیگر دس سنتیں بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہیں 'رجم اور قصاص کے احکام توراۃ میں بھی تھے اور شروع میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زناکار یہودیوں کو توراۃ کے فیصلہ کے مطابق رجم کرنے کا حکم دیا اور ہم ان تمام احکام پر اس لیے عمل کرتے ہیں کہ یہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ (تبیان)

قرآن پاک کی تین حیثیتیں

1 ایک تو یہ کہ اسے حق کے ساتھ اتارا گیا۔ "حق " سے مراد یہ ہے 'جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے کہ اسے ہم نے قول فیصل بنا کر بھیجا ہے۔ چونکہ سابقہ کتابیں ترمیم اور تحریف کا شکار ہو گئیں۔ اب اس کتاب کی حیثیت یہ ہے کہ ان کتابوں کی کمی بیشی اور اہل کتاب کی خیانتوں پر یہ قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو بات یہ کہے گی وہ صحیح ہو گی اور پہلی آسمانی کتابوں کو اس کی کہی ہوئی باتوں پر جانچا اور پرکھا جائے گا۔

2 دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ سابقہ کتابوں کی محفوظ باتوں اور محفوظ حقائق کی تصدیق کرتی ہے اور خود ان حقائق کی مصداق بھی ہے۔ لیکن یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ سابقہ کتابوں کا ذکر الکتاب کے لفظ سے کیا گیا۔ اس سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں 'سب کی سب حقیقت میں ایک ہی کتاب ہے 'ایک ہی ان کا مصنف ہے 'ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے 'ایک ہی ان کی تعلیم ہے اور ایک ہی علم ہے 'جو ان کے ذریعے سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے 'جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں 'مؤید ہیں۔ تردید کرنے والی نہیں 'تصدیق کرنے والی ہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ یہ کہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

3 تیسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب مھیمن بنا کر نازل کی گئی۔ "مھیمن " اللہ کی صفت بھی ہے 'جو سورۃ حشر میں ذکر کی گئی ہے اور اس کتاب کی صفت بھی۔ "مھیمن "کا معنی ہوتا ہے محافظ 'نگران 'گواہ 'امین 'تائید اور حمایت کرنے والا۔ قرآن کریم کے مھیمن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو 'جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں 'اپنے اندر لے کر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے 'اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کی مؤید ہے 'اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر اللہ کا کلام جس حد تک موجود ہے 'قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ اس پر گواہ ہے 'اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر اللہ کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے 'قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے۔ جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے 'وہ اللہ کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے 'وہ لوگوں کا کلام ہے۔ گویا کہ علم الٰہی کے حوالے سے صحت واستناد کی اگر کوئی اتھارٹی ہے 'جس کے بعد شک وشبہ کا ہر کانٹا نکل جاتا ہے 'وہ صرف قرآن کریم ہے۔ مذہب کے حوالے سے کوئی ایسی بات 'جس کی نسبت وحی الٰہی کی طرف ہو 'اگر یہ دیکھنا ہو کہ یہ واقعی ثابت بھی ہے یا نہیں تو اس کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ پہلی آسمانی کتابیں یقیناً وحی الٰہی کا نور لے کر نازل ہوئی ہیں اور وہ اپنے دور میں اللہ کی عطا کردہ

ہدایت کا سرچشمہ تھیں۔ لیکن اب ان کے مندرجات چونکہ ترمیم و تحریف کی نذر ہو گئے 'اس لیے اب ان کی صحت کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں۔

اسے دنیائے علم کی ستم ظریفی کہئے کہ جس کتاب کی حیثیت قول فیصل اور مہیمن کی تھی 'اس کو سابقہ آسمانی کتابوں پر جانچ جانچ کر فیصلہ کیا جانے لگا حالانکہ سابقہ کتابوں کو ماننے والے بھی اس کی صحت کے بارے میں یکسو نہیں۔ لیکن مذہبی تعصب جب علمی امانت پر غالب آجاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے 'جو ہم مستشرقین کی کتابوں میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی ہر بات کو توراۃ وانجیل پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر ان سے مختلف نظر آتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چونکہ ان باتوں کا علم لوگوں سے سن سنا کر حاصل کیا تھا 'اس لیے اپنی کتاب میں درج کرتے ہوئے ان سے بھول ہو گئی ہے اور اگر وہ کسی بات کو زائد دیکھتے ہیں 'جس کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں میں نہیں تو وہ حیران ہو کر اس کا انکار کر دیتے ہیں کہ یہ نئی بات کہاں سے آ گئی۔ بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو کتاب اللہ نہیں بلکہ کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کی اصل اور مخصوص حیثیت کو نمایاں کرنے کے بعد فرمایا کہ اے پیغمبر! لوگوں کے درمیان اس حق کے مطابق فیصلہ کیجئے 'جو قرآن کریم کی شکل میں اللہ نے نازل کیا ہے اور آپ کو اس کتاب کے مطابق فیصلہ کرنے میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی کیونکہ اہل کتاب آپ کو بار بار اپنی خواہشات کے اتباع پر مجبور کریں گے اور وہ چاہیں گے کہ آپ کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہونے کی بجائے 'ان کی خواہشات کے مطابق ہوں۔ آپ پر چونکہ حق نازل ہو چکا ہے 'اس لیے آپ کا کام اس حق کا اتباع ہے 'کسی کی خواہش کا اتباع نہیں۔ (روح)

{لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ بنایا ہے۔} ارشاد فرمایا کہ ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ بنایا ہے یعنی فروعی اعمال ہر ایک کے خاص اور جدا جدا ہیں جیسے نمازوں، روزوں کی تعداد اور اس طرح کے احکام جدا جدا ہیں لیکن اصل دین سب کا ایک ہے یعنی توحید و رسالت، عقیدہ آخرت، یونہی بنیادی اخلاقیات سب کی مشترک ہیں۔ حضرت علی المرتضٰی (رض) نے فرمایا کہ ایمان حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانہ سے یہی ہے کہ "لَآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ" کی شہادت اور جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے آیا اس کا اقرار کرنا جبکہ شریعت ہر امت کی خاص ہے۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۴۸، ۱/۵۰۱)

{وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وّٰحِدَةً: اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔} ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تاکہ جو شریعتیں اس نے تمہیں دی ہیں ان میں تمہیں آزمائے اور امتحان میں ڈالے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ ہر زمانہ کے مناسب جو احکام دیئے کیا تم ان پر اس یقین و اعتقاد کے ساتھ عمل کرتے ہو کہ ان کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی مَشِیَّت (مرضی) سے ہے اور اس میں بہت سی حکمتیں اور دنیاوی اور اخروی فوائد و منافع ہیں اور یا تم حق کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہو۔ (ابو سعود، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۴۸، ۲/۵۱) (صراط)

توراۃ کے نزول کی غرض وغایت

توراۃ کے نزول کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یحکم بھا النبیون اور انجیل کے نزول کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا ولیحکم اھل الانجیل اور قرآن حکیم کے نازل کرنے کا مدعا بھی یہی بتایا فاحکم بما انزل الخ ان تمام الفاظ سے یہ بتانا مطلوب ہے کہ ان کتابوں کے نازل کرنے کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے تمدنی اور معاشرتی مسائل میں اپنی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں ان کی روشنی سے ہدایت حاصل

کی جائے اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلا جائے۔ تب ہی تو وہ فرق معلوم ہو سکتا ہے جو قانون الٰہی اور انسان کے بنائے ہوئے ناقص قانون میں ہے۔ اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے اور اس کی واضح ہدایات اور احکام کے ہوتے ہوئے اپنی خواہشات کی ہی پیروی کی جائے تو پھر ان کے نزول کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور انسان ان برکتوں سے محروم ہو جاتا ہے جو ان احکام میں مضمر ہیں۔ (ضیاء)

{ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ: تو نیکیوں کی طرف دوسروں سے آگے بڑھ جاؤ۔ } قرآن پاک کا حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ جن معاملات سے انسان کی دنیا و آخرت کا کوئی قابل قبول فائدہ متعلق نہیں ہے ان میں بحث و مقابلہ کرنے کی بجائے انھیں رضائے الٰہی اور بھلائی کے کاموں میں مقابلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اسی انداز کی ایک جھلک ہے کہ شریعتوں کے اختلاف کی وجوہات میں فلسفیانہ بحثیں کرنے اور بال کی کھال اتارنے کی بجائے نیکیوں کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اس میں ہماری بہت سی چیزوں کی اصلاح ہے۔ آج کل حالت یہ ہے کہ ہر محاذ اور میدان میں فضولیات پر بحث و مباحثہ اور پانی سے مکھن نکالنے کی کوششیں جاری رہتی ہیں اور کرنے کے کاموں کی طرف توجہ کم ہی ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کی باریکیاں نکالنے کو مہارت اور قابلیت شمار کیا جاتا ہے اگرچہ عملی طور پر ایسے آدمی کی حالت نہایت گری ہوئی ہو۔ بحث وہاں کی جائے جہاں اس سے کوئی فائدہ نظر آئے، صرف وقت گزاری، لوگوں کو متوجہ رکھنے، طلبِ شہرت اور قابلیت دکھانے کیلئے اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کرنا اور عملی دنیا میں تنکا تک نہ توڑنا عقل، دین اور اسلام سب کے منافی ہے۔ اس نصیحت کی روشنی میں بہت سے لوگوں کو اپنے طرز عمل پر نظر کرنے کی حاجت ہے۔ سمجھنے کیلئے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک فرمان ہی کافی ہے "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ "آدمی کے اسلام کے حسن سے ہے کہ وہ فضول چیزوں کو چھوڑ دے۔ (ترمذی، کتاب الزہد، ۱۱۔ باب، ۱۴۲/۴، الحدیث: ۲۳۲۴) (صراط)

کسی بات سے اگر منع کیا جائے تو اس کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مخاطب اس کا ارتکاب کرنے والا تھا اور اسے روک دیا گیا بلکہ کبھی منع اس لیے بھی کیا جاتا ہے کہ مخاطب جیسے پہلے اس کام سے مجتنب اور محترز چلا آ رہا ہے اسی طرح آئندہ بھی مجتنب رہے۔ یہاں حضور رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے روکنے کا مقصد یہ نہیں کہ معاذ اللہ آپ ان کی پیروی کا خیال کرنے لگے تھے اس لیے روکنا پڑا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جیسے پہلے آپ احکام الٰہیہ کی پیروی کرتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی نفسانی خواہشات کی اتباع کا واہمہ تک بھی خاطر عاطر میں نہیں گزرتا اسی طرح آئندہ بھی ہمت و استقلال سے احکام ربانی کی اطاعت کرتے جایئے۔ (ضیاء)

آیت مبارکہ:

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

لغۃ القرآن: [وَاَنِ : اور یہ کہ][احْكُمْ : آپ فیصلہ کریں][بَيْنَهُمْ : انکے درمیان][بِمَآ : ساتھ جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][وَلَا : اور نہ][تَتَّبِعْ : آپ اتباع کریں][اَهْوَآءَهُمْ : خواہشات ان کی][وَاحْذَرْهُمْ : ہوشیار رہیں ان سے][اَنْ : یہ کہ][يَّفْتِنُوْكَ : وہ آپکو بہکا دیں][عَنْۢ: سے][بَعْضِ : بعض][مَآ : جو][اَنْزَلَ : نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][اِلَيْكَ: آپ کی طرف][فَاِنْ : پھر اگر][تَوَلَّوْا : وہ پھرجائیں][فَاعْلَمْ : تو جان لو][اَنَّمَا : یقیناً][يُرِيْدُ : وہ ارادہ کرتا ہے][اللّٰهُ : اللہ][اَنْ : یہ کہ][يُّصِيْبَهُمْ : پہنچائے ان کو][بِبَعْضِ : سبب بعض][ذُنُوْبِهِمْ : ان کے گناہ][وَاِنَّ : اور بیشک][كَثِيْرًا : بہت زیادہ][مِّنَ : سے][النَّاسِ : لوگ][لَفٰسِقُوْنَ : ضرور نافرمان ہیں]

ترجمہ: اور (اے حبیب ! ہم نے یہ حکم کیا ہے کہ) آپ ان کے درمیان اس (فرمان) کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور آپ ان سے بچتے رہیں کہیں وہ آپ کو ان بعض (احکام) سے جو اللہ نے آپ کی طرف نازل فرمائے ہیں پھیر (نہ) دیں، پھر اگر وہ (آپ کے فیصلہ سے) روگردانی کریں تو آپ جان لیں کہ بس اللہ ان کے بعض گناہوں کے باعث انھیں سزا دینا چاہتا ہے، اور لوگوں میں سے اکثر نافرمان (ہوتے) ہیں

تشریح: مسلمانوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ اہل کتاب خود تو احکام الٰہیہ سے منہ موڑ چکے تھے اور اپنی کتابوں سے رشتہ توڑ چکے تھے لیکن اب وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ تم ہدایت کی راہ پر چلو اس لیے وہ طرح طرح کے شبہات، قسم قسم کے اعتراضات اور گوناگوں وسوسوں سے تمہیں بھی اپنے دین سے برگشتہ کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ خبردار ! ان کے جال میں پھنس کر اللہ کے دین قیم کی رسی چھوڑ نہ دینا۔ آج بھی گم کردہ راہ لوگ متاع ایمان لوٹنے کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ پانی کی طرح روپیہ بہایا جارہا ہے۔ فتنوں اور سازشوں کا ایک ٹھاٹھیں

مارتا ہوا سیلاب اسلامی اقدار کو بہالے جانے کے لیے بڑھا چلا آرہا ہے۔ کاش ہم قرآن کی اس تنبیہ پر کان دھریں اور ہوشیار ہو جائیں۔ چور نہیں بلکہ وہ مالک قابل ملامت ہے جو اپنے قیمتی سامان کی حفاظت نہیں کرتا۔
حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معصوم اور خطاؤں سے پاک ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے۔ (قرآن : 132:3) اور آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ (قرآن : 50:4) لہٰذا آپ خدائی احکام کے برعکس کسی اور کی خواہشات کی پیروی نہیں کر سکتے، لیکن اس آیت میں آپ کو مخاطب کرکے دراصل امت مسلمہ کو تعلیم دی جارہی ہے کہ احکام خداوندی کے برعکس کسی انسان کی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنا سراسر گمراہی ہے جس کی اجازت جب کسی پیغمبر کو نہیں ہے تو کسی اور کو کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ (امداد)

شان نزول

حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کا شان نزول یہ بیان فرمایا ہے کہ چند یہود علماء نے جن میں ابن صوریا، کعب بن اسد اور ابن صلوبا ان کے اکابر بھی تھے یہ مشورہ کیا کہ آؤ چلیں محمد (فداہ امی وابی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اور انھیں کسی حیلہ سے اپنے دین سے برگشتہ کریں فانما ھو بشر وہ بشر ہی تو ہے اسے دھوکا دینا کیا مشکل ہے۔ بڑی سوچ بچار سے ایک منصوبہ تجویز کیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے احبار (علماء) ہیں اور اگر ہم آپ کا دین قبول کرلیں تو سب یہودی مسلمان ہو جائیں گے۔ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمارا بعض لوگوں کے ساتھ کچھ تنازعہ ہے۔ ہم اس کے تصفیہ کے لیے آپ کے پاس آئیں گے۔ اگر آپ نے اس کا فیصلہ ہمارے حق میں کیا تو ہم سب مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے ایمان لانے سے سارے یہودی اسلام قبول کرلیں گے۔ بہت ہی خطرناک تھی یہ سازش ! انھیں اچھی طرح علم تھا کہ کسی کے اسلام قبول کرنے سے جو مسرت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہوتی ہے وہ اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔ وہ عقل کے اندھے سمجھ رہے تھے کہ بشر ہی تو ہے ہمارے جال میں پھنس جائے گا لیکن حقائق عالم کو بے حجاب دیکھنے والا، اسرار کائنات کے رخ سے ہر نقاب الٹ دینے والا، دین اسلام کا سچا داعی یہ رشوت کب قبول کرسکتا تھا جس کی فراست نور خداوندی سے روشن تھی اس سے ان کی چال کیوں کر مخفی رہ سکتی تھی۔ فابی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (قرطبی) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صاف انکار کردیا۔ فنزلت ھذہ الایۃ (قرطبی) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ بیچارے ساری عمر اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ یہ بھی ہماری طرح بشر ہیں۔ اور ان کی نگاہیں مقام محمدی کی رفعتوں کو نہ دیکھ سکیں۔ آفتاب مصطفوی کی جلوہ سامانیوں کو نہ پا سکیں۔ آج بھی توحید کی آڑ لے کر شان رسالت کی عظمتوں کا انکار کرنے والے بعینہٖ یہی الفاظ دہراتے سنائی دیتے ہیں۔ اس یہودی ذہنیت کو مسلمان کہلانے والوں نے کیوں اور کیسے قبول کرلیا بڑی حیرت اور افسوس کا مقام ہے۔ (ضیاء)
اگر کوئی آدمی اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ نعوذ باللہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرنے والے تھے تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تنبیہ فرمائی ہے تو یہ اس کی کج فہمی ہوگی، کیونکہ مستند حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ یہود کی پیشکش پہلے ٹھکرا چکے تھے، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ تو یہ آیت حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان عصمت کے خلاف نہیں بلکہ آپ کی خدا خوفی، استقامت اور اتباع حق کی ایک مضبوط دلیل اور آپ کی حوصلہ افزائی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ آپ کو فرما رہے ہیں کہ آپ نے ہمیشہ کی طرح آج بھی بہت اچھا فیصلہ سنایا ہے اور آئندہ بھی ایسے ہی فیصلوں پر قائم رہیں۔

یہ آیت تومدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس وقت ہزاروں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس استقامت کا مظاہرہ ہجرت سے پہلے اس وقت بھی کر چکے تھے جب آپ کے ساتھ گنتی کے چند مسلمان تھے اور مکہ کے سرداروں نے آپ کو دولت، سرداری اور مکہ کی حکومت کی اس شرط پر پیشکش کی کہ آپ اس نئی دعوت سے باز آجائیں، مگر آپ نے فرمایا: "اگر آپ سورج لا کر میرے دائیں ہاتھ میں رکھ دیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں اور یہ توقع کریں کہ میں توحید کی دعوت کو چھوڑ دوں تو یہ ناممکن ہے۔" (سیرت ابن کثیر: جلد اول: ص 474) (امداد)

قرآن کریم سے امت مسلمہ کا سلوک

لیکن اس ساری احتیاط اور تاکید کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امت اسلامیہ نے اس خدشے کو ایک حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے عبرت کے لیے پیش کر دیا ہے۔ آج پورے عالم اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم سب سے زیادہ چھپنے والی اور پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ صرف سعودی عرب میں قرآن کریم کی طباعت و اشاعت کا محیر العقول نظام موجود ہے اور پوری دنیا میں سعودی حکومت نے اسے مفت تقسیم کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا مجموعی طور پر اس کے ساتھ رویہ حیرت انگیز حد تک قابل افسوس ہے کہ جس کتاب کو وہ انتہائی مقدس اور محترم جان کر آنکھوں سے لگاتی ہے 'اسے سمجھنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ اسے جزدانوں میں لپیٹ کر 'طاقوں میں سجایا جاتا ہے۔ تعویذ بنا کر دھو دھو کر پیا جاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا مقدس کام اس سے لیئے جاتے ہیں۔ کوئی مر جائے تو اس سے ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ لیکن خود وہ کتاب کیا کہتی ہے 'اس سے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں۔ سمجھ یہ لیا گیا ہے کہ اس کتاب کا مقصد حصول ثواب ہے یا ایصال ثواب یا بیماریوں میں اس سے شفا پانا ہے اور اگر کسی کی جان نہ نکلتی ہو تو اس کے پاس پڑھ کر اس کی نزع کو سہل بنانا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم سے یہ سارے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ وہ شفا بھی ہے 'اس کے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا ہے 'اس سے ایصال ثواب بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ کتاب دنیا میں صرف اس حوالے سے تو نازل نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے کہ ہم نے اس کتاب کو ان مقاصد تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

توپیں جب چلتی ہیں تو اس کی زد میں آنے والے جانور اور حیوانات بھی مر جاتے ہیں۔ لیکن توپیں جانوروں کے شکار کے لیے نہیں داغی جاتیں۔ ان سے تو مورچے تباہ ہوتے اور فصیلیں اڑائی جاتی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم بھی کتاب ہدایت 'کتاب زندگی اور کتاب انقلاب بن کر آیا تھا اور قرن اول میں اس سے یہی فائدہ اٹھایا گیا اور یہ امت دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رہی۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ یہ امت اس کتاب مقدس سے یہی سلوک کرے گی۔ اس لیے اس نے تکرار کے ساتھ اپنے حکم کو دھرایا تاکہ ہم ان کوتاہیوں سے بچ سکیں۔ لیکن ہماری امت کا ہر طبقہ 'ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر 'اپنی اس روش کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ جنھیں مذہب سے کوئی خاص رشتہ نہیں 'ان کی تو شکایت ہی فضول ہے۔ شکایت تو ان سے ہے 'جو اپنے بچوں کو قرآن پاک نہایت شوق سے حفظ تک کرواتے ہیں اور خود بھی پابندی سے روزانہ تلاوت قرآن کریم کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے انھیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جو کتاب 'کتاب ہدایت ہو 'اگر اس کو سمجھا نہ جائے تو اس

سے ہدایت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے ' جیسے کوئی شخص بیرون ملک گیا اور اس نے جاتے ہوئے اپنے عزیز دوست سے کہا کہ میں بیوی بچوں کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں ' تم میرے سب سے عزیز دوست ہو۔ خدا کے لیے میرے بچوں کی دیکھ بھال کرنا اور آتے جاتے گھر کی ضرورتوں کے بارے میں پوچھتے رہنا۔ میں خود بھی وقتاً فوقتاً تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم اس کے مطابق میرے اہل خانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے رہنا۔ جب وہ چند سال کے بعد اپنے گھر لوٹ کے آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس اللہ کے بندے نے کبھی ایک دفعہ بھی گھر کی راہ نہیں دیکھی اور کبھی آ کر اس نے معلوم نہ کیا کہ اہل خانہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ اس شخص کو سن کر نہایت دکھ ہوا چنانچہ ' جب اس کا دوست ملنے آیا تو اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اس کے دوست نے جب اس کی بے رخی کو دیکھا تو اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے گیا اور پوچھا دوست بتاؤ تو سہی ' تمہیں شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا شکایت پوچھتے ہو ' تم نے یہی دوستی کا حق ادا کیا کہ اتنے سالوں میں میرے بچوں کی ایک دفعہ بھی خیریت معلوم نہ کی۔ اس نے کہا اس بات کو چھوڑو ' گھر گیا اور اس کے تمام خطوط کا پلندہ ' جو اس نے نہایت خوبصورت جزدان میں لپیٹا ہوا تھا ' وہ اٹھا کر لے آیا اور اہل محلّہ میں جا کر اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم ذرا میرے دوست کے سامنے اس بات کی گواہی دو کہ جب بھی اس کا خط آتا تھا تو کیا میں لہک لہک کر آپ لوگوں کو پڑھ کر نہیں سناتا تھا اور کس طرح میں اپنے دوست کی ہر وقت آپ لوگوں کے سامنے تعریف کرتا تھا؟ اب بتایئے اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا؟ اس دوست نے یہ سن کر سر پکڑ لیا کہ تم تو عقل سے بالکل ہی فارغ معلوم ہوتے ہو۔ خطوط لہک لہک کر پڑھنے کے لیے اور لوگوں کو سنانے کے لیے ہوتے ہیں یا جو کچھ خطوط میں لکھا جائے ' اسے سمجھ کر عمل کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر تم ایسے ہی ضعیف العقل ہو تو میں تم سے کیا گلہ کروں۔ یہ ایک انفرادی واقعہ ہے ' جس سے آپ کو تعجب ہوا ہوگا اور آپ اسے یقیناً فتورِ عقل کی ایک مثال سمجھیں گے۔ لیکن اس امت اسلامیہ کے بارے میں ' جس کے ہم سب افراد ہیں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے؟ کیا ہم سب اسی اختلال دماغ کا شکار ہیں کہ اللہ کا پیغام جو ہماری زندگی کی راہنمائی کے لیے آیا ' وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن اس کے مطابق زندگی کے فیصلے کرنا تو دور کی بات ' ہم اسے سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اس لیے تکرار کے ساتھ ' اس حکم کو ارشاد فرمانے کے بعد اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ کہا جب تم اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کا ارادہ کرو تو نہایت ہوشیاری کا ثبوت دینا۔ اس بات سے پوری طرح چوکنا رہنا کہ یہ اہل کتاب یا دشمنان دین ' تمہیں اس شریعت کے حوالے سے کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے سے برتر قوتوں کے سامنے اپنے مفادات کو غیر محفوظ سمجھ کر ' اس قدر ذہنی تحفظات کا شکار ہو جاؤ کہ تم سرے سے اسلامی شریعت سے لاتعلّقی کا فیصلہ کر لو۔ جب قرآن کریم اتر رہا تھا تو یقینا یہ بات حیران کن ہوگی کہ مسلمان کبھی اس صورت حال سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں لیکن آج ہم پورے عالم اسلام کو دیکھتے ہوئے ' جب اس حقیقت کو اپنے سامنے پاتے ہیں تو اس کی کوئی تاویل کرنا مشکل نظر آتی ہے۔

ہمارے ملک کا جوڈیشری سے متعلق ایک اہم وفد ایک مسلمان ملک کے دورے پر گیا۔ اس کے پروگرام میں سربراہ مملکت سے ملاقات بھی شامل تھی۔ ملاقات سے پہلے اس وفد کے سربراہ نے پروٹوکول آفیسر کو ضابطہ کے مطابق اطلاع دی کہ ہم آپ کے ملک کے سربراہ کو قرآن کریم کا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اگلے روز جواب دینے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن باضابطہ جواب دیا گیا کہ آپ قرآن کریم کا تحفہ سربراہ مملکت کو پیش نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ چونکہ اس ملک میں اقلیتیں بھی رہتی ہیں ' اگر قرآن کریم کا آپ تحفہ پیش کریں گے تو ان اقلیتوں کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے اور ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے۔ اندازہ فرمایئے ! جس ملک کا سربراہ غیر مسلم اقلیتوں کے خوف سے قرآن کریم کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا تو کیا وہ قرآن کریم کا نظام اپنے ملک میں نافذ کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ یہی وہ چیز ہے ' جس سے اس امت کو

آگاہ کیا گیا ہے کہ دیکھنا اس کمزوری کا شکار نہ ہو جانا کہ اگر تمہارے پیش نظر غیر مسلموں کی پسند و ناپسند رہی اور تم اپنے دینی فیصلے بھی ان کے اشارہ ابرو سے کرنے لگے تو پھر اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے کہ تم کبھی شریعت کو نافذ کر سکو۔ تم نے اگر فی الواقع اس فرض کو انجام دینا ہے تو پھر تمہارے سامنے اللہ کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ تم یہ فرض کبھی انجام نہیں دے سکو گے۔

پاکستان بننے کے بعد ' پاکستان میں بسنے والے یہاں بھی یہی تماشہ دیکھتے رہے ہیں کہ جب بھی اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ ہوا تو سب سے بڑی رکاوٹ وہی طبقہ رہا 'جن کی نظریں ہمیشہ باہر کی طرف لگی رہتی تھیں۔ میاں امیر الدین مرحوم 'جو پاکستان بننے کے بعد لاہور کے پہلے میئر تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ بتایا کہ حصول پاکستان کے بعد 'جب اہل پاکستان نے بالعموم اور اس کی دینی تنظیموں نے بالخصوص زور و شور سے اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس میں خود مسلم لیگ کا اسلام پسند طبقہ بھی شامل تھا اور میاں امیر الدین کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہوتا تھا۔ میاں صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک روز ہائی کورٹ بار میں گیا تو مجھے وکلاء نے گھیر لیا۔ کہنے لگے میاں صاحب ! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ میاں صاحب نے ان سے کہا کہ آخر آپ کو اس میں شکایت کیا ہے ؟ کہنے لگے کہ آج کی روشنی کے زمانے میں 'اگر آپ صدیوں پہلے کا قانون نافذ کریں گے تو ہم مغربی دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اندازہ کیجئے کہ نفاذ اسلام کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ 'یہ بے حمیتی ہے کہ اللہ ناراض ہوتا ہے تو بیشک ہو جائے 'لیکن مغربی دنیا کو ہم سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ ظفر علی خاں مرحوم نے اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا

تم سمجھتے ہو پرایوں نے کیا ہم کو تباہ
یوں تو شرم پیمبر ہے انھیں بھی لیکن
بندہ پرور کہیں اپنوں کا یہ کام نہ ہو
ان کو ڈر یہ ہے کہ ناراض کہیں ٹام نہ ہو

یہ ٹام کی ناراضگی 'وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے 'جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا:

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ط

آپ ان اہل کتاب سے یعنی ٹام کی اولاد سے ہوشیار رہیے۔ کہیں آپ کو اللہ کی نازل کردہ شریعت سے پھسلا نہ دیں اور کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ جس بات سے ہوشیار رہنے کی ہمیں آگاہی بخشی گئی تھی 'افسوس یہ ہے کہ آج اسی بات نے ہمارا راستہ روک رکھا ہے۔

یہود کی بدنیتی کا انجام

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ط

یعنی اگر تمہاری تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود 'اہل کتاب اپنی روش سے باز نہیں آتے تو آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ حق سے ان کی روگردانی 'بلکہ اہل حق کو بھی اس سے پھیرنے کی کوشش 'اصلاً ان کی بدنصیبی کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی محرومی کا فیصلہ کیا 'بلکہ یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ انھیں ان کے کرتوتوں کی سزا دے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں

کہ بنی اسرائیل کے تینوں قبیلے ' جو مدینہ طیبہ میں آباد تھے۔ اپنی اسی روش کے باعث ' اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئے۔ جنگ بدر کے جلدی بعد ' بنو قینقاع کو شہر بدر کر دیا گیا اور پھر ایک عرصہ کے بعد ' بنو نضیر بھی شہر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے قلعے ' ان کی زمینیں ' ان کے کاروبار ' سب کچھ پیچھے رہ گیا اور یہ عبرت کی تصویر بنے ' خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔ سب سے آخر میں ' بنو قریظہ اپنے انجام کو پہنچے کہ جن کے بیشتر افراد کو قتل ہونا پڑا اور پہلے دو قبیلے جو خیبر میں جا کر بس گئے تھے ' وہاں بھی ان کی حق دشمنی کی عادت رک نہ سکی۔ بالآخر ان کو جزیرہ عرب سے نکال دیا گیا۔ یہ وہ سزا تھی جو اللہ کے قانون کے مطابق انھیں ملی کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اتمام حجت کر دی جاتی ہے اور پھر بھی وہ قوم راہ راست اختیار نہیں کرتی تو عام طور پر اس کے اجتماعی گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اسے دے دی جاتی ہے۔ البتہ ! انفرادی اعمال کی سزا ' وہ قیامت میں پائیں گے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ ہم نے ان لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیوں کیا فرمایا:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ

(یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں)

یعنی اللہ کی ہدایت سے باغی ہیں۔ انھیں ہر طرح سمجھا بجھا کے دیکھ لیا ہے لیکن ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ آیت کے اس حصہ نے اگرچہ ان کی شقاوت کو پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔ تاہم آخری بات مزید فرمائی جا رہی ہے ممکن ہے ان میں سے کوئی بھی اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو تو شاید وہ اس پر غور کرے اور ہدایت کے راستے پر چل نکلے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

لغۃ القرآن: [اَفَحُكْمَ : کیا فیصلہ][الْجَاهِلِيَّةِ : جاہلیت][يَبْغُوْنَ : وہ تلاش کرتے ہیں][وَمَنْ : اور کون][اَحْسَنُ : زیادہ اچھا][مِنَ : سے][اللّٰهِ : اللہ][حُكْمًا : فیصلہ کرنا][لِّقَوْمٍ : قوم کے لیے][يُّوْقِنُوْنَ : وہ یقین رکھتے ہیں]

ترجمہ: کیا یہ لوگ (زمانہ) جاہلیت کا قانون چاہتے ہیں، اور یقین رکھنے والی قوم کے لیے حکم (دینے) میں اللہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔

تشریح: جاہلیت اس نظام حیات کو کہتے ہیں جہاں قانون سازی کا کامل اختیار خالق کائنات کو نہ ہو بلکہ انسانی اغراض اور خواہشات کے ہاتھ میں ہو۔ جہاں اقتدار و حکومت کی مسند پر وحی الٰہی کے بجائے انسان کا ناقص اور ناتمام علم قابض ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم ان آسمانی کتابوں کی اطاعت کو گراں سمجھ رہے ہو۔ جن میں ہدایت ہی ہدایت، نور ہی نور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم دور جہالت کے اس ظالمانہ نظام کو اپنانا چاہتے ہو جس میں غریب و امیر، کمزور اور طاقتور، حاکم اور محکوم کے لیے الگ الگ قانون تھے۔ ذرا سوچو! اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے احکام جو عین عدل و انصاف اور مجسم رحم و کرم ہیں وہ بہتر ہیں یا تمہارا یہ ظالمانہ نظام جہاں خواہشات نفسانی کی سروری ہے۔ (ضیاء)

شانِ نزول

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بنی نَضِیر اور بنی قریظہ یہودیوں کے دو قبیلے تھے، ان میں آپس میں قتل و غارتگری جاری رہتی تھی۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو یہ لوگ اپنا مقدمہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں لائے اور بنی قریظہ نے کہا کہ "بنی نَضِیر ہمارے بھائی ہیں ہم وہ ایک نسل سے ہیں، ایک دین رکھتے ہیں اور ایک کتاب (توریت کو) مانتے ہیں لیکن اگر بنی نضیر ہم میں سے کسی کو قتل کریں تو وہ اس کے خون بہا میں ہمیں ستر وَسْق (ایک بڑا وزن) کھجوریں دیتے ہیں اور اگر ہم میں سے کوئی ان کے کسی آدمی کو قتل کرے تو ہم سے اس کے خون بہا میں ایک سو چالیس وسق لیتے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا فیصلہ فرمادیں۔ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "میں حکم دیتا ہوں کہ دونوں قبیلوں کے افراد کا خون برابر ہے، کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ اس پر بنی نضیر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ سے راضی نہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے دشمن ہیں، ہمیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۰، ۱/۵۰۲)

اور فرمایا گیا کہ کیا جاہلیت کی گمراہی اور ظلم کا حکم چاہتے ہیں۔ جو حکم حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑھ کر کس کا حکم اچھا ہو سکتا ہے۔ (صراط)

جاہلیت کا لفظ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو چیز بھی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مقابل ہے یا اس کے خلاف ہے 'وہ جاہلیت ہے کیونکہ اسلام کی بنیاد اس علم پر ہے 'جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے اور جو فی الواقع حقیقی علم کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم رکھتا ہے 'چاہے ان کا تعلق علم کے کسی شعبہ سے بھی ہو۔ اس کا علم نہ گمان پر مبنی ہے اور نہ کسی ایک شعبے میں محدود۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے 'جاہلیت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم یا قیاس و گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرز عمل جہاں جس دور میں بھی انسان اختیار کرے 'اسے بہرحال جاہلیت ہی کا طرز عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے 'وہ محض ایک جزوی علم ہے اور کسی معنی میں بھی انسان کی راہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظام زندگی اس جزوی علم کے ساتھ ظنون و اوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کرکے بنا لیے گئے ہیں 'وہ بھی اسی طرح جاہلیت کی تعریف میں آتے ہیں 'جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اس تعریف میں آتے تھے۔ اہل کتاب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود علم اور جاہلیت کے اس

فرق کو کسی نہ کسی حد تک ضرور سمجھتے تھے۔اس لیے ان کی عقل سے اپیل کی گئی ہے کہ جب تم یہ جانتے ہو کہ علم تو وہ ہے 'جو اللہ کی طرف سے آئے اور تم تسلیم کرو یا نہ کرو 'لیکن تم اپنی کتابوں کی دی ہوئی خبر کے مطابق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کریم کو پہچانتے ہو کہ یہ ضابطہ حیات اللہ کی طرف سے آیا ہے 'جو سراسر علم پر مبنی ہے تو کیا یہ جانتے ہوئے بھی تم پھر جاہلیت کے راستے پر چلنا چاہتے ہو؟

لیکن تمہاری مصیبت یہ ہے کہ اس حقیقت سے بے بہرہ نہیں ہو بلکہ یقین وایقان سے عاری ہو اور وہ علم جو یقین کی قوت سے محروم ہو 'وہ محض ذہن کی ورزش ہے اور ذوق کی عیاشی۔ایسے علم سے علمی مجالس میں رونق کا سامان کیا جاسکتا ہے 'علمی مغالطے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔لیکن انسانی زندگی کی فوز و فلاح کے لیے جس سیرت و کردار کی ضرورت ہوتی ہے 'وہ تو صرف یقین و ایمان سے ہی پیدا ہوتی ہے اور اہل کتاب اسی نعمت سے محروم ہیں۔

یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیر ملت ہے

پیش نظر آیات کو پڑھنے سے پہلے چند حقائق کا ادراک بہت ضروری ہے۔

انسان کی کامیابی کا انحصار اپنے مقصد حیات سے سنجیدہ وابستگی سے ہے

1 وہ قومیں 'جو کسی نظریہ حیات سے وابستہ ہوتی ہیں 'ان کی زندگی اور بقاء کی ضمانت صرف نظریہ حیات سے غیر مشروط وابستگی ہوتی ہے۔ان کی تمام تر قوت کا سرچشمہ 'اسی نظریہ حیات کے بارے میں یکسو ہونا ہے۔وہ جب کبھی بھی اس نظریہ حیات کے بارے میں تشکک وارتیاب کا شکار ہوتی ہیں 'اسی وقت ان کی اجتماعی قوت میں کمی آنے لگتی ہے اور ان کی بقاء کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔اس کو اگر ہم سمجھنا چاہیں تو ہم اپنی روزمرہ کی مثالوں سے بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً: اگر آپ اپنے بچے کو کسی تعلیمی ادارے میں پڑھنے کے لیے داخل کراتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد آپ کو یہ شکایت ملتی ہے کہ آپ کا بچہ روزانہ سکول آتا تو ہے 'لیکن نہ سکول کی تعلیم میں دلچسپی لیتا ہے اور نہ ہوم ورک کرکے آتا ہے۔آپ پریشانی سے جب بچے کا جائزہ لیتے ہیں تو بالآخر آپ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بچہ سکول ضرور جاتا ہے 'لیکن سکول جانے کا جو مقصد ہے 'یعنی علم کا حصول 'اس کے ساتھ اس کی وابستگی برائے نام بھی نہیں۔وہ یہ سمجھتا ہے کہ سکول میں آمدورفت 'بس یہی اس کا مقصد ہے۔رہا علم کا حصول 'اس کے لیے اس کے دماغ میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔یہ وجہ ہے 'جسکے باعث وہ تعلیم سے کورا رہتا ہے۔اگر آپ اس کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ اسے مقصد سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور پھر اس کی تمام تر صلاحیتوں کو اس کے ساتھ یکسو کر دیں۔تب آپ دیکھیں گے کہ چند ہی دنوں میں آپ کا بچہ بہتر نتائج دینے لگے گا۔(روح المختصر۔۔جس قوم کے لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور الٰہی امور پر بچشم بصیرت نظر ڈالتے ہیں تو انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تمام دنیاوالوں کے احکام سے احسن واعدل ہے جن میں ہزاروں مصلحتیں اور بیشمار حکمتیں ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے ہر حکم کے سامنے سر جھکائیں اور دل سے مانیں نہ اس پر اعتراض کریں نہ نکتہ چینی سابقہ ارشادات کی روشنی میں یہود و نصاری کے مکر وفریب اور ان کی فطری سرکشی اور سلام دشمنی کو سمجھنے کے بعد یہ قوم اس لائق نہیں کہ اہل ایمان اس سے دوستی کا رابطہ قائم رکھیں۔(اشرفی)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

لغۃ القرآن: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگ جو][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][لَا تَتَّخِذُوا : نہ تم بناؤ][الْيَهُوْدَ : یہودی][وَالنَّصٰرٰٓى: اور نصرانی][اَوْلِيَآءَ : دوست][بَعْضُهُمْ : ان کا بعض][اَوْلِيَآءُ : دوست][بَعْضٍ: بعض][وَمَنْ : اور جو][يَّتَوَلَّهُمْ : وہ ان سے دوستی رکھتا ہے][مِّنْكُمْ : تم سے][فَاِنَّهٗ : پھر یقیناً وہ][مِنْهُمْ : ان سے][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][لَا : نہیں][يَهْدِي : وہ ہدایت کرتا][الْقَوْمَ : قوم][الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ یہ (سب تمہارے خلاف) آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو شخص ان کو دوست بنائے گا بیشک وہ (بھی) ان میں سے ہو (جائے) گا، یقیناً اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں فرماتا۔

تشریح: دشمنان دین کو اپنا ہم راز اور اصلاح کار بنانے اور ان پر کامل اعتماد کرنے کی ممانعت ہو رہی ہے جس کی توضیح کئی مرتبہ پہلے گزر چکی ہے۔ مسلمانوں کی صفوں میں ابھی کئی منافق تھے جو مسلمانوں سے بھی روابط قائم رکھنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ یہود کی طرف بھی دلی میلان رکھتے تھے۔ اور مسلمانوں کے راز وقتاً فوقتاً ان کو بتا آیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی سرگرمیاں کیونکہ بہت خطرناک تھیں۔ اس لیے مسلمانوں کو بتادیا گیا کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ جو ایسے دل تعلقات قائم کرے وہ زمرہ مسلمین سے نہیں۔ (ضیاء)

یہ آیت مشہور صحابی حضرت عبادہ بن صامت (رض) اور مشہور منافق عبداللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئی جو منافقین کا سردار تھا۔
حضرت عبادہ (رض) نے فرمایا کہ یہودیوں میں میرے بہت بڑی تعداد میں دوست ہیں جو بڑی شوکت و قوت والے ہیں، اب میں ان کی دوستی سے بیزار ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا میرے دل میں اور کسی کی محبت کی کوئی گنجائش نہیں۔
اس پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ میں تو یہودیوں کی دوستی سے بیزار نہیں ہو سکتا، مجھے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا اندیشہ ہے اور مجھے ان کے

ساتھ تعلقات رکھنا ضروری ہے۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا کہ "یہ یہودیوں کی دوستی کا دم بھرنا تیرا ہی کام ہے، عبادہ کا یہ کام نہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ۱/۵۰۳)

کفار سے دوستی وموالات کا شرعی حکم

اس آیت میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستی وموالات یعنی ان کی مدد کرنا، ان سے مدد چاہنا اور ان کے ساتھ محبت کے روابط رکھنا ممنوع فرمایا گیا۔ یہ حکم عام ہے اگرچہ آیت کا نزول کسی خاص واقعہ میں ہوا ہو۔ چنانچہ یہاں یہ حکم بغیر کسی قید کے فرمایا گیا کہ اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ مسلمانوں کے مقابلے میں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، تمہارے دوست نہیں کیونکہ کافر کوئی بھی ہوں اور ان میں باہم کتنے ہی اختلاف ہوں، مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ سب ایک ہیں "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ" کفر ایک ملت ہے۔ (مدارک، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ص ۲۸۹)

لہٰذا مسلمانوں کو کافروں کی دوستی سے بچنے کا حکم دینے کے ساتھ نہایت سخت وعید بیان فرمائی کہ جو ان سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے، اس بیان میں بہت شدت اور تاکید ہے کہ مسلمانوں پر یہود ونصاریٰ اور دین اسلام کے ہر مخالف سے علیحدگی اور جدا رہنا واجب ہے۔ (مدارک، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ص ۲۸۹، خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ۱/۵۰۳، ملتقطاً)

اور جو کافروں سے دوستی کرتے ہیں وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت میں کفار کو کلیدی آسامیاں نہ دی جائیں۔ یہ آیت مبارکہ مسلمانوں کی ہزاروں معاملات میں رہنمائی کرتی ہے اور اس کی حقانیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ پوری دنیا کے حالات پر نظر دوڑائیں تو سمجھ آئے گا کہ مسلمانوں کی ذلت وبربادی کا آغاز تبھی سے ہوا جب آپس میں نفرت ودشمنی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر غیر مسلموں کو اپنا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھ کر ان سے دوستیاں لگائیں اور انھیں اپنوں پر ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ (صراط)

کفار کے ساتھ دوستی کی ممانعت میں احادیث اور آثار

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہود اور نصاری کو ابتداء سلام نہ کرو، جب تم ان میں سے کسی سے راستہ میں ملو تو اسے تنگ راستے پر چلنے میں مجبور کرو۔ (صحیح مسلم، السلام، ۱۳، (۲۱۶۷) ۵۵۵۷، سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۶۰۸، صحیح ابن حبان ۵۰۰، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۷۶۲۱، مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۱۹۴۵۷، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۱۱۱، سنن کبری للبیہقی ج ۹، ص ۲۰۳)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مومن کے سوا کسی کو ساتھی نہ بناؤ اور متقی کے علاوہ اور کوئی تمہارا کھانا نہ کھائے۔ (سنن ترمذی، ج ۴، رقم الحدیث: ۲۴۰۳، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۴۸۳۲، مسند احمد، ج ۴، رقم الحدیث: ۱۱۳۳۶، شعب الایمان، رقم الحدیث: ۹۳۸۲)

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص مشرکین کے ساتھ ٹھہرا 'اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ (شعب الایمان ج ۷ ص رقم الحدیث : ۹۳۷۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت ۱۴۱۰)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم اپنی انگوٹھیوں میں عربی کو نقش نہ کرو 'اور مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو۔ حضرت انس (رض) نے اس کی تفسیر میں فرمایا یعنی تم اپنی انگوٹھیوں میں محمد نہ لکھواؤ اور اپنے معاملات میں مشرکین سے مشورہ نہ کرو۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۹۳۷۵)

عیاض اشعری بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس ایک نصرانی کاتب تھا۔ حضرت عمر (رض) اس کی کتابت سے بہت خوش ہوئے۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا حضرت عمر (رض) نے مجھے ڈانٹا اور میری ران پر ضرب لگائی اور فرمایا : اس کو نکال دو اور یہ آیت پڑھی اے ایمان والو ! اپنے اور میرے دشمن کو دوست نہ بناؤ (الممتحنہ : ۱) اور یہ آیت پڑھی :

اے ایمان والو : یہود اور نصاری کو دوست نہ بناؤ 'وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں 'تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا وہ ان ہی میں سے (شمار) ہوگا، بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (المائدہ : ۵۱)

حضرت ابو موسیٰ نے کہا بخدا میں اس سے دوستی نہیں رکھتا 'یہ صرف کتابت کرتا ہے۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا کیا تمہیں مسلمانوں میں کوئی کاتب نہیں ملا تھا ؟ جب اللہ نے ان کو دور کردیا ہے تو تم ان کو قریب نہ کرو 'اور جب اللہ نے ان کو خائن قرار دیا ہے تو تم ان کو امین نہ بناؤ ؟ اور جب اللہ نے ان کو ذلیل کیا ہے تو تم ان کو عزت مت دو۔ سنن کبری کی آداب القضاء میں ہم نے اس حدیث کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۹۳۸۴)

ابو سلمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے فرمایا اللہ کے دشمنوں یہود اور نصاری سے ان کی عید اور ان کے اجتماع کے دنوں میں ان سے اجتناب کرو 'کیونکہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے 'مجھے خدشہ ہے کہ تم پر بھی وہ غضب نہ آجائے 'اور ان کو اپنے راز نہ بتاؤ۔ ورنہ تم بھی ان کے اخلاق اختیار کرلوگے۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۹۳۸۵)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) نے فرمایا جس شخص نے عجمیوں کے ملک میں نشوونما پائی 'اور ان کے نوروز اور مہرجان کو منایا اور ان کی مشابہت اختیار کی اور اسی طریقہ پر مرگیا تو وہ قیامت کے دن اسی طرح اٹھایا جائے گا۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۹۳۸۷)

حضرت جریر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خشعم کی طرف ایک لشکر بھیجا 'وہاں کے لوگوں نے مسجدوں میں پناہ لینی شروع کردی 'لشکر نے ان کو جلدی جلدی قتل کرنا شروع کردیا 'جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے ان کے لیے آدھی دیت کا حکم فرمایا اور فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہے 'صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ! کس لیے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا ان دونوں کے (چولہوں کی) آگ اکٹھی نہ دکھائی دے۔

حضرت سمرۃ بن جندب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مشرکین کے ساتھ سکونت نہ کرو 'نہ ان کے ساتھ جمع ہو 'جس نے ان کے ساتھ سکونت رکھی یا ان کے ساتھ جمع ہوا وہ ان کی مثل ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۶۱۱ '۱۶۱۰ 'سنن ابو داؤد 'رقم الحدیث : ۲۶۴۵ 'سنن نسائی 'رقم الحدیث : ۴۷۹۴)

علامہ تفتازانی نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ایک قوم اسلام لانے کے بعد مکہ میں مشرکین کے ساتھ رہتی تھی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرک کے ساتھ رہتا ہو۔ پوچھا گیا 'کیوں ؟ تو آپ ﷺ نے

فرمایا: ان دونوں کی آگ ایک ساتھ دکھائی نہ دے 'یعنی یہ واجب ہے کہ جب ایک آگ جلائے تو دوسرا نظر نہ آئے 'وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنی دور رہیں۔ علامہ ابن اثیر جزری نے کہا ہے کہ واجب ہے کہ مسلمان کا گھر مشرک کے گھر سے دور ہو 'اور جب اس کے گھر جلے تو اس سے مشرک کا گھر نظر نہ آئے 'مسلمان پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ رہے۔

کفار سے دوستی کے حق میں منافقوں کے بہانوں کا بطلان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا وہ ان ہی میں سے (شمار) ہوگا۔ (المائدہ: ۵۱)

اس آیت میں یہود و نصاری سے دور اور الگ رہنے پر تشدید کی گئی ہے اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منع کرنے کے باوجود جو شخص کافروں سے دوستی رکھے گا 'وہ کافروں کی طرح اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرے گا۔ لہٰذا کافروں کی طرح اس سے عداوت رکھنا بھی واجب ہے اور وہ بھی دوزخ کا مستحق ہوگا جیسے کافر دوزخ کے مستحق ہیں اور وہ کافروں کے اصحاب سے شمار کیا جائے گا اور یا اس لیے کہ کافروں اور یہود و نصاری سے دوستی رکھنے والے منافق تھے اور ان کا شمار بھی کافروں میں ہوتا ہے۔ (تبیان)

دراصل اسلام اور کفر کی کشمکش روز افزوں تھی جس کی بنا پر نو وارد مسلمان بالخصوص منافقین اس کوشش میں تھے کہ ہمارے تعلقات یہود و نصاریٰ کے ساتھ پہلے کی طرح استوار رہیں تاکہ یہود و نصاریٰ کی کامیابی کی صورت میں ہم نقصان سے محفوظ رہ سکیں۔ اسی بنا پر مسلمانوں کے راز یہود و نصاریٰ تک پہنچاتے تاکہ ان کی دلی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ حق و باطل کے اس معرکہ میں اسلام یہ بات کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ ان لوگوں کو آستینوں کا سانپ سمجھنے کے باوجود اس حالت میں رہنے دیا جائے کہ یہ مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہیں۔ اسلام تو دور بینی کا دین ہے۔ ایسی صورت حال تو کوئی باطل نظریہ کی حامل اور کمزور جماعت بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ لہٰذا سازشوں کا قلع قمع اور مذموم سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ غیر مسلم بالخصوص یہود و نصاریٰ کے ساتھ رازدارانہ تعلقات سے کامل اجتناب کریں۔ جو اس حکم کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ دوستی سے باز نہیں آتا وہ انھی میں شمار ہوگا اور ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے سرفراز نہیں کرتا۔ واضح رہے کہ اسلام سماجی تعلقات اور کاروباری معاملات میں اپنوں کو ترجیح دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن غیر مسلموں سے سماجی تعلقات اور کاروبار کرنے سے منع نہیں کرتا۔ البتہ ان سے قلبی تعلق اور ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ)

[رواہ ابوداؤد: کتاب اللباس باب فی لبس الشہرۃ]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان فرماتے ہیں جو کوئی کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔"

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (رض) قَالَ لَعَنَ اللّٰہُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَیِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰہِ فَجَاءَ تْہُ امْرَأَۃٌ فَقَالَتْ اِنَّہٗ بَلَغَنِیْ اَنَّکَ لَعَنْتَ کَیْتَ وَکَیْتَ فَقَالَ مَالِیْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وَمَنْ ہُوَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَیْنَ اللَّوْحَیْنِ فَمَا وَجَدْتُّ فِیْہِ مَا تَقُوْلُ قَالَ لَءِنْ کُنْتِ قَرَأْتِیْہِ لَقَدْ وَجَدْتِیْہِ اَمَا قَرَأْتِ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا قَالَتْ بَلٰی قَالَ فَاِنَّہٗ قَدْ نَھٰی عَنْہُ۔) [متفق علیہ]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ سرمہ بھرنے والیوں اور بھروانے والیوں بھنووں (اور رخسار کے بال) اکھیڑنے والیوں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کو باریک بنانے والیوں اور اللہ کی تخلیق کو بدلنے والیوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ ایک عورت عبداللہ بن مسعود (رض) کے پاس آئی اور کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ (رض) نے فلاں فلاں عورت کو ملعون قرار دیا ہے؟ عبداللہ بن مسعود (رض) نے جواب دیا کہ میں کیوں اس پر لعنت نہ کروں جس پر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ کی کتاب میں لعنت کی گئی ہے۔ اس عورت نے کہا 'میں نے دونوں تختیوں کے درمیان (یعنی پورے) قرآن مجید کی تلاوت کی ہے 'مجھے اس میں وہ بات نہیں ملی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ ابن مسعود (رض) نے وضاحت فرمائی کہ اگر تو نے قرآن مجید کی تلاوت کی ہوتی تو اس میں اس حکم کو پالیتی کیا تو نے قرآن مجید میں نہیں پڑھا "تمہیں جو چیز رسول دیں اس پر عمل کرو اور جس بات سے منع کریں اس سے رک جاؤ " (الحشر) اس عورت نے جواب دیا کہ بالکل عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا 'تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان باتوں سے منع فرمایا ہے۔" (فہم)

شان نزول

مذکورہ آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔

پہلا واقعہ: حضرت عبادہ بن صامت (رض) انصاری اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی دونوں زمانہ جاہلیت سے یہود کے قبیلے بنی قینقاع کے حلیف چلے آرہے تھے، اسلام کے ظاہر ہونے کے بعد عبادہ بن صامت نے یہود کی دوستی سے اظہار بیزاری کر دیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ دیا کہ میرے لیے اللہ اور اس کے رسول کی دوستی کافی ہے مگر عبداللہ بن ابی یہود کے ساتھ دوستی قائم رکھنے پر مصر رہا، حضرت عبادہ بن صامت کے ساتھ عبداللہ بن ابی کی اس مسئلہ میں ایک مرتبہ تیز کلامی بھی ہو گئی عبداللہ بن ابی یہود کے ساتھ دوستی قائم رکھنے پر مصر تھا اس کا کہنا تھا کہ اسلام کا ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ہے نہ معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے مشن میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں، اس لیے ضروری ہے کہ یہود کے ساتھ تعلقات و رابط قائم رکھے جائیں تاکہ آڑے وقت میں کام آئیں، اسی واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

دوسرا واقعہ: آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوالبابہ کو بنی قریظہ سے فہاش کرنے کے لیے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، بنو قریظہ سے ابولبابہ کے دیرینہ تعلقات تھے، بنو قریظہ نے ابولبابہ سے معلوم کیا کہ اگر ہم لڑائی موقوف کرکے اپنے قلعہ سے اتر آئیں تو آخر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ حضرت ابولبابہ نے ہاتھ اپنے گلے پر پھیر کر اشارہ کر دیا کہ تمہارا قتل ہوگا، حالانکہ یہ ایک راز داری کی بات تھی جس کا اظہار ابولبابہ کو نہیں کرنا چاہیے تھا، مگر تعلقات اور دوستی کی بنا پر خفیہ راز سے بنو قریظہ کو آگاہ کر دیا، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (جلالین)

کافروں سے دوستانہ تعلقات اور دلی محبت سے خدا تعالیٰ کی نظر میں اسلام کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے۔

مگر یہاں نہ سمجھ لینا چاہیے کہ موالات جس کی کفار کے ساتھ ممانعت ہے اور چیز ہے اور مروت و حسن سلوک اور مصالحت، رواداری، اور عدل و انصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں اور اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح اور عہد و پیمان مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں، رہا عدل و انصاف کا حکم وہ مسلم کافر ہر فرد بشر کے حق میں ہے۔ مروت۔ حسن سلوک، یا رواداری کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلہ میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس لیے یہ چیزیں کفار کے ساتھ جائز ہیں باقی موالات یعنی دوستانہ تعلقات اور برادرانہ مناصرۃ و معاونت اور ایسی گہری دوستی اور خلط ملط جس سے اسلام کے امتیازی نشان گڈمڈ ہو جائیں اور اس کی اجازت نہیں۔

آگے یہ بتلایا اور سمجھایا گیا ہے اگر کسی وقت اور کسی وقت اور کسی جگہ مسلمان اس بنیادی اصول اور قرآنی حکم، ترک موالات، کفار سے ہٹ کر غیر مسلموں سے ایسا خلط ملط اور دوستانہ تعلقات کرلیں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے دین اسلام کو کوئی گزند اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ اسلام دین حق کی حفاظت۔ نگرانی اور بقا کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی ہے، اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا، اگر فرض کرلو کہ کوئی قوم پلٹ جائے اور حدود شرعیہ کو توڑ کر اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو کھڑا کردیں گے جو اسلام کے اصول اور قانون کو قائم کرے گی ۔(درس)

عیسائی کاتب کی وجہ سے حضرت عمر کی ناراضگی

قاضی عیاض کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم دیا کہ آپ نے جو کچھ لیا دیا وایک چمڑے پر (لکھ کر) پیش کیجیے حضرت ابو موسیٰ کا کاتب عیسائی تھا، کاتب نے حساب پیش کیا حضرت عمر نے تعجب کیا اور فرمایا یہ بڑی یاد داشت رکھتا ہے، اچھا ہمارا ایک خط شام سے آیا ہے ت اس کو مسجد میں چل کر پڑھ دو، حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا یہ مسجد میں نہیں جاسکتا، حضرت عمر نے فرمایا کیا یہ جنب ہے، حضرت ابو موسیٰ نے کہا نہیں عیسائی ہے، حضرت ابو موسیٰ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی حضرت عمر نے میرے کچو کا مارا اور میری ران پر ضرب رسید کی اور فرمایا اس کو نکال دو پھر آیت یاایھا الذین امنوا لاتتخذوا الیھود والنصری اولیاء تلاوت فرمائی (اخرجہ ابن ابی حاتم، والبیہقی فی شعب الایمان)

کافر ایک دوسرے کے دوست ہیں

یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض و عداوت کے باوجود باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ یہودی یہودی کا، نصرانی نصرانی کا دوست بن سکتا ہے اور جماعت اسلام کے مقابلہ میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں۔ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ

منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی

یعنی ان ہی کے زمرہ میں شامل ہے۔ یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے باب میں نازل ہوئی تھیں۔ یہود سے اس کا بہت دوستانہ تھا۔ اس کا گمان یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور پیغمبر (علیہ السلام) کی جماعت مغلوب ہو گئی تو یہود سے ہماری یہ دوستی کام آئے گی۔ اسی واقعہ کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تو فی الحقیقت یہود کے ساتھ منافقین کی موالات کا اصلی منشاء یہ تھا کہ یہود جماعت اسلام کے مد مقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن تھے۔

کافروں کا دوست اسلام کا دشمن ہے

ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاری یا کسی جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمن اسلام ہے اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگ احد میں لڑائی کا پانسا بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں گے۔ اس قماش کے لوگوں کی نسبت بھی (وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ) 5۔ المائدہ: 51) کا ظاہری مدلول اعلانیہ صادق ہے۔ رہے وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور منشاء سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں، چونکہ ان کی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں۔ یا کم از کم اور رسوم شعائر کفر اور رسوم شرکیہ سے کارہ اور نفور نہ رہیں۔ اس اعتبار سے فانہ منھم کا اطلاق ان کے حق میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حدیث المرامع من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ان اللہ لا یھدی القوم الظلمین: یعنی جو لوگ کہ دشمنان اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور جماعت اسلام کے مغلوب و مقہور ہونے کا انتظار کر رہے ہیں، ایسی بدبخت، معاند اور دغا باز قوم کی نسبت یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ بھی راہ ہدایت پر آئے گی۔ (گلدستہ)

دعا کیجئے! اللہ ہم کو ان قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق کاملہ نصیب فرمائے۔ یا اللہ ہم کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت اور دلی تعلق نصیب ہو اور کفار و یہود و نصاری سے دلی بغض اور ترک موالات نصیب ہو۔ یا اللہ منافقانہ خصلتوں سے ہمارے قلوب کو پاک رکھیے اور سچا ایمان اور پکا اسلام ہم کو نصیب فرمایئے۔ آمین۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مسائل

۱۔ مومن یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بنائیں۔

۲۔ یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

۳۔ یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے والا انہی میں سمجھا جائے گا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

آیت مبارکہ:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ۭ

لغۃ القرآن: [فَتَرَى: آپ دیکھیں گے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][فِيْ : میں][قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں][مَّرَضٌ: بیماری][يُّسَارِعُوْنَ : وہ جلدی کرتے ہیں][فِيْهِمْ : ان میں][يَقُوْلُوْنَ : وہ کہتے ہیں][نَخْشٰٓى: ہم ڈرتے ہیں][اَنْ : یہ کہ][تُصِيْبَنَا : ہمیں پہنچے][دَآىِٕرَةٌ: کوئی مصیبت][فَعَسَى : سو قریب ہے][اللّٰهُ : اللہ][اَنْ : یہ کہ][يَّاْتِيَ : لے آئے][بِالْفَتْحِ : فتح][اَوْ : یا][اَمْرٍ : کوئی حکم][مِّنْ : سے][عِنْدِهٖ : اس کے پاس][فَيُصْبِحُوْا : پھر وہ ہوجائیں][عَلٰي : پر][مَآ : جو][اَ سَرُّوْا : وہ چھپاتے ہیں][فِيْٓ: میں][اَنْفُسِهِمْ : ان کے نفس][نٰدِمِيْنَ : پچھتانے والے]

ترجمہ: سو آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جن کے دلوں میں (نفاق اور ذہنوں میں غلامی کی) بیماری ہے کہ وہ ان (یہود و نصاریٰ) میں (شامل ہونے کے لئے) دوڑتے ہیں، کہتے ہیں: ہمیں خوف ہے کہ ہم پر کوئی گردش (نہ) آجائے (یعنی ان کے ساتھ ملنے سے شاید ہمیں تحفظ مل جائے)، تو بعید نہیں کہ اللہ (واقعۃً مسلمانوں کی) فتح لے آئے یا اپنی طرف سے کوئی امر (فتح و کامرانی کا نشان بنا کر بھیج دے) تو یہ لوگ اس (منافقانہ سوچ) پر جسے یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں شرمندہ ہو کر رہ جائیں گے۔

تشریح:

شان نزول

عبداللہ بن ابی سلول اور اس کی جماعت کے دوسرے منافقین نجران۔ خیبر اور مدینہ منورہ کے یہودیوں سے خفیہ میل ملاقات رکھتے تھے جب مسلمانوں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ دنیا میں مصیبتیں آیتیں آتی رہتی ہیں ہمارے ان یہودیوں سے پرانے تعلقات ہیں تاکہ

وقت پر کام آئیں اور ہماری مدد کریں۔ مسلمانوں کا کیا اعتبار۔ اسلام کو فروغ ہو یا نہ ہو تم اپنے پرانے تعلقات کیوں ختم کریں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (حسنات)

منافقین کی دلی کیفیت اور ان کے قلبی خوف کو طشت از بام کیا گیا ہے۔

منافقانہ عقیدہ اور کردار کو قرآن مجید ایک مرض قرار دیتا ہے جس میں آدمی کفر و اسلام کے درمیان تذبذب کا شکار رہتے ہوئے ہمیشہ دنیاوی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ یہی حالت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں منافقین کی تھی۔ جب انھیں اس روش سے باز رہنے کی تلقین کی جاتی تو وہ اپنے جذبات کو ان الفاظ میں بیان کرتے کہ ہم فریقین کے ساتھ اس لیے تعلقات رکھے ہوئے ہیں کہ کسی ایک فریق کو شکست ہونے کی صورت میں ہمیں نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دینے کے ساتھ منافقین کو انتباہ کر رہا ہے کہ جس بات سے تم ڈرتے ہو۔ وہ عنقریب ہو کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح سے نوازے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کا دوسرا راستہ کھول دے گا۔ جس میں منافقین کے لیے ندامت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ غزوہ بدر سے لے کر غزوہ تبوک تک منافقوں کو معمولی فائدہ پہنچنے کے سوا ہر قدم پر ندامت اور خفت اٹھانا پڑی آخرت میں ان کے لیے ذلت اور نقصان کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں منافقین کی عادات کا ذکر ہوا۔ جس میں ہم نے لکھا ہے کہ منافق کا لفظ نفق سے نکلا ہے جس کا معنی ہے کہ چوہے کی ایسی بل جسکے دو منہ ہوں، اگر ایک منہ بند کیا جائے تو چوہا دوسری طرف سے نکل جاتا ہے جب تک دونوں بل کے منہ بند نہ کیے جائیں چوہا قابو میں نہیں آسکتا۔ منافق کی یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ جب تک بیک وقت کفار اور مسلمانوں کی طرف سے دھتکارا نہ جائے اسے نقصان نہیں ہوتا۔ منافق اس نقصان سے بچنے کے لیے دونوں فریقوں سے رابطہ رکھتا ہے۔ اس آیت میں ان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن دنیا کا یہ مفاد منافقین کو آخرت کے نقصان سے نہیں بچا سکتا اگر مسلمان منافقین کو سمجھ جائیں اور ان کے ساتھ وہ سلوک کریں جس کے کرنے کا حکم قرآن دیتا ہے تو منافق دنیا میں بھی ذلیل ہو جائیں گے جس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے کے منافق بالآخر رسوا ہوئے تھے۔ (فہم)

پہلے تو یہ عام حکم دیا کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ ایسے گہرے یارانے نہ گانٹھو ورنہ تمہارا شمار انھیں میں سے ہوگا۔ اب منافقین کے ایک خاص گروہ کی روش کو بے نقاب کیا جا رہا ہے جو دونوں کشتیوں میں بیک وقت سوار رہنے کے لیے کوشاں تھے۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وہ دل سے تو ایمان لائے ہوئے نہ تھے تاکہ وہ اپنی قسمت کو کلیۃ اسلام کے ساتھ وابستہ کر دیتے اور مشکلات اور نتائج کی پرواکئے بغیر اسلام کو غالب و منصور کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتے۔ وہ تو مصلحت کے پرستار تھے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام اور کفر میں کشمکش شروع ہے ہو سکتا ہے مسلماوں کا پلہ بھاری رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفر کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ ان غیر یقینی حالات میں ان کی عقل مصلحت بین کا فیصلہ یہی تھا کہ کسی ایک فریق کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دینا نادانی بلکہ دیوانگی ہے۔ اس لیے تم مسلمانوں سے بھی راہ و رسم رکھو اور کفار کے ساتھ بھی تمہارے تعلقات دوستانہ رہیں۔ اگر مسلمان کو شکست ہو (جس کے وہ دل سے خواہاں تھے) تو اس وقت تم بے یار و مددگار ہو کر نہ رہ جاؤ۔ ان کی اس غلط اندیشی پر انھیں سرزنش ہو رہی ہے کہ تم کس ادھیڑ بن میں ہو۔ اللہ تعالیٰ تو عنقریب اپنے دین کو فتح مبین عطا فرمانے والا ہے اور مسلمانوں کی تقویت اور دین کی اشاعت کے دوسرے وسائل بہم پہنچانے والا ہے۔ اس وقت تمہاری یہ دوغلی پالیسی تمہارے کام نہیں آئے گی۔ دائرۃ گردش زمانہ کو کہتے ہیں۔ نخشی ان تصیبنا دائرۃ کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب مسلمان ان کو ٹوکتے کہ اللہ تعالیٰ کے بار بار منع فرمانے کے باوجود تم

یہود سے قطع تعلق کیوں نہیں کرتے تو وہ منافق ان کو جواب دیتے کہ یہود بڑے متمول اور سرمایہ دار ہیں۔ ہم تو فقط اس لیے ان کے ساتھ راہ ورسم رکھتے ہیں کہ مبادا کہیں قحط پڑ جائے یا کوئی اور ناگہانی مصیبت آجائے تو اس وقت ہم ان سے روپیہ پیسہ یا غلہ وغیرہ کی امداد لے سکیں۔ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ فرمادیا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلبہ دے گا۔ دولت وثروت مسلمانوں کی لونڈی بنے گی۔ یہ یہودی مہاجن اور ساہوکار یہاں سے جلاوطن کردیئے جائیں گے۔ اس وقت حسرت وندامت کے بغیر تمہارے لیے کوئی چارہ کار نہ رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ابھی سے اسلام کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔ اور اس کے دشمنوں سے اپنے تعلقات منقطع کرلو۔ (ضیاء وصراط)

منافق کی نشانیاں

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ زَادَ مُسْلِمٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اءْتُمِنَ خَانَ) (رواہ مسلم : باب خصائل المنافق)

”حضرت ابوہریرہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ذکر کرتے ہیں منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ 1 جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے 2 جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے 3 جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔ (متفق علیہ) مسلم شریف میں ان الفاظ کا اضافہ ہے ”چاہے روزے رکھتا اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔“ (فہم)

اثرات

شاعر نے کہا:

یردعنك القدر المقدورا ودائرات الدهر ان تدورا :

یعنی گردش زمانہ ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف پھر گئی، ”الفتح “کے معنی میں اختلاف ہے الفتح کا معنی فیصلہ اور حکم بھی ہے، یہ قتادہ (رض) وغیرہ سے مروی ہے، حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ کا فیصلہ آیا تو بنی قریظہ کے جنگ جوؤں کو قتل کردیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید بنا یا گیا اور بنی نضیر کو جلاوطن کیا گیا۔ ابو علی نے کہا: یہ مسلمانوں کو مشرکین کے شہروں کی فتح عطا کرنا ہے، سدی نے کہا: اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ (آیت) ”اوامر من عندہ “سدی نے کہا: اس سے مراد جزیہ ہے حسن نے کہا: منافقین کے امر کا اظہار کرنا اور ان کے نام بتانا اور ان کے قتل کا حکم دینا مراد ہے، بعض علماء نے فرمایا: شادابی اور خوشحالی کا مسلمان کے لے اظہار ہے۔ (آیت) ” فیصبحوا علی مااسروافی انفسھم ندمین “۔ یعنی وہ کفار سے دوستی کرنے پر شرمندہ ہوں گے جو وہ مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھیں گے اور جب وہ موت کو دیکھیں گے اور انھیں عذاب کی بشارت دی جائے گی۔ (قرطبیؒ)

چنانچہ۔۔ فتح مکہ کے علاوہ خیبر وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے قبضہ میں دیدیا۔ (یا کوئی بات) یعنی کوئی حکم یہودیوں کے قتل یا جلاوطن کردینے کے تعلق سے (اپنی طرف سے نازل فرمائے گا، تاکہ ہو جائیں جو اپنے دل میں چھپا رکھا ہے یعن کفر کا غلبہ اور نبی کریم کی نبوت میں شک۔۔ الغرض۔۔ اپنی اس ناقص سوچ پر شرمندہ اور کھسیانے، نیز۔۔ اپنے کرتوتوں پر پچھتانے والے۔

۔۔ چنانچہ ۔۔ وہ وقت آ ہی گیا کہ خود منافقین نے مشاہدہ کر لیا کہ اب ان کی امیدیں بے کار ہو گئیں اور ان کے عزائم کی پختگی ختم ہو گئی اور جن باتوں کی انھیں امید تھی ان کے متعلق معاملہ برعکس ہو گیا جن امور کے لیے وہ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے وہ بہتر صورت پورا نہ ہو سکا۔ (اشرفی) دراصل

صدق واخلاص کامیابی کی اصل واساس

سو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ صدق ایمان و یقین کامیابی کا ذریعہ اور کفر و نفاق ہلاکت و تباہی کا باعث ہے۔ والعیاذ باللہ۔ سو ارشاد فرمایا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ لے آئے فتح یا ظاہر فرما دے اور کوئی امر اپنے یہاں سے۔ جیسے ان کفار و مشرکین اور منافقوں کو جلاوطن کر دیا جائے۔ یا ان کے دلوں میں وہ ایسا رعب ڈال دے کہ یہ اہل حق کے مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کے قابل ہی نہ رہیں اور جزیہ دینے کی پیشکش کر دیں۔ یا کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ منافقوں کے دلوں کے یہ پوشیدہ راز آشکارا ہو جائیں اور ان کو مزید ذلت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے۔ والعیاذ باللہ۔ پس صدق ایمان و یقین کامیابی اور فائز المرامی کا ذریعہ و وسیلہ اور کفر و نفاق ہلاکت و تباہی کا باعث ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بہر کیف ارشاد فرمایا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کر دے جس سے کفار و مشرکین اور یہود بے بہبود اور ان کے اعوان و انصار ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ مکہ کے کفار و مشرکین مغلوب ہو گئے اور مدینے کے یہودی ذلیل و خوار ہوئے اور ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہ رہی۔ سو ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ خواہ مخواہ خوف میں مبتلا ہیں اور دوڑ دوڑ کر ان کفار میں جا گرتے ہیں۔ حالانکہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو عنقریب ہی فتح و کامرانی کی خوشخبری نصیب ہو جائے۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے یہاں سے اور کوئی ایسا امر ظاہر فرما دے جس سے ان کی عزت و عظمت اور شان و شوکت میں اضافہ ہو اور ان کو غلبہ نصیب ہو۔ سو کامیابی صدق و اخلاص اور ایمان و یقین کی راہ میں ہے۔ وباللہ التوفیق ۔۔(مدنی)

مسائل

۱۔ منافق یہود و نصاریٰ سے دوستی کرتے ہیں۔

۲۔ مومنوں کی کامیابی کو منافق برا محسوس کرتے ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

لغۃ القرآن: وَيَقُوْلُ : وہ کہتا ہے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو][اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے][اَهٰٓؤُلَاۗءِ : کیا یہی][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اَقْسَمُوْا : انہوں نے قسمیں کھائیں][بِاللّٰهِ : اللہ کی][جَهْدَ : پختہ][اَيْمَانِهِمْ : ان کی قسمیں][اِنَّهُمْ : بیشک وہ][لَمَعَكُمْ : البتہ تمہارے ساتھ][حَبِطَتْ : ضائع ہوگئے][اَعْمَالُهُمْ : ان کے اعمال][فَاَصْبَحُوْا : تو وہ ہوگئے][خٰسِرِيْنَ : نقصان پانے والے]

ترجمہ: اور (اس وقت) ایمان والے یہ کہیں گے کیا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے بڑے تاکیدی حلف (کی صورت) میں اللہ کی قسمیں کھائی تھیں کہ بیشک وہ ضرور تمہارے (ہی) ساتھ ہیں، (مگر) ان کے سارے اعمال اکارت گئے، سو وہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے

تشریح:

اس سے پہلی آیت میں مسلمانوں کو کامیاب ہونے کی خوشخبری سنانے کے ساتھ اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ مسلمان کامیاب اور منافق اپنی سازشوں اور شرارتوں پر نادم ہوں گے اور اس وقت مسلمان انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہیں گے کیا یہی وہ لوگ تھے جو قسمیں اٹھا اٹھا کر ہمیں یقین دہانی کرایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی منافقوں کو شرمندہ کیا اور آخرت میں جب منافق جہنم میں داخل کیے جائیں گے تو مومن ان سے یہ پوچھیں گے کیا تم وہی لوگ ہو جو دنیا میں حلف اٹھا اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ ہم بھی ایماندار اور تمہارے ساتھی ہیں۔ دنیا میں منافقوں کو شرمندگی اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں ذلت سے دوچار ہوں گے۔ ان کے تمام اعمال بے فائدہ اور غارت ہو جائیں گے اعمال کی قبولیت کا دارومدار اخلاص پر ہے۔ منافق اخلاص سے تہی دامن ہوتا ہے جس وجہ سے نہ

صرف آخرت میں یہ لوگ نقصان اٹھائیں گے بلکہ دنیا میں بھی ان کی منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ ان کی حالت اس جانور کی ہو گی جس کے بارے میں محاورہ زبان زد عام ہے کہ نہ گھر کا اور نہ گھاٹ کا، منافق ایسی صورت حال سے دوچار ہوا کرتا ہے۔

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيرُ إِلَى هٰذِهِ مَرَّةً وَإِلَى هٰذِهِ مَرَّةً) [رواہ مسلم: کتاب صفات المنافقین واحکامھم]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق کی مثال دو ریوڑوں کے درمیان بکرے کی تلاش میں پھرنے والی بکری کی طرح ہے۔ ایک مرتبہ اس جانب جاتی اور دوسری مرتبہ دوسری جانب جاتی ہے۔" (فہم)

منافق کے تمام اعمال صالح ضائع ہو جاتے ہیں

مسلمانوں کو ان کے سابقہ طرز عمل پر انتہائی تعجب ہو رہا تھا کہ وہ کس طرح بڑھ بڑھ کر اپنی وفاداری اور اخلاص کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ نمازوں میں شریک ہوتے 'زکوتیں دیتے 'جہاد کا اعلان ہوتا تو بڑھ چڑھ کر بہادری اور سرفروشی کی باتیں کرتے۔ اب جو ان کا اصل چہرہ مسلمانوں کے سامنے آیا تو انھیں حیرت اور تعجب ہی ہو سکتا تھا۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ کوئی گروہ اس طرح دو چہروں کے ساتھ بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن منافقین کی مشکل یہ تھی کہ اگر وہ یہ اسلامی زندگی اختیار نہ کرتے تو اسلامی معاشرے میں ان کے لیے رہنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ معاشرہ ہماری طرح کا معاشرہ نہیں تھا کہ جس میں صرف اسلام کا نام لینے سے کام چل سکتا ہو۔ اس معاشرے میں تو ہر آدمی کی شناخت اس کے کردار اور عمل سے ہوتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ نماز کے وقت میں کوئی آدمی نماز نہ پڑھتا اور اذان کے ہو جانے کے بعد کوئی شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور اگر ایسا عمل کسی سے ظہور پذیر ہوتا تو صحابہ (رض) یا تو اسے بیمار سمجھ کر اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے اور اگر معلوم ہوتا کہ وہ صحت مند آدمی ہے تو پھر یہ گمان ہونے لگتا کہ یہ شخص منافق ہے۔ اس لیے منافقین کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھنا ایک مجبوری تھی اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب تھے۔ اب جب ان کے چہرے سے پردہ ہٹا تو مسلمانوں کو ان پر یقیناً تعجب ہونا چاہیے تھا 'سو ہوا۔ لیکن ان کے وہ اعمال خیر 'جو وہ مسلمانوں کے ساتھ دکھاوے کے لیے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ اعمال ان کے ڈھے گئے اور ضائع ہو گئے کیونکہ کوئی عمل بھی ایمان اور اخلاص کے بغیر اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے یہاں عمل کی صورت کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت بھی دیکھی جاتی ہے۔ جب تک یہ دونوں بہم نہ ہوں قبولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ وہ لوگ نامراد ہو گئے۔ یہ اصلاً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ یعنی منافقین اسلام کے بارے میں محض اس لیے یکسو نہیں ہو رہے تھے کہ انھیں کفر کے غلبے کی صورت میں نقصان اٹھانے اور نامراد ہونے کا اندیشہ تھا۔ پروردگار ان سے یہ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! تمہیں جس نامرادی کا ڈر تھا اور جس نقصان سے تم خوف زدہ تھے 'اس نقصان سے تم دوچار تو ضرور ہوئے ہو لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو تم سمجھتے تھے بلکہ اس کا سبب تمہارا نفاق ہے جس نے تمہیں اسلام سے دور رکھا اور تم کفر کی پناہ کو آخری پناہ سمجھتے رہے۔ اب جب کہ اللہ نے اسلام کو غلبہ دیا ہے تو تمہارے لیے اس انجام کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اس طرح منافقین کو آنے والے دنوں میں جو صورت حال پیدا ہونے والی تھی 'اس کا آئینہ دکھا کر انھیں جھنجھوڑا گیا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو اور اپنی دنیا اور آخرت کی حفاظت کی کوشش کرو 'ورنہ یہ روش تمہیں ارتداد تک لے جائے گی کیونکہ نظریہ حیات کے بارے میں یکسو نہ ہونا اور نظریہ حیات کے دشمنوں سے پینگیں بڑھانا 'یہ اسلام سے تعلق کی علامت نہیں بلکہ اسلام سے دشمنی کے مترادف ہے اور تم اسی راستے پر بڑھتے جا رہے ہو۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری اس روش سے شاید اسلام کو کوئی نقصان پہنچے گا 'یہ تمہارا خیال خام ہے۔ اس سے اسلام کو تو کیا نقصان پہنچے گا 'البتہ تمہاری دنیا اور آخرت تباہ ہو جائے گی۔ (روح)

یہیں سے یہ سبق ملتا ہے کہ حقیقی اور لازوال دولت صرف حق کے لیے ہے اور باطل کے لیے تو صرف ظاہری صولت اور محض زبانی جمع خرچی ہے جو بعد کو مٹ جاتی ہے اور ایسی فنا ہوتی ہے کہ جس کا نشان تک باقی نہیں رہتا، مومن پر لازم ہے کہ وہ باطل کی طرف بالکل نہ جھکے، چاہے وہ کتنا ہی اچھا نظر آئے۔

ذہن نشین رہے کہ منافقین کا یہود و نصاری سے میل ملاپ ان کی اسلام کو مٹانے کی مشترکہ درپردہ کوششیں اور دین اسلام کو ختم کر دینے کے سارے حربے ہرگز ہرگز دین اسلام مٹا نہ سکیں گے بلکہ اس کے فروغ وارتقاء کو بھی روک نہ سکیں گے۔ اس موقع پر قران کریم کی زبانی یہ غیب کی خبر بھی سن لو کہ اگر۔۔ بالفرض، خدانخواستہ کسی دور کے مومنین بھی مرتد ہو جائیں جب بھی اسلام کا آفتاب اقبال جگمگاتا ہی رہے گا۔ (اشرفی)

اسلام قائم رہے گا

اس آیت میں اسلام کی ابدی بقا اور حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے پچھلی آیات میں کفار کے موالات سے منع کیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم موالات کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے۔ جیسا کہ (وَمَنۡ يَتَوَلَّهُمۡ مِّنكُمۡ فَإِنَّهُۥ مِنۡهُمۡ) میں تنبیہ کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی سے آگاہ کر دیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے، اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا ان کے مقابلہ پر ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا ان سے محبت کرے وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں غالب اور زبردست ہوں گے یہ پیشین گوئی بحول اللہ و قوتہ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی۔ (گلدستہ)

سب سے پہلے فتنہ ارتداد کا انسداد

ارتداد کا فتنہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد صدیق اکبر کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے۔ مگر صدیق اکبر کی ایمانی جرات اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمات اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کر کے از سر نو اخلاص و ایمان کے راستہ پر گامزن کر دیا۔

آج کی صورتحال

آج بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع افراد اسلام کے حلقہ سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کرلیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے خدا ایسے وفادار اور جاں نثار مسلمانوں کو کھڑا کردیتا ہے جنہیں خدا کے راستہ میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پروا نہیں ہوتی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی قوم

روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف اشارہ کرکے فرمایا وہ اس کی قوم ہے۔اب ان کامل ایمان والوں کی صفت بیان ہو رہی ہے کہ یہ اپنے دوستوں یعنی مسلمانوں کے سامنے تو بچھ جانے والے، جھک جانے والے ہوتے ہیں اور کفار کے مقابلہ میں تن جانے والے، ان پر بھاری پڑنے والے اور ان پر تیز ہونے والے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا اشداء علی الکفار رحماء بینھم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفتوں میں ہے کہ آپ خندہ مزاج بھی تھے اور قتال بھی یعنی دوستوں کے سامنے ہنس مکھ خندہ رو اور دشمنان دین کے مقابلہ میں سخت اور جنگجو۔

حبطت اعمالھم فاصبحو خاسرین ان کی ساری کاروائیاں برباد گئیں اور دنیا و دین میں یہ ناکام ہوگئے ' یہ آیت یا مؤمنون کا مقولہ ہے یا اللہ کا مقولہ ہے ' اللہ نے منافقوں کے اعمال کی بربادی اور ان کی نامرادی کی شہادت دی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا من یرتد منھم عن دینہ اے اہل ایمان! تم میں سے جو اپنے دین اسلام

سے (کفر کی جانب) پھر جائے گا ' حسن بصری نے فرمایا اللہ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی وفات کے بعد کچھ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے ' اس لیے اس نے پہلے سے خبر دے دی کہ ایسا ہوگا۔

اللہ کی محبت اور محبوب قوم کونسی ہے

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ تو اللہ آئندہ ایسے لوگ پیدا کردے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ سے محبت ہوگی یعنی مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کے لیے تم میں سے ہی اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کردے گا جو اللہ کے محب بھی ہوں گے اور محبوب بھی۔

اس قوم سے مراد کون سی قوم ہے اس کے متعلق اقوال میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت علی (رض) مراد ہیں۔ حسن ' ضحاک اور قتادہ کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے مرتدوں اور زکوۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے جہاد کیا تھا۔

فتنہ ارتداد کی تفصیل

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی وفات ہوتے ہی سوائے اہل مکہ اور اہل مدینہ اور بحرین کے قبیلہ عبدالقیس کے عام عرب مرتد ہوگئے اور بعض نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا مگر صحابہ کرام نے اس ارادہ کو پسند نہیں کیا حضرت عمر (رض) نے فرمایا (یہ لوگ کلمہ گو ہیں) آپ ان سے کس طرح جہاد کر سکتے ہیں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تو فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم اس وقت تک ہے 'جب تک وہ لا الہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں جو لا الہ الا اللہ کا قائل ہو گیا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا اور اس کا (اندرونی) محاسبہ اللہ کا کام ہے ہاں کسی حق کی وجہ سے (اس کلمہ گو کے جان و مال سے) تعرض کیا جاسکتا ہے 'حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا جو لوگ نماز اور زکوۃ (کی فرضیت) میں فرق پیدا کرتے ہیں خدا کی قسم میں ان سے جہاد کروں گا کیونکہ (جس طرح نماز جسمانی عبادت ہے اسی طرح) زکوۃ مالی فرض ہے 'خدا کی قسم اگر یہ لوگ بکری کا بچہ بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کو دیتے تھے اور مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں اس پر ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ ادائے زکوۃ سے انکار کرنے والوں سے جنگ کرنا صحابہ کو (شروع میں) پسند نہ تھا 'ان کا قول تھا کہ یہ لوگ تو اہل قبلہ ہیں اور اہل قبلہ سے جہاد نہیں کیا جاسکتا لیکن جب ابو بکرؓ گردن میں تلوار لٹکائے تنہا ہی نکل کھڑے ہوئے تو صحابہ کو بھی نکلے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے ہم کو شروع میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا لیکن آخر میں ہم نے آپ کے خیال کی تعریف کی 'ابو بکر بن عیاش کا بیان ہے میں نے ابو حفص کو یہ کہتے سنا کہ انبیاء کے بعد حضرت ابو بکر سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد آپ ہی مرتدوں سے جنگ کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

(أَلَا إِنِّي أَبْرَأُ إِلَى كُلِّ خَلِيلٍ مِنْ خُلَّتِهِ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا، لَاتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيلًا، إِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللَّهِ" آگاہ رہو! میں ہر خلیل) جگری دوست (کی دلی دوستی سے بری ہوں، اور اگر میں کسی کو خلیل) جگری دوست (بناتا تو ابو بکر کو بناتا، بیشک تمہارا یہ ساتھی اللہ کا خلیل) مخلص دوست ہے"(سنن ابن ماجه/باب فی فضائل اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم/حديث: (93

کے مطابق حضرت ابو بکرؓ معرفت دین میں سب سے افق تھے۔ بات کی غایت کو پہنچ گئے تھے جہاں دوسروں کی رسائی بعد میں ہوئی۔

مرتدوں کے فرقے

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی زندگی ہی میں تین گروہ مرتد ہوگئے تھے (۱) بنی مذحج جن کا سردار 'ذوالحمار 'عبہلہ بن کعب عنسی تھا اس کا لقب اسود تھا یہ ایک شعبہ باز کاہن تھا یمن میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بلاد یمن پر قابض ہو گیا تھا اس کے بارے فرمایا

أَخْبَرَنِي أَبُو هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: بَيْنَمَا أَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُ فِي يَدَيَّ سِوَارَيْنِ مِنْ ذَهَبٍ فَأَهَمَّنِي شَأْنُهُمَا، فَأُوحِيَ إِلَيَّ فِي الْمَنَامِ أَنِ انْفُخْهُمَا، فَنَفَخْتُهُمَا فَطَارَا، فَأَوَّلْتُهُمَا كَذَّابَيْنِ يَخْرُجَانِ بَعْدِي فَكَانَ أَحَدُهُمَا الْعَنْسِيَّ، وَالآخَرُ مُسَيْلِمَةَ الْكَذَّابَ صَاحِبَ الْيَمَامَةِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ”میں سویا ہوا تھا کہ میں نے (خواب میں) سونے کے دو کنگن اپنے ہاتھوں میں دیکھے۔ مجھے اس خواب سے بہت فکر ہوا، پھر خواب میں ہی وحی کے ذریعہ مجھے بتلایا گیا کہ میں ان پر پھونک ماروں۔ چنانچہ جب میں نے پھونک ماری تو وہ دونوں اڑ گئے۔ میں نے اس سے یہ تعبیر لی کہ میرے بعد جھوٹے نبی ہوں گے۔“ پس ان میں سے ایک تو اسود عنسی ہے اور دوسرا یمامہ کا مسیلمہ کذاب تھا۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۶۲۱)

حضرت سیدنا محمد الرسول اللہ ﷺ کی حجۃ الوداع سے واپسی کے علالت کا دور شروع ہوا اسی زمانے میں یمن کے علاقے میں قبیلۂ عنس کے ایک شخص عبہلہ بن کعب نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ شخص مزاجاً نرم اور شیریں گفتگو والا تھا لیکن کریہہ صورت اور کالی رنگت کا تھا اسی وجہ اسے اسود کہا گیا یعنی کالا۔ اس کے لقب کے متعلق، ذوالخمار (اوڑھنی والا) یا ذوالحمار (گدھے والا) تحریر ہے، وجہ یہ ہے کہ کریہہ صورت ہونے کے سبب وہ اوڑھنی کا نقاب لگاتا تھا اور اس کے پاس سدھایا ہوا ایک گدھا بھی تھا جو اس کے اشارے پر رکوع و سجود کرتا تھا۔ اسود عنسی شعبدے اور کہانت میں بھی ماہر تھا جس کی وجہ سے اسے دعوائے نبوت کو ثابت کرنے میں مدد ملی۔ شعبدے اور کہانت کے زور پر لوگوں کو اپنی جھوٹی نبوت کا معتقد بنا کر اس نے باضابطہ یمن کے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور بلا شرکت غیرے، (مصلحت خداوندی سے) پورے یمن کا حاکم بن گیا۔ حکومت اور اقتدار ملتے ہی اس کے کلام کی شیرینی ختم ہو گئی اور عجز وانکسار کی جگہ غرور اور تکبر نے لے لیا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ بن جبل (گورنر یمن) اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو لکھا کہ لوگوں کو مضبوطی کے ساتھ دین پر قائم رہنے کی ترغیب دیتے رہیں اور اسود سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ' چنانچہ فیروز دیلمی نے (گھر میں گھس کر) اسود کو اس کے بستر پر ہی قتل کر دیا۔ حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ قتل کی رات کو ہی آسمان سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اسود کے قتل ہونے کی خبر مل گئی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمادیا کہ آج رات اسود کو قتل کر دیا گیا اور مبارک شخص نے اس کو قتل کیا ہے عرض کیا گیا وہ کون ہے فرمایا فیروز 'فیروز کامیاب ہو گیا۔ اس بشارت کو سنانے کے دوسرے روز حضور ﷺ کی وفات ہو گئی اور مدینہ میں اسود کے قتل کی خبر (باضابطہ) ماہ ربیع الاوّل کے آخر میں پہنچی جبکہ اسامہ (رض) جہاد کے لیے جا چکے تھے سب سے اول حضرت ابو بکرؓ کے پاس اسی فتح کی اطلاع آئی۔

(۲) بنی حنیفہ جن کا سردار مسیلمہ کذاب تھا 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں ہی ۱۰ھ کے آخر میں اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا 'اس کا خیال تھا کہ محمد ﷺ کے ساتھ مجھے بھی نبوت میں شریک کر دیا گیا ہے چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی خدمت میں اس نے مندرجہ ذیل خط بھی بھیجا تھا۔ مسیلمہ رسول خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ امابعد 'یہ زمین آدھی میری اور آدھی آپ کی ہے ' یہ خط دو آدمیوں کے ہاتھ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں بھیجا 'حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قاصدوں سے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا حکم نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا 'پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب لکھوایا۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ امابعد 'ساری زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بناتا ہے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہوتا ہے۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیمار ہو گئے اور آپ

کی وفات ہو گئی تو ابو بکر (رض) نے کثیر لشکر کے ساتھ خالد بن ولید کو مسیلمہ سے لڑنے بھیجا۔ آخر مطعم بن عدی کے غلام وحشی کے ہاتھوں سے مسیلمہ مارا گیا وحشی وہی شخص تھا جس نے حمزہ بن عبد المطلب کو شہید کیا تھا اور مسیلمہ کو قتل کرنے کے بعد کہا کرتا تھا میں نے مسلمان ہونے سے پہلے سب سے بہتر آدمی کو شہید کیا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد بدترین آدمی کو قتل کر دیا۔

(۳) بنی اسد ان کا سردار طلیحہ بن خویلد تھا ' یہ مدعیان نبوت میں سب سے آخری شخص تھا جس نے مرتد ہو کر نبوت کا دعویٰ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی ہی میں کر دیا تھا لیکن اس سے جہاد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد کیا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا حضرت خالدؓ نے شدید جنگ کے بعد اس کو شکست دی یہ بھاگ کر شام کو چلا گیا پھر کچھ مدت کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام خلوص کے ساتھ رہا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر (رض) کی خلافت میں بہت لوگ مرتد ہو گئے تھے جن کو ہم سات فرقے کہہ سکتے ہیں۔

۱) بنی فزارہ۔ یہ عیینہ بن حصین کا قبیلہ تھا۔

۲) بنی غطفان۔ یہ قرہ بن سلمہ قشیری کا قبیلہ تھا۔

۳) بنی سلیم۔ یہ فجاۃ بن عبد یالیل کا قبیلہ تھا۔

۴) بنی یربوع۔ یہ مالک بن نویرہ کا کنبہ تھا۔

۵) خاندانِ بنی تمیم کا کچھ حصہ ' یہ قبیلہ شجاج بنت منذر زوجہ مسیلمہ کذاب کا تھا ' شجاج نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا لیکن آخر میں مسلمان ہو گئی تھی۔

۶) بنی کندہ یہ اشعث بن قیس کا خاندان تھا۔

۷) بنی بکر بن وائل یہ بحرین کے باشندے اور حطیم کے قبیلہ والے تھے آخر کار حضرت ابو بکر (رض) کے ہاتھوں اللہ نے ان سب کا کام تمام کرا دیا اور اپنے دین کو فتحیاب کر دیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی استقامت

حضرت عائشہ (رض) : کا بیان ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی وفات ہوتے ہی عرب مرتد ہو گئے اور نفاق ان کے دلوں میں جم گیا اور میرے باپ پر وہ مشکلات پڑیں کہ اگر مضبوط پہاڑوں پر پڑتیں تو ان کا بھی چورہ کر دیتیں۔

حضرت عمر (رض) کی خلافت میں جبلہ بن ایہم کا قبیلہ غسان مرتد ہو گیا تھا یہ ارتداد اس وقت ہوا جب (شاہ غسان) جبلہ بن ایہم سے (ایک غریب آدمی) کا بدلہ لینے کا حضرت عمر (رض) نے حکم دیا تھا اور وہ عیسائی ہو کر ملک شام کو چلا گیا تھا ' بعض علماء کے نزدیک قوم محب و محبوب سے مراد اشعری قبیلہ کے لوگ ہیں۔ عیاض بن غنم کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو موسیٰ اشعری کی طرف اشارہ کر کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کی قوم والے ' رواہ ابن جریر فی السنن والطبرانی والحاکم ' اشعری قبیلہ کے لوگ یمن کے باشندہ تھے۔

یمن والوں کا بیان

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے پاس یمن والے آئے ہیں جن کے دل بڑے کمزور اور نرم ہیں۔ ایمان (تو) یمن کا ہے اور حکمت (بھی) یمن کی ہے متفق علیہ 'کلبی نے کہا یہ یمن کے مختلف قبائل والے تھے 'قبیلہ نخع کے دو ہزار افراد بنی کندہ اور بجیلہ کے پانچ ہزار اور مختلف قبائل کے تین ہزار 'ان سب نے حضرت عمر (رض) کی خلافت میں قادسیہ کی جنگ میں اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اعزۃ علی الکافرین کافروں کے مقابلہ میں طاقتور۔ یعنی کافروں کے مقابلہ میں طاقتور ہیں 'عاجزی و کمزوری ظاہر نہیں کرتے۔
حضرت ابو موسیٰ اشعری کا بیان ہے میں نے رسول اللہ کے پاس آیت **فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ** پڑھی تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ لوگ اہل یمن میں سے ہیں اور اہل یمن میں سے بھی بنی کندہ میں سے اور بنی کندہ میں سے بھی قبیلہ سکون میں سے اور سکون میں سے قبیلہ نجیب میں سے۔
قاسم بن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے مرحبا کہا پھر آیت **من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی** الخ تلاوت کی پھر میرے مونڈھے پر ہاتھ مار کر تین بار فرمایا میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اے اہل یمن وہ محب محبوب قوم تم میں سے ہوگی اخرجہ البخاری فی تاریخہ۔ میں کہتا ہوں حضرت ابوبکرؓ کے لشکر نے اہل یمن کی مدد سے مرتدوں سے جہاد کیا تھا (لہٰذا دونوں روایتیں صحیح ہیں)

مومنوں اور منافقوں کا موازنہ

یجاھدون فی سبیل اللہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔
ولا یخافون لومۃ لآئم اور (اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے میں) کسی برا کہنے والے کے برا کہنے سے
خوف زدہ نہیں ہوں گے (کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے) یہ یجاہدون کی ضمیر سے حال ہے 'اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ کافروں کی ملامت کا اندیشہ کئے بغیر جہاد کریں گے 'منافقوں کی حالت اس کے خلاف تھی۔ وہ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ یا تو مال غنیمت کی طمع میں نکلتے تھے یا اس خیال سے نکلتے تھے کہ نہ نکلنے کی صورت میں ان کے نفاق کا اظہار ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھ یہودی دوستوں کے برا کہنے کا اندیشہ لگا رہتا تھا اس لیے کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جس پر یہودی ان کو آئندہ ملامت کر سکیں 'یا **لا یخافون** کا عطف **یجاھدون** پر ہے یعنی ان کے اندر دو وصف پائے جاتے ہیں ایک تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں دوسرے دین میں بڑے ٹھوس ہیں دینی کام میں ان کو کسی کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں 'حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیعت ان شرطوں پر کی کہ حکم سنیں گے اور مانیں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اللہ کے معاملہ میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں کریں گے 'متفق علیہ۔
لومۃ ایک بار ملامت کرنا۔ دونوں کو نکرہ لانے سے اس طرح اشارہ ہے کہ کسی ملامت گر کی کسی

ایک ملامت کی بھی ان کو پروانہ ہوگی۔

تین مسجدوں والے

قتادہ نے بیان کیا اللہ کو معلوم تھا کہ آئندہ کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے۔ اس لیے اس آیت میں اس نے اطلاع دی، چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات ہوتے ہی عام عرب اسلام سے پھر گئے صرف تین مسجدوں والے مرتد نہیں ہوئے مدینہ والے مکہ والے اور جواثا والے قبیلہ عبدالقیس کے لوگ۔

مرتدوں اور منکروں کے خلاف حضرت ابو بکر کا شرح صدر

مرتدوں نے کہا ہم نماز پڑھیں گے زکوۃ نہیں دیں گے ہمارا مال چھینا نہیں جا سکتا۔ حضرت ابو بکرؓ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی گئی کہ اس وقت آپ چشم پوشی کریں اور عرض کیا گیا کہ آئندہ جب ان میں دینی سمجھ آجائیگی تو زکوۃ دیدیں گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ نے جمع کیا میں ان میں تفریق نہیں کروں گا اگر اللہ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ ایک رسی کے دینے سے بھی یہ انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا چنانچہ اللہ نے آپ کے ساتھ بھی کچھ جماعتیں کر دیں یہاں تک کہ مرتدوں سے جنگ ہوئی ان کو قتل کیا گیا آخر ماعون یعنی زکوۃ ادا کرنے کا انھوں نے اقرار کیا۔

صرف حضرت ابو بکر (رض) کے زمانہ میں مرتدوں سے جہاد کیا گیا صحابہ کی رائے شروع میں اس کے خلاف تھی اور حضرت ابو بکرؓ کے خلاف انھوں نے ناگواری کا اظہار بھی کیا تھا لیکن آپ نے کسی کی ناگواری کی پروا نہیں کی۔ آخر صحابہ نے بھی آپ کی رائے کی تعریف کی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے قلب کو اس جہاد کے لیے مضبوط فرمادیا اور آپ (رض) نے ایک ایسا بلیغ خطبہ صحابہ کرام کے سامنے دیا کہ اس جہاد کے لیے ان کا بھی شرح صدر ہو گیا۔ اس خطبہ میں اپنے پورے عزم واستقلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ :

جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دیئے ہوئے احکام اور قانون اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرے مقابلہ پر تمام جن وانس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں، اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو، تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا۔

اور یہ فرما کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلنے لگے، اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبر (رض) کو اپنی جگہ بٹھلا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا۔ اسی لیے حضرت علی مرتضیٰ (رض)، حسن بصری (رح)، ضحاک (رح) قتادہ وغیرہ جمہور ائمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق (رض) اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آئی ہے وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے۔ جن کے من جانب اللہ میدان عمل میں لائے جانے کا آیت مذکورہ میں ارشاد ہے۔

بہر حال صحابہ کرام (رض) کی ایک جماعت حضرت صدیق اکبر (رض) کے زیر ہدایت اس فتنہ ارتداد کے مقابلہ کے لیے کھڑی ہو گئی۔ حضرت خالد بن ولید (رض) کو ایک بڑا لشکر دے کر مسیلمہ کذاب کے مقابلہ پر یمامہ کی طرف روانہ کیا۔

وہاں مسیلمہ کذاب کی جماعت نے اچھی خاصی طاقت پکڑ لی تھی۔ سخت معرکے ہوئے، بالآخر مسیملہ کذاب حضرت وحشی (رض) کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی جماعت تائب ہو کر پھر مسلمانوں میں مل گئی۔ اسی طرح طلیحہ بن خویلد کے مقابلہ پر بھی حضرت خالد (رض) ہی تشریف لے گئے۔ وہ فرار ہو کر کہیں باہر چلا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خود بخود ہی اسلام کی دوبارہ توفیق بخشی اور مسلمان ہو کر لوٹ آئے۔
خلافت صدیقی کے پہلے مہینہ ربیع الاول کے آخر میں اسود عنسی کے قتل اور اس کی قوم کے مطیع و فرمان بردار ہو جانے کی خبر پہنچ گئی اور یہی خبر سب سے پہلی فتح کی خبر تھی جو حضرت صدیق اکبر (رض) کو ان حالات میں پہنچی تھی۔ اسی طرح دوسرے قبائل مانعین زکوۃ کے مقابلہ میں بھی ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو فتح مبین نصیب فرمائی۔

روافض کی تردید

پس جب صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقاء کا خاصان خدا ہونا یعنی اللہ کا محب اور محبوب ہونا ثابت ہو گیا تو پھر ان کی خلافت کے حق ہونے میں کیا شبہ رہا یہ امر تاریخ سے اور شیعہ اور سنی روایت سے بالاتفاق ثابت ہے کہ حضور پر نور کی وفات کے قریب ہی کچھ لوگ مرتد ہونا شروع ہو گئے تھے اور آپ کی وفات کے عبد جب صدیق اکبرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ آگ اور تیز ہو گئی اور یہ امر بھی بالاتفاق ثابت ہے کہ سوائے ابو بکرؓ کے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کے کسی نے مرتدین سے قتال و جہاد نہیں کیا
اس آیت کو حضرت علیؓ کی لڑائیوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ان کی لڑائی مرتدین اسلام سے نہ تھی بلکہ اپنے باغی بھائیوں سے تھی جیسا کہ خود حضرت علیؓ کا ارشاد ہے، ھولاء اخواننا قدبغوا علینا۔ جن لوگوں سے حضرت علیؓ نے قتال کیا وہ اسلام سے مرتد نہ تھے بلکہ حضرت علیؓ کی خلافت اور امارت سے باغی تھے اور کسی کی امارت نہ تسلیم کرنے سے اسلام سے مرتد نہیں ہوتا معاذ اللہ اگر حضرت معاویہؓ روافض کے زعم کے مطابق مرتد تھے تو حضرت امام حسن (رض) نے باوجود قوت و شوکت کے ان سے صلح کیسے کی ان کے حق میں خلافت کے حق سے کیسے دستبر دار ہوئے کیا مرتد کی خلافت اور اطاعت پر صلح کرنا جائز ہے معلوم ہوا کہ امام حسنؓ کے نزدیک حضرت معاویہؓ مسلمان تھے مرتد نہ تھے بلکہ خلافت اور امارت کے اہل تھے اور امام حسنؓ حضرات شیعہ کے نزدیک امام معصوم اور مفترض الاطاعت ہیں
علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ عرب کے گیارہ فرقے مرتد ہوئے تین قبیلے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخیر زمانہ میں مرتد ہو گئے اور ہر قبیلہ میں سے ایک ایک شخص دعوائے نبوت کرتا ہوا اٹھا اور اس کے قوم کے لوگوں نے اس کی تصدیق کی اور فساد عظیم برپا کیا۔
مارشل لاء:
مارشل لا حکومت کے مرتدین کے لیے ہے۔ مارشل لاء کا قانون حکومت سے مرتد ہونے والوں کے لیے ہے اور تمام مغربی قومیں اس کے جواز پر متفق ہیں لیکن شریعت الٰہیہ کے مرتدین کے لیے سزائے قتل کے نام سے ناک منہ چڑھاتے ہیں
چند سال ہوئے کہ پاکستان میں مارشل لاء کی عدالت سے یہ حکم جاری ہوا کہ مارشل لاء کے احکام پر کسی کو تبصرہ کرنے کی اجازت نہ ہو گی تو اس ناچیز کی زبان سے دو شعر نکلے۔

مار شل لا چہ بود اے ار جمند، چشم بند و گوش بند ولب بہ بند۔
حکم فانی را چو شد ایں حر متی، حکم باقی را بداں چوں ر فعتے۔

مرتد کی سزا

(1)۔ حدیث میں ہے من بدل دینہ فاقتلوہ رواہ البخاری وابوداود والدار قطنی عن ابن عباس۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دین اسلام کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اس کو قتل کر ڈالو یہ حدیث مشہور ہے اور اس حدیث کے علاوہ دیگر احادیث صحیحہ میں اسی طرح آیا ہے کہ جو شخص مرتد ہو جائے وہ قابل گردن زنی ہے خواہ وہ بر سر پیکار ہو یا نہ ہو مرتد ارتداد کی وجہ سے واجب القتل ہے نہ کہ بر سر پیکار ہونے کی وجہ سے۔

(2)۔ ابو موسی اشعری نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے والی یمن تھے ایک مرتبہ ان کی ملاقات کے لیے معاذ بن جبل ان کے پاس گئے دیکھا کہ ان کے پاس ایک مرتد شخص قید کرکے لائے گئے معاذؓ بن جبل نے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے معلوم ہوا کہ یہ مرتد ہے اسلام کو چھوڑ کر یہودی بن گیا اس پر معاذؓ بن جبل نے فرمایا لا اجل حتی یقتل قضاء اللہ ورسولہ ثلاث مرات فامر بہ فاقتل (بخاری ومسلم وابوداود والنسائی واحمد)۔ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک اس کو قتل نہ کیا جائے جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے تین مرتبہ یہی کہا چنانچہ اس کو قتل کر دیا گیا (صحیح بخاری وغیرہ۔

(3)۔ حضرت عثمان غنیؓ جب اپنے گھر میں محصور تھے اور باغی اور مفسد ان کو قتل کرنا چاہتے تھے تو اس وقت عثمان غنی نے دیوار پر چڑھ کر لوگوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا قتل اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس سے تینوں کاموں سے کوئی کام سرزد نہ ہو جائے وہ تینوں کام یہ ہیں، زنا بعد احصان، و کفر بعد الاسلام، وقتل النفس بغیر حق۔ (شادی کے بعد زنا کرنا، اور اسلام کے بعد کافر اور مرتد ہو جانا اور کسی کو ناحق قتل کر دینا۔ نسائی وترمذی وابن ماجہ)۔

(4)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسی ہی ایک جماعت کے متعلق یہ ارشاد فرمایا اینما لقیتموھم فاقتلوھم فان فی قتلھم اجر المن قتلھم یوم القیامۃ۔ بخاری ومسلم وغیرہما۔ یعنی ان کو مرتدین کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اس لیے کہ ان کے قتل میں قیامت کے دن بڑا یہ اجر عظیم ملے گا حضرت علی کرم اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مرتدین اور زنادقہ کو آگ میں جلایا کرتے تھے دیکھو صحیح بخاری۔

(5)۔ قبیلہ عرینہ کے کچھ افراد خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوئے اور بعد میں مرتد ہو گئے آپ ﷺ نے ان سب کے قتل کا حکم جاری کر دیا یہ روایت بخاری اور مسلم اور دیگر کتب صحاح میں مذکور اور مشہور ہے۔

بڑی سعادت

انسان کی بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کبریٰ اور فضل عظیم سے حصہ وافر عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے۔ اور وہی خوب جانتا ہے کہ کونسا بندہ اس کا اہل اور مستحق ہے۔ (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

لغۃ القرآن: [يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][مَنْ : وہ جو][يَّرْتَدَّ : پھر جائے][مِنْكُمْ : تم سے][عَنْ : سے][دِيْنِهٖ : اپنے دین][فَسَوْفَ : سو عنقریب][يَاْتِي : لے آئے گا][اللّٰهُ : اللہ][بِقَوْمٍ : ایسے لوگ][يُّحِبُّهُمْ : وہ ان سے محبت کرتا ہے][وَيُحِبُّوْنَهٗٓ: اور وہ اس سے محبت کریں گے][اَذِلَّةٍ : نرم][عَلَي : پر][الْمُؤْمِنِيْنَ : مومنوں][اَعِزَّةٍ : سخت][عَلَي : پر][الْكٰفِرِيْنَ : کفار][يُجَاهِدُوْنَ : وہ جہاد کرتے ہیں][فِيْ : میں][سَبِيْلِ : راستہ][اللّٰهِ : اللہ][وَلَا : اور نہیں][يَخَافُوْنَ : وہ ڈرتے][لَوْمَةَ : ملامت][لَآئِمٍ: ملامت کرنے والا] ذٰلِكَ : وہ][فَضْلُ : فضل ہے][اللّٰهِ : اللہ کا][يُؤْتِيْهِ : وہ دیتا ہے][مَنْ يَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][وَاسِعٌ: کشائش والا][عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے]

ترجمہ:

اے ایمان والو ! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ (ان کی جگہ) ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ (خود) محبت فرماتا ہو گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے وہ مومنوں پر نرم (اور) کافروں پر سخت ہوں گے اللہ کی راہ میں (خوب) جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ یہ (انقلابی کردار) اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ وسعت والا (ہے) خوب جاننے والا ہے۔

تشریح:

اس آیت کریمہ میں مخلص مسلمانوں کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ تمہاری صفوں میں چھپے ہوئے منافق اگر اعلانیہ کفر اختیار کرلیں تو بھی اسلام کا چراغ روشن رہے گا۔ ان کی جگہ ان سے بہتر، ذہین، فہیم اور مخلص لوگ اسلام کو قبول کریں گے اور اس کی عظمت کو چار چاند لگادیں گے۔ نیز اس آیت میں ایک بہت بڑے واقعہ کے متعلق پیشین گوئی بھی کی گئی ہے کہ بعض بدنصیب اس دین سے برگشتہ ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اسلام کو ایسے جانباز سپاہی اور جواں ہمت مجاہد عطا فرمائے گا جو ان مرتدین کا قلع قمع کرکے مملکت اسلامیہ کی بنیادوں کو ایسا مضبوط اور مستحکم بنادیں گے کہ پھر صدیوں تک اس میں لچک پیدا نہ ہو گی۔ چنانچہ قرآن نے جو فرمایا وہ ہو کر رہا۔ (ضیاء)

اس آیت مبارکہ میں یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ کفار کا مسلمانوں کے خلاف یہ بھی ایک حربہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو جہاد سے روکنے کے لیے پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مسلمان وحشی اور جنگجو لوگ ہیں۔ اسلام دنیا کے امن کو تباہ کردینے والا مذہب ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ قرآن نے صدیوں پہلے کفار کی جس ملامت کی طرف اشارہ کردیا تھا وہ کس طرح حرف بحرف پوری ہورہی ہے۔ آج پوری دنیا کے کافر جب خود عراق، افغانستان، بوسنیا اور کشمیر پر بم باری کرتے ہیں تو انھیں کوئی شرم نہیں آتی جب مجاہدین دفاع کرتے ہیں تو انھیں تخریب کار اور کیا کیا لقب دیتے ہیں کاش مسلمان سربراہ قرآن کی آواز سنیں اور دشمن کے ایجنٹ کا کردار ادا نہ کریں۔ (فہم)

ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو ! تم میں سے اگر کچھ لوگ مرتد بھی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ صفت بندے پھر بھی موجود ہوں گے اور وہ عظیم صفات کے حامل ہوں گے۔

اس آیت میں ان کی چند صفات بیان فرمائی گئیں

(1)۔۔ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔

(2)۔۔ وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ سے محبت کرتے ہیں۔

(3)۔۔ مسلمانوں کے ساتھ نرمی و شفقت کا سلوک کرنے والے ہیں۔

(4)۔۔ کافروں سے سختی سے پیش آنے والے ہیں۔

(5)۔۔ راہِ خدا کے مجاہد ہیں۔
(6)۔۔ حق بیان کرنے میں کسی کی ملامت کی پروا نہیں کرتے بلکہ حق گو اور حق گوئی میں بیباک ہیں۔
یہ صفات جن حضرات کی ہیں وہ کون ہیں، اس میں کئی اقوال ہیں۔
(1)۔۔ حضرت علی المرتضٰی شیر خدا (رض)، امام حسن بصری اور حضرت قتادہ (رض) نے کہا کہ یہ حضرات سیدنا ابوبکر صدیق (رض) اور ان کے وہ ساتھی ہیں جنہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد مرتد ہونے والوں اور زکوۃ کے منکروں سے جہاد کیا۔
(2)۔۔ حضرت عیاض بن غنم اشعری (رض) سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) کی نسبت فرمایا کہ یہ ان کی قوم ہے۔
(3)۔۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ لوگ اہل یمن ہیں جن کی تعریف بخاری و مسلم کی حدیثوں میں آئی ہے۔
(4)۔۔ مفسر سدی کا قول ہے کہ یہ لوگ انصار ہیں جنہوں نے تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت کی۔ ان تمام اقوال میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ بیان کردہ سب حضرات کا ان صفات کے ساتھ متصف ہونا صحیح ہے۔
(خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۴، ۱/۵۰۴۔۵۰۵) (حسنات، صراط)
اکثر محدثین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو آئندہ ہونے والے کچھ لوگوں کے ارتداد کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے جو ارتداد کے دور میں دین پر پکے اور مرتدین کے خلاف جہاد کریں گے۔
علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۲۸ھ لکھتے ہیں:

مرتدین کے گیارہ فرقے تھے، تین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں تھے

ایک فرقہ بنو مدلج تھا، ان کا رئیس ذوالحمار تھا اور یہی اسود عنسی تھا۔ یہ شخص کاہن تھا، اس نے یمن میں نبوت کا دعوی کیا اور ان شہروں پر غلبہ پالیا، اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض عاملوں کو نکال دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ بن جبل (رض) اور یمن کے سرداروں کے نام خط لکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فیروز دیلمی کے ہاتھوں میں اس کو ہلاک کرادیا، انھوں نے اس کو قتل کردیا۔ جس رات وہ قتل ہوا، اسی رات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے قتل کی خبر مسلمانوں کو دے دی تھی، جس سے مسلمان خوش ہوئے، پھر اس کے دوسرے روز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رفیق اعلی سے واصل ہوگئے، اور وہاں سے اس کی خبر ربیع الاول کے آخر میں پہنچی تھی۔
دوسرا فرقہ بنو حنیفہ ہے۔ یہ مسیلمہ کی قوم تھی، اس نے نبوت کا دعوی کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف مکتوب لکھا " از مسیلمہ رسول اللہ برائے محمد رسول اللہ، بعد ازیں یہ کہنا ہے کہ یہ زمین آدھی آپ کی ہے اور آدھی میری ہے"۔ رسول اللہ نے اس کا جواب دیا، از محمد رسول اللہ برائے مسیلمہ کذاب، بعد ازیں یہ کہنا ہے کہ تمام زمین اللہ کی ملکیت ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس کا

وارث بناتا ہے ‘اور نیک انجام متقین کے لیے ہے”۔ حضرت ابو بکر (رض) نے مسلمانوں کے ساتھ اس سے جنگ کی اور یہ حضرت حمزہ (رض) کے قاتل حضرت وحشی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ حضرت وحشی کہتے تھے میں نے اپنی جاہلیت کے زمانہ میں سب سے نیک شخص کو قتل کیا اور اپنے اسلام کے زمانہ میں سب سے بدتر شخص کو قتل کیا۔

تیسرا فرقہ بنو اسد تھا ‘یہ علیحہ بن خویلد کی قوم تھی ‘اس شخص نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا ‘رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے جنگ کے لیے حضرت خالد بن ولید کو بھیجا ‘یہ شکست کھانے کے بعد شام بھاگ گیا ‘پھر مسلمان ہوگیا اور اس نے نیک عمل کیے۔

حضرت ابو بکر (رض) کے عہد میں مرتدین کے سات فرقے تھے۔

(۱) عینہ بن حصن کی قوم فزارہ۔

(۲) قرہ بن قشیری کی قوم غطفان۔

(۳) فجاءۃ بن عہد یالیل کی قوم بنو سلیم۔

(۴) مالک بن نویرہ کی قوم بنو یربوع۔

(۵) سجاح بنت المنذر۔ یہ وہ عورت تھی جس نے نبوت کا دعوی کیا اور مسیلمہ کذاب سے نکاح کیا اور اس کی قوم تمیم کے بعض لوگ۔

(٦) اشعث بن قیس کی قوم کندہ۔

(۷) حطیم بن زید کی قوم بنو بکر بن وائل ‘یہ بحرین میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر (رض) کے ہاتھوں ان ساتوں مرتد فرقوں کا مکمل استیصال کرادیا۔ اور حضرت عمر (رض) کے عہد میں ایک شخص مرتد ہوا تھا ‘یہ غسان کی قوم کا جبلہ بن ایہم تھا ‘اس کو ایک تھپڑ نے نصرانی بنادیا اور یہ اسلام سے مرتد ہو کر روم کے شہروں کی طرف نکل گیا ‘جبلہ کی چادر پر ایک شخص کا پیر پڑ گیا ‘اس نے اس کے تھپڑ مارا ‘اس شخص نے حضرت عمر (رض) سے شکایت کی ‘حضرت عمر (رض) نے فرمایا اب یہ تمہارے تھپڑ مارے گا ‘اس نے تھپڑ کے بدلہ میں دس ہزار درہم کی پیشکش کی ‘مگر وہ شخص نہ مانا۔ جبلہ نے مہلت طلب کی اور روم جا کر مرتد ہوگیا۔ (الکشاف ‘ج ۱ ص ٦۴٦۔ ٦۴۴ ‘مطبوعہ نشر البلاغہ ‘ایران ‘۱۴۱۳ ھ) (تبیان)

چنانچہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے فوراً بعد صحابہ کرام (رض) کو مرتدین کا سامنا کرنا پڑا۔ مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ جس کی سرکوبی کے لیے خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے خالد بن ولید (رض) کی کمان میں فوج روانہ کی اس جنگ میں کئی صحابہ (رض) شہید ہوئے۔ ان میں بہت سے حفاظ صحابہ (رض) بھی شامل تھے۔ اس کے بعد کچھ قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا۔

حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے ان سے زکوۃ وصول کرنے کے لیے جہاد کا اعلان کیا۔ بڑے بڑے صحابہ (رض) نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ان کے خلاف جہاد کیونکر ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہ لوگ دین کے باقی ارکان پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن صدیق اکبر (رض) نے فرمایا جو زکوۃ اور نماز میں فرق کرے گا میں اس کے خلاف جہاد ضرور کروں گا۔ بالآخر حضرت عمر (رض) اور ان کے ہم نوا صحابہ کرام (رض) کو اس مسئلہ میں انشراح صدر ہوا اور انھوں نے خلیفۃ المسلمین کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں مانعین زکوۃ نے زکوۃ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ان بحرانوں کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ لشکر اسامہ کو روانہ کیا جائے یا کہ بحرانی کیفیت کی بنا پر کچھ عرصہ کے لیے روک لیا جائے۔ اس پر خلیفہ اول نے بڑا مضبوط موقف اختیار فرمایا۔ جس سے امت اعتقادی، مالی، اور سیاسی بحران سے بچ گئی۔

ان حالات میں بہت سے لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیق (رض) کو مشورہ دیا کہ وہ وقت کی نزاکت کے پیش نظر جیش اسامہ کو نہ بھیجیں، کیونکہ اسے امن وسلامتی کی حالت میں تیار کیا گیا تھا۔ مشورہ دینے والوں میں حضرت عمر بن خطاب (رض) بھی شامل تھے، مگر حضرت ابو بکر (رض) نے اس بات کو قبول نہ کیا اور جیش اسامہ کو روکنے سے سختی سے انکار کیا اور فرمایا خدا کی قسم! میں اس جھنڈے کو نہیں کھولوں گا جس کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے باندھا ہے۔ خواہ پرندے اور درندے ہمیں مدینے کے ارد گرد سے اچک لیں۔ اگر امہات المومنین کے پاؤں کو کتے گھسیٹ لیں تو بھی میں ضرور جیش اسامہ کو بھیجوں گا۔ اور مدینہ کے ارد گرد کے محافظوں کو حکم دوں گا کہ وہ اس کی حفاظت کریں اور جیش اسامہ کا اس حالت میں جانا بڑے مفاد میں رہا اور وہ عرب کے جس قبیلے کے پاس سے بھی گزرے وہ ان سے خوف زدہ ہو جاتا اور وہ لوگ کہتے کہ یہ لوگ اس لیے نکلے ہیں کہ ان کو بڑی قوت حاصل ہے۔ (البدایہ والنہایہ) (فہم)

تفسیر تبیان القرآن میں علامہ غلام رسول سعیدیؒ نے بہت عمدہ بحث فرمائی ہے اسے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

حضرت ابو بکر کی خلافت پر دلائل

روافض اور شیعہ یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت اور امامت کا اقرار کیا وہ سب کافر اور مرتد ہیں کیونکہ انھوں نے حضرت علی (علیہ السلام) کی امامت کی نص صریح کا انکار کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ بات صحیح ہو تو لازم تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ایک محبوب قوم کو لاتا جو ان سب سے جہاد کرتی اور ان کو حضرت علیؓ کی امامت اور خلافت ماننے پر مجبور کر دیتی ' جیسا کہ اس آیت کا تقاضا ہے اور جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ روافض اور شیعہ کا مزعوم فاسد ہے۔

ثانیا: ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابو بکر (رض) کے حق میں نازل ہوئی ہے ' کیونکہ یہ آیت ان کے ساتھ خاص ہے جنھوں نے مرتدین کے ساتھ جنگ کی اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام میں مرتدین کے ساتھ سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے جنگ کی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس آیت کا مصداق قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

اولا: اس لیے کہ آپ کے عہد میں مرتدین کے ساتھ جنگ کا واقعہ پیش نہیں آیا۔

ثانیا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب اللہ ایسی قوم کو لے آئے گا اس سے معلوم ہوا کہ وہ قوم اس وقت موجود نہیں تھی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ابو بکرؓ تو اس وقت موجود تھے تو پھر وہ بھی مراد نہیں ہونے چاہئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو بکر (رض) اس وقت موجود تھے ' لیکن بہ حیثیت سربراہ موجود نہیں تھے اور ان کی حیثیت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ مسلمانوں کو کسی پر حملہ کرنے کا حکم دیتے ' اور اس آیت کے مصداق حضرت علیؓ بھی نہیں ہو سکتے ' کیونکہ ان کو مرتدین کے ساتھ قتال کرنے کا اتفاق پیش نہیں آیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جس نے ان کی امامت کا انکار کیا ' وہ مرتد ہو گیا اور امامت کے منکرین کیخلاف انھیں نے جنگ کی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرتد کا معنی یہ ہے جو شریعت اسلامیہ سے مرتد ہو جائے اور اگر مرتد کا یہی معنی کیا جائے تو حضرت علیؓ کی امامت سے مرتد ہو؟ تو پھر خلفاء ثلاثہ اور ان کے ماننے والے تمام مسلمان مرتد تھے ' کیونکہ انھوں نے اس وقت میں حضرت علیؓ کی امامت کو نہیں مانا تو چاہیے تھا کہ حضرت علیؓ ان سے جنگ کرتے اور جب حضرت علیؓ نے ان سے جنگ نہیں کی ' بلکہ اس کے برعکس ان کی بیعت کی اور ان سے تعاون کیا۔ اور اہل یمن بھی

اس آیت کا مصداق نہیں ہو سکتے ' کیونکہ انھوں نے مرتدین کے ساتھ جنگ نہیں کی اور حدیث کا محمل یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی اس قوم میں سے ہیں کیونکہ حضرت ابو موسی اشعری (رض) بھی حضرت ابوبکر (رض) کے اصحاب میں سے ہیں ' اور اسی طرح دیگر اہل یمن بھی ' اور اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ آیت حضرت ابوبکر (رض) کے ساتھ مختص ہے۔

اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی (رض) نے بھی مرتدین کے ساتھ جنگ کی تھی ' وہ بہت اعلی اور افضل تھی اور اسلام میں بہت دور رس نتائج کی حامل تھی ' کیونکہ حضرت ابوبکر (رض) کی جنگ اسلام کے لیے تھی اور حضرت علی (رض) کی جنگ اپنی خلافت کی بقاکے لیے تھی۔ کیونکہ یہ امر تواتر سے ثابت ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اعراب مرتد ہو گئے ' تو نبوت کے مدعیوں اور زکوۃ کے منکروں کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے تلوار اٹھائی اور مرتدین کے ساتوں فرقوں کا مکمل استیصال کیا ' اور حضرت ابوبکر (رض) کی جدوجہد کے نتیجہ میں اسلام کو استقامت ملی ' اور شرق و غرب میں اسلام پھیلنے لگا اور تمام متمول دنیا کے حکمران مغلوب ہونے لگے ' اور اسلام کے علاوہ ادیان اور ملل کے چراغ بجھنے لگے اور آفتاب اسلام پوری آب و تاب سے جگمگانے لگا اور حضرت علی (رض) کی خلافت کے وقت تک اسلام پوری دنیا میں ایک غالب دین کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت ابوبکر (رض) کی مرتدین کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں وہ صرف اسلام کی نصرت اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ہوئیں اس کے برعکس حضرت علی (رض) کی جو جنگیں ہوئیں ' ان کی خلافت کے منکرین کے ساتھ تھیں۔ اگر بقول شیعہ ان کو بالفرض مرتد مان بھی لیا جائے ' تب بھی حضرت ابوبکر (رض) کی جنگیں ان سے بہر حال افضل اور اعلی تھیں۔

اس آیت میں حضرت ابوبکر (رض) کی امامت پر یہ دلیل بھی ہے کہ مرتدین کے ساتھ جنگ کرنے والی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس سے اللہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کرے گی اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر (رض) اللہ کے محب اور اللہ کے محبوب ہیں اور جو اللہ کا محب اور محبوب ہو ' وہی خلافت کا زیادہ مستحق ہے۔

نیز اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی صفت یہ ذکر کی کہ وہ مومنوں پر نرم ہوں گے اور کافروں پر سخت ہوں گے اور پوری امت میں سب سے زیادہ مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت حضرت ابوبکر (رض) ہیں :

امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں امت پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے اور اللہ کا حکم نافذ کرنے میں سب سے زیادہ سخت ابوبکر ہیں الحدیث : یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۳۸۱۶ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : '۱۵۴۰ ' صحیح ابن حبان ' ج ۱۶ ' رقم الحدیث : '۷۱۳۸۔۷۱۳۷ ' المستدرک ' ج ۳ ' ص '۴۲۴ ۔ یہ حدیث صحیحین کی شرط پر ہے اور امام ذہبی نے امام حاکم کی موافقت کی ہے۔ مسند الطیالسی ' رقم الحدیث : '۲۰۹۶ ' مسند احمد ' ج ۴ ' رقم الحدیث : '۱۲۹۰۳ ' فضائل الصحابہ للنسائی ' رقم ۱۸۲ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۶ ' ص ۲۱۰ ' حیلۃ الاولیاء ' ج ۳ ' ص ۱۲۲)

حضرت ابوبکر (رض) مومنوں پر بہت نرم تھے۔ نبوت کی ابتداء میں جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں تھے۔ اس وقت مسلمان بہت کمزور تھے ' اور حضرت ابوبکر (رض) مسلمانوں کی طرف سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دفاع کرتے تھے۔ ہر وقت حضور ﷺ کے پاس عمرو بن العاص (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مشرکین سے سب سے سخت تکلیف جو پہنچی ' وہ یہ تھی کہ ایک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حطیم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے ' اچانک عقبہ بن ابی معیط آیا اور اس نے اپنا کپڑا

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی گردن میں ڈالا اور آپ کو گلا بہت سختی سے گھونٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت حضرت ابوبکر (رض) آئے اور اس کو کندھے سے پکڑ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پرے دھکیلا اور کہا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کر رہے ہو کہ اس نے کہا کہ میرا رب اللہ ہے۔ (غافر: ۲۸) (صحیح البخاری 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۳۸۵۶) اور مسلمانوں کے ساتھ رحمت کی واضح مثال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر (رض) نے سات ایسے غلاموں اور باندیوں کو خرید کر آزاد کیا جن کو اسلام لانے کی پاداش میں مکہ میں سخت عذاب دیا جاتا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت بلال 'حضرت عامر بن فہیرہ 'حضرت زنیرہ 'حضرت نہدیہ اور ان کی بیٹی 'بنو موہل کی باندی اور ام عبیس۔ (الاصابہ 'ج ۲ 'ص ۳۴۳) اور جب حضرت ابوبکر (رض) خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بہت جرات اور دلیری کے ساتھ تمام مرتدین سے جنگ کی اور صحابہ کرام کے منع کرنے کے باوجود شام کی طرف لشکر روانہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی صفت میں فرمایا: وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ ہر چند کہ دوسرے خلفاء اور ائمہ نے بھی جہاد کیا ہے 'لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد جس نے سب سے پہلے جہاد کیا 'وہ حضرت ابوبکر (رض) تھے اور حضرت ابوبکر (رض) نے اس وقت جہاد کیا 'جب ملک کے اندر مانعین زکوۃ اور مرتدین کے فتنے کھڑے ہو چکے تھے 'اور اس وقت ملک سے باہر فوج بھیجنے کی سب سے مخالفت کی تھی 'لیکن حضرت ابوبکر (رض) نے کہا شام کے خلاف فوج کشی کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم دیا تھا 'اور میں کسی حالت میں بھی اس حکم کو موخر نہیں کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے (المائدہ: ۵۴)

حضور سرور کائنات علیہ اجمل التحیات واحسن التسلیمات کے آخری ایام میں اسود عنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کر دیا لیکن فیروز دیلمی نے اس رات اس کا کام تمام کر دیا جس کی صبح کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی وقت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس کی اطلاع بھی دے دی جس سے صحابہ کو بڑی فرحت ہوئی (بیضاوی) قبیلہ بنی حنیفہ میں مسیلمہ کذاب نے، بنو اسد میں طلیحہ نے اپنے اپنے نبی ہونے کا اعلان کر دیا۔ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انتقال کے بعد حالات اور نازک ہوگئے۔ کئی قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ غرضیکہ ارتداد کی آندھی اس زور سے چلی کہ عرب کے بادیہ نشین قبائل میں سے شاذونادر ہی کوئی اپنے ایمان کی شمع روشن رکھ سکا۔ لیکن صد آفرین حضرت صدیق کے ایمان ویقین پر، ان کے عزم واستقلال اور ان کے تدبر وفراست پر اور ان جانباز اور سرفروش مسلمان مجاہدین پر جنہوں نے اس تند وتیز طوفان کا منہ پھیر دیا اور دو سال سے کم عرصہ میں سارے جزیرہ عرب پر پھر توحید کا پرچم لہرانے لگ گیا۔

وہ قوم کون تھی؟ حضرت صدیق (رض)، ان کے رفقاء کار، ان کے لشکروں کے جانباز سپاہی، یمن کے قبائل، عرب کے دوسرے لوگ جنہوں نے بڑی بے جگری سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ (رض)

ہر کسی کا کام نہیں کہ وہ حوادثات کے منہ زور ریلے کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے اور فتنہ وفساد کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر انھیں گلزار خلیل بنا دے۔ اس لیے فرمایا کہ اس نازک وقت میں اسلام کی امداد کے لیے سر بکف نکلنے والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو ان صفات سے متصف ہوں گے وہ اللہ کے پیارے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کا محبوب ہوگا۔ اہل ایمان کے لیے وہ نرم، مشفق اور سراپا لطف وعنایت ہوں گے اور

کافروں کے لیے فولاد کی چٹان کی طرح سخت ۔
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم !

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ان کی تیسری صف یہ ہے کہ اس والہانہ سرفروشی اور تن فراموشی کے پس پردہ کوئی مادی منفعت کارفرما نہیں ہوتی بلکہ ان کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اٹھتا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے۔
آپ نے غور فرمایا حضرت صدیق اکبر (رض) اور ان کے جانباز مجاہدوں کو قرآن کریم کن الفاظ سے خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔ جس کے سپاہیوں کی یہ شان ہو، جس کے لشکری ان اوصاف حمیدہ سے متصف ہوں، جنہیں زبان قدرت ان پاکیزہ جملوں سے سرفراز فرما رہی ہو اس خلیفہ برحق کی شان کتنی رفیع اور اس کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ ایسے خلیفہ کی خلافت کی حقانیت کے بارے میں کسی ایسے شخص کو تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا جو قرآن کو خدا کا کلام اور اپنے خدا کو علیم بذات الصدور یقین کرتا ہو۔

حضرت ابوبکر (رض) کے فضائل: (مختصر)

یہ آیت بھی حضرت ابوبکر (رض) کے حال کے مناسب ہے ‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور کی آیت میں بھی حضرت ابوبکر (رض) کو صاحب فضل فرمایا ہے۔ کیونکہ مسطح (رض) حضرت ابوبکر (رض) کے خالہ زاد بھائی تھے ‘ یہ نادار مہاجر تھے اور بدری صحابی تھے اور حضرت ابوبکر (رض) ان کی مالی امداد کیا کرتے تھے ‘ لیکن انھوں نے بھی حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ (رض) پر تہمت لگانے والوں کی موافقت کی ‘ جس سے حضرت ابوبکر (رض) کو بہت رنج ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ام المومنین کی برات بیان کردی ‘ تو حضرت ابوبکر (رض) نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ مسطح کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی :
(آیت) ” ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمھجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم “۔ (النور : ۲۲)
ترجمہ : اور تم میں سے صاحب وسعت یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں ‘ مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے اور ان کو چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بہت بخشنے والا ‘ بےحد رحم فرمانے والا ہے۔
جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی تو حضرت ابوبکر صدیق ‘ (رض) نے کہا بیشک میری آرزو ہے کہ اللہ مجھے بخش دے اور میں مسطح کے ساتھ جو حسن سلوک کرتا تھا ‘ اس کو کبھی موقوف نہیں کروں گا۔
حضرت بلال (رض) امیہ بن خلف کے غلام تھے ‘ وہ حضرت بلال کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ان کو بہت ایذائیں پہنچاتا تھا ‘ ان کو گرم زمین پر ڈال کر ان کے اوپر بھاری پتھر رکھ دیتا تھا۔ حضرت ابوبکر (رض) نے امیہ بن خلف کو اس ظلم وستم سے منع کیا ‘ اس نے کہا اگر تم کو اس

کی تکلیف ناگوار لگتی ہے تو اس کو خرید لو۔ حضرت ابو بکر (رض) نے امیہ بن خلف سے ایک گراں قیمت پر حضرت بلال کو خریدا اور آزاد کر دیا ' اتنی بڑی قیمت پر حضرت بلال کو خریدنے سے مشرکین کو حیرت ہوئی اور انھوں نے کہا ضرور بلال کا ابو بکر پر کوئی احسان ہوگا۔ اس کا بدلہ اتارنے کے لیے ابو بکر نے اتنی بھاری قیمت پر بلال کو خریدا ہے ' اللہ تعالیٰ نے اس طعن کے جواب میں حضرت ابو بکر (رض) کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی :

(آیت) " **وسیجنبھا الاتقی، الذی یؤتی مالہ یتزکی، وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی، الا ابتغآء وجہ ربہ الاعلی، ولسوف یرضی،** (اللیل : ۲۱۔ ۱۷)

ترجمہ : اور جو سب سے زیادہ متقی ہے وہ اس (آگ) سے دور رکھا جائے گا ' جو پاکیزہ ہونے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ صرف اپنے رب اعلی کی رضا جوئی کے لیے (مال خرچ کرتا ہے) اور وہ ضرور عنقریب راضی ہوگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا ' کہ اے مشرکو ! بلال کے احسان کی بات کرتے ہو ' ابو بکر پر اس کائنات میں کسی کا کوئی دنیاوی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جائے ' اس نے صرف اپنے رب اعلی کو راضی کرنے کے لیے بلال کو خرید کر آزاد کیا ہے۔ اور اللہ عنقریب اس کو راضی کر دے گا۔

حضرت ابو بکر (رض) کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز و اکرام اپنے فضل سے عطا کیا ہے ' اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی حضرت ابو بکر (رض) کو انعامات سے نوازا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (رض) منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا نے اپنے ایک بندہ کو دنیا کی تروتازگی میں جو وہ چاہے ' اسے دینے کا اور آخرت میں اس کے پاس جو اجر ہے ' اسے دینے کا اختیار دیا ' اس بندہ نے اللہ کے پاس جانے کو اختیار کرلیا۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر (رض) رونے لگے اور کہنے لگے ' ہماری مائیں اور ہمارے باپ آپ پر فدا ہو جائیں۔ ہمیں ان پر تعجب ہوا اور لوگوں نے کہا اس بوڑھے کو دیکھو ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ایسے بندہ کے متعلق خبر دے رہے ہیں جس کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کی تروتازگی لے یا اللہ کے پاس آجائے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ پر ہمارے باپ اور ہماری مائیں فدا ہو جائیں ' اور دراصل یہ اختیار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیا گیا تھا ' اور اس بات کو ہم میں سے سب سے زیادہ جاننے والے حضرت ابو بکر (رض) تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنی رفاقت اور اپنے مال کے ذریعہ میرے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والے ابو بکر ہیں اور میں اپنی امت میں سے اگر کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو خلیل بناتا ' لیکن ان کے ساتھ اسلام کی خلت (دوستی) ہے ' مسجد (نبوی) میں ابو بکر کی کھڑکی کے سوا اور کوئی کھڑکی باقی نہ رکھی جائے۔ (صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۳۹۰۴ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۲۳۸۲ ' سنن ترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۳۶۷۹ ' صحیح ابن حبان ' ج ۱۵ ' رقم الحدیث : ۶۸۶۱ ')

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے بھی ہمارے ساتھ کوئی نیکی کی ہم نے اس کا بدلہ دے دیا ' ماسوا ابو بکر کے ' کیونکہ انھوں نے ہمارے ساتھ ایک ایسی نیکی کی ہے جس کا بدلہ انھیں اللہ قیامت کے دن دے گا اور کسی شخص کے مال نے مجھے ہرگز وہ نفع نہیں پہنچایا ' جو ابو بکر کے مال نے نفع پہنچایا اور اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو خلیل بناتا اور سنو ! تمہارے پیغمبر اللہ کے خلیل ہیں۔ اس سند کے ساتھ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۳۶۸۱ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۹۴ ')

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص ایک نوع کی دو چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرے 'اس کو جنت میں بلایا جائے گا۔ اے اللہ کے بندے! یہ خیر ہے سو جو نمازی ہوگا 'اس کو باب الصلوۃ سے بلایا جائے گا اور جو مجاہد ہوگا ' اس کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا اور جو صدقہ دینے والا ہوگا 'اس کو باب الصدقہ سے بلایا جائے گا اور جو روزہ دار ہوگا 'اس کو باب الریان سے بلایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر (رض) نے کہا یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں 'کیا کوئی ایسا شخص ہوگا جس کو ان تمام دروازوں سے بلایا جائے گا؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں 'اور مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو۔ (صحیح ابن حبان 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: ۶۸۶۶ ' صحیح مسلم 'زکوۃ ۸۵ '(۱۰۲۷) سنن نسائی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۲۳۷)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جنت میں ایک ایسا شخص داخل ہوگا جس کے متعلق جنت کے ہر گھر والے اور ہر بالاخانہ والے 'یہ کہیں گے: مرحبا 'مرحبا 'ہمارے پاس آئیں۔ حضرت ابوبکر (رض) نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس شخص کو اس دن کوئی نقصان نہیں ہوگا! آپ نے فرمایا ہاں اے ابوبکر وہ شخص تم ہوگے۔ (صحیح ابن حبان 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: ۶۸۶۷ 'المعجم الکبیر 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث: ۱۱۱۶۶ 'المعجم الاوسط 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۴۸۵ 'حافظ الہیثمی نے لکھا ہے اس حدیث کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں 'سوا احمد بن احمد بن ابی بکر سالمی کے 'اور وہ بھی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد 'ج ۹ 'ص ۴۶) (تبیان)

مالک حقیقی جسے چاہتا ہے اسے اپنے انعامات سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کا فضل و کرم بے پایاں ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کس ذرہ ناچیز کو اپنی رحمت سے رشک مہر درخشاں بنانا ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

لغۃ القرآن: [اِنَّمَا : یقیناً][وَلِيُّكُمُ : تمہارا دوست][اللّٰهُ : اللہ][وَرَسُوْلُهٗ : اور اس کا رسول][وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][اٰمَنُوا : وہ ایمان لائے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][يُقِيْمُوْنَ : وہ قائم کرتے ہیں][الصَّلٰوةَ : نماز][وَيُؤْتُوْنَ : اور وہ ادا کرتے ہیں][الزَّكٰوةَ : زکوۃ][وَهُمْ : اور وہ][رٰكِعُوْنَ : رکوع کرنے والے ہیں]

ترجمہ: بیشک تمہارا (مددگار) دوست تو اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہے اور (ساتھ) وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور وہ (اللہ کے حضور عاجزی سے) جھکنے والے ہیں.

تشریح:

پہلے دشمنانِ اسلام سے دوستی اور محبت کرنے سے روکا گیا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان کس سے محبت و پیار کریں۔ کسے اپنا ناصر اور مددگار بنائیں۔ فرمایا تمہارا دوست اور مددگار اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوۃ دیتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ **وھم راکعون** یعنی نہات خشوع و خضوع سے عبادت الٰہی میں مشغول و منہمک رہتے ہیں۔ رکع بمعنی خشع کثیر الاستعمال ہے مثلاً۔

لا تھن الفقیر علك ان ترکع یوما والدھر قد رفعه

یعنی کسی فقیر کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ۔ ہو سکتا ہے کہ تو ذلیل ہو جائے اور زمانہ اس کو سربلند کر دے۔ اسی طرح **وارکعی مع الراکعین** میں بھی رکوع سے عاجزی اور انکساری ہی مراد ہے۔ کیونکہ یہ رکوع جو ہم نماز میں کرتے ہیں وہ پہلی امتوں میں نہیں تھا۔ اس صورت میں یہ جملہ حال ہوگا۔ اور نماز پڑھنے والے، زکوۃ دینے والے ایماندار ذوالجلال ہوں گے۔

شانِ نزول

اس آیت مبارکہ کے متعلق حضرت جابر (رض) نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام (رض) کے حق میں نازل ہوئی، انھوں نے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ہماری قوم نے ہمیں چھوڑ دیا اور قسمیں کھالیں کہ وہ ہمارے پاس نہیں بیٹھا کریں گے اور دوری کی وجہ سے ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کی صحبت میں بھی نہیں بیٹھ سکتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور ایمان والے تمہارے دوست ہیں تو حضرت عبداللہ بن سلام (رض) نے کہا "اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نبی ہونے پر اور مومنین کے دوست ہونے پر ہم راضی ہیں۔ (قرطبی، صراط، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۵، ۱۳۱/۳، الجزء السادس)

آیتِ مبارکہ میں بیان کردہ حکم تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے سب ایک دوسرے کے دوست اور محب ہیں۔

{ وَہُمۡ رٰکِعُوۡنَ : اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ } عربی گرامر کے اعتبار سے آیت مبارکہ کے اس جملے کے چار معنی بیان کئے گئے ہیں:

(1)۔۔ پہلا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکا ہوا ہونا مومنوں کی ایک مزید صفت ہے۔

(جمل، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۵، ۲۴۲/۲)

(2)۔۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ مومنین نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کے دونوں کام خشوع اور تواضع کے ساتھ کرتے ہیں۔

(ابو سعود، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۵، ۵۹/۲)

(3)۔۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ وہ تواضع اور عاجزی کے ساتھ زکوۃ دیتے ہیں۔ (جمل، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۵، ۲۴۲/۲)

(4)۔۔ چوتھا معنی یہ ہے کہ وہ حالت رکوع میں راہ خدا میں دیتے ہیں۔

پہلا معنی سب سے قوی اور چوتھا معنی سب سے کمزور ہے بلکہ امام فخر الدین رازی (رح) نے تفسیر کبیر میں اس کا بہت شدومد سے رد کیا ہے اور اس کے بطلان پر بہت سے دلائل قائم کئے ہیں۔ (صراط)

تفسیر ابن عباس کے مطابق : حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اسد، اسید اور ثعلبۃ بن قیس وغیرہ کو یہود نے تکالیف پہنچائیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ تمہارا محافظ ومددگار اور دوست اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابوبکر صدیق (رض) اور ان کے ساتھی ہیں جو پانچوں نمازوں کو باجماعت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ان سے دوستی رکھے تو اللہ تعالیٰ کی جماعت یعنی رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرام (رض) اپنے دشمنوں پر یقیناً غلبہ رکھتے ہیں۔ (ابن عباس)

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ آیت حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے حق میں نازل ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک سائل نے آکر سوال کیا۔ آپ اس وقت حالت رکوع میں تھے آپ نے اپنی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔

اگرچہ اس روایت کی سند میں علماء و محدثین کو کلام ہے لیکن اگر اس روایت کو صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز وزکوٰۃ کے پابند عام مسلمان ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے : من کنت مولاہ فعلی مولاہ، (رواہ احمد از مظہری) یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی کرم اللہ وجہہ بھی اس کے دوست ہیں۔ اور ایک حدیث میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے : اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ، یعنی یا اللہ آپ محبوب بنالیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہو علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے، اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لیے نوازا گیا ہے کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہوگیا تھا، کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت و دشمنی رکھیں گے، اور ان کے مقابلہ پر علم بغاوت اٹھائیں گے، جیسا کہ خوارج کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔ جب کسی نے حضرت امام باقر (رح) سے پوچھا کہ اس آیت میں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی مومنین میں داخل ہونے کی حیثیت سے اس آیت کا مصداق ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب پر غالب آکر رہے۔ جو طاقت ان سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی خلیفہ اول صدیق اکبر (رض) کے مقابلہ پر اندرونی فتنے اور بغاوتیں کھڑی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سب پر غالب فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم (رض) کے مقابلہ پر دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں قیصر وکسریٰ آگئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نام ونشان مٹادیا۔ اور پھر ان کے بعد کے خلفاء اور مسلمانوں میں جب تک ان احکام کی پابندی رہی کہ مسلمانوں نے غیروں کے ساتھ خلط ملط اور گہری دوستی کے تعلقات قائم نہیں کئے وہ ہمیشہ مظفر ومنصور نظر آئے۔

بعض نے کہا کہ یہ آیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں نازل ہوئی

حضور نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد سے باہر تشریف لائے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ قیام ورکوع میں ہیں اور ایک سوالی کھڑا ہے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا۔

ترجمہ: کیا تجھے کسی نے کچھ دیا عرض کی جی ہاں ایک چاندی کی انگوٹھی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تجھے کس نے دی تو عرض کی اس کھڑے ہوئے آدمی نے حضرت شیر خدا اسد اللہ کرم اللہ وجہہ کی طرف اشارہ کیا فرمایا انھوں نے جب تجھے انگوٹھی دی تو یہ کس حال میں تھے عرض کی کہ وہ رکوع میں تھے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تکبیر فرمائی اور یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین۔ الخ اور حضرت حسان (رض) نے اسی وقت یہ اشعار فرمائے۔

ابا حسن نفدیك نفسی و مهجتی و كل بطئی فی الهدی و مسارع

ایذهب مدحیك المعبر ضائعاً وما المدح فی جنب الاله بضائع

فانت الذی اعطیت اذ كنت راكعاً زكوة فدتك النفس یا خیر راكع

فانزل فیك الله خیر ولایة وائبتها اثنا كتاب الشرائع

ترجمہ:۔ اے علی ابوالحسن آپ پر ہماری جانیں اور ہر ہدایت یافتہ قربان ہو۔ آپ کا مدح گو کبھی برباد نہ ہوگا۔ آپ ہی وہ ہیں جنہوں نے رکوع کرتے کرتے زکوۃ ادا کی۔ اے بہترین رکوع والے تم پر میری جان فدا اللہ تعالیٰ نے بہترین آیت اتاری اور اسے قرآن جیسی شریعت کی کتاب میں محفوظ کر دیا۔ (روح المعانی) حسنات)

شیخ طوسی متوفی ۴٦۰ھ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت علی (رض) ہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد خلافت اور امامت کے مستحق تھے ' کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور مومنین ہیں اور مومنین سے مراد اس آیت میں حضرت علی (رض) ہیں ' کیونکہ یہاں مومنین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں اور مذکور الصدر شان نزول کے مطابق حضرت علی (رض) ہی اس آیت کے مصداق ہیں ' کیونکہ آپ ہی نے حالت رکوع میں سائل کو سونے کی انگوٹھی دی تھی۔ لہٰذا حضرت علی (رض) مسلمانوں کے ولی ہوئے اور ولی کا معنی اولی اور احق ہے۔ سو حضرت علی (رض) مسلمانوں پر متصرف اور ان کے حاکم ہوئے اور یہی خلافت اور امامت کا معنی ہے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علی (رض) مسلمانوں کے ولی یعنی ان کے امام اور خلیفہ ہیں۔ (التبیان فی التفسیر القرآن ' ج ۳ ' ص ۵۵۸ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

علماء شیعہ کی دلیل کا جواب

شیخ طوسی کا یہ استدلال کئی وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) ولی کا معنی اولی اور احق نہیں ہے ' بلکہ ولی کا معنی محب اور ناصر ہے۔

علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی متوفی ۸۱۷ھ لکھتے ہیں:

ولی جب اسم ہو تو اس کا معنی محب ' صدیق (دوست) اور نصیر ہے اور مصدر ہو تو اس کا معنی امارۃ اور سلطان ہے۔ (القاموس المحیط ج ۴ ص ' ۵۸۳ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت ' ۱۴۱۲ھ)

(۲) اس آیت میں ولی محب ' دوست اور مددگار ہی کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا اے ایمان والو: یہود اور نصاری کو دوست نہ بناؤ ' ۔ سو اس آیت میں فرمایا تمہارا ولی یعنی دوست اللہ ہے۔ اس کا رسول ہے اور مومنین ہیں۔

(۳) اگر اس آیت میں ولی کا معنی اولی بالامامت ہو اور مومنین سے مراد حضرت علی ہوں تو یہ لازم آئے گا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت مسلمانوں کی امامت کے زیادہ لائق حضرت علی (رض) ہوں ' حالانکہ اس وقت تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں میں موجود اور تشریف فرما تھے اور آپ کے ہوتے ہوئے کسی اور کا امامت اور حکومت کے زیادہ لائق اور حقدار ہونا قطعاً باطل اور مردود ہے۔
(۴) اگر یہ آیت حضرت علی (رض) کی امامت کے حقدار ہونے پر دلالت کرتی تو حضرت علی (رض) ضرور کسی نہ کسی محفل میں اس آیت سے استدلال کرتے ' حالانکہ آپ نے کبھی بھی اس آیت سے اپنی امامت پر استدلال نہیں کیا۔ آپ نے شوری کے دن حدیث غدیر اور آیت مباہلہ سے اپنے فضائل پر استدلال کیا ' لیکن اس آیت کو آپ نے کبھی پیش نہیں کیا۔
(۵) شیخ طوسی اور دیگر علماء شیعہ کا استدلال اس پر موقوف ہے کہ اس آیت میں مومنین سے مراد حضرت علی (رض) ہوں۔ ہرچند کہ تعظیما جمع کا واحد پر اطلاق جائز ہے ' لیکن یہ مجاز ہے ' اور بلاضرورت شرعی کسی آیت کو مجاز پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔
(٦) نیز ! یہ استدلال اس پر موقوف ہے کہ حضرت علی (رض) نماز کی حالت میں سائل کی طرف متوجہ ہوں اور حالت رکوع میں سونے کی انگوٹھی سائل کو دینے کی نیت سے گرائیں اور نماز میں نماز کے علاوہ کوئی اور عمل کریں۔ حالانکہ حضرت علی (رض) جس طرح انہماک اور استغراق اور خضوع وخشوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے ' یہ کہانی اس کے سراسر خلاف ہے۔
(۷) عہد رسالت میں حضرت علی (رض) بہت تنگ دست تھے ' بعض اوقات آپ اپنے حصہ کی روٹی سائل کو دے کر خود بھوکے رات گزارتے تھے۔ ایسے شخص کے متعلق یہ فرض کرنا کہ وہ صاحب زکوۃ تھے اور ان کے پاس سونے کی انگوٹھی تھی۔ یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ اس روایت کے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے یہی کافی ہے۔
(۸) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مردوں پر سونا حرام کردیا تھا اور سورۃ مائدہ احکام سے متعلق آخری سورت ہے۔ اس لیے حضرت علی (رض) کا سونے کی انگوٹھی پہننا بھی اس روایت کے غیر معتبر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔
ہمارے نزدیک اس آیت میں " راکعون " اپنے ظاہری معنی میں نہیں ہے ' اس کا معنی ہے جھکنے والے ' یعنی ایمان والے نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور وہ اللہ کے سامنے (عاجزی سے) جھکنے والے ہیں۔ (تبیان)

جن بعض صاحبان نے اس آیت سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خلافت بلافصل پر استدلال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ ولی سے مراد یہاں متصرف فی الامور یعنی امام اور خلیفہ ہے اور انما حصر کا کلمہ ہے تو آیت کا مطلب ہوا کہ تمہارے امور میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ، اس کا رسول پاک اور وہ مومن ہیں جنہوں نے رکوع کی حالت میں خیرات دی ہو۔ اور یہ کام کیونکہ صرف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے کیا اس حصر کے پیش نظر صرف آپ ہی خلیفہ ہوسکتے ہیں اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان کا یہ استدلال کئی وجوہ سے توجہ کے لائق نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ ولی کا معنی یہاں متصرف فی الامور (خلیفہ اور امام) نہیں بلکہ یار اور مددگار ہے۔ کیونکہ بعینہ یہی لفظ اس آیت میں مذکور ہے۔ یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود والنصاری اولیاء (اے ایمان والو ! یہود ونصاریٰ کو ولی نہ بناؤ) اور یہ واضح ہے کہ کوئی بھی انھیں خلیفہ نہیں بناتا تھا بلکہ بعض منافق انھیں اپنا ناصر اور مددگار سمجھتے تھے۔ اس آیت کے بعد والی آیت میں بھی ولی بمعنی ناصر ہے۔ تو جس چیز کی نفی ہو رہی ہے اسی کا ہی اثبات ہو رہا ہے۔ یعنی یہودی وغیرہ تمہارے دوست نہیں بلکہ اللہ اور اس کا رسول اور مومن تمہارے دوست ہیں۔ دوسری عرض یہ ہے کہ ولایت عامہ اور خلافت کبریٰ اگر صرف ان لوگوں میں ہی محصور ہو جن میں وہم راکعون کی صفت پائی جاتی ہو تو پھر حضرت امام حسن (رض) اور امام حسین

(رض) بلکہ جملہ گیارہ ائمہ اہل بیت کی امامت کا ان صاحبان کو بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ ان میں سے کسی نے حالت رکوع میں زکوۃ نہیں دی۔ اور امام صرف وہی ہو سکتا ہے جو حالت رکوع میں زکوۃ دے اس لیے ان کے اپنے قائم کردہ قاعدہ کے مطابق ان حضرات میں سے کوئی بھی امام نہیں ہوگا اور شاید اس بات کے لیے تو وہ بھی تیار نہ ہوں۔ تیسری کھلی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ آیت حضرت سیدنا علی (رض) کی امامت بلا فصل کی دلیل ہوتی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسے ضرور پیش فرماتے۔ اور ان وجوہات کے پیش نظر ان صاحبان کا استدلال قابل التفات نہیں۔

نیز یہ روایت بھی توجہ طلب ہے۔ نماز میں سائل کے سوال کی طرف توجہ کرنا، پھر ایک ہاتھ کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے اس کو دوسرے ہاتھ سے اتارنا، پھر ہاتھ بڑھا کر سائل کو دینا یہ عمل کثیر اور توجہ الی الغیر حضرت علی مرتضیٰ (رض) کی شان سے بہت بعید ہے جن کی حالت استغراق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ نماز ادا کرتے ہوئے دنیا ومافیہا بلکہ اپنے جسم تک کی خبر نہ رہتی تھی۔ ایک بار جناب کے جسم کو چیر کر تیر نکالا گیا لیکن نہ آپ کو درد ہوا اور نہ تیر نکالنے کا علم ہوا۔ ایسی محویت سے نماز ادا کرنے والا حالت نماز میں کسی غیر کی طرف متوجہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ انگوٹھی سونے کی تو ہرگز نہ تھی کیونکہ سونا مردوں پر حرام ہے یقیناً چاندی کی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ اس کا وان ایک تولہ ہوگا جس کی قیمت اس وقت ایک روپیہ سے بھی کم تھی۔ اگر ایک روپیہ صدقہ کرنے سے خلافت کا حق ثابت ہو جاتا ہے تو جنھوں نے ہزاروں اشرفیاں ایک بار ہی نہیں کئی کئی بار بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پیش کیں اور جب بھی اسلام کے لیے ضرورت پڑی سونے اور چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی جھولیاں قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیں ان کی خلافت کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ (ضیاء و ملخص من قرطبیؒ و مظہری)

یہاں ولی بمعنی خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ آیت خلافت مرتضوی کے لیے مخصوص ہو سکتی ہے۔ چند وجوہ سے ایک یہ کہ اللہ رسول کسی کے خلیفہ نہیں اور یہاں انھیں بھی ولی فرمایا گیا۔ اور ایک لفظ بیک وقت چند معنی میں استعمال نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ اس آیت کے نزول کے وقت علی مرتضی (رض) خلیفہ نہ تھے، اگر آیت میں حضور کے بعد کا زمانہ مراد لیا جائے تو آپ کی خلافت بلا فصل ثابت نہیں ہوتی۔ تین خلفاء کے بعد بھی بعد کا ہی زمانہ ہے تیسرے یہ کہ انما حصر کے لیے ہے۔ اگر خلافت علی مرتضی میں منحصر ہو جائے تو بقیہ گیارہ اماموں کی خلافت باطل، بہر حال یہاں ولی کے معنی یا دوست ہیں یا مددگار۔ (نور)

اس روایت کی سند میں علماء اور محققین کو کلام ہے لیکن روایت کو اگر صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز زکوۃ کے پابند عام مسلمان ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں۔

جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "من کنت مولاہ فعلی مولا" (رواہ احمد از مظہری) یعنی میں اس کا دوست ہوں تو علی بھی اس کا دوست ہے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے علی کو دوست نہیں رکھا تو اس نے مجھے بھی دوست نہیں رکھا۔ ایک اور حدیث میں بھی سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ "یعنی یا اللہ آپ محبوب بنالیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہے علی مرتضی سے اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضی سے۔

حضرت علی مرتضی (رض) کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لئے نوازا گیا ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہو گیا تھا کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت اور دشمنی رکھیں گے اور ان کے مقابلہ پر علم بغاوت اٹھائیں گے جیسا کہ خوارج کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔ (معارف)

بہر حال آیت کریمہ کا سبب نزول خواہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا عمل ہو لیکن الفاظ کے عموم اراکین اور خاشیعین اور متوازی ہیں اور تمام زکات ادا کرنے والوں کو شامل ہے اور یہ مسلم قاعدہ ہے کہ قرآن کا ہر حکم قیامت تک آنے والے سب لوگوں کے لیے ہوتا ہے خواہ سبب نزول کچھ بھی ہو۔ (منازل)

خطاب کے آغاز اور رکوع کی ابتدا میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ قلبی دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ جس میں یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔ اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں غیروں سے دوستی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اللہ اور اس کا رسول تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں کیونکہ تم اللہ ہی کے لیے دین کے دشمنوں کے ساتھ برسرپیکار ہو۔ تم اللہ تعالیٰ کے حضور نماز کی حالت میں جھکنے والے اور اس کی رضا کی خاطر زکوٰۃ کی شکل میں غرباء سے تعاون کرنے والے رکوع کرتے ہوئے عاجزی اختیار کرنے والے ہو۔ گویا کہ جب تک مسلمانوں میں یہ اوصاف ہوں گے کہ وہ اللہ کے حضور نماز کی صورت میں جھکنے والے، زکوٰۃ کی شکل میں کمزور ساتھیوں سے تعاون کرنے والے، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوں گے۔ تو انھیں کسی کی پروا نہیں کرنی چاہیے یہ اللہ کی فوج ہیں اور اللہ کی فوج ہی دنیا میں غالب رہے گی۔ چنانچہ دنیا نے کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھا جب تک مسلمانوں میں یہ اوصاف رہے مسلمان سربلند رہے۔ یہاں رکوع سے مراد اکثر مفسرین نے عاجزی اور انکساری لی ہے تاہم یہ سورۃ البقرۃ میں ذکر ہو چکا ہے کہ نماز کے ساتھ رکوع کا خصوصی ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہودیوں نے رکوع فرض ہونے کے باوجود اپنی نماز سے خارج کر دیا ہے یہاں کفار اور منافقوں کو متنبہ کرنے کے ساتھ مومنوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ تمہیں غیروں سے دوستی اس لیے بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کامیابی تمہارا مقدر ہے۔

(الاسلام یعلو ولا یعلیٰ) [ارواء الغلیل حدیث نمبر: ۱۲۶۸]

"اسلام غالب آئے گا اور اس پر کوئی غالب نہیں آئے گا۔"

(كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ) [المجادلۃ: ۲۱]

"اللہ تعالیٰ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔"

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) اِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلاَةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلاَّ بِحَقِّ الإِسْلاَمِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)

[رواہ البخاری: باب (فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلاَةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ)]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے لوگوں کے ساتھ لڑائی کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے جب انھوں نے یہ کام کر لیا تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال کو محفوظ کر لیا مگر اسلام کے حقوق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔" (فہم)

بہر حال مسلمان قوم کے دوست کون؟

یعنی تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد نہ بناؤ بلکہ اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست اور معتمد بناؤ۔ تمہارا ایمان ' اگر تمہیں واقعی اس سے کوئی تعلق ہے تو وہ تمہیں ان سے جوڑتا ہے ' یہود و نصاریٰ سے نہیں۔ اللہ اور رسول سے زیادہ تو ظاہر ہے کوئی ہمدرد ' غمگسار ' مشکل وقت میں مدد دینے والا اور بے بسی میں سہارا بننے والا اور کون ہو سکتا ہے اور جہاں تک تعلق ہے مسلمانوں کا ' ظاہر ہے ایمان کے دعوے داروں کے ساتھ ان سے بڑھ کر اور کس کا قریبی رشتہ ہو سکتا ہے۔ اسلامی اخوت اور اسلامی حمایت اور حمیت نے جس طرح مسلمانوں کو جسد واحد بنا دیا ہے ' اس کی موجودگی میں ان کو چھوڑ کر کسی اور سے رسم و راہ پیدا کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ' اس لیے ان کمزور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم صحیح راستے کو چھوڑ کر ' ایک غلط راستے پر چل نکلے ہو اور مزید یہ بھی فرمایا کہ مسلمان بھی ایسے ہونے چاہئیں جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فروتنی اور عاجزی کی تصویر ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو مسلمانوں کو اعتماد کی دولت فراہم کرتے ہیں اور جن پر ہر معاملے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو اسلام کی اصل قوت ہیں ' وہ وہ ہیں جن کا نماز ' زکوٰۃ ' عاجزی اور انکساری سے رشتہ ہے کیونکہ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا ' وہ گویا اللہ کے عہد وفا سے انحراف اختیار کرتا ہے اور جو زکوٰۃ نہیں دیتا وہ مال و دولت کو اللہ کی امانت کی بجائے ذاتی ملکیت سمجھتا ہے اور جو انکساری اختیار نہیں کرتا ' یقیناً اس کے اندر تکبر اور غرور کا مادہ ہوگا۔ ایسا شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاشرے میں معاشرت کے توازن کو درہم برہم کرنے کا سبب بنتا ہے تو ایسے مسلمان تو اپنے لیے بھی طاقت کا باعث نہیں ہوتے باقی اسلامی سوسائٹی کو کیا طاقت دے سکتے ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور جو][يَّتَوَلَّ : دوستی رکھے][اللّٰهَ : اللہ][وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کے رسول سے][وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][فَاِنَّ : تو یقیناً][حِزْبَ : جماعت][اللّٰهِ : اللہ][هُمُ : وہ][الْغٰلِبُوْنَ : غالب آنے والے]

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ایمان والوں کو دوست بنائے گا تو (وہی اللہ کی جماعت ہے اور) اللہ کی جماعت (کے لوگ) ہی غالب ہونے والے ہیں.

تشریح:

آخری فتح مومنین ہی کی ہوگی

یہاں ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کیا جارہا ہے 'جو آج ہمارے لیے بھی چشم کشا ہے اور اس دور کے منافقین کے لیے بھی سبق آموز تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے کفار چونکہ ابھی تک بڑی طاقت کے مالک ہیں 'اس لیے ان سے ترک تعلق نہیں ہو سکتا ورنہ کسی بھی نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور آج ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت 'قوت اور طاقت ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے مسائل کے حل اور اپنی بقا کے سر و سامان کے لیے ان قوتوں کی طرف دیکھنا چاہیے 'جو دنیا کو لیڈ (Lead) کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں پروردگار اس حقیقت کا انکشاف فرمارہے ہیں کہ اصل طاقت اللہ کے پاس ہے اور اس کی طاقت اس قوم کے ہم رکاب ہوتی ہے 'جو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا تعلق رکھتی ہے 'جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہو چکا اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کر لیتی ہے 'جن کا گزشتہ آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ اس صورت میں وہ ایک قوم نہیں رہتی بلکہ وہ ایک قطرہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی قوت کے بے پناہ سمندر کا حصہ بن جاتی ہے۔ اب اس کی طاقت ایک قطرے کی طاقت نہیں بلکہ سمندر کی طاقت ہے۔ اب ریت کا طوفان بھی اس پر غالب آکر اسے خشک کرنے کی کوشش کرے تو ناکامی کا منہ دیکھے گا۔ اب یہ قوم محض انسانوں کا ایک ہجوم نہیں رہتی بلکہ یہ اللہ کی جماعت اور پارٹی ہے اور اللہ کی پارٹی کو اور اس کی جماعت کو دنیا کی پارٹیاں اور جماعتیں شکست نہیں دے سکتیں کیونکہ اس کی شکست اللہ کی شکست ہوگی اور اللہ تو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی جماعت بھی ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اقبال نے کہا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا و کار ساز

(روح)

کمزور دل والوں اور ظاہر بینوں کی تسلی

کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلّت عدد کو دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار، کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقاء کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے فرمادیا کہ مسلمانوں کی قلّت اور ظاہری بے سروسامانی پر نظر مت کرو۔ جس طرف خدا اور اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے، وہی پلہ بھاری رہے گا۔

حضرت عبادہ (رض) کی فضیلت

یہ آیتیں خصوصیت سے حضرت عبادہ ابن صامت (رض) کی منقبت میں نازل ہوئی ہیں۔ یہود بنی قینقاع سے ان کے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر خدا اور رسول کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انھوں نے اپنے سب تعلقات منقطع کر دیے۔ (عثمانی)
ومن یتول اللہ ورسولہ والذین امنوا اور جن کے دوست اللہ ' اللہ کا رسول اور مؤمن ہوں (تو یہ اللہ کا گروہ ہوگا) حضرت ابن عباس نے فرمایا ان سے مراد مہاجر و انصار ہیں یعنی جو لوگ مہاجرین و انصار کی دوستی اختیار کریں گے۔

رافضیوں کا استدلال

رافضی قائل ہیں کہ خلافت کا حصر صرف حضرت علی میں ہے اس قول پر استدلال روافض نے اس آیت سے کیا ہے اس جگہ ولی سے مراد ہے مسلمانوں کا ناظم اور امور انتظامیہ کا متولی پس اللہ نے اپنے لیے اور اپنے رسول کے لیے جس طرح ولایت کو ثابت کیا ہے اسی طرح علی (رض) کو بھی مسلمانوں کا والی قرار دیا ہے اور لفظ انما کو حصر کے لیے ذکر کیا ہے (تاکہ مسلمانوں کا والی اللہ ' اللہ کا رسول اور علی قرار پائیں کسی دوسرے کو یہ امتیازی وصف حاصل نہ ہو) اور چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا والی ہونا عمومی ہے (تمام مسلمانوں کو حاوی ہے) اس لیے علی کی ولایت بھی عمومی ہے بس علی ہی امام ہیں آپ کے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ ہونے کا حق نہیں ' اس کی تائید براء بن عازب اور زید بن ارقم کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (مقام) خم کے تالاب پر فروکش ہوئے تو علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مؤمنوں کا والی خود ان کی ذات سے بھی زیادہ ہوں ' صحابہ نے عرض کیا بیشک ایسا ہی ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے اللہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علی بھی مولیٰ ہے ' اے اللہ جو علی کا دوست ہو تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو علی کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو جا۔ اس واقعہ کے بعد عمر کی ملاقات علی سے ہوئی تو عمر نے کہا اے ابن ابی طالب تم کو مبارک ہو تم شبانہ روز (ہر وقت) ہر مؤمن مرد و عورت کے مولیٰ ہو گئے۔ رواہ احمد وغیرہ۔
یہ حدیث حد تواتر تک پہنچ چکی ہے تقریباً تیس صحابیوں کی روایت سے محدثین کی ایک جماعت نے صحاح سنن اور مسندوں میں اس کا ذکر کیا ہے ' علی بن ابی طالب ' بریدہ بن حصیب ' ابو ایوب عمرو بن مرہ ' ابوہریرہ ' ابن عباس ' عمار بن بریدہ ' سعد بن وقاص ' عبداللہ بن عمر ' انس بن مالک ' جریر بن مالک بن حویرث ' ابو سعید خدری ' طلحہ ' ابوالطفیل ' حذیفہ بن اسید اور بکثرت دوسرے صحابہ نے اس کو بیان کیا ہے ' بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں۔ میں جس کا والی اس کی جان سے زیادہ ہوں علی بھی اس کا ولی (والی) ہے
غدیر خم کی یہ حدیث واضح طور پر علی کی خلافت کو ثابت کر رہی ہے ' عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے۔ علی ہر مؤمن کا ولی (والی) ہے رواہ الترمذی وابن ابی الشیبہ۔ یہ دونوں حدیثیں آیت مذکورہ سے بھی زیادہ علی کی خلافت پر واضح طور سے دلالت کر رہی ہیں کیونکہ آیت کا نزول اگر علی کے لیے قرار دیا جائے تب بھی تمام مؤمنوں کو حکم ولایت شامل ہے اور دونوں حدیثوں میں تو علی کی خصوصی ولایت کی صراحت ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا)۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ آیت اور حدیثوں سے سوائے حضرت علی کے دوسروں کی خلافت کی نفی پر دلیل لانی غلط ہے 'کیونکہ صاحب قاموس نے لکھا ہے وَلِی وَلْیٌ سے اسم (صفت) ہے ولی کا معنی ہے 'محب 'دوست 'مددگار 'جوہری نے صحاح میں لکھا ہے 'ولاء اور توالی دو یا زیادہ چیزوں کا اس طرح ہو جانا کہ ان کے درمیان بیگانگی نہ رہے 'مجازاً اُس کا اطلاق قرب مکانی 'قرابت نسبی 'قرابت دینی۔قرب دوستی 'قرب مدد 'قرب عقیدہ اور آقائیت پر ہوتا ہے اور ناظم امور (متولی انتظام) ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے مولیٰ کا معنی ہے مالک 'غلام 'آزاد کرنے والا 'آزاد کیا ہوا 'ساتھی قرابتدار 'جیسے چچا کا بیٹا بہن کا بیٹا 'ہمسایہ 'معاہد 'مہمان 'شریک 'رب 'ولی 'مددگار 'نعمت دینے والا 'انعام یافتہ 'محب 'تابع 'دوست قرآن میں یہ لفظ آیا ہے بندہ کی خدا سے جو نسبت محبت و قربت ہوتی ہے اس کو ولایت کہتے ہیں اور ولی کا اطلاق بندہ پر بھی ہوتا ہے جیسے کسی کو ولی اللہ کہا جاتا ہے اور اللہ پر بھی ہوتا ہے آیت میں آیا ہے اللّٰہ ولی الذین امنوا قرآن میں مولی کا اطلاق اللہ پر آیا ہے 'فرمایا ہے نعم المولی و نعم النصیر نیز جبرائیل اور نیک مؤمنوں پر بھی آیا ہے 'فرمایا ہے ان اللّٰہ ہو مولاہ و جبرائیل و صالح المؤمنین۔

خلاصہ یہ کہ یہ آیت اور یہ احادیث تعیین کے ساتھ حضرت علی کی خلافت پر ہی دلالت نہیں کرتیں دوسروں کی خلافت کی نفی تو بجائے خود رہی ہاں آیت سے حضرت علی کا مستحق ہونا اور احادیث سے حضرت علی کی محبت کا واجب ہونا اور آپ کی دشمنی کا حرام ہونا ضرور ثابت ہو رہا ہے جس طرح آیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستی اور موالات رکھنے کی حرمت معلوم ہو رہی ہے۔ابو نعیم مدائنی کا بیان ہے کہ جب حسن مثنیٰ بن امام حسن مجتبیٰ سے کہا گیا کہ حدیث من کنت مولاہ میں حضرت علی کی خلافت کی صراحت ہے تو فرمایا سنو خدا کی قسم اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کی یہ مراد ہوں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بالکل واضح طور پر بیان فرما دیتے 'حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں سے تو سب سے واضح کلام فرمایا کرتے تھے 'غدیر خم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کی اس تقریر کا باعث یہ تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کو امیر لشکر بنا کر یمن بھیجا حضرت علی نے خمس کے مال میں سے ایک باندی لے لی اس کی شکایت بعض لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کی 'حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس شکایت کو سن کر غضبناک ہو گئے اور فرمایا تم ایسے شخص سے کیا چاہتے ہو جو اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں 'پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ خطبہ دیا تاکہ حضرت علی کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں جم جائے اور ان کی شکایت دور ہو جائے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس خطبہ میں جو یہ فرمایا ہے الستم تعلمون انی اولی بکل مؤمن اس سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ علی کی محبت کا جو میں تم کو حکم دے رہا ہوں اس کی تعمیل تم پر واجب ہے اسی طرح آخر کلام میں جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی ہے اس کی غرض بھی علی کی محبت کی تاکید ہے۔

آیت میں دو طرح سے رافضیوں کی تردید ہے

یہ آیت دو طرح سے رافضیوں کے مذہب کی تردید کر رہی ہے۔

(1) رافضیوں کے مذہب کی بناء تقیہ پر ہے مگر آیت: اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاہدون فی سبیل اللہ لا یخافون لومۃ لائم تقیہ کی تردید کر رہی ہے (اس میں تعریف ان لوگوں کی گئی ہے جو علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ جہاد کرتے ہوں اور کسی کے برا کہنے سے نہیں ڈرتے ہوں)

حضرت علی (رض) نے تینوں خلفاء کی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ مل کر ۲۳ برس تک نمازیں پڑھیں اور جہاد کئے اور حضرت عمر (رض)

سے اپنی صاحبزادی کا نکاح کرایا کیا سب کچھ تقیہ کے ساتھ لوگوں کے دباؤکے زیر اثر تھا اگر ایسا تھا تو پھر آپ کا شمول اس آیت کے حکم میں نہ ہوگا 'اس قول کے کہنے کی جرأت سوائے رافضیوں کے کوئی سنی تو کر نہیں سکتا۔

(2) آیت فان حزب اللّٰہ ہم الغالبون بتارہی ہے کہ صرف اہل سنت کا فرقہ ہی فرقہ ناجیہ ہے رافضی یا کوئی دوسرا بدعتی فرقہ نجات یافتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمیشہ اہل سنت غالب رہے ہیں بلکہ رافضی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت علی نے محض تقیہ کے ساتھ دباؤکے زیر اثر خلفاء ثلاثہ کا ساتھ دیا اور آپ کے بعد دوسرے اماموں نے خوف کی وجہ سے اپنے دین کا اظہار نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں کو پوشیدہ طور پر دین کی تعلیم دیتے رہے اور پوشیدہ رکھنے کا ہی حکم دیتے رہے اور برابر کہتے رہے دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بہت ہی اخفاء سے کام لینا چاہیے 'امام باقر اور امام جعفر صادق کی طرف یہ لوگ ایسے ہی اقوال کی نسبت کرتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں 'یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب الامر (امام مہدی) سامرہ کے تہ خانہ میں ہزار برس سے چھپے ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

آیت کا شان نزول

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رفاعہ بن زید بن تابوت اور سوید بن حارث بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر باطن میں کافر تھے مسلمان دونوں کو دوست سمجھنے لگے تھے اس پر مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔ (مظہری، گلدستہ)

کشاف میں ہے کہ حزب اللہ سے مراد رسول اللہ اور مومن ہیں۔ جو کوئی انھیں دوست بنائے تو اس نے حزب اللہ کو دوست بنایا اور ان کا ہاتھ پکڑا جو کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔ (تفسیرات)

آخر میں اہل تشیع کی تفسیر نمونہ کے مطابق

اس آیت میں "ولایت "کے اس معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گزشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی "ولایت "بمعنی " سرپرستی، تصرف اور رہبری "کیونکہ "حزب اللہ "اور اس کا غلبہ حکومت اسلامی سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے اور یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں "دلایت "سرپرستی، حکومت نیز اسلام اور مسلمانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے کیونکہ "حزب "کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل، وابستگی اور مشترک اہداف و مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔ توجہ رہے کہ " الذین امنا "سے اس آیت میں تمام صاحب ایمان مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد جو شخص ہے جس کی طرف معین اوصاف کے ساتھ گزشتہ آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آیت میں حزب اللہ کی کامیابی سے مراد صرف معنوی کامیابی ہے یا اس میں ہر طرح کی معنوی و مادی کامیابی شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا اطلاق حزب اللہ کی عام محاذوں پر مطلق کامیابی کی دلیل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی جمعیت حزب اللہ میں شامل ہو یعنی ایمان محکم، تقویٰ، عمل صالح، اتحاد، کامل باہمی اعتماد، آگاہی اور علم رکھتا ہو اور کافی تیاری کئے ہوئے ہو تو بلاتردید وہ تمام معاملات میں کامیاب ہوگا۔ آج اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی میسر نہیں ہے تو اس کا سبب واضح ہے کیونکہ حزب اللہ کی مذکورہ شرائط میں سے زیادہ تر آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو توانائیاں اور صلاحیتیں دشمن کو شکست دینے کے لیے استعمال

ہونا چاہئیں۔ زیادہ تر ایک دوسرے کو کمزور کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔ سورۃ مجادلہ آیت ۲۲ میں بھی حزب اللہ کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں جس کی تعبیر انشاء اللہ متعلقہ مقام پر آئے گی۔ (نمونہ)

کیا ہی عزت افزائی ہے اس ایمان والے کی، جو اللہ ورسول اور مومنین سے محبت رکھتے ہوئے فرائض اسلامی کی ادائیگی کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنا گروہ ارشاد فرمارہا ہے اسی طرح کس قدر بدنصیب ہے وہ جو واللہ تعالیٰ اور رسول پاک اور مومنین کے غیر سے محبت کرتا ہے اور اس طرح وہ شیطانی گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔۔ تو مسلمانوں تمہاری دوستی کسی ایسے سے نہ ہونی چاہیے جو دین کا مدعی ہو کر، خواہش نفسانی پر عمل کرکے حق اور صواب کی تحریف میں لگا رہتا ہے جیسے کہ اہل کتاب یہود نصاری۔۔ یا۔۔ وہ کسی دین کا بھی پابند نہ ہو، جیسے مشرکین۔ (اشرفی)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

لغۃ القرآن:

[يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][لَا تَتَّخِذُوا : نہ تم بناؤ][الَّذِيْنَ : ان لوگوں][اتَّخَذُوْا : انہوں نے بنا لیا][دِيْنَكُمْ : تمہارا دین][هُزُوًا : مذاق][وَّلَعِبًا : اور کھیل][مِّنَ : سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اُوْتُوا : جو دیے گئے][الْكِتٰبَ : کتاب][مِنْ قَبْلِكُمْ : پہلے تمہارے][وَالْكُفَّارَ : اور کفار][اَوْلِيَآءَ : دوست (جمع)][وَاتَّقُوا : اور ڈروتم][اللّٰهَ : اللہ][اِنْ : اگر][كُنْتُمْ : ہو تم][مُّؤْمِنِيْنَ : ایمان والے]

ترجمہ: اے ایمان والو! ایسے لوگوں میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنائے ہوئے ہیں اور کافروں کو دوست مت بناؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو بشرطیکہ تم (واقعی) صاحب ایمان ہو۔

تشریح:

مناسبت اور شان نزول

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود اور نصاری کو دوست بنانے سے منع فرمایا تھا۔ اسی سیاق میں یہ آیت نازل فرمائی ہے 'اور اس میں مزید یہ فرمایا ہے کہ کافروں کو بھی دوست نہ بناؤ۔

رفاعہ بن زید بن التابوت اور سوید بن الحارث دونوں نے اسلام ظاہر کیا اور دراصل یہ دونوں منافق تھے 'اور بہت سے مسلمان ان سے محبت رکھتے تھے 'تو اللہ نے ان دونوں کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی اے ایمان والو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے۔ الایہ۔ (السیرۃ النبویہ 'ج ۲ ص ۱۸۱ جامع البیان 'جز ٦ 'ص ۳۹۱ 'اسباب نزول القرآن 'ص ۲۰۲)

یہود و نصاری اور بت پرستوں سے متعلق قرآن مجید کی اصطلاح :

اس آیت میں کفار سے مراد مشرکین ہیں 'ہر چند کہ یہود و نصاری اور بت پرست سب کافر ہیں لیکن قرآن مجید کی اصطلاح ہے کہ وہ یہود و نصاری پر اہل کتاب کا اطلاق کرتا ہے اور بت پرستوں پر کفار اور مشرکین کا اطلاق کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ جب مسلمان سجدہ کرتے تو یہود اور مشرکین ان کا مذاق اڑاتے تھے اور جب مسلمان اذان دیتے تو وہ کہتے 'یہ اس طرح چلا رہے ہیں جیسے قافلے والے چلاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور مشرکین کو دوست بنانے سے مسلمانوں کو منع فرما دیا۔

ملکی اور جنگی معاملات میں کفار سے خدمت لینے میں مذاہب

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر کی طرف گئے 'جب آپ ﷺ حرۃ الوبرہ (مدینہ سے چار میل ایک جگہ) پہنچے تو آپ ﷺ کو ایک شخص ملا 'جس کی جرات اور بہادری کا بہت چرچا تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے 'اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ ﷺ کی اتباع کروں اور مال غنیمت حاصل کروں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا: اللہ اور اس رسول پر ایمان لاتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا واپس جاؤ میں کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا 'وہ چلا گیا 'حتی کہ جب ہم ایک درخت کے پاس پہنچے تو اس نے پھر اپنی پیشکش کی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر یہی جواب دیا کہ میں مشرک سے ہرگز مدد نہیں لوں گا وہ چلا گیا 'پھر مقام بیداء پر ملا 'اور اس نے پھر پیشکش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہو۔ اس نے کہا ہاں تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چلو۔ (صحیح مسلم 'الجہاد '۱۵۰ '(۱۸۱۷) ۴۶۱۹ 'سنن ترمذی 'ج '۳ 'رقم الحدیث : '۱۵٦۴ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : '۲۷۳۲ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث : '۲۸۳۲ 'سنن دارمی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۲۴۹٦ 'مسند احمد 'ج ۹ 'رقم الحدیث : '۲۵۲۱۲ 'طبع دار الفکر 'مسند احمد بتحقیق احمد شاکر 'ج ۱۷ 'رقم الحدیث : '۲۴۲٦۷ 'طبع دار الحدیث 'قاہرہ)

امام شافعی اور دوسرے فقہاء نے کہا ہے 'اگر مسلمانوں کے متعلق کافر کی رائے اچھی ہو اور اس کی مدد کی ضرورت ہو تو اس سے مدد لی جائے ' ورنہ اس سے مدد لینا مکروہ ہے اور یہ حدیث اسی صورت پر محمول ہے 'اور جب مسلمانوں کی اجازت سے کافر سے خدمت لی جائے تو اسے کچھ معاوضہ دے دیا جائے اور اس کا حصہ نہ نکالا جائے۔ امام مالکؒ 'امام شافعیؒ 'امام ابو حنیفہؒ اور جمہور کا یہی مسلک ہے۔ (تبیان)

مذہب ایک مقدس امانت ہے جس کو انسان کا دل منتخب کرتا ہے۔ اسی لیے انسان کو اپنے مذہب اور مذہبی شخصیات سے قلبی لگاؤ ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کے مذہب کی توہین کرے تو وہ دراصل اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اسلامی احکام کا مذاق اڑاتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں بلکہ دراصل وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ یہ احکام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقرر فرمائے ہیں، نیز جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی دشمنی اور حقارت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کے عقائد کو چیلنج کرتے ہیں اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرتے ہیں تو ایسے فتنہ پرور لوگوں سے نفرت اور دشمنی کرنی چاہیے تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو۔ وہ کسی دوستی اور رازداری کے لائق نہیں ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے دہشت گرد غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (امداد)

ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے دین سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن اور استہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اسلام اور اکابر اسلام سے متعلق آئے دن یورپ والے اہانت آمیز فلمیں بنا کر درپردہ اسلام کی اہانت کرتے ہیں کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں غیرت ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو تو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ ورسم پیدا کرنے یا قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لیے بھی گوارا کرے گا، اگر ان کے کفر و عناد اور عداوت اسلام سے بھی قطع نظر کرنی چاہے تب بھی دین اسلام کے ساتھ ان کا تمسخر اور استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک موالات کا ہے چنانچہ ان آیات میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:۔

"اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب آسمانی یعنی توراۃ وانجیل مل چکی ہے (مراد یہود و نصاریٰ) جو ایسے ہیں کہ انھوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور اسی طرح دوسرے کفار کو بھی جیسے مشرکین وغیرہ دوست مت بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (یعنی ایمان دار تو ہو ہی پس جس چیز سے اللہ نے منع کیا ہے اس کو مت کرو) چنانچہ جب تم نماز کے لیے اذن کے ذریعہ سے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ تمہاری اس عبادت کے ساتھ جس میں اذان و نماز دونوں آ گئیں ہنسی اور کھیل کرتے ہیں اور یہ حرکت اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے ورنہ امر حق کو سمجھتے اور اس کے ساتھ ہنسی نہ کرتے۔

یہاں یہود و نصاریٰ اور دوسرے کفار کے متعلق بتلایا گیا کہ یہ لوگ بے عقل ہیں اور ان کے بے عقلی کی دلیل یہ دی گئی کہ دین حق کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے عقل فرمایا ہے حالانکہ امور دنیا میں ان کی عقل و دانش مشہور معروف ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان ایک قسم کے کاموں میں ہوشیار عقل مند ہو مگر دوسری قسم میں بیوقوف ہو اور لایعقل ہو کہ یا وہ عقل سے کام نہ لیتا یا اس کی عقل اس طرف چلتی نہیں اس لیے اس میں بیوقوف لایعقل ثابت ہوتا ہے قرآن کریم نے اسی مضمون کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے، یعلمون ظاہرا من۔۔تا۔۔ غفلون۔ یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے سطحی امور کو تو خوب جانتے ہیں مگر انجام وآخرت سے غافل اور انجان ہیں۔

یہود و نصاری کفار و مشرکین کو بے عقل اس وجہ سے بتلایا گیا کہ مسلمانوں کی عبادت جیسے نماز اور اذان کی حقیقت نہیں سمجھتے اور ہنسی اڑاتے ہیں اگر ان کو ذرا عقل ہوتی تو سمجھتے کہ خالق کی عبادت اور بندگی اس کی تعظیم و تکبیر اور اس کی توحید کا اظہار و اعلان جس کی تمام کتب سماویہ اور انبیاء سابقین کی شریعتیں مصدق ہیں کسی طرح قابل استہزا اور تمسخر نہیں کلمات اذان میں اس کے سوا کیا ہے کہ خداوند قدوس کی عظمت اور بڑائی کا اظہار ہے توحید کا اعلان ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمام انبیاء سابقین اور کتب ساویہ کے مصدق ہیں ان کی رسالت کا اقرار ہے نماز جو غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے، اس کی طرف دعوت ہے فلاح دارین اور اعلی سے اعلی کامیابی حاصل کرنے کے لیے بلاوا ہے۔ پھر ان میں کون ایسی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے لائق ہو، ایسی نیکی اور حق و صداقت کی آواز پر مسخراپن کرنا صرف اسی کا کام ہو سکتا ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز نہ رہے، اگر غور کیا جائے تو اذان میں تمام انسانون کے لیے امن و امان کا اعلان ہے اور ان کی زندگی کا صحیح راستہ اس میں بتادیا گیا ہے۔

تفسیر مظہری میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی تھا جب وہ اذان میں اشھد ان محمد رسول اللہ سنتا تو یہ کہتا اللہ جھوٹے کو آگ میں جلائے۔ آخر کار اس کا یہ کلمہ ہی اس کے پورے گھرانے کے جل کر خاک ہو جانے کا سبب بن گیا جس کا واقعہ یہ کہ ایک رات اس کی خادمہ آگ لا رہی تھی اور وہ نصرانی اور اس کے سب گھر والے پڑے سو رہے تھے اتفاق سے اس کے ہاتھ سے اس آگ سے ایک چنگاری اڑ کر کسی کپڑے پر گری جس سے وہ گھر اور وہ نصرانی اور اس کے سب گھر والے جل کر خاکستر ہو گئے اور اس نصرانی کے قول کے مطابق خدا نے جھوٹے کو جلا دیا۔ اور اللہ نے یہ دکھلا دیا کہ صادق امین کو جھوٹا بتلانے والا جہنم میں جانے سے پہلے ہی کس طرح آگ میں جلایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اہل ایمان کو غیر مسلموں سے دوستی کرنے کے لیے غیرت ایمانی کی وجہ سے بھی ممانعت فرمائی جا رہی ہے، اور کفار و مشرکین کی بے عقلی کی وجہ سے بھی اس لیے کہ بے عقل آدمی لائق محبت نہیں اور ساتھ ہی واتقواللہ ان کنتم مومنین، فرما کر اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو، اس امر کی مزید تاکید فرمائی، مگر افسوس صد افسوس کہ اس وقت کے مسلمان کے لیے یہود و نصاری اور کفار و مشرکین ہی کی ساری چیزیں پیاری ہیں اور محبوب بنی ہوئی ہیں الاماشاء اللہ۔ لباس ہے تو ان کا پسند معاشرت ہے تو ان کی پسند شکل و صورتے تو ان کی پیاری ہر معاملہ میں ان کی نقالی کو فخر سمجھا جاتا ہے، انا اللہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دین کی سمجھ عطا فرمائیں اور ہم کو دینی غیرت و حمیت نصیب فرمائیں۔ آمین۔

آگے بھی اسی تاکید کے لیے یہ کفار و مشرکین یہود و نصاری ہر گز ہر گز دوستی کے لائق نہیں بتلایا گیا کہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ نے لعنت فرمائی اور جن پر خدا کا غضب ہوا نازل ہوا اور کچھ لوگ ان میں کے سور اور بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے تو ایسے برے لوگ کسی طرح دوستی کے لائق نہیں جس کا بیان انشاء اللہ اگلی آیات میں آئندہ درس میں ہوگا۔

دعا کیجئے ! اللہ ہم کو دین اسلام سے قوی اور صحیح تعلق نصیب فرمائیں، اور دین کی ہر بات کی وقعت و عزت اور احترام ہمارے دلوں میں پیدا فرمائیں۔ یا اللہ کفار مشرکین یہود و نصاری کی موالات اور دوستی سے ہم کو بچایئے۔ اور جملہ قرآنی احکام پر ہم کو عمل پیرا ہونے کی توفیق کاملہ نصیب فرمایئے۔ یا اللہ جو اعدائے دین ہماری اذان اور نماز کی ہنسی اڑاتے ہیں اور مذہب اسلام کی اہانت کرتے ہیں ان سے ہم کو ترک موالات نصیب فرمایئے، ایسے بے عقل لوگوں سے ہم کو قطع تعلق کی توفیق عطا فرمایے۔ یا اللہ ہماری اس بدحالی کو دور فرما کر جو ہم نے آج یورپ کے بیدین اور یہود و نصاری کی معاشرت، طور طریق اور لباس کو پسند کر رکھا ہے یا اللہ اہل اسلام میں دینی غیرت اور حمیت کا جذبہ پیدا فرمادے،

اور ان کے دلوں میں مغربیت سے کراہت اور نفرت پیدا کردے۔ یا اللہ ہماری نظروں میں دین کو سب سے زیادہ معظم و محترم بنادے اور شعائر اسلام کی محبوبیت ہم کو عطا فرمادے۔ آمین۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (درس)

کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔

یہودِ بنو قریظہ کی سازش

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد ان اطراف کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ اس پر کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے، نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی امداد کریں گے۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اسی طرح مسلمان نہ ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ ان کے خلاف کسی قوم کی امداد کریں گے بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے۔ کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ جانبین سے قائم رہا، لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے سازش کر کے ان کو قلعہ میں بلانے کے لیے خط لکھ دیا۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے مقابلہ کے لیے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیا۔ بنو قریظہ کے یہ یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے لیے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے۔ اس لیے یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی گہری دوستی سے روک دیا، تاکہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کر سکیں۔

صحابہ کرامؓ کا آیت پر عمل

اس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہ بن صامت وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور ترک موالات کا اعلان کر دیا۔ اور بعض لوگ جو منافقانہ طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا ابھی ایمان ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے قطع تعلق کر دینے میں یہ خطرات محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکین و یہود کی سازش کامیاب ہو جائے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں تو ہمیں ان لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے لیے مصیبت نہ ہو جائے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے اسی بناء پر کہا کہ ان لوگوں سے قطع تعلق میں تو مجھے خطرہ ہے۔ اس لیے ایسا نہیں کر سکتا

ترک موالات کی تاکید

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو موالات کفار سے منع فرمایا تھا اس آیت میں ایک خاص موثر عنوان سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی اور موالات سے نفرت دلائی گئی ہے ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن واستہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ (اذان وغیرہ) کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال

شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں خشیتہ الٰہی اور غیرت ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ ورسم پیدا کرنے یا قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لیے گوارا کرے گا اگر ان کے کفر و عناد اور عداوت اسلام سے بھی قطع نظر کرلی جائے تو دین قیم کے ساتھ ان کا یہ تمسخر واستہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک موالات کا ہے۔

پچھلی قوموں کی بربادی کا سبب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگلے لوگ جو برباد ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے برے کام اختیار کیے اور ان کے علماء نے انھیں منع نہ کیا حضرات اہل علم تفصیل کے لیے امام غزالی کی احیاء العلوم باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر دیکھیں۔ (گلدستہ)

الغرض۔۔اگر تم سچے ایمان والے ہو تو ایسوں کو دوست بنا کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھ کر ان کی دوستی اور یاری سے بچو، اس لیے کہ ایمان تقوی کا مقتضی ہے ذرا غور تو کرو کہ جو تمہارے دین کے ساتھ ٹھٹھا کرتا ہے وہ تو اس لائق ہے کہ اس سے دشمنی کی جائے نہ کہ اس سے دوستی اور یاری کا دم بھرا جائے۔ ذرا ان کتابیوں کا طرز عمل تو دیکھو کہ جب رسول کریم کے موذن اذان دیتے تو وہ آپس میں ہنستے اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تو ان کی سفاہت و بیوقوفی کی طرف اشارہ کرکے ہنسی کھیل کرتے اور کہتے کہ ان کی جہالت کا حال دیکھو کہ کس طرح اللہ کی عبادت کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا صرف اہل اسلام سے نفرت دلانا مقصود تھا اور چاہتے تھے کہ ان کے لوگ دائمی طور پر اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ (اشرفی)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

لغۃ القرآن:

[وَاِذَا : اور جب][نَادَيْتُمْ : تم پکارتے ہو][اِلَى الصَّلٰوةِ : طرف نماز][اتَّخَذُوْهَا : بنالیتے ہیں اسے][هُزُوًا : مذاق][وَّلَعِبًا : اور کھیل][ذٰلِكَ : وہ][بِاَنَّهُمْ : اس وجہ سے وہ][قَوْمٌ : قوم][لَّا : نہیں][يَعْقِلُوْنَ : وہ عقل رکھتے]

ترجمہ: اور جب تم نماز کے لیے (لوگوں کو بصورت اذان) پکارتے ہو تو یہ (لوگ) اسے ہنسی اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (بالکل) عقل ہی نہیں رکھتے۔

تشریح: گزشتہ شریعتوں میں اذان کا رواج نہیں تھا، مختلف اشاروں اور آوازوں کے ذریعہ اوقات عبادت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اذان کی ابتدا کی جو نہ صرف ایک آواز تھی بلکہ ترغیب کی ایک مکمل دعوت تھی تو بجائے اس کے کہ وہ اس سے سبق حاصل کرتے الٹا وہ اذان کا مذاق اڑانے لگے جو کہ ان کی کج فہمی اور نادانی کی دلیل ہے۔

اذان کا مقصد

اذان صرف نماز کے لیے ایک وقتی دعوت ہی نہیں بلکہ اسلام کے پورے نظام حیات کا اعلان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی، توحید و رسالت کی گواہی اور نماز و فلاح کی یاددہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان برداروں اور نافرمانوں کے درمیان پہچان کی کسوٹی ہے۔ اہل اطاعت اذان سنتے ہی دنیاوی کام چھوڑ کر رازق حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور مال و زر کے پجاری اپنے فانی اور عارضی محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، نیز جو مسلمان کسی دنیاوی افسر یا وزیر کی دعوت پر خوش ہوتے ہیں اور سارے کام چھوڑ کر اس کے ہاں جانے کی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن ساری کائنات کے خالق اور مالک یعنی اللہ تعالیٰ کی دعوت پر کان نہیں دھرتے اور مسجد میں حاضری کی کوشش نہیں کرتے انھیں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ (امداد)

اذان کے متعلق یہود کہا کرتے کہ یہ کیا نئی رسم نکالی ہے جس کا پہلے دینوں میں نام و نشان تک نہیں۔ یہ شور و غل ناقابل برداشت ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے گھنٹوں اور ناقوسوں کی بے معنی چیخ و پکار کے مقابلہ میں اذان کے پیارے پیارے اور معنی خیز جملوں کی قدر کرتے وہ الٹا تمسخر اڑاتے۔ یہ ان کی حماقت اور نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ مدینہ میں ایک عیسائی تھا جب موذن اشھد ان محمد الرسول اللہ کے دلنواز الفاظ کہتا تو وہ بدبخت کہا کرتا حرق الکاذب کہ جھوٹا جلایا جائے۔ چنانچہ ایک رات وہ سو رہا تھا کہ اس کے گھر میں آگ لگ گئی جس میں وہ اور سارا کنبہ جل کر راکھ ہو گیا۔ گویا اس کو جلا کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ جھوٹا کون ہے۔ (ضیاء)

شان نزول

ایک روایت میں آیا ہے کہ کفار جب اذان سنتے تو جل جاتے ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے عرض کیا محمد تم نے ایک ایسی بدعت نکالی ہے کہ تم سے پہلے کسی امت میں اس کی نظیر کہیں سننے میں نہیں آئی اگر تم نبوت کے مدعی ہو تو اس بدعت کو ایجاد کر کے تم نے گزشتہ انبیاء کی کیوں مخالفت کی۔ اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو انبیاء اس بھلائی کے زیادہ مستحق تھے انھوں

نے ایسا کیوں نہیں کیا ' یہ مینڈھے کی طرح چیخنا تم نے کہاں سے سیکھا۔ کیسی بری آواز ہوتی ہے اور یہ کام کتنا قبیح ہے اس پر آیت **وَمَنْ اَحْسَنَ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا** نازل ہوئی اور یہ آیت بھی اتری۔

بے سمجھ قوم

ذلک بانہم قوم لا یعقلون یہ (حق سے استہزاء) اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ سمجھتے نہیں۔ کیونکہ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ استہزاء نہ کرتے اور کسی چیز کی اچھائی برائی پر غور کرتے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ کافروں میں دینی سمجھ نہیں ہوتی خواہ دنیا کے معاملات میں کتنے ہی ہوشیار ہوں اس سے معلوم ہوا کہ عقل و حواس سے سوچنا اور انجان چیزوں پر غور کرنا حصول علم کی علت موجبہ نہیں (اگرچہ فلاسفہ صحیح غور و فکر کو حصول علم کا لازمی سبب قرار دیتے ہیں) بلکہ اللہ کا قانون اور دستور ہے کہ اگر آدمی صحیح غور و فکر کرتا ہے تو خدا انجان چیز کا علم عطا کر دیتا ہے۔ (تو گویا غور و فکر! اور نتیجہ کے درمیان اصل چیز اللہ کی مشیت ہے)۔

کافروں کا اذان سے جلنا

یعنی جب اذان کہتے ہو تو اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھا کرتے ہیں جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلمات اذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریاء کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں، ان کی رسالت کا اقرار۔ نماز جو تمام اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے، اس کی طرف دعوت، فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے بلاوا، ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے پھر اس میں کونسی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے قابل ہو ایسی نیکی اور حق و صداقت کی آواز پر مسخرا پن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے۔

ایک عیسائی کا جلنا

بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشھد ان محمداً رسول اللہ سنتا تو کہتا قد حرق الکاذب (جھوٹا جل گیا یا جل جائے) اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو، مگر یہ بات بالکل اس کے حسب حال تھی۔ کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج و شیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب میں کوئی چھوکری آگ لے کر اس کے گھر میں آئی۔ وہ اور اس کے اہل و عیال سو رہے تھے ذرا سی چنگاری نادانستہ اس کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع سونے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔

حضرت ابو محذورہ (رض)

اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کاایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں حضرت بلال نے اذان کہی، چند نو عمر لڑکے جن میں ابو محذورہ بھی تھے، اذان کی ہنسی اور نقل کرنے لگے، آپ نے سب کو پکڑ بلوایا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو محذورہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو مکہ کا موذن مقرر فرمادیا۔ اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی۔

حضرت عبداللہ بن محیریز جب شام کے سفر کو جانے لگے تو حضرت محذورہ سے جن کی گود میں انھوں نے ایام یتیمی بسر کئے تھے، کہا آپ کی اذان کے بارے میں مجھ سے وہاں کے لوگ ضرور سوال کریں گے تو آپ اپنے واقعات تو مجھے بتا دیجئے۔ فرمایاہاں سنو جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حنین سے واپس آ رہے تھے، راستے میں ہم لوگ ایک جگہ رکے، تو نماز کے وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے موذن نے اذان کہی، ہم نے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا، کہیں آپ کے کان میں بھی آوازیں پڑ گئیں۔ سپاہی آیا اور ہمیں آپ کے پاس لے گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم سب میں زیادہ اونچی آواز کس کی تھی؟ سب نے میری طرف اشارہ کیا تو آپ نے اور سب کو چھوڑ دیا اور مجھے روک لیا اور فرمایا اٹھو اذان کہو واللہ اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات سے اور آپ کی فرمان برداری سے زیادہ بری چیز میرے نزدیک کوئی نہ تھی لیکن بے بس تھا، کھڑا ہو گیا، اب خود آپ نے مجھے اذان سکھائی اور جو سکھاتے رہے، میں کہتا رہا، پھر اذان پوری بیان کی، جب میں اذان سے فارغ ہوا تو آپ نے مجھے ایک تھیلی دے، جس میں چاندی تھی، پھر اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھا اور پیٹھ تک لائے، پھر فرمایا اللہ تجھ میں اور تجھ پر اپنی برکت نازل کرے۔ اب تو اللہ کی قسم میرے دل سے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عداوت بالکل جاتی رہی، ایسی محبت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دل میں پیدا ہو گئی، میں نے آرزو کی کہ مکہ کا موذن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ کو بنا دیں۔ آپ نے میری یہ درخواست منظور فرمالی اور میں مکہ میں چلا گیا اور وہاں کے گورنر حضرت عتاب بن اسید سے مل کر اذان پر مامور ہو گیا۔ حضرت ابو محذورہ کا نام سمرہ بن مغیرہ بن لوذان تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چار موذنوں میں سے ایک آپ تھے اور لمبی مدت تک آپ اہل مکہ کے موذن رہے۔ (رض) وارضاہ۔

عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام کا اقرار

فتح مکہ کے سال حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت بلال کو کعبے میں اذان کہنے کا حکم دیا، قریب ہی ابو سفیان بن حرب، عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام بیٹھے ہوئے تھے۔ عتاب نے تو اذان سن کر کہا کہ میرے باپ پر تو اللہ کا فضل ہوا کہ وہ اس غصہ دلانے والی آواز کے سننے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسا، حارث کہنے لگا اگر میں اسے سچا جانتا تو مان ہی لیتا۔ ابو سفیان نے کہا کہ بھئی میں تو کچھ بھی زبان سے نہیں نکالتا، ڈر ہے کہ کہیں یہ کنکریاں اسے بھئی خبر نہ کر دیں۔ انھوں نے باتیں ختم کی ہی تھیں جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آگئے اور فرمانے لگے اس وقت تم نے یہ باتیں کہی ہیں، یہ سنتے ہی عتاب اور حارث تو بول پڑے کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے سچے

رسول ہیں۔ یہاں تو کوئی چوتھا تھا ہی نہیں ورنہ ہم یہ گمان کر سکتے تھے کہ اس نے جا کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دیا ہوگا (سیرۃ محمد بن اسحاق) (گلدستہ)

ابتداء اذان کی کیفیت

اس آیت میں اذان کا ذکر فرمایا ہے 'اس لیے ہم اذان کی ابتداء 'اذان کے کلمات 'اذان اور اقامت کے کلمات اذان کا جواب اور اذان کے بعد دعا اور اذان کی فضیلت کے متعلق اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔ "فنقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

مکہ میں اذان مشروع نہیں ہوئی تھی 'اس وقت نماز کے لیے یوں نداء کرتے تھے "الصلوۃ جامعۃ "جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہجرت کی اور کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا 'تو آپ کو پانچ فرض نمازوں کے لیے اذان کا حکم دیا گیا 'اور نماز جنازہ 'نماز عید اور نماز کسوف وغیرہ کے لیے " الصلوۃ جامعۃ " سے ندا کا طریقہ برقرار رہا۔ حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمر بن خطاب (رض) نے خواب میں فرشتے سے اذان کے کلمات سنے اور اس سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شب معراج کے موقع پر فرشتے سے اذان کے کلمات سنے تھے۔

امام طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر (رض) نے بھی اذان کا خواب دیکھا تھا 'اور امام غزالی نے وسیط میں لکھا ہے کہ دس سے زیادہ صحابہ نے اذان کا خواب دیکھا تھا اور علامہ جیلی نے شرح التنبیہ میں لکھا ہے کہ چودہ صحابہ نے اذان کا خواب دیکھا تھا 'لیکن حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ثابت صرف حضرت عبداللہ بن زید کے لیے ہے اور بعض روایات میں حضرت عمر (رض) کا بھی ذکر ہے۔ (فتح الباری ج ۲ 'ص ۷۸ 'مطبوعہ لاہور '۱۴۰۱ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رات میں آسمان کی طرف لے جایا گیا تو آپ ﷺ کی طرف اذان کی وحی کی گئی اور جب آپ ﷺ واپس آئے تو جبرائیل (علیہ السلام) نے آپ ﷺ کو اذان کی تعلیم دی۔ (المعجم الاوسط 'ج ۱۰ 'رقم الحدیث: ۹۲۴۳ 'حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک روای طلحہ بن زید وضع کی طرف منسوب ہے)

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اذان کی تعلیم دینے کا ارادہ کیا 'تو حضرت جبرائیل آپ ﷺ کے پاس ایک جانور لے کر آئے جس کو براق کہتے تھے 'جب آپ ﷺ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ کچھ دشوار ہوا جبرائیل نے کہا پرسکون رہو 'بخدا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ معزز شخص کبھی تم پر سوار نہیں ہوا۔ آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے 'حتی کہ آپ ﷺ رحمان تبارک وتعالیٰ کے حجاب تک پہنچے 'اسی دوران حجاب سے ایک فرشتہ نکلا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے جبرائیل! یہ کون ہے؟ جبرائیل نے کہا اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے 'میں مخلوق میں سب سے مقرب ہوں 'لیکن میں جب سے پیدا ہوا ہوں 'میں نے اس فرشتے کو اس سے پہلے نہیں دیکھا، "اللہ اکبر اللہ اکبر "تو حجاب کی اوٹ سے آواز آئی میرے بندہ نے سچ کہا میں اکبر ہوں 'میں اکبر ہوں۔ پھر فرشتہ نے کہا لا الہ الا اللہ تو حجاب کی اوٹ سے آواز آئی 'میرے بندہ نے سچ کہا۔ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ (الحدیث)۔(کشف الاستار عن زوائد البزار 'ج ۱ ص ۱۷۸ 'حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند میں ایک راوی زیاد بن المنذر ہے 'اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ 'مجمع الزوائد 'ج ۱ ص ۳۲۹)

نوٹ: مناقب میں ضعیف مانی جاتی ہے۔

ابو عمیر بن انس اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ مشورہ کیا کہ نماز کے لیے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے : ؟ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ نماز کے وقت ایک جھنڈا گاڑ دیا جائے ' جب لوگ اس جھنڈے کو دیکھیں گے تو ایک دوسرے کو نماز کی اطلاع دیں گے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ بات پسند نہیں آئی پھر آپ ﷺ کو بگل ' نرسنگا) کا مشورہ دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور کہا کہ یہ یہود کا طریقہ ہے۔ پھر آپ ﷺ کو ناقوس (لوہے کا ٹکڑا جو لکڑی سے بجایا جاتا ہے ' گھڑیال) کا مشورہ دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کو بھی پسند نہیں کیا اور فرمایا : یہ عیسائیوں کا طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید (رض) وہاں سے اٹھ کر گئے ' وہ اسی فکر میں تھے۔ پھر انھیں خواب میں اذان دکھائی گئی ' وہ صبح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو اس خواب کی خبر دی۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نیند اور بیداری کی حالت میں تھا ' میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے مجھے اذان دکھائی۔ اس سے پہلے حضرت عمر بن خطاب (رض) نے بھی اذان کا خواب دیکھا تھا ' لیکن انھوں نے بیس دن تک اس خواب کو مخفی رکھا ' پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم کو مجھے خبر دینے سے کس چیز نے روکا تھا ؟ انھوں نے کہا عبداللہ بن زید مجھ پر سبقت لے گئے اور مجھے حیاء آئی ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے بلال ! تم کھڑے ہو اور عبداللہ بن زید تم کو جو کلمات بتائیں ' وہ پڑھو ' پھر حضرت بلال ؓ نے اذان دی ' ابو عمیر یہ کہتے تھے کہ اگر اس دن حضرت عبداللہ بن زید بیمار نہ ہوتے تو وہ اذان کہتے۔ (سنن ابوداؤد ' ج ا رقم الحدیث : ۴۹۸ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ' ۱۴۱۶ ھ)

کلمات اذان میں مذاہب ائمہ

امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اذان میں پندرہ کلمات ہیں اور ان میں ترجیع نہیں ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک اذان میں ترجیع ہے ' یعنی دو مرتبہ شہادتین کو پست آواز سے کہا جائے اور دو مرتبہ شہادتین کو بلند آواز سے کہا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابو محذورہ (رض) کی روایت میں ہے۔ (المغنی ' ج ا ص ۲۴۳ ' مطبوعہ دارالفکر ' بدایۃ المجتہد ' ج ا ص ۷۶ ' مطبوعہ دارالفکر)
امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا استدلال اس سے ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید (رض) نے خواب میں فرشتے سے اذان کے جو کلمات سنے تھے ' ان میں ترجیع نہیں تھی۔ انھوں نے یہی کلمات حضرت بلال (رض) کو بتائے اور انھوں نے ان ہی کلمات کے ساتھ اذان دی۔
حضرت عبداللہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ناقوس بجانے کا حکم دیا ' تاکہ لوگوں کو نماز کے لیے جمع کیا جائے ' میں اسی سوچ بچار میں سو گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے جا رہا تھا۔ میں نے کہا اے اللہ کے بندے ! کیا تم ناقوس فروخت کرو گے ؟ اس نے پوچھا تم اس کا کیا کرو گے ؟ میں نے کہا ہم لوگوں کو نماز کے لیے جمع کریں گے۔ اس نے کہا کیا میں تم کو اس سے اچھی چیز نہ بتاؤں ؟ میں نے کہا کیوں نہیں ؟
اس نے کہا تم کہا کرو "۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمدا رسول اللہ ' اشھد ان محمدا رسول اللہ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الفلاح ' حی علی الفلاح ' اللہ اکبر اللہ اکبر ' لا الہ الا اللہ "۔ اس کے بعد فرشتے نے اقامت کے کلمات بتلائے۔ جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے اپنا خواب بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان شاء اللہ برحق خواب ہے ' تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو اور خواب میں جو کلمات سنے ہیں ' وہ ان کو بتاؤ تاکہ وہ اذان دیں ' کیونکہ ان کی

آواز تم سے بلند ہے پس میں حضرت بلال (رض) کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میں نے ان کو بتایا تاکہ وہ اذان دیں ' کیونکہ ان کی آواز تم سے بلند ہے۔ پس میں حضرت بلال (رض) کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میں ان کو اذان کے کلمات بتاتا گیا اور وہ اذان دیتے گئے۔ حضرت عمر (رض) نے اپنے گھر میں ذان سنی تو وہ اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ میں نے بھی اسی طرح خواب دیکھا تھا ' تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "فللہ الحمد۔ (سنن ابوداؤد ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٤٩٩ ' سنن دارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ١١٨٧ ' سنن ابن ماجہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٧٠٦ ' مصنف عبدالرزاق ' ج ١ ' رقم الحدیث : ١٧٧٤ ' مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ١ ' ص ٢٣١ ' مسند احمد بتحقیق احمد شاکر ج ١٣ ' رقم الحدیث : ١٦٤٢٩ ' طبع ' الحدیث قاہرہ ' مسند احمد ' ج ٤ ' ص ٤٣ ' طبع قدیم ' صحیح ابن خزیمہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٣٧١ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ١ ' ص ٣٩١۔ ٣٩٠ ' السیرۃ النبویہ لابن ہشام ' ج ٢ ص ١٢٣ ' ١٢٢ ' طبع داراحیاء التراث العربی ' سنن دارقطنی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٩٢٤ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' صحیح ابن حبان ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ١٦٧٩ ' مطبوعہ موسستہ الرسالہ ' بیروت ' ١٤١٤ ھ)

حضرت ابو محذورہ کی روایت کا محمل

حضرت ابو محذورہ کی روایت میں جو ترجیع کا ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو محذورہ اسلام لانے سے پہلے اپنے لڑکپن میں لڑکوں کے ساتھ مسلمانوں کی اذان کی نقل اتار رہے تھے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حنین سے واپسی پر انھیں دیکھ لیا۔ آپ نے ان کو بلایا اور ان سے فرمایا اذان پڑھو۔ انھوں نے اذان پڑھی۔ اور اشھد ان لا الہ الا اللہ اور اشھد ان محمد ارسول اللہ کو آہستہ آہستہ پڑھا۔ آپ نے ان شہادتین کو دوبارہ زور سے پڑھنے کا حکم دیا ' تو انھوں نے دوبارہ زور سے پڑھا اور آپ ﷺ کے اذان دلوانے کی برکت سے یہ مسلمان ہوگئے تو شہادتین کو دوبارہ زور سے پڑھنے کا حکم دیا ' تو انھوں نے دوبارہ زور سے پڑھا اور آپ ﷺ کے اذان دلوانے کی برکت سے یہ مسلمان ہوگئے تو شہادتین کو پہلے دو بار آہستہ اور پھر دو بار زور سے پڑھنے کا یہ خاص واقعہ ہے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طرح اذان دینے کی عام ہدایت نہیں دی۔ اس کا بیان اس حدیث میں ہے :

حضرت ابو محذورہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم بعض ساتھیوں کے ساتھ حنین کے راستہ میں تھے ' جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حنین سے واپس آرہے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے موذن نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے نماز کے لیے اذان دی ' ہم نے اذان کی آواز سنی ' ہم راستہ سے ایک طرف ہٹ گئے اور ہم نے اذان کا مذاق اڑانے کے لیے بلند آواز سے اذان کی نقل اتارنی شروع کردی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس کی آواز میں سن رہا ہوں ' تم میں سے کوئی شخص اس کو پہچانتا ہے ؟ پھر ہم کو بلایا گیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے پیش کردیا گیا ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ آواز تم میں سے کس کی تھی ؟ سب نے میری طرف اشارہ کیا۔ آپ نے باقی لڑکوں کو بھیج دیا اور مجھے روک لیا۔ اس وقت مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم دینے سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا اور خود مجھے اذان کے کلمات بتائے۔ اور فرمایا کہو اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمد ارسول اللہ ' اشھد ان محمد ارسول اللہ ' ۔ آپ ﷺ نے فرمایا دوبارہ پڑھو اور اپنی آواز بلند کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمد ارسول اللہ ' اشھد ان محمدا

رسول اللہ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الفلاح ' حی علی الفلاح ' اللہ اکبر اللہ اکبر ' لاالہ الااللہ ' ۔ جب آپ ﷺ مجھ سے اذان پڑھوانے سے فارغ ہوگئے تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور مجھے ایک تھیلی دی جس میں چاندی تھی ' اور آپ ﷺ نے دعا کی ' اے اللہ ! اس میں برکت دے اور اس پر برکت دے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! مجھے اذان دینے کا حکم دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں حکم دیدیا۔ میرے دل میں جتنی آپ کی ناپسندیدگی تھی ' وہ سب آپ ﷺ کی محبت سے بدل گئی۔ پھر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عامل عتاب بن اسید کے پاس گیا۔ اور میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے مکہ میں اذان دینے لگا۔ (صحیح ابن حبان ' ج ' رقم الحدیث : ۱۶۸۰ ' سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۵۰۳ ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۶۳۰ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۷۰۸ ' مصنف عبدالرزاق ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۷۷۹ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۴۰۹ ' طبع قدیم ' سنن کبری ' للبیہقی ' ج ۱ ص ۳۹۳ ' سنن دارقطنی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۸۹۰ ' مسند الشافعی ' ص ۳۰۳۱ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ' ۱۴۰۰ ھ)

کلمات اقامت میں مذاہب آئمہ

امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اقامت میں اللہ اکبر اللہ اکبر دو دفعہ اور باقی کلمات ایک ایک مرتبہ پڑھے جاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک اللہ اکبر ' اللہ اکبر ' چار چار دفعہ اور باقی کلمات دو دو مرتبہ اور آخر میں لاالہ الااللہ ایک مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ (المغنی ' ج ۱ ص ' ۲۴۹ ' بدایۃ المجتہد ' ج ۱ ' ص ۸۰)

امام مالک اور امام شافعی کی دلیل یہ حدیث ہے :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت بلال (رض) کو حکم دیا گیا کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ پڑھیں اور اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ پڑھیں۔ (سنن ترمذی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۹۳ ' صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۶۰۳ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ' (۳۷۸) ۸۱۵ ' سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۵۰۸ ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۶۲۶ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۷۲۹)

امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی دلیل یہ حدیث ہے :

حضرت عبداللہ بن زید خزرجی انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اذان اور اقامت میں دو دو کلمے تھے۔ (سنن ترمذی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۹۴ ' سنن دارقطنی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۹۲۵ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۱ ' ص ۴۲۰۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں)

نیز ! حضرت ابو محذورہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات کی تعلیم دی ' انھوں نے اقامت کے کلمات اس طرح بیان کیے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمدا رسول اللہ ' اشھد ان محمدا رسول اللہ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الصلوۃ ' حی علی الفلاح ' حی علی الفلاح ' اللہ اکبر اللہ اکبر ' لا الہ الا اللہ ' ۔ (صحیح ابن حبان ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۱۶۸۱ ' سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۵۰۲ ' سنن ترمذی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۹۲ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۴۰۹ ' ج ۶ ' ص ۴۰۱ ' طبع قدیم ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم

الحدیث : ۶۲۹ ' صحیح ابن خزیمہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۳۷۷ ' سنن دارمی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۱۱۹۶-۱۱۹۷ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ' ص ۳۹۴)
اس حدیث میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے موقف کی واضح دلیل ہے۔

اذان کا جواب

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب موذن کہے 'اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ " اور تم میں سے کوئی "اللہ اکبر " پھر وہ کہے "اشھد ان لا الہ الا اللہ " تو یہ کہے "اشھد ان لا الہ الا اللہ " پھر وہ کہے "اشھد ان محمدا رسول اللہ 'تو یہ کہے "اشھد ان محمد ا رسول اللہ " پھر وہ کہے ""حی علی الصلوۃ " پھر وہ کہے 'لا حول ولا قوۃ الا باللہ " پھر وہ کہے "حی علی الفلاح 'تو یہ کہے "لا حول ولا قوۃ الا باللہ " پھر وہ کہے "اللہ اکبر اللہ اکبر تو یہ کہے "اللہ اکبر 'اللہ اکبر " پھر وہ کہے "لا الہ الا اللہ " تو یہ کہے "لا الہ الا اللہ ' ۔ تو یہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (صحیح ابن حبان ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۱۶۸۵ ' صحیح مسلم ' اذان ' ۱۲ ' (۳۸۵) ۸۲۷ ' سنن ابو داؤد ' رقم الحدیث : ۵۲۷ ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۶۷۳ ' عمل الیوم واللیلہ للنسائی ' رقم الحدیث : ۶۷۸ ' سنن ترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۳۶۳۴ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ' ص ۴۰۸-۴۰۹)

دعا بعد الاذان

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اذان سننے کے بعد یہ دعا کی :
اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلاۃ القائمۃ آت محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ۔
ترجمہ : اللہ ! اس کامل نداء اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب ! سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جنت میں بلند مقام اور فضیلت عطا فرما اور آپ کو اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔
تو اس شخص پر میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔ (صحیح البخاری ' ج ا ' رقم الحدیث : ۶۱۴ ' صحیح مسلم ' اذان ' ۱۱ (۳۸۴) ۸۲۶ ' سنن ترمذی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۲۱۱ ' سنن ابو داؤد ' ج ا ' رقم الحدیث : ۵۲۹ ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۶۷۷ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۷۲۲ ' مسند احمد ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۱۴۸۲۳ ' طبع دار الفکر ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۳۵۴ ' طبع قدیم ' عمل الیوم واللیہ للنسائی ' رقم الحدیث : ۴۶ ' عمل الیوم واللیۃ لابن السنی ' رقم الحدیث : ۹۲ ' طبع کراچی ' المعجم الصغیر للطبرانی ' ج ا ص ۲۴۰ ' طبع المدینہ المنورہ ' مصنف عبدالرزاق ' ج ا ' رقم الحدیث : ۱۹۱۱ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ' ص ۴۱۰ ' صحیح ابن حبان ' ۴ ' رقم الحدیث : ۱۶۸۹ ' شرح السنہ للبغوی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۲۱ ' صحیح ابن خزیمہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۴۲۰)
حضرت ابو درداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اذان سنتے تو دعا کرتے اے اللہ ! اس کامل نداء اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب ! اپنے بندہ اور اپنے رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جنت میں نازل فرما اور قیامت کے دن

ہمیں آپ ﷺ کی شفاعت میں (داخل) کر دے۔ (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ دعا فرمانا ہماری تعلیم کے لیے ہے۔ سعیدی غفرلہ) (المعجم الاوسط ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۳۶۷۵ ' مجمع الزوائد ' ج ا ص ۳۳۳)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اذان سن کر یہ دعا کی "اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ" اور قیامت کے دن ہم کو آپ کی شفاعت میں (داخل) کر دے سو جو شخص یہ دعا کرے گا ' اس کے لیے شفاعت واجب ہو جائے گی (المعجم الکبیر ج ۱۲ ' رقم الحدیث : ۱۲۵۵۴ ' مجمع الزوائد ج ا ' ص ۳۳۳ ' الجامع الکبیر ج ۷ ' رقم الحدیث : ۲۳۱۱۸ ' عمدۃ القاری ج ۵ ' ص ۱۲۴)

اذان کی فضیلت میں احادیث

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی صعصعہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے حضرت ابوسعید خدری (رض) نے فرمایا میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم بکریوں اور جنگل سے محبت کرتے ہو ' پس جب تم اپنی بکریوں یا جنگل میں ہو تو نماز کے لیے اذان دیا کرو ' اور بہ آواز بلند اذان کہنا ' کیونکہ موذن کی آواز کو جو بھی جن یا انسان سنتا ہے ' اور جو چیز بھی سنتی ہے ' وہ قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے گی۔ حضرت ابوسعید نے کہا میں نے یہ حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنی ہے۔ (صحیح البخاری ' ج ا ' رقم الحدیث : ۶۰۹ ' سنن نسائی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۶۴۳ ' سنن ابن ماجہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۷۲۳ ' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ۱۵۳ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۴۳۔ ۳۵ ' مسند حمیدی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۷۳۴ ' مصنف عبدالرزاق ' ج ا ' رقم الحدیث : ۱۸۶۵ ' صحیح ابن خزیمہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۳۸۹ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ص ۳۹۷۔ ۴۲۷)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے روحاء (ایک مقام) پر بھاگ جاتا ہے۔ روای نے پوچھا کہ روحاء کتنی دور ہے؟ تو حضرت جابر نے کہا وہ مدینہ سے چھتیس میل ہے۔ (صحیح مسلم ' صلوۃ ۱۵ ' (۳۸۸) ۸۳۱ ' صحیح ابن خزیمہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۳۹۳ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۳۱۶ ' شرح السنہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۵ ' صحیح ابن حبان ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۱۶۶۴ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ' ص ۴۳۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : شیطان جب نماز کی نداء سنتا ہے تو زور سے یاد لگاتا ہے ' تاکہ اذان کی آواز نہ سن سکے اور جب موذن خاموش ہو جاتا ہے تو پھر واپس آ کر وسوسہ ڈالتا ہے۔ (صحیح مسلم ' صلوۃ ۱۶ ' (۳۸۹) ۸۳۲ ' صحیح ابن حبان ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۱۶۶۳ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۳۱۳ ' طبع قدیم ' صحیح ابن خزیمہ ج ا ' رقم الحدیث : ۳۹۲ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ا ' ص ۴۳۲ ' شرح السنہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۴) (تبیان)

اذان کی فضیلت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

" بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پہلی صف پر رحمتیں نازل کرتے ہیں اور موذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے اسی مقدار میں اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور کائنات کی خشک یا تر جو چیز بھی اس کی آواز سنتی ہے وہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اسے ان کے ثواب جتنا ثواب ملتا ہے۔ " (نسائی : 647 : کتاب الاذان : باب 14) (امداد)

آیت "وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ" سے معلوم ہونے والے مسائل

اس آیت سے 3 مسئلے معلوم ہوئے: (1)۔۔ نماز پنجگانہ کے لیے اذان ہونی چاہیے، اذان کا ثبوت اس آیت سے بھی ہے۔
(2)۔۔ دین کی کسی چیز کا مذاق اڑانا کفر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اذان کا مذاق اڑانے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ ایسے ہی عالم، مسجد، خانہ کعبہ، نماز، روزہ وغیرہا میں سے کسی کا مذاق اڑانا کفر ہے۔
(3) دینی چیزوں کا مذاق اڑانے والے احمق و بے عقل ہیں جو ایسے سَفیہانہ اور جاہلانہ حرکات کرتے ہیں۔

دینی چیزوں کا مذاق اڑانے والوں کا رد

اس آیت میں دینی چیزوں کا مذاق اڑانے والوں کا کتنا شدید رد ہے۔ افسوس کہ جو کام یہودی اور منافق کیا کرتے تھے وہی کام مسلمان کہلانے والوں میں آتے جارہے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، فرشتے، جنت، حوریں، دوزخ، اس کے عذاب، قرآنی آیات، احادیثِ نبوی، دینی کتابوں، دینی شَعائر، عمامہ، داڑھی، مسجد، مدرسے، دیندار آدمی، دینی لباس، دینی جملے، مقدس کلمات الغرض وہ کونسی مذہبی چیز ہے کہ جس کا اس زمانے میں کھلے عام فلموں، ڈراموں، خصوصاً مزاحیہ ڈراموں، عام بول چال، دوستوں کی مجلسوں، دنیاوی تقریروں، ہنسی مذاق کی نشستوں اور باہمی گپ شپ میں مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ افسوس کہ مسلمان کہلانے والے اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مسلمان کہلانے والوں کو داڑھی، عمامہ، مذہبی حلیے سے نفرت ہے۔ مسلمان کہلانے والے کو اذان سن کر تکلیف ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث کی باتیں اسے پرانی باتیں لگتی ہیں۔
یاد رکھیں کہ دینی شَعائر کا مذاق اڑانا کفر ہے اور دین کا مذاق اڑانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْــٴًـا اتَّخَذَهَا هُزُوًاؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌؕ (۹) (الجاثیہ: ۹) وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْــٴًـا اتَّخَذَهَا هُزُوًاؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌؕ (۹) (الجاثیہ: ۹)

اور جب ہماری آیتوں میں سے کسی پر اطلاع پائے تو اسے مذاق بناتا ہے ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

اور فرماتا ہے:

وَلَىٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (۶۵) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْؕ (التوبہ: ۶۵، ۶۶)

اور اے محبوب ﷺ اگر تم ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ ہم تو یونہی ہنسی کھیل میں تھے تم فرماؤ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو۔ بہانے نہ بناؤ تم کافر ہو چکے مسلمان ہو کر۔

اور فرماتا ہے:

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (انعام: ۷۰)

اور چھوڑ دے ان کو جنہوں نے اپنا دین ہنسی کھیل بنالیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے فریب دیا۔
اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی حالت پر غور کرنے اور اپنی اس روش کو تبدیل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔
نماز اور دوسروں کو نماز کی طرف بلانے میں کیا فوائد و برکات ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اس میں۔
1۔ اللہ کی رضا ہے۔
2۔ گناہوں کی بخشش و معافی ہے۔
3۔ ایسے مقام پر کھڑے ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے جہاں سے انسان اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے۔
4۔ نماز فواحش و منکرات سے بچاتی ہے۔ وغیر ذالک من الفوائد۔
یہاں اس آیت سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ نص کی رو سے اذان مشروع ہے صرف خواب ہی مشروعیت اذان کی دلیل نہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اذان کی مشروعیت اور فضیلت اس نص سے ثابت ہے۔ اگرچہ فقہاء نے اس آیت کو اذان کے لیے دلیل نہیں بنایا۔ بلکہ فقہاء اس خواب کو جس میں اذان کا حکم دیا گیا مشروعیت اذان کی دلیل بناتے ہیں۔

اذان کے احکام

1۔ پانچ نمازوں اور جمعہ کے لیے سنت موکدہ ہے۔
2۔ اس میں طہارت مستحب ہے۔
3۔ موذن قبلہ رو کھڑے ہو کر اذان کہے۔
4۔ وقت سے پہلے اذان جائز نہیں، اگر وقت سے پہلے کہہ دی جائے تو وقت میں اعادہ ضروری ہے۔
5۔ اذان میں لحن و ترجیع نہیں۔ لیکن امام شافعی کے نزدیك اس میں ترجیع ہے اگرچہ لحن نہیں۔
کتب حدیث میں اذان اور اذان کی دعوت پر عمل کے بیشمار فضائل ہیں۔
6۔ اذان خاموشی سے سننی چاہیے۔
7۔ جو کچھ موذن کہے اس کا اعادہ کیا جائے۔
8۔ اذان خشوع خضوع تعظیم اور پوری توجہ سے سننی چاہیے۔
ان سب باتوں کی تفصیل کتب مبسوطہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (تفسیرات)

آیت مبارکہ:

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ ہَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَکۡثَرَکُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][یٰٓاَهْلَ : اے اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][هَلْ : کیا][تَنْقِمُوْنَ : انتقام لیتے ہو][مِنَّآ : ہم سے][اِلَّآ : مگر][اَنْ : یہ کہ][اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ کے][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْنَا : ہماری طرف][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][مِنْ قَبْلُ : سے پہلے][ۙوَاَنَّ : اور بیشک][اَكْثَرَكُمْ : تمہارے اکثر][فٰسِقُوْنَ : فاسق ہیں]

ترجمہ: (اے نبی مکرّم !) آپ فرمادیجئے : اے اہل کتاب ! تمہیں ہماری کون سی بات بری لگی ہے بجز اس کے کہ ہم اللہ پر اور اس (کتاب) پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور ان (کتابوں) پر جو پہلے نازل کی جاچکی ہیں ایمان لائے ہیں اور بیشک تمہارے اکثر لوگ نافرمان ہیں .

تشریح:

اہل کتاب سے سوال کرنے کے دو مقصد ہیں کہ انھیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ اسلام کو مذاق سمجھنے اور نماز اور اذان کو استہزاء کا نشانہ بنانے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے ؟ کیا اس پر تمہارے ضمیر تمہیں کوئی ملامت نہیں کرتے ؟ ہاں یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ہمیں عطا کیا گیا ہے اور جو ہم سے پہلے نازل کیا گیا ہم اس کو بھی مانتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم دوسروں سے دو قدم آگے بڑھ کر قرآن مجید پر ایمان لاتے کیونکہ قرآن مجید تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ہم توراۃ اور انجیل کو ان کے دور کی منزل من اللہ کتابیں سمجھتے ہیں۔ دنیا میں وہ شخص کتنا عاقبت نااندیش ہے جس کے نظریہ کی تائید کی جائے وہ اس پر خوش ہونے کی بجائے الٹا اپنے موید کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے اہل کتاب تمہارا یہی حال ہے دراصل تمہاری مخالفت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تمہاری اکثریت نافرمان لوگوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کے نافرمان اس حد تک حقیقی شعور سے تہی دامن ہوتے ہیں کہ وہ نیکی کی بجائے فسق وفجور کے مددگار بن جاتے ہیں

جن کی یہ حالت ہو وہ اللہ کی رحمت کی بجائے اس کے غضب کے سزاوار ہونے کی وجہ سے انسانیت کے شرف سے محروم ہو کر بدترین مخلوق قرار پائے۔ (فہم)
نقم کہتے ہیں ناپسند کرنے، مکروہ ومعیوب سمجھنے کو اور انتقم کا معنی بدلہ لینا، انتقام لینا ہے۔ یقال نقم منہ کذا اذا انکرہ وانتقم اذا کافاہ (بیضاوی) حکم ہو رہا ہے کہ یہود سے دریافت کرو کہ تم ہم سے ناراض اور کھچے کھچے کیوں رہتے ہو۔ چور ہم نہیں۔ جھوٹ ہم نہیں بولتے۔ کسی پر ظلم و تعدی ہم نہیں کرتے۔ کسی کے دین کی توہین کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ پھر اس غصہ وغضب کی آخر کیا وجہ ہے؟ ہاں ہم میں ایک چیز ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو واحد ویکتا سمجھتے ہیں، اس کی جو کتاب ہم پر نازل ہوئی یا جو کتابیں ہم سے پہلے انبیاء سابقین پر نازل ہوئیں۔ ان سب پر ایمان لائے ہوئے ہیں شاید اس وجہ سے تم ہمیں برا سمجھتے ہو۔ اگر یہی وجہ ہے اس بغض وعناد کی تو پھر خود ہی انصاف کرو خطا کس کی ہے ہماری یا تمہاری؟ (ضیاء)

شان نزول

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت فرمایا کہ آپ انبیاء (علیہ السلام) میں سے کس کس کو مانتے ہیں؟ اس سوال سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہ مانیں تو وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئیں لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں اور جو اس نے ہم پر نازل فرمایا اور جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ (علیہ السلام) اور ان کی اولاد پر نازل فرمایا اور جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا یعنی توراۃ وانجیل اور جو اور نبیوں (علیہ السلام) کو ان کے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے دیا گیا سب کو مانتا ہوں۔ ہم انبیاء (علیہ السلام) میں فرق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ جب یہودیوں کو معلوم ہوا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کو بھی مانتے ہیں تو وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے منکر ہو گئے اور کہنے لگے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مانے ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (بغوی، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۵۹، ۳۹/۲)
اور فرمایا گیا کہ اے کتابیو! ہم تمہارے تمام پیغمبروں (علیہ السلام) اور تمہاری تمام کتابوں کو حق مانتے ہیں تو کیا تمہیں یہی برا لگ رہا ہے۔ اس چیز کی وجہ سے تو تمہیں ہمارے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ ہمارے خلاف۔ (صراط)

آج بھی اہل کتاب اسی برف کو پگھلانا چاہتے ہیں بلکہ اسے دبا کر اس کے آثار کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اسلامی ممالک کے باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں یا ان باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں جن کے آباؤاجداد مسلمان تھے۔ یہ اہل کتاب اس فہم کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر ربانی منہاج تربیت نے پیدا کر دیا تھا اور جب تک مسلمانوں کے اندر یہ فہم وشعور زندہ ہے صلیبی استعمار ان کے مقابلے میں جم نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ خود عالم اسلام میں کالونیاں بنائے۔ اہل کتاب کو جب صلیبی جنگ میں شکست فاش ہوئی اور اس کے بعد جب وہ عیسائیت کی تبلیغ میں بھی ناکام رہے 'تو ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ مکروفریب کی راہ اختیار کریں اور ان آبادیوں کے درمیان یہ تصورات پھیلائیں 'جو مسلمانوں کی وارث ہیں 'کہ اب دین کے نام پر تمام جنگ جوئیاں ختم ہو چکی ہیں اور یہ تو

ایک تاریک دور تھا جس کے اندر تمام اقوام کے اندر مذہبی جنگیں ہوئیں، اب تو دنیا کو نئی روشنی مل گئی ہے 'اب تو ترقی کا دور ہے اور اب تو کسی دینی نظریہ حیات کے مطابل لڑنا نہ جائز ہے 'نہ مناسب 'اور نہ ہی اس دنیا کے مفاد میں ہے۔آج تو مادی دور ہے اور اب جنگ منڈیوں اور خام مال پر ہو گی۔لہٰذا مسلمانوں یا مسلمانوں کے وارثوں کو چاہیے کہ وہ کسی دینی کشمکش یا کسی تحریک احیائے دین کے متعلق نہ سوچیں۔
اور جب اہل کتاب اس بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اہل اسلام اب اپنی سرحدوں کے بارے میں بے فکر ہو گئے ہیں اور ان کے فکر و شعور سے یہ ترک موالات محو ہو گئی ہے تو اب وہ اپنا استعماری جال پھیلاتے ہیں۔ خصوصا پھر وہ بڑی آزادی سے عالم اسلام کے اندر استعماری جال پھیلاتے ہیں۔اب وہ عالم اسلام میں مسلمانوں کے غیظ و غضب سے محفوظ ہو گئے ہیں اور جب انھوں نے مسلمانوں کو تھپکی دے کر سلا دیا تو اب ان کو محض نظریاتی فتح ہی حاصل نہ ہو گئی بلکہ اب ان کے لیے عالم اسلام میں ہر قسم کی لوٹ اور مار کے راستے بھی کھل گئے 'تب انھوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں 'مسلمانوں کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور نظریاتی فتح کے بعد اب وہ مادی دنیا پر بھی قابض ہو گئے اور صورت حال یہ ہو گئی کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے اندر کوئی فرق ہی نہ رہا۔ دونوں قریب قریب ایک جیسے ہو گئے عالم اسلام کے اندر اب اہل کتاب کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں جو استعماری طاقتوں نے جگہ جگہ بٹھا رکھے ہیں۔ بعض اعلانیہ طور پر بٹھار کھے ہیں اور بعض ان کے خفیہ ایجنٹ ہیں۔ وہ بھی یہی بات دہراتے ہیں کیونکہ اہل کتاب کے ایجنٹ ہیں اور یہ لوگ اسلامی حدود کے اندر یہ کام کرتے ہیں۔ یہ ایجنٹ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ صلیبی جنگیں دراصل صلیبی جنگیں ہی نہ تھیں وہ مسلمان جنہوں نے اسلامی جھنڈوں کے نیچے یہ جنگیں لڑیں وہ مسلمان ہی نہ تھے وہ تو قوم پرست تھے۔ سبحان اللہ۔
ایک تیسرا فریق جو نہایت کم عقل فریق ہے 'اسے مغرب میں صلیبیت کی جانشیں استعماری قوتیں یہ دعوت دیتی ہیں کہ آؤ ہم بھائی بھائی بن جائیں۔مذہب کا دفاع کریں اور ملحدین کی تردید کریں۔ یہ فریب خوردہ ان کی اس دعوت کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ صلیبیوں کی یہ مغربی اولاد جب بھی اسلام اور الحاد کی جنگ ہوتی ہے 'یہ ملحدین کے ساتھ صف آراء ہو جاتی ہے۔ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں 'جب بھی مسلمانوں کا مقابلہ ملحدین کے ساتھ ہو۔ صدیوں سے ان کا یہ طرز عمل بالکل جاری ہے۔آج بھی ان کے لیے مادیت کی جنگ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر اہمیت اس جنگ کو دیتے ہیں جو وہ اسلام کے خلاف برپا کئے ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ مادی اور ملحد دشمن ایک وقتی اور عارضی دشمن ہے اور اسلام ایک مستقل اور ٹھوس نظریہ ہے جو ان کے لیے ایک مستقل دشمن ہے۔ یہ جنگ انھوں نے اس لیے شروع کر رکھی ہے کہ اسلامی قوتوں کے اند بظاہر جو بیداری پیدا ہو رہی ہے یہ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ لوگ الحاد کے خلاف جنگ میں بیوقوف مسلمانوں کو جھونک کر اپنا مفاد محفوظ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ملحدین مغربی اور صلیبی استعمار کے سیاسی مخالف ہیں اور یہ دونوں معرکے گویا اسلام کے خلاف ہوں گے۔ اور یاد رہے کہ صلیبیوں اور ملحدین دونوں کے خلاف مسلمانوں کے پاس صرف نظریاتی ہتھیار ہے اور وہ فہم و فراست ہے جو ان کے اندر قرآن کریم کی یہ آیات پیدا کرنا چاہتی ہیں۔
یہ ایک گہرا کھیل ہے اور یہ اہل اسلام کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ بظاہر اہل کتاب اور صیلبی دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ فریب خوردہ مسلمان ان اہل کتاب کو مخلص سمجھتے ہیں۔ وہ اہل اسلام کو اتحاد 'بھائی چارے اور موالات کی دعوت دیتے ہیں اور مقصد یہ بتاتے ہیں کہ مذہب کا دفاع کرتے ہیں لیکن فریب خوردہ مسلمان چودہ سو سال کی تاریخ کو بھول جاتے ہیں جس میں ان کا رویہ عداوت کا رہا ہے اور اس میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخ تو بڑی بات ہے اور بہت طویل ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی ان واضح تعلیمات کو بھی بھول جاتے ہیں جو انھیں ان

کارب براہ راست دے رہا ہے یہ ایسی تعلیم ہے کہ یہ لاریب ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس سے کوئی پہلو تہی نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اللہ پر اعتماد ہو ' اور اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نہایت ہی سنجیدہ ہے۔

یہ فریب دینے والے اور فریب خوردہ لوگ اس سلسلے میں اپنی پالیسی کے حق میں قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وہ احادیث پیش کرتے ہیں جن کے اندر اہل کتاب کے ساتھ حسن معاملہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور یہ کہ معیشت اور طرز عمل میں ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ لیکن یہ لوگ قرآن کریم کی ان تنبیہات و تحذیرات اور فیصلہ کن ممانعت کو بھلا دیتے ہیں جو قرآن کریم اہل کتاب کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے خلاف کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ اس حکم کے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ اس سلسلے میں اسلامی تحریک کا منصوبہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ اسلامی تنظیم کن خطوط پر ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ دوستی اور موالات کے تعلقات کو بالکل ختم کرنا چاہیے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک باہم موالات اور باہم دگر نصرت صرف اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہوتی ہے اور اسلام کو عملی زندگی میں قائم کرنے لیے ہوتی ہے۔ تحریک امامت دین کے نصب العین کے بارے میں ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے دین میں ان کی تحریفات سے پہلے کئی نکات مشترک تھے۔

لیکن اب تو صورت حالات یہ ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہی اس لیے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اقامت دین کے نصب العین کے حامل ہیں اور وہ ہم سے راضی تب ہی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی بن جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نص صریح (البقرہ : ۱۲۰) میں فرمایا۔

یہ لوگ قرآن مجید کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس سے وہ اجزاء لیتے ہیں جو انھیں پسند ہیں اور ان کی دعوت کی تائید کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو غافل کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی درست کیوں نہ ہوں اور یہ لوگ ان آیات کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان کی اس فریب کارانہ پالیسی کے بالکل خلاف ہیں۔

ہم اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہم اس مسئلے میں اللہ کی بات سنیں۔ اللہ کا کلام اس سلسلے میں نہایت ہی دوٹوک اور قطعی ہے۔ رہا ان فریب کاروں کا کلام تو وہ ہم سنیں یا نہ سنیں برابر ہے۔

ذرا چند منٹ کے لیے ٹھہریئے ! اور اس موضوع پر غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ازلی دشمنی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایمان باللہ ' ایمان بالرسول اور ایمان بالکتب کے جامع عقیدے کی وجہ سے یہ لوگ ان کے دشمن بنے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایک اور اہم بات بھی بتاتے ہیں۔

(آیت) "وان اکثرکم فسقون"۔ (۵ : ۵۹) "اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ "ان کا یہ فسق وفجور بھی اس عداوت اسلام کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس لیے کہ ایک کج رو شخص کو راست رو شخص بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اور اس کی تصدیق قرآن کریم کا یہ فقرہ کرتا ہے۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی اشارہ ہے اس لیے کہ جو شخص کسی راہ سے کجروی اختیار کرتا ہے وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کچھ اور لوگ اس راہ پر چلیں۔ اگر وہ ایسے لوگوں کو دیکھے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ فسق وفجور میں مبتلا ہو گیا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہو گیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کا راہ حق پر قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ منحرف ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منحرف شخص جادہ حق پر مستقیم شخص کا دشمن ہوتا ہے اور پھر اس سے محض اس لیے انتقام لیتا ہے کہ وہ سچا ہے یہ انتقامی کارروائی اس لیے ہوتی ہے کہ یہ منحرف شخص اس صالح کو بھی گھیر گھار کر اپنی راہ پر ڈال دے اور اگر وہ بہت ہی سخت ہو اور بات مان کر نہ دیتا ہو تو اسے سے سے ختم کردے۔

یہ ایک دائمی اصول ہے اور یہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور میں اہل کتاب اور اہل اسلام کے تعلقات کے بارے میں ہی درست نہیں ہے بلکہ یہ مطلق اہل کتاب اور اہل اسلام کی پالیسیوں پر صادق آتا ہے۔ جو شخص بھی کسی صالح گروہ اور اصول پسند جماعت سے نکلتا ہے اس کی سعی یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس جماعت سے منحرف کر دے اور فساق وفجار اور اشرار کے معاشرے میں جنگ ہمیشہ صالح لوگوں کے خلاف ہوتی ہے۔ تمام فساق صالحین کے خلاف جمع ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اصولوں سے منحرف ہو چکے ہوتے ہیں 'وہ تمام لوگ ان کے دشمن ہوتے ہیں جو اصولوں پر جمے ہوتے ہیں۔ یہ جنگ ایک قدرتی جنگ ہوتی ہے اور یہ اسی اصول پر برپا ہوتی ہے جس کی طرف اس قرآنی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اللہ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ شر کی طرف سے ہر وقت بھلائی کی دشمنی ہوتی رہے گی اور حق کے مقابلے میں باطل ہمیشہ کھڑا ہوگا اور ثابت قدمی کے مظاہر کو دیکھ کر فساق وفجار جلیں گے اور جو لوگ اصولوں پر جمے ہوئے ہوں گے ان پر ان فساق وفجار اور منحرفین کو بہت ہی غصہ آئے گا۔

اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ بھلائی 'سچائی 'استقامت اور اصول پرستی کو اپنی مدافعت کرنا ہوگی اور ان کو شر باطل 'فسق اور انحراف کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہوگی۔ یہ ایک ایسا حتمی معرکہ ہوگا کہ جس میں اہل حق کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہوگا کہ بس وہ اس معرکے میں کود جائیں اور باطل کا مقابلہ کریں۔ اگر وہ یہ معرکہ آرائی نہ کریں گے تو باطل از خود ان پر حملہ آور ہو جائے گا اور سچائی اس سے کسی طرح جان نہ چھڑا سکے گی کیونکہ باطل کا مقصد اسے سرے سے مٹانا ہوتا ہے۔

یہ ایک نہایت ہی غافلانہ اور احمقانہ سوچ ہوگی کہ کوئی حق پرست 'اصلاح پسند 'صاحب استقامت اور اصولی شخص یہ سوچے کہ 'شر 'باطل اور فسق وفجور کے داعی اسے آرام سے چھوڑ دیں گے اور وہ حق و باطل کے اس معرکے سے بچ نکلیں گے یا حق و باطل کے درمیان کوئی مصالحت یا معاہدہ صلح ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں 'تو ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ہر وقت اس اٹل معرکے کے لیے تیار رہیں اور خوب سوچ کر ساتھ اور اچھی تیاری کے ساتھ رہیں اور موہوم امن کے لیے دشمن کی چالوں میں نہ آئیں ورنہ دشمن انھیں کھا کر چاٹ جائے گا۔

اس کے بعد جب ہم مطالعہ جاری رکھتے ہیں تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اہل کتاب کے مقابلے کے لیے ہدایات دی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی تھی کہ اہل کتاب کے دل میں اسلامی نظام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر گہری دشمنی کیوں ہے؟ اب یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ قدیم کے کچھ اوراق الٹے جاتے ہیں اور یہ کہ انھوں نے اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ؟ (ظلال)

آیت مبارکہ:

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][هَلْ : کیا][أُنَبِّئُكُمْ][بِشَرٍّ : زیادہ برا][مِّنْ : سے][ذٰلِكَ : وہ][مَثُوْبَةً : جزا][عِنْدَ : پاس][اللهِ: الله][مَنْ : جو][لَّعَنَهُ : اس پر لعنت کی][اللهُ : الله][وَغَضِبَ : اور غضب ہوا][عَلَيْهِ : اس پر][وَجَعَلَ : اور بنایا اس نے][مِنْهُمُ : بعض ان سے][الْقِرَدَةَ : بندر (جمع)][وَالْخَنَازِيْرَ : اور خنزیر (جمع)] وَعَبَدَ : اور پوجا کی انہوں نے][الطَّاغُوْتَ: شیطان][أُولٰئِكَ : وہی][شَرٌّ: برا][مَّكَانًا : ٹھکانا][وَّاَضَلُّ : اور زیادہ گمراہ][عَنْ : سے][سَوَآءِ : سیدھا][السَّبِيْلِ : راستہ]

ترجمہ: فرمادیجئے: کیا میں تمہیں اس شخص سے آگاہ کروں جو سزا کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک اس سے (بھی) براہے (جسے تم برا سمجھتے ہو، اور یہ وہ شخص ہی) جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس پر غضب ناک ہوا ہے اور اس نے ان (برے لوگوں) میں سے (بعض کو) بندر اور (بعض کو) سؤر بنادیا ہے، اور (یہ ایسا شخص ہے) جس نے شیطان کی (اطاعت و) پرستش کی ہے، یہی لوگ ٹھکانے کے اعتبار سے بدترین اور سیدھی راہ سے بہت ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔

تشریح:

اہل کتاب کی اکثریت ماضی کے جرائم اور اپنے آباؤاجداد کے کردار سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے ان کے گھناؤنے کردار پر فخر کرتی ہے۔ جس وجہ سے قرآن مجید ہر دور کے اہل کتاب کو انہی میں شمار کرتا ہے چنانچہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد ہوا کہ آپ ان سے استفسار فرمائیں کہ کیا تمہیں ان لوگوں کے انجام سے آگاہ نہ کیا جائے جو اپنے کردار کی وجہ سے اللہ کے ہاں اس حد تک بدترین ٹھہرے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا

غضب اور پھٹکار ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں انھیں بندر، خنزیر اور شیطان کے بندے بنادیا گیا۔ یہ لوگ دنیا میں صراط مستقیم سے بھٹک چکے اور آخرت میں ان کا بدترین اور عبرت ناک انجام ہوگا۔ امام رازی (رح) نے مختلف ذرائع سے لکھا ہے کہ یہودیوں میں ہفتہ کے روز زیادتی کرنے والوں کو ذلیل بندر بنادیا گیا اور عیسائیوں میں جن لوگوں نے آسمانی دستر خوان کا مطالبہ کیا پھر نافرمانیوں میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ انھیں خنزیر بنادیا گیا تھا حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرمایا کرتے تھے کہ امت محمدیہ کے لوگ خنزیر اور بندر تو نہیں بنائے جائیں گے لیکن ان کا ذہن بندروں کی طرح شریر اور ان کا کردار خنزیروں کی طرح بے حمیت ہوجائے گا۔ یہ بات سورۃ البقرہ آیت نمبر ٦٥، ٦٦ میں بیان ہوچکی ہے کہ جس قوم کی اللہ تعالیٰ شکلیں مسخ کرتا ہے وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہا کرتے۔ اس لیے جن لوگوں نے بندر اور خنزیر کی نسل کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا نقطہ نگاہ کسی اعتبار سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ (فہم)

جہاں تک مسلمانوں کی بات ہے مسلمان تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں جبکہ یہودی، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور انجیل کے منکر تھے۔ یہود و نصاریٰ دونوں، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید کے منکر تھے اور عقیدہ اسلام کو شر اور برائی سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ برے وہ نہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان لائیں دراصل بدترین اور شریر تو وہ لوگ تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت اور غضب کو نازل کیا۔ ان میں سے بعض کو بندر اور بعض کو خنزیر بنادیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو راہ راست سے بھٹک گئے، شیطان کی عبادت کرنے لگے اور بدترین درجہ ٹھکانا کے مستحق قرار پائے۔

مذکورہ صفات کے آئینے میں غور کیا جائے تو بدترین لوگ وہ تھے جنہوں نے انبیائے کرام (علیہم السلام) کو قتل کیا۔ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے نتیجہ میں بندر اور خنزیر بنائے گئے اور آج بھی وہی لوگ بدترین ہوں گے جو ان غضب زدہ لوگوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کے برعکس اہل اسلام تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے سب انبیائے کرام (علیہم السلام) کا احترام کرتے ہیں اور احکام خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پرامید ہیں۔

نوٹ: یہود میں سے جن لوگوں نے یوم سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تو ان کو بندر بنادیا گیا اور عیسائیوں میں سے جن لوگوں نے نزول مائدہ (دستر خوان) کے باوجود ناشکری اور نافرمانی کی تو ان کو خنزیر بنادیا گیا۔ (تفسیر روح المعانی) موجودہ بندر اور خنزیر ان کی نسل سے نہیں ہیں کیونکہ انھیں مسخ کے چند روز بعد ہلاک کردیا گیا تھا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی موجودہ بندر اور خنزیر ان کی نسل سے نہیں ہیں کیونکہ انھیں مسخ کے چند روز بعد ہلاک کردیا گیا تھا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی موجودہ بندروں اور خنازیر کے بارے میں سوال کیا گیا: کیا یہ انہی کی نسل میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کردیا تھا؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو مسخ کرکے پھر اس کی نسل نہیں چلائی۔ بندر اور خنزیر اس سے پہلے بھی ہوتے تھے۔

(مسلم: 6772: کتاب القدر: باب 7) (امداد)

یہود کی نافرمانیوں کی سزا

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے براہ راست ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے 'ان کی تاریخ کا انھیں آئینہ دکھایا تاکہ اگر وہ سمجھنا چاہیں تو اس آئینہ کو دیکھنے کے بعد بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر براہ راست انھیں اسی تند و تیز لہجے میں جواب دیا جاتا 'جس کے وہ مستحق تھے تو یقیناً ان کے اندر ایک اشتعال پیدا ہوتا۔ لیکن یہ اسلوب بھی اپنے اندر دعوتی حکمت رکھنے کے باوجود ایسا مُسکِت ہے کہ جس کا جواب آج تک یہود

سے بن نہ پڑا۔ فرمایا گیا کہ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تمہارے وہ اسلاف جن کے تم وارث ہو ' تم خوب جانتے ہو کہ اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں وہ کیسے بڑے بڑے عذابوں سے دوچار ہوئے۔ جب انھوں نے صحرائی زندگی میں اولوالعزمی ' جانفروشی اور سخت جانی کی تربیت حاصل کرنے کی بجائے ' شہری زندگی اور اس کی مراعات کا مطالبہ کیا تو انھیں حکم دیا گیا کہ جاؤ! کسی شہر میں جا اترو ' تمہیں وہاں یہ ساری نعمتیں مل جائیں گی کیونکہ جس مقصد کے لیے تمہیں مصر سے نکالا گیا تھا ' اگر وہ مقصد تمہیں عزیز نہیں بلکہ کھانے پینے کی ہوس ہی تمہیں عزیز ہے تو پھر اللہ کی بارگاہ سے تمہارے لیے ذلت اور مسکنت کے سوا اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری گئی اور جہاں سے انھیں اللہ کی رحمت کو لے کر پلٹنا تھا ' وہیں سے وہ اللہ کے غضب کو لے کر لوٹے۔ پھر تاریخ تمہاری اس ذلت اور مسکنت اور غضب کی داستان سے بھری ہوئی ہے ' جس کو تم بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہو اور جب انھوں نے ان تاریخی حوادث اور اللہ کے غضب سے کوئی سبق نہ سیکھا تو اللہ نے سبت کی صورت میں ان پر پابندیاں لگا کر انھیں آزمایا۔ جب وہ اس آزمائش میں بری طرح ناکام ہوئے تو ان پر وہ سخت ترین عذاب آیا کہ جس میں انھیں بندر اور سور بنا دیا گیا۔ سورۃ البقرہ میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ' جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخی حقیقت یہود میں ایک مسلّمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور پھر یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ قرآن کریم کی جب یہ آیات نازل ہوئیں ' یہود نے ان الزامات کی ہرگز تردید نہیں کی بلکہ اس پر چپ سادھ لی کیونکہ ان حوادث سے ان کے عوام تک بھی آگاہی رکھتے تھے۔ یہ بندر اور خنزیر بنائے جانے کا واقعہ سورۃ الاعراف میں کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک ایسی بستی میں پیش آیا ' جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا ' جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے ' جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے بحر قلزم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔

اس بستی کے رہنے والے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ سبت کے احترام میں اس دن کوئی دنیوی کام نہ کریں۔ گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے ' جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کے اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں (جو 668 سے 586 قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے مال و اسباب لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے اللہ کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنی اس بری عادت سے باز نہ آئی بلکہ اس قدر نافرمانی میں دلیر ہو گئی کہ انھیں صاف حکم دیا گیا تھا کہ تم سبت کے دن مچھلیاں نہیں پکڑو گے ' چونکہ ان کی گزر بسر ساحل سمندر پر رہنے کی وجہ سے زیادہ تر مچھلیوں پر ہی ہوتی تھی ' اس لیے یہ ان کے لیے ایک سخت آزمائش تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی اطاعت سے اس آزمائش سے نکلنے کی کوشش کرتے ' انھوں نے کھلم کھلا نافرمانی کا راستہ اختیار کیا۔ البتہ حیلہ یہ اختیار کیا کہ سبت کے دن مچھلیاں حوضوں میں جمع کر لیتے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے۔ اس پر اللہ کا عذاب حرکت میں آیا۔

قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کے رہنے والے تین قسم کے لوگ تھے ' جو اپنے اعمال کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے۔ اس لیے پروردگار نے بھی ان کے ساتھ یکساں سلوک نہیں فرمایا۔ ہم اس کی تفصیل ایک محقق کے قلم سے نقل کرتے ہیں۔

(ایک وہ 'جو دھڑلے سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ 'جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے 'مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ 'جن کی غیرت ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہ راست پر آ جائیں اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں 'تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے اللہ کے سامنے اپنی برات کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورت حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا کیونکہ اسی نے اللہ کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا 'جس نے اپنی برات کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے)

برائی کے خلاف جدوجہد کرنے والا ہی اللہ کے عذاب سے بچتا ہے

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے 'لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس (رض) سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا 'بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر اللہ کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے 'ایک وہ 'جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے 'جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو 'وہ ساری کی ساری بستی قابل مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے اللہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامت حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ

وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ۚ (الانفال ۸: ۲۵)

" ڈرو اس فتنہ سے 'جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے 'جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو"

اس کی تشریح میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ :

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصہ حتی یروا المنکر بین ظہرانیھم وھم قادرون علیٰ ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ

(اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا 'جب تک عامۃالناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں، پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے)

بنی اسرائیل پر مختلف وقتوں میں اترنے والے عذابوں کا ذکر فرما کر پروردگار نے ان کے ایک خاص جرم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ فرمایا وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ یعنی ان کا ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ باوجود اہل کتاب ہونے کے ' انھوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت ہر اس قوت یا اقتدار کو کہتے ہیں ' جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی عبادت کرواتا ہے یا اپنے وضعی قوانین کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین کے مقابلے میں اپنے زیر تسلط ملک میں یا اپنے دائرہ اثر میں نافذ کرتا ہے اور اس کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے جبکہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ کی صفت ہے اور اس کی اطاعت کے توڑ پر اور اس کے احکامات کو نظر انداز کر کے ' جب کوئی دوسری قوت اس کی جگہ لے لیتی ہے تو وہ طاغوت کہلاتی ہے اور جو لوگ اس کی اس طرح غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں ' وہ طاغوت کی اطاعت کا جرم کرتے ہیں۔ یہ طاغوت ایک بادشاہ بھی ہو سکتا ہے ' ایک ڈکٹیٹر بھی ' جمہوری ملک میں پارلیمنٹ بھی اور آزاد قبائل کی دنیا میں کوئی جرگہ یا پنچایت بھی یعنی جب بھی کوئی اجتماعی قوت اللہ کے قانون کو نظر انداز کر کے اپنے قانون کو رائج کرے گی اور لوگوں کو اس کے سامنے جھکنے پر مجبور کرے گی ' وہ طاغوتی قوت ہے۔ اس کی اطاعت کرنا ' طاغوت کی اطاعت کرنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو چیلنج کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرم کوئی بھی کرے ' قابل مذمت ہے۔ لیکن اگر اس کا ارتکاب ایک کتاب اور شریعت رکھنے والی قوم کرے تو اس کی شناعت اور برائی میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔
چنانچہ ان کی ساری وہ بداعمالیاں ' جس پر بنی اسرائیل عذابوں کا شکار ہوتے رہے ' ان سب سے بڑھ کر یہ وہ برائی اور جسارت ہے ' جس کا ذکر اس آیت کریمہ کے آخر میں کیا گیا ہے۔

امت مسلمہ اور طاغوت کی پرستش

یہاں رک کر امت مسلمہ کو سو بار سوچنا ہوگا کہ اگر طاغوت کی بندگی اور اطاعت ' بنی اسرائیل کے لیے ' اس لیے سب سے بڑا جرم بن گئی کہ وہ ایک حامل شریعت امت تھی۔ شریعت کی موجودگی میں انھوں نے کسی اور قانون کی اطاعت اور کسی اور اتھارٹی کی بندگی کیسے قبول کرلی۔ تو امت مسلمہ نہ صرف کہ حامل شریعت امت ہے بلکہ یہ تو آخری امت ہے ' جس پر آخری کتاب اتاری گئی ہے ' جس کی طرف آخری نبی آیا ' اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا ' نہ کوئی کتاب اترے گی اور نہ ان کے بعد کوئی امت آئے گی۔ اب اگر یہ امت بھی صراط مستقیم سے ہٹ جاتی ہے تو پھر آخر اس دنیا کی اصلاح کے لیے اور کس سے امید وابستہ کی جائے گی۔ اس لیے اس امت مسلمہ کو اس عظیم جرم کے بارے میں جس کا ارتکاب پورے عالم اسلام میں ہو رہا ہے ' سو دفعہ گہرے غور و فکر سے کام لینا ہوگا اور اپنی اس گمراہی سے نکل کر اللہ کے دین کے ساتھ اپنی زندگیوں کا ربط قائم کر کے اور اللہ کے دین کو قوت نافذہ بنا کر اپنی اس بہت بڑی کوتاہی کا ازالہ کرنا ہوگا ورنہ جس ذلت سے آج یہ امت گزر رہی ہے ' اس سے نکلنے کی اور کوئی صورت ممکن نہیں۔
بنی اسرائیل کے اسلاف کی اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہم عصر بنی اسرائیل کے چند ایسے کرتوتوں اور نمایاں عادتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس راستے پر ان کے اسلاف چلتے رہے ' یہ اخلاف بھی اسی راستے پر چلنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس لیے اب اگر انھیں شہادت حق کے منصب سے معزول کیا جا رہا ہے تو انھیں بجائے اس پر برہم ہونے اور حسد کے پھپھولے پھوڑنے کے ' اپنے اعمال کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (روح اسلم)
فوائد

ا: یعنی انبیاء کرام کو ماننے والے اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور ان میں سے ایک کا انکار کرنے والا اللہ کے غضب اور لعنت میں ہوگا۔
۲: یعنی اے یہودیو تم اپنے گزشتہ اور موجودہ حالات دیکھ کر خود فیصلہ کر لو۔ کہ تم اللہ کے محبوب ہو یا مردود، پچھلے زمانہ میں صورتیں تمہاری مسخ ہوئیں۔ سور بندر تم بنائے گئے بچھڑے تم نے پوجے۔ اب بھی بت پرستی تم کر رہے ہو، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بغیر بزرگوں کا نسب اور اشرف جگہ رہنا کام نہیں آتا۔ یہود اپنے اولاد انبیاء ہونے پر گھمنڈ کرتے تھے۔

ایک اور پہلو سے مزید جائزہ لیجئے

کہہ دیجئے۔ کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جن کا انجام اللہ کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے۔ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی۔ جن پر اس کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے۔ اور جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا درجہ اور بھی زیادہ برا ہے اور وہ سواء السبیل سے اور بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ بندروں کا ذکر آیا اور خنازیر کا ذکر آیا۔ بندر کے ساتھ ہی نقالی کا تصور آتا ہے۔ نقل کرنے والے۔ یہ چیز بھی اسلام کے اندر پسندیدہ نہیں کہ لوگوں کی نقلیں اتاری جائیں۔ بندر کی مشابہت ہو جاتی ہے اور مسخ کا عذاب تو ہم پڑھ آئے ہیں قرآن کے اندر۔ ایک قوم کو اللہ نے مسخ کر دیا تھا اور ان کو بندر بنا دیا تھا۔ بندروں میں ایک ایسا بندر ہوتا ہے ان کی نسل ہے کہ ان میں ماں اور بچے کے اندر bonding نہیں ہوتی۔ ان بندروں کے اندر مامتا کا جذبہ نہیں ہوتا۔ manasect بندروں میں ایک اور بندروں کی قسم ہوتی ہے۔ Baboons۔ ان کے اندر باپ کا نہ پتہ ہوتا ہے نہ اس کی کوئی پہچان ہوتی ہے۔ کون اس بچے کا باپ ہے۔ پتہ نہیں ہوتا۔ نر اور مادہ کشش محسوس کرتے ہیں ایک دوسرے میں۔ لیکن تھوڑی دیر کیلئے۔ جلدی جلدی اپنے وہ پارٹنرز بدل لیتے ہیں۔ بعض دفعہ پوری تہذیب ایسی ہو جاتی ہے نہ جن کے اندر یہ صفات ہوتی ہیں۔ بندروں جیسی چیزیں ہوتی ہیں۔ جہاں تک خنزیر کا تعلق ہے۔ اپنی بے حیائی کے لیے وہ پہچانا جاتا ہے۔ گندگی سے اس کو زیادہ لگاؤ ہوتا ہے۔ تو قردۃ والخنازیر ان جانوروں کی سی کوالیٹیز پیدا ہو جائیں۔ ان جیسا mind set بن جائے۔ پوری پوری تہذیبیں ان بندروں اور سوروں کے طور طریقوں پر چل پڑیں۔ یہ بھی تو ایک طرح کا عذاب ہی ہے اللہ کا۔ پچھلے دنوں ایک recent ریسرچ لوگوں نے کی ہے۔ کچھ انھوں نے جینٹک انجئیرنگ کی ہے۔ جیسے کچھ لوگوں کے organs خراب ہو جاتے ہیں نہ۔ کسی کا دل خراب ہو گیا۔ یا liver transplant کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور دوسرے انسانوں کا دل یا جگر نہیں مل رہا ہوتا۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم کیا کریں۔
ایک xeno transplant کا طریقہ نکالا ہے۔ اس میں وہ سور کا دل یا سور کا جگر لگا دیتے ہیں انسانوں کے اندر۔ heart valves یا brain cells سور کے وہ انسانوں میں لگا دیتے ہیں۔ Pencrees بھی لگا دیتے ہیں۔ bone marrow بھی ٹرانسپلانٹ کر رہے ہیں۔ جینٹک انجئیرنگ کے ذریعے وہ pigs organs باقاعدہ devoulp کرتے ہیں۔ تاکہ انسانوں کے اندر ٹرانسپلانٹ ہو سکے۔ سور وہ جانور ہے جس کے اعضاء انسانی اعضاء سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن وہ خود کہتے ہیں کہ اس میں خطرات بہت ہیں۔ بہت سے وائرس بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جو سوروں سے انسانوں کے اندر آ سکتی ہیں۔ سور میں وہ بیماری ہوتی ہے تو دبی رہتی ہے۔ اس کے لیے مہلک نہیں ہے خطرناک نہیں ہے۔ انسانوں میں آ جاتی ہے تو انسانوں کا جو دماغی نظام ہے وہ ان کو handle نہیں کر سکتا۔ تو کچھ undiscovered virus بھی Pigs کے اندر پائے جاتے ہیں۔ تو واللہ اعلم کیا کیا چیزیں ہیں جو دیکھنی ہیں۔ سوچیں سور کا دل کسی کے اندر آ جائے یا سور کے brain cells دماغ میں چلے جائیں۔ اللہ جانے انسان کی سوچ پر اس کے دماغ پر ان چیزوں کا کیا اثر ہو۔ اور عبد الطاغوت۔ طاغوت کے بندے۔ زبان سے تو کوئی نہیں کہتا کہ میں

طاغوت کا بندہ ہوں۔ مراد ہے شیطان کی باتیں ماننا۔ اس کے طور طریقوں کو اپنا لینا۔ اس کے احکامات پر عمل کرنا۔ اور شیطان تو حکم دیتا ہے۔ بالسوء والفحشاء۔ برائی کا اور فحاشی کا۔ تو جن میں یہ چیزیں آ گئیں وہ تو سیدھے راستے سے بہت دور چلے گئے۔ (تنویر)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

لغتہ القرآن: وَاِذَا [اور جب بھی] جَآءُوْكُمْ [وہ آتے ہیں تمہارے پاس] قَالُوْٓا [تو کہتے ہیں] اٰمَنَّا [ہم ایمان لائے] وَ [حالانکہ] قَدْ دَّخَلُوْا [وہ داخل ہوئے ہیں] بِالْكُفْرِ [کفر کے ساتھ] وَهُمْ [اور وہ] قَدْ خَرَجُوْا [نکلے ہیں] بِهٖ[اس کے ساتھ] وَاللّٰهُ [اور اللہ] اَعْلَمُ [خوب جانتا ہے] بِمَا [اس کو] كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَكْتُمُوْنَ : چھپاتے]

ترجمہ: اور جب وہ (منافق) تمہارے پاس آتے ہیں (تو) کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ (تمہاری مجلس میں) کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے اور اسی (کفر) کے ساتھ ہی نکل گئے، اور اللہ ان (باتوں) کو خوب جانتا ہے جنہیں وہ چھپائے پھرتے ہیں۔

تشریح:

شان نزول

یہ آیت یہودیوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ایمان واخلاص کا اظہار کیا اور کفر و گمراہی کو چھپائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے حال کی خبر دی۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ٦١، ١/٥٠٨)

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہودیوں نے دین اسلام کو ہنسی اور کھیل بنالیا تھا اور وہ اذان کا مذاق اڑاتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کو مسلمانوں کا ایمان اور تقوی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کو ان کے کرتوتوں کی جو سزا آخرت میں ملے گی ' وہ ان کو اس سے زیادہ ناگوار ہوگی اور اب اس آیت میں دین اسلام کے صدق اور برحق ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی کہ جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپاتے تھے ' اس کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمادیا۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا وہ کفر کے جس حال میں آپ کے پاس آئے تھے ' اسی حال میں لوٹ گئے۔ کیونکہ ان کے دل سخت تھے اور ان کا یہ قول کہ ہم ایمان لائے ' بالکل خلاف واقع اور جھوٹ ہے اور اس جھوٹ سے ان کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ مکروفریب کرنے کی بہت کوشش اور جہدوجہد کریں ' کیونکہ وہ مسلمانوں سے بہت بغض اور عداوت رکھتے تھے۔ (تبیان)

منافق بداعتقادی کے ساتھ آتے تھے تو جیسے آتے ویسے ہی جاتے اور صحابہ (رض) عقیدت و محبت کے ساتھ آتے تو فیض کے دریا سمیٹ کر جاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بداعتقادی کے ساتھ کسی کے پاس جانے والا کبھی اس سے فیض نہیں اٹھا سکتا۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب میں مغضوب لوگوں کی شکلیں تبدیل نہ بھی ہوں تو بھی برے اعمال کی وجہ سے شیطان کے بندے اور غلام بن جاتے ہیں۔ جس وجہ سے وہ کفر اور ایمان کے درمیان تمیز نہیں کرسکتے ان کی اکثریت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ گناہ، زیادتی اور اکل حرام میں بڑے مستعد اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ کفر اور اسلام میں امتیاز نہیں کرتے اور اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ان کا کردار لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کے متعلق انھیں اشتباہ کیا گیا ہے ہوسکتا ہے تمہارا برا کردار مومنوں کی نظروں سے اوجھل رہ جائے۔ لیکن یاد رکھنا تمہاری کوئی حرکت اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے اللہ تمہارے جھوٹے دعوے کو خوب جانتا ہے۔ جس کا تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اظہار کرتے ہو۔ حالانکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم ایمان کا اظہار کر رہے ہوتے ہو تو اس وقت بھی تم کفر کی حالت میں ہوتے ہو۔ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس سے اٹھ کر جاتے ہو تب بھی تم کفر ہی میں مبتلا ہوتے ہو۔ امام رازی (رض) نے "اثم " سے مراد عام گناہ لیا ہے اور "عدوان " کا معنٰی یہ کرتے ہیں کہ ایسا گناہ جس کے اثرات لوگوں پر مرتب ہوتے ہوں اور اس میں زیادتی کا عنصر بھی پایا جائے۔ "سحت " کا معنی رشوت اور حرام خوری کیا گیا ہے۔

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ لَعَنَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ) [رواہ الترمزی : کتاب الاحکام عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی]

"حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔" (فہم)

فوائد

ا: اس سے معلوم ہوا کہ بدنصیب کو اچھی صحبت سے بھی فیض نہیں ملتا۔ بزرگوں کے پاس وہ جیسا آتا ہے ویسا ہی جاتا ہے، پیشاب سے بھرا ہوا ڈول کنوئیں سے کچھ نہ لائے گا۔ جب یہ لوگ نبی کی صحبت سے فائدہ حاصل نہ کرسکے تو دوسری صحبتوں کا کیا ذکر ہے۔

۲: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتنا مہربان ہے، کہ انھیں دشمنوں کی خفیہ سازشوں سے خبردار فرماتا ہے۔

مسائل

۱۔ محض زبانی دعویٰ کرنے سے کوئی شخص مومن نہیں بنتا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے۔
۳۔ اہل کتاب کی اکثریت گناہ اور زیادتی کے کاموں اور حرام خوری میں تیز ہے۔
۴۔ گناہ و زیادتی اور حرام خوری برے عمل ہیں۔

آیت مبارکہ:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

لغۃ القرآن: وَتَرٰى [اور آپ دیکھیں گے] كَثِيْرًا [بہت سے لوگوں کو] مِّنْهُمْ [ان میں سے] يُسَارِعُوْنَ [کہ وہ لوگ باہم سبقت کرتے ہیں] فِي الْاِثْمِ [گناہ میں] وَالْعُدْوَانِ [اور زیادتی میں] وَاَكْلِهِمُ [اور اپنے کھانے میں] السُّحْتَ [ناپاک کمائی کو] لَبِئْسَ [یقینا بہت برا ہے] مَا [وہ جو] كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [وہ لوگ کیا کرتے ہیں]

ترجمہ:

اور آپ ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھیں گے جو گناہ اور ظلم اور اپنی حرام خوری میں بڑی تیزی سے کوشاں ہوتے ہیں۔ بیشک وہ جو کچھ کر رہے ہیں بہت برا ہے۔

تشریح: اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہودی ہر قسم کے گناہ بے دھڑک کرتے ہیں اور وہ کسی قسم کے گناہ میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ خواہ وہ گناہ کفر ہی کیوں نہ ہو۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں اثم سے مراد کفر ہے ' اور عدوان کے معنی اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھنا ہے۔

قتادہ نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہودی حکام مراد ہیں اور اس کا معنی یہ ہے کہ جن یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے ' وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنے اور حلال و حرام میں اس کی حدود سے تجاوز کرنے اور رشوت لے کر جھوٹے فیصلے کرنے میں بہت تیزی سے رواں دواں ہیں اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں ' وہ سراسر باطل کام ہیں۔ (تبیان)

نکات

وَتَرٰی۔ اور آپ دیکھتے ہیں۔ مراد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب ہے کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگاہ مبارک ہر ظاہر و باطن چیز کو ملاحظہ فرماتی تھی۔ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ۔ ان میں سے اکثر لوگ یعنی اہل کتاب کی اکثریت۔ یُسَارِعُوۡنَ۔ دوڑتے ہیں، یہ مسارعت سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک دوسرے سے سبقت کرنے کے ہیں۔ فِی الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ۔ گناہ اور سرکشی میں۔ الاثم، جھوٹ وغیرہ یا وہ گناہ جو گنہگار کی ذات تک محدود ہے۔ والعدوان اس میں ہر قسم کی سرکشی شامل ہے، یا وہ گناہ جو دوسروں تک پہنچے۔ وَاَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ۔ اور حرام کے کھانے میں۔ اکلھم السحت۔ اس میں سود، رشوت اور ظلم یا مکر سے حاصل کیا ہوا مال شامل ہے یعنی حرام خوری ظلم اور سرکشی میں اہل کتاب کی اکثریت ایک دوسرے سے سبقت کرنے میں لگی ہے تورات میں جناب رسول کریم آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی لغت کی آیات کو چھپانے کو اثم سے اور اس میں زیادتیاں یا باطل تاویلات کرنے کو عدوان سے تعبیر کیا گیا ہے اور علماء یہود جو رشوت لیکر لوگوں کی خواہشات کے مطابق تورات میں تحریف کیا کرتے تھے اس کی طرف اشارہ۔ الکلھم السحت، میں کیا گیا ہے۔ لَبِئۡسَ۔ البتہ بہت ہی برا ہے۔ مَا۔ وہ عمل۔ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۰۰۶۲۔ جو وہ کر رہے ہیں یعنی کتمان حق اور مظالم اور سرکشی اور حرام خوری بہت ہی برے اعمال ہیں۔

مقصد

اس آیت کا مقصد اہل کتاب کی قباحت کا اظہار ہے، اور مسلمانوں کو گناہ سرکشی اور حرام خوری سے بچنے کی تلقین ہے۔ (کاشف)

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں گناہ سے مراد توراۃ کی وہ آیات چھپانا ہے جن میں تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت وشان کا بیان تھا اور زیادتی سے مراد توراۃ میں اپنی طرف سے بڑھا دینا ہے اور حرام خوری سے مراد وہ رشوتیں ہیں جو یہ لے کر توراۃ کے احکام بدل دیتے تھے۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۲، ۱/۵۰۸)

یہودیوں کی صفات اور مسلمانوں کی حالت زار

ویسے "اِثۡم" ہر گناہ اور نافرمانی کو شامل ہے اور یہاں یہودیوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے کی حاجت ہے کہ ظاہری لفظی معنی کے اعتبار سے گناہ، زیادتی اور حرام خوری کے کاموں میں بھاگ کر جانا ان کی صفت بیان کی گئی ہے لیکن اب ہمارے ہاں کتنے ایسے لوگ ہیں کہ نیکی کے کام میں تو تاخیر بلکہ ترک کریں گے لیکن گناہ کے کام میں جلدی کریں گے۔ کسی کی مدد کرنے اور اسے ظلم سے بچانے میں کنی کترا کر گزر جائیں گے لیکن ظلم وزیادتی میں اپنی قوم یا علاقے یا تحریک کے جھنڈے نیچے تَعَصُّب کے ساتھ موجود ہوں گے۔ حلال تو ان کے گلے میں اٹکے گا لیکن جہاں حرام کی توقع ہو گی، رشوت ملے گی، سود ملے گا، خوب ناجائز تجارت کا فائدہ نظر آئے گا وہاں بھاگ کر جائیں گے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمَدُّن میں ہنود　　　　یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اور اپنی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے غور کرو کہ

کون ہے تارکِ آئین رسول مختار ؟ مَصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار ؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار ؟ ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار ؟

اور اب تمہارا حال یہ ہے کہ

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں

(صراط)

دراصل سابقہ آیت میں یہود کے ایمان کا ذکر گزرا ہے۔ انھیں بہت اصرار ہے کہ ہم صاحب ایمان لوگ ہیں ' ہمارے ایمان کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ پروردگار فرماتے ہیں کہ ذرا ان کے ایمان کا حال دیکھو کہ ان میں زیادہ تر افراد چاہے وہ عام لوگ ہوں یا ان کا پڑھا لکھا طبقہ ' وہ پوری طرح اخلاقی اور اعتقادی برائیوں کا شکار ہیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ ان اخلاقی برائیوں کا کبھی کبھی ارتکاب کر بیٹھتے ہیں ' بلکہ "یُسَارِعُوْنَ " کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ بداعمالیاں اور بداطواریاں ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب برائی کے ارتکاب میں اس حد کو پہنچ چکے ہیں ' جس میں برائی کا احساس تک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر پورا معاشرہ ان برائیوں کے ارتکاب میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں لگ جاتا ہے۔ برائی جب کسی معاشرے کا چلن بن جاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا احساس مر جاتا ہے۔ پھر اگر کبھی کوئی اللہ کا بندہ ' اس پر سرزنش کرنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے تو وہ اپنے معاشرے میں نکو بن کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح بیمار معدہ ہر مقوی غذا کو اگل دینے کی کوشش کرتا ہے ' اسی طرح معاشرہ ایسے فرد یا ایسے افراد کو اگل دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہود ایسی ہی حالت کو پہنچ گئے تھے۔
اس آیت کریمہ کے الفاظ سے مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی بداعمالیاں کسی ایک دائرے میں بند نہیں ' بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا رویہ ہر طرح کی برائی کی تصویر بن کے رہ گیا تھا۔ عام طور پر گناہ اور برائی کو "اثم " سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہر طرح کے ظلم اور زیادتی کو "عدوان " کا نام دیا جاتا ہے اور ہر طرح کی حرام خوری بالخصوص رشوت کو "سحت " کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہی تینوں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے جرائم ہیں۔ جب کوئی قوم ان جرائم میں اس حد تک آلودہ ہو جائے کہ ان میں احساس گناہ بھی باقی نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو کر رہ گیا ہے چنانچہ یہی کیفیت یہود کے معاشرے کی تھی۔ وہ ان تمام بڑے بڑے گناہوں میں سر سے پاؤں تک آلودہ تھے۔ اس لیے پروردگار نے ارشاد فرمایا :

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(کس قدر برا تھا ' جو کچھ وہ کرتے تھے)

یعنی ان کی اجتماعی زندگی اعتقادی اور اخلاقی طور پر بری طرح تباہ ہو چکی تھی جس کی انتہاء یہ تھی کہ کسی بھی قوم کا صالح ترین طبقہ ان کے علماء اور مشائخ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قومیں بگاڑ کی کسی بھی انتہاء کو پہنچ جائیں ' یہ طبقہ برابر اصلاح و ہدایت کے کام میں لگا رہتا ہے۔ لیکن جب یہ طبقہ بھی خود برائیوں میں ڈوب جائے اور اصلاح و ہدایت کے کام کو لپیٹ کر رکھ دے تو پھر اس قوم کی بقاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا یہ قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے اور یا تصویر حسرت بن کر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بن کے رہ جاتی ہے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

لَوۡلَا يَنۡهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ‌ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾

لغۃ القرآن: [لَوْلَا : کیوں نہیں][يَنْهٰىهُمُ : انہیں روکتے][الرَّبّٰنِيُّوْنَ : مربی][وَالْاَحْبَارُ : اور علماء[] عَنْ : سے][قَوْلِهِمُ : بات ان کی][الْاِثْمَ : گناہ][وَاَكْلِهِمُ : اور وہ کھاتے ہیں][السُّحْتَ : حرام][لَبِئْسَ : البتہ بہت برا ہے][مَا كَانُوْا : جو وہ تھے][يَصْنَعُوْنَ : وہ کرتے تھے]

ترجمہ: انھیں (روحانی) درویش اور (دینی) علماء ان کے قول گناہ اور اکل حرام سے منع کیوں نہیں کرتے؟ بیشک وہ (بھی برائی کے خلاف آواز بلند نہ کرکے) جو کچھ تیار کر رہے ہیں بہت برا ہے۔

تشریح:

علامہ بیضاوی (رح) لکھتے ہیں کہ لولا اگر ماضی پر داخل ہو تو زجر و توبیخ کے لیے ہوتا ہے یعنی انھوں نے کیوں ایسا نہ کیا۔ کیوں اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی۔ اور اگر مضارع پر داخل ہو تو کسی کام پر برانگیختہ کرنے اور اکسانے کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں مضارع پر داخل ہے اور مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب کے علما اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ لوگوں کو حرام کاری اور حرام خوری سے منع کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا ھو اشد ایۃ فی القرآن (کشاف) یہ قرآن کریم کی سخت ترین آیت ہے۔ اور ضحاک کہتے ہیں مافی القرآن اخوف عندی منھا (کشاف) یہ قرآن کریم کی سخت ترین آیت ہے۔ اور ضحاک کہتے ہیں مافی القرآن اخوف عندی منھا (کشاف) میرے نزدیک قرآن میں اس سے زیادہ خوف دلانے والی کوئی آیت نہیں۔ اس میں علماء اسلام کو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید بلیغ ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک فرشتہ کو حکم دیا گیا کہ فلاں گاؤں کو برباد کردو۔ اس نے عرض کی کہ اس میں تو فلاں عبادت گزار رہتا ہے۔ حکم ہوا کہ ہلاکت کی ابتدا اسی سے کرو۔ کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے شریعت کے احکام کی خلاف ورزیاں ہوتی رہیں اور کبھی اس کے چہرے کا رنگ تک بھی میلا نہ ہوا۔ (ضیاء)

امام فخر الدین رازی (رح) فرماتے ہیں "گناہ روحانی مرض ہے اور اس کاعلاج اللہ تعالیٰ کی، اس کی صفات کی اور اس کے احکام کی معرفت ہے اور یہ علم حاصل ہونے کے باوجود گناہ ختم نہ ہوں تو یہ اس مرض کی طرح ہے جو کسی شخص کو ہو اور دوائی کھانے کے باوجود وہ مرض ختم نہ ہو اور عالم کا گناہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا یہ قلبی مرض انتہائی شدید ہے۔ (تفسیر کبیر، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۳، ۳۹۳/۴)
عالم پر واجب ہے کہ خود بھی سنبھلے اور دوسروں کو بھی سنبھالے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: قرآن پاک میں (علماء کے لئے) اس آیت سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ والی کوئی آیت نہیں۔

(خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۳، ۵۰۹/۱) (صراط)

نیکی کا حکم نہ دینے اور برائی سے نہ روکنے کی مذمت

گناہ کی بات کہنے سے مراد جھوٹ بولنا ہے۔ وہ ایمان نہیں لائے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہتے تھے ہم ایمان لائے ہیں اور یہ جھوٹ ہے اور تورات میں جھوٹ بولنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ رشوت لے کر جھوٹے فیصلے کرتے تھے ' اور اس سے بھی تورات میں منع کیا گیا ہے اور ان کے علماء اس سے بھی منع نہیں کرتے تھے اور گناہ کرنے کی بہ نسبت گناہ سے منع نہ کرنا زیادہ مذموم ہے ' کیونکہ گناہ کرنے والا گناہ سے لذت حاصل کرتا ہے ' اس لیے گناہ کرتا ہے اور گناہ سے منع نہ کرنا محض گناہ بے لذت ہے ' اس لیے اس کی زیادہ مذمت ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کے ان علماء کی مذمت کی ہے جو ان کو گناہوں سے نہیں روکتے تھے۔
حسن بصری نے کہا ہے کہ ربانیوں سے مراد عیسائیوں کے علماء ہیں ' اور احبار سے مراد یہود کے علماء ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ دونوں لفظوں سے مراد یہودی ہیں ' کیونکہ یہ آیات یہودیوں کے متعلق ہیں۔ ایک لفظ سے مراد یہود کے یہود کے درویش ہیں اور دوسرے لفظ سے مراد یہود کے علماء ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا علماء کی تنبیہ کے باب میں یہ سب سے سخت آیت ہے۔ ضحاک نے کہا کہ قرآن مجید کی جس آیت سے سب سے زیادہ خوف پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہی آیت ہے۔ کیونکہ جو شخص نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں سستی اور کوتاہی کرے ' اس کو اور برے کام کرنے والے شخص ' دونوں کی مذمت کو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جمع فرمادیا ہے۔ (زاد المسیر ' ج ۲ ' ص ۳۹۱)

نیکی کا حکم نہ دینے اور برائی سے نہ روکنے پر وعید کی احادیث

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ نے ایک فرشتہ کی طرف وحی کی کہ فلاں فلاں بستی والوں پر ان کی بستی کو الٹ دو۔ اس نے کہا اس بستی میں ایک بندہ ہے جس نے ایک پل بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ نے فرمایا اس بستی کو اس شخص پر اور بستی والوں پر الٹ دو ' کیونکہ میری وجہ سے اس شخص کا چہرہ ایک دن بھی غصہ سے متغیر نہیں ہوا۔ اس حدیث کے دو راویوں کی تضعیف کی گئی ہے۔ لیکن ابن المبارک اور ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے (مجمع الزوائد ' ج ۷ ' ص ۲۷۰ ' المعجم الاوسط ' ج ۸ ' رقم الحدیث: ۷۶۵۷ ' مطبوعہ مکتبہ المعارف ' ریاض ' ۱۴۱۵ ھ)

حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے فرمایا اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو 'اے ایمان والو! تم اپنی جانوں کی فکر کرو 'جب تم ہدایت پر ہو گے تو کسی کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی (المائدہ: ۱۰۵) اور میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو عنقریب اللہ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۱۷۵ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۴۳۳۸ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۰۰۵ 'مسند احمد 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۳۰ '۱۶ 'طبع دار الفکر بیروت و دار الحدیث قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۱ 'ص ۷ '۵ '۲ 'طبع قدیم صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۳۰۵ '۳۰۴ 'سنن کبری 'لل بیہقی 'ج ۱۰ 'ص ۹۱)

حضرت حذیفہ بن یمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے 'تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا 'ورنہ عنقریب اللہ تم پر عذاب بھیج دے گا 'پھر تم دعا کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی 'یہ حدیث حسن ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۱۷۶ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۴۳۳۸ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۰۰۵)

حضرت طارق بن شہاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے 'کہ تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے 'اور جو اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے بدلے اور جو اس کی طاقت نہ رکھے 'وہ اس کو دل سے بدلے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔ (صحیح مسلم 'ایمان '۷۸ '(۴۹) ۱۷۵ 'سنن ابوداؤد 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۱۴۰ 'سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۱۷۹ 'سنن نسائی 'رقم الحدیث: ۵۰۲۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۲۷۵۔ ۴۰۱۳ 'مسند احمد 'ج ۳ 'ص ۵۲ '۱۰۔ طبع قدیم 'سنن کبری للبیہقی 'ج ۱۰ ص ۹۰)

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی حدود قائم کرنے والے اور اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے (ترمذی کی روایت میں ہے اور اللہ کی حدود میں مداہنت 'یعنی سستی اور نرمی کرنے والے) کی مثال اس طرح ہے کہ ایک قوم نے کشتی میں بیٹھنے کے لیے قرعہ اندازی کی 'بعض لوگوں کے نام اوپر کی منزل کا قرعہ نکلا اور بعض لوگوں کے نام نچلی منزل کا 'نچلی منزل والے پانی لینے کے لیے اوپر کی منزل پر گئے۔ پھر انھوں نے کہا: اگر تم کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے سمندر سے پانی لے لیں تو اوپر کی منزل والوں کو زحمت نہیں ہوگی۔ اگر اوپر کی منزل والوں نے ان کو اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو سب ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کے ہاتھوں کو سوراخ کرنے سے روک لیا تو وہ بھی نجات پالیں گے اور نچلی منزل والے بھی۔ (صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۲۴۹۳ '۲۶۸۶ 'سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۱۸۰ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۲۹۷ 'مسند احمد 'ج ۶ 'رقم الحدیث: ۱۸۳۸۹ 'طبع دار الفکر 'ج ۴ 'ص ۲۷۳ '۲۷۰ '۲۶۸ 'طبع قدیم 'سنن کبری للبیہقی 'ج ۱۰ 'ص ۲۸۸ '۹۱)

حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں گناہوں کے کام کیے جا رہے ہوں اور وہ ان گناہوں کو مٹانے کی قدرت رکھتے ہوں 'اور پھر نہ مٹائیں تو اللہ ان کو مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں 'اور اس کی سند حسن ہے۔ (صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۳۰۰ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۴۳۳۹ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۰۰۹ 'مسند احمد 'ج ۴ 'ص ۳۶۶۔ ۳۶۴ 'قدیم المعجم الکبیر للطبرانی 'ج ۲ رقم الحدیث: ۲۳۸۳ '۲۳۸۲) (تبیان)

(عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيدَ أَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ يَرْضَ اللهُ عَنْهُ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً فَإِنْ مَاتَ مَاتَ كَافِرًا وَإِنْ تَابَ تَابَ اللهُ عَلَيْهِ)

[مسند احمد : کتاب من مسند القبائل، باب من حدیث اسماء بنت یزید]

"حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں میں نے نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا جو بھی شراب پیے اللہ تعالیٰ اس سے چالیس دن تک راضی نہیں ہوگا۔ اگر وہ مر گیا تو وہ کفر کی حالت میں مرے گا۔ اگر اس نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائے گا۔"

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رض) سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ مَنْ رَأَى مُنْكَرًا فَغَيَّرَهُ بِيَدِهِ فَقَدْ بَرِءَ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُغَيِّرَهُ بِيَدِهِ فَغَيَّرَهُ بِلِسَانِهِ فَقَدْ بَرِءَ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُغَيِّرَهُ بِلِسَانِهِ فَغَيَّرَهُ بِقَلْبِهِ فَقَدْ بَرِءَ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ)[رواہ النسائی : بَاب تَفَاضُلِ أَهْلِ الْإِيمَانِ]

"حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ نے فرمایا جس شخص نے برائی کو دیکھا تو اس نے اسے اپنے ہاتھ سے ختم کیا تو وہ بری ہو گیا اور اگر اس نے اس برائی کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں پائی تو اس نے اسے اپنی زبان سے روکا تو وہ بھی بری ہو گیا اگر اس نے زبان سے روکنے کی طاقت نہ پائی تو اس نے اسے اپنے دل سے برا جانا تو وہ بھی بری ہو گیا اور یہ سب سے کمتر ایمان ہے۔" (فہم)

ایک روایت میں ہے جس قوم میں گناہ کیے جائیں وہ قوم زیادہ اور غالب ہو پھر بھی مداہنت کرے اور خاموش رہے اور برائی کو بدلنے کی کوشش نہ کرے ، تو پھر ان سب پر عذاب آئے گا۔ (المعجم الکبیر ، ج ۲ ، رقم الحدیث : ۲۳۸۵ ، ۲۳۸۱۔ ۲۳۸۰ ، مسند احمد ، ج ۴ ، ص ۳۶۳۔ ۳۶۱ ، طبع قدیم ، سنن کبری للبیہقی ، ج ۱۰ ، ج ۹۱)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات بیان کی جائے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (سنن ترمذی ، ج ۴ ، رقم الحدیث : ۲۱۸۱ ، سنن ابو داؤد ، ج ۳ ، رقم الحدیث : ۴۳۴۴ ، سنن ابن ماجہ ، ج ۲ ، رقم الحدیث : ۴۰۱۱ ، مسند البزار ، رقم الحدیث : ۳۳۱۳ ، مجمع الزوائد ، ج ۷ ، ص ۲۷۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنو اسرائیل میں سب سے پہلی خرابی یہ واقع ہوئی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرکے یہ کہتا ، اے شخص اللہ سے ڈر ، اور جو کام تو کر رہا ہے اس کو چھوڑ دے۔ کیونکہ یہ کام تیرے لیے جائز نہیں ہے۔ پھر جب دوسرے دن اس سے ملاقات کرتا ، تو اس کا وہ کام اس کو اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے منع نہ کرتا ، جب انھوں نے اس طرح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ایک جیسے کر دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا بنو اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ، ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ، کیونکہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ان برے کاموں سے نہیں روکتے تھے جو وہ کرتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے ، وہ بہت برا کام تھا (المائدہ : ۷۹۔ ۷۸) پھر آپ نے فرمایا ہر گز نہیں بخدا تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا اور تم ضرور ظلم کرنے والے کے ہاتھوں کو پکڑ لینا اور تم اس کو ضرور حق پر عمل کے لیے مجبور کرنا ، ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک جیسے کر دے گا ، پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی تھی۔ (سنن ابو داؤد ، ج ۳ ، رقم الحدیث : ۴۳۳۷۔ ۴۳۳۶ ، امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے ، سنن ترمذی ، ج ۵ ، رقم الحدیث : ،

۳۰۵۹، ۳۰۵۸، سنن ابن ماجہ ، ج ۲ ، رقم الحدیث : ۴۰۰۶، مسند احمد ، ج ۱ ، ص ۳۹۱ ، طبع قدیم ، امام احمد کی سند میں انقطاع ہے ، اس لیے یہ سند ضعیف ہے ، مسند احمد بتحقیق احمد شاکر ، ج ۴ ، رقم الحدیث : ۳۷۱۳ ، طبع دار الحدیث قاہرہ المعجم الاوسط ، ج ۱ ، رقم الحدیث : ۵۲۳، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ امام طبرانی کی سند کے سند کے تمام راوی صحیح ہیں ، مجمع الزوائد ، ج ۷ ، ص ۲۶۹)

جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کی عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا حال یہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیاوی لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انھوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا۔ کیونکہ دنیا کی حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکونت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لیے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص میں بہت ہی سخت تاکید و تہدید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرض امر بالمعروف کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔

بھلائی ترک کرنا

بیضاوی نے لکھا ہے کہ بھلائی کو ترک کرنا گناہ سے زیادہ برا ہے کیونکہ معصیت میں تو نفس کے لیے لذت ہوتی ہے طبیعت کا جھکاؤ ہوتا ہے لیکن بھلائی کے ترک میں نہ لذت ہوتی ہے نہ میلان طبع اس لیے بھلائی کا ترک زیادہ مذمت کے قابل ہے۔

اس آیت میں مشائخ و علماء کو سخت زجر ہے کیونکہ ان کا فرض تو یہ تھا کہ دوسروں کو برائی سے روکیں بجائے روکنے کے وہ برائی کا حکم دیتے بلکہ خود بھی کرتے تھے ، بعض اہل تفسیر کے نزدیک الربانیون سے علماء نصاریٰ اور احباء سے علماء یہود مراد ہیں۔ (اس آیت میں مشائخ و علماء کو سخت زجر ہے کیونکہ ان کا فرض تو یہ تھا کہ دوسروں کو برائی سے روکیں بجائے روکنے کے وہ برائی کا حکم دیتے بلکہ خود بھی کرتے تھے ، بعض اہل تفسیر کے نزدیک الربانیون سے علماء نصاریٰ اور احباء سے علماء یہود مراد ہیں۔ (گلدستہ)

علماء اور مشائخ کی تباہی کی جڑ " گناہ کی بات اور حرام خوری ہیں

اس آیت کریمہ میں علماء و مشائخ کے حوالے سے دو جرائم کا بطور خاص ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک ہے : "قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ "گناہ کی بات اور دوسرا ہے " أَكْلِهِمُ السُّحْتَ "یعنی حرام خوری۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء و مشائخ کے لیے یہ دو گناہ تمام گناہوں کی جڑ اور تمام برائیوں کا سرچشمہ ہیں کیونکہ علماء و مشائخ اپنی قوم کے لیے اس وقت تک اسوہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں ، جب تک ان میں حق گوئی اور حق نصیحت کا جذبہ باقی رہتا ہے۔ لیکن جب ان کی زبان گناہ سے آلودہ ہو جائے اور بڑھتے بڑھتے اللہ کے بارے میں یاوہ گوئی سے بھی دریغ نہ کرے اور دین کی باتوں کا مذاق اڑانا یا ان کا برداشت کرنا ، ان کا معمول بن جائے تو پھر وہ اپنی قوم کے لیے نمونہ اور اسوہ کیا ، الزام بن کے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا عمل اس وقت تک قوم کے لیے قابل تقلید رہتا ہے ، جب تک وہ عسرت اور تنگدستی میں زندگی گزارنے کو تو برداشت کر لیتے ہیں ، لیکن کبھی ہوس زر کے اسیر ہو کر حرام خوری اور مادی آلودگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ خود ان برائیوں کا ارتکاب کرنے لگیں تو ان کا عمل قوم کے لیے

نہ صرف قابل تقلید نہیں رہتا ' بلکہ ان کا وجود گالی بن کے رہ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کے اس مذہبی طبقہ کو انہی دونوں بنیادی برائیوں نے اپنی منصبی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

آج امت مسلمہ کے لیے بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ امت کی غالب اکثریت بری طرح ان مفاسد کا شکار ہو گئی ہے اور جن لوگوں کو ان برائیوں کو روکنے کے لیے عملی نمونہ بننا چاہیے ' اگرچہ ان میں ابھی تک قابل تقلید مثالیں موجود ہیں ' لیکن ان کی ایک اچھی خاصی تعداد خود ان کمزوریوں کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی (رح) نے ایک دفعہ دوران درس یہ واقعہ بیان فرمایا کہ بھوپال میں ایک قاضی صاحب تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ خواب میں سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی ' دوران ملاقات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قاضی صاحب نے عرض کی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ نے انگشت شہادت اٹھائی ' پہلے ہونٹوں پہ رکھی اور اس کے بعد پیٹ پر اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کی نگہداشت کرنا یعنی پیٹ میں حرام لقمہ نہ جانے پائے اور زبان پر گناہ کی بات نہ آنے پائے۔ واقعہ یہ ہے کہ صدق مقال اور رزق حلال ہی ایک مسلمان کا حقیقی جوہر ہے اور علماء اور مشائخ کی حقیقی پہچان ' اگر یہ دونوں باتیں امت مسلمہ میں کمزور پڑ جائیں اور بالخصوص علماء و مشائخ میں اس برائی کو داخل ہونے کا موقع مل جائے تو پھر اپنے اچھے انجام کی اللہ ہی سے دعا کرنی چاہیے۔ (روح)

مسائل

۱۔ درویشوں اور علماء لوگوں کو حرام خوری اور برے کاموں سے منع کرنا چاہیے۔

۲۔ برائی سے نہ روکنا بھی برائی ہے۔

آیت مبارکہ:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

لغۃ القرآن: [وَقَالَتِ : اور کہا][الْيَهُوْدُ : یہود نے][يَدُ : ہاتھ][اللّٰهِ : اللہ] [مَغْلُوْلَةٌ: بندھا ہوا] [ۭغُلَّتْ : بندھے ہوئے ہیں [اَيْدِيْهِمْ : ان کے ہاتھ][وَلُعِنُوْا : اور لعنت کی گئی][بِمَا : بسبب جو][قَالُوْا : انہوں نے کہا][ۘبَلْ : بلکہ][يَدٰهُ : اس کے دونوں ہاتھ][مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ: کھلے ہیں][يُنْفِقُ : وہ خرچ کرتا ہے][كَيْفَ : جیسے][يَشَاۗءُ: وہ چاہتا ہے][وَلَيَزِيْدَنَّ : اور یقیناً وہ زیادہ کرے گا][كَثِيْرًا : اکثر کو][مِّنْهُمْ : ان سے][مَّآ : جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][مِنْ : سے][رَّبِّكَ : آپ کا رب][طُغْيَانًا : سرکشی][وَّكُفْرًا: اور کفر][وَاَلْقَيْنَا : اور ہم نے ڈالا][بَيْنَهُمُ : ان کے درمیان][الْعَدَاوَةَ : دشمنی][وَالْبَغْضَاۗءَ : اور بغض][اِلٰي : تک][يَوْمِ الْقِيٰمَةِ : دن قیامت][ۭكُلَّمَآ : جب بھی][اَوْقَدُوْا : انہوں نے جلائی][نَارًا : آگ][لِّلْحَرْبِ : جنگ کے لیے][اَطْفَاَهَا : بجھا دیا اسکو][اللّٰهُ : اللہ][ۙوَيَسْعَوْنَ : اور وہ دوڑتے ہیں][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][فَسَادًا : فساد کرنا][ۭوَاللّٰهُ : اور اللہ][لَا : نہیں][يُحِبُّ : پسند کرتا][الْمُفْسِدِيْنَ : فساد کرنے والے]

ترجمہ: اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے (یعنی معاذاللہ وہ بخیل ہے)، ان کے (اپنے) ہاتھ باندھے جائیں اور جو کچھ انھوں نے کہا اس کے باعث ان پر لعنت کی گئی، بلکہ (حق یہ ہے کہ) اس کے دونوں ہاتھ (جود و سخا کے لئے) کشادہ ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ (یعنی بندوں پر

عطائیں) فرماتا ہے، اور (اے حبیب!) جو (کتاب) آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کی گئی ہے یقیناًان میں سے اکثر لوگوں کو (حسداً) سر کشی اور کفر میں اور بڑھادے گی، اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا ہے، جب بھی یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھادیتا ہے اور یہ (روئے) زمین میں فساد انگیزی کرتے رہتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تشریح: پہلے تو یہ بتایا کہ یہود اسلام عبادات، اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس آیت میں یہ بتایا کہ اب ان کی بے باکی اور جسارت کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عزت وجلال میں بھی گستاخانہ کلمات زبان پر لانے سے نہیں شرماتے۔ جب یہود نے حضور رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضور کے غلاموں کو دیکھا کہ زندگی فقر وفاقہ سے کٹ رہی ہے افلاس وتنگ دستی کا دور دورہ ہے اور قرآن کی یہ آیت بھی انھوں نے سنی من یقرض اللہ قرضا حسنا تو بڑے بے حیائی سے کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خدا فقیر ہے اور بخیل ہے۔ اسی لیے تو مسلمان بھوکے مر رہے ہیں اگر اس کے پاس کچھ ہوتا یا وہ سخی ہوتا تو مسلمانوں کا افلاس اور غربت کے مارے یہ حال ہوتا! (ضیاء)

شان نزول

وَقَالَتِ الْيَهُودُ: اور یہودیوں نے کہا۔

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ یہودی بہت خوش حال اور نہایت دولت مند تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب ومخالفت کی توان کی روزی کم ہو گئی۔ اس وقت فنحاص یہودی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بندھا ہے یعنی مَعَاذَاللہ وہ رزق دینے اور خرچ کرنے میں بخل کرتا ہے۔ اس کے اس قول پر کسی یہودی نے منع نہ کیا بلکہ راضی رہے، اسی لیے یہ سب کا مقولہ قرار دیا گیا اور یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی
(خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۴، ۱/۵۰۹، مدارک، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۴، ص ۲۹۳)
اور فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تو جواد و کریم ہے، ہاں ان یہودیوں کے ہاتھ باندھے جائیں۔ اس ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ یہودی دنیا میں سب سے زیادہ بخیل ہو گئے یا اس جملے کا یہ معنیٰ ہے کہ ان کی اس بے ہودہ گوئی اور گستاخی کی سزا میں ان کے ہاتھ جہنم میں باندھے جائیں اور اس طرح انھیں آتش دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کشادہ ہونے سے مراد بے حد کرم اور مہربانی ہے کہ دوستوں کو بھی نوازے اور دشمنوں کو بھی محروم نہ کرے ورنہ اللہ تعالیٰ جسمانی ہاتھ اور ہاتھ کے کھلنے سے پاک ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق جیسے اور جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اس میں کسی کو اعتراض کرنے کی مجال نہیں۔ وہ کسی کو امیر اور کسی کو غریب کرتا ہے لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس کے خزانے میں کچھ کمی یا کرم میں کچھ نقصان ہے بلکہ بندوں کے حالات کا تقاضا ہی یہ ہے اور اس میں ہزارہا مصلحتیں ہیں۔
وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم: اور ضرور ان میں سے بہت سے لوگوں (کی سرکشی اور کفر) میں اضافہ کرے گا۔} ارشاد فرمایا کہ جتنا قرآن پاک اترتا جائے گا اتنا ہی یہودیوں کا حسد و عناد بڑھتا جائے گا اور وہ اس کے ساتھ کفر و سرکشی میں بڑھتے رہیں گے جیسے مُقَوِّی غذا کمزور معدے والے کو بیمار کر دیتی ہے، اس میں غذا کا قصور نہیں بلکہ مریض کے معدے کا قصور ہے یا جیسے سورج کی روشنی چمگادڑ کو اندھا کر دیتی ہے تو اس میں سورج کا نہیں بلکہ چمگادڑ کی آنکھ کا قصور ہے۔

آیت ”وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم“ سے معلوم ہونے والے مسائل

اس سے دو چیزیں معلوم ہوئیں:

(1)۔۔ جس کے دل میں سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت نہ ہو اس کے لیے قرآن و حدیث کفر کی زیادتی کا سبب ہیں جیسے آج کل بہت سے بے دینوں کو دیکھا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ دین کی عظمت، دین لانے والے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت سے ہے۔

(2)۔۔ کفر میں زیادتی کمی ہوتی ہے یعنی کوئی کم شدید کافر ہوتا ہے اور کوئی زیادہ شدید۔ کمی زیادتی کسی مقدار کے اعتبار سے نہیں ہوتی، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے یعنی کوئی زیادہ مضبوط ایمان والا اور کوئی کمزور ایمان والا ہوتا ہے۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: اور ہم نے قیامت تک ان میں دشمنی اور بغض ڈال دیا۔} یعنی وہ ہمیشہ باہم مختلف رہیں گے اور ان کے دل کبھی نہ ملیں گے اگرچہ اوپر سے کبھی کبھار مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔

{كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ: جب کبھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں۔} جب بھی یہودیوں نے فساد، شر انگیزی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی تو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے کسی ایسے شخص کو ان پر مُسَلَّط کر دیا جس نے انھیں ہلاکت اور بربادی سے دوچار کر دیا، پہلے جب انھوں نے فتنہ و فساد شروع کیا اور توراۃ کے احکام کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان کی طرف بھیج دیا جس نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا، کچھ عرصے بعد پھر جب انھوں نے سر اٹھایا تو طیطوس رومی نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی، پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب انھوں شر انگیزی شروع کی تو فارسی مجوسیوں نے ان کا حشر نشر کر دیا، پھر کچھ عرصے بعد جب فساد کا بازار گرم کیا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر تَسَلُّط اور غلبہ عطا فرمادیا۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۴، ۱/۵۱۰-۵۱۱)

ایک قول یہ ہے کہ جب بھی یہودی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ کا ارادہ کرتے ہوئے اس کے اسباب تیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے منصوبے ناکام بنادے گا۔ (ابو سعود، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۴، ۲/۶۶) (صراط)

دراصل اسلام کے ابتدائی دور میں مدینہ کے یہود نے جب مسلمانوں کی غربت اور تنگدستی دیکھی اور ساتھ یہ بھی سنا کہ اللہ تعالیٰ قرض حسن بھی مانگتا ہے تو کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خدا فقیر یعنی محتاج اور غریب ہے۔ (تفسیر قرطبیؒ) اور اس آیت میں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے یعنی وہ بخیل ہے اور اپنے بندوں پر خرچ نہیں کرتا۔ اسی لیے تو مسلمان افلاس و غربت کا شکار ہیں۔ علامہ طبری لکھتے ہیں: اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی بھی دی ہے کہ آپ ان کی گستاخیوں سے رنجیدہ نہ ہوا کریں، یہ تو ایسے سرکش ہیں جو مجھے بھی فقیر اور بخیل کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ (تفسیر ابن جریر طبری)

یا تو یہ خبر دی گی ہے کہ دراصل یہودی خود فقیر اور بخیل ہوگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس گستاخی کی وجہ سے مردود ہوگئے ہیں یا بطور بددعا انھیں کہا جارہا ہے کہ انہی کے ہاتھ تنگ ہو جائیں یعنی وہ خود فقیر و بخیل ہو جائیں اور ان پر اس بدزبانی کی وجہ سے لعنت پڑے، چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی ایسی پھٹکار پڑی کہ انھیں تنگدست ہو کر مدینہ چھوڑنا پڑا اور مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم فرمایا کہ قیصر و کسریٰ حکومتوں اور خزانوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی تردید بندہ مومن کی ذمہ داری ہے اور ایسے گستاخ کے لیے بددعا کرنا قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے اور وہ شخص بھی ایسے ہی سلوک کا مستحق ہے جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں گستاخی کرے جیسے قرآن مجید کی ایک پوری سورت ابو لہب کے خلاف نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے پاک ہے۔ ہاتھوں کا بندھا ہوا ہونا بخل سے کنایہ ہے اور دونوں ہاتھوں کا کھلا ہوا ہونا جود وعطا کی کثرت سے کنایہ ہے، تو ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ یہود کے لغو اعتراض کا رد فرما رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ وہ فقیر اور بخیل نہیں بلکہ غنی اور بہت زیادہ سخی ہے۔

جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے، جو چاہتا ہے، جتنا چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے غیر محدود خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"بیشک اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ رات دن خرچ کرتا ہے لیکن کوئی کمی نہیں آتی۔ ذرا دیکھو تو جب سے آسمان و زمین اس نے پیدا کئے ہیں وہ خرچ کر رہا ہے لیکن اس کے ہاتھ کے خزانے میں کمی نہیں آئی۔۔۔" (بخاری: 7419: کتاب التوحید: باب 22)

ابو سعود نے کہا: کسی کے رزق میں کمی کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیضان میں نقص ہے بلکہ اس انسان کے اپنے گناہوں کی نحوست یا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا۔ (صفوۃ التفاسیر) اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی انسان کی غربت کی وجہ اس کی شامت اعمال ہو۔ کبھی یہ غربت اس کے بہتر مستقبل کا پیش خیمہ یا کسی بڑی مصیبت سے نجات کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایک ہی قسم کی تکلیف کے دو مختلف اور متضاد اسباب اور مقاصد ہو سکتے ہیں جیسے چور کا ہاتھ اس لیے کاٹا جاتا ہے کہ اس کی بداعمالی کی اسے سزا دی جائے اور بیمار کا ہاتھ اس لیے کاٹا جاتا ہے تاکہ اس کا بقیہ جسم اس بیماری سے محفوظ ہو جائے۔ اب ہاتھ کاٹنے کا نقص تو ایک ہے مگر مختلف اسباب کی وجہ سے مقاصد اور نتائج مختلف ہیں یعنی چور شرمندہ ہوتا ہے جبکہ مریض کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

یہودی علماء نے دنیاوی لالچ اور امیر لوگوں کے تحفظ کے لیے ایسے احکام گھڑ لیے تھے جو توراۃ میں نہیں تھے، اس لیے ان کے رد میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں اور ہر آیت کے نازل ہونے کے بعد اکثر یہود اس کا انکار کر دیتے، لہٰذا جتنا قرآن مجید نازل ہوتا جائے گا اتنا ہی وہ قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے کفر اور سرکشی میں آگے بڑھتے رہیں گے، کیونکہ قرآن مجید حق اور سچ بات کہتا ہے اور حق بات کو وہی تسلیم کر سکتا ہے جس کا ذہن وضمیر سلامت ہو لیکن جس کے ذہن میں فتور اور ضمیر پر تعصب کے پردے ہوں اسے حق بھی ناقص نظر آتا ہے جیسے بعض بیماروں کو مٹھائی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں مٹھائی کا قصور نہیں ہے بلکہ مریض کی بیماری نے اس کے ذوق کو ناقص کر دیا ہے اس لیے اسے ہر چیز ناقص محسوس ہوتی ہے۔

۔ نیز قرآن مجید نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے دلائل کو بالکل واضح کر دیا اور بعض حق پرست یہود نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو اس سے بھی یہود کے حسد وعناد میں اضافہ ہو گا جس کے نتیجہ میں وہ کفر وسرکشی میں مزید آگے بڑھتے جائیں گے۔

۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: اے اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن نعمتوں سے نوازا ہے یہ حسد کے مارے یہود کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہیں۔ ان نعمتوں کو دیکھ کر اہل ایمان کی تصدیق اور نیکیوں میں اضافہ ہو گا جبکہ یہود کے انکار اور سرکشی میں اضافہ ہو گا۔

(تفسیر ابن کثیر)

یہود کے مسلسل کفر و سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہودی فرقوں کے درمیان دینی معاملات میں ایسی دشمنی اور عناد پیدا فرمادیا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

جب بھی یہود نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شہید کرنے کی سازش کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے درمیان اختلاف پیدا کردیا۔ (تفسیر ابن عباس) جس کی وجہ سے ان کی سازش کی آگ خود بخود بجھ گئی اور وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکے تاہم وہ زمین میں فساد پھیلانے یعنی لوگوں کو راہ راست سے بہکانے میں سرگرم ہیں اور اس فساد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یہود کو پسند نہیں کرتا۔ (تفسیر ابن عباس) (امداد)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر][اَنَّ : بیشک][اَهْلَ : اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][وَاتَّقَوْا : اور ڈریں][لَكَفَّرْنَا : وہ یقیناً ہم مٹادیں گے][عَنْهُمْ : ان سے][سَيِّاٰتِهِمْ : ان کی برائیاں][وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ : اور ضرورہم داخل کریں گے ان کو][جَنّٰتِ : باغات][النَّعِيْمِ : نعمتوں والے]

ترجمہ: اور اگر اہل کتاب (حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر) ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرلیتے تو ہم ان (کے دامن) سے ان کے سارے گناہ مٹادیتے اور انھیں یقیناً نعمت والی جنتوں میں داخل کردیتے

تشریح: اس آیت کا معنی ہے کہ اگر اہل کتاب اللہ اور اس کے رسول ' یعنی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آتے اور اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرنے اور گناہ کرنے اور سرکشی کرنے سے اللہ سے ڈرتے ' یعنی اللہ کی کتاب میں لفظی اور معنوی تحریف نہ کرتے ' رشوت لے کر حرام مال نہ کھاتے تو ہم نہ صرف یہ کہ ان کے گناہوں کو مٹادیتے ' بلکہ ان کو جنت کی نعمتوں میں اخل کردیتے۔

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی خرابی اور ان کے مرض کا ذکر کیا تھا ' اور اس آیت میں اس کے تدارک اور علاج کا ذکر فرمایا ہے۔(تبیان)

اہل کتاب گستاخیاں اور نافرمانیاں کرنے کی بجائے ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو آخرت میں ہی نہیں دنیا میں بھی جنت کی جھلک پاتے۔

اگر اہل کتاب اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرنے کی بجائے اس کی نازل کردہ ہدایات پر ایمان لاتے اور اجتماعی زندگی میں توراۃ وانجیل کا نفاذ کرتے تو دنیا وآخرت کے ثمرات سے سرفراز کیے جاتے۔ اہل کتاب کے جرائم کی وجہ سے ان میں سے کچھ لوگوں کو دنیا میں بندر اور خنزیر بنادیا گیا اور باقی کے درمیان ہمیشہ کے لیے حسد وبغض اور عداوت ودشمنی پیدا کردی گئی۔ اب اس کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں دنگا فساد برپا کرنے کے درپے رہتے ہیں حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر ایمان لاتے اور اپنے دور میں توراۃ وانجیل کو اپنے لیے ضابطہ حیات مقرر کرتے تو نہ صرف ان کے گناہ معاف کردیے جاتے۔ بلکہ دنیا میں بھی بابرکت رزق سے مستفید ہوتے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ انھیں جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرماتے۔ یہاں دنیا کی فراوانی کے لیے فرمایا ہے کہ یہ لوگ اپنے اوپر، نیچے سے رزق پاتے یعنی زمین ان کے لیے اپنے خزانے اگلتی اور آسمان سے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہوتا جس کی ظاہری شکل بارش کا بروقت ہونا اور لوگوں کا آفاقی آفتوں سے محفوظ رہنا ہے۔ اس کے لیے شرط یہ تھی کہ سچے ایمان کے ساتھ وہ توراۃ اور انجیل کو اجتماعی زندگی میں بالفعل نافذ کرتے۔ یہی اقامت دین کا مفہوم ہے لیکن انھوں نے انفرادی زندگی میں بداعمالیوں کو اپنایا اور اجتماعی زندگی میں دین کو کلیتاً خارج کردیا دوسرے لفظوں میں نظام حکومت سے توراۃ اور انجیل کو نکال کر اپنی مرضی کے قوانین نافذ کیے۔ یوں ان کی پوری زندگی توراۃ اور انجیل کے احکامات سے خالی ہوگی۔ جس کے نتیجے میں ان کے کردار سے دیانت وامانت، شرم وحیا اور شرافت ونجابت کا خاتمہ ہوا۔ دنیا کی فراوانی کے باوجود ان سے برکت اٹھالی گئی تاہم ان میں ایسے خوش قسمت بھی ہیں جنھوں نے اعتدال کا رویہ اختیار کرتے ہوئے نہ صرف توراۃ وانجیل پر عمل کیا بلکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لا کر دونوں جہانوں میں سرخرو ہوئے۔

(عن ابی هُرَيْرَةَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حَدٌّ يُعْمَلُ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ مِنْ أَنْ يُمْطَرُوا ثَلَاثِينَ صَبَاحًا) [رواہ النسائی: کتاب قطع السارق، باب الترغیب فی اقامۃ الحد]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کیا کرتے تھے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا زمین پر ایک حد کا نفاذ اہل دنیا کے لیے تیس دن کی بارش سے بھی بہتر ہے۔" (یہاں تیس دن کی بارش سے مراد مناسب وقت پر بارشوں کا ہونا ہے۔)

(حَدَّثَنِي أَبُو بُرْدَةَ (رض) عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔۔) [رواہ البخاری: باب تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ]

"حضرت ابوبردہ (رض) اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں انھوں نے کہا رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین آدمیوں کے لیے دوہرا اجر ہے ایک وہ آدمی جس کا تعلق اہل کتاب سے وہ اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی ایمان لایا۔۔"

ان دو آیات کے اندر اسلامی تصور حیات کا ایک عظیم اصول بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو آیات سے انسانی زندگی کی ایک اساسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں اس اصول کی مناسب وضاحت کی ضرورت ہے اور دور جدید میں اس وضاحت کی ضرورت پہلے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ عقل انسانی اور انسانی پیمانے اور انسانی حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔ دور جدید کے ان اضطرابات اور فکری انتشار کی وجہ سے اس عظیم حقیقت کے سمجھنے میں بھی انسان صحیح راہ گم کرسکتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اگر وہ ایمان لے آئیں تو اللہ ان کی تمام تقصیرات معاف کردے گا اور انھیں جنت نعیم میں داخل کردے گا اور یہ تو ہے جزائے آخرت۔ لیکن اگر انھوں نے اپنی اس دنیا کی زندگی میں اللہ کا وہ نظام رائج کیا ہوتا جو توراۃ اور انجیل میں ان کے ہاں موجود تھا اور جو تعلیمات اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی تھیں جن میں انھوں نے بعد میں تحریف کردی تھی 'تو اگر وہ ایسا

بھی کرتے تو ان کو کم از کم یہ دنیاوی زندگی تو اچھی طرح گزرتی۔ ان کے ہاں ترقی ہوتی اور ان کے رزق حلال میں اضافہ ہوتا اور ان کے اوپر آسمان سے رزق نازل ہوتا اور ان کے نیچے سے زمین ان کے لیے سونا اگلتی 'پیداوار زیادہ ہوتی اور ان کے درمیان وہ خوب تقسیم ہوتی اور ان کے دنیاوی امور و مسائل سب کے سب حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس کہ نہ تو وہ ایمان لاتے ہیں 'نہ خداترسی کی روش اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلامی نظام زندگی نافذ کرتے ہیں۔۔ ہاں ان میں سے قلیل لوگ ان کی تاریخ میں ایسے رہے ہی جو صراط مستقیم پر چلنے والے تھے اور اپنے نفوس کے خلاف انھوں نے ظلم نہ کیا تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ بد عمل تھے۔ (آیت) "وکثیر منھم سآء مایعملون "۔ (۵ : ٦٦) یوں ان دو آیات سے بالکل واضح نظر آتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام اور اس دنیا کی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہونا صرف اس بات کا ضامن نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کے لیے اخروی زندگی کی بھلائی کے اسباب فراہم کردے گا۔ اگرچہ اسلامی نظام کے قیام کا بڑا اور دائمی مقصد فلاح اخروی کا حصول ہے۔ وہ بھی نہایت ہی اہم اور دائمی مقصد ہے لیکن اقامت دین اس دنیا کے مسائل کا بھی حل ہے اور دین قائم کرنے والوں کی دنیا بھی اچھی ہوگی۔ اس دنیا کے وسائل زیادہ ہوں گے 'ان کی تقسیم بہت ہی اچھی طرح ہوگی۔ معاشرے کے اندر ایک کفالتی نظام قائم ہوگا اور معاشرہ دنیاوی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے کے اندر پائی جانے والی معاشی خوشحالی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں اس تصویر کشی میں فیضان اور کثرت کا اظہار ہے۔ (لاکلوا من فوقھم و من تحت ارجلھم "۔ (۵ : ٦٦) "تو ان کے اوپر سے رزق برستا اور وہ کھاتے اور نیچے سے ابلتا"۔ یہاں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ بات نہیں ہے کہ ایک راستہ علیحدہ ہے جو جس وقت انسان اس راستے سے ادھر ادھر ہو گیا تو سمجھو کہ اس کی دنیا وآخرت خراب ہو گئی۔ یہ واحد راستہ ایمان 'خداترسی اور اقامت دین کا راستہ ہے اور دینی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا راستہ ہے۔

یہ نظام صرف عقیدے 'صرف نظریئے اور صرف قلبی شعور کا نام نہیں ہے۔ بیشک یہ چیزیں بھی اس کے اندر ہیں لیکن درحقیقت یہ قلبی شعور کے ساتھ انسانی زندگی کے لیے ایک عملی نظام بھی ہے جس کی اقامت فرض ہے اور اس کے مطابق زندگی کو تبدیل کرنا فرض ہے۔ اور اقامت دین کے ساتھ ساتھ تقوی کی بھی ضرورت ہے۔ تقوی ہی وہ معیار ہے جس کے ذریعے اس دنیا میں زندگی کو درست کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ذریعے اس دنیا کی زندگی کا نظام درست ہو سکتا ہے اور رزق کی فراوانی ہو سکتی ہے۔ ملک کے اندر پیداوار بڑھ سکتی ہے 'اس کی اچھی تقسیم ہو سکتی ہے تاکہ سب لوگ کھائیں اور پئیں اور اس نظام کے اندر ان کے لیے آسمان سے رزق برسے اور زمین ابلے۔

ایمانی نظام حیات میں دین داری کے لیے ترک دنیا لازمی نہیں ہے اور نہ ہی سعادت اخروی کے حصول کے لیے دنیا میں ذلت اور خواری ضروری ہے۔ آخرت کے لیے اس دنیا سے گزرنے کے سوا کوئی اور راہ نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہوں نے آج دنیا کے لوگوں کے افکار کو دھندلا کر دیا ہے اور ان افکار کی وجہ سے لوگوں کی عملی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ (ظلال)

مسائل

۱۔ ایمان و تقویٰ اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ گناہ مٹا دیتا ہے۔ ۲۔ ایمان و تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت کا داخلہ عطا فرمائے گا۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرنے کی وجہ سے رزق میں فراوانی ہوتی ہے۔ ۴۔ اہل کتاب کی اکثریت بد عمل ہے۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر][اَنَّهُمْ : یقیناً][اَقَامُوا : وہ قائم کریں][التَّوْرٰىةَ : تورات][وَالْاِنْجِيْلَ : اور انجیل][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْهِمْ : ان کی طرف][مِّنْ : سے][رَّبِّهِمْ : ان کے رب][لَاَكَلُوْا : یقیناً وہ کھاتے][مِنْ : سے][فَوْقِهِمْ : اپنے اوپر][وَمِنْ : اور سے][تَحْتِ : نیچے][اَرْجُلِهِمْ : اپنے پاؤں][مِنْهُمْ : ان سے][اُمَّةٌ : امت][مُّقْتَصِدَةٌ : درمیانی][وَكَثِيْرٌ : اور اکثر][مِّنْهُمْ : ان سے][سَآءَ : برا][مَا : جو][يَعْمَلُوْنَ : وہ عمل کرتے ہیں]

ترجمہ: اور اگر وہ لوگ توراۃ اور انجیل اور جو کچھ (مزید) ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا تھا (نافذ اور) قائم کر دیتے تو (انہیں مالی وسائل کی اس قدر وسعت عطا ہو جاتی کہ) وہ اپنے اوپر سے (بھی) اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (بھی) کھاتے (مگر رزق ختم نہ ہوتا)۔ ان میں سے ایک گروہ میانہ رَو (یعنی اعتدال پسند ہے)، اور ان میں سے اکثر لوگ جو کچھ کر رہے ہیں نہایت ہی برا ہے۔

تشریح: گزشتہ چند آیات سے خطاب ان اہل کتاب کو کیا جارہا ہے جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں موجود تھے۔ جب اسلام پھیلنا شروع ہوا اور لوگوں کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ بڑھ گئیں تو اہل کتاب کے دنیاوی کاروبار کو سخت دھچکا لگا اور وہ غربت و افلاس کا شکار ہونے لگے۔ اس آیت میں قرآن مجید نے ان کی غربت کی وجہ سے بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اگر وہ توراۃ وانجیل کے احکام کے پابند رہتے اور ان میں بیان کردہ بشارات کی روشنی میں قرآن مجید پر ایمان لے آتے تو وہ غربت کا شکار نہ ہوتے اور زمین وآسمان کی نعمتوں سے مالا مال رہتے لیکن ان میں کچھ لوگ حقیقت پسند بھی تھے جو قرآن مجید پر ایمان لے آئے اور عزت و وقار سے زندگی بسر کی، جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے بعض یہودی ساتھی، اسی طرح شاہ حبشہ یعنی نجاشی اور اس کے بعض عیسائی ساتھی۔ (تفسیر ابن عباس)

یہ دنیاوی خوشحالی کا وعدہ اہل کتاب کے صرف ان مخصوص لوگوں کے ساتھ ہے جو آپ ﷺ کے زمانے میں موجود اور آپ ﷺ کو مخاطب تھے۔ ویسے یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں کہ جو بھی مخلص اور ایماندار ہوگا وہ ہمیشہ خوشحال رہے گا ہاں اتنا ضرور ہے کہ مخلص ایماندار کی دنیاوی زندگی اطمینان بخش، پاکیزہ اور قابل رشک ہوتی ہے چاہے دنیاوی حالات کے اعتبار سے وہ خوشحال ہو یا تنگدست۔ اس سلسلہ میں انبیائے کرام (علیہم السلام) اور صحابہ کرام (رض) کے حالات زندگی بڑا حسین نمونہ ہیں۔ ان میں سے بعض دولت منداور بعض تنگدست تھے مگر ہر حال میں ان کے کردار پاکیزہ اور قابل تقلید ہیں۔ (امداد)

دین کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وُسعَت زرق کا ذریعہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمان برداری سے رزق میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت ابو اسحاق ہمدانی (رض) سے مروی ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " جسے عمر میں اضافہ ہونا اور رزق میں زیادتی ہونا پسند ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔

(شعب الایمان، السادس والخمسون من شعب الایمان۔۔ الخ، ۲۱۹/۶، الحدیث: ۷۹۴۷)

یہ اظہار مبالغہ کے لیے ہے۔ یعنی توراۃ وانجیل کی اتباع کی برکت سے انھیں کشادہ، حلال اور پاکیزہ روزی دی جاتی۔ اسی طرح دوسری آیت ہے۔ ولو ان اھل القری امنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض، اگر ان گاؤں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ اور اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آسمان سے ان کے قلب وروح کے لیے رحمتوں اور برکتوں کی غذا نازل کرتے اور ان کے جسم کے لیے زمین میں چھپے ہوئے رزق کے خزانوں کے منہ کھول دیتے۔ کیونکہ انسان کو جس طرح جسمانی خوراک کی ضرورت ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ روحانی غذا کی ضرورت ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی سے فقر و تنگ دستی نہیں بلکہ فراخی اور وسعت ہوتی ہے **ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب**۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کی راہ بنادیتا ہے اور اسے ایسے ذرائع سے رزق دیتا ہے جن کا اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ (ضیاء)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اے لوگو! جو چیز تمہیں جنت کے قریب اور جہنم سے دور کرسکتی ہے اس کا میں نے تمہیں حکم دے دیا اور جو چیز تمہیں جہنم کے قریب اور جنت سے دور کرسکتی ہے اس سے میں نے تمہیں منع کردیا۔ بیشک رُوحُ الاَمین (علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی جان اس وقت تک مرے گی نہیں جب تک وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اچھے طریقے سے رزق طلب کرو۔ رزق کا آہستہ پانا تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ذریعے رزق طلب کرنے لگو کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اس کی اطاعت کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

(شرح السنہ، کتاب الرقاق، باب التوکل علی اللہ عزوجل، ۳۲۹/۷، الحدیث: ۴۰۰۶)

{ مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ: ان میں ایک گروہ اعتدال کی راہ والا ہے۔} ارشاد فرمایا کہ سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں بلکہ بعض اعتدال پسند ہیں اور وہ حد سے تجاوز نہیں کرتے، یہ یہودیوں میں سے وہ لوگ ہیں جو تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) وغیرہ جبکہ بقیہ اکثریت نافرمان ہے جو کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ (صراط)

نفاذ شریعت کی برکات

یعنی انھیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد انھیں زندگی کی نامرادیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا بلکہ وہ من حیث الامت اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کے مرکز ٹھہریں گے اور باقی مسلمانوں کے ساتھ ان کو اس طرح نوازا جائے گا کہ رزق ان کے اوپر سے بھی برسے گا اور نیچے سے بھی ابلے گا۔ یعنی آسمان کی برکتوں کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کردے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ توراۃ اور انجیل اور جو کچھ ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا جارہا ہے ' اسے قائم کریں۔ یہاں مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ سے مراد قرآن کریم ہے ' جو اس وقت اللہ کی طرف سے نازل کیا جارہا تھا۔ حکم یہ دیا جارہا ہے کہ تم توراۃ اور انجیل اور قرآن کریم کو قائم کرو۔ توراۃ اور انجیل کو قائم کرنے کے حوالے سے ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کریم کو قائم کرنا صرف قرآن کریم کو قائم کرنا نہیں بلکہ درحقیقت توراۃ وانجیل کو بھی قائم کرنا ہے۔ اس لیے کہ توراۃ وانجیل دونوں کی اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق یہ قرآن کریم ہی ہے ' جو توراۃ اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والا اور سب کا محافظ و نگران ہے۔ مزید یہ بات کہ قرآن کریم نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ جب بھی تمہارے پاس نبی آخر الزماں تشریف لائیں جو تمہاری کتابوں اور شریعتوں کا مصدق بن کے آئیں گے:

لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ط

(تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا)

اس لحاظ سے اہل کتاب اس بات کے پابند تھے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں اور قرآن کریم کو نافذ کرنے میں ان کی مدد کریں اس لیے انھیں یاد دلایا جارہا ہے کہ اب تمہیں اپنے پیغمبروں کے ذریعے کیے گئے وعدے کے مطابق اللہ کے آخری رسول پر ایمان لا کر ان کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اخروی نعمتوں کا ذکر تو اس سے پہلی آیت میں ہوچکا ' دنیوی نعمتوں کا وعدہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔

مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ سے مراد قرآن و سنت دونوں ہیں

یہاں ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ توراۃ اور انجیل کے نام لینے کی طرح یہاں قرآن کریم کا نام لینے کی بجائے مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ کیوں کہا گیا؟ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جس طرح توراۃ اور انجیل موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئیں اور دونوں کی تبلیغ و دعوت کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔ گویا یہ دونوں کتابیں بنی اسرائیل کی طرف آئیں۔ اسی طرح اب بنی اسرائیل یہ

سمجھ رہے تھے کہ قرآن کریم بنی اسماعیل کی طرف آیا ہے ‘جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اگر اس کا کوئی حامل ہے تو وہ بنی اسماعیل ہیں اور اگر یہ کوئی اعزاز ہے تو اس کے مستحق بھی بنی اسماعیل ہیں چنانچہ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کتاب عالمگیر اور ہمہ گیر بن کر آئی ہے۔ یہ بنی اسماعیل کے لیے نہیں بلکہ ساری نوع انسانی کے لیے ہے کیونکہ یہ ذکر للعالمین ہے۔ اس لیے تمہیں آگے بڑھ کر اس لیے اسے قبول کرنا چاہیے کہ یہ تمہارا اپنا سرمایہ ہے اور تمہارے اپنے وعدے کی نعمت اور تمہاری اپنی میراث ہے۔ کسی خاص قبیلے کا اس پر کوئی استحقاق نہیں ‘ بلکہ یہ کتاب ہر اس قوم کے لیے راہنما ہے ‘جو اسے آگے بڑھ کر قبول کرلے اور اس کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اٹھالے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ سابقہ امتوں کی گمراہی اور فساد کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ امتیں جب گمراہ ہوئیں اور زوال نے ان کے اندر نفوذ اختیار کیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے ہاتھوں سے کتابیں گم ہوگئی تھیں اور یہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں سے بالکل محروم ہوگئے تھے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جو ان پر حادثہ گزرا ہے ‘وہ یہ ہے کہ کتابیں کسی نہ کسی حد تک ان کے پاس موجود رہیں ‘لیکن یہ اپنے رسولوں کی سنت اور سیرت سے بہت جلدی محروم ہوگئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب کتاب اللہ کے احکام کے مطابق پیغمبر کے عمل کی سند یا کتاب اللہ کے مجملات کی پیغمبر کی جانب سے تشریح یا کتاب اللہ کے مبہمات کی پیغمبر کی جانب سے تفسیر ‘ان کے پاس موجود نہ رہی تو اللہ کی کتاب ان کے ہاتھوں میں موم کی ناک بن کر رہ گئی۔ انھوں نے جیسے چاہا اس کے احکام کا قالب تیار کیا۔ شروع میں معنوی تحریف ہوئی ‘آہستہ آہستہ لفظی تحریف اور ترمیم تک نوبت پہنچی۔ گویا ان کی گمراہی اور کج روی کا آغاز اور پھر اس میں توسیع کا سبب صرف پیغمبروں کی سنت اور سیرت کا گم ہو جانا تھا۔ اس کو ایک مختصر سی مثال سے اس طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم نے ہمیں ”اقیموا الصلٰوۃ“ کہہ کر اقامت صلٰوۃ کا حکم دیا۔ لیکن قرآن کریم میں کہیں طریقہ نہیں بتایا گیا۔ قرآن کریم سے ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ نمازوں کی تعداد کتنی ہے ‘اس کے اوقات کیا ہیں ‘اذان کیا چیز ہے ‘جماعت کے احکام کیا ہیں۔ ہر نماز کی رکعتیں کتنی ہیں ‘فرائض اور واجبات کیا ہیں۔ غرضیکہ نماز کی پوری تفصیل سے متعلق کوئی چیز ہمیں قرآن کریم سے معلوم نہیں ہوتی۔ آج اگر خدانخواستہ ہمارے ہاتھوں میں صرف قرآن کریم محفوظ رہ جائے تو ہم نماز ادا کرنے سے عاجز ہو جائیں کیونکہ اس کی پوری تفصیل ہمیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث مبارکہ اور سنت طیبہ سے ملتی ہے۔ اگر یہ احادیث اور سنت مسلمانوں کے پاس موجود اور محفوظ نہ ہوتیں تو ہم نماز تک ادا نہیں کرسکتے تھے ‘چہ جائیکہ ہم باقی پوری شریعت پر عمل کرتے۔ اس لیے یہاں بجائے قرآن کریم کے لفظ کے مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ فرمایا گیا کہ تم نے دنیا میں اب جو چیز قائم کرنی ہے وہ صرف قرآن کریم نہیں بلکہ وہ سب کچھ ہے ‘جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔ اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط

(النساء ۴: ۱۱۳)

(ہم نے اے پیغمبر ! آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور وہ کچھ آپ کو سکھایا ہے ‘جو آپ نہیں جانتے تھے)

اس کی بہترین تشریح آنحضرت کا وہ ارشاد گرامی ہے ‘جسے ابوداوٗد ‘ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

الا انی اوتیت القرآن و مثله معه الا یوشك رجل شبعان علیٰ اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوا، وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کما حرم الله

(یاد رکھو! مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے۔ آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو صرف قرآن کافی ہے 'جو اس میں حلال ہے 'صرف اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے 'صرف اس کو حرام سمجھو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرام ٹھہرایا ہے 'وہ بھی ایسی ہی حرام ہے 'جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں)

حاصل کلام یہ کہ قرآن کریم کے ساتھ چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کو بھی قائم کرنا تھا 'اس لیے اگر صرف قرآن کا لفظ بولا جاتا تو اس سے یہ وضاحت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ کہا گیا 'تاکہ امت مسلمہ اپنے فریضہ منصبی کو اچھی طرح سمجھ لیں اور مزید یہ بات بھی شاید اشارۃً اس میں کہی جارہی ہے کہ اللہ کی کتاب یقیناً امت اسلامیہ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے کیونکہ وہ کلام اللہ ہے اور وہی مسلمانوں کے لیے آئین اور قانون ہے۔ لیکن کوئی کتاب بھی کسی امت اور افراد امت کی شخصیت کی تعمیر کے لیے کافی نہیں ہوتی ' جب تک کہ اس کے ساتھ پیغمبر کی شخصیت موجود نہ ہو۔ یہاں اس لیے بالواسطہ یہ سمجھایا جارہا ہے کہ تم سابقہ امتوں کی طرح انبیاء کی شخصیتوں سے کٹ کر زندگی گزارنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ زندگی کے سفر میں آوارہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری وابستگی قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی ویسی ہی گہری ہونی چاہیے 'ورنہ تمہاری شخصیتوں کی تعمیر نہیں ہو سکے گی۔

سید سلیمان ندوی مرحوم نے لکھا ہے کہ میں مصر سے واپسی پر جس بحری جہاز پر سفر کر رہا تھا 'اسی میں بنگال کے مشہور شاعر ڈاکٹر ٹیگور بھی سفر کر رہے تھے۔ ایک دن ہمارے دوستوں میں سے کسی نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب برہمو سماج ایک بڑا صلح کن قسم کا مذہب تھا۔ اس کے بنانے والوں کا یہ دعویٰ تھا کہ اس میں تمام مذاہب کی سچائیاں موجود ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ تمام مذاہب سے زیادہ کامیاب ٹھہرتا۔ مگر دیکھا یہ گیا کہ وہ تھوڑی عمر میں ہی ناکام ہو گیا اور آج اس کے ماننے والے نہایت محدود تعداد میں ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس فلسفی شاعر نے بڑی سچی بات کہی کہ مذاہب ہمیشہ شخصیتوں سے توانا ہوتے اور رواج پکڑتے ہیں۔ اس مذہب کے پیچھے چونکہ کوئی شخصیت نہیں تھی۔ اس لیے باوجود صداقتوں کا مجموعہ ہونے کے 'شخصیت سے خالی ہونے کی وجہ سے وہ ناکام ہو گیا۔ اس لیے یہاں پیغمبر کی شخصیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

کسی چیز کو قائم کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس آیت کریمہ میں "اَقَامُوا" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ اہل کتاب توراۃ وانجیل اور قرآن کریم کو قائم کریں۔ قائم کرنے سے کیا مراد ہے؟ عربی زبان میں اقامت کسی چیز کو اس طرح وجود میں لانے کو کہتے ہیں 'جس میں اس کے وجود کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ عدالت قائم ہو گئی تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ عدالت کی عمارت بن گئی 'ججز نے اپنے کام شروع کر دیئے 'مدعی اور مدعا الیہ اپنے معاملات لے کر عدالت کی طرف رجوع کرنے لگے 'وکلاء نے کیس پیش کرنے شروع کر دیئے 'دفتری عملے نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا 'انصاف کا عمل پوری طرح جاری ہو گیا۔ اس پورے پروسس کو عدالت کا قائم ہونا کہتے ہیں۔ اس طرح اللہ کی کتابوں کو قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ماننے والوں کی زندگی 'ان کتابوں کی تعلیمات سے متعلق ہو جائے۔ ان کا کوئی شخصی 'جماعتی ' انفرادی اور اجتماعی کام اور رویہ جو بھی شکل اختیار کرے 'اس میں راہنمائی اس کتاب سے لی جائے۔ ہر ادارہ اس کی راہنمائی میں اپنا کام کرے۔

تعلیمی اداروں کی بنیاد ، اسی کی مہیا کردہ علمی بنیادوں پر اٹھائی جائے۔ معاشرت کے اصول ،معیشت کے قوانین ، سیاست کے طور اطوار ، حکومت کا طریق کار ، ملک کا دستور و آئین ، ان سب کا سرچشمہ یہی اللہ کی کتاب ہو۔ اس پورے پروسس کو کتاب کا قائم کرنا کہیں گے اور یہی وہ حقیقت ہے ، جس کے بروئے کار لانے پر دینوی سہولتوں ،کامرانیوں اور سرفرازیوں اور اخروی نعمتوں کی نوید سنائی گئی ہے۔
اس آیت کریمہ میں آخر میں یہ فرمایا ہے: مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ "ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے "یعنی یہود پر اتمام حجت کے بعد آخر میں یہ خبر دی گئی ہے اور مسلمانوں کو شاید اس حقیقت سے آگاہ کیا جارہا ہے کہ آپ ان یہود سے کوئی بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کریں۔ ان میں ایک مختصر جماعت ہے ، جو پہلے سے راست روی پر قائم ہے ، وہی اب بھی ایمان لائیں گے۔ رہے باقی یہود تو ارشاد فرمایا کہ ان میں زیادہ ایسے لوگ ہیں ، جن کے عمل بہت برے ہیں۔ اس لیے ان سے قبول اسلام کی توقع عبث ہے۔ چنانچہ بعد میں حالات نے یہ ثابت کو دیا کہ قرآن کریم کی یہ خبر بالکل صحیح تھی۔ ان میں سے ایک مختصر گروہ نے اسلام قبول کیا ، باقی حسد و بغض کی آگ میں جلتے رہے۔ (روح)

ایمان و تقویٰ باعث سعادت دارین

سو ایمان اور تقویٰ کی برکات آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی نصیب ہوتی ہیں۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کی برکات سے آدمی آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی فیضیاب و سرفراز ہوتا ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر آسمان سے طرح طرح کی برکات نازل ہوتی ہیں اور زمین ان پر قسما قسم کے خزانے اگلتی ہے۔ اور انسانی معاشرہ ایمان و یقین کی قوت اور عمل و کردار کی دولت سے جس قدر زیادہ سرفراز ہوگا اسی قدر زیادہ آسمان و زمین کی ان عظیم الشان خیرات و برکات سے مستفید و فیضیاب ہوگا۔ وَبِاللّٰہِ التوفیق۔ سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں پر ایمان سے مراد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان ہے۔ سو اگر یہ لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور آپ کے لائے ہوئے قرآن پاک پر ایمان لے آتے تو یہ دنیا و آخرت کی سعادتوں اور خیرات و برکات سے فیضیاب و مالا مال ہوتے۔ ان کے گزشتہ گناہوں اور خطاؤں کو معاف کردیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کو جنت میں داخلہ نصیب ہوتا اور وہاں کی ابدی اور حقیقی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے۔ اور اس سے پہلے اس دنیا میں بھی ان کو آسمان و زمین کی خیرات و برکات سے فیضیابی اور بہرہ مندی نصیب ہوتی۔ مگر ان لوگوں نے اس کی بجائے کفر و انکار کو اختیار کرکے ابدی ہلاکت و تباہی اور محرومی کی راہ کو اپنایا۔ اور یہی نتیجہ ہوتا ہے عناد و ہٹ دھرمی اور اتباع ہویٰ کا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اللہ ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔ (مدنی)
اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آسمان سے ان کے قلب و روح کے لیے رحمتوں اور برکتوں کی غذا نازل کرتے اور ان کے جسم کے لیے زمین میں چھپے ہوئے رزق کے خزانوں کے منہ کھول دیتے۔ کیونکہ انسان کو جس طرح جسمانی خوراک کی ضرورت ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ روحانی غذا کی ضرورت ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی سے فقر و تنگ دستی نہیں بلکہ فراخی اور وسعت ہوتی ہے و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کی راہ بنادیتا ہے اور اسے ایسے ذرائع سے رزق دیتا ہے جن کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ (ضیاء)

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۶۷﴾

لغۃ القرآن: [يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ : اے رسول][بَلِّغْ : پہنچادیجیے][مَآ : جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][مِنْ : سے][رَّبِّكَ : آپ کے رب][وَاِنْ : اور اگر][لَّمْ : نہ][تَفْعَلْ : آپ کریں][فَمَا : تو نہیں][بَلَّغْتَ : آپ نے پہنچایا][رِسَالَتَهٗ : اس کا پیغام][وَاللّٰهُ : اور اللہ][يَعْصِمُكَ : وہ آپ کی حفاظت کرئے گا][مِنَ : سے][النَّاسِ : لوگ][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][لَا : نہیں][يَهْدِي : وہ ہدایت دیتا][الْقَوْمَ : قوم][الْكٰفِرِيْنَ : انکار کرنے والے]

ترجمہ: اے (برگزیدہ) رسول ! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (وہ سارا لوگوں کو) پہنچا دیجئے، اور اگر آپ نے (ایسا) نہ کیا تو آپ نے اس (ربّ) کا پیغام پہنچایا ہی نہیں، اور اللہ (مخالف) لوگوں سے آپ (کی جان) کی (خود) حفاظت فرمائے گا۔ بیشک اللہ کافروں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

تشریح: جس قوم کی اصلاح اور ہدایت کے لیے سیدنا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا گیا ان کی کوئی بات بھی تو درست نہ تھی۔ سیاسی طور پر وہ بد نظمی اور انتشار کا شکار تھے۔ معاشی طور پر ان کی بدحالی کی مثال نہ تھی۔ اخلاقی لحاظ سے ان کے ہاں گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔ شراب نوشی، جوا بازی اور بدکاری، سرداری اور دولت مندی کی علامات تھیں۔ ظلم و قتل کو شجاعت، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے کو تقاضائے حمیت و غیرت اور اسراف و فضول خرچی کو سخاوت کہا نہیں جاتا تھا بلکہ یقین کیا جاتا تھا۔ دینی لحاظ سے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ گھر جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا وہاں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ اور یہ ان کا دین تھا۔ ان کا عقیدہ تھا۔ انھیں اس پر کامل یقین بھی تھا اور اس سے والہانہ محبت بھی تھی۔ اب جو ہستی ایک ہمہ گیر انقلاب کی داعی بن کر آئی تھی اور جسے

زندگی کے ہر شعبہ میں ہر خرابی کی اصلاح کے لیے مقرر فرمایا گیا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ سیاسی انتشار کے جو محرکات تھے ان پر بھی ضرب کاری لگائے۔ وہ عناصر جن کی دھاندلیاں وہاں کی معاشی زندگی کو درہم برہم کر رہی تھیں ان کے منہ میں بھی لگام دے۔ وہ خبیث عادتیں اور وحشیانہ افعال جن پر اخلاق عالیہ کے دلکش غلاف چڑھے ہوئے تھے ان کو بھی بے نقاب کرے اور اخلاق فاضلہ کا صحیح مفہوم بھی ان کے ذہن نشین کرائے اور ان کی عقیدت کے صنم کدوں میں جتنے بت تھے پتھر کے، تانبے کے، پیتل کے، اپنی خواہشات کے، اپنے نفس کے، ذاتی اور قبائلی عصبیتوں کے ان سارے بتوں کو الا اللہ کی ضرب سے ریزہ ریزہ کرے۔ اس کار عظیم کے لیے قدرت کی نظر انتخاب پڑی تو اس پر جس کا کوئی بھائی نہیں، جس کے سر پر باپ اور دادا کا سایہ نہیں۔ دولت نہیں۔ خدام نہیں۔ اس کے پاس صرف اللہ کا نام ہے۔ یہی اس کی ساری قوتوں کا سرچشمہ ہے اور یہی اس کی ساری توانائیوں کا منبع ہے۔ اس نازک اور مشکل ترین خدمت کے لیے اسے متعین فرما کر اس کا رب اسے فرماتا ہے کہ آپ رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور رسول کا کام یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کا پیغام بے خوف وخطر کسی ردوبدل کے بغیر پہنچادے۔ اس لیے اپنے منصب رسالت کا پاس رکھتے ہوئے اپنے رب کریم کا جو حکم آپ کو ملے اس کو اس کی مخلوق تک پہنچادو۔ اور اگر کسی حکم کے پہنچانے میں پس وپیش کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اپنا فرض منصبی پورا کرنے میں غفلت برتی ہے اور اس کا ذرا حق ادا نہیں کیا۔ باقی رہی دشمنوں کی قوت، کفار کے حملے، منافقین کی سازشیں، اور یہود وغیرہ کی ریشہ دوانیاں تو سن لو اللہ تعالیٰ خود آپ کا نگہبان ہے۔ کوئی آپ کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ اس صریح اور پر جلال حکم کے بعد کوئی یہ باور کر سکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو کسی کی پاسداری کے لیے یا کسی کے خوف سے چھپایا ہو۔ مولانا عثمانی کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"نوع انسانی کے عوام وخواص میں سے جو بات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلا کم وکاست اور بے خوف وخطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کردی"۔ (ضیاء)

اس آیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو اس کی مخلوق تک پہنچادیں اور اگر بفرض محال کسی ایک حکم کی بھی تبلیغ رہ گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا نہیں کیا۔ جس طرح نماز کا کوئی ایک رکن چھوڑنے سے پوری نماز باطل ہو جاتی ہے اور قرآن مجید کی کسی ایک آیت کے انکار سے پورے قرآن مجید پر ایمان ختم ہو جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی نبی اللہ تعالیٰ کے کسی ایک حکم کی تبلیغ میں کمی کردے تو اس کی ساری تبلیغ کالعدم قرار پائے گی۔

خطاب کا یہ اسلوب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی اہمیت بتانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے، ورنہ کسی نبی کے بارے میں یہ تصور کرنا ہی گناہ ہے کہ وہ احکام خداوندی کی تبلیغ میں کسی ادنیٰ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، چہ جائیکہ امام الرسل اور مبلغ اعظم نبی آخر الزمان کے بارے میں یہ سوچا جائے۔ آپ نے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کیا ہے اور حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام (رض) کی موجودگی میں جب اللہ تعالیٰ نے تکمیل اسلام کا اعلان فرمایا تو اسی موقع پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تکمیل تبلیغ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: (اے میرے صحابہ!) تم میرے بارے میں کیا کہوگے؟ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: ہم گواہی دیں گے کہ بیشک آپ نے تبلیغ اور نصیحت کا حق ادا کردیا۔ اس پر آپ نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ عرض کیا: اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا (میں نے تیرا پیغام پہنچادیا)۔ (مسلم: 2950: کتاب الحج: باب 19)

نوٹ: اس آیت میں اہل علم کے لیے بھی درس عبرت ہے کہ وہ شریعت کے احکام کو پوری دیانتداری کے ساتھ بیان کریں اور لالچ یا خوف میں آکر کسی شرعی حکم میں خیانت نہ کریں۔ (امداد)

رسول کا اصل کام

بجائے اس کے کہ پروردگار رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لے کر یا آپ ﷺ کے کسی لقب کے ذریعے مثلاً طٰہٰ یا یٰسین کہہ کر آپ کو خطاب کرتا آپ کو رسول کہہ کر خطاب کرنا بہت معنویت کا حامل ہے۔ یعنی آپ کی حیثیت نہ تو ایک ناصح کی ہے کہ آپ مخاطب کے مزاج کو دیکھ کر اور اس کے معمولات کا اندازہ کرکے حق نصیحت استعمال کریں اور اگر آپ دیکھیں کہ مخاطب کا مزاج اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ حق نصیحت ہی سے ہاتھ اٹھالیں اور نہ آپ کی حیثیت صرف ایک مصلح کی ہے کہ مصلح بھی اپنے اصلاحی عمل کا تخم بنجر زمین میں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ فرمایا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے پیغام کو بندوں تک بلا کم وکاست پہنچاتا ہے 'اس کے سامنے چاہے مخالفت کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے ہوں اور چاہے نامساعد حالات کی وجہ سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی ہو اسے پھر بھی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کا رسول اور پیغامبر ہے اور پیغامبر کا کام پیغامبری کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ رہی یہ بات کہ وہ دشمنی میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کی طرف سے پیغام کی قبولیت کا کوئی ادنی سا امکان بھی دکھائی نہیں دیتا 'یہ بات اپنی جگہ چاہے کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو 'لیکن بحیثیت رسول اسے مخاطب کی حالت کو نہیں دیکھنا بلکہ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ رہی اس کی قبولیت کی طرف سے مایوسی 'تو اس سے ہزار دفعہ روکا گیا ہے کیونکہ یہ بات سراسر اللہ کے علم میں ہے کہ کس کا دل کس وقت قبولیت کے لیے کھل سکتا ہے اور مزید یہ بات بھی کہ بعض دفعہ قوموں کے سامنے پیغام خداوندی اس لیے نہیں بھیجا جاتا کہ وہ اسے ضرور قبول کریں بلکہ اس لیے بھی بھیجا جاتا ہے تاکہ ان پر اتمام حجت ہو جائے اور قیامت کے دن وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو کسی پیغامبر نے پیغام نہیں پہنچایا ورنہ ہم ضرور قبول کرلیتے اور رہی یہ بات کہ ان کی دشمنی کے باعث اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ پہلے ہی اپنی دشمنی میں جلے بھنے بیٹھے ہیں 'اب یہ پیغام جو اس آیت کریمہ کے بعد شروع ہو رہا ہے 'جس میں ان کی اصل حیثیت کو واضح کیا جارہا ہے 'جب ان تک پہنچے گا تو وہ یقیناً دشمنی میں آخری اقدام کرنے اور آخری داؤ کھیلنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ اس سے حالات کے بگاڑ میں یقیناً اضافہ ہوگا اور دعوت و تبلیغ کی راہ مسدود ہو کر رہ جائے گی اور ہوسکتا ہے اس طرح وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات والا صفات کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ (روح اسلم)

اے رسول ثقلین کہ تم تمام مخلوق کے لیے مبعوث ہوئے ہو۔ یہ ندا تشریفی ہے اس لیے کہ رسالت اللہ کا خاص احسان اور عطائے عظمیٰ اور کرامت کبریٰ ہے اور اس منصب پر بدغ بصیغہ امر ایذان ہے من جانب اللہ جو نبی پر واجب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یدغ معنی او صل الخلق ما انزل الیک ہیں ای جمیعا ما انزل کائنا ماکان من ربک یعنی پہنچا دو خلائق کو جو کچھ آپ پر اترا ہونے والے امور اور ہو چکنے والے معاملات یعنی بذریعہ وحی جو کچھ آپ کو بتایا وہ گزشتہ امور سے ہو یا آئندہ سے بے خوف وخطر پہنچا دیجیے۔

صاحب تفسیر صادی (رح) نے فرمایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وحی تین قسم کی ہے ایک وہ جس کی عام تبلیغ کا حکم دیا گیا جسے شرعی احکام قرآن کریم کی روشنی میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرف بحرف تبلیغ فرمادی اور آخر وقت تک فرمائی۔ دوسرے اسرار الٰہیہ جو عام لوگوں کے قابل نہیں وہ صرف اہل ہی کے لیے ہیں۔

وان لم تفعل اور اگر ایسا نہ کیا یعنی جو حکم آپ کو جمیع خلائق کا دیا ہے اس میں کوتاہی کی تو فما بلغت رسالتہ کے حاصل معنی یہ ہوں گے کہ تم نبی بلکہ نبی الانبیاء ہو تمہاری ذات سے یہ ممکن ہی نہیں کہ تم اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کسی طرح کوتاہی کرو اور یہ امر عام طور پر واضح ہے کہ

بنانے والا جس چیز کو ایسا بنائے جس پر اسے ناز ہو تو یہ کہا کرتا ہے کہ اگر یہ ایسا نہ کرے تو یہ ایسی ہر گز نہیں یعنی مجھے اس پر یقین ہے کہ یہ لازمی طور پر کام کرے گی۔

تو ذات والا تبار سید الانبیاء (علیہم السلام) وہ ذات ہے جس پر اللہ تعالیٰ عزوجل خود فرمارہا۔ قد جآء کم من اللہ نور۔ قد جآء کم برھان من ربکم ان کی بعثت پر ایمان ولوں پر احسان کر رہا ہے لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً۔ لقد جآء کم رسول من انفسکم اور کس کس شان سے ذات اقدس کے اوصاف بیان فرمائے تو گویا یوں ارشاد ہوا کہ ماانزل الیک من ربک کی تکمیل آپ کے دست حق پرست کے ذریعہ سے کامل واکمل اور مکمل ہو گی اور اگر بفرض محال آپ بھی ایسا نہ کریں تو گویا احکام کی تبلیغ کی ہی نہیں گئی۔

چنانچہ ابوالشیخ ابن حبان (رح) اپنی تفسیر میں حسن (رح) سے راوی ہیں۔

ان النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال بعثنی اللہ تعالیٰ بالرسالۃ فضقت بھا ذرعا فاوحی اللہ تعالیٰ ان لم تبلغ رسالتی عذبتك وضمن لی العصضمۃ فقویت۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے رسالت کے مصنب پر مبعوث فرمایا تو عامہ مشرکین ومنافقین ویہود نصاریٰ کی مخالفت سے میرے باز وتنگ ہوئے تو جناب باری کی طرف سے مجھے وحی ہوئی کہ عدم تبلیغ رسالت پر آپ تنگ ہو سکتے تھے اور تبلیغ رسالت میں تو کسی قسم کا خطرہ ہی نہیں۔ ہم آپ کی محافظت کے ضامن ہیں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں میں قویٰ ہو گیا اور ایسا ہوا کہ مجھے کسی کا خطرہ ہی نہ رہا۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ آیا کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وہ مجھ پر سخت باری گزری۔ اور حجتہ الوداع سے قبل اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ چنانچہ اب مردویہ ضیاء بنی مختار میں ابن عباس (رض) سے راوی ہیں۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا کہ آسمان سے وہ کون سی آیت ہے جو آپ پر سخت تھی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں منیٰ میں ایام موسم حج میں تھا اور مشرکین اور گروہ کفار کے بہت سے لوگ موسم حج کے لیے جمع تھے کہ جبرائیل نازل ہوئے اور انھوں نے یہ آیت کریمہ سنائی۔ فرمایا مجھے تعمیل حکم میں تاخیر کرنا مناسب نہیں تھا میں عقبہ کے پاس کھڑا ہوا اور باآواز میں پکارا اے لوگو کون میری مدد کرے گا اس پر کہ میں اپنے رب کے پیام پہنچاؤں اور اگر تم میرا ساتھ دو تو تمہارے لیے جنت ہے۔ اے لوگو سب یک زبان ہو کر کہو لاالہ الا اللہ وانا رسول اللہ الکلیم۔ کوئی معبود نہیں مگر اللہ اور میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف تو کامیاب ہو جاؤ گے اور نجات پاؤ گے اور تمہارے لیے جنت ہو گی۔

تو مرد عورت۔ لونڈی بچہ کوئی نہ تھا جو مجھ پر مٹی پتھر نہ پھینک رہا ہو اور ہر ایک کہہ رہا تھا جھوٹی صابی ہے۔

کہ کوئی عارض ہوا اور کہنے لگا اے محمد اگر آپ کوئی اور رسول ہوتے تو یقیناً وہی شان آپ کی ہوتی جو نوح (علیہ السلام) کی تھی کہ انھوں نے اپنی قوم کی ہلاکت کے لیے دعا کی۔

فقال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔

الٰہی میری قوم کو ہدایت فرما کہ وہ مجھے پہچانتے اور میری مدد فرما اس پر کہ وہ تیری اطاعت کے لیے میری دعوت قبول کریں۔

فجاء العباس عمہ فانقذہ منھم وطردھم عنہ۔ تو حضرت عباس حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا آئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان سے بچایا اور انھیں دور کیا۔

اعمش (رض) کہتے ہیں اسی وجہ سے بنو عباس فخر کرتے اور کہتے تھے کہ ان میں ہی یہ آیت نازل ہوئی۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاہتے تھے ابو طالب کو اور اللہ نے چاہا عباس بن عبد المطلب کو اسلام کے لئے۔
اس کی تصریح ابو نعیم نے دلائل میں کی اور ابن مردویہ نے اور ابن عسا کرنے ابن عباس (رض) سے روایت کی۔ فرماتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پاسبانی ہوتی تھی اور ابو طالب آدمیوں کو بنی ہاشم سے چوکیداری کے لیے بھیجا کرتے تھے حتیٰ کہ آیہ کریمہ واللہ یعصمك من الناس نازل ہوئی تو حضرت ابو طالب نے چوکیداری کو آدمی بھیجنے چاہے۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چچا اللہ نے اب میری حفاظت کر لی ہے۔ اور ابو طالب قبل ہجرت اور حجتہ الوداع سے مدتوں پہلے انتقال کر چکے تھے۔
ایک روایت میں یوں ہے کہ جو ترمذی بیہقی نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کی فرماتی ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پاسبانی میں تھے کہ **واللہ یعصمك من الناس** نازل ہوئی تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سر مبارک قبہ سے نکالا اور فرمایا ایھا الناس انصر فوا فقد عصمی اللہ تعالیٰ اے لوگو چلے جاؤ بیشک اللہ نے مجھے اپنی صیانت و حفاظت میں لے لیا ہے۔ (روح المعانی)
اب علامہ آلوسی رحمتہ اللہ روح المعانی میں دفع دخل مقدر فرماتے ہیں کہ عصمت سے مراد لوگوں سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محافظت تھی قتل واہلاك سے۔ اور واللہ یعصمك کے بعد یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اس کے بعد احد میں سر اقدس زخمی ہوا اور باعیات مبارک ٹوٹے۔ اور بعض نے کہا کہ احد کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔
راغب اصفہانی (رح) کہتے ہیں۔

عصمت انبیاء

عصمت انبیاء سے مراد یہ ہے ان کی ان معاملات میں حفاظت ہو گی جو ان کے لیے مخصوص ہے۔ صفاء جوہر روحانیہ، حسن اخلاق، فضائل ذات پھر نصرت دشمنوں کے مقابلہ میں اور ثابت قدمی پھر انزال سکینہ اور دلوں کی محافظت، توفیق تبلیغ عامہ (روح المعانی) یہ تو تھی مفسرین کی تصریح اور اب صوفیائے کرام رحمہم اللہ کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔
اس آیت کریمہ میں بدغ سے مراد وہ تبلیغ ہے جو مصالح عباد سے متعلق ہے احکام میں اور اس حکم کے نازل کرنے سے مقصود اطلاع ہے۔
اور وہ جو مخصوص علوم غیبیہ کے ساتھ ہے وہ امت کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ وہ حضور کے لیے ہے اور اس کے کتمان کا ذمہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہے۔ مسلم (رح) جعفر (رض) سے راوی ہیں کہ آیہ کریمہ فاوحی الی عبدہ مآاوحی کے متعلق فرمایا وحی بلاواسطہ بینہ وبینہ سرا الی قلبہ ولایعلم بہ احد سواہ الا فی العقبی حین یعطیہ الشفاعۃ لامنہ۔ بغیر یہ وحی بلا واسطہ اللہ تعالیٰ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مابین مخفی تھی جو قلب اقدس پر ہوئی اور اسے سوا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور کوئی نہیں جانتا مگر آخرت میں جب مناصب شفاعت عطا کئے جائیں گے امت کی ممتاز ہستیوں کو اس وقت کچھ منکشف ہو گا۔ واسطی (رح) فرماتے ہیں القی الی عبدہ ماالقی ولم یظھر بالذی اوحی لانہ خصہ سبحانہ وتعالیٰ بہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وماکان مخصوصاً بہ (علیہ الصلوۃ والسلام) کان مستوراً وما بعثہ اللہ تعالیٰ بہ الی الخلق کان ظاھراً۔
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ خاص پر القاء فرمایا جو القاء فرمایا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ وحی کیا تھی اس لیے کہ اس میں مخصوص راز تھے اللہ تعالیٰ اور سید الانبیاء کے مابین تو جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص تھے وہ مستور رہے اور جو مخلوق کے لیے تھے وہ ظاہر کئے گئے۔
علامہ طیبّی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں۔ (ترجمہ)

حضرت ابوہریرہ (رض) فرمایت ہیں میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو برتن محفوظ کئےایک تو وہ جو میں نے سب میں بکھیر دیئے اور دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اسے کہوں تو میرا یہ بلعوم کٹ جائے۔ بلعوم فرما کر گردن مراد لی۔

اس بناء پر امام بخاری نے تفسیر کی اور اس علم کا نام علم اسرار الٰہیہ رکھا اور جو عوام میں بیان کردیا گیا اسے علم حقیقت کہا۔ آخر میں فرماتے ہیں میری تحقیق یہ ہے۔

ترجمہ :۔ جو کچھ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اسرار الٰہیہ وغیرہ احکام شرعیہ سے عطا ہوئے وہ سب قرآن کریم میں ہے جیسا کہ آیت کریمہ سے واضح ہے ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شیء اور ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے اور مافرطنا فی الکتب من شیئ۔ 10ع۔ پ ۷ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھانہ رکھا اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جسے ترمذی وغیرہ نے روایت کیا۔ عنقریب فتنے ہوں گے۔ صحابہ علیہم رضوان نے عرض کیا ان سے نکلنے کا کیا ذریعہ ہے فرمایا قرآن کریم جس میں تم سے پہلے کی خبریں اور تمہارے بعد کی خبریں ہیں اور اس کے احکام جس میں تم ہوگے۔ ابن جریر ابن حاتم ابن مسعود رحمہم اللہ سے راوی ہیں۔ فرمایا اس قرآن کریم میں تمام علوم نازل ہوئے اور ہمیں ہر شے کی حقیقت منکشف کردی۔ لیکن ہمارے علم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جو قرآن کریم میں ہے۔ امام شافعی (رض) نے فرمایا تمام وہ احکام جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آئے وہ تمام قرآن سے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی تائید میں وہ روایت ہے جو طبرانی (رح) نے اوسط میں نقل کی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے کوئی شے حلال نہیں کی مگر وہی جو اللہ نے حلال کی قرآن کریم میں اور نہ کوئی شے حرام کی مگر وہی جو کتاب اللہ میں حرام ہے۔ مرسی (رح) کہتے ہیں قرآن کریم میں علوم اولین وآخرین ایسی شان سے جمع ہیں کہ کوئی علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ مگر قرآن میں بولنے والا پھر اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوا اس کے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے راز کے طور پر اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ پھر ان کے وارث معظمین وسادات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوئے پھر ان کے اہل علم مثل خلفاء اربعہ یا ابن مسعود ابن عباس (رض) یہاں تک کہ کہہ دیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہوجائے تو میں قرآن میں اس کا پتہ پاتا ہوں۔ پھر اس علم کے وارث تابعین ہوئے رضوان علیہم اجمعین پھر ہمتیں قاصر ہونے لگیں اور عزائم پست۔ اور اہل علم بھکنے لگے اور جو تحمل صحابہ علیہم رضوان میں تھا اس تحلم سے ضعیف لوگ پیدا ہوئے اور تابعین کی جیسی ہمتیں بھی نہ رہیں تو اپنے فہم نارسا کے مطابق نئے نئے انواح کے فنون ایجاد کرنے لگے اور ہر فن میں ایک جماعت بن گئی۔ مولف۔ امام شافعی (رض) کا ایک شعر بھی حسب موقع مجھے یاد آیا ہے۔

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

(ترجمہ) قرآن مجید میں تمام علوم موجود ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ ان سے قاصر ہے۔ ابوحجیفہ (رض) سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عرض کیا کہ آپ کے پاس کیا کوئی ایسی کتاب ہے جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آپ کے لیے مخصوص کی ہو فرمایا نہیں مگر کتاب اللہ جو مسلمان کے لیے کافی وافی ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے وہ تلوار کے میان میں ہے۔ ابوحجیفہ (رض) نے کہا وہ کیا ہے اس صحیفہ میں تو آپ نے فرمایا۔ دیت۔ اور قیدیوں کا آزاد کرنا اور ولایقتل مومن بکافر۔ اور کافر کے بدلے مسلمان قتل نہ کیا جائے۔ (روح المعانی)

(جیسا کہ امام شافعی (رض) کا مسلک ہے) من المولف دوسری روایت میں ابوحجیفہ سے ہے جسے ابن ابی حاتم عنترہ سے روای ہیں فرمایت ہیں میں حضرت ابن عباس کے پاس تھا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ لوگ میرے پاس یہ خبر لائے ہیں کہ آپ کے پاس کچھ ایسے راز

ہیں جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں پر ظاہر نہیں فرمائے۔ تو حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یاایھا الرسول بدغ ما انزل الیك من ربك۔

خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے جو کچھ سیاہ سپید کا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وارث کیا اسے ابوہریرہ کے برتن نے اٹھالیا اور علم اسرار کو انھوں نے عام نہیں پھیلایا۔ منجملہ ان کے فتنوں کی خبریں۔ شرائط قیامت اور جو کچھ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نوجوان بیوقوف قریش کے ہاتھوں زمین میں فساد ہونے کی خبریں دی تھیں۔ چنانچہ ابوہریرہ (رض) یہاں تک فرماتے تھے کہ اگر تو چاہے تو میں ان کے نام بیان کروں تو میں بیان کرسکتا ہوں۔ اور اس سے وہ حدیثیں مراد تھیں جن میں لہرائے جور اور ان کے احوال موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) کنایۃ بعض امور بیان کرتے تھے مگر صراحتۃ بیان نہیں کرتے تھے چنانچہ منجملہ اس کے آپ کا فرمانا ہے اعوذ باللہ سبحانہ من راس الستین وامارۃ الیبان میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں ساٹھویں سال کی ابتداء اور لڑکوں کی حکومت سے اس میں آپ کا اشارہ تھا حکومت یزید کی طرف چنانچہ اصل عبارت یہ ہے۔

اس لیے کہ 60 ساٹھ ہجری میں ہی یزید کی نحوست شروع ہوئی اور حضرت ابوہریرہ (رض) کی وعااللہ نے قبول کی چنانچہ آپ ایک سال قبل ہی وفات پا گئے۔ اور امام زین العابدین (رض) نے فرمایا اچھی قوم ہے جو متمسک ہے قرآن سے سوا اور چیزوں کے اس کی جگہ لیکن قرآن کریم کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہیں اور وہ احکام جو صادر ہوں شریعت کے خلاف واجب العمل نہیں۔ عبدالوہاب شعرانی (رح) اجوبتہ المرضیہ عن الفقھاء و الصوفیہ میں فرماتے ہیں۔

میں نے سید علی وصفی سے سنا کہ فرماتے تھے لایکمل الرجل فی مقام المعرفۃ والعلم حتی یری الحقیقۃ مویدۃ للشریعۃ کوئی آدمی معرفت اور علم میں مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس حقیقت کو نہ دیکھ لے جو موید شریعت ہو۔

اور یقیناً تصوف کوئی سے زائد نہیں سنت محمدیہ سے بلکہ سنت محمدیہ ہی اس کی اصل ہے۔

اور سیدی علی الخواص کو بارہا کہتے سنا کہ جو گمان کرے کہ حقیقت مخالف شریعت ہے یا شریعت مخالف حقیقت وہ جاہل ہے اس لیے کہ محققین کے نزدیک کوئی شریعت کبھی مخالف حقیقت نہیں یہاں تک کہ آپ نے فرمایا۔ شریعت بلا حقیقت معطل ہے اور حقیقت بلا شریعت باطل ہے۔ (روح المعانی)

تو یاایھا الرسول بدغ ما انزل الیك من ربك۔ کا مفہوم واضح ولائح روشن و مبرہن ہو گیا کہ اس میں ماموصولہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے اور اس میں تبلیغ ماانزل کا ہی حکم ہوا تھا نہ کہ مخصوص کسی معاملہ کا اور اگر یا عہدہ کا ہو اور اگر مزید توضیح کا مطالعہ کرنا ہو تو مطلولات میں سیر کرے۔ اب حسب موقعہ بزعم حضرات شیعہ جو آیت کریمہ کی تصریح ہے وہ بھی منقول ہے تاکہ معلومات میں وسعت ہو۔ علامہ آلوسی (رح) روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) حضرات شیعہ کا گمان ہے کہ مراد آیہ کریمہ یاایھا الرسول بدغ ما انزل الیك من ربك سے خلافت علی کرم اللہ وجہہ ہے اور اس پر متعدد سندوں سے روایتیں بھی لائے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابی جعفر اور ابو عبداللہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف وحی کی کہ خلافت علی کا اعلان کردیں۔ مگر (معاذ اللہ) یہ اعلان کرنا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر شاق تھا کہ کہیں جماعت صحابہ ناراض نہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہمت بڑھانے کے لیے نازل فرمائی اور شجاعت و قوت سے اعلان فرمانے کا حکم دیا۔ اس پر حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی۔

(ترجمہ) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ آیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں نازل ہوئی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ لوگوں کو مطلع کردیں ولایت علی سے تو (معاذاللہ) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس امر کا خوف ہوا کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے چچازاد بھائی کی محبت میں یہ اعلان کیا اور لوگ طعنہ دیں گے اس اعلان سے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی یہ آیت کریمہ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ولایت علی کے اعلان کے لیے غدیر خم والے دن اٹھے اور حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا جس کو میں محبوب ہوں تو علی بھی اس کا محبوب ہے۔ اے اللہ جو علی سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو علی سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اور جلال الدین سیوطی (رح) نے درمنثور میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ اور ابن عساکر سے روایت کی کہ جو حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا یہ آیت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یوم غدیر خم میں حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی۔ اور ابن مردویہ ابن مسعود (رض) سے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں ہم عہد رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں یہ آیت کریمہ یوں پڑھا کرتے تھے۔ یایھاالرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا ولی المومنین وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ اور خم غدیر والی حدیث خلافت امیر کرم اللہ وجہہ کے لیے بہترین دلیل ہے۔ اس کے بعد علامہ آلوسی صاحب (رح) روح المعانی فرمایت ہیں اور مسلک اہل سنت واضح کرتے ہیں۔

اور بیشک اس میں حضرت اشیعہ نے زیادتی کرڈلای اپنی غرض پوری کرنے کے لیے اور زیادتی بھی ایسی جو قابل رد وانکار ہے۔ اور اصل مضمون میں بہت سے کلمات دھوکا دینے کو رکھ دیئے اور نظمیں بھی لکھ ڈالیں اور صحابہ کرام پر شدید طعن کئے اور اپنے خیال میں انھوں نے دکھایا کہ معاذاللہ صحابہ کرام نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی مخالفت کی۔ اس کے بعد اسماعیل بن محمد حمیری (رح) کی ایک نظم نقل کرکے لکھتے ہیں۔

اور تو جانتا ہے کہ وہ اخبار غدیر جس میں خلافت علی کرم اللہ وجہہ کا حکم ہے صحیح نہیں ہے اہلسنت کے نزدیک اور نہ وہ ان کے مسلمات سے ہے۔ اور واضح کرتے ہیں ہم ان امور کو جو یہاں ڈالے گئے علم اتم وجہ البیان اور روشن کرتے ہیں ہم اس کے کھوٹے اور کھرے کو اور پھر شیعہ کے استدلال کی تردید کی طرف متوجہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہیں اور اس پر بھروسہ ہے تو اب ہم کہتے ہیں۔

(ترجمہ) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مکان میں خطبہ دیا جو مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے مابین واقع ہے جبکہ حجتہ الوداع ہے واپس تشریف لائے یہ مقام جحفہ سے قریب ہے اور اسے غدیر خم کہتے ہیں اس خطبہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وضاحت فرمائی فضائل علی کرم اللہ وجہہ کی اور ان باتوں سے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی برأت فرمائی جو آپ کے خلاف کلام کرتے تھے یمن والے اس وجہ سے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے متعلق ایک فیصلہ پر اہل یمن گمان کرتے تھے اور بعض ان میں آپ کی نسبت جور اور تنگ نظری اور بخل کا اتہام باندھتے تھے اور درحقیقت حقیقت حق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف ہی تھا اور یہ واقعہ یوم احد یعنی یک شنبہ 18 ذی الحجتہ کو غدیر خم میں ایک درخت کے نیچے ہوا۔

(ترجمہ) محمد بن اسحاق یحیٰی بن عبداللہ کے واسطہ سے یزید بن طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت علی یمن سے اپنے ساتھیوں سمیت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ملاقات کے لیے مکہ آئے تو آپ جلدی سے پہلے چلے آئے اور اپنے ساتھیوں پر ایک آدمی کو امیر مقرر کیا اس آدمی نے زیادتی کی اور حضرت علی کے ساتھ جزیہ میں جو ریشمی کپڑے آرہے تھے ان میں سے سب کو ایک ایک ریشمی جوڑا پہنا دیا۔

جب یہ لشکر قریب آیا تو حضرت علی ان کی ملاقات کو نکلے تو آپ نے ان پر ریشمی لباس دیکھے تو فرمایا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا میں نے ان کو یہ لباس پہنایا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اچھے لباس میں جائیں تو آپ نے فرمایا تیرا ستیاناس ہو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ملاقات سے پہلے پہلے انھیں فوراً اُتار دو۔ تو آپ نے لوگوں سے کپڑے اتروا کر کپڑوں میں رکھ دیئے۔ لشکر نے حضرت علی کے اس سلوک کا شکوہ کیا۔ اور زینب بنت کعب اپنے شوہر ابو سعید خدری سے روایت کرتی ہیں کہ لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکایت کی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو خطبہ دیا۔ میں نے سنا آپ فرمارہے تھے لوگو علی کی شکایتیں نہ کرو خدا کی قسم وہ اللہ کی ذات اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے میں بڑے ہی سخت ہیں۔

اس کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے اور ابن عباس (رض)۔بریدہ اسلمی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کے ساتھ ہو کر یمن میں جنگ کی۔ میں نے آپ میں سختی دیکھی۔ جب میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا تو میں نے حضرت علی کا تذکرہ کیا تو میں نے دیکھا آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کیا میں مومنوں کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب نہیں ہوں؟ میں نے کہا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔ تو آپ نے فرمایا جس کا میں محبوب ہوں اس کا علی بھی محبوب ہے۔ اس کو نسائی نے بھی ثقہ راویوں سے اسی طرح روایت کیا ہے اور یہ ایک اور سند سے بھی مروی ہے جو صرف نسائی میں ہے۔

ذہبی نے کہا زید بن ارقم نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجتہ الوداع سے واپس آئے اور غدیر خم میں قیام فرمایا تو آپ نے خطبہ دیا کہتے ہیں مجھے اب تک وہ لفظ یاد ہیں آپ نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی آل اہل بیت تم دیکھو کہ کیسے ان کا حق ادا کرتے ہو یہ دونوں چیزیں الگ الگ نہیں ہوں گی یہاں تک کہ حوض کوثر پر پہنچیں۔ اللہ میرا مالک ہے اور میں ہر مومن کا دوست ہوں۔ پھر آپ نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا جس کا میں محبوب ہوں یہ بھی اس کے محبوب ہیں اے اللہ جو علی سے محبت رکھے اس سے تو محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔

اور ابن جریر نے علی بن زید اور ابو ہارون عبیدی اور موسیٰ بن عثمان کے ذریعہ براء سے روایت کیا کہ ہم حجتہ الوداع میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے جب ہم غدیر خم میں آئے تو آپ نے درخت کے نیچے ڈیرا لگایا اور آواز دے کر لوگوں کو اکٹھا کیا گیا اور آپ نے علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا اور اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور فرمایا کیا میں مومنوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب نہیں ہوں لوگوں نے کہا ہاں تو فرمایا جس کا میں محبوب ہوں اس کا یہ بھی محبوب ہے اے اللہ جو اس سے محبت رکھے اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے اس سے دشمنی رکھ تو ان کو عمر بن خطاب ملے اور کہا اے علی آپ کو مبارک ہو آپ تو ہر مومن مرد اور عورت کے محبوب بن گئے۔ اور یہ حدیث ضعیف ہے محدثین نے تصریح کی ہے کہ علی بن زید اور ابو ہارون اور موسیٰ بن عثمان یہ سب ضعیف ہیں اور ان کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور ان کی سند میں ابو اسحاق بھی ہے اور وہ شیعہ مردود الروایت ہے۔

اور حمزہ نے اپنی سند سے ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا کہ جس کا میں محبوب ہوں اس کا علی بھی محبوب ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری "میں نے آج تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔" پھر ابوہریرہ نے کہا اور وہ غدیر خم کا دن تھا۔ اور جو آدمی اٹھارہ ذی الحجتہ کا روزہ رکھے اس کے لیے ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب ہے اور یہ حدیث انتہائی کمزور ہے اور بدایہ والنہایہ میں تصریح ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

ابو جعفر بن جریر طبری نے حدیث غدیر پر توجہ کی اور دو جلدیں لکھ دیں ان میں اس حدیث کے تمام طرق اور الفاظ جمع کئے ہیں اور صحیح، ضعیف، غلط، درست جو کچھ بھی ملا سب درج کر دیا جیسا کہ عام محدثین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ صحیح اور ضعیف کی تمیز کے بغیر جو کچھ متعلقہ مضمون کے لیے ملے وہ سب کچھ درج کر دیتے ہیں۔ اور اسی طرح حافظ کبیر ابوالقاسم ابن عساکر نے اس خطبہ کے متعلق بہت سی احادیث جمع کی ہیں اور ان میں صحیح وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ان میں خلافت کے متعلق کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں اور ذہبی کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ ٹکڑا کہ "جس کا میں محبوب ہوں علی بھی اس کا محبوب ہے"۔ یہ متواتر رہے یقین ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ضرور ایسا کہا ہوگا اور یہ فقرہ کہ "جو اس سے محبت رکھے اس سے محبت رکھ 'ذ یہ راوی کی زیادہ نہ ہے لیکن سنداً قوی ہے اور باقی رہا یہ فقرہ کہ "جو اٹھارہ ذی الحجہ کا روزہ رکھے اسے ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب ہے۔" یہ صحیح نہیں ہے۔ اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ یہ آیت غدیر خم سے کچھ دن پہلے یوم عرفہ میں اتری۔

اور بخاری مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں غدیر کی حدیث کو بیان نہیں کیا کیونکہ یہ حدیث ان کی شرطوں کے مطابق نہیں ہے۔ اور شیعہ کہتے ہیں کہ انھوں نے تعصب کی بناء پر اس حدیث کو درج نہیں کیا اور وہ اس سے پاک ہیں اور شیعہ حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علی بھی مولی ہے "اور مولیٰ کا اولیٰ بالتصرف (تصرف کا زیاد حق دار) معنی ہے اور تصرف کا زیادہ حقدار ہونا یہی تو امامت ہے۔ اور یہ چیز مخفی نہیں کہ ان کی پہلی غلطی ان کا یہی استدلال ہے کہ انھوں نے مولیٰ کا ترجمہ اولیٰ کیا ہے اور تمام اہل لغت اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور مفع لکا صیغہ کبھی بھی افعل کے معنی میں نہیں آیا اور سوائے ابوزید لغوی کے کسی نے اس کو جائز نہیں سمجھا اور آیت کریمھی مولاکم کی تفسیر میں ابو عبیدہ کے قول سے استدلال کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کا معنی کیا ہے اولی بکم یعنی زیادہ حقدار ہے۔ اور اس کی تردید اس کی طرح کی جاتی ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ یہ مقولہ صحیح ہو فلان مولی من فلان جیسے کہ یہ صحیح ہے کہ فلان اولی من فلان اور اجماعاً باطل ہے۔ اب اگر لازم باطل ہے تو یقیناً ملزوم بھی باطل ہے۔ اور پھر یہ بھی کوئی نص تو نہیں کہ حدیث میں مولی کا ضرور ہی اولی کے معنی میں ہے۔ اور دوسری یہ بات ہے کہ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ مولیٰ بمعنی اولی ہے تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اس کا صلہ تصرف ہی ہو۔ بلکہ احتمال ہے کہ مراد اولی بالمحبت یا اولی بالتعظیم (محبت کا زیادہ حقدار یا تعظیم کا زیادہ حقدار) ہو یا کوئی اور چیز مراد ہو۔ اور قرآن مجید میں کتنے ہی مقامات پر اولی کا لفظ آیا ہے جہاں تصرف کا معنی کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا جیسے کہ اس آیت کریمہ میں ان اولی الناس بابرھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین امنوا (بے شک ابراہیم کے زیادہ قریب وہ لوگ تھے جو ان کے تابعدار تھے اور یہ نبی اور اس پر ایمان لانے والے) حالانکہ یہاں دو قرینے ایسے بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں لفظ مولی یا اولیٰ محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پہلا قرینہ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ جب ان لوگوں نے حضرت علی کی شکایت کی جو ان کے ساتھ یمن میں تھے جیسے۔ بریدہ اسلمی اور خالد بن ولید وغیرہ تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شکایت کرنے والوں کو ہی منع نہیں کیا تاکہ موالات کے مطالبہ میں مبالغہ ہو اور دعوت میں نرمی ہو جیسا کہ عموماً حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایسے حالات میں طریقہ تھا اور اسی مہربانی کے اظہار کے لیے آپ نے اپنا خطبہ ان الفاظ سے شروع فرمایا۔ کیا میں مومنوں کے ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب نہیں ہوں۔

اور دوسرا قرینہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وہ الفاظ ہیں جو بعض روایات میں ہیں "اے اللہ جو علی سے محبت رکھے اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے اس سے دشمنی رکھ "اور اگر مولیٰ سے مراد "امور میں تصرف کرنے والا "اور با "تصرف کا زیادہ حقدار "ہوتا۔ تو

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح کہتے اے اللہ ان سے محبت رکھ جو علی کے تصرف میں ہیں اور ان سے عداوت رکھ جو ان کے تصرف میں نہیں۔ تو جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے محبت اور عداوت کا ذکر کیا ہے تو وہاں آپ کی محبت کے وجوب اور آپ کی عداوت سے بچنے پر تنبیہ کرنا مقصود ہے نہ کہ تصرف اور عدم تصرف کی بحث اور آپ کی مراد اس سے خلافت ہوتی تو آپ صراحتاً اس کو بیان کردیتے۔

نوٹ: یہاں تک روح المعانی کی عبارت کا ترجمہ ختم ہوا۔ ابو نعیم حضرت حسن مثنی بن حسن سبط النبی (رض) سے راوی ہیں۔ کہ آپ سے صحابہ کرام نے اس واقعہ کے متعلق سوال کیا کہ اگر حضور نے خلافت امیر کا ارادہ فرمایا ہوتا تو آپ فرماتے اے لوگو یہ اولیٰ ہیں میری حکومت میں اور میرے قائم مقام ہیں تم سنو اور اطاعت کرو۔ دوسرے جہاں استثناء کیا ہے ولایت علی سے وہ محبت علی کرم اللہ وجہہ ہے اس لیے کہ کہیں اس اعلان کو بعدی فرما کر مقید نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ اگر ولایت بمعنی خلافت مانا جائے تو ایک زمانہ میں دو خلافتیں مجتمع ہو جائیں گی اور اجتماع ولایتین بمعنی خلافت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس تقدیر پر بھی ماننا پڑے گا کہ اولی سے مراد الوی بالمحبت ہی ہے۔ اور حضرات شیعہ کا یہ تمسک ہے کہ مولیٰ سے مراد اولی بالتصرف ہے اور وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ہے۔ **الست اولی بالمومنین من انفسھم** اور اہل سنت کہتے ہیں کہ اس جگہ اولی بالمومنین سے مراد اولی بالمحبۃ ہے گویا حضور کا فرمانا یہ ہے کہ الست اولی بالمومنین من انفسھم بالمحبۃ۔ بلکہ داعیہ تحقیق میں یوں کہنا چاہیے اولیٰ اس جگہ مشتق ہے ولایت سے اور ولایت بمعنی محبت ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے **الست احب الی المومنین من انفسھم** یعنی کیا میں مومنوں کو ان کی جان سے زیادہ محبوب نہیں ہوں تو اب حاصل معنی سارے اعلان کے یہ ہوں گے۔ اے ایمان والو تم مجھے محبوب رکھتے ہو اپنی جان سے زیادہ تو جو مجھے محبوب رکھتا ہے وہ علی کو بھی محبوب رکھے۔ الٰہی اسے محبوب رکھ جو علی کو محبوب رکھے اور اسے مبغوض رکھ جو علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت کرے۔

اور یہی معنی آیت کریمہ **النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم وازوجہ امھتم واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتب اللہ** پ ۲۱ سورۃ احزاب رکوع اول اس کی تفسیر میں علامہ آلوسی صاحب روح المعانی فرمایت ہیں۔

یہ آیت کریمہ اپنے سیاق میں مدعین نسب کی نفی کرتی ہے جو متبنّٰی ہو کر مشارکت نسبی کرے اور یہ بیان حضرت زید بن حارثہ کے متعلق ہے کہ ہر گز ایسا نہ چاہیے کہ مشرکین کی طرح کہا جائے کہ وہ ابن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ اس لیے کہ نسب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یوں تو تمام مومنین کی طرف مثل شفیق باپ کے ہے بلکہ اس سے بھی زائد اور ازواج مطہرات (رض) امہات المومنین ہیں اور جو اقربا سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نسب میں ہیں وہ **احق بہ تعظیم اور اولیٰ بالمحبۃ** ہیں۔ غیروں کے مقابلہ میں۔ پھر علامہ آلوسی آخری فیصلہ فرماتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ طریقہ اہل سنت سے جو احادیث وارد ہیں وہ اس امر پر دال ہیں کہ آیہ کریمہ **یایھا الرسول بدغ ما انزل الیك من ربك** یقیناً حضرت علی اللہ وجہہ کی شان میں نازل ہوئی ہے لیکن اس میں فضیلت علی کرم اللہ وجہہ سے زائد اور کوئی چیز نہیں اور وہ یقیناً ولی المومنین ہیں لیکن ولی کے معنی وہی ہیں جو ہم نے پہلے مقرر کئے اور ہم ہر گز اس سے منکر نہیں بلکہ وہ ملعون ہے جو ولایت علی اور محبت و تعظیم علی سے انکار کرے کرم اللہ وجہہ الکریم۔ (روح المعانی)

اب حسب موقعہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اس لغت کا استعمال جن معنی میں ہوا ہے وہ بھی یکجا جمع کر دیا جائے۔ قرآن کریم میں لفظ مولیٰ تقریباً چھ مقام پر استعمال ہوا ہے۔ وھو ھذا

پارہ ۷ رکوع ۱۳ ثم ردوآ الی اللہ مولھم الحق۔ اپنے مولیٰ اللہ کی طرف۔

پارہ ۱۱ رکوع ۸۔ وردوآ الی اللہ مولھم الحق۔ مولکم۔ پانچ مقام پر ہے۔

پارہ ۴ رکوع ۷۔ بل اللہ مولکم۔ بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے۔

پارہ ۴ رکوع ۷ ۃ بل اللہ مولکم۔ بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے۔

پارہ ۹ رکوع ۹۔ (آیت) بمعنی مولیٰ ہر دو جگہ۔

پارہ ۱۷ رکوع ۱۷۔ ھو مولکم فنعم المولی و نعم النصیر بمعنی مولیٰ ہر دو جگہ۔

پارہ ۲۷ رکوع ۱۸۔ ھی مولکم وبئس المصیر۔ وہ تمہاری رفیق ہے۔

پارہ ۲۸ رکوع ۱۹ واللہ مولکم وھوالعلیم الخبیر۔ اور اللہ تمہارا مولیٰ ہے۔ موالیکم۔ صرف ایک جگہ آیا ہے۔

پارہ ۲۱ رکوع ۱۷۔ فاخوانکم فی الدین و موالیکم۔ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور بشریت میں تمہارے چچازاد۔ موالی۔ دو جگہ آیا ہے۔

پارہ ۵ رکوع ۲۔ ولکل جعلنا موالی۔ اور ہم نے سب کے لیے مال کے مستحق بنائے۔

پارہ ۲۶ رکوع ۴۔ ولیس لہ من دونہ اولیآء اور نہیں اس کے لیے اللہ کے سوا مددگار ولیکم۔ تمام قرآن کریم میں ایک جگہ آیا ہے۔

پارہ ۶ رکوع ۱۲۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ۔ تمہارے نہیں ہیں دوست مگر اللہ اور اس کا رسول۔ ولینا دو جگہ ہے۔

پ ۹ رکوع ۹۔ انت ولینا فاغفر لنا تو ہمارا مولیٰ ہے تو ہمیں بخش دے۔

پ ۲۲ رکوع ۱۱۔ قالوا سبحنک انت ولینا من دونھم۔ وہ عرض کریں گے پاکی ہے تجھ کو تو ہمارا دوست ہے نہ وہ۔ ولی۔ دو جگہ آیا ہے۔

پ ۹ رکوع ۱۴۔ ان ولی اللہ الذی نزل الکتب۔ بیشک میرا اولیٰ اللہ ہے جس سنے کتاب اتاری۔

پ ۱۳ رکوع ۵۔ انت ولی فی الدنیا والاخرۃ۔ تو میرا کام بنانے والا ہے دنیا اور آخرت میں۔ ولیھم دو جگہ ہے۔

پ ۸ رکوع ۲۔ وھو ولیھم وہ ان کا مولیٰ ہے۔

پ ۱۴ رکوع ۱۴ فزین لھم الشیطن اعمالھم فھو ولیھم الیوم تو شیطان نے ان کے کرتوت ان کی آنکھوں میں بھلے کر دکھائے تو آج وہی ان کا رفیق ہے۔ ولیھما۔ صرف ایک جگہ ہے۔

پ ۴ رکوع ۴۔ واللہ ولیھما اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے۔ ولیہ۔ تین جگہ ہے۔

پ ۳ رکوع ۷۔ فلیملل ولیہ بالعدل تو اس کا ولی انصاف سے لکھا جائے۔

پ ۱۵ رکوع ۴۔ ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطناً اور جو ناحق قتل کیا جائے تو بیشک ہم نے اس کے وارث کو قابو دیا ہے۔

پ ۱۹ رکوع ۱۹۔ ثم لنقولن لولیہ۔ پھر اس کے وارث سے کہیں گے۔ ولیا۔ بارہ جگہ آیا ہے۔

پ ۵ رکوع ۴۔ وکفی باللہ ولیاً اور اللہ کافی ہے والی۔

پ ۵ رکوع ۷۔ واجعل لنا من لدنک ولیا۔ اور دے اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی حمایتی۔

پ ۵ رکوع ۹۔ ولا تتخذوا منھم ولیاً ولا نصیراً اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار۔

پ ۵ رکوع ۱۵۔ و من یتخذ الشیطن ولیا من دون اللہ۔ اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے۔

پ ۶ رکوع ۴۔ ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیا ولا نصیراً اور اللہ کے سوا نہ اپنا کوئی حمایتی پائیں گے نہ مددگار۔

پ ۷ رکوع ۸۔ قل اغیر اللہ اتخذ ولیاً فرماد یجیے کیا اللہ کے سوا بناؤں کسی اور کو والی۔

پ ۱۵ رکوع ۱۴ فلن تجد لہ ولیا مرشداً اور ہر گز اس کا حمایتی نہ پائے گا۔

پ ۱۶ رکوع ۴۔ فھب لی من لدنک ولیا یرثنی۔ تو مجھے اپنے پاس سے دے جو میرا اوالی ہو تاکہ وہ میرے ورثہ کا حقدار ہو۔

پ ۱۶ رکوع ۶۔ فتکون للشیطن ولیا تو ہو جائے گا تو شیطان کا رفیق۔

پ ۲۱ رکوع ۱۸ ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیاً ولا نصیراً اور نہ وہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا حامی و مددگار۔

پ ۲۲ رکوع ۵۔ لا یجدون ولیاً ولا نصیراً نہ پائیں گے کوئی حمایتی نہ مددگار۔

پ ۲۶ رکوع ۱۱۔ ثم لا یجدون ولیا نصیراً۔ پھر نہ پائیں گے کوئی حمایتی نہ مددگار۔ ولی۔ ۱۸ جگہ آیا ہے۔

پ ا رکوع ۱۳۔ وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر۔ اور نہیں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی نہ مددگار

پ ا رکوع ۱۴۔ مالک من اللہ من ولی ولا نصیر۔ نہیں تریے لیے اللہ سے کوئی بچانے والا نہ مددگار۔

پ ۳ رکوع ۲۔ اللہ ولی الذین امنوا۔ اللہ والی ہے ان کا جو ایمان لائے۔

پ ۳ رکوع ۸۔ وارحمنا انت مولنا اور ہم پر رحم کر تو ہمارا مولیٰ ہے۔

پ ۷ رکوع ۱۲۔ لیس لھم من دونہ ولی ولا شفیع۔ نہیں ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی نہ سفارشی۔

پارہ ۷ رکوع ۱۴۔ لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع نہیں اس کا اللہ کے سوا کوئی حمایتی نہ سفارشی۔

پارہ ۱۰ رکوع ۱۶۔ وما لھم فی الارض من ولی ولا نصیر اور نہیں ان کے لیے زمین میں کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

پارہ ۱۱ رکوع ۳۔ وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر اور نہیں تمہارا اللہ کے سوا کوئی والی نہ مددگار۔

پ ۱۳ رکوع ۱۱۔ مالک من اللہ من ولی ولا واق۔ نہیں تیرا اللہ کے آگے کوئی حمایتی اور نہ بچانے والا۔

پ ۱۵ رکوع ۱۲۔ ولم یکن لہ ولی من الذل اور ہر گز نہ ہوگا اس کا کوئی حمایتی اس کی ذلت کی وجہ سے۔

پ ۱۵ رکوع ۱۶۔ مالھم من دونہ من ولی۔ نہیں اس کا اللہ کے سوا کوئی والی۔

پ ۲۰ رکوع ۱۴۔ وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر اور نہیں تمہارے لیے اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست کام بنانے والے اور نہ مددگار۔

پ ۲۴ رکوع ۱۹۔ کانہ ولی حمیم۔ گویا کہ گہرا دوست ہے۔

پ ۲۵۔ رکوع ۲۔ فاللہ ھو الی۔ تو اللہ ہی والی ہے۔

پ ۲۵ رکوع ۴۔ وھو الولی الحمید۔ اور وہی کام بنانے والا تعریف کیا گیا ہے۔

پ ۲۵ رکوع ۴۔ وھو الولی الحمید۔ اور وہی کام بنانے والا تعریف کیا گیا ہے۔

پ ۲۵ رکوع ۵۔ وما لک من دون اللہ من ولی ولا نصیر۔ اور نہیں تمہارا اللہ کے سوا کوئی دوست نہ مددگار۔

پ ۲۵ رکوع ۶۔ فما لہ من ولی من بعدہ۔ تو نہیں اس کا کوئی رفیق اللہ کے بعد۔

پ ۲۵ رکوع ۱۵۔ واللہ ولی المتقین اور اللہ ڈر والوں کا دوست ہے۔ اولیآء ۳۴ جگہ آیا ہے۔

پ ۳ر کوع ۲۔ والذین کفروآ اولیھم الطاغوت اور وہ لوگ جو کافر ہیں ان کے حمایتی شیطان ہیں۔

پ ۳ر کوع ۱۱۔ لایتخذ المومنون الکفرین اولیآء من دون المومنین مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ مسلمانوں کے سوا۔

پ ۴ر کوع ۹۔انما ذلکم الشیطن یخوف اولیآءہ۔ وہ تو شیطان ہی ہے کہ اپنے دوستوں کو خائف کرتا ہے۔

پ ۵ر کوع ۷۔ فقاتلوآ اولیآء الشیطن تو لڑو شیطان کے دوستوں سے۔

پ ۵ر کوع ۹۔ فلاتتخذوا منھم اولیآء توان میں کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

پ ۵ر کوع ۱۷۔ الذین یتخذون الکفرین اولیآء من دون المومنین۔ وہ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں۔

پ ۶ر کوع ۱۲۔ (آیت) اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

پ ۶ر کوع ۱۳۔ والفکار اولیآء اور کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

پ ۶ر کوع ۱۵۔ وماانزل الیہ مااتخذوھم اولیآء اور اس پر جو ان کی طرف اترا تو کافروں سے دوستی نہ کرتے۔

پ ۸ر کوع ۲۔ وقال اولیوھم من الانس۔ اور ان کے دوست آدمی عرض کریں گے۔

پ ۸ر کوع ۸۔ ولاتتبعوا من دونہ اولیآء اور نہ پیروی کرو۔ اللہ کے سوا۔ اولیاء بمعنی پیرو۔

پ ۸ر کوع ۱۰۔ انھم اتخذوا الشیطن اولیآء من دون اللہ۔ انھوں نے بنایا شیطانوں کو والی اللہ کے سوا۔

پ ۹ر کوع ۱۸۔ وماکانوآ اولیآءہ ان اولی آؤہ الا المتقون اور وہ اس کے اہل نہیں اس کے اولیاء تو پرہیزگاری ہی ہیں۔

پ ۱۰ر کوع ۶۔ والذین کفروا بعضھم اولیآء بعض۔ اور کافر ایک دوسرے کے وارث ہیں۔

پ ۱۰ر کوع ۶۔ اولئک بعضھم اولیآء بعض۔ وہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔

پ ۱۰ر کوع ۹۔ یایھاالذین امنوالاتتخذوآ ابآء کم واخوانکم اولیآئَ۔ اے ایمان والو اپنے باپ اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ۔

پ ۱۰ر کوع ۱۵۔ بعضھم اولیآء بعض۔ بعض ان کے رفیق ہیں بعض کے۔

پ ۱۱ر کوع ۱۲۔ الاان اولیآء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ سن لو بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ خوف ہے نہ کچھ غم۔

پ ۱۲ر کوع ۲۔ وماکان لھم من دون اللہ من اولیآء اور نہیں ہے ان کا کوئی اللہ کے سوا حمایتی۔

پ ۱۲ر کوع ۱۰۔ ومالکم من دون اللہ من اولیآء اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی نہیں۔

پ ۱۳ر کوع ۸۔ قل افاتخذتم من دونہ اولیآئَ۔ فرمادیجیے کیا اللہ کے سوا تم نے وہ حمایتی بنالیے ہیں۔

پ ۱۵ر کوع ۱۱۔ فلن تجد لھم اولیآء من دونہ۔ تو ہرگز نہ پاؤ گے اس کے سوا کوئی حمایتی۔

پ ۱۵ر کوع ۱۹۔ افتتخذونہ وذریتہ اولیآء من دونی۔ تو کیا بناتے ہو اسے اور اس کی اولاد کو دوست میرا سوا۔

پ ۱۶ر کوع ۳۔ افحسب الذین کفروآ ان یتخذوا عبادی من دونی اولیآء تو کیا کافر سمجھتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے سوا حمایتی بنائیں گے۔

پ ۱۸ر کوع ۱۷۔ ان نتخذ من دونک من اولیآء بنائیں گے تیرے سوا اور کو مولیٰ۔

پ ۲۰ رر کوع ۱۶اتخذوا من دون اللہ اولیآء اللہ کے سوا اور مالک بنالئے۔

پ ۲۳ر کوع ۱۵۔ والذین اتخذوا من دونہ اولیآء وہ جنھوں نے بنالیے والی اللہ کے سوا۔

پ ۲۴ر کوع ۱۸۔ نحن اولیوکم۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔

پ ۲۵ رکوع ۲۔ ام اتخذوا من دونہ اولیآء کیا اللہ کے سوا اور والی ٹھہراتے ہیں۔
پ ۲۵ رکوع ۶۔ وماکان لھم من اولیآء اور ان کے کوئی دوست نہ ہوئے۔
پ ۲۵ رکوع ۱۷۔ ولا ما اتخذ وا من دون اللہ اولیآء اور نہ وہ جو اللہ کے سوا حمایتی ٹھہرا رکھے تھے۔
پ ۲۵ رکوع ۱۸۔ وان الظلمین بعضھم اولیآء بعض۔ اور بیشک ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔
پ ۲۶ رکوع ۴۔ ولیس لہ من دونہ اولیآء اور اللہ کے سامنے اس کا کوئی مددگار نہیں۔
پ ۲۸ رکوع ۴۔ یایھا الذین امنوا لاتتخذ وا اعدوی وعدوکم اولیآئ۔ اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔
پ ۲۸ ۱۱۔ انکم اولیآء للہ۔ تم اللہ کے دوست ہو۔ اولیکم۔ ایک جگہ آیا ہے۔
پ ۲۱ رکوع ۱۷۔ الا ان تفعلوآ الیٰ آولیکم معروفاً مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں پر کوئی کسی قسم کا احسان کرو۔ اولیھم۔ ایک جگہ آیا ہے۔
پ ۸ رکوع ۱۔ (آیت)

۹۶ مقامات پر ولی کا معنی مددگار نہ کہ خلیفہ

کل ۹۶ مقام پر ہے اور اس کے تمام معنی مندرجہ ذیل ہیں۔ دوست، مددگار، منہ کرنا، مولیٰ مستحق ورثہ، والی، کام بنانے والا، رفیق، سنبھالنے والا، وارث، ورثہ، حمایتی۔ حامی، بچانے والا۔ کام بنانے والا۔ اولیاء محبوب۔ مالک۔
ان معنی میں خلافت کے معنی کہیں نہیں آئے۔ قطع نظر اس کے دیکھنا یہ ہے کہ یہ الیکشن بعد وفات سید اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہو چکا۔
اب اس قصہ کو دہرانے اور وہی پرانا راگ الاپتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں جسے جس وقت جس طرح مسند نشین مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بننا تھا بن گیا۔ پھر مسند نشین ہونے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔
جہاں صدیق و فاروق و ذوالنورین علیھم رضوان کو مسند نشین مانا جاتا ہے وہاں حضرت امیر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا مسند نشین مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں۔ بحث تو صرف اور صرف اس میں ہے۔ کہ خلیفۃ اللہ بلا فصل کون ہوا۔ مسند مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پہلے کون متمکن ہوا۔
پھر حضرات شیعہ کا مسلمہ اعتقاد ہے کہ خلافت علی منہاج النبوت بغیر مشیت الٰہی عزوجل کسی کو نہیں ملتی۔ بنابریں یہ کہنا تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ جسے خلیفہ بنانا چاہتا ہے وہ تو نہ بن سکے اور دوسرے اس مسند پر آ جمے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو لازم آتا ہے کہ ارادۃ اللہ پر ارادہ عبد غالب ہے اور یہ باطل ہے۔
بہر حال
انصاف کی نظر سے دیکھنے اولے کو صاف نظر آتا ہے کہ اولیت و ثانویت موجب اعزاز نہیں بلکہ خلافت سنت الٰہی عزوجل کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے چوتھے درجہ میں اس لیے ہوئی کہ آپ مقام ولایت کے علی منہاج النبوت خاتم تھے۔ تو بلا تشبیہہ جیسے جناب ختمی مآب خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء (علیھم السلام) کے بعد تشریف لائے اور خاتم الانبیاء قرار پائے اسی طرح حضرت مولائے کائنات

اسد اللہ علی کرم اللہ وجہہ خاتم ولایت ہونے کی بنا پر خلافت کے آخر پر خلفیہ ہوئے۔اب رہی فضیلت صدیق اکبر (رض) سو وہ خلیفہ اول ہونے کی بنا پر نہیں۔

بلکہ اعلان سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ میں کہ ارشاد ہوا۔افضل البشر بعد الانبیاء ابوبکر الصدیق۔اور جہاں یہ فضیلت صدیق اکبر (رض) کو حاصل ہوئی وہاں

من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔شیر خدا اسد اللہ کرم اللہ وجھہ کی فضیلت میں ارشاد ہوا جس کے معنی ہی بتا رہے ہیں کہ جس کے دل میں محبت سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے اس کا دل محبت علی کرم اللہ وجہہ سے لازمی طور پر معمور ہوگا اور محبوبان حق وہ یہ ہیں جو حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی محبت کو جزو ایمان جانیں اور جن کے دل میں عداوت ہو وہ عاد من عاداہ کا مستحق ہے اور جس کے دل میں محبت ہو وہ وال من والاہ کا حقدار ہے۔یہ ہے خلاصہ تحقیق انیق اس پر بھی اگر کوئی موشگافی کی جرات ہے وہ مفرط ہے اور مفرط سے مکالمہ افراط و تفریط کے مریضوں کا کام ہے واللہ الہادی۔(حسنات)

شان نزول:(آیت) "یایھا الرسول بلغ ما انزل الیك"۔

ابو الشیخ نے حسن (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے رسالت سے مشرف فرمایا تو میرے دل میں پریشانی ہوئی اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ لوگ ضرور میری تکذیب کریں گے تو مجھے اس چیز کا ڈر ہوا کہ میں تمام احکام کی تبلیغ کردوں، ورنہ مجھے عذاب دیا جائے گا۔

تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور ابن ابی حاتم (رح) نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار، کس طرح تبلیغ کروں میں اکیلا ہوں اور سب مل کر مجھ پر ہجوم کرجائیں گے تو اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جملہ نازل ہوا، (آیت) "وان لم تفعل فما بلغت رسلتہ"۔

اور حاکم (رح) وترمذی (رح) نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پہرہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی، (آیت) "واللہ یعصمك من الناس"۔تو آپ نے خیمہ سے سر نکالا اور فرمایا کہ لوگو واپس چلے جاؤ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔

نیز طبرانی (رح) نے ابوسعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس (رض) رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عم محترم ان حضرات میں سے تھے جو آپ کا پہرہ دیا کرتے تھے، جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی، کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا تو انھوں نے پہرہ دینا چھوڑ دیا۔

نیز عصمۃ بن مالک (رض) سے روایت کیا ہے کہ ہم رات کو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پہرہ دیا کرتے تھے، جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا تو پہرہ دینا چھوڑ دیا گیا۔

اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ جب ہم اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی سفر میں ہوتے تو ہم آپکے لیے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ سایہ دار درخت چھوڑ دیتے تھے جس کے نیچے آپ اتر کر آرام فرماتے، چنانچہ ایک

دن ایسے ہی ایک درخت کے نیچے آپ نے آرام فرمایا اور اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی تو ایک شخص نے آکر وہ تلوار اتار لی اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بچا سکتا ہے تلوار رکھ دے اس نے تلوار رکھ دی، تب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "**واللہ یعصمک من الناس**"۔

اور ابن ابی حاتم (رح) اور ابن مردویہ نے جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بنی انمار کیا تو مقام ذات الرقیع میں ایک کھجوروں کے بلند باغ پر پڑاؤ کیا، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے اور پیر کنوئیں میں لٹکا رکھے تھے۔

تو بنی نجار میں سے وارث نامی ایک شخص کہنے لگا کہ العیاذ باللہ میں ضرور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کروں گا، تو اس کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ کس طرح قتل کرے گا وہ کہنے لگا میں آپ سے آپ کی تلوار مانگوں گا، جب آپ اپنی تلوار دے دیں گے تو میں آپ کو قتل کردوں گا، چنانچہ وہ آیا اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذرا اپنی تلوار تو دیجیے، میں سونگھتا ہوں، آپ نے تلوار دے دی تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تیرے اور تیرے ارادہ کے درمیان حائل ہوگیا۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (آیت) " یایھا الرسول بلغ ما ان (الخ)

اور ابن مردویہ (رح) اور طبرانی (رح) نے ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی جاتی تھی اور ابوطالب بنی ہاشم میں سے کچھ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بھیجنے کا ارادہ فرمایا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عم محترم اللہ تعالیٰ نے جن وانس سب سے میری حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے۔

نیز ابن مردویہ نے جابر بن عبداللہ (رض) سے اسی طرح روایت نقل کی ہے اور اس سے اس چیز کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے مگر ظاہر اس کا مخالف ہے۔ (ابن عباس)

معارف و منازل

گذشتہ آیات میں اہل کتاب کی شرارتوں اور کفر و نافرمانیوں کا بیان ذکر کرکے توریت وانجیل اور قرآن کریم یعنی تمام کتب سماوی پر عمل کی ترغیب دی گئی قرآن کریم تمام کتب آسمانی کا جامع عطر اور نچوڑ ہے جو شخص قرآن کریم پر عمل کیا تو ایسا سمجھو گے اس نے تمام کتب سماوی پر عمل کیا اسی طرح قرآن مجید کی تبلیغ تمام کتب سماوی کی تبلیغ کہلائے گی اب خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فریضہ تبلیغ ادا کرنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پوری کائنات کے پیغمبر ہیں سارے انبیاء کے وارث ہیں ساری آسمانی کتابوں کے حامل ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہلے حکم دیا جاچکا ہے " قم فانذر وربک فکبر "اس نئے حکم کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری کا بھی اعلان کیا جا رہا ہے اس آیت کے نزول سے پہلے آنحضرت صلی عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کفار و منافقین یہود موہان دین سے جسمانی اذیتیں پہنچی ہیں اس آیت کے نزول کے بعد آپ کو کوئی شخص تکلیف نہیں پہنچا سکا۔

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے روایت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہ اصحاب رات کو باری باری آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا کرتے تھے جب آیت " واللہ یعصمک من الناس " نازل ہوئی تو آنحضرت سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

خیمہ سے اپنا سر مبارک نکال کر حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) کو فرمایا کہ اب تم میرے پاس سے چلے جاؤ اللہ تعالیٰ میرا نگہبان ہے اس نے خود میری حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے یہ روایت جامع ترمذی میں ہے قریب قریب اسی طرح کی روایت متفق علیہ میں بھی ہے۔

حکم تبلیغ رسالت اور وعدہ حفاظت

اس آیت کریمہ میں رب العزت جل شانہ نے سرور عالم مبلغ اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو احکام الٰہی کی ہمہ گیر تبلیغ کا حکم فرمادیا اور فرمایا کہ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچادیں۔

حضرت حسن بصری (رح) سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قلب مبارک پر بوجھ محسوس ہوا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خیال دامن گیر ہوا کہ لوگ میری تکذیب کریں گے کیونکہ پورے کرہ ارض اور چاروں افق احکام الٰہی سے خالی اور محروم تھے اس پر یہ آیت اتری تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عرض کیا کہ عرب میں تنہا اکیلا یہ مشکل کام کیسے انجام دوں گا کیونکہ لوگ میرے خلاف اٹھیں گے اور میرے لیے مشکلات پیدا کریں گے فرمایا وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ اور مزید اطمینان قلب کے لئے ارشاد ہوا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یہ کتنی بڑی حوصلہ افزائی اور تسلی ہے اس کے نزول کے ساتھ اپنے تمام جان نثار محافظوں اور پہرے داروں کو رخصت دے دی اور آرام سے رہے (معالم، لباب)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ کہ جن کی قسمت میں ہدایت نہیں وہ کبھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا بہت سے لوگ مختلف مقامات میں اور متفرق حالات میں یا تو آپ تک نہیں پہنچ سکے یا پہنچ کر عاجز اور ناتوان رہے کچھ نہ کرسکے بلکہ الٹا ذلیل ہو کر گرفتار ہوئے یا قتل ہوئے یا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے تفصیل دیکھنا ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں جن المناک واقعات کا تفصیلی احاطہ کیا ہے ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات اقدس پر پہلا حملہ اس وقت ہوا جب آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا جس سے مکہ میں ہلچل پیدا ہوئی اور لوگ آپ پر حملہ آور ہوئے حضرت خدیجہ (رض) کے پہلے خاوند سے بیٹے حارث بن ابی ہالہ آپ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوگئے یہ اسلام کے پہلے شہید تھے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ)

۲۔ ابوجہل نے پتھر سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سر مبارک کچلنے کی کوشش کی حالانکہ آپ بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز تھے جونہی وہ آگے بڑھا تو ایک خونخوار اونٹ اس کو دبوچنے کے لیے دوڑا آرہا تھا ابوجہل گھبرا کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ اپنے ساتھیوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اگر میں ایک قدم اور آگے بڑھتا تو اونٹ مجھے کھا جاتا۔ میں نے اتنا خوفناک اونٹ آج تک نہیں دیکھا (ابن ہشام۔ الرحیق المختوم)

۳۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیت اللہ میں کھڑے ہو کر توحید کا پیغام سنا رہے تھے کہ مشرکین آپ پر ٹوٹ پڑے جن میں عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اتنے بل دیے کہ آپ کا چہرہ مبارک خون سے سرخ ہوگیا اور بے ساختہ آواز نکل گئی اس موقع پر اچانک حضرت ابوبکر صدیق (رض) آن پہنچے۔ انھوں نے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی جس پہ ان کو اس قدر پیٹا گیا کہ وہ کئی دن تک اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ (رواہ البخاری: کتاب المناقب فضائل ابوبکر)

۴۔ جناب عمر (رض) کا مشہور واقعہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنے کے ارادے سے باہر نکلے۔ راستے میں انھیں بتایا گیا کہ تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں جسے سنتے ہی عمر اپنی بہن کے گھر گئے اور بہن اور بہنوئی کو پیٹنا شروع کر دیا۔

۵۔ آپ کی عظیم جدوجہد سے مجبور ہو کر مکہ کے زعماء ابوطالب کے پاس جا کر پیشکش کرتے ہیں کہ آپ مکہ کے نامور سردار ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ کو قبول فرمائیں اور اس کے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہمارے حوالے کر دیں۔ ان کا مقصد رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنا تھا۔ (ابن ہشام، الرحیق المختوم)

۶۔ ہجرت سے پہلے رات کے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر کا گھیراؤ کرنا تاکہ آپ صبح کے وقت نکلیں تو یکبارگی حملہ کرکے آپ کا کام تمام کر دیا جائے (الانفال آیت ۳۰ کی تفسیر دیکھئے)

۷۔ ہجرت کے دوران ۱۰۰ اونٹ کے لالچ میں سراقہ بن مالک کا پیچھا کرنا تاکہ زندہ یا قتل کرنے کی صورت میں انعام حاصل کیا جائے (بخاری کتاب الانبیاء باب ہجرت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۸۔ غزوہ بدر کے بعد صفوان بن امیہ کا عمیر بن وہب کو قتل کے ارادے سے مدینہ بھیجنا عمیر جب آپ کے پاس پہنچا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بذریعہ وحی اسے پوری بات بتلائی کہ صفوان بن امیہ نے تیرا قرض چکانے اور اہل و عیال کی ذمہ داری اٹھائی ہے تاکہ تو مجھے قتل کر دے یہ سن کر عمیر بن وہب ششدر رہ گیا۔ اس نے اس بات کا اقرار کیا اور ساتھ ہی مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ تفصیل جاننے کے لیے ابن ہشام اور الرحیق المختوم کی طرف رجوع کریں۔

۹۔ ثمامہ بن اثال کی گرفتاری کا مشہور واقعہ ہے جس کی تفصیل میں الرحیق کے مصنف لکھتے ہیں کہ یہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلا تھا لیکن گرفتار ہو گیا اور آپ کا حسن اخلاق دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

۱۰۔ مدینہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک قضیہ کے تصفیہ کے لیے یہودیوں کے محلے میں تشریف لے گئے آپ کی گفتگو کے دوران یہودیوں نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چپکے سے مکان پر چڑھ کر بھاری پتھر لڑھکائے جس سے آپ جانبر نہ ہو سکیں لیکن بذریعہ وحی آپ کو خبر ہوئی آپ اس سے پہلے ہی اٹھ کر چلے آئے۔ (الرحیق المختوم)

۱۱۔ خیبر کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ختم کرنے کے لیے یہودی عورت کا آپ کی دعوت کرنا جس میں زہر ملا دیا گیا تھا لیکن لقمہ منہ میں ڈالتے ہی آپ کو احساس ہوا جس سے آپ نے کھانا چھوڑ دیا تاہم یہ زہر اس قدر ہلاکت انگیز تھا کہ وفات کے وقت بھی آپ نے اس کے زہریلے اثرات بڑی شدت کے ساتھ محسوس فرمائے۔ (بخاری کتاب الطب)

۱۲۔ صلح حدیبیہ کے بعد اشاعت دین کے لیے رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختلف حکمرانوں کو مراسلات لکھے جن میں ایران کے فرمانروا خسرو پرویز کو بھی خط لکھا اس نے نہ صرف آپ کا نامہ مبارک پھاڑ دیا بلکہ یمن کے گورنر کو حکم دیا کہ نبوت کے دعویدار کو گرفتار کرکے میرے پاس بھیجا جائے تب یمن کے اہلکاروں نے آپ کے پاس آکر خسرو پرویز کا حکم نامہ سناتے ہوئے کہا کہ اگر آپ نے گرفتاری پیش نہ کی تو آپ کے علاقے کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔ (ابن ہشام، بخاری)

۱۳۔ یہود کی تمام سازشیں اور شرارتیں ناکام ہو گئیں تو انھوں نے ایک بہت بڑے جادوگر کے ذریعے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جادو کا ایسا وار کیا جس سے کئی ہفتے آپ کی طبیعت انتہائی پریشان، مضمحل اور بے چین رہی، رات کی نیند اڑ گئی اور دن کا چین جاتا رہا اس حالت میں

جبرائیل امین تشریف لائے اور انھوں نے جادو کا علاج بتلاتے ہوئے اس کنویں کی نشاندہی فرمائی جہاں آپ کا مجسمہ بنا کر آپ کے بالوں کو گرہیں دیتے ہوئے جادو کیا گیا تھا۔ تفصیل جاننے کے لیے (رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق، کتاب الادب)

۱۴۔ غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسلحہ اتار کر ایک درخت کے نیچے آرام فرما تھے کہ ایک دشمن قبیلے کا آدمی موقعہ پا کر آپ کی تلوار لہراتے ہوئے کہتا ہے کہ اب تجھے مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے کسی مرعوبیت کے بغیر فرمایا اللہ ہی مجھے بچانے والا ہے یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی وہ معافی کا خواستگار ہوا آپ نے اسے معاف کر دیا بعض روایات کے مطابق وہ شخص آپ کا حسن اخلاق دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (رواہ البخاری: کتاب الجہاد)

۱۵۔ عمیر بن وہب کا واقعہ نمبر ۸ گزر چکا ہے اس کا بیٹا فضالہ فتح مکہ کے موقع پر کافر تھا فتح کے بعد جب آپ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے تو اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا جسے آپ بھانپ گئے آپ نے اسے قریب بلا کر اس کے مذموم ارادے سے متنبہ فرمایا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ (الرحیق المختوم)

۱۶۔ اسلام کا پیغام حجاز کی سرزمین سے گزر کر روم کی سرحدات میں پہنچ چکا تھا جس وجہ سے روم کے حکمران اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہے تھے انھوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی افواج کو پیش قدمی کے لیے تیار کیا اس صورت حال کو دبانے کے لیے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ۳۰۰۰۰ ہزار مجاہدین لے کر روم کے دروازے پر دستک دی آپ کا جرأتمندانہ اقدام دیکھ کر رومی سامنے آنے کی تاب نہ لا سکے۔ کچھ دن قیام کرنے کے بعد آپ مدینہ واپس آ رہے تھے کہ رات کی تاریکی میں منافقوں نے آپ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا کہ جب آپ کسی تنگ گزرگاہ کے درمیان پہنچیں تو آپ پر یکبارگی حملہ کر دیا جائے منافقوں کے جتھے نے چہرے چھپائے ہوئے تھے تاہم وحی کے ذریعے آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے حذیفہ بن یمان کو حکم دیا کہ منافقوں کی سواریوں کو دور ہانک دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں منافقوں کے نام بتائے اور کریمانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے نام کسی اور کو نہ بتلائے جائیں۔

(رواہ مسلم: کتاب صفۃ المنافقین، ابن ہشام، الرحیق المختوم)

۱۷۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف آخری سازش عامر بن طفیل نے تیار کی جس نے بئر معونہ کے مقام پر ستر قرّاء کو شہید کروایا یہ ایک وفد لے کر مدینہ آیا اور منصوبے کے تحت آپ سے گفتگو کر رہا تھا کہ اس کے ایک ساتھی نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے ہو کر تلوار کا وار کرنا چاہا جس کی بذریعہ وحی آپ کو خبر ہو گئی آپ نے ان کی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے درگزر سے کام لیا تاہم اس کے لیے بددعا کی جس کی وجہ سے وہ ذلیل ہو کر مرا۔ (رواہ البخاری: کتاب المغازی)

تو اس ماحول میں خالق ارض و سماء فرما رہا ہے "**واللہ یعصمك من الناس**"

حجۃ الوداع کا تاریخی خطبہ اور پوری امت کو پیغام

آنحضرت سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اس میں بہت سی اہم اور ہمہ گیر اور عالمگیر ضروری باتوں کا تذکرہ فرمایا ایسا لگتا تھا کہ بیشمار ستاروں اور چمکدار تاروں کے عین وسط میں چودھویں رات کا چاند محو سفر رواں دواں ہے سفید چادروں کے احرام میں ملبوس ایک لاکھ سے زائد نورانی چہروں والے صحابہ کرام آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہر

بات ہر اشارہ ہر ادا سننے اور دیکھنے کے لئے تڑپ رہے ہیں اور بڑی خاموشی اور ادب کے ساتھ جس مکان بنے ہوئے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درمیان میں اونٹنی پر سواری کی حالت میں خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اونٹنی کا مہار مشہور سردار سہیل بن عمرو کے ہاتھ میں ہے اونٹنی کے منہ سے جھاگ مسلسل گر رہی ہے سہیل بن عمرو ان دھاگوں کو زمین پر نہیں گرنے دیتا بلکہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے چہرے اور سر کے بالوں پر اور بدن پر مل رہا ہے یہ وہ سہیل بن عمرو ہے جس نے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے بیٹھ کر کفار قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر آئے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ میدان حدیبیہ میں مشہور صلح حدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں جب بات پہنچی محمد رسول اللہ پر تو سہیل نے کہا میں آپ کو رسول اللہ تسلیم نہیں کرتا یا رسول اللہ کا لفظ کاٹ دو محمد بن عبداللہ لکھو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا صبر اور تحمل پہاڑوں سے زیادہ وزنی تھا فرمایا اچھی بات ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) کاتب وحی سے فرمایا رسول اللہ کا لفظ کاٹ دو حضرت علی (رض) نے کہا میرے ہاتھوں میں یہ حوصلہ اور جرات کہاں کہ رسول اللہ کا مبارک لفظ کاٹ دوں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اچھا وہ لفظ مجھے نشاندہی کر کے بتاؤں حضرت علی (رض) انہوں نے نشاندہی کی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے داہنے ہاتھ مبارک سے کاٹ کر اسے مطمئن کر دیا۔

اگر ہو عشق تو ہے کافری مسلمانی نہ ہو تو بندہ مومن بھی کافر و زندیق (اقبال)

یہ وہی سہیل ہے جو آج اونٹنی کی جھاگ پر جان دینے کے لئے تیار اور قربان ہے جب کہ 4 سال قبل اور رسول اللہ کے لفظ کو برداشت اور تسلیم کرنے کے منکر تھے میدان عرفات کا یہ خطبہ کیا خطبہ تھا پوری شریعت اور دین الہی کا نچوڑ اور عرق کشیدہ عطر تھا جب آپ یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے انسان تو انسان تھے قرب وجوار کے درخت سبزی جڑی بوٹیاں پتھر پہاڑ سارے خاموشی کے ساتھ سن رہے ہوں گے اور فرد محبت عقیدت سے جھوم رہے ہوں گے یہ وہ تاریخی خطبہ تھا جس کی سماعت اور سننے کے لئے عالم بالا آسمانوں سے لاکھوں فرشتے آئے ہوئے تھے جنہوں نے تخلیق آدم (علیہ السلام) سے لے کر آج تک جامع معطر عالمگیر خطبہ نہ سنا تھا اور نہ انکے خیال وگمان میں تھا دوسری طرف سے سید الملائکہ حضرت جبریل (علیہ السلام) تکمیل دین اور اتمام نعمت الہی کے پیغام کا مژدہ سنانے کے لئے فرشتوں کی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بارگاہ نبوت میں حاضری دے کر اعلان کر رہا تھا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (المائدۃ) یہ خطبہ کیا خطبہ تھا جس میں اعلان ہو رہا تھا کہ سارے جہاں کی خدائی اللہ رب العزت وحدہ لاشریک کے لئے ہے جاہلیت کے تمام ڈیوا جو رسوم میرے پاؤں کے نیچے دبے ہوئے ہیں ہاتھ مبارک کے اشارہ سے فرمایا دیکھو وہ ہے ابلیس اپنے بال نوچ رہا ہے چہرے پر ہاتھوں سے طمانچہ مار رہا ہے اور ویل واویلا کرتے ہوئے چیختے ہوئے اپنے سر پر مٹی ڈال رہا ہے اور اپنی ناامیدی کا اعلان کر رہا ہے اسے یقین ہو گیا ہے کہ قیامت تک اس خطے میں شرک نہیں ہو گا اور غیر اللہ کی عبادت نہیں ہو گی۔ آج پورا جزیرہ عرب توحید کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور یہ سلسلہ قرب قیامت تک قائم رہے گا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اس خطبے میں اصنام، اوثان بتوں پتھر سونے چاندی تانبے سے بنے ہوئے تمام مورتوں کو پاش پاش کر کے ہمیشہ کے لئے انہیں نیست و نابود فرمایا قومیتوں لسانی علاقائی کالے سفید سرخ ہر قسم کی عصبیتوں کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا اور تمام شرافتوں اور فضیلتوں کا معیار صرف تقوی اور پرہیزگاری کو قرار دیا آخر میں ارشاد فرمایا کے قیامت کے دن میرے متعلق تم سے پوچھا جائے گا تو کیا جواب دو گے سارے مجمع نے بیک زبان علان کیا کہ "نشھد انك قد بلغت الرسالۃ وادیت الامان و نصحت الامۃ "ہم گواہی دیں گے کہ بلاشبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہنچایا رسالت کو اور پورا ادا کیا امانت کو اور خیر خواہی فرمائی امت کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی پھر لوگوں کی طرف جھکائی اور تین بار رب العزت کے حضور میں شہادت کی انگلی اٹھا کر عرض کیا" **اللھم اشھد** "اے اللہ! تو گواہ ہو جا! (رواہ مسلم) پھر دسویں ذوالحجہ یوم نحر کے روز منیٰ شریف میں آپ نے دوبارہ خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا "الاھل بلغت "خبر دار ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا میں نے پہنچا دیا حاضرین نے بیک زبان جواب دیا "**نعم قد بلغت** "ہاں آپ نے اللہ کا حکم پہنچایا پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ **اللھم اشھد**۔ اے اللہ تو گواہ ہو جا۔ پھر ساتھ ہی فرمایا۔ **فلیبلغ الشاھد الغائب**۔ جو حاضر ہو وہ یہ پیغام غائب کو پہنچادے (بخاری)۔

قرآن مجید کی تصریح سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ نے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف نازل فرمایا ہے وہ سب پہنچادیجئے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی ایسی تعمیل کی جس کی مثال نہیں ملتی آپ نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ بتاؤ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کی سپرد شدہ امانت پہنچادیں سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہنچادی اور حق ادا کیا اور سب نے وعدہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہم سب گواہی دیں گے کہ آپ نے سب کچھ پہنچادیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) نے فرمایا کہ جو کوئی شخص تم میں سے یہ بیان کرے کہ سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے نازل فرمودہ امور میں سے کچھ بھی چھپایا تو وہ جھوٹا ہے (بخاری، مسلم، معالم، ابن کثیر، مظہری وغیرہ)۔

مشہور شیعہ عالم شیخ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ اس آیت کے شان نزول کے متعلق لکھتے ہیں:

ابو جعفر اور ابو عبداللہ (علیہما السلام) نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف یہ وحی کی کہ آپ حضرت علی (رض) کو خلیفہ بنائیں تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خوف تھا کہ یہ معاملہ آپ کے اصحاب کی جماعت پر دشوار ہوگا۔ تب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہمت بڑھانے کے لیے یہ آیت نازل کی تاکہ آپ اللہ کے حکم پر عمل کریں۔ (التبیان 'ج ۳ ص ۵۸۸ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

بروز جمعرات '۱۸ ذوالحجہ ۱۰ھ کو حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر غدیر خم کے مقام پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلند آواز سے فرمایا تم تمام لوگوں میں مسلمانوں کے سب سے زیادہ لائق اور مستحق کون ہے؟ صحابہ نے کہا اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ میرا مولی ہے اور میں مسلمانوں کا مولی ہوں اور میں جس کا مولی ہوں 'علی اس کے مولی ہیں 'آپ نے اس جملہ کو تین چار بار دہرایا۔ پھر فرمایا اے اللہ! اس سے دوستی رکھ جو علی سے دوستی رکھے 'اور اس سے عداوت رکھ جو علی سے عداوت رکھے۔ اللہ! اس سے محبت رکھ جو علی سے محبت رکھے اور اس سے بغض رکھ جو علی سے بغض رکھے۔ پھر آپ نے فرمایا تمام حاضرین یہ پیغام غائبین کو پہنچادیں۔ (تفسیر نمونہ 'ج ۵ 'ص ۱۲۔۱۱ 'مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ 'طہران)

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہے 'کیونکہ ان کی شرط کے موافق اس کی روایت نہیں ہے۔ دیگر کتب حدیث میں یہ روایت ہے۔ بعض میں صرف اس قدر ہے کہ جس کا میں مولی ہوں 'اس کے علی مولی ہیں اور بعض میں یہ الفاظ بھی ہیں اے اللہ! اس سے دوستی رکھ جو علی سے دوستی رکھے 'اور اس سے عداوت رکھ جو علی سے عداوت رکھے۔ اور اس کے حوالہ جات حسب ذیل ہیں: (سنن ترمذی 'ج ۵ ' رقم الحدیث: '۳۷۳۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۲۱ 'سنن کبری للنسائی 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ۸۱۴۵ 'مسند احمد 'ج ۱ 'ص ۳۳۱۔

رقم الحدیث ' (کشف الاستار) ' مسند البزار ' طبع قدیم ' ۳۷۰۔ ۳۶۶۔ ۴۱۹ ص ۵ ' ج ۳ ' ۷۰ ۳ ' ۲۷ ص ' ج ۴ ' ۸۴۔ ۸۸۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۵۲

مسن ابویعلی ' رقم الحدیث : '۵۶۷۔ ۶۴۲۳ ' ۲۵۳۵۔ ۲۵۳۶۔ ۲۵۲۹۔ ۲۵۲۸۔ ۲۵۳۱۔ ۲۵۳۲۔ ۲۵۴۲۔ ۲۵۴۴۔ ۲۵۳۷۔ ۲۵۱۹ ' :

المعجم الکبیر ' ج ۳ ' رقم الحدیث : '۲۵۰۵۔ ۲۰۳۵ ' ج ۴ ' رقم الحدیث : '۴۰۵۲۔ ۳۵۱۴۔ ۳۵۱۵ ' ج ۵ ' رقم الحدیث : '۵۰۹۲۔ ۴۹۶۸۔

۴۹۹۶۔ ۵۱۲۸۔ ۴۹۸۵۔ ۵۰۶۷۔ ۳۵۱۴ ' ج ۱۹ ' رقم الحدیث : '۲۹۱ ' ج ۲۲ ' رقم الحدیث : '۱۳۵ ' المعجم الاوسط ' ج ۲ ' رقم الحدیث : '

۱۱۱۵ ' ۱۹۸۷ ' ۳۷۳۴ ' ج ۳ ' رقم الحدیث : '۲۲۷۵۔ ۲۱۳۱ ' مجمع الزوائد ' ج ۹ ص ۱۰۹۔ ۱۰۴ ' طبع قدیم)

علماء شیعہ یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں مولی بمعنی اولی ہے۔ یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس شخص پر اولی بالتصرف ہیں اس پر حضرت علی اولی بالتصرف ہیں اور جو شخص اولی بالتصرف ہو ' وہ امام معصوم ہوتا ہے اور اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت علی امام معصوم ہیں اور ان کی اطاعت فرض ہے ' اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) کو امام قرار دے دیا تو ان کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کی امامت صحیح نہیں۔

اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں :

(۱) لفظ مولی ولی سے ماخوذ ہے اور اہل تشیع کا استدلال اس پر موقوف ہے ' کہ اس حدیث میں ولی بمعنی اولی ہے۔ اس لیے ہم پہلے دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کے لغت میں کیا معنی ہیں۔ علامہ زبیدی نے قاموس کے حوالے سے ولی کے حسب ذیل معنی ذکر کیے ہیں :

(۱) محب۔ (۲) صدیق۔ (دوست)۔ (۳) نصیر۔ (۴) سلطان۔ (۵) مالک (۶) عبد (۷) آزاد کرنے والا (۸) آزاد کیا ہوا۔ (۹) قریب۔ (۱۰) مہمان۔ (۱۱) شریک۔ (۱۲) عصبہ۔ (۱۳) رب۔ (۱۴) منعم۔ (۱۵) تابع۔ (۱۶) سسرالی رشتہ دار۔ (۱۷) بھانجہ۔ (تاج العروس ' ج ۱۰ ' ص ۳۹۸۔ ۳۹۹)

ولی کے یہ تمام حقیقی معانی ہیں اور ولی کا معنی اولی بالتصرف نہیں ہے ' اس لیے یہاں مولی کے لفظ کو اولی بالتصرف پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا مولی ہے ' یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں شخص فلاں سے مولی ہے یعنی اولی ہے۔

(۲) بفرض محال اگر یہ مان لیا جائے کہ یہاں مولی بمعنی اولی ہے ' تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اولی بالامامۃ کے معنی میں ہو ' بلکہ یہ اولی بالاتباع اور اولی بالقرب کے معنی میں ہے ' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے (آیت) " اولی الناس ابراھیم للذین اتبعوہ (آل عمران : ٦٨) ابراہیم سے اولی بالقرب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہے۔

(۳) اگر یہ لفظ اولی بالامامۃ کے معنی میں بھی مان لیا جائے تو اس حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ جب حضور نے یہ فرمایا تھا۔ اس وقت حضرت علی اولی بالامامۃ تھے ' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی مال کے اعتبار سے اولی بالامامۃ ہیں ' یعنی جس وقت حضرت علی کی خلافت کا موقع ہوگا ' اس وقت وہی اولی بالامۃ ہوں گے ' اور خلفاء ثلاثہ کا ان سے پہلے خلیفہ اور امیر ہونا اس حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

(۴) اگر یہ حدیث حضرت علی (رض) کی خلافت پر نص ہوتی تو حضرت علی (رض) اس سے حضرت ابوبکر (رض) کی خلافت کے خلاف اپنی خلافت پر استدلال کرتے ' لیکن حضرت علی (رض) اور حضرت عباس (رض) میں سے کسی نے بھی اس حدیث سے استدلال نہیں کیا۔

(۵) مسند بزار میں ہے حضرت علی نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تو میں کسی کو کیسے اپنا خلیفہ بنا سکتا ہوں۔ اگر یہ حدیث حضرت علی (رض) کی خلافت پر نص ہوتی تو حضرت علی (رض) اس طرح نہ فرماتے۔

(٦) اس حدیث میں مولی دوست محب اور ناصر کے معنی میں ہے ' جیسا کہ اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں اے اللہ ! اس سے دوستی رکھ جو علی سے دوستی رکھے اور اس سے دشمنی رکھ جو علی سے دشمنی رکھے ' یہ دعا اس پر قرینہ ہے کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ کا معنی ہے میں جس کا دوست یا محب یا ناصر ہوں ' علی اس کے دوست یا محب یا ناصر ہیں۔

اہل تشیع کے اس اعتراض کے اور بھی متعدد جوابات ہیں ' لیکن ہم نے اختصار کے پیش نظر صرف انھی جوابات پر اکتفاء کی ہے۔ (تبیان)

اور جو حدیث قرطاس پیش کرتے ہیں :

حدیث قرطاس کا پس منظر اور مفہوم احادیث مبارکہ میں یوں ہے کہ :

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَوْمُ الْخَمِيسِ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ اشْتَدَّ بِرَسُولِ اللهِ وَجَعُهُ فَقَالَ ائْتُونِي أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا فَتَنَازَعُوا وَلَا يَنْبَغِي عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ فَقَالُوا مَا شَأْنُهُ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوهُ فَذَهَبُوا يَرُدُّونَ عَلَيْهِ فَقَالَ دَعُونِي فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونِي إِلَيْهِ وَأَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَأَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ أَوْ قَالَ فَنَسِيتُهَا.

''حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ جمعرات ! اور جمعرات کا روز کیا ہے؟ اس روز رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری شدت اختیار کر گئی تھی۔ آپ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لکھنے کی چیزیں لا کر دو تاکہ میں تمہیں ایسی تحریر لکھ دوں کہ میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو سکو۔ کچھ لوگ جھگڑنے لگے، حالانکہ نبی کی بارگاہ میں جھگڑنا مناسب نہ تھا۔ بعض حضرات کہنے لگے کہ شاید آپ بیماری کے باعث ایسا فرما رہے ہیں۔ پس انہوں نے دوبارہ جا کر دریافت کیا، تو فرمایا اس بات کو جانے دو۔ جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی جانب تم بلا رہے ہو، اور آپ نے انہیں تین باتوں کی وصیت فرمائی (1) مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا۔ (2) سفیروں کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک کرنا جیسے میں کرتا تھا۔ تیسری وصیت سے وہ خاموش ہو گئے یا فرمایا کہ میں بھول گیا۔''

بخاری، الصحیح، 4: 1612، الرقم: 4168، دار ابن کثیر، الیمامۃ، بیروت

دوسری روایت میں ہے :

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ لَمَّا حُضِرَ رَسُولُ اللهِ وَفِي الْبَيْتِ رِجَالٌ فَقَالَ النَّبِيُّ هَلُمُّوا أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ رَسُولَ اللهِ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَكُمُ الْقُرْآنُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ فَاخْتَلَفَ أَهْلُ الْبَيْتِ وَاخْتَصَمُوا فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ قَرِّبُوا يَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَمَّا أَكْثَرُوا اللَّغْوَ وَالِاخْتِلَافَ قَالَ رَسُولُ اللهِ قُومُوا قَالَ عُبَيْدُ اللهِ فَكَانَ يَقُولُ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللهِ وَبَيْنَ أَنْ يَكْتُبَ لَهُمْ ذَلِكَ الْكِتَابَ لِاخْتِلَافِهِمْ وَلَغَطِهِمْ.

''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا وقت قریب آیا تو کاشانہ رسالت میں کافی لوگ جمع تھے۔ اس وقت نبی کریم صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری نزدیک آ جاؤ۔ میں تمہیں ایک تحریر لکھ دیتا ہوں تاکہ میرے بعد تم گمراہی سے بچے رہو۔ بعض حضرات کہنے لگے کہ رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم شدتِ مرض کے باعث ایسا فرما رہے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم تمہارے پاس موجود ہے، تو ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ پس اہل بیت نے اس خیال سے اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔

بعض حضرات کہنے لگے کہ نزدیک جا کر تحریر لکھوالی جائے تاکہ ہم بعد میں گمراہی سے بچے رہیں، اور بعض حضرات نے کچھ اور رائے پیش کی۔ جب یہ بیکار اختلاف بڑھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ عبید اللہ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے کہ یہ کتنی بڑی مصیبت آپڑی تھی کہ بعض حضرات اختلاف اور بیکار گفتگو کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جس تحریر کو لکھنے کے لئے آپ فرماتے تھے، اس کے درمیان حائل ہو گئے"۔

بخاری، الصحیح، 4:1612، الرقم:4169

تیسری روایت مسند امام احمد بن حنبل کی ہے

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ عَنْ يُونُسَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ كَعْبٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ عَلِيٌّ مِنْ عِنْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ فَقَالُوا كَيْفَ أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا حَسَنٍ فَقَالَ أَصْبَحَ بِحَمْدِ اللَّهِ بَارِئًا فَقَالَ الْعَبَّاسُ أَلَا تَرَى إِنِّي لَأَرَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيُتَوَفَّى مِنْ وَجَعِهِ وَإِنِّي لَأَعْرِفُ فِي وُجُوهِ بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ الْمَوْتَ فَانْطَلِقْ بِنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْنُكَلِّمْهُ فَإِنْ كَانَ الْأَمْرُ فِينَا بَيَّنَهُ وَإِنْ كَانَ فِي غَيْرِنَا كَلَّمْنَاهُ وَأَوْصَى بِنَا فَقَالَ عَلِيٌّ إِنْ قَالَ الْأَمْرُ فِي غَيْرِنَا فَلَمْ يُعْطِنَاهُ النَّاسُ أَبَدًا وَإِنِّي وَاللَّهِ لَا أُكَلِّمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا أَبَدًا (مسند احمد: جلد دوم: حدیث نمبر 1102 حدیث متفق علیہ)

حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مرض الوفات کے زمانے میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہاں سے باہر نکلے تو لوگوں نے پوچھا ابو الحسن! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیسے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ اب تو صبح سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الحمد للہ ٹھیک ہیں، حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ اس پر حضرت ابن عباس (رض) نے حضرت علی (رض) کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا تم دیکھ نہیں رہے؟ بخدا! اس بیماری سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (جانبر نہ ہو سکیں گے) اور وصال فرما جائیں گے، میں بنو عبد المطلب کے چہروں پر موت کے وقت طاری ہونے والی کیفیت کو پہچانتا ہوں، اس لیے آؤ، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس چلتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کے بعد خلافت کسے ملے گی؟ اگر ہم ہی میں ہوئی تو ہمیں اس کا علم ہو جائے گا اور اگر ہمارے علاوہ کسی اور میں ہوئی تو ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بات کر لیں گے تاکہ وہ ہمارے متعلق آنے والے خلیفہ کو وصیت فرما دیں، حضرت علی (رض) نے فرمایا اللہ کی قسم! اگر ہم نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کی درخواست کی اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہماری درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا تو لوگ کبھی بھی ہمیں خلافت نہیں دیں گے، اس لیے میں تو کبھی بھی ان سے درخواست نہیں کروں گا۔

یہاں چند باتیں قابل غور ہیں رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض وصال میں جمعرات کے دن کاغذ و قلم مانگا اس کے بعد پانچویں دن یعنی بروز سوموار آپ کا وصال ہوا اگر یہ تحریر لکھنا ضروری ہوتا تو اتنے وقفہ میں کسی بھی وقت لکھ سکتے تھے، مگر ایسا نہیں ہوا۔

آپ نے کاغذ قلم اہل بیت سے مانگا تھا تو وہ لاتے، اس میں شور و غل کی کیا ضرورت تھی؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیش کرتیں، ازواج مطہرات پیش کرتیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ یا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ لاتے۔ ان میں سے بعض حضرات نے قلم کاغذ لانے کی بجائے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا، جس سے سرکار صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراض ہو کر فرمایا "اٹھ کر چلے جاؤ"۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے، حضور صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر

برستے ہیں کہ انہوں نے رکاوٹ کیوں ڈالی؟ جواب یہ ہے کہ گھر والے یعنی حضرت علی، حضرت عباس، سیدہ فاطمہ یا امہات المؤمنین میں سے کوئی قلم کاغذ لے آتا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کوئی اور مزاحمت کرتا تو اس کے خلاف فرد جرم عائد کرتے۔ نہ اہل خانہ قلم کاغذ لائے، نہ کسی نے رکاوٹ ڈالی پھر الزام کیسا؟ کسی بھی گھر کا بزرگ ترین یا عام فرد شدید بیمار ہو مرض موت میں کسی چیز کا مطالبہ کرے مثلاً پانی پلاؤ!۔ دوائی لاؤ! فلاں کو بلاؤ! کھانا کھلاؤ! ہسپتال لے جاؤ! ڈاکٹر کو بلاؤ! وغیرہ تو یہ مطالبہ بیمار پرسی کرنیوالوں سے نہیں اہل خانہ سے ہوتا ہے گھر والے عمل کریں، یا نہ کریں ان پر منحصر ہے۔

حضور کیا لکھوانا چاہتے تھے؟

عَنْ سُلَيْمَانَ الْأَحْوَلِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَوْمُ الْخَمِيسِ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ ثُمَّ بَكَى حَتَّى بَلَّ دَمْعُهُ الْحَصَى فَقُلْتُ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ قَالَ اشْتَدَّ بِرَسُولِ اللهِ وَجَعُهُ فَقَالَ ائْتُونِي أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدِي فَتَنَازَعُوا وَمَا يَنْبَغِي عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ وَقَالُوا مَا شَأْنُهُ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوهُ قَالَ دَعُونِي فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ أُوصِيكُمْ بِثَلَاثٍ أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَأَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ قَالَ وَسَكَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ أَوْ قَالَهَا فَأُنْسِيتُهَا.

”سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بیان کیا کہ جمعرات کا دن بھی کس قدر ہولناک دن تھا، جمعرات کا دن! پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قدر روئے کہ ان کے آنسوؤں سے کنکریاں تر ہو گئیں۔ میں نے کہا اے ابن عباس! جمعرات کے دن کیا واقعہ ہوا تھا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درد زیادہ ہو گیا تھا۔ آپ نے فرمایا قلم اور کاغذ لاؤ، میں تم کو ایسی چیز لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے (قلم اور کاغذ کے متعلق) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور نبی کے پاس اختلاف مناسب نہیں تھا۔ صحابہ نے کہا کیا سبب ہے؟ کیا آپ الوداع ہو رہے ہیں؟ آپ سے پوچھو! آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو، میں جس حال میں ہوں وہ بہتر ہے۔ میں تم کو تین چیزوں کی وصیت کر رہا ہوں، مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو، وفود کی اس طرح عزت کیا کرو جس طرح میں عزت کرتا ہوں، تیسری بات سے حضرت ابن عباس خاموش ہو گئے یا انہوں نے بیان کی تھی اور میں بھول گیا“۔

مسلم، الصحیح، 3: 1257، الرقم: 1637، دار احیاء التراث العربی، بیروت

اور کیا لکھوانا چاہتے تھے؟

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ قَالَ سَمِعْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ قَالَ قَالَتْ عَائِشَةُ وَا رَأْسَاهْ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ذَاكِ لَوْ كَانَ وَأَنَا حَيٌّ فَأَسْتَغْفِرَ لَكِ وَأَدْعُوَ لَكِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ وَا ثُكْلِيَاهْ وَاللهِ إِنِّي لَأَظُنُّكَ تُحِبُّ مَوْتِي وَلَوْ كَانَ ذَاكَ لَظَلِلْتَ آخِرَ يَوْمِكَ مُعَرِّسًا بِبَعْضِ أَزْوَاجِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ بَلْ أَنَا وَا رَأْسَاهْ لَقَدْ هَمَمْتُ أَوْ أَرَدْتُ أَنْ أُرْسِلَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَابْنِهِ وَأَعْهَدَ أَنْ يَقُولَ الْقَائِلُونَ أَوْ يَتَمَنَّى الْمُتَمَنُّونَ ثُمَّ قُلْتُ يَأْبَى اللهُ وَيَدْفَعُ الْمُؤْمِنُونَ أَوْ يَدْفَعُ اللهُ وَيَأْبَى الْمُؤْمِنُونَ.

”قاسم بن محمد کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہائے سر پھٹا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کاش! میری زندگی میں ایسا ہو جاتا تو میں تمہارے لیے استغفار کرتا اور دعا مانگتا۔ حضرت عائشہ عرض گزار ہوئیں: ہائے مصیبت! خدا کی قسم! کیا میں گمان کروں کہ آپ میری موت چاہتے ہیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو آپ دوسرا دن اپنی کسی دوسری بیوی کے پاس گزاریں گے۔ اسی پر

حضور نبی اکرم صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلکہ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ لہٰذا میرا فیصلہ ہوا یا میں نے ارادہ کیا کہ ابو بکر اور ان کے صاحبزادے کو بلا بھیجوں اور ان سے عہدِ خلافت لوں ورنہ کہنے والے جو چاہیں کہیں گے اور خواہش کرنے والے خواہش کریں گے۔ پھر میں نے کہا (کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ اس کے خلاف نہیں چاہتا اور مسلمان اس کی مخالفت کو ہٹا دیں گے یا اللہ مخالف کو ہٹا دے گا اور مسلمان کسی دوسرے کو قبول نہیں کریں گے"۔

(بخاری، الصحیح، 5:2145، الرقم: 5342)

خلاصہ کلام

رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری بیماری میں قلم کاغذ منگوائے۔ حاضرین میں سے بعض نے لانے کو کہا بعض نے اس وقت لانا مناسب نہ سمجھا اس بحث مباحثہ میں آوازیں بلند ہوئیں سرکار نے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیکر سب کو خاموش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمیں کتاب اللہ (القرآن) کافی ہے، بعض صحابہ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر یہ طرز عمل بہت ناگوار گزرا مگر قلم کاغذ کسی نے پیش نہیں کیا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت آپ کو تکلیف دینے کو مناسب نہ سمجھا گیا اس کے بعد پانچ دن حضور صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم حیات رہے مگر دوبارہ قلم کاغذ نہ مانگا جس کا مطلب ہے کہ تحریر ضروری نہ تھی جو فرمانا تھا آخر وقت تک فرماتے رہے۔ امت نے اس کو سنا سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ اگر یہ تحریر لازمی ہوتی تو حضور صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے نبی ہیں کسی کے ماننے یا انکار کی پرواہ کئے بغیر لکھوا سکتے تھے۔ کسی کی مجال تھی کہ رکاوٹ ڈالتا؟ جب ساری دنیا مخالف اور دشمن تھی، اس وقت تو سرکار صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کی اب تو سارے جان قربان کرنے والے فدائی تھے، کس کی جرات تھی کہ حضور صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادے میں حائل ہوتا؟ یہ ہے حدیث قرطاس کا پس منظر اور مفہوم۔ (ورلڈ اسلامک مشن)

واللہ اعلم ورسولہ

دراصل یہ روافض شیعوں کا حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تہمت اور افتراء ہے:

روافض گر زند طعنہ بہ یار غار پیغمبر۔ مکن عیبش کہ اولعنت ز میراث پدر دارد۔ (احمد علی)

یہ تو قرآن حدیث کی تصریحات ہیں لیکن کچھ منکرین رسالت ایسے ہیں جن کا یہ جاہلانہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا تھا کہ اپنے بعد حضرت علی (رض) کی خلافت کا اعلان فرمادیں لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو بکر و حضرت عمر (رض) کے ڈر سے اعلان نہیں فرمایا ان لوگوں کا بے سروپا جھوٹا دعوی ہے اور صاحب اہل بیت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا خلاف کیا اور اللہ تعالیٰ کا صحیح حکم نہیں پہنچایا۔ یہ لوگ صرف 45 صحابہ کرام کو مومن سمجھتے ہیں ان کے علاوہ تمام صحابہ کرام کو کافر کہتے ہیں اور حضرت جبریل امین (علیہ السلام) کو وحی پہنچانے کے سلسلے میں خائن سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہاں سے غلطی ہو سکتی ہے اور اس سے علم غیب کی نفی کرتے ہیں یعنی "بدا" اور قرآن مجید کی تحریف کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور موجودہ قرآن کو تسلیم بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اصل قرآن ایک غار میں چھپا ہوا ہے جس میں 17

ہزار آیتیں ہیں اور وہ غار "سر من رای "ہے جو عراق میں ہے اور وہ ابوطالب کو نبی تسلیم کرتے ہیں اور حضرت علی (رض) کو کبھی خدا کہتے ہیں کبھی پیغمبر اور ان کی موت کے قائل نہیں بارش میں گرج کی آواز کو حضرت علی (رض) کی آواز کہتے ہیں اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امین بھی تسلیم نہیں کرتے ہیں اور ازواج مطہرات کے بارے میں بہت گندے عقائد رکھتے ہیں تو یہ ایک عجیب دھوکا اور فریب ہے کہ اہل بیت سے محبت ہو اور جس ذات والا صفات کی وجہ سے اہل بیت سے محبت ہوئی اس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ منصب رسالت کی ذمہ داری اس نے پوری نہیں کی (العیاذ باللہ) یہ کتنے اور کیسے خرافات ہیں۔ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں یہ عقیدہ ایک کافر مجاہر کا شاید ہو سکتا ہے مگر کسی مدعی ایمان کا نہیں ہو سکتا اگر کسی کا یہی عقیدہ ہو تو وہ بالاتفاق کافر ہے جب اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخلوق سے ڈر جائیں اور احکام الٰہیہ کو چھپائے اور "فاصدع بما تومر "کی خلاف ورزی کریں تو پھر کون حق کو قائم کرے گا حیرت ہے ان لوگوں پر کہ جس رسول کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا "واللہ یعصمک من الناس "فرما کر حفاظت کی ضمانت دے دی اس رسول کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر (رض) کے ڈر سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کا حکم چھپایا اور پھر ایسے دو شخصوں کا نام لیتے ہیں جنہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کیا اور پوری زندگی اطاعت و خدمت گزاری میں صرف کی پوری جماعت صحابہ کرام میں ان کی خدمات فرمانبرداری قربانی ضرب المثل ہے انہوں نے زندگی بھر ایک ادنی ذرا جتنا خلاف نبوت کوئی کام انجام نہ دیا اور خود سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں ان کے جنتی ہونے کا اعلان ہوا اور ان کی مقدس پاکیزہ بیٹیوں سے اللہ تعالیٰ کے حکم فرمان کے ساتھ نکاح کیا اور ان دونوں کو اپنا وزیر بنایا اور انہیں اپنی خوابگاہ قبر شریف میں رفیق بنایا اور مرض وفات میں پوری جماعت صحابہ کو وصیت کی کہ میرے بعد ہر بات میں ان دونوں کی اقتداء اور تابعداری کرو وغیرہ۔

ع۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اس وعدہ پر آپ کو بھروسہ نہیں تھا (العیاذ باللہ) ایک ادنی مومن بھی اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ رکھتا ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو سچ نہ سمجھا ہو اور لوگوں سے ڈرتا ہو ؟ اور پھر عجیب بات ہے کہ جن کی خلافت بلا فصل کے یہ لوگ مدعی ہیں جب 26 سال کے بعد انہیں خلافت ملی تو انہوں نے تو یہ نہ کہا کہ میں خلیفہ بلا فصل تھا مجھ سے خلافت چھین لی گئی یہ ان کے مدعی سست گواہ چست حمایتی (شیعہ) ان کو بھی مطعون کرتے ہیں کہ باوجود شجاع اور بہادر ہونے کے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر (رض) سے ڈرتے رہے اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے اور ان کے مشوروں اور محفلوں میں شریک ہوتے رہے اللہ تعالیٰ ان جھوٹے حمائیتیوں کے عقائد اور مکائد اور کافرانہ خیالات و خرافات سے عالم اسلام کو محفوظ رکھے۔ "ولقد صدق اللہ تعالیٰ حیث قال : "ان اللہ لا یھدی القوم الکفرین "کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت کی راہ نہ دکھائے گا۔ (منازل)

آیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف احکام شرعیہ کی تبلیغ پر مامور تھے ' یا اپنے تمام علوم کی تبلیغ پر؟

علماء کرام نے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو کچھ بھی وحی کی تھی 'خواہ وہ وحی جلی ہو یا خفی 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ سب امت تک پہنچا دی یا کچھ علوم ایسے تھے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص تھے۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

بعض صوفیاء سے منقول ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جو احکام بندوں کی مصلحت سے متعلق ہیں 'ان کی تبلیغ آپ پر ضروری ہے اور جن آیات سے مقصود بندوں کو اطلا پہنچانا ضروری ہے 'ان کو بندوں تک پہنچانا ضروری نہیں ہے 'بلکہ اس کا ان سے چھپانا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "فاوحی الی عبدہ ما اوحی"۔ (النجم: ۱۰)

ترجمہ: سو وحی فرمائی اپنے عبد مقدس کو جو وحی فرمائی۔

حضرت جعفر (رض) نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب پر بلاواسطہ ایک راز کی وحی فرمائی اور اس راز کو آپ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کا آخرت میں پتا چلے گا۔ جب آپ اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے اور علامہ واسطی نے کہا اللہ نے اپنے عبد مکرم کی طرف القاء کیا جو القاء کیا اور اس کو بالکل ظاہر نہیں کیا 'کیونکہ اللہ سبحانہ نے اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص رکھا ہے اور جس چیز کو آپ کے ساتھ مخصوص رکھا ہے 'وہ مستور ہے اور جس چیز کے ساتھ آپ کو مخلوق کی طرف مبعوث کیا ہے 'وہ ظاہر ہے اور صوفیاء اس کو اسرار الہیہ اور حقیقت کا علم کہتے ہیں۔

علامہ آلوسی اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صوفیاء نے اس مسئلہ میں بہت طویل کلام کیا ہے 'لیکن میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس احکام شرعیہ اور اسرار الہیہ کا جو بھی علم تھا 'وہ سب قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء"۔ (النحل: ۸۹)

ترجمہ: ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

(آیت) "ما فرطنا فی الکتاب من شیء"۔ (الانعام: ۳۸)

ترجمہ: ہم نے کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔

اور امام ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: عنقریب فتنے ہوں گے۔ آپ سے پوچھا گیا ان سے نکلنے کی کون سے جگہ ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں تم سے پہلے اور تمہارے بعد کے لوگوں کی خبریں ہیں اور تمہارے

متعلق احکام ہیں اور اما ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر علم کو نازل کیا گیا ہے اور ہمارے متعلق ہر چیز کا بیان کیا گیا ہے لیکن ان کو قرآن کریم سے حاصل کرنے سے ہمارا علم قاصر ہے 'اور امام شافعی رحمۃ اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس قدر احکام دیئے ہیں 'آپ نے ان سب کو قرآن سے مستنبط کیا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے امام طبرانی نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اسی چیز کو حلال کرتا ہوں جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور اسی چیز کو حرام کرتا ہوں 'جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے۔ (المعجم الاوسط 'ج ۶ 'رقم الحدیث : ۵۷۳۷ 'سنن کبری للبیہقی 'ج ۷ 'ص ۷۵)

علامہ مرسی نے کہا کہ قرآن مجید میں تمام اولین اور آخرین کے علوم جمع ہیں اور اس کا حقیقی احاطہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا ہے 'ماسوا ان علوم کے جن کو اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اپنے ساتھ خاص کرلیا ہے۔ پھر معظم سادات صحابہ کرام ان علوم کے وارث ہوئے 'مثلا خلفاء اربعہ اور حضرت ابن مسعود (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) پھر صحابہ کرام (رض) کے بعد تابعین عظام ان علوم کے وارث ہوئے 'پھر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی ہمتیں اور ان کے درجات کم ہوتے گئے اور افاضل صحابہ اور اخیار تابعین جن علوم کے حامل تھے 'بعد کے مسلمان وہ مقام حاصل نہ کرسکے۔

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ تمام علوم اور معارف قرآن مجید میں موجود ہیں 'تو قرآن مجید کی تبلیغ ان تمام علوم و معارف کی تبلیغ ہے 'زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ہر نکتہ 'ہر ہر راز اور ہر ہر حکم تفصیل کے ساتھ ہر ہر شخص کے لیے قرآن مجید کی صریح عبارت سے ظاہر نہیں ہے اور جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ کچھ ایسے اسرار ہیں جو قرآن مجید سے خارج ہیں اور ان کو صوفیہ نے براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا ہے 'تو یہ صریح جھوٹ ہے۔ علامہ قسطلانی نے کہا کہ عالم دین کا اپنی فہم سے قرآن مجید سے اسرار اور حکمتوں اور احکام کا استخراج کرنا جائز ہے 'بشرطیکہ وہ اصول شریعت کے موافق ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ صوفیاء کا کلام بھی اسی اعتبار سے ہے۔ البتہ ان کی بعض عبارات ظاہر شریعت کے مخالف ہوتی ہیں اور حضرت علی (رض) نے فرمایا ہے لوگوں سے ان کے عرف کے مطابق بات کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی جائے۔ (صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۲۷) ہمارے موقف کے قریب یہ حدیث ہے۔

ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ عترہ سے روایت کیا ہے کہ میں حضرت ابن عباس (رض) کے پاس بیٹھا ہوا تھا 'کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا ہم سے لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی خاص علم ہے جس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں سے بیان نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اے رسول ! آپ پر جو آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے 'اس کو پہنچا دیجئے۔ بخدا ہم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (قرآن مجید کے سوا) کسی تحریر کا وارث نہیں کیا 'اور امام بخاری نے ابو جحیفہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت علی (رض) سے پوچھا کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے ؟ فرمایا نہیں ! صرف کتاب اللہ ہے 'یا وہ فہم ہے جو ہر مسلمان شخص کو دی گئی ہے 'یا جو اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے پوچھا اس صحیفہ میں کیا ہے ؟ فرمایا : دیت کے احکام ہیں اور قیدیوں کو چھڑانے کے اور یہ کہ مسلمانوں کو کافر (حربی) کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۱۱)

خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاء کی جو عبارات قرآن وسنت کے موافق ہیں 'وہ مقبول ہیں اور جو عبارات کتاب وسنت کے خلاف ہیں 'وہ مردود ہیں ' اور یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو کتاب وسنت سے ایسے اسرار اور احکام مستنبط کرنے کی فہم عطافرمائے جو ان سے پہلے مفسرین 'فقہاء اور مجتہدین نے مستنبط نہ کیے ہوں 'اور جب آیات اور احادیث سے ائمہ اربعہ کے اجتہاد اور استنباط کو مان لیا گیا ہے 'حالانکہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو بعد کے علماء کے لیے یہ کیوں جائز نہیں ہے ؟کہ وہ کتاب اور سنت سے ایسے مسائل اور حکمتیں مستنبط کریں ' جو ائمہ اربعہ نے نہ مستنبط کیے ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ استخراج اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔ (روح المعانی ج ٦ ص '١٩٢۔ ١٨٩ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

نبی کریم ﷺ کے علم کی تین قسمیں

علامہ سید محمود آلوسی کے اس کلام کی متانت اور ثقاہت میں ہمیں کلام نہیں ہے 'لیکن دلائل صحیحہ کی روشنی میں بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صرف احکام شرعیہ کی تبلیغ واجب تھی 'اور تمام علوم کی تبلیغ آپ پر واجب نہیں تھی۔ بعض علوم ایسے تھے جو آپ نے سب کو نہیں بتلائے بلکہ جو ان کے اہل تھے 'ان کو بتلا دیئے اور بعض علوم ایسے تھے 'جو آپ نے کسی کو نہیں بتلائے 'وہ صرف آپ کی ذات مقدسہ کے ساتھ مختص تھے گویا آپ کے علوم کی تین قسمیں ہیں :

شیخ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ١٠٥٢ھ لکھتے ہیں

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھ سے میرے پروردگار نے کوئی چیز پوچھی جس کا جواب میں نہیں دے سکا 'تب اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا 'جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی 'پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اولین اور آخرین کا علم عطافرمادیا اور مجھے کئی اقسام کا علم عطافرمایا۔ ایک علم کی وہ قسم تھی جس کے متعلق مجھے عہد لیا کہ میں کسی کو اس پر مطلع نہیں کروں گا اور میرے علاوہ اور کوئی شخص اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ دوسری علم کی وہ قسم تھی جس کو ظاہر کرنے یا پوشیدہ رکھنے کا مجھے اختیار عطافرمایا اور تیسری علم کی وہ قسم تھی جس کے متعلق مجھے حکم دیا کہ میں امت کے ہر خاص وعام کو اس کی تبلیغ کروں۔ (مدارج النبوت 'ج ا ص ١٦٨ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ 'سکھر '١٣٩٧ھ)

وہ علم جس کو تمام امت تک پہنچانا آپ پر فرض ہے۔

جن علوم کی امت کے ہر خاص وعام کو تبلیغ واجب ہے 'ان کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے اور زیر بحث آیت میں آپ کو ان ہی کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ نے قرآن مجید کی تمام آیات کا پہنچایا اور احادیث میں ان کی وضاحت فرمائی۔ زیر بحث آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں آپ کو احکام شرعیہ کی تبلیغ کا حکم دیا ہے۔

قاضی عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ٦٨٥ھ لکھتے ہیں :

اس آیت کاظاہر معنی یہ ہے کہ ہر جو چیز نازل ہوئی اس کی تبلیغ واجب ہے ' اور شاید اس سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کے ساتھ بندوں کی مصلحتیں متعلق ہوں ' اس کی تبلیغ واجب ہے اور اس کے نازل کرنے سے مقصود ان کو مطلع کرنا ہو ' کیونکہ بعض اسرار الٰہیہ کا افشاء کرنا حرام ہے۔ (انوار التنزیل ' الکازرونی ' ج ۲ ' ص ۳۴۸ ' مبطوعہ دارالفکر ' بیروت)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کے حکم کا تعلق دین اور بندوں کی مصلحتوں کے ساتھ ہے ' اور آپ کو انھیں مطلع کرنے کا حکم دیا گیا ہے ' اور جو اسرار نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہیں ' ان کا حکم نہیں ہے۔ جیسا کہ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو قسم کے علوم محفوظ کیے۔ ایک علم کو تو میں نے لوگوں میں پھیلا دیا ' اور اگر دوسرے علم کو میں پھیلاؤں تو یہ نرخرہ کاٹ دیا جائے گا۔ (صحیح البخاری ' ج ' ۳ ' ص ۳۶۴ ' ۳۶۳ ' مطبوعہ دار صادر ' بیروت)

علامہ ابوالسعود محمد عمادی حنفی متوفی ۹۸۲ ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

آپ پر جس قدر بھی احکام نازل کیے گئے ہیں ' ان کو پہنچا دیجئے ' کیونکہ جن امور کا تعلق احکام سے بالکل نہیں ہے جیسے اسرار خفیہ ان کی لوگوں کو تبلیغ کرنا مقصود نہیں ہے۔ (تفسیر ابی السعود علی ھامش الکبیر ' ج ۴ ' ص ۷ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۳۹۸ ھ)

علامہ سلیمان بن عمر الجمل متوفی ۱۲۰۴ ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

جو امور احکام سے متعلق ہیں ان کو پہنچا دیجئے۔ کیونکہ جو اسرار آپ کے ساتھ خاص کر دیجئے۔ کیونکہ جو اسرار آپ کے ساتھ خاص کر دیئے گئے ہیں ' ان کی تبلیغ کرنا آپ کے لیے جائز نہیں ہے۔ (حاشیۃ الجمل علی الجلالین ' ج ا ص ۵۱۰ ' مطبوعہ قدیمی کتب خانہ ' کراچی)

وہ علم جس کی تبلیغ میں آپ ﷺ کو اختیار ہے

علامہ طاہر بن عاشور متوفی ۱۳۸۰ ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کبھی بعض لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ بعض ایسے علوم سے مطلع فرماتے جن کا تعلق احکام شرعیہ کے ساتھ نہیں ہوتا تھا ' اور بعض اصحاب کو کسی راز سے مطلع فرماتے تھے ' جیسے آپ نے صرف حضرت سیدہ فاطمہ (رض) کو یہ راز بتلایا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل میں سے سب سے پہلے وہ آپ کے ساتھ آپ کے وصال کے بعد لاحق ہوں گی۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۳۶۲۳) اور حضرت ابوبکر (رض) کو اس راز سے مطلع کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کی اجازت دے دی ہے (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۳۹۰۵) اور حضرت حذیفہ (رض) کو اس راز سے مطلع کیا کہ خارجی حضرت عثمان (رض) کو شہید کردیں گے ' جیسا کہ حضرت حذیفہ نے حضرت عمر (رض) کو بتایا تھا۔ (صحیح البخاری : رقم الحدیث : ۵۲۵) اور جیسا کہ حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو قسم کے علوم حاصل کیے ہیں۔ ایک علم تو انھوں نے پھیلا دیا اور دوسرا علم اگر وہ پھیلا دیں تو ان کی رگ جاں کاٹ دی جائے گی۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۱۲۰) اور یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مرض وفات میں کچھ لکھوانا چاہا اور پھر لکھوانے سے اعراض کرلیا۔ (صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۱۱۴) تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق احکام شرعیہ سے نہیں تھا ' کیونکہ اگر اس کا تعلق احکام شرعیہ سے ہوتا تو آپ اس کو لکھوانے سے کبھی اعراض نہ فرماتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہے

اے رسول ! جو آپ نے اپنے رب کا پیغام نہیں پہنچایا۔ (المائدہ : ٦٧) اور حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا جو شخص تم سے یہ کہے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی ایسی چیز کو چھپالیا جو آپ پر نازل کی گئی تھی تو اس نے جھوٹ بولا (صحیح البخاری ' رقم الحدیث ٤٨٥٥ ' التحریر والتنویر ' جز سادس ' ص ٢٦٠)

جن علوم کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اختیار دیا گیا تھا کہ جس کو چاہیں مطلع فرمائیں اور جس کو چاہیں نہ مطلع فرمائیں ان میں سے بعض کا ذکر احادیث کے حوالہ سے علامہ ابن عاشور کی تحریر میں آگیا ہے ' اور اسی سلسلہ میں ایک حدیث یہ ہے :

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک سواری پر حضرت معاذ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا اے معاذ بن جبل انھوں نے کہا لبیک یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! میں حاضر ہوں (یہ مکالمہ تین بار ہوا) آپ نے فرمایا جو شخص بھی صدق دل سے " لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ "۔ کی گواہی دے ' اللہ اس کو دوزخ پر حرام کر دے گا۔ حضرت معاذ نے کہا یا رسول اللہ ! کیا میں لوگوں کو یہ خبر نہ سناؤں کہ وہ خوش ہو جائیں ! آپ نے فرمایا پھر لوگ اسی پر تکیہ کرلیں گے پھر حضرت معاذ (رض) نے موت کے وقت گناہ سے بچنے کے لیے (تاکہ علم کا چھپانا لازم نہ آئے) یہ حدیث بیان کردی۔ (صحیح البخاری ' ج ا رقم الحدیث : ١٢٨)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھے بتایا گیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ (رض) سے فرمایا : جس شخص نے اللہ سے اس حال میں ملاقات کی کہ اس نے اللہ کے ساتھ بالکل شرک نہ کیا ہو ' وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔ حضرت معاذ نے پوچھا میں لوگوں کو یہ خوش خبری نہ سنادوں ؟ آپ نے فرمایا نہیں ! مجھے خدشہ ہے کہ پھر لوگ اسی پر تکیہ کرلیں گے۔ (صحیح البخاری ' ج ا رقم الحدیث : ١٢٩)

قرآن مجید میں بھی اس سلسلہ کی ایک نظیر ہے

(آیت) " واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلما نبات بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعراض عن بعض فلما نباھا بہ قالت من انباک ھذا قال نبانی العلیم الخبیر "۔ (التحریم : ٣)

ترجمہ : اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے ایک راز کی بات فرمائی پھر جب انھوں نے اس راز کا (کسی سے) ذکر کردیا اور اللہ نے نبی پر اس کا اظہار فرمادیا ' تو نبی نے انھیں کچھ جتادیا اور کچھ بتانے سے اعراض فرمایا۔ پھر جب نبی نے انھیں اس کی خبر دی ' تو وہ کہنے لگیں آپ کو اس کی کس نے خبر دی ؟ آپ نے فرمایا مجھے بہت علم والے نہایت خبر رکھنے والے نے خبر دی۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

امام ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس (رض) سے اور امام ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حفصہ (رض) سے یہ راز بیان کیا کہ آپ نے اپنے اوپر حضرت ماریہ کو حرام کرلیا ہے۔ (بعض روایات میں شہد کے حرام کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے مراد شرعی حرام نہیں ہے ' بلکہ قسم کھانا مراد ہے) اور یہ فرمایا کہ آپ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رض) خلیفہ ہوں گے۔ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ (رض) کو بتادیا تب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حفصہ سے فرمایا کہ تم

نے ماریہ کے حرام کرنے کو افشاء کر دیا ہے اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رض) کی خلافت کے راز کو افشاء کرنے سے آپ نے اعراض فرمایا ' تاکہ وہ مزید شرمندہ نہ ہوں اور امام ابو نعیم اور امام ابن مردویہ نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے والد اور عائشہ کے والد میرے بعد خلیفہ ہوں گے ' سو تم یہ راز کسی کو بتانے سے اجتناب کرنا۔ (روح المعانی ج ۲۸ ' ص ' ۱۵۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

ہم نے باحوالہ دلائل سے یہ بیان کر دیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم کی ایک وہ قسم تھی جس کی ہر خاص وعام پر تبلیغ کرنا آپ پر فرض تھا ' یہ قرآن مجید کی تمام آیات ہیں اور وہ احادیث ہیں جن کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے اور آپ کے علم کی دوسری قسم وہ ہے جس میں آپ کو اختیار تھا کہ آپ جس کو چاہیں ' بیان فرمائیں۔ اس پر بھی ہم نے باحوالہ بیان کر دیئے ہیں۔ اب رہی تیسری قسم ' یعنی وہ علم جو آپ کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کا اخفاء آپ پر واجب ہے ' اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

وہ علم جس کا اخفاء آپ ﷺ پر واجب ہے

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے متشابہات کا علم عطا فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو یہ علم عطا نہیں فرمایا۔ فقہاء احناف کا یہی مذہب ہے اور سلف صالحین کا بھی یہی مذہب تھا کہ آیات متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ کر لیا ہے ' یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا اور کسی کو نہیں عطا فرمایا۔

ملا جیون متشابہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

متشابہ اس چیز کا اسم ہے جس کی معرفت کی امید منقطع ہو اور اس کے ظاہر ہونے کی اصلا امید نہ ہو۔ وہ غایت خفا میں ہوتا ہے ' اور محکم کی ضد ہے جو غایت ظہور میں ہوتا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس لفظ سے جو مراد ہے ' وہ حق ہے۔ اگرچہ ہم کو قیامت سے پہلے یہ پتا نہیں چلے گا کہ اس لفظ متشابہ سے کیا مراد ہے اور قیامت کے بعد اس کی مراد انشاء اللہ ہر شخص پر منکشف ہو جائے گی اور یہ حکم امت کے حق میں ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حق میں یہ اعتقاد ہے کہ آپ کو لفظ متشابہ کی مراد قطعاً معلوم ہو ' ورنہ آپ سے اس کے ساتھ خطاب کا فائدہ باطل ہو جائے گا اور یہ ایسا ہو گا جیسے لفظ مہمل کے ساتھ خطاب کیا جائے یا کسی عربی کے ساتھ حبشی میں گفتگو کی جائے۔ (انور الانوار ' ص ۹۳ ' مطبوعہ سعید اینڈ کمپنی ' کراچی)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اور یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (علیہ الصلوۃ والسلام) کو وقت وقوع قیامت کی کامل اطلاع دی ہو مگر اس طریقہ سے نہیں کہ آپ اللہ کے علم کی حکایت کریں ' ہاں مگر اللہ سبحانہ نے کسی حکمت کی وجہ سے آپ پر اس علم کا اخفاء واجب کر دیا ہے اور یہ علم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خواص میں سے ہے ' لیکن میرے نزدیک اس پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ (روح المعانی ج ۲۱ ص ' ۱۱۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت میں یہ دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو روح کی حقیقت پر مطلع نہیں فرمایا ' بلکہ یہ جائز ہے کہ آپ کو روح کی حقیقت پر مطلع فرمایا ہو اور آپ کو لوگوں کو اطلاع دینے کا حکم نہ دیا ہو ' اور علم قیامت کے متعلق بھی انھوں نے اسی طرح کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۴۰۳ ' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ ' لاہور ۱۴۰۱ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امور خمسہ (قیامت ' بارش ہونے ' ماں کے پیٹ ' کل کیا ہوگا ' اور کون کہاں مرے گا) کا علم دیا گیا ہے اور وقت وقوع قیامت اور روح کا علم بھی دیا گیا ہے ' لیکن آپ کو ان کے مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (خصائص کبری ' ج ۳ ' ص ۱۶۰ ' طبع مصر ' شرح الصدور ' ص ۳۱۹ ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ' بیروت)

علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں :

بعض علماء نے بیان فرمایا ہے کہ قرآن کی آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حقیقت روح پر مطلع نہیں فرمایا ' بلکہ جائز ہے کہ آپ کو روح کی حقیقت پر مطلع فرمایا ہو اور دوسروں کو بتلانے کا حکم نہ دیا ہو اور علماء نے قیامت کے علم کے متعلق بھی اسی طرح فرمایا ہے۔ (المواہب اللدنیہ مع الزرقانی ' ج ا ص ۲۶۵)

امام بخاری نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک خواب بیان کیا۔ حضرت ابوبکر (رض) نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ مجھے اس خواب کی تعبیر کی اجازت دیں ' پھر حضرت ابوبکر نے اس خواب کی تعبیر کی ' بعد ازاں عرض کیا آپ فرمائیں کہ میری تعبیر صحیح ہے یا غلط ' آپ نے فرمایا بعض صحیح ہے ' بعض غلط ' حضرت ابوبکر (رض) نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ! آپ ضرور بتلائیں میں نے کیا خطا کی ہے ' آپ نے فرمایا قسم نہ دو۔ (صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۷۰۴۶ ' مختصر)

حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

خواب کی تعبیر غیب کا علم ہے ' اس لیے جائز تھا کہ آپ اس غیب کو اپنے ساتھ خاص رکھتے اور دوسروں سے مخفی رکھتے۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۴۳۶ ' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ ' لاہور ۱۴۰۱ھ)

ہم نے تفصیل سے دلائل کے ساتھ باحوالہ بیان کردیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم میں تین قسمیں تھیں۔ ایک وہ علم جس کی تمام امت کو تبلیغ کرنا آپ پر فرض تھا۔ یہ تمام قرآن کریم ہے اور وہ احادیث ہیں جن کا تعلق قرآن مجید کی تفصیل اور بیان سے ہے ' اور دوسرا وہ علم ہے جس کی تبلیغ میں آپ کو اختیار تھا اور اس کا تعلق عموماً غیب کی خبروں سے ہے ' اور تیسرا وہ علم جس کا اخفاء آپ پر واجب ہے۔ جیسے آیات متشابہات ' تقدیر ' وقت وقوع قیامت اور روح کا علم اور یہ وہ اسرار ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس نے صرف اپنے حبیب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان پر مطلع فرمایا ہے۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیں][يٰٓاَهْلَ : اے اہل][الْكِتٰبِ : کتاب][لَسْتُمْ : نہیں ہو تم][عَلٰي : پر][شَيْءٍ؛ کوئی چیز][حَتّٰي : یہاں تک][تُقِيْمُوا : تم قائم کرو][التَّوْرٰىةَ : تورات][وَالْاِنْجِيْلَ : اور انجیل][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْكُمْ : تمہاری طرف][مِّنْ : سے][رَّبِّكُمْ : رب تمہارے][وَلَيَزِيْدَنَّ : اور وہ ضرور زیادہ کرے گا][كَثِيْرًا : بہتوں کو][مِّنْهُمْ : ان سے][مَّآ : جو][اُنْزِلَ : نازل کی گئی][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][مِنْ : سے][رَّبِّكَ : آپ کا رب][طُغْيَانًا : سرکشی][وَّكُفْرًا : اور کفر][فَلَا تَاْسَ : پس نہ آپ غم کریں][عَلَي : پر][الْقَوْمِ : قوم][الْكٰفِرِيْنَ : انکار کرنے والے]

ترجمہ: فرما دیجئے: اے اہل کتاب! تم (دین میں سے) کسی شے پر بھی نہیں ہو، یہاں تک کہ تم توراۃ اور انجیل اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (نافذ اور) قائم کر دو، اور (اے حبیب!) جو (کتاب) آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کی گئی ہے یقیناً ان میں سے اکثر لوگوں کو (حسداً) سرکشی اور کفر میں بڑھا دے گی، سو آپ گروہ کفار (کی حالت) پر افسوس نہ کیا کریں۔

تشریح:

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ : تم فرمادو اے کتابیو ! } اہل کتاب سے فرمایا گیا کہ جب تک تم نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان نہیں لے آتے تب تک تم کسی دین و ملت پر نہیں ہو کیونکہ اگر حقیقی طور پر تم توراۃ و انجیل پر عمل کرو تو تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی ایمان لے آؤ کیونکہ

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کا حکم توراۃ وانجیل میں موجود ہے

{ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ : اے حبیب ! یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ } یعنی اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو قرآن آپ کی طرف آپ کے رب عَزَّوَجَلَّ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے، یہ اہل کتاب کے علماء اور سرداروں کی پرانی سرکشی اور کفر میں اضافہ کرے گا کیونکہ آپ پر جب قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو یہ اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اس طرح یہ اپنے کفر و سرکشی میں اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں اس لیے اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جو یہودی آپ کی نبوت کا انکار کر رہے اور آپ پر ایمان نہیں لا رہے ان کی وجہ سے آپ غمزدہ نہ ہوں کیونکہ ان کے اس کفر کا وبال انہی پر پڑے گا۔

(روح البیان، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۸، ۲/۴۱۹، خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۶۸، ۱/۵۱۱-۵۱۳، ملتقطاً) (صراط)

شان نزول

عبد الملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ لکھتے ہیں :

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس رافع بن حارثہ ' سلام بن مشکم ' مالک بن الصیف اور رافع بن حریمہ آئے اور کہنے لگے یا محمد ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت اور ان کے دین پر ہیں اور آپ اس توراۃ پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے پاس ہے اور آپ گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے برحق ہے۔ آپ نے فرمایا کیوں نہیں ! کیا تم نے دین میں کچھ نئی بدعات نکال لی ہیں اور اللہ نے تم سے جو عہد لیے تھے ' تم نے ان کا انکار کر دیا ' اور اللہ نے تم کو جن چیزوں کے بیان کرنے کا حکم دیا تھا ' تم نے ان کو چھپالیا ' سو میں تمہاری بدعات سے بری ہوں۔ انھوں نے کہا ہم ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو ہمارے پاس ہیں اور بیشک ہم ہدایت اور حق پر ہیں اور ہم آپ پر ایمان لائیں گے ' نہ آپ کی اتباع کریں گے ' تب یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ کہئے کہ اہل کتاب تم (دین برحق کی) کسی چیز پر نہیں ہو۔ (الایہ) (السیرۃ النبویہ ' ج ۲ ' ص ۱۸۱۔ ۱۸۰ ' جامع البیان ' جز ۶ ' ص ۴۱۸۔ ۴۱۷)

یہود و نصاری کے کسی عمل کا لائق شمار نہ ہونا

اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاری ہیں ' یہود اس لیے ہیں کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ توراۃ کے ان احکام پر عمل کریں جن کو منسوخ نہیں کیا گیا اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت تک انجیل پر ایمان لائیں اور آپ کی بعثت کے بعد قرآن کریم پر ایمان لائیں جو توراۃ اور انجیل

دونوں کا محافظ ہے اور قرآن مجید کے احکام پر عمل کریں 'لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا 'اور نصاریٰ اس لیے مراد ہیں کہ انھوں نے انجیل کی ان بشارتوں سے اعراض کیا جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق دی تھیں۔
تم کسی چیز پر نہیں ہو اس کا معنی یہ ہے کہ تم دین برحق کی کسی چیز کے حامل نہیں ہو۔ تم میں تقویٰ ہے 'نہ دیانت ہے 'نہ ہدایت ہے اور تم پر جو کتاب نازل کی گئی تھی 'تم اس کی کسی چیز پر قائم نہیں ہو 'جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کے اصل احکام پر عمل نہ کرو اور قرآن مجید پر ایمان لا کر اس کے احکام پر عمل نہ کرو۔ اس وقت تک تم میں دین داری اور ہدایت کا ایک شمہ بھی نہیں ہوگا اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہارا کوئی عمل قابل ذکر اور لائق شمار نہیں ہے 'اور دین داری اور صاحب کتاب ہونے کے تمہارے تمام دعوی جھوٹے اور باطل ہیں 'خواہ تم دنیا میں اہل کتاب کہلاتے رہو 'لیکن آخرت میں تمہارا کوئی عمل مقبول نہیں ہے۔

نزول قرآن سے ان کے کفر اور سرکشی کا اور زیادہ ہونا

نیز یہ فرمایا کہ قرآن مجید کا نزول ان کے کفر اور سرکشی کو اور زیادہ کرے گا 'کیونکہ قرآن مجید نے ان کی شریعت کو منسوخ کر دیا ہے 'اور ان کی بدعقیدگیوں کو باطل کیا ہے اور ان کا کافر قرار دیا ہے۔ اس لیے یہ قرآن مجید سے حسد اور بغض رکھتے ہیں اور جوں جوں قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی ہیں 'ان کے حسد اور بغض میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ زیادہ شدومد سے قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں۔ نیز یہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرتے ہیں اور قرآن مجید کی ہر آیت آپ کی نبوت کی دلیل ہے اور اسلام کے دین مستقیم ہونے پر برھان ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی ہے 'یہ اس کا انکار کرتے ہیں اور ان کا کفر اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ نیز کتنے ہی تاریخی حقائق انھوں نے غلط بیان کیے تھے 'جن کی قرآن مجید نے تکذیب کر دی 'اس لیے یہ قرآن مجید کے خلاف اور زیادی سرکشی کرتے ہیں۔
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر چونکہ رحمت غالب تھی 'اس لیے ان کے کفر اور سرکشی سے آپ کو رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کافروں کی (اس) قوم پر افسوس نہ کریں 'کیونکہ سرکشی ان کی سرشت بن چکی ہے 'یہ لوگ راہ راست پر آنے والے نہیں ہیں 'لہٰذا آپ ان کے انجام بد پر افسوس نہ کریں۔ (تبیان)
جس طرح کلام الٰہی کے اقرار سے انسان کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح کلام الٰہی کے انکار سے انسان کی سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے، چونکہ قرآن مجید کے احکام، اہل کتاب کے مفادات سے ٹکراتے تھے اس لیے وہ انکار کر دیتے اور اس انکار سے ان کی سرکشی میں اضافہ ہو جاتا، مگر ان کے انکار سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غمگین ہوتے کہ آخر وہ اپنے نفع و نقصان میں تمیز کیوں نہیں کرتے، تو اس آیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں، ان کے اسلام نہ لانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبلیغ کا کوئی قصور نہیں، دراصل یہ اپنی سرکشی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔
۔قرآن کی مثال بارش کی طرح ہے جو زمین میں مدفون بیج کو اگا کر زیادہ کرتی ہے لیکن اس کی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتی یعنی گندم کے بیج سے گندم اور گھاس کے بیج سے گھاس کا پودا ہی نمودار ہوگا۔ اسی طرح جن کے دلوں میں سرکشی کا تخم دفن ہے قرآن ان کی سرکشی کو نمایاں اور زیادہ کرتا ہے اور جن کے دلوں میں اطاعت کے جذبات موجزن ہیں قرآن ان کی اطاعت شعاری میں اضافہ کرتا ہے۔ (امداد)

یہاں توراۃ وانجیل پر قائم رہنے کا جو منطقی تقاضا بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو من جانب اللہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی ہدایات اور احکامات کو مانا جائے۔ کیونکہ قرآن مجید توراۃ اور انجیل کے احکامات کا ضامن اور محافظ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پر عمل کرنا توراۃ اور انجیل کے احکامات کو ماننے کا تسلسل ہے۔ اسی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے پہلے انبیاء کی تصدیق اور تائید لازم قرار پائی۔ اہل کتاب کی اکثریت کا عالم یہ ہے وہ مخالفت برائے مخالفت کی بنیاد پر قرآن مجید کے ساتھ کفر کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے جارہے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں قرآن من جانب اللہ اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اسی بنا پر آپ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی الله علیه وآله وسلم) أَنَّهُ قَالَ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لاَ يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الأُمَّةِ يَهُودِيٌّ وَلاَ نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلاَّ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ)

[رواہ مسلم : باب وُجُوبِ الإِيمَانِ بِرِسَالَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

”حضرت ابوہریرہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میں محمد کی جان ہے یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جس شخص تک میرا پیغام پہنچ جائے اور پھر وہ اسی حالت میں مر جائے اور وہ مجھ پر ایمان نہ لائے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔“

کیونکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اہل کتاب کے ایمان اور اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب تک وہ آپ پر جو نازل ہوا اس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہاں واضح الفاظ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اہل کتاب کی سرکشیوں اور نافرمانیوں پر آپ کو افسردہ اور دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کا کام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے منوانا نہیں۔ (فہم)

اب اسلام کی اطاعت کے بغیر کسی کوئی قیمت نہیں ہے

یعنی کل کتب سماویہ جن کا خاتم اور مہیمن قرآن کریم ہے۔ پچھلے رکوع میں اس آیت کی تفسیر گزر چکی۔

شریعت اسلام کی پابندی کے بغیر تمہارے سارے کمالات اور اعمال سب اکارت ہیں۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے ایک کمال فطری یہ عطا فرمایا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کی اولاد ہو، دوسرے توراۃ وانجیل کے عملی کمالات بھی تمہیں حاصل ہیں، تم میں سے بہت سے آدمی درویش منش بھی ہیں، مجاہدات وریاضیات کرتے ہیں، مگر ان سب چیزوں کی قیمت اور وزن اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس پر موقوف ہے کہ تم شریعت آلٰہیہ کا اتباع کرو۔ اس کے بغیر نہ کوئی نسبی فضیلت کام آوے گی نہ علمی تحقیقات تمہاری نجات کا سامان بنیں گی نہ تمہارے مجاہدات وریاضیات۔

مسلمانوں کے لیے راہ نمائی

اس ارشاد میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدآیت مل گئی کہ کوئی درویشی اور سلوک وطریقت، مجاہدات وریاضیات اور کشف والہام اس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ ہو۔

حجیت حدیث :

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا، اسی طرح دوسرے علوم و معارف بھی عطا کئے گئے ہیں۔ جن کو ایک حیثیت سے قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جاسکتا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ترجمہ یاد رکھو! کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے، آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو صرف قرآن کافی ہے، جو اس میں حلال ہے صرف اس کو حلال سمجھو، اور جو اس میں حرام ہے صرف اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرام ٹھہرایا ہے وہ بھی ایسے ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی وغیرہا)۔

احکام کی تین اقسام: جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک تو وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صراحۃً قرآن میں مذکور نہیں بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جداگانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے، تیسرے وہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا، وہ بھی بحکم وحی ہو گیا، یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں

کون سا ایمان معتبر ہے

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود و نصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا۔ بلکہ قتل و قتال اور سیف و سنان کی جنگیں بھی لڑی۔ اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عند اللہ ہونے کے لیے صرف اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو خبیث ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روز آخرت اور قیامت کا منکر تھا۔ اس نے تو عین حالت غضب میں بھی (آیت) الی یوم یبعثون کہہ کر ایمان باآخرت کا اقرار کیا ہے۔

اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو۔ قرآن میں کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا ' (آیت) فان امنوا بمثل ماامنتم بہ فقد اھتدوا، یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھا۔ اس لیے مَن آمَنَ باللّٰہ کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔

فلاتاس علی القوم الکفرین: یعنی اس غم اور افسوس میں پڑ کر تنگ دل نہ ہوں اپنا فرض امن و اطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔ (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

لغۃ القرآن: [إِنَّ : بیشک][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][هَادُوْا : جو یہودی ہوئے][وَالصّٰبِئُوْنَ : اور جو بے دین ہوئے][وَالنَّصٰرٰى: اور نصاریٰ][مَنْ : جو][اٰمَنَ : ایمان لائے][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ] کے [وَالْيَوْمِ : اور دن][الْاٰخِرِ : آخرت][وَعَمِلَ : اور عمل کیے][صَالِحًا : نیک][فَلَا : تو نہیں][خَوْفٌ : خوف][عَلَيْهِمْ : ان پر][وَلَا : اور نہ [هُمْ : وہ] [يَحْزَنُوْنَ : غم گین ہوں گے]

ترجمہ: بیشک (خود کو) مسلمان (کہنے والے) اور یہودی اور صابی (یعنی ستارہ پرست) اور نصرانی جو بھی (سچے دل سے تعلیمات محمدی کے مطابق) اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے.

تشریح:

نجات: ایمان و اعمال صالحہ سے ہوگی، نسل و مذہب سے نہیں

تمام مذاہب کے لوگ۔ خاص طور پر یہود۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اللہ کے پیارے ہیں، انہی کی نجات ہوگی، دوسرا کوئی آخرت میں اللہ کے انعامات کا مستحق نہیں ہوگا، اب مسلمان بھی اسی غلط خیال میں مبتلا ہوگئے ہیں، وہ کہتے ہیں: "ہم محبوب کی امت ہیں، اس لیے ضرور بخشے جائیں گے" جبکہ عمل میں صفر ہوتے ہیں، اور ایمان کا حال اللہ بہتر جانتے ہیں۔

یہی حال اہل کتاب کا ہے، وہ کہتے ہیں : ہم اللہ کے بیٹے اور اللہ کے پیارے ہیں، اس لیے نجات ہماری ہی ہو گی، سورۃ البقرۃ کی (آیت 62) میں اور یہاں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کسی مذہب اور نسل میں محدود نہیں، قبولیت کا مدار ایمان و عمل صالح پر ہے۔

تمام مذاہب والے۔ جب تک ان کا مذہب بر حق تھا۔ اگر ان کا اللہ پر، اور اس زمانہ کے رسول پر، اور اس کی لائی ہوئی شریعت پر اور آخرت کے دن پر ایمان تھا، اور اس زمانہ کی شریعت پر عمل تھا تو ضرور ان کی نجات ہو گی، مگر محض اس وجہ سے کہ اس کا فلاں مذہب اور فلاں نسل سے تعلق تھا نجات نہیں ہو گی، آج مسلمان بھی اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لیے ان کو بھی ان آیات میں لیا گیا ہے۔

مدار نجات ایمان و عمل اور بس

سو نجات اور فوز و فلاح کا مدار شریعت محمدیہ کے اتباع پر ہے اور بس۔ اور ایمان صادق اور عمل صالح کی یہ دولت تب ہی مل سکے گی اور اس کے نتائج و ثمرات سے متعلق یہ سب کچھ تب ہی متحقق ہو سکے گا جبکہ شریعت محمدیہ کو دل و جان سے اپنا لے۔ اس کے مطابق اس کا ایمان و عقیدہ بھی سچا ہو اور عمل و کردار بھی صحیح اور درست ہو۔ کیونکہ اس کامل اور ابدی صداقت کے ظہور کے بعد اس کے سوا فلاح و نجات کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور قرآن و سنت کی نصوص کریمہ میں اس حقیقت کو طرح طرح سے اجاگر و آشکار فرمایا گیا ہے۔ مثلاً نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشہور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ آج اگر موسیٰ بذات خود زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی و اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کو یہ اصولی، جامع اور اہم تعلیم دی کہ تم لوگ اتباع کرو اور دین متین میں نئی بات نکالنے سے بچو۔ سو مدار نجات اور ذریعہ فوز و فلاح شریعت محمدیہ کی اتباع پر ہے۔ اور حق و ہدایت کی نعمت و دولت اس کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ پس جو لوگ اس شریعت مقدسہ پر ایمان و یقین اور اس کی اتباع و پیروی سے محروم ہیں وہ نور حق و یقین اور دولت حق و ہدایت سے قطعی طور پر محروم ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ خواہ ایسے لوگ کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کرتے ہوں کہ مدار و انحصار محض زبانی کلامی دعوؤں پر نہیں ایمان و عمل پر ہے۔ و باللہ التوفیق۔

اتباع حق ذریعہ نجات و سرفرازی

سو دین کے سچے پیروکاروں کیلئے قیامت کے روز کوئی فکر نہ ہو گا۔ وہاں کے اہوال و مخاوف سے اور آئندہ کے بارے میں کہ سچے ایمان کی دولت ان کو وہاں حقیقی اور دائمی امن وامان سے سرفراز کر دے گی۔ اور۔ { لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ } ۔ کا مژدہ جانفزا ان کو وہاں سنایا جا چکا ہو گا۔ اور اللہ کے نوری فرشتے بڑھ بڑھ کر ان کا وہاں استقبال کر رہے ہوں گے۔ { وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ } ۔ اور ان کو عظیم الشان بشارتوں سے نواز رہے ہوں گے۔ { هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ } ۔ اللہ ہمیں انہی کے زمرے میں محشور فرمائے۔ آمین۔ سو دین حنیف کی سچی پیروی انسان کو دارین کے مخاوف و مہالک سے بچانے والی اور دارین کی سعادت و سرخروئی سے ہمکنار و سرفراز کرنے والی ہے۔ وَباللّٰہِ التوفیق۔ سو جن لوگوں کی فکر پاک و صاف ہو گی اور وہ ایمان و یقین اور عمل صالح کی پونجی سے سرفراز ہوں گے وہ اپنے خالق و مالک کے فضل و

کرم اور اس کی توفیق و عنایت کی بنا پر سکون و اطمینان قلب کی ایسی دولت سے مالامال ہوں گے کہ وہ آئندہ کے حوادث و اہوال کے غم سے آزاد اور مطمئن ہوں گے۔ اور اس دنیا میں بھی ان کو یہ سعادت نصیب ہوگی لیکن اس کا آخری اور کامل ظہور آخرت میں ہوگا۔ **وَبِاللّٰہِ التوفیق لِمَا یُحِبُّ وَیُرِیْدُ وَھُوَ الھادی اِلٰی سواءِ السَّبیل۔**

ایمان وسیلہ امن وامان

سو اہل ایمان پر وہاں کوئی غم نہیں ہوگا۔ یعنی دنیا اور اس کی زندگی پر کہ دنیا میں انھوں نے اپنی زندگی صحیح راہ پر صرف کی ہوگی جس کا ثمرہ انھیں وہاں نصیب ہوگا۔ اور دنیاوی مال و دولت کی آخرت کی ان نعمتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔ تو پھر دنیا پر افسوس کاہے کا؟۔ سو یہ پھل ہے سچے ایمان و عقیدہ کا کہ یہ انسان کو حقیقی امن و اطمینان کی اس عظیم الشان دولت سے نوازتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت کے اس ابدی جہاں میں بھی جہاں کی کامیابی حقیقی کامیابی ہے۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ شَرَّفَنَا بِنِعْمَۃِ الْاِیْمَانِ بِمَحْضِ مَنِّہٖ وَکَرَمِہٖ جَلَّ وَعَلَا۔**
سو اس سے ایمان و یقین کی دولت بے مثال کی عظمت شان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہی وہ دولت ہے جو انسان کو ماضی کے غم و اندوہ اور مستقبل کے خوف و اندیشہ سے محفوظ رکھتی ہے۔ جس سے بندہ مومن سکون و اطمینان کی ایسی بے مثال دولت نادیدہ سے سرشار ہوتا ہے جس کو سمجھنے سے دنیا عاجز و قاصر ہے۔ سو صدق ایمان سعادت دارین سے سرفرازی کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ **اَللّٰھُمَّ زِدْنَا مِنْہُ وَثبتنَا عَلَیْہِ یَا مَنْ لَا حَدَّ لِجُوْدِہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔**
اس کے بعد جاننا چاہیے کہ مشہور آسمانی کتابیں چار ہیں، قرآن، تورات، زبور اور انجیل، قرآن کا تعلق مسلمانوں سے ہے، باقی تین کا تعلق اہل کتاب سے ہے، ان میں اصل کتاب تورات ہے، جو موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی ہے، پھر حضرت داود (علیہ السلام) کو زبور دی گئی، جو محامد پر مشتمل تھی، اصل شریعت تورات تھی، زبور اس میں اضافہ تھا، مگر کچھ لوگ تورات کو چھوڑ کر زبور کو لے بیٹھے، زبور میں احکام نہیں تھے، اس طرح ان کو تورات کے احکام سے چھٹی مل گئی، اس طرح یہود میں سے نئی امت وجود میں آئی، جو صابی کہلائے،

صابی کے معنی ہیں

ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار کرنا، اسی لیے مشرکین مکہ: مسلمانوں کو صابی کہتے تھے، کیونکہ انہوں نے آبائی دین چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا تھا۔
حسن المحاضرۃ فی اخبار المصر والقاھرۃ۔ میں حضرت جلال الدین السیوطی (رح) ذکر ائمۃ التاریخ میں فرماتے ہیں۔
حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے شیث کو جنہیں نبوت اور دین عطا ہوا تھا وصیت کی اور حضرت شیث (علیہ السلام) پر 29 صحیفے نازل ہوئے اور وہ ارض مصر میں تشریف لائے اور آپ کو ایلون بلایا گیا چنانچہ آپ اور اپنے بھائی کی اولاد کے ساتھ ایلون تشریف لے گئے۔ حضرت شیث (علیہ السلام) تو پہاڑ کے اوپر سکونت پذیر ہوئے اور اولاد قابیل نیچے کے میدان میں رہے۔

پھر شیث (علیہ السلام) کے خلیفہ ان کے بیٹے انوش ہوئے اور ان کے خلیفہ ان کے بیٹے قونان بنے اور قونان کے جانشینی ان کے بیٹے مہلائیل کو حاصل ہوئی اور ان کی جگہ ان کے بیٹے یرد خلیفہ ہوئے اور مہلائیل نے وصیت شیث دے کر تمام علوم میں ماہر کر دیا۔ واخبرہ بمایحدث فی العالم میں اور دنیا میں جو کچھ ہونے والا تھا سب کی خبر دی اور فن نجوم میں بھی ماہر کر دیا۔ اور وہ کتاب جو آدم (علیہ السلام) پر نازل ہوئی تھی وہ اپنے بیٹے اخنوخ کو یدپھر چالیس سال کے بعد اخنوخ جنہیں ادریس (علیہ السلام) (غالباً کہا جاتا ہے) منصب نبوت پر فائز ہوئے اور آپ ہی کو ہرمس کہا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں یہاں کا بادشاہ محویل بن اخنوخ بن قابیل تھا۔ اسے حضرت ادریس (علیہ السلام) سے کد ہوئی۔ اس نے کچھ برائی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ عزوجل نے انھیں اس کے شر سے محفوظ کیا اور آپ (علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل کئے تو جب آپ کی تبلیغ عام ہوئی تو جو اس کے پیرو ہوئے وہ ملت صابیہ کہلاتی ہے۔ اس ملت میں توحید الٰہی اور طہارت اور روزہ وغیرہ احکام تھے۔

ایک قول ہے کہ صابی منسوب ہے صابی بن متوشلخ بن ادریس کی طرف ہے اور یہ متنقیت اولیٰ پر تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ صابی بن ماویٰ زمانہ خلیل (علیہ السلام) میں تھا۔

ایک قول یہ ہے کہ صابی عرب کے نزدیک اسے کہتے ہیں جو اپنی قوم کے دین سے خارج ہو گیا ہو۔ تو آیت کریمہ سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ باوجود اس کے کہ اس کی ضالت اور زیغ عن الادیان اظہر من الشمس ہے تو جب اس کی توبہ قبول ہے بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح کر لے تو پھر اس سے غیر بہ طریق اولیٰ قبولیت کا حقدار ہے۔ (روح المعانی وحسنات)

صبات کا وطن شام اور عراق تھا، مگر اب ان کا وجود باقی نہیں رہا، اس لیے ان کی تعیین میں مفسرین کرام میں بہت اختلاف ہوا ہے، معارف القرآن شفیعی میں جو بات ہے وہ میں نے لی ہے۔

پھر جب تورات کی شریعت کے ختم ہونے کا وقت آیا تو بنی اسرائیل میں آخری رسول حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مبعوث ہوئے، اور ان پر انجیل نازل ہوئی جو تورات کا تتمہ تھی، اس میں تورات کے بعض احکام کو بدلا گیا، پھر تقریباً چھ سو سال کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوئے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن کریم نازل ہوا، پس تورات کی شریعت موقوف ہو گئی، اور شریعت اسلامیہ کا دور شروع ہوا۔

غرض: ان تینوں کتابوں کے ماننے اور شریعت تورات کی پیروی کرنے پر نجات موقوف تھی، جبکہ وہ شریعت باقی تھی، مگر جب وہ شریعت موقوف ہو گئی، اور اس کی جگہ دوسری شریعت آ گئی، تو اب جو اسلام کی شریعت کی پیروی کرے گا اسی کی نجات ہو گی۔

جیسے تعلیم گاہوں میں اسباق کے پیریڈ (Period) ہوتے ہیں، جب ایک استاذ کا پیریڈ ختم ہو کر دوسرے استاذ کا پیریڈ شروع ہوتا ہے تو دوسرے استاذ سے پڑھنا ضروری ہوتا ہے، اب بھی پہلے استاذ کو پکڑے رہنا نظام سے اختلاف ہے۔

پس یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ قیامت تک سب ادیان ایک ساتھ برحق ہیں، کسی بھی مذہب کو ماننے والے اور اس کے مطابق نیک کام کرنے والے ناجی ہوں گے، بلکہ مختلف زمانوں میں جو مذاہب برحق تھے ان پر عمل کرنے سے نجات ہو گی۔

آیت کی تفسیر میں دراز نفسی کی وجہ

سورۃ البقرۃ (آیت 62) میں مفصل کلام نہیں کیا، یہاں مفصل بات اس لیے کہی ہے کہ آگے اس مضمون کی آیت نہیں آئے گی۔ اور سورۃ الحج میں (آیت 17) اس سے ملتی جلتی آیت ہے، مگر اس کا موضوع الگ ہے، اس میں مجوس اور مشرکین کا بھی ذکر ہے، اللہ تعالیٰ سب کے درمیان قیامت کے دن عملی فیصلہ فرمائیں گے کہ کونسا مذہب صحیح تھا اور کونسا غلط؟ پس وہ آیت اس آیت سے مختلف ہے، اس لیے اشتباہ نہ ہو۔

سوال: اس آیت میں اور سابقہ آیت میں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر تو ہے، مگر اس زمانہ کے رسول اور اس کی شریعت پر ایمان لانے کا ذکر نہیں، اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ رسول پر ایمان کی کوئی خاص اہمیت نہیں، کسی بھی رسول کی شریعت پر عمل کرنے سے نجات ہوگی۔

جواب: ایسا سمجھنا صحیح نہیں، رسول کا تذکرہ چھوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیا مبعوث ہوئے ہیں، پھر کس کا ذکر کرتے اور کس کا ذکر چھوڑتے؟ اور قیامت کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ یہ عقیدہ عمل کا باعث بنتا ہے، جو قیامت کو صحیح طرح مانتا ہے: وہی دین پر عمل کرتا ہے، پس اس عقیدہ کو مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

علاوہ ازیں: اللہ پر ایمان: ان کے بھیجے ہوئے رسولوں اور ان کی لائی ہوئی شریعتوں پر ایمان کو متضمن ہے، پس ایمان باللہ کے جلو میں ایمان بالرسول بھی آجاتا ہے، الگ سے اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رب کائنات ہیں، مخلوقات کی ضروریات کا انتظام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے، اور انسان مکلّف مخلوق ہیں، جہاں ان کی مادی ضروریات ہیں روحانی ضروریات بھی ہیں، یہ ضرورت اللہ تعالیٰ انبیا کے ذریعہ اور ان کی نازل کردہ شریعت کے ذریعہ پوری کرتے ہیں، پس ایمان باللہ میں ایمان بالرسول بھی آجاتا ہے، اس لیے دونوں آیتوں میں ایمان بالرسول کا تذکرہ نہیں کیا، جیسے "من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ" میں جو "لا الہ الا اللہ" ھے۔ وہ "محمد رسول اللہ" کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔

یہود نے اپنے دور میں نہایت برے کام کیے ہیں: پھر وہ آخرت میں کیسے کامیاب ہوں گے؟

اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ (علیہ السلام) کو تورات عنایت فرمائی تو بنی اسرائیل سے پختہ قول وقرار لیا تھا کہ وہ اللہ کی کتاب پر مضبوطی سے عمل کریں گے، پھر مسلسل ان میں رسول بھیجے جو تذکیر کا کام کرتے تھے، یہود کو سمجھاتے تھے کہ تورات کے احکام پر عمل کرتے رہو، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو۔

ان انبیاء پر وحی آتی تھی، اس کے ذریعہ تورات کے احکام میں جزوی تبدیلی کی جاتی تھی، جب تورات کے کسی حکم میں کوئی ایسی تبدیلی کی جاتی جو یہود کو پسند نہ آتی تو وہ اندھے بہرے ہو کر بعض انبیاء کی تکذیب کرتے اور بعض کو تہہ تیغ کردیتے اور بعض کو پابند سلاسل کردیتے، اور وہ ایسا خیال کرتے کہ اس سے کیا ہوگا؟ ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔

پھر جب صورت حال ناگفتہ بہ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بابل کے بادشاہ بخت نصر کو مسلط کیا، اس نے قدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور ستر ہزار یہود کو قید کرکے بابل لے گیا، اور ان کو غلام باندیاں بنادیا، وہاں وہ تقریباً ایک صدی تک غلامی کی ذلت ورسوائی برداشت کرتے رہے،

کہتے ہیں: اسی غلامی کے زمانہ میں حضرت عزیر (علیہ السلام) مبعوث ہوئے ہیں، جب یہود کو ہوش آیا تو انہوں نے اپنی حرکتوں سے توبہ کی، اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔
پھر فارس کے بادشاہ سائرس نے بابل پر حملہ کیا، اور یہودیوں کو غلامی سے نجات دلائی، اور ان کو مال سامان دیا، تاکہ وہ بیت المقدس کو دوبارہ آباد کریں، لیکن کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ان کو پھر شرارتیں سوجھیں، اور اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریاؑ و یحیٰؑ (علیہما السلام) کو شہید کر دیا، اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے قتل کے درپے ہوئے، یہ تو اچھا ہوا کہ اللہ نے ان کو زندہ اٹھا لیا، ورنہ یہود ان کو بھی قتل کر دیتے۔
اللہ تعالیٰ یہود کی یہ تمام حرکتیں دیکھ رہے ہیں، ایسے بد کردار آخرت میں کیسے کامیاب ہوں گے؟ کامیابی تو کام سے ہوتی ہے نہ کہ نام سے! وہ خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ ہم انبیا کی اولاد ہیں نوح (علیہ السلام) کا بیٹا نبی کی اولاد ہوتے ہوئے بھی غرقاب ہو گیا، اور یہ بھی ان کی خام خیالی ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، اس لیے ہم ضرور بخشے جائیں گے، اللہ کا کوئی بیٹا نہیں، اولاد ہونا ان کے لیے عیب ہے، اور وہ عیب سے پاک ہیں، اور ان کو محبت قوموں سے اور نسلوں سے نہیں، بلکہ ایمان و عمل صالح سے ہے۔ (ہدایت)

مدار نجات ایمان و عمل اور بس

سو نجات اور فوز و فلاح کا مدار شریعت محمدیہ کے اتباع پر ہے اور بس۔ اور ایمان صادق اور عمل صالح کی یہ دولت تب ہی مل سکے گی اور اس کے نتائج و ثمرات سے متعلق یہ سب کچھ تب ہی متحقق ہو سکے گا جبکہ شریعت محمدیہ کو دل و جان سے اپنا لے۔ اس کے مطابق اس کا ایمان و عقیدہ بھی سچا ہو اور عمل و کردار بھی صحیح اور درست ہو۔ کیونکہ اس کامل اور ابدی صداقت کے ظہور کے بعد اس کے سوا فلاح و نجات کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور قرآن و سنت کی نصوص کریمہ میں اس حقیقت کو طرح طرح سے اجاگر و آشکار فرمایا گیا ہے۔ مثلاً نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشہور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ آج اگر موسیٰ بذات خود زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی و اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کو یہ اصولی، جامع اور اہم تعلیم دی کہ تم لوگ اتباع کرو اور دین متین میں نئی بات نکالنے سے بچو۔ سو مدار نجات اور ذریعہ فوز و فلاح شریعت محمدیہ کی اتباع پر ہے۔ اور حق و ہدایت کی نعمت و دولت اس کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ پس جو لوگ اس شریعت مقدسہ پر ایمان و یقین اور اس کی اتباع و پیروی سے محروم ہیں وہ نور حق و یقین اور دولت حق و ہدایت سے قطعی طور پر محروم ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ خواہ ایسے لوگ کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کرتے ہوں کہ مدار و انحصار محض زبانی کلامی دعوؤں پر نہیں ایمان و عمل پر ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اتباع حق ذریعہ نجات و سرفرازی

سو دین کے سچے پیروکاروں کیلئے قیامت کے روز کوئی فکر نہ ہوگا۔ وہاں کے اہوال و مخاوف سے اور آئندہ کے بارے میں کہ سچے ایمان کی دولت ان کو وہاں حقیقی اور دائمی امن و امان سے سرفراز کر دے گی۔ اور۔ {لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ} ۔ کا مژدہ جانفزا ان کو وہاں سنایا جا چکا ہوگا۔ اور اللہ کے نوری فرشتے بڑھ بڑھ کر ان کا وہاں استقبال کر رہے ہوں گے۔ {وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ} ۔ اور ان کو عظیم الشان بشارتوں

سے نواز رہے ہوں گے۔ {هذا يومُكُمُ الّذِى كُنْتُمْ تُوْعدُونَ} ۔اللہ ہمیں انہی کے زمرے میں محشور فرمائے۔آمین۔سو دین حنیف کی سچی پیروی انسان کو دارین کے مخاوف و مہالک سے بچانے والی اور دارین کی سعادت و سرخروئی سے ہمکنار و سرفراز کرنے والی ہے۔وَبِاللّٰہِ التوفیق۔سو جن لوگوں کی فکر پاک و صاف ہو گی اور وہ ایمان و یقین اور عمل صالح کی پونجی سے سرفراز ہوں گے وہ اپنے خالق ومالک کے فضل و کرم اور اس کی توفیق و عنایت کی بنا پر سکون و اطمینان قلب کی ایسی دولت سے مالامال ہوں گے کہ وہ آئندہ کے حوادث واہوال کے غم سے آزاد اور مطمئن ہوں گے۔اور اس دنیا میں بھی ان کو یہ سعادت نصیب ہو گی لیکن اس کا آخری اور کامل ظہور آخرت میں ہو گا۔**وَبِاللّٰہِ التوفیق لِمَا یُحِبُّ وَیُرِیْدُ وَھُوَ الھادی اِلٰی سواءِ السَّبیل۔**

ایمان وسیلہ امن وامان

سو اہل ایمان پر وہاں کوئی غم نہیں ہو گا۔یعنی دنیا اور اس کی زندگی پر کہ دنیا میں انھوں نے اپنی زندگی صحیح راہ پر صرف کی ہو گی جس کا ثمرہ انھیں وہاں نصیب ہو گا۔اور دنیاوی مال و دولت کی آخرت کی ان نعمتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہو گی۔تو پھر دنیا پر افسوس کا ہے کا؟۔سو یہ پھل ہے سچے ایمان و عقیدہ کا کہ یہ انسان کو حقیقی امن و اطمینان کی اس عظیم الشان دولت سے نوازتا ہے۔اس دنیا میں بھی اور آخرت کے اس ابدی جہاں میں بھی جہاں کی کامیابی حقیقی کامیابی ہے۔فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ شَرَّفَنَا بِنِعْمَۃِ الْاِیْمَانِ بِمَحْضِ مَنِّہٖ وَکَرَمِہٖ جَلَّ وَعَلَا۔سو اس سے ایمان و یقین کی دولت بے مثال کی عظمت شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہی وہ دولت ہے جو انسان کو ماضی کے غم واندوہ اور مستقبل کے خوف واندیشہ سے محفوظ رکھتی ہے۔جس سے بندہ مومن سکون و اطمینان کی ایسی بے مثال دولت نادیدہ سے سرشار ہوتا ہے جس کو سمجھنے سے دنیا عاجز و قاصر ہے۔سو صدق ایمان سعادت دارین سے سرفرازی کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔اَللّٰھُمَّ زِدْنَا مِنْہُ وَثَبِّتْنَا عَلَیْہِ یَا مَنْ لَا حَدَّ لِجُوْدِہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔(مدنی)

آیت مبارکہ:

لَقَدۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ رُسُلًا ؕ کُلَّمَا جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُہُمۡ ۙ فَرِیۡقًا کَذَّبُوۡا وَفَرِیۡقًا یَّقۡتُلُوۡنَ ﴿۷۰﴾

لغۃ القرآن: [لَقَدْ : یقیناً][اَخَذْنَا : ہم نے پکڑا][مِیْثَاقَ : وعدہ پختہ][بَنِيْٓ: بیٹے][اِسْرَاۗءِيْلَ : اسرائیل][وَاَرْسَلْنَآ : اور بھیجے ہم نے][اِلَيْهِمْ : طرف ان][رُسُلًا : رسول (جمع)][ۭكُلَّمَا : جب کبھی][جَاۗءَهُمْ : آیا انکے پاس][رَسُوْلٌۢ: رسول][بِمَا : ساتھ اس کے جو][لَا : نہ][تَهْوٰٓى: چاہتے تھے][اَنْفُسُهُمْ : ان کے دل][ۙفَرِيْقًا : جماعت][كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا][وَفَرِيْقًا : اور جماعت][يَّقْتُلُوْنَ : وہ قتل کرتے ہیں]

ترجمہ: بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد (بھی) لیا اور ہم نے ان کی طرف (بہت سے) پیغمبر (بھی) بھیجے، (مگر) جب بھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جسے ان کے نفس نہیں چاہتے تھے تو انھوں نے (انبیاء کی) ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک کو (مسلسل) قتل کرتے رہے.

تشریح: اس آیت سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ بنواسرائیل اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ سے کیے ہوئے پختہ عہد کو پورا نہیں کرتے ' انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ اللہ کے تمام احکام کو سن کر قبول کریں گے ' اور ان تمام احکام پر عمل کریں گے ' لیکن انھوں نے ان پختہ عہود کو توڑ دیا اور اپنی آراء اور خواہشوں کو احکام شرعیہ پر مقدم کیا۔ شریعت کا جو حکم ان کی رائے اور خواہش کے موافق ہوتا ' اس پر عمل کرتے اور جو اس کے خلاف ہوتا ' اس کو رد کردیتے انھوں نے حضرت زکریا اور یحیٰی (علیہما السلام) اور کئی انبیاء (علیہم السلام) کو قتل کیا ' اور انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ (تبیان)

گزشتہ آیت میں قانون نجات کا بیان فرمایا گیا تھا اور تین چیزیں نجات اخروی کے لیے ضروری بتلائی گئی تھیں۔ ایمان باللہ، 2۔ ایمان بالیوم الاخر، 3۔ عمل صالح۔ چنانچہ ان آیات میں یہ دکھلایا گیا کہ یہود کے ایمان باللہ کی تو یہ کیفیت ہے کہ اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ کر اور کسی کو قید اور کسی کو قتل ہی کر ڈالا، اور ان کے ایمان بالیوم الاخر کا اندازہ اس سے کرلیا جائے کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا

ارتکاب کرکے بالکل بے فکر ہو بیٹھے گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا، اور ظلم اور بغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے، یہ خیال کرکے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل اندھے اور بہرے ہوگئے۔ (درس احمد)
حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں یہ عہد لیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں اور حکم الٰہی کے مطابق عمل کریں لیکن انھوں نے یہ کیا کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات کے برخلاف حکم لے کر آتے تو انبیاء کرام (علیہ السلام) کے کسی گروہ کو تو یہ جھٹلاتے اور کسی کو شہید کر دیتے۔ انبیاءِ کرام (علیہ السلام) کی تکذیب میں تو یہود و نصاریٰ سب شریک ہیں مگر قتل کرنا یہ خاص یہودیوں کا کام ہے، انہوں نے بہت سے انبیاء کرام (علیہ السلام) کو شہید کیا جن میں سے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) بھی ہیں۔ یہ خیال رہے کہ کوئی نبی (علیہ السلام) جہاد میں کافروں کے ہاتھوں شہید نہیں ہوئے۔ (صراط)

بنی اسرائیل کا رسولوں اور نبیوں سے سلوک ' امت مسلمہ کے لیے عبرت

یعنی ان سے شریعت کی پاسداری احکام خداوندی کے نفاذ اور عدل اجتماعی کے قیام کا جو عہد و میثاق لیا گیا تھا ' جب انھوں نے اس میں کمزوری اختیار کی تو اللہ نے اس کی یاد دہانی اور ان کی اصلاح کے لیے رسول اور انبیاء بھیجے تو یہ لوگ اس حد تک خواہشات نفس کے اسیر ہو چکے تھے کہ اپنی خواہشوں کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے آنے والے نبیوں کی ہدایات کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام زوال پذیر قومیں شاید ایک ہی جیسا مزاج رکھتی ہیں کہ جب ان کے اندر دینی زوال کے نتیجے میں اللہ کے قانون کو بار پانے کا موقع نہیں ملتا اور اخلاقیات کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں تو پھر خواہشات نفس ' مقاصد زندگی کی جگہ لے لیتی ہیں اور قومیں ان کے حصول کے لیے دیوانہ وار ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔ اس جنونی کیفیت میں جب بھی ان کا کوئی راستہ روکتا ہے ' یعنی ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اسے اپنا دشمن خیال کرتی ہیں۔ پھر یا تو اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں اور یا سرے سے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ یہی تاریخ بنی اسرائیل کی تھی اور یہی شاید آج امت مسلمہ کی بھی ہے کہ مادے کی ہوس نے پورے عالم اسلام کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور ہر جگہ دینی قوتیں اور اصلاح کا عمل کرنے والوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو مرنے والی قوموں کا خاصہ رہا ہے ' وہ لوگ ان کی بھلائی کی بات کرتے ہیں ' یہ اس کا جواب دشمنی سے دیتے ہیں اور یہی شاید زمانے کی ریت ہے۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درس صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے سامنے اسی لیے بیان کی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق سیکھیں اور وہ غلطیاں نہ کریں جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل عذاب کا شکار ہوئے۔ چنانچہ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ جب ان کی خواہشات نفس کو اللہ کے نبیوں نے لگام دے کر اصلاح کی کوشش کی تو انھوں نے کسی کی تو تکذیب کی اور جس پر بس چلا ' اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا اور پھر شقاوت کی انتہا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تاریخ کو خود بیان بھی کیا۔ ہم یہاں چند واقعات کا اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ شاید امت مسلمہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔
1۔ حنانی نبی: حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں

کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانرواآسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تواریخ ' باب ۱۷۔آیت ۷۔۱۰)

2۔حضرت الیاس (ایلیاء Elliah) (علیہ السلام) نے جب بَعْل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اوراز سرنو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا 'حتیٰ کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔اس موقع پر جو دعا حضرت الیاس (علیہ السلام) نے مانگی ہے 'اس کے الفاظ یہ ہیں : "بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا۔۔ تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں 'سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں "۔ (۱۔ سلاطین باب ۱۹۔آیت ۱۔۱۰)

3۔ایک اور نبی حضرت میکایاہ (علیہ السلام) کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (۱۔ سلاطین۔ باب ۲۲۔آیت ۲۶۔۲۷)

4۔حضرت زکریا۔ : پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکل سلیمانی میں "مقدس "اور "قربان گاہ "کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲۔ تواریخ ' باب ۲۴۔آیت ۲۱)

5۔ایک اور نبی حضرت عاموس (علیہ السلام) کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔ (عاموس ' باب ۷۔آیت ۱۰۔۱۳)

6۔حضرت یحییٰ (یوحنا) (علیہ السلام) نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں 'تو پہلے وہ قید کیے گئے 'پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مرقس ' باب ٦ 'آیت ۱۷۔۱۹)

7۔آخر میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا 'کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان وراستی کی تلقین کرتے تھے۔اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا 'رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور براَبّا ڈاکو 'دونوں میں سے کس کو رہا کروں 'تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ براَبّا ڈاکو کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی ' باب ۲۷۔آیت ۲۰۔۲۶)

جس قوم کے ہاتھ سے اللہ کے یہ برگزیدہ بندے بھی ظلم اور قتل سے نہ بچ سکے حقیقت یہ ہے کہ اسے روئے زمین پر زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اللہ کا اپنا ایک قانون ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق قوموں کو مہلت دیتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اصلاح کر لیں۔ لیکن اگر وہ قومیں اصلاح کی بجائے بگڑتی چلی جاتی ہیں تو یہ ان کی انتہائی بدنصیبی کا دور ہوتا ہے۔ قدرت انھیں پھر بھی پکڑنے میں جلدی نہیں کرتی۔ لیکن اب انھیں اس لیے مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور اپنی فائل اچھی طرح موٹی کر لیں تاکہ جب قدرت ان پر ہاتھ ڈالے تو انھیں چیخنے کا بھی موقع نہ ملے اور وہ فریاد کرنا چاہیں تو عذاب کا ہاتھ ان کے گلے تک پہنچ چکا

ہو۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے اسی قانون کے تحت مہلت دی۔ لیکن ان کی کج فکری ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے اس مہلت عمل کو اپنے لیے ہر طرح کے جرائم کا لائسنس سمجھ لیا۔ نتیجہ واضح ہے کہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ (روح)

آیت مبارکہ:

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

لغۃ القرآن: [وَحَسِبُوْٓا : اور انہوں نے سمجھا][اَلَّا : یہ کہ نہ][تَكُوْنَ : ہوگی][فِتْنَةٌ: آزمائش][فَعَمُوْا : پس وہ اندھے ہوگئے][وَصَمُّوْا : اور بہرے ہوگے][ثُمَّ : پھر][تَابَ : رجوع کیا][اللّٰهُ : اللہ نے][عَلَيْهِمْ : ان پر][ثُمَّ : پھر][عَمُوْا : وہ اندھے ہوگے][وَصَمُّوْا : اور بہرے ہوگئے][كَثِيْرٌ: اکثر][مِّنْهُمْ: ان سے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][بَصِيْرٌ : دیکھنے والا ہے][بِمَا : ساتھ اس کے جو][يَعْمَلُوْنَ : وہ عمل کرتے ہیں]

ترجمہ: اور وہ (ساتھ) یہ خیال کرتے رہے کہ (انبیاء کے قتل وتکذیب سے) کوئی عذاب نہیں آئے گا، سو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے تھے۔ پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی، پھر ان میں سے اکثر لوگ (دوبارہ) اندھے اور بہرے (یعنی حق دیکھنے اور سننے سے قاصر) ہوگئے، اور اللہ ان کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

تشریح: گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت کریں گے لیکن جب کبھی اللہ تعالیٰ کے رسول ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے احکام لے کر آئے جو ان کی خواہشات نفس کے خلاف تھے تو وہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے بعض انبیائے کرام (علیہم السلام) کی تکذیب کی اور بعض کو شہید کر دیا۔ اس قدر شدید جرائم کے باوجود وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ اس سے کوئی فتنہ برپا نہیں ہوگا اور ان سے ایسے شدید مظالم کے بارے میں کوئی بازپرس نہیں ہوگی گویا وہ احکام خداوندی اور اپنے مظالم کے برے انجام سے بالکل بہرے اور اندھے بن گئے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انھیں پکڑا اور مصائب میں گھر گئے تو توبہ کرنے لگے۔ اس قدر شدید جرائم کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور انھیں معاف کر دیا، لیکن جونہی حالات سازگار ہوئے تو ان میں سے اکثریت نے دوبارہ سرکشی اختیار کرلی اور احکام خداوندی سے اندھے اور بہرے بن بیٹھے مگر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے خوب آگاہ ہے اور وہ اپنے جرائم کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔

اس کے ذریعہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی تسلی دی جارہی ہے کہ اگر آج کے اہل کتاب آپ کی مخالفت میں سرگرم ہیں تو غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلاف تو ان سے بھی بڑھ کر تھے حتیٰ کہ انھوں نے بعض انبیاء کو شہید بھی کردیا جن میں حضرت زکریا (علیہ السلام) اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) بھی شامل تھے، اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کو بادشاہ وقت ہیرودیس نے اس لیے شہید کروادیا کہ بادشاہ اپنے بھائی کی منکوحہ بیوی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نے اعلان کردیا کہ مذہبی اعتبار سے یہ شادی جائز نہیں ہے۔

(بائبل: مرقس: باب 6: آیات 17 تا 28) (امداد)

اللہ تعالیٰ سے بار بار عہد شکنی، شریعتوں کی تکذیب، انبیاء (علیہ السلام) پر زیادتی کرنے اور اپنی خواہش کا بندہ بننے کی وجہ سے اہل کتاب بصیرت سے تہی دامن ہوگئے۔

جب کوئی قوم ایمان کی دعوے دار ہو کر اپنی خواہشات کو مقدم سمجھے، حقائق کی تکذیب کرے، مصلحین کی گستاخ اور ان کی جان کے درپے ہو جائے تو وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جایا کرتی ہے کہ اب انھیں کوئی روکنے، ٹوکنے والا نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ اس جرم میں مبتلا ہونے کے بعد اسی خوش فہمی کا شکار ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حقائق دیکھنے اور سننے سے بے بہرہ اور اندھے ہوگئے یہ تو اپنے آپ کو دیکھنے سے اندھے ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ تو ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر اور ہر دور میں ایسے حکمران مسلط کیے کہ جنھوں نے ان کو ایسی سزائیں دیں جو پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں تھیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرماتے ہوئے انھیں آزادی کی نعمت سے ہمکنار فرمایا لیکن بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے اور اپنے اعمال کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے پھر اندھے اور بہرہ پن کا مظاہرہ کیا۔

(وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَـٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ)

[الاعراف: ١٧٩]

"""اور بلاشبہ ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم کے لیے ہی پیدا کیے ہیں ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔"

امام رازی (رح) نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل پہلی مرتبہ حضرت زکریا (علیہ السلام)، حضرت یحییٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں مکمل طور پر اندھے اور بہرے پن کا شکار ہوئے اور دوسری مرتبہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے وقت اس مرض میں مبتلا ہوئے، سوائے چند لوگوں کے باقی یہود و نصاریٰ نے سرور گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کی تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) کو غلبہ نصیب فرمایا۔ یہودیوں کی بار بار عہد شکنی اور سازشوں کی وجہ سے غزوہ خندق کے بعد نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو ہمیشہ کے لیے سرزمین عرب سے نکال دیا۔ چودہ سو سال سے زائد عرصہ ہو چلا ہے یہودی ہزاروں کوششوں کے باوجود مدینہ میں داخل نہیں ہوسکے حالانکہ یہودی ہر دور میں اپنی قوم سے وعدہ لوگوں کے سامنے کرتے آرہے ہیں کہ ہم عنقریب مدینہ پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا اور نہ ہی قیامت تک ہوسکے گا۔ ان شاء اللہ (فہم)

فتنہ کے معنی

فتنہ کے کئی معانی ہیں۔ نقصانات اور مصائب کو بھی فتنہ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بداعمالیوں کی جو سزا دیتا ہے اس کو بھی فتنہ کہتے ہیں ' اور اس آیت میں یہی معنی مراد ہے اور اللہ کے نیک بندوں کو جس آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ' اس کو بھی فتنہ کہتے ہیں اس فتنہ کی وجہ سے نیک لوگوں کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے ہاروت اور ماروت کو بھی فتنہ فرمایا ہے ' کیونکہ ان کی وجہ سے لوگ آزمائش میں مبتلا ہوگئے تھے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دجال کو فتنہ فرمایا ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ بنو اسرائیل کا گمان یہ تھا کہ انھوں نے انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا ہے ' اس کی دنیا میں اس کو کوئی سزا نہیں ملے گی اور اس وجہ سے ان پر مصائب طاری نہیں ہوں گے اور وہ سمجھتے تھے کہ آخرت میں بھی ان کو عذاب سے نجات ہو جائے گی ' کیونکہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور اگر ان کو عذاب ہوا تو صرف چند دن عذاب ہوگا ' جتنے دن انھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔

بنو اسرائیل کا ہدایت سے دوبار اندھا اور بہرا ہونا

اس آیت میں بنو اسرائیل کے متعلق دو مرتبہ فرمایا ہے کہ وہ اندھے اور بہرے ہوگئے ' اس کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے دیکھ کر ہدایت حاصل کی اور نہ سن کر ہدایت حاصل کی ' ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان پر قحط مسلط ہو گیا اور ان پر وبائیں طاری کی گئیں ' لیکن انھوں نے اس سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کی۔ پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد اور بغض پیدا کر دیا گیا ' وہ ایک دوسرے کے خلاف لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ' لیکن انھوں نے اس سے بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کی

بنو اسرائیل ہدایت کو حاصل کرنے سے دو مرتبہ اندھے اور بہرے ہوئے۔ ایک مرتبہ حضرت زکریا ' حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں ' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی ' اور ان میں سے بعض کو ایمان لانے کی توفیق دی۔ ان میں سے پھر بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہوگئے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں انھوں نے آپ کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا اور کم لوگ ایمان لائے ' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام (رض)۔

اس آیت کا دوسرا محمل یہ ہے کہ پہلی بار یہ اندھے اور بہرے اس وقت ہوئے جب انھوں نے بچھڑے کی پرستش کی ' پھر انھوں نے توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا ' پھر دوبارہ یہ اندھے اور بہرے ہوگئے۔ جب انھوں نے سرکشی اور ہٹ دھرمی کی اور یہ کہا : کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں۔

اور اس کا تیسرا محمل یہ ہے کہ جب ان کے پاس حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) بھیجے گئے تو یہ ہدایت حاصل کرنے سے اندھے اور بہرے ہوگئے ' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کر لی اور اس کے بعد پھر یہ اندھے اور بہرے ہوگئے۔

علامہ طاہر بن عاشور متوفی ۱۳۸۰ ھ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دو تاریخی عظیم حادثوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنو اسرائیل کو پیش آئے۔ پہلا حادثہ وہ تھا جب اشور کا بادشاہ کئی مرتبہ بیت المقدس پر حملہ آور ہوا ' یہ ۶۰۶ ' ۵۹۸ ' ۵۸۸ ' سال قبل مسیح کے واقعات ہیں ' وہ تیسری مرتبہ یروشلم میں داخل ہوا ' اس نے مسجد کو جلا دیا اور تمام بنو اسرائیل کو ہانک کر بابل لے گیا اور وہاں ان کو قید

کردیا ' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور فارس کا بادشاہ کورش 'اشورییین پر غالب آیا اور اس نے ۵۳۰ سال قبل مسیح بابل پر قبضہ کرلیا 'اور یہودیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنے شہروں میں واپس چلے جائیں اور ان کو آباد کریں۔ سو واپس گئے اور انھوں نے اپنی مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا 'اس کے بعد انھوں نے پھر نافرمانی اور سرکشی کی اور یہ پھر ہدایت اور راہ حق سے اندھے اور بہرے ہوگئے 'اور تب دوسرا حادثہ پیش آیا۔ جب قیطس بن انبراطور رومانی نے یروشلم کا محاصرہ کرلیا 'حتی کہ یہود بھوک سے مجبور ہو کر چمڑا کھانے لگے اور بعض اوقات بھوک سے بلبلا کر ایک دوسرے کو کھا جاتے تھے۔ اس نے دس لاکھ یہودیوں کو قتل کردیا 'اور ستانوں ہزار یہودیوں کو قید کرلیا 'یہ ۶۹ء کا واقعہ ہے۔ پھر ابن انبراطور رومانی ۱۱۷ء سے ۱۳۸ء تک اس کے بعد حکمران رہا 'اس نے ان کے شہر کو منہدم کرکے سپاٹ زمین بنادیا اور اس وقت دنیا میں یہودیوں کی حکومت ختم ہوگئی تھی اور ان کا وطن ملیامیٹ ہوچکا تھا۔ (التحریر والتنویر 'ج ٦ 'ص ۲۷۸۔ ۲۷۷)

یہ دونوں تاریخی حادثے جو بنو اسرائیل کی بداعمالیوں کی پاداش میں رونما ہوئے تھے 'ان کی طرف قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

(آیت) "**وقضینا الی بنی اسرآئیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا۔ فاذا جآء وعد اولھما بعثنا علیکم عبادالنا اولی باس شدید فجاسوا خلل الدیار وکان وعدا مفعولا۔ ثم رددنالکم الکرۃ علیھم وامددنکم باموال وبنین وجعلنکم اکثر نفیرا۔ ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا فاذا جآء وعد الاخرۃ لیسوء وا وجوھکم ولیدخلوا المسجد کما دخلوہ اول مرۃ ولیتبروا ماعلوا تتبیرا۔ عسی ربکم ان یرحمکم وان عدتم عدنا وجعلنا جھنم للکفرین حصیرا**"۔ (بنو اسرائیل: ۸۔ ۴)

ترجمہ: ہم نے بنو اسرائیل کو کتاب میں قطعی طور پر یہ بتادیا تھا کہ تم ضرور زمین میں دو مرتبہ فساد کروگے اور تم ضرور بہت بڑی سرکشی کروگے، تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آپہنچا تو ہم نے تم پر اپنے سخت بندے مسلط کردیئے سو وہ تمہاری تلاش کے لیے شہروں میں پھیل گئے اور یہ ایسا وعدہ تھا جو ضرور پورا ہونا تھا، پھر ہم نے ان پر تمہارا غلبہ دوبارہ لوٹا دیا 'اور مال اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی اور تمہاری تعداد بڑھادی، اگر تم نے نیک کام کیے تو تم نے اپنی جانوں کے ساتھ بھلائی کی 'اور اگر تم نے برے کام کیے تو اپنے ساتھ برائی کی 'پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آپہنچا تو ہم نے دوسرے ظالموں کو تم پر مسلط کردیا 'تاکہ وہ تمہارے چہروں کو مضمحل کردیں اور مسجد میں داخل ہوں جیسا کہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں 'اسے تباہ و برباد کردیں، عنقریب تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم نے پھر سرکشی کی تو ہم پھر عذاب دیں گے 'اور ہم نے دوزخ کو کافروں کیلیے قید خانہ بنادیا ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں لکھ دیا تھا کہ بنو اسرائیل دو بار شرارت کریں گے۔ اس کی سزا میں دشمن ان کے ملک پر غالب ہوجائیں گے۔ پہلے وعدہ سے مراد بخت نصر کا حملہ ہے جو ولادت مسیح سے ۵۸۸ سال قبل ہوا 'اور دوسرے وعدہ سے قیطس (طیطوس) رومی کا حملہ ہے 'جو ۶۹ء میں ہوا۔ ان دونوں حملوں میں یہودوں پر مکمل تباہی آئی اور مقدس ہیکل کو برباد کردیا گیا۔

چونکہ یہودیوں نے یہ گمان کیا تھا کہ انھوں نے رسولوں کی جو تکذیب کی ہے 'اور ان کو قتل کیا ہے 'ان کو اس کی کوئی سزا نہیں ملے گی 'تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کا رد کرنے کے لیے فرمایا کہ انھوں نے دو بار سرکشی کی اور ہر بار اللہ نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی 'جس سے تمام یہودی ویران اور برباد ہوگئے 'اور ہر سزا کے بعد انھوں نے توبہ کی اور توبہ کے بعد وہ پھر اندھے اور بہرے ہوگئے۔ سو اب اگر انھوں نے ہمارے رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی اور آپ کو قتل کرنے کی سعی کی 'تو یہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے

نہیں بچ سکیں گے اور ایسا ہی ہوا ' انھوں نے آپ کی تکذیب بھی کی اور دو بار آپ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ آپ کو اللہ نے ان کے شر سے محفوظ رکھا اور ان کو قتل کیا گیا اور جلاوطن کیا گیا اور دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کر دی گئی۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

لغۃ القرآن: [لَقَدْ : یقیناً][كَفَرَ : اس نے کفر کیا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][هُوَ : وہی][الْمَسِيْحُ : مسیح][ابْنُ مَرْيَمَ : بیٹا مریم][وَقَالَ : اور کہا][الْمَسِيْحُ : مسیح نے][يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ :: اے بنی اسرائیل][اعْبُدُوا : تم عبادت کرو][اللّٰهَ : اللہ][رَبِّيْ : میرا رب][وَرَبَّكُمْ : اور تمہارا رب][اِنَّهٗ : یقیناً وہ][مَنْ : جو][يُّشْرِكْ : وہ شرک کرے][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ][فَقَدْ : سو یقیناً][حَرَّمَ : حرام کیا][اللّٰهُ : اللہ][عَلَيْهِ : اس پر][الْجَنَّةَ : جنت][وَمَاْوٰىهُ : اور اس کا ٹھکانا][النَّارُ : آگ][وَمَا : اور نہیں][لِلظّٰلِمِيْنَ : ظالموں کے لیے][مِنْ : سے][اَنْصَارٍ : مدد گار]

ترجمہ: درحقیقت ایسے لوگ کافر ہوگئے ہیں جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم (علیہما السلام) ہے حالانکہ مسیح (علیہ السلام) نے (تو یہ) کہا تھا: اے بنی اسرائیل! تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا (بھی) رب ہے اور تمہارا (بھی) رب ہے۔ بیشک جو اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام فرما دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ظالموں کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

تشریح:

یہ حقیقت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ یہودی انبیاء (علیہ السلام) کی تکذیب اور ان کو قتل کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے جبکہ عیسائی عیسیٰ (علیہ السلام) کی محبت اور ان کی والدہ کے احترام میں غلو کی وجہ سے صراط مستقیم سے ہٹ گئے۔

عیسائیوں کی گمراہی کے دو اسباب ہیں ان میں کچھ لوگ تو اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ قرار دیا ہے جس کا منطقی مفہوم یہ بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا جزو یعنی اس کی ذات کا حصہ ہے۔ عیسائیوں کے دوسرے گروہ نے جان بوجھ کر عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اس کی والدہ حضرت مریم کو خدا کی بیوی قرار دیتے ہوئے کہا کہ تینوں کو ملا کر خدا کی ذات مکمل ہوتی ہے۔ کچھ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی خدا ہیں۔ اس طرح یہ لوگ ایک گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہیں جو علم کی دنیا میں ایک مذاق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پھر عیسائیوں نے یہ عقیدہ گھڑا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو تختہ دار پر لٹکا کر اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تا کہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بن سکے حالانکہ عیسیٰ (علیہ السلام) نہ سولی پر لٹکائے گئے اور نہ انھوں نے شرک کی تائید کی وہ تو بار بار فرماتے رہے کہ اے بنی اسرائیل صرف ایک اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ یاد رکھو جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں شرک کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر ہمیشہ کے لیے جنت کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کا ٹھکانا آگ ہے۔ ایسے ظالموں کے لیے قیامت کے دن کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ (فہم)

جو عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا سمجھتے ہیں ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے، بعض تثلیث کے قائل ہیں یعنی وہ تین میں سے ایک ہے اور بعض کہتے ہیں کہ "خدا نے ذات عیسیٰ میں حلول کیا اور وہ ان کے ساتھ متحد ہو گیا تو عیسیٰ خدا ہو گیا۔" (تفسیر خازن) یعنی جس طرح دودھ اور پانی متحد ہو جائیں تو پانی بھی دودھ بن جاتا ہے اسی طرح خدا کے اتحاد سے عیسیٰ بھی خدا ہو گیا۔

اس آیت میں اس تیسرے فرقے کی تردید کی گئی ہے جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ دراصل ایسا عقیدہ رکھنے والے کافر ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمات کے منکر ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے خدا ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ خدا کے بندے ہیں اور صرف اسی کی عبادت کرنا ہی صراط مستقیم (سیدھا راستہ) ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔" (قرآن: 30:19) "بیشک اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور آپ سب کا بھی رب ہے، لہٰذا اسی کی عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے۔" (قرآن: 36:19) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت کے قریب دمشق (شام) میں جب سفید منارے کے قریب نازل ہوں گے۔ (ترمذی: 2240: ابواب الفتن: باب 59) تو زمین پر اترنے کے بعد ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ نبی آخر الزمان حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک عظیم امتی (حضرت امام مہدی) کی اقتدا میں (صبح کی) نماز ادا کریں گے۔ (بخاری: 3449: کتاب احادیث الانبیاء: باب 49) اور ایک ہی خدا کی عبادت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ہر رکعت میں (ایاک نعبد) اور صراط مستقیم کی دعا (اھد ناالصراط المستقیم) پر آمین کہیں گے اور اسی صراط مستقیم یعنی اسلام کی تبلیغ میں اپنی بقیہ زندگی گزار کر روضہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں دفن ہوں گے۔ (ترمذی: 3617: ابواب المناقب: باب 1) (اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آج 9 مئی 2003ء بروز جمعۃ المبارک میں (مصنف) یہ سطور دمشق (شام) میں اس سفید مشرقی منارہ کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہا ہوں جس پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نزول ہوگا۔)

حیرت کی انتہا ہے کہ مریم کا بیٹا بھی کہتے ہیں اور پھر ان کو خدا بھی سمجھتے ہیں۔ جو اپنی پیدائش میں ماں کا محتاج ہے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ دراصل خدا وہ ہے جو مریم و عیسیٰ (علیہاالسلام) اور ساری کائنات کا رب ہے۔ وہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: ہمیں ہر صورت میں خدا کی عبادت کرنا ہے اور صرف اسی کی۔ (لوقا: 4: 8) (امداد)

عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کا رد

یہ آیت ان عیسائیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) اور ان کی والدہ کو خدا کہتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو تین میں کا تیسرا اقرار دیتے تھے۔

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بداعمالیوں کا بیان فرمایا اور ان کے شبہات کا ابطال کیا اور اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کا رد شروع کیا ہے اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جو ان کا الوہیت کا عقیدہ تھا اس کو باطل کیا ہے' اور خود حضرت مسیح (علیہ السلام) کے قول سے ان کا رد کیا ہے' اور یہ ان کے خلاف حجت قاطعہ ہے۔

نصاریٰ میں سے ایک فرقہ یعقوبیہ ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے' وہ کہتے ہیں کہ اللہ تین اقانیم (اصلوں) سے مرکب ہے۔ باپ' بیٹا اور روح القدس۔ باپ اللہ ہے اور بیٹا مسیح ہے اور باپ (اللہ) بیٹے (مسیح) میں حلول کرکے اس کے ساتھ متحد ہو گیا' اور وہ روح القدس بن گیا اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا عین ہے اور ان کے اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے' حالانکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے پیدا ہوتے ہی جو کلمہ سب سے پہلے کہا' وہ یہ تھا "میں اللہ کا بندہ ہوں"۔

(آیت) "قال انی عبداللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیا ،وجعلنی مبارکا این ما کنت واوصانی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیا"۔ (مریم: ۳۱۔ ۳۰)

ترجمہ: (مسیح نے کہا) بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور میں جہاں بھی ہوں' مجھے برکت والا بنایا اور جب تک میں زندہ ہوں' مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا۔

اور اس آیت میں حضرت مسیح کا یہ قول نقل فرمایا اے بنو اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے' بیشک جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا' تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ (تبیان)

عیسائی بھی معیار پر نہ اترے

یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھلائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے۔ ان کے ایمان باللہ کا حال یہ ہے کہ عقل کے خلاف، فطرت سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا۔ ایک تین اور تین ایک کی بھول بھلیاں تو محض برائے نام ہیں حقیقۃً سارا زور و قوت صرف حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود

حضرت مسیح (علیہ السلام) خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مربوب ہونے کا اعلانیہ اعتراف فرما رہے ہیں۔ اور جس شرک میں ان کی امت مبتلا ہونے والی تھی اس کی برائی کس زور و شور سے بیان کر رہے ہیں۔ پھر بھی ان اندھوں کی عبرت نہیں ہوتی۔

عیسائیوں کا عقیدہ حلول

حقیقت خداوندی اور حقیقت انسانی کامل کر ایک ہو جانا محال ہے اور بری عجیب بات ہے کہ عیسائی ہندوؤں کو کافر مانتے ہیں لیکن انہی کی باتیں اپنے عقائد یں رکھتے ہیں۔ اگر عقلاء نصرانیت یہ دعوی کریں کہ حقیقیت خداوندی اور حقیقت انسانی کا اتحاد محال نہیں بلکہ ممکن ہے تو پھر نصاری یہ بتلائیں کہ اللہ تعالیٰ کا جسم فرعون اور جسم نمرود کے ساتھ اور رامچندر اور کرشن کے ساتھ متحد ہو جانا کس دلیل سے محال ہے جو کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ نصاری کے نزدیک جب ایک جسم بشری میں اللہ کا حلول اور نزول جائز ہے تو نمرود اور فرعون اور کرشن اور رامچندر کے جسم میں اللہ کا حلول اور نزول کس دلیل سے محال ہے نصاری اس کا جواب دیں گے اور اگر بالفرض نصاری کے نزدیک مریم کے بیٹے کا خدا ہونا ممکن ہے تو کوسلیا کے بیٹے یعنی رامنچندر کا اور نوکی کے بیٹے یعنی کہنیا کا خدا ہونا کیوں ناممکن ہے اور بشن اور مہادیو اور برہما جن کو ہندو لوگ اسی طرح خدا مانتے ہیں جس طرح نصاری حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا مانتے ہیں نصاری بتلائیں کہ یہ کیوں خدا نہیں ہو سکتے۔ (گلدستہ)

فوائد

ا: عیسائیوں میں یعقوبیہ اور ملکانیہ فرقہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کہتا تھا۔ یہ لوگ حلول الوہیت کے قائل تھے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) میں الوہیت ایسی سرایت کی ہوئی ہے جیسے پھول میں رنگ و بو، اسی طرح شیعوں میں نصیر یہ فرقہ حضرت علی (رض) کو خدا کہتا ہے، ان کا مطلب بھی یہی ہے۔

۲: یعنی ان عیسائیوں کی یہ بکواس خود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعیم کے خلاف ہے کہ وہ تو اپنے کو رب کا بندہ کہتے تھے اور یہ انھیں رب کہنے لگے۔

۳: اس سے معلوم ہوا کہ رب کے لیے اولاد ماننا شرک ہے اور وہ عیسائی جن کا یہ عقیدہ ہو مشرک ہیں۔ لیکن پھر بھی انھیں اہل کتاب اس لیے کہا جاتا ہے، کہ وہ آسمانی کتاب انجیل کے قائل ہیں۔ جو مشرکین فرشتوں کو رب کی بیٹیاں مانتے تھے، وہ اس لیے مشرک کہلائے کہ کسی کتاب کو نہ مانتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کو مان لینا کبھی شرک و کفر کو بھی ہلکا کر دیتا ہے اور کبھی اس سے کفر سخت بھی ہو جاتا ہے جیسے اسلام کے مرتد فرقے۔

۴: معلوم ہوا کہ رب نے مسلمانوں کے مددگار مقرر فرمادیئے ہیں، کیونکہ مددگار نہ ہونا کفار کا عذاب ہے جس سے مسلمان محفوظ ہیں۔

آیت مبارکہ:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

لغۃ القرآن: [لَقَدْ : البتہ تحقیق][كَفَرَ : کفر کیا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][ثَالِثُ : تیسرا][ثَلٰثَةٍ : تین (میں سے)][وَمَا : اور نہیں][مِنْ : سے][اِلٰهٍ : معبود][اِلَّآ : مگر][اِلٰهٌ: معبود][وَّاحِدٌ : ایک][وَاِنْ : اور اگر][لَّمْ يَنْتَهُوْا : نہ وہ باز آئے][عَمَّا : اس سے جو][يَقُوْلُوْنَ : وہ کہتے ہیں][لَيَمَسَّنَّ : ضرور پہنچے گا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا][مِنْهُمْ : ان میں سے][عَذَابٌ : عذاب][اَلِيْمٌ : اذیت والا]

ترجمہ: بیشک ایسے لوگ (بھی) کافر ہوگئے ہیں جنھوں نے کہا کہ اللہ تین (معبودوں) میں سے تیسرا ہے، حالانکہ معبود یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور اگر وہ ان (بیہودہ باتوں) سے جو وہ کہہ رہے ہیں باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو دردناک عذاب ضرور پہنچے گا۔

تشریح:

عیسائیوں کے باطل عقیدہ کی تردید اور انھیں اس عقیدہ سے توبہ کی تلقین کی گئی ہے

آدمی جب حقائق دیکھنے سے اندھا اور دلائل سننے سے بہرہ ہو جائے تو وہ کفر کی وادیوں میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے عیسائی اس جرم کے مرتکب ہوئے تو حقائق جاننے کے باوجود عیسیٰ (علیہ السلام) کی محبت میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے مرتکب ہوئے کہ اللہ، عیسیٰ اور مریم ایک دوسرے سے ہیں اور اللہ اس مثلث میں سے ایک ہے۔

توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ سمجھے شرک تمام گناہوں کا منبع، آخری درجے کا ظلم اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غداری کرنے کے مترادف ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی توحید سے آگاہ فرماتے ہوئے انسانی رشتوں کے درجہ بدرجہ احترام کا حکم دیا ہے لیکن کوئی انسان کس قدر نیک، صالح اور دین و دنیا کے لحاظ سے کتنا ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو وہ بالآخر انسان ہی رہتا ہے لہٰذا انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا بندہ ہونے کے سوا کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔

سورۃ اخلاص میں اس عقیدہ کو نہایت سادہ لیکن مکمل انشراح کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ وہ ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ اس سے کوئی چیز نکلی اور پیدا ہوئی ہے اور نہ اس کی کوئی برابری کرنے والا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک ہے اور بے مثال ہے لیکن افسوس مشرک اس بات کو سمجھنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے یہودیوں نے حضرت عزیر (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا۔ عیسائی دو قدم آگے بڑھتے ہوئے عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا اور مریم [کو اللہ کی بیوی قرار دیتے ہیں اور اس عقیدہ کا نام تثلیث رکھا۔ افسوس امت مسلمہ کی اکثریت شرک کی تمام اقسام کا ارتکاب کر رہی ہے جبکہ ہر نبی اپنی امت کو اور عیسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو صرف اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی ایک معبود حقیقی ہے لہٰذا انسان کو ایک اللہ ہی کو اپنا معبود، مشکل کشا، حاجت روا اور خالق و مالک سمجھ کر اس کی عبادت کرنی چاہیے جو لوگ عقیدہ تثلیث اور شرک سے باز نہیں آئیں گے اللہ تعالیٰ انھیں درد ناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (فہم)

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی ایک معبود حقیقی ہے لہٰذا انسان کو ایک اللہ ہی کو اپنا معبود، اور خالق و مالک سمجھ کر اس کی عبادت کرنی چاہیے جو لوگ عقیدہ تثلیث اور شرک سے باز نہیں آئیں گے اللہ تعالیٰ انھیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ البتہ جنھوں نے شرک سے توبہ کی اور اللہ کے حضور معافی کے خواستگار ہوئے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے گا کیونکہ وہ نہایت ہی معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

(عن ابی وائل (رض) قَالَ سَمِعْتُ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُولُ یُجَاءُ بِالرَّجُلِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُلْقَی فِی النَّارِ فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُهُ فِی النَّارِ فَیَدُورُ کَمَا یَدُورُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ فَیَجْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَیْهِ فَیَقُولُونَ أَیْ فُلَانُ مَا شَأْنُكَ أَلَیْسَ کُنْتَ تَأْمُرُنَا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْکَرِ قَالَ کُنْتُ آمُرُکُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِیهِ وَأَنْهَاکُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَآتِیهِ) [رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفۃ النار]

”حضرت ابو وائل (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن ایک آدمی کو جہنم میں پھینکا جائے۔ وہ آگ میں اپنی انتڑیوں کے گرد چکر لگائے گا جس طرح گدھا کنویں کے گرد چکر لگاتا ہے جہنم کے لوگ اکٹھے ہو کر اسے کہیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے کیا تم ہمیں نیکی کی ترغیب اور برے کاموں سے روکتے نہیں تھے وہ کہے گا میں تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتا تھا مگر خود نہیں کیا کرتا تھا۔ تمہیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا مرتکب ہوا کرتا تھا۔“

(عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اَللّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ مِنْ أَحَدِکُمْ إِذَا اسْتَیْقَظَ عَلَی بَعِیرِهِ قَدْ أَضَلَّهُ بِأَرْضِ فَلَاةٍ) [رواہ مسلم: کِتَابُ التَّوْبَةِ، بَابٌ فِی الْحَضِّ عَلَی التَّوْبَةِ وَالْفَرَحِ بِهَا]

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ اپنے بندوں کے توبہ کرنے سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کو اس کا اونٹ بے آب و گیاہ علاقے میں چھوڑ کر دوبارہ ملے۔“

(لَّقَدۡ كَفَرَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ ثَالِثُ ثَلَٰثَةٖۘ وَمَا مِنۡ إِلَٰهٍ إِلَّآ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۚ وَإِن لَّمۡ يَنتَهُواْ عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ) [المائدۃ: ۷۳]

"بلا شبہ وہ لوگ کافر ہو چکے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے حالانکہ اِلٰہ تو صرف وہی اکیلا ہے اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جو انکار کرتے رہے انھیں المناک عذاب ہوگا۔" (فہم)

عقیدہ تثلیث کی حقیقت کیا ہے؟

عیسائیوں نے اسے کب اور کیوں اختیار کیا؟ کیا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے کسی قول سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ کیا پہلی تین انجیلوں میں یہ عقیدہ موجود ہے؟ جب تک ان سوالات کا تحقیقی جواب نہ دیا جائے نہ ہم قرآن حکیم کی ان آیات کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ علیٰ وجہ البصیرت مسیحی عقائد کے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں۔ آیئے نہایت صبر و سکون اور متانت و سنجیدگی سے ان امور کی تحقیق کریں۔

اس وقت میرے پیش نظر بائیبل کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا (مطبوعہ 1962ء) ہے۔ جو دنیا بھر کے فضلا اور محققین کی کاوشوں کا مجموعہ ہے۔ اور جسے تمام علمی حلقوں میں مستند ترین کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسیحیت کے متعلق میں نے اس میں عیسائی علماء کے مضامین کا مطالعہ کیا ہے ان کے مطالعہ سے میں جن نتائج پر پہنچا ہوں وہ ہدیہ ناظرین ہیں:۔

مسیحیت (Christianity) کے موضوع پر جارج ولیم ناکس (G.W. KNOX) اور سڈنی ہربرٹ میلون (S.H. MELLONE) نے مل کر جو محققانہ مقالہ لکھا ہے اس میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"مسیح نے خود بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی اصل کوئی مافوق الفطرت چیز ہے بلکہ وہ اس پر مطمئن تھے کہ انھیں مریم اور جوزف کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جائے"۔ (انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد 5، صفحہ 632)۔

اس خیال کی تائید میں انھوں نے مرقس کی انجیل باب ششم کی آیات نمبر 3، 4 کا حوالہ دیا ہے۔ "کیا یہ وہی بڑھئی نہیں جو مریم کا بیٹا اور یعقوب اور یوسیس اور یہوداہ اور شمعون کا بھائی ہے؟ اور کیا اس کی بہنیں یہاں ہمارے ہاں نہیں؟ پس انھوں نے اس کے سبب ٹھوکر کھائی۔ یسوع نے ان سے کہا نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔

یوحنا کی یہ آیت بھی زیر نظر رہے۔ "پھر ان دو دنوں کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو کر گلیل کو گیا کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ نبی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا" (4:43،44) لوقا کی یہ آیت بھی توجہ طلب ہے۔

"مگر مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو"۔ (13:33)

اناجیل کی ان آیات اور سابقہ تصریح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ہمیشہ اپنے آپ کو مریم کا بیٹا کہلوایا اور اپنے نبی ہونے کا بار بار اعلان کیا اور کبھی بھی اپنے آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں کہا۔

(ان تصریحات سے اسی سورۃ کی آیت نمبر 116 کی تصدیق بھی ہو گئی)

جب حقیقت یہ ہے تو پھر تثلیث (تین خدا) اور ابنیت کا نظریہ اس دین میں کیونکر گھس آیا۔ اس کے متعلق بھی مذکور بالا فاضلوں کی یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے:۔

"باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحات کو یہودی ذرائع نے مہیا کیا۔ یسوع نے شاذو نادر ہی آخری اصطلاح استعمال کی ہو۔ (سینٹ) پال کے متعلق بھی یہ واضح نہیں کہ اس نے اسے استعمال کیا۔ چنانچہ تثلیث کا مواد یہودی ہے۔ جسے یونانی (فلسفہ کے) اثر ورسوخ نے اس قالب میں ڈھالا ہے"۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد 5 صفحہ 633۔

دین مسیحی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت جو چیز بڑی عجیب و غریب اور انوکھی معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دین کے بنیادی عقائد وہ نہیں جو اس دین کے بانی حضرت مسیح (علیہ السلام) نے بتائے ہیں یا جو انجیلوں میں مذکور ہیں بلکہ اس کے بنیادی عقائد وہ ہیں جو پادریوں کی کونسلیں مختلف حالات میں مقرر کرتی رہی ہیں۔ اور یہ کونسلیں اس امر کی مجاز ہیں کہ حضرت مسیح پر ایمان رکھنے والے اگر ان کے منظور کردہ عقائد سے انحراف کریں تو وہ انھیں مرتد قرار دے کر اس دین سے خارج کردیں۔ ان کونسلوں کی داستان بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

مجھے اب آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ جب تثلیث کا کوئی سراغ ہمیں یسوع مسیح کے کلام میں نہیں ملتا اور انجیلوں کی آیات بھی مسیح کی ابنیت (بیٹا ہونا) کی بجائے ان کی نبوت ثابت کررہی ہیں تو پھر یہ مشرکانہ نظریہ کیسے اور کب نمودار ہوا۔ اس کے متعلق بھی انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے حقیقت حال پیش کرتا ہوں۔

قسطنطین کے تخت نشین ہونے سے پہلے عیسائیوں پر طرح طرح کے مظالم کیۓ جاتے تھے اور حکومت روم کی نگاہوں میں بھی یہ معتوب تھے۔ لیکن یہ مذہب آہستہ آہستہ پھیلتا رہا اور تقویت پکڑتا رہا۔ قسطنطین جب رومن ایمپائر کا فرمانروا بنا تو اس نے 313ء میں میلان کے فرمان شاہی کے ذریعہ مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اپنی سیاسی اغراض کی وجہ سے عیسائیوں پر عنایات خسروانہ کی بارش شروع کردی تاکہ ان کی کثیر آبادی کی ہمدردیاں اور وفاداریاں حاصل کرکے اپنی حکومت کو مستحکم کرلے۔ اور 337ء میں جب وہ بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا تو اس نے عیسائی مذہب قبول کیا اور اسے بپتسمہ دیا گیا۔ یہ تو ان کے سیاسی حالات تھے۔ لیکن اس سے پہلے تین صدیوں میں ان کے عقائد میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں۔ اور قسطنطین کی سرپرستی میں ان کیا قطع و برید کی گئی۔ اس کے متعلق تاریخ کلیسا (Church History) کے عنوان پر چار مسیحی فضلاء نے جو لکھا ہے اس کا اقتباس پیش خدمت ہے:۔

"تیسری صدی کے ختم ہونے سے پہلے یسوع کو کلام الٰہی (LOGOS) کا مجسمہ تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن اس کی الوہیت کا عام طور پر انکار کیا جاتا تھا۔ اس اثنا میں ایریس (Arius) تنازعہ نے چوتھی صدی کے کلیسا کو جس اضطراب و حیرت میں مبتلا کردیا تھا اس نے لوگوں کی توجہ کو اس مسئلہ کی طرف مبذول کیا۔ نیقیا (Nicaea) کی کونسل جو 323ء میں منعقد ہوئی اس میں سرکاری طور پر یسوع کی الوہیت کو تسلیم کرلیا گیا جسے باضابطہ طور پر مرتبہ کرنے کے بعد (Nicene Creed) کا نام دیا گیا۔ تنازعہ کچھ عرصہ جاری رہا۔ لیکن آخر کار مشرق و مغرب کے عیسائیوں نے اسی عقیدہ کو صحیح مسیحی عقیدہ مان لیا۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح القدس کی الوہیت بھی تسلیم کرلی گئی۔ نیقیا کے عقیدہ کی فتح نے تثلیث کو عیسائی مذہب کے صحیح عقائد کا جزو لاینفک بنادیا۔ بیٹے کی الوہیت کا مظہر یسوع کو قرار دینے سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہوگئی جو چوتھی صدی اور اس کے بعد عرصہ تک مابہ النزاع بنی رہی۔ وہ یہ کہ یسوع میں الوہیت اور انسانیت کا باہمی تعلق کیا ہے؟ کالسیڈن (Chalcedon) کی کونسل جو 451ء میں منعقد ہوئی اس میں یہ قرار پایا کہ مسیح کی ذات میں الوہیت اور انسانیت دونوں یکساں طور پر مجتمع ہیں اور باہمی امتزاج کے باوجود دونوں کی خصوصیات جوں کی توں قائم ہیں۔ قسطنطیہ کی تیسری کونسل جو 680ء میں منعقد ہوئی اس میں اس پر مزید اضافہ کیا گیا کہ ان دو ماہیتوں کی الگ الگ مرضی اور مشیت ہے۔ مسیح دونوں مشیتوں کا مالک ہے۔ مغربی کلیسا نے نیقیا، کالسیڈن اور قسطنطنیہ کے فیصلوں کو قبول کرلیا اور اس طرح تثلیث اور مسیح کے اندر دو مشیتوں (خدائی اور انسانی) کے وجود کے نظریات کو مشرق و مغرب کے کلیساؤں نے بحیثیت پختہ اور صحیح عقیدہ کے مان لیا"۔ (انسائیکلو پیڈیا جلد 5۔ صفحہ 78۔677)

اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ تثلیث وابنیت کے عقائد خدا اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے عقائد نہیں ہیں بلکہ سینکڑوں سال بعد انعقاد پذیر ہونے والی کونسلوں نے انھیں گھڑا اور عیسائیوں کے لیے ان پر ایمان لانا ضرور قرار دیا۔ قرآن کریم نے بارہا علماء اہل کتاب کے متعلق جو یہ اعلان فرمایا کہ وہ اپنی طرف سے باتیں گھڑتے ہیں اور پھر اسے خدا کی طرف اور اس کے پیغمبروں کی طرف منسوب کردیتے ہیں اس کا کتنا واضح ثبوت ان کی اپنی تاریخ نے فراہم کردیا۔

لیکن یہ بحث تشنہ تکمیل رہے گی اگر یہ نہ بتایا جائے کہ نیقیا کی کونسل میں مسیح کی الوہیت کا جو افترا باندھا گیا اس کے محرکات کیا تھے ؟ اور کیا اس کونسل میں شرکت کرنے والے سارے بشپ اس عقیدہ کو دل وجان سے تسلیم کرتے تھے یا نہیں ؟

یہ بات سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کا سمجھنا لازمی ہے۔ قسطنطین کی حمایت وسرپرستی میں عیسائیت کو امن وسکون نصیب ہوا تو ان میں نظریاتی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے باعث ان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور ان کی سیاسی قوت زوال پذیر ہونے لگی۔ اس طرح قسطنطین نے جس خیال سے ان کی حمایت شروع کی تھی وہ خواب پریشان ثابت ہونے لگا۔ چنانچہ اس داخلی انتشار کو دور کرنے کے لیے اس نے نیقیا میں تمام عیسائی علماء کی کونسل طلب کی۔ جس کے اجلاس 20۔ مئی سے 25۔ جولائی 323ء تک جاری رہے۔ سب سے اہم مسئلہ جو زیر بحث آیا وہ یہ تھا کہ

یسوع کا تعلق خدا سے کس نوعیت کا ہے ؟

یہ بھی یاد رہے کہ اس کونسل کا داعی بھی قسطنطین تھا۔ اس کے جملہ مصارف بھی اس نے اپنی گرہ سے ادا کئے اور اس کے کئی اجلاسوں میں شرکت بھی کی اور ان کے فیصلوں کو اپنے شاہی اختیارات سے نافذ کیا اور جس نے ماننے سے انکار کیا اس کو سزائیں دیں۔ (انسائیکلوپیڈیا جلد 6۔ صفحہ 588)

اس کونسل کے انعقاد کے محرکات اور پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد مسیح کی الوہیت کے متعلق جو قرار داد پاس کی گئی اب اس کے متعلق مسیحی فاضلوں کی آرا سنئیے :۔

"یہ درست ہے کہ کثرت آرا سے نیقیا کی کونسل میں اسکندریہ کے عقیدہ کو منظور کیا گیا لیکن یہ اتفاق قلبی یقین وایمان سے رو پذیر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شرکت کرنے والے پادریوں کی اکثرت غیر جانب دار تھی۔ انھیں اس سے کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی۔ دوسری وجہ شاہی اختیارات اور ان کا دباؤ تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس تاریخ شہادت موجود ہے وہ یہ کہ ایریس (Arius) کے خلاف یہ فیصلہ اگر پورے غور وفکر کے بعد کامل ایمان ویقین سے کیا گیا ہوتا تو پھر اس عقیدہ کے حق میں رائے دینے والے ایریس سے کبھی نرم برتاؤ نہ کرتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ عقیدہ فقط ان لوگوں کی طرف سے مسلط کیا گیا تھا جو اس کونسل کے بانی تھے (یعنی قسطنطین اور اس کے اعیان حکومت) ان حالات میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ کثرت آراء قطعاً اس بات کا معیار نہیں کہ مسیح کی الوہیت کا جو عقیدہ اس کونسل میں منظور ہوا اس میں کونسل کے ارکان کا قلبی یقین بھی کارفرما تھا"۔

فاضل مقالہ نگار مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ نیقیا کی کونسل کے متعلق اپنی نگارشات کا اختتام کرتا ہے :۔

"اس مصنوعی اور بناوٹی اتحاد سے جو عقیدہ گھڑا گیا تھا وہ امن برقرار رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اس نے ایسے جھگڑوں کے لیے راہ ہموار کردی جن کے باعث مملکت کی بنیادیں لرز گئیں۔ نیقیا کے اس عقیدہ کے اعلان کے بعد لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کردیا۔ اور یہ عقیدہ جو

کلیسانے فکروتدبر کے بغیر اپنے اوپر مسلط کرلیا تھااس کی تشریح و توضیح کرتے وقت کلیسا کو ایسی مذہبی بحثوں میں الجھناپڑا جن کا راستہ بڑا دشوار اور پر خار تھا۔ (انسائیکلوپیڈیابریٹانیکا جلد 16 صفحہ 410)

ان تاریخی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اب ان آیات لقد کفر الذین قالواالخ کو غور سے پڑھو۔آفتاب حقانیت کی تابانیاں آپ کی چشم خرد کو روشن کردیں گی اور اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ کی آیت نمبر 48 میں قرآن کو سابقہ آسمانی کتب کے نگہبان (مھیمنا علیہ) کا جو لقب عطا فرمایا ہے۔اس کی صداقت آشکارا ہو جائے گی۔

خدارا بتایئے کیا اس دین کو دین الٰہی کہنا بجا ہے جس کے بنیادی عقائد چند آدمیوں نے سیاسی دباؤ اور سیاسی اغراض کی خاطر صدہا سال بعد خود وضع کئے ہوں اور ان میں اپنے پیغمبر کے ارشادات سے واضح انحراف کیا گیا ہو۔ مسیحیت کو اس کی اپنی تاریخ کے آئینہ میں آپ نے دیکھ لیا۔اس کے بعد کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

عیسائیوں میں فرقہ مرقوسیہ اور نسطوریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ الٰہ تین ہیں، باپ بیٹا روح القدس، اللہ تعالیٰ کو باپ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس کا بیٹا اور حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو رُوحُ القُدُس کہتے ہیں۔علم کلام کے ماہر علماء فرماتے ہیں کہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ باپ بیٹا روحُ القدس یہ تینوں ایک الٰہ ہیں۔مَعَاذَاللہ۔ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کا کوئی ثانی ہے نہ ثالِث۔وہ وحدانیت کے ساتھ موصوف ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، باپ بیٹے بیوی سب سے پاک ہے۔اگر یہ کفار اس عقیدے سے باز نہ آئے اور تثلیث (تین خدا ماننے) کے معتقد رہے اور توحید اختیار نہ کی تو آخرت میں دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔ (صراط)

متقدمین اور متاخرین عیسائیوں کا نظریہ تثلیث اور اس کا رد

قدیم عیسائی یہ کہتے تھے کہ اللہ ٗمریم اور عیسیٰ تین خدا ہیں اور قرآن مجید نے انہی لوگوں کو رد کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "واذ قال اللہ یعیسی ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ قال سبحنک مایکون لی ان اقول مالیس لی بحق"۔ (المائدہ: ۱۱٦)

ترجمہ: اور جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم: کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنالو ٗوہ عرض کریں گے تو پاک ہے ٗمیرے لیے یہ جائز نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔

اور متاخرین عیسائی یہ کہتے ہیں کہ جوہر واحد تین اقانیم (اصلیں) باپ ٗبیٹا اور روح القدس ٗاور یہ تینوں ایک خدا میں جیسے سورج تین چیزوں پر مشتمل ہے۔قرص ٗشعاع اور حرارت۔اور باپ سے ان کی مراد ہے ذات ٗاور بیٹے سے مراد ہے کلمہ ٗاور روح سے مراد ہے حیات۔وہ کہتے ہیں کہ کلمہ اللہ کا کلام ہے جو حضرت عیسیٰ کے جسم میں مختلط ہو گیا ٗجیسے پانی شراب میں مخلوط ہو جاتا ہے ٗیا پانی دودھ میں مخلوط ہو جاتا ہے ٗاور ان کا زعم ہے کہ باپ خدا ہے ٗبیٹا خدا ہے اور روح خدا ہے۔

عیسائیوں کا یہ قول بدیہی البطلان ہے ٗکیونکہ تین ایک نہیں ہوتا اور ایک تین نہیں ہوتا اور عیسائیوں کے اس قول سے زیادہ فاسد اور باطل قول دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ (تبیان)

یعنی اور کوئی خدا ہے ہی نہیں سوائے اس کے جو صفت وحدانیت سے متصف ہے۔اس جملہ میں "ما" استغراق نفی کا فائدہ دیتا ہے یعنی کسی قسم کا تعدد نہیں نہ ذات میں نہ اعتبار میں۔صرف وہی خدا ہے جو ہر طرح کی کامل وحدانیت اور یکتائی سے متصف ہے۔ (ضیاء)

تثلیث ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر تقریباً سارے عیسائی متحد ہیں لیکن اس کی تعبیر اور تفصیل میں اختلاف کا شکار ہیں۔ ایک فرقے کا دعویٰ ہے کہ اللہ، عیسیٰ اور مریم تین خدا ہیں۔ (تفسیر کبیر) دوسرا فرقہ کہتا ہے: اللہ، عیسیٰ اور جبرائیل تین خدا ہیں (تفسیر کبیر) یعنی اللہ کی باپ، عیسیٰ کا بیٹا اور جبرائیل کو مقدس روح کہتے ہیں، پھر ان تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ کامل خدا ہے اور یہ تین مل کر صرف ایک خدا ہے یعنی تین میں ایک خدا اور ایک میں تین خدا، حالانکہ عملی طور پر ایک کا تین اور تین کا ایک ہونا ممکن نہیں ہے، جیسے ایک سیب ایک ہی ہے وہ تین نہیں ہو سکتا اور تین سیب تین ہی ہیں وہ ایک نہیں ہو سکتے۔

بہر حال تثلیث ایک ایسا معمہ ہے

جس کو سلجھانے کے لیے عیسائی علماء گزشتہ 1900 برس سے سر کھپا رہے ہیں مگر آج تک اس کی کوئی معقول اور قابل فہم تعبیر پیش نہیں کر سکے، اور نہ ہی آئندہ پیش کر سکیں گے کیونکہ یہ نظریہ حقیقت کے خلاف ہے اور عیسائی دنیا کی اپنی غلط فہمیوں کی پیداوار ہے۔ اس کا اصل اور آسان حل وہی ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے یعنی تین خداؤں سے باز آ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ صرف ایک ہے وہی تنہا عبادت کے لائق ہے اور اس کا کوئی بیٹا نہیں اور وہی زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا گیا کہ سب سے اہم حکم کون سا ہے؟ آپ نے جواب دیا: (سب سے اہم حکم یہ ہے) کہ ہمارا خدا ایک اور صرف ایک ہے، تو اپنی پوری طاقت، روح اور دل و دماغ کے ساتھ اس سے محبت کر۔ (مرقس: 12:28 تا 30) مقدس صحیفے یہی کہتے ہیں کہ صرف پروردگار خدا کی عبادت کر اور صرف اسی کی اطاعت کر۔ (متی: 10:4)

تثلیث کی تعریف اور تاریخ کے متعلق انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے الفاظ بھی غور طلب ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تثلیث کے عقیدہ کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپ کے کئی سو سال بعد بعض غلط فہمیوں نے تثلیث کی صورت اختیار کر لی:

Trinity: In Christain doctrine, the unity of Father, Son and Holy Spirit as three persons in one god-

Neither the word Trinity nor the explicit doctrine appears in the New Testament, nor did ـhead

Jesus and his followers intend to contradict the Shema (the Jewish confession of faith in the one'god

The doctrine developed gradually (after the ascension of ـof humankind) in the Old Testament

Encyclopaedia Britannia:)ـJesus Christ) over several centuries and through many controversies

(15th edition 1995

عیسائی عقیدہ کے مطابق تثلیث کی تعریف یہ ہے کہ باپ، بیٹا اور مقدس روح تینوں متحد ہو کر ایک خدا ہیں۔ لیکن عہد نامہ جدید (انجیل) میں نہ تو تثلیث کا لفظ ہے اور نہ ہی اس عقیدہ کی صراحت ہے اور نہ ہی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے پیروکاروں نے عہد نامہ قدیم میں بیان کردہ یہودی عقیدہ توحید کی تردید کی ہے، بلکہ تثلیث کے عقیدہ نے (حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے عروج کے بعد) کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی بہت سی بحثوں کے ذریعہ بتدریج نشوونما پائی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا: اشاعت 15: 1995ئ) ان تصریحات کے باوجود بھی جو

تثلیث سے باز نہیں آئیں گے ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا اور جو صدق دل سے توبہ کرلیں گے اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ گناہ معاف فرمادے گا۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَی اللّٰہِ وَیَسْتَغْفِرُوْنَہٗ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۷۴﴾

لغۃ القرآن: [اَفَلَا : کیا نہیں][یَتُوْبُوْنَ : وہ توبہ کرتے][اِلَی اللّٰہِ : طرف اللہ کی][وَیَسْتَغْفِرُوْنَہٗ : اور وہ اس سے معافی مانگتے][وَاللّٰہُ : اور اللہ][غَفُوْرٌ : بخشنے والا][رَّحِیْمٌ : مہربان ہے]

ترجمہ: کیا یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں رجوع نہیں کرتے اور اس سے مغفرت طلب (نہیں) کرتے، حالانکہ اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

تشریح: :

توبہ سے مراد اور استغفار سے مراد

یہاں توبہ سے مراد شرک سے باز آجانا ہے اور استغفار سے مراد توحید کا اقرار کرنا۔ یا توبہ سے مراد برے عقیدوں سے توبہ کرنا اور استغفار سے مراد برے اعمال سے توبہ کرنا۔ یا گزشتہ کفر پر ندامت توبہ ہے اور آئندہ توحید پر قائم رہنے کا اقرار استغفار ہے۔ لہٰذا آیت میں تکرار نہیں۔ (نور)

یعنی مسیح کو اللہ قرار دینا یا اللہ کو تین میں تقسیم کرکے 'اس کو تین میں تیسرے کا درجہ دینا' یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسا جرم کا کرنے والا کسی رحم کا مستحق نہیں رہتا۔ لیکن پروردگار اتمام حجت کے طور پر فرما رہے ہیں کہ ہم نے نصاریٰ کے اتنے بڑے جرم کے بعد بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا۔ اس لیے اب بھی اگر کوئی اس راستے سے داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو ہم اس کی قدر افزائی کریں گے۔ اس لیے فرمایا اے گروہ نصاریٰ! کیا اب بھی تم اللہ کی طرف رجوع کرکے اور اس سے معافی مانگ کر اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے اور تم جانتے ہو کہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے 'اس لیے اس سے بخشش چاہو اور اس کی مہربانی کے سائے میں آجاؤ۔ ان تین آیتوں میں نہایت سادہ اور قابل فہم اسلوب میں عیسیٰ (علیہ السلام) کی اصل حیثیت واضح کردی گئی ہے اور شرک کا پوری طرح ابطال کردیا گیا ہے۔ لیکن استدلال کی اپنی ایک حیثیت ہے 'اس

لیے کہ عقل کی خو گر طبیعتیں استدلالی انداز سے زیادہ اثر قبول کرتی ہیں 'اس لیے اگلی آیت کریمہ میں ایک ایسے سادہ لیکن پرکار اور موثر طریقہ استدلال سے اس مضمون کو واضح فرمایا گیا ہے کہ جس طبیعت میں قبولیت حق کا ذرا بھی مادہ ہو 'وہ اس استدلال سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (روح)

یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم ہے اور اس کا بے حد لطف اور احسان ہے کہ عیسائیوں کے اس کذب اور افتراء اور ان کے شرک کے باوجود ان کو توبہ اور استغفار کی دعوت دے رہا ہے۔ (تبیان)

اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت کا حوالہ و ذکر: سو ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا، نہایت ہی مہربان ہے۔ سو اس میں سرکشوں اور نافرمانوں کیلئے بخشش و مہربانی کا مژدہ جانفزا ہے کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور انتہائی مہربان ہے۔ اور اتنا بڑا مہربان اور اس قدر بخشنہار کہ نہ اس کی مغفرت و بخشش کا کوئی کنارہ ہے اور نہ اس کی رحمت و عنایت کی کوئی حد و انتہا۔ سچی توبہ پر وہ زندگی بھر کی تمام خطاؤں کو یکسر معاف فرما دیتا ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ۔ پس باغی و سرکش اور اس کے نافرمان بندوں کے لیے موقع ہے کہ وہ اس کے حضور رجوع ہو کر اور سچے دل سے توبہ و استغفار کر کے اپنے گناہوں کو معاف کرالیں۔ قبل اس سے کہ فرصت عمر ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور پھر ان کو ہمیشہ کے خسارہ میں مبتلا ہونا پڑے۔ والعیاذ باللہ۔ اور سچی توبہ پر نہ صرف یہ کہ انسان کے تمام گناہوں کی بخشش اور صفائی ہو جاتی ہے بلکہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا پیارا اور اس کا محبوب بن جاتا ہے۔ تو پھر ایسے خدائے مہربان سے منہ موڑنا اور اعراض ولاپرواہی برتنا کتنے بڑے خسارے کا باعث ہے۔ وَالْعِيَاذ بِاللّٰہِ جَلَّ وَعَلَا۔ اسی لیے اس بارے اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ توبہ و استغفار کیوں نہیں کرتے اور اس کی طرف رجوع کیوں نہیں ہوتے۔ (مدنی)

ایک اور بات کہ یہاں انداز تخاطب بڑا متاثر کن ہے: کتنا خوبصورت انداز ہے نہ۔ امید دلانے والا۔ افلا یتوبون الی اللہ۔ تو کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے۔ کیسے ترغیب دی جا رہی ہے۔ کیسے ان کے دل کو اپیل کی جا رہی ہے کہ آ جاؤ۔ کیسے بلایا جا رہا ہے۔ جیسے کہ ایک ماں اپنے ناراض بچے کو بلاتی ہے کہ آ جاؤ۔ کس قدر پیار سے وہ بلاتی ہے۔ ایسے پیار سے اللہ رب العزت انھیں invite کر رہا ہے۔ اپنی طرف اللہ تعالیٰ بلاتا ہے کہ آ جاؤ۔ کیا تم استغفار نہیں کرو گے۔ کیا یہ توبہ نہیں کریں گے۔ کیوں نہیں کریں گے۔ کیا یہ مایوس ہیں اللہ کی رحمت سے۔ یہ مایوس نہ ہوں۔ کیا گناہوں پر اتنی شرمندگی ہے کہ اللہ سے آنکھ ملاتے وقت ان کو شرم آ رہی ہے۔ اللہ کا سامنا کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ کوئی بات نہیں اگر گناہ ہو گئے۔ پچھلے گناہوں کا احساس اللہ کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ کرے۔ اللہ تو بلاتا ہے کہ آ جاؤ۔ کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے۔ اور اس سے معافی نہ مانگیں گے۔ اللہ کی طرف لوٹیں اللہ کی طرف پلٹیں۔ اور اللہ سے معافی مانگیں۔ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔ کئی دفعہ قصور ہو جائے اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا۔ تو ان کے غلط عقائد کی نفی کر کے اب صحیح عقیدہ جو ہے بتایا جا رہا ہے۔ (تنویر) اب بھی اگر کوئی اس کی رحمت کے جلو میں نہیں آتا تو پھر تو پکڑ ہی ہو گی۔ یارب فَاغْفِرْلِی وَارْحَمْنِی یَارَبِّ فَاِنِّیْ اَتُوْبُ اِلَیْکَ۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی طرف رجوع رہنے کی توفیق و عنایت سے نوازے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین۔

آیت مبارکہ:

مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ‌ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ‌ ؕ كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ‌ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرۡ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۷۵﴾

لغۃ القرآن: [مَا : نہیں][الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ : مسیح ابن مریم][اِلَّا : مگر][رَسُوْلٌ : رسول][قَدْ : یقینا][خَلَتْ : گزر چکے][مِنْ : سے][قَبْلِهِ : پہلے اس][الرُّسُلُ : رسول (جمع)][وَاُمُّهٗ : اور اسکی والدہ][صِدِّيْقَةٌ سچی تھیں][كَانَا : وہ دونوں تھے][يَاْكُلٰنِ : کھاتے][الطَّعَامَ : کھانا][اُنْظُرْ : آپ دیکھیں][كَيْفَ : کیسے][نُبَيِّنُ : ہم بیان کرتے ہیں][لَهُمُ : ان کے لیے][الْاٰيٰتِ : دلائل][ثُمَّ : پھر][انْظُرْ : دیکھیں][اَنّٰى : کیسے][يُؤْفَكُوْنَ : وہ بہکائے جاتے ہیں]

ترجمہ: مسیح ابن مریم (علیہما السلام) رسول کے سوا (کچھ) نہیں ہیں (یعنی خدا یا خدا کا بیٹا اور شریک نہیں ہیں)، یقیناً ان سے پہلے (بھی) بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اور ان کی والدہ بڑی صاحب صدق (ولیّہ) تھیں، وہ دونوں (مخلوق تھے کیونکہ) کھانا بھی کھایا کرتے تھے۔ (اے حبیب!) دیکھئے ہم ان (کی رہنمائی) کے لیے کس طرح آیتوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں پھر ملاحظہ فرمایئے کہ (اس کے باوجود) وہ کس طرح (حق سے) پھرے جا رہے ہیں۔

تشریح: (مسیح ابن مریم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہی ہیں اور یہ کوئی پہلے رسول نہیں بلکہ بیشک گزرے ان کے پہلے بھی بہت رسول)۔

یہ صفت رسالت اگرچہ ساری مخلوقات میں سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہے کوئی مخلوق جو صفت رسالت سے متصف نہ ہو تو وہ اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتی، لیکن صفت الٰہیت والوہیت اس صفت رسالت سے بھی کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے اور بے انتہاء بلند و بالا ہے تو کوئی بھی خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ والا رسول ہو اپنی صفت رسالت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔۔ ہاں۔۔ ہر رسول کو رب کی طرف سے معجزات عطا فرمائے جاتے ہیں جو ان کی نبوت کی دلیل ہوتے ہیں۔

۔۔ چنانچہ۔۔ جس طرح حضرت مسیح کو معجزات عطافرمائے گئے کہ ان کی پھونک سے مردہ زندہ کیا گیا توان سے پہلے حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں عصااژدھا ہوگیا تھااور عصاکااژدھا ہونا نسبتاً بڑے تعجب کی بات ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوئے تو حضرت آدم بے ماں باپ کے پیدا ہوئے اور یہ اس سے زیادہ عجیب بات ہے۔۔ الحاصل۔۔ انبیاء کرام کے معجزات انبیاء اکرام کو بندہ سے خدا نہیں کردیتے۔
(اور) یادرکھو کہ (اس) صاحب کمال رسول، یعنی حضرت مسیح کی ماں صدیقہ ہیں) جو بڑی ہی راست گو ہیں صدق وصفامیں مداومت رکھنے والی اپنا معاملہ صحیح اور درست رکھنے والی ہیں ان سے ایسی بات کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ جو ان کی عبودیت اور اطاعت الٰہی کے منافی ہو۔ ماں بیٹے دونوں بشری تقاضوں کے تحت کھانا بھی کھاتے تھے۔۔ الغرض۔۔ دونوں کو دوسرے ذی روح مخلوقات کی طرح غذا کی حاجت تھی اور ظاہر ہے کہ جو صاحب احتیاج ہو وہ رب نہیں ہوسکتا۔ دیکھنے والو (دیکھو کہ ہم کس طرح) صاف (صاف بتائے دیتے ہیں ان کو) توحید کی نشانیاں) اور اس کی دلیلیں، یعنی ان کو ایسے روشن دلائل دکھاتے ہیں جن سے ان کو یقین ہوسکتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔
(پھر دیکھو کہ وہ کیسے اوندھے کیے جاتے ہیں) یعنی نہ حق کو سنتے ہیں اور نہ ہی اس میں غور وفکر کرتے ہیں بلکہ بے تکی اور اوندھی باتیں کرتے ہیں اور انھیں حق بات سمجھنے اور قبول کرنے سے کیونکر پھیر دیتے ہیں اور وہ کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں اگرچہ ہماری آیات کا بیان کرنا بھی عجیب ہے لیکن ان کا اس سے انکار کر عجیب تر، جبکہ ان کے سامنے ایسے روشن دلائل وبراہین کھل کر آگئے ہیں کہ اگر غور وفکر کریں تو انھیں انکار کرنے کی گنجائش بھی نہ ہو۔ (اشرفی)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے خدا نہ ہونے کے چند دلائل جن کا اشارہ اس آیت میں ملتا ہے

1۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت مریم (علیہاالسلام) کے بیٹے ہیں جب کہ خدا کی شان یہ ہے کہ نہ اس کے والدین ہیں اور نہ ہی اولاد، لہٰذا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا نہیں ہوسکتے۔
2۔ جو شخص اپنی پیدائش میں ماں کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کسی کا محتاج نہیں ساری خدائی اس کی محتاج ہے۔
3۔ جس کی ماں ہو وہ حادث ہے یعنی وہ پہلے موجود نہیں تھا بعد میں پیدا ہوا اور جس شخص کی یہ صفت ہو وہ مخلوق ہے خدا نہیں کیونکہ خدا تو ہمیشہ سے ہے اور اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی خدا مان لیا جائے تو ان کی پیدائش سے پہلے کون خدا تھا؟
4۔ اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس لیے خدا کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش باپ کے بغیر ہوئی ہے تو پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کو بدرجہ اولیٰ خدا ہونا چاہیے کیونکہ ان کی پیدائش ماں اور باپ دونوں کے بغیر ہوئی ہے اور تخلیق آدم (علیہ السلام) تخلیق عیسیٰ (علیہ السلام) سے بھی زیادہ عجیب ہے، حالانکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو کوئی بھی خدا نہیں کہتا۔ دراصل ان دونوں کی پیدائش قدرت خداوندی کا مظاہرہ ہے اور ان کے بندہ ہونے اور خدا نہ ہونے کی دلیل ہے۔
5۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پہلے رسولوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے ایک رسول ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے تھے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔

6۔ جس طرح پہلے رسول آئے اور اپنا مقررہ وقت گزار کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ان کو دوام وبقا حاصل نہیں تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی اپنا مقررہ وقت گزار کر ایک دن اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے انھیں بھی دوام وبقا حاصل نہیں ہے، للذا کوئی رسول بشمول حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ انبیائے کرام (علیہم السلام) پہلے موجود نہیں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا فرمایا اور مقررہ وقت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

7۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے آنے والے رسولوں نے بھی معجزات دکھائے، جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے خشک لکڑی کی لاٹھی میں جان ڈال کر اسے زندہ سانپ بنا دیا۔ (قرآن: 26:32تا45) اور حضرت صالح (علیہ السلام) نے پتھر سے اونٹنی برآمد کر دی۔ (قرآن 7:73) مردوں کو زندہ کرنے سے لاٹھی کا زندہ سانپ بنا دینا اور پتھر سے زندہ اونٹنی برآمد کرنا زیادہ عجیب چیزیں ہیں کیونکہ مردہ تو کبھی زندہ تھا جبکہ پتھر اور لاٹھی کبھی زندہ ہی نہیں تھے، مگر ان عظیم الشان معجزات کے باوجود وہ خدا نہیں بلکہ خدا کے رسول ہیں، تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی اپنے عظیم معجزات کے باوجود خدا نہیں بلکہ اس کے رسول ہیں۔

8۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کھانا کھاتے تھے کیونکہ کھانا پینا انسانی ضرورت ہے اور جو شخص اپنی نشوونما اور بقا میں کھانے کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا ان ضروریات وحاجات سے پاک ہے، لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ فرشتے کھانا نہیں کھاتے تو وہ خدا ہیں، کیونکہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اس لیے انھیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال اپنی تخلیق وبقا میں فرشتے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے محتاج ہیں اس لیے وہ بھی خدا نہیں ہو سکتے۔

ان عام فہم دلائل سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے ہیں، لیکن عیسائی پھر بھی اگر انھیں خدا کہنے پر اصرار کرتے ہیں تو انھیں بائبل کی درج ذیل آیات پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

Jesus shouted, " Eli, Eli, Lama Sabachthani," which means, " My God, jamy God, why have you -1
(6۔The Living Bible: 1975: Mathew:27:4)"?forsaken me

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بلند آواز سے چلا کر کہا: اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

Remember how he spike unto you when he was yet in Galilee, saying, The Son of Man (the -2
Messiah) must be delivered into the hands of sinful men, and be crucified, and the third day rise
.again
(7۔Luke:24:6-1954۔The Holy Bible)

یاد کرو جب وہ گلیل میں تھا تو اس نے تم سے کہا تھا: ضرور ہے کہ آدم کا بیٹا (حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)) گناہ گار لوگوں کے حوالہ کیا جائے اور مصلوب ہو اور تیسرے دن جی اٹھے۔

And as they were telling about it, Jesus himself was suddenly standing there among them, and -3
But the whole group was terribly ۔(1954۔peace be unto you: The Holy Bible)greeting them
Why are you frightened?" he asked "why do you "۔frightened, thinking they were seeing a ghost
doubt that it is really I ? " look at my hands! look at my feet! you can see that it is I, myself, touch

me and make sure that I am not a ghost, for ghosts do not have bodies, as you see that I do! as he

Still they stood there ۔spoke, he held out his hands for them to see and showed them his feet

Then he asked them, "Do you have anything here to eat?" ۔undecided, filled with joy and doubt

۔1975۔The Living Bible)۔They gave him a peice of broiled fish and he ate it as they watched

(43۔Luke:24:36

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یسوع بذات خود ان کے درمیان آکھڑا ہوا اور ان سے کہا: تم پر سلامتی ہو، مگر انھوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں۔اس نے ان سے کہا: تم کیوں گھبراتے ہو؟اور میرے بارے میں کیوں شبہ کرتے ہو؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو۔آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں بذات خود موجود ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو اور یقین رکھو کہ میں روح نہیں ہوں کیونکہ میرا (گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل) جسم ہے جبکہ روح کا کوئی جسم نہیں ہوتا اور یہ کہہ کر یسوع نے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ابھی وہ خوش اور شک کے عالم میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے تھے کہ یسوع نے ان سے پوچھا: کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ تو انھوں نے یسوع کو بھنی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا دیا اور یسوع نے ان کے سامنے مچھلی کا ٹکڑا کھایا۔

بائبل کی مذکورہ آیات سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں

1۔ پہلے حوالہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر عیسیٰ (علیہ السلام) خدا ہوتے تو مشکل گھڑی میں کسی اور خدا کو کیوں پکارتے۔ دراصل حقیقی خدا وہی ہے جس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پکار رہے تھے۔

2۔ اگر عیسیٰ (علیہ السلام) ایسے خدا ہیں کہ وہ اپنی مشکل کشائی کے لیے کسی اور خدا کے محتاج ہیں تو پھر ایک عام بندے اور عیسیٰ (علیہ السلام) میں کیا فرق ہوا؟

3۔ دوسرے حوالہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی زبان سے اعتراف کیا ہے کہ وہ آدم کے بیٹے ہیں اور گناہ گار لوگوں کے ہاتھوں سولی پر چڑھائے جائیں گے، لہٰذا ان کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنا ان کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

4۔ جو شخص اپنا تحفظ نہ کر سکے اور دشمن اسے سولی پر چڑھا دیں وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے؟

5۔ جو شخص تین دن قبر میں مردہ رہے اور اس کو اگر خدا مان لیا جائے تو خدا کے بغیر ان تین دنوں میں یہ کائنات کیسے چلتی رہی؟

6۔ تیسرے حوالہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) لوگوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ وہ ہڈیوں اور گوشت سے بنے ہوئے انسان ہیں۔ان کے ہاتھوں اور پاؤں ہیں۔ وہ روح نہیں ہیں کیونکہ روح کا کوئی جسم نہیں ہوتا اور ان کا جسم ہے، لہٰذا وہ انسان ہیں خدا نہیں ہیں۔

7۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو ایک انسان کے لیے ضروری ہیں۔انھیں بھوک بھی لگتی ہے اور انھوں نے لوگوں کے سامنے مچھلی کھا کر اس کا عملی مظاہرہ بھی کر دیا، پھر بھی انھیں خدا یا خدا کا بیٹا کہنا عقل سے بہت دور کی بات ہے۔(امداد وتبیان) یہودی حضرت مریم [پر (خاکم بدہن) بدکاری کا الزام لگاتے ہیں جس کی تردید کے لیے حضرت مریم [کو صدیقہ کے عظیم لقب سے نوازا گیا ہے۔ جو لفظ صدیق کی مونث ہے۔ نبوت کے بعد صدیق کا مقام ہے۔

صادق وہ جو جھوٹ نہ بولے سچ بولے، اور صدیق وہ جو جھوٹ نہ بول سکے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی قوم بزرگوں کی شان میں زیادتی کرے تو تم ان بزرگوں کو گالیاں مت دو بلکہ ان کا احترام قائم رکھتے ہوئے اس قوم کی تردید کرو، دیکھو عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ و مریم (علیہ السلام) کو خدا کہہ دیا، تو رب نے ان بزرگوں کا ذکر عزت ہی سے فرمایا۔ خیال رہے کہ یہاں کھانے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ کھانا بندگی کی بڑی دلیل ہے کھانے والا کھانے سے پہلے رزق حاصل کرنے میں کھاتے وقت اعضاء کی طاقت میں اور کھانے کے بعد ہضم وغیرہ میں رب کا حاجت مند ہوتا ہے تمام کاروبار کھانے کے لیے چل رہے ہیں، تمام بیماریاں کھانے سے ہیں۔ (نور)

حضرت مریم [کی پاکدامنی اور ہر اعتبار سے طاہرہ، طیبہ ہونے کی شہادت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ کے بارے میں طبعی اور فطری یہ دلیل دی گئی ہے کہ وہ دونوں اکل و شرب کے محتاج تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کھانے پینے اور مخلوق کی حاجات سے بے نیاز اور مبرّا ہے۔ (فہم)

ان دلائل کے بعد حکم ہوا کہ غور کیجئے کہ ہم نے سچائی واضح کرنے کے لیے کتنے کھلے دلائل بیان کیے ہیں اور اس پر بھی غور کیجئے کہ کتنے ٹھوس اور واضح دلائل ہونے کے باوجود لوگ حقائق کا انکار اور شرک کا ارتکاب کرکے کس طرح گمراہی میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

نوٹ : حضرت مریم (علیہا السلام) بھی خدا نہیں ہیں۔ وہ پیدا ہوئیں، لہٰذا حادث تھیں۔ انھوں نے خوراک سے نشوونما پائی، لہٰذا محتاج تھیں اور اس دنیا سے چلی گئیں، لہٰذا فانی تھیں۔ یہ ساری صفات مخلوق کی ہیں اس لیے حضرت مریم (علیہا السلام) خدا نہیں بلکہ خدا کی مقبول اور راست باز بندی تھیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم (علیہا السلام) کو صدیقہ (بہت ہی سچ بولنے والی خاتون) فرمایا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت مریم (علیہا السلام) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ہیں۔ (امداد)

خواتین میں نبوت نہیں آئی :

جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی یہ منصب رجال ہی کے لیے مخصوص رہا ہے (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى) حضرت مریم بتول بھی ایک ولی بی بی تھیں۔ نبی نہیں۔ (گلدستہ)

ایک علمی نکتہ، حضرت مریم بتولؑ پیغمبر تھیں یا ولی؟

حضرت مریم کے ولی یا پیغمبر ہونے میں اختلاف ہے، آیت میں لفظ صدیقہ سے بظاہر اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ولی تھیں، پیغمبر نہیں تھیں، کیونکہ جب کسی کی تعریف کی جاتی ہے وہ اس کے سب سے اچھے درجہ کو ذکر کیا جاتا ہے، اگر آپ کو پیغمبری حاصل ہوتی تو یہاں " پیغمبر " کہا جاتا حالانکہ یہاں " صدیقہ " کہا گیا ہے جو کہ ولی ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، امت کے اکثر علماء کی تحقیق یہی ہے کہ عورتوں میں پیغمبری نہیں آئی یہ منصب مردوں کے لئے ہی خاص رہا ہے۔ (ربانی)

صدیق کا مرتبہ بہت بلند ہے لیکن نبی کا درجہ صدیق سے بھی برتر ہے جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر 69 میں ہے۔ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام یافتہ لوگ نبی، صدیق، شہید اور صالح ہیں"۔ قرآن مجید کی اس ترتیب سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ سب سے بلند مرتبہ نبی کا ہے، اس کے بعد صدیق کا، پھر شہید کا اور شہید کے بعد صالح کا مرتبہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نبی صدیق ہے لیکن ہر صدیق نبی نہیں جیسے ہر نبی ولی

ہے لیکن ہر ولی نبی نہیں، نیز قرآن مجید نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ سارے انبیاء اور رسول مرد تھے ان میں سے کوئی بھی عورت نہیں ہے۔ مزید تشریح کے لیے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 42 کا حاشیہ نمبر 21 ملاحظہ فرمائیں۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

قُلۡ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَـكُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا‌ ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۷۶﴾

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][اَتَعْبُدُوْنَ : کیا تم عبادت کرتے ہو][مِنْ : سے][دُوْنِ : علاوہ][اللّٰهِ : اللہ][مَا لَا : جو نہیں][يَمْلِكُ لَكُمْ : مالک تمہارے لیے][ضَرًّا : نقصان][وَّلَا نَفْعًا : اور نہ نفع][وَاللّٰهُ : اور اللہ][هُوَ : وہ][السَّمِيْعُ : خوب سننے والا][الْعَلِيْمُ : خوب جاننے والا]

ترجمہ: فرما دیجئے : کیا تم اللہ کے سوا اس کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے لیے کسی نقصان کا مالک ہے نہ نفع کا، اور اللہ ہی تو خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے.

تشریح: حضرت صدر الافاضل مراد آبادی (رح) رقمطراز ہیں۔ "یہ ابطال شرک کی ایک اور دلیل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ الہ (مستحق عبادت) وہی ہو سکتا ہے جو نفع و ضرر وغیرہ ہر چیز پر ذاتی قدرت واختیار رکھتا ہو جو ایسا نہ ہو وہ الہ مستحق عبادت نہیں ہو سکتا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نفع و ضرر کے بالذات مالک نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کے مالک کرنے سے مالک ہوئے۔ تو ان کی نسبت الوہیت کا اعتقاد باطل ہے"۔ (خزائن العرفان وضیاء)

عقیدہ تثلیث کی تردید کرنے کے بعد اہل کتاب اور ان کے حوالے سے تمام لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔

عبادت کا معنٰی ہے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی غلامی اختیار کرنا ہے، انسان بڑا کمزور اور عاجز واقع ہوا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر انعام کرتے ہوئے اجازت ہی نہیں دی بلکہ حکم دیا ہے کہ اے انسان مجھے اپنی حاجات کے لیے پکارا کر۔ میں تیری دستگیری اور دادرسی بھی کروں گا اور یہ پکار میری بارگاہ میں تیری عبادت بھی سمجھی جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ میرے سوا کسی کو اپنا الہٰ و معبود اور حاجت روا (اصلی) نہ سمجھنا۔ بیشک کوئی نبی ہو یا ولیؒ حاکم ہو یا غنیؒ کوئی بھی ہو تجھے میرے اذن کے بغیر نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

پہلی بات عیسائیوں کو سمجھائی گئی ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم [اللہ کی مخلوق ہیں اگر وہ نفع و نقصان کے مالک ہوتے تو حضرت مریم عیسیٰ (علیہ السلام) کو جنم دیتے ہوئے یہ نہ کہتی کہ کاش میں اس سے پہلے بے نام ونشان ہو چکی ہوتی سورۃ مریم: آیت ۲۳ اسی طرح اگر عیسیٰ (علیہ السلام) الٰہ ہوتے تو انھیں تختہ دار پر چڑھانے کی کوشش اور سازش نہ کی جاتی۔

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُول اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُولُ إِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا یَنْتَزِعُہُ مِنَ الْعِبَادِ وَلَکِنْ یَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰی إِذَا لَمْ یُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُھَّالًا فَسُءِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا)

[رواہ البخاری: کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم]

”حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے علم نہیں چھینے گا بلکہ علم کو علماء کے ساتھ قبض کرلے گا۔ یہاں تک کہ زمین پر کوئی عالم نہیں بچے گا۔ لوگ جاہلوں کو اپنے عالم بنالیں گے ان سے سوال ہوگا تو وہ بغیر علم کے فتوٰی جاری کریں گے وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔“ (فہم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کر رہے ہو جو تمہارے لیے کسی نقصان اور نفع کے مالک نہیں ہیں ' اور اللہ ہی سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (المائدہ: ۷٦)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی عبادت گزاری سے ان کے خدا نہ ہونے پر استدلال

اس آیت میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے خدا نہ ہونے پر ایک اور دلیل قائم کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ذاتی طور پر کسی کو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ انھوں نے جو پرندے بنا کر اڑائے ' جن مردوں کو زندہ کیا ' جن کوڑھیوں کو شفا دی اور جن مادر زاد اندھوں کو بینا کیا ' یہ سب کام انھوں نے اللہ کی دی ہوئی قدرت سے کیے ' وہ اپنی ذاتی طاقت اور قدرت سے کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کے مالک تھے تو ان کو خدا سے دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اناجیل میں ہے پھر ان باتوں کے کوئی آٹھ روز بعد ایسا ہوا کہ وہ پطرس اور یوحنا اور یعقوب کو ہمراہ لے کر پہاڑ پر دعا کرنے گیا ' جب وہ دعا کر رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی۔ (لوقا کی انجیل ' باب ۹ ' آیت ۲۹ ' ۔ ۲۸ ' مطبوعہ لاہور)

اور ان دنوں میں ایسا ہوا کہ وہ پہاڑ پر دعا کرنے کو نکلا اور خدا سے دعا کرنے میں ساری رات گزار دی۔ (لوقا کی انجیل ' باب ٦ ' آیت ۱۲ ' ص ۵۸ ' مطبوعہ لاہور)

پھر ایسا ہوا کہ وہ کسی جگہ دعا کر رہا تھا ' جب کرچکا تو اس کے شاگردوں میں سے ایک نے اس سے کہا: اے خداوند! جیسا یوحنا نے اپنے شاگردوں کو دعا کرنا سکھایا ' تو بھی ہمیں سکھا ' اس نے ان سے کہا: جب تم دعا کرو تو کہو: اے باپ تیرا نام پاک مانا جائے ' تیری بادشاہی آئے

'ہماری روز کی روٹی ہمیں ہر روز دیا کر، اور ہمارے گناہ معاف کر 'کیونکہ ہم بھی اپنے ہر قرض دار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔ (لوقا کی انجیل 'باب ۱۱ 'آیت ۴۔۱ 'ص ۶۵ 'مطبوعہ لاہور)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ساری ساری رات دعا کرنا 'بکثرت دعا کرنا اور اپنے پیروؤں کو بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تعلیم دینا 'اس کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے نفع اور نقصان کے مالک نہیں تھے 'اور نہ ان کے پیروکاران کو ایسا جانتے تھے 'اور نہ ان کو خدا سمجھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کی عبادت کرتے تھے 'اور یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں 'پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی 'اور اس سے کہا: اگر تو مجھے جھک کر سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔

یسوع نے اس سے کہا: شیطان دور ہو 'کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ (متی کی انجیل 'باب ۴ 'آیت ۱۱۔۸ 'ص ۷ 'مطبوعہ لاہور)

پولس رسول یسوع مسیحؑ کے متعلق لکھتے ہیں

اس نے اپنی بشریت کے دنوں میں زور زور سے پکار کر اور آنسو بہا بہا کر اس دعائیں اور التجائیں کیں 'جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا 'اور خدا ترسی کے سبب سے اس کی سنی گئی 'اور باوجود بیٹا ہونے کے اس نے دکھ اٹھا اٹھا کر فرمان برداری کی۔ (عبرانیوں کے نام پولس رسول کا خط 'باب ۵ 'آیت ۸۔۷ 'ص ۲۱۴ 'مطبوعہ لاہور)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ پولس رسول کے نزدیک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بہت عبادت گزار 'فرمان بردار اور رو رو کر اللہ سے دعائیں کرنے والے تھے 'اور جو تمام جہان کا خدا ہو 'اور اپنی قدرت سے نفع اور نقصان کا مالک ہو 'وہ کسی کی عبادت اور فرمان برداری کرنے اور کسی سے رو رو کر دعائیں کرنے سے پاک اور منزہ ہوتا ہے۔

نیز پولس رسول لکھتے ہیں:

ہمارے خداوند یسوع مسیح کے خدا اور باپ کی حمد ہو 'جو رحمتوں باپ اور ہر طرح کی تسلی کا خدا ہے۔ (کرنتھیوں کے نام پولس رسول کا دوسرا خط 'باب ۱ 'آیت ۳ 'ص ۱۶۸ 'مطبوعہ لاہور)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ پولس رسول کے نزدیک یسوع مسیح خدا نہ تھے 'بلکہ یسوع مسیح خدا خدا کو ماننے والے تھے۔ اسی کی وہ عبادت کرتے تھے 'اسی کی فرمان برداری کرتے تھے اور اسی سے رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا پولس رسول کا اور ہم سب کا خدا ہے۔ اس کو باپ کہنا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ان کا بیٹا اور خداوند کہنا 'یہ سب عیسائی علماء کی بعد کی تحریفات ہیں۔ باپ ہونا اور بیٹا رکھنا مخلوق کی صفات ہیں 'اللہ عزوجل اس سے بلند ہے 'اس کی صفات وہی ہیں جو صرف اس کے شایان شان ہیں اور مخلوق کے لیے ممکن نہیں ہیں 'جیسے وہ عبادت کا مستحق ہے 'اس کا کوئی شریک اور مثیل نہیں 'وہ واجب الوجود اور قدیم بالذات ہے۔ اس کی ہر صفت مستقل اور غیر سے مستغنی ہے 'اور وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ (تبیان)

بلاشبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے مٹی سے پرندے بنا کر اڑائے، مردوں کو زندہ کیا، کوڑھیوں کو شفا دی اور مادرزاد اندھوں کو بینا کیا۔ (قرآن: 49:3) حضرت داؤد (علیہ السلام) کا پہاڑوں پر اختیار تھا۔ (قرآن: 72:21) حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو ہوا پر اختیار حاصل تھا۔

(قرآن: 81:21) شیطان چھو کر انسان کو خبطی بنا سکتا ہے۔ (قرآن: 2:275) کفار کو شیاطین روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ (قرآن: 2:257)

مذکورہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ مخلوق بھی دوسروں کو نفع و نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن مخلوق کے جملہ اختیارات اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انھیں یہ اختیارات نہ دیتا تو وہ کسی کو نفع یا نقصان نہ پہنچا سکتے، لہٰذا کوئی مخلوق ذاتی طور پر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہے۔

الغرض عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ذاتی طور پر مختار کل ہے اور اس کی ساری صفات ازلی اور ابدی ہیں وہ ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور اس کی نیت بھی جانتا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور دیگر مخلوق کی صفات نہ تو ذاتی ہیں اور نہ ہی ازلی و ابدی، لہٰذا کوئی مخلوق عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرمادیجیے][يٰٓاَهْلَ : اے اہل][الْكِتٰبِ : كتاب][لَا تَغْلُوْا : نہ تم غلو کرو][فِيْ : میں][دِيْنِكُمْ : اپنے دین][غَيْرَ : علاوہ][الْحَقِّ : حق][وَلَا : اور نہ][تَتَّبِعُوْٓا : تم پیروی کرو][اَهْوَآءَ : خواہشات][قَوْمٍ : قوم][قَدْ : یقیناً][ضَلُّوْا : وہ گمراہ ہوئے][مِنْ : سے][قَبْلُ : پہلے][وَاَضَلُّوْا : اور انہوں نے گمراہ کیا][كَثِيْرًا : زیادہ][وَّضَلُّوْا : وہ گمراہ ہوئے][عَنْ : سے][سَوَآءِ السَّبِيْلِ : سیدھا راستہ]

ترجمہ: فرمادیجئیے: اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق حد سے تجاوز نہ کیا کرو اور نہ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کیا کرو جو (بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے) پہلے ہی گمراہ ہو چکے تھے اور بہت سے (اور) لوگوں کو (بھی) گمراہ کر گئے اور (بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد بھی) سیدھی راہ سے بھٹکے رہے۔

تشریح: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ دین میں حد سے تجاوز نہ کرو یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہو کیونکہ یہ حق کے خلاف ہے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بہت بعد بعض گمراہ لوگوں کی سازش سے یہ عقیدہ عیسائیت کے اندر داخل کیا گیا تھا، لہٰذا تم ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان کے مشرکانہ عقائد سے توبہ کر کے سیدھے راستے پر واپس آ جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے جس کو جو مرتبہ عطا فرمایا ہے اس کو اسی مرتبہ پر رکھنا ہی حق اور صراط مستقیم ہے۔ اس میں مجرمانہ حد تک کمی یا زیادتی دونوں گمراہی کا سبب ہیں، جیسے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شان میں کمی کرنے کی وجہ سے یہود گمراہ ہوئے اور ان کی شان میں زیادتی کرنے کی وجہ سے عیسائی گمراہ ہوئے اور ایسا ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ کسی عظیم ہستی کو ماننے والے اس کی محبت و عقیدت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور حسد کرنے والے اس کی شان میں کمی کے مرتکب ہوتے ہیں، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرمایا:

اے علی! تیری وجہ سے دو آدمی ہلاک ہوں گے: حد سے زیادہ محبت کرنے والا اور انتہائی بغض رکھنے والا، اور فرمایا: اے علی! ترے ساتھ محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور ترے ساتھ بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔ (تفسیر الشعراوی: رواہ الطبرانی فی الاوسط) (امداد)

یاد رکھیں غلو دو طرح سے ہے۔ غلو حق اور غلو باطل کی تعریفیں

اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کے باطل عقائد بیان کیے اور ان کا رد کیا ' پھر نصاری کے باطل عقائد بیان کیے اور ان کا رد فرمایا:

اب دونوں فریقوں کو خطاب کر کے فرما رہا ہے اسے اہل کتاب! تم اپنے دین میں غلو نہ کرو غلو دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حق اور ایک باطل۔ غلو حق یہ ہے کہ کسی صحیح اور حق چیز کے بیان میں مبالغہ کیا جائے ' جس سے اس کو موکد کرنا کرنا مقصود ہو۔ اور غلو باطل یہ ہے کہ کسی چیز کی تحقیر میں زیادتی کی جائے ' یا کسی چیز کی تعظیم میں زیادتی کی جائے۔ یہود نے انبیاء (علیہم السلام) کی شان میں کمی کی ' حتی کہ ان کی طرف زنا کو منسوب کیا ' ان کی تکذیب کی اور ان کو قتل کیا اور عیسائیوں نے انبیاء کی تعظیم میں غلو کیا ' حتی کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا: یہ خود بھی گمراہ ہیں اور انھوں نے لوگوں کو بھی گمراہ کیا ' اور یہ بہت بڑی گمراہی ہے۔ اس آیت میں اس زمانہ کے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: کہ تم اپنے احبار اور رہبان کی پیروی نہ کرو ' وہ گمراہ ہو چکے ہیں اور تم کو بھی گمراہ کر دیں گے ' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہود سے یہ فرمایا ہو ' کہ تم عزیر کی تعظیم میں غلو نہ کرو ' کہ ان کو خدا بنا ڈالو ' اور عیسائیوں سے فرمایا: تم عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعظیم میں غلو نہ کرو کہ ان کو خدا بنا ڈالو۔ (تبیان)

ایک اور بات بھی قابل فہم ہونی چاہیئے کہ:

اولیاءِ کرام اور ان کے مزارات کے حوالے سے غُلُوّ

اولیاء کرام کی تعظیم کرنا اور فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے ان کے مزارات پر حاضری دینا جائز اور پسندیدہ عمل ہے کیونکہ اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں اور ان کے مزارات رحمت الٰہی اترنے کے مقامات ہیں لیکن فی زمانہ اولیاء کرام اور ان کے مزارات کے حوالے سے انتہائی غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ بعض حضرات ان کی جائز تعظیم کو ناجائز و حرام کہتے اور ان کے مزارات پر حاضری کو شرک و بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض نادان ان کی تعظیم کرنے میں شرعی حد پار کر جاتے اور ان کے مزارات پر ایسے امور سرانجام دیتے ہیں جو شرعاً ناجائز و حرام ہیں جیسے تعظیم کے طور پر مزار کا طواف کرنا اور صاحب مزار کو سجدہ تعظیمی کرنا، مزارات پر مزامیر کے ساتھ قوالیاں پڑھنا، عورتوں کا مزارات پر مخلوط حاضر ہونا اور عرس وغیرہ کے موقع پر لہو و لعب کا اہتمام کرنا وغیرہ۔ تعظیمِ اولیاء کو ناجائز و حرام کہنے والوں اور مزارات پر حاضری کو شرک و بت پرستی سمجھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی حالت پر غور کریں اور شرعاً جائز عمل کو اپنی طرف سے ناجائز و حرام کہہ کر دین میں زیادتی نہ کریں بلکہ حق کی پیروی کریں اور مزارات پر ناجائز و حرام کام کرنے والوں کو چاہیے وہ بھی اپنے ان افعال سے باز آ جائیں تاکہ دشمنان اولیاء ان کی نادانیوں کی وجہ سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے دور کرنے کی سعی نہ کر سکیں۔ (صراط)

(کہو کہ اے اہل کتاب) ہوش سے کام لو اور اپنے دین اور اپنے نظریات میں ناحق غلو نہ کرو) یعنی نہ تو نصاری کی طرح حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا دعوی کرو اور ان کو ان کی حد رسالت سے اوپر اٹھا دو اور نہ ہی یہودیوں کی طرح ان کی شان گھٹاؤ کہ ان کے لیے رشد و ہدایت بھی نہ مانو۔۔ الغرض۔۔ حضرت مسیحؑ کے تعلق سے نصاری کی افراط اور یہودیوں کی تفریط سے اپنے کو بچاؤ۔ (اور) اس سلسلے میں اس قوم کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو) اور ان کی تابعداری نہ کرو (جو خود) تم سے پہلے سے گمراہ ہو گئے) یعنی تمہارے وہ گمراہ لیڈر اور مذہبی لوگ جو حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے گزرے ہیں جو خود تو گمراہ ہی تھے (اور بہتوں کو گمراہ کر ڈالا) جو ان کی بدعات اور گمراہیوں کی اتباع کرتے تھے۔ اور پھر یہ سارے کے ساتھ گمراہ ہونے والے اور گمراہ کرنے والے، نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کی تکذیب کر کے۔۔ نیز۔۔ آپ ﷺ سے بغاوت اور حسد کر کے اسلام کی (سیدھی راہ سے بہک گئے) بعثت رسول ﷺ سے پہلے بھی اپنی سرکشیوں اور نافرمانیوں کے سبب یہودی کفار ہمیشہ مستحق لعنت ہی رہے (اشرفی)

اہل عرب کا مشہور مقولہ ہے "الجاھل اما مفرط او مفرط "یعنی جاھل یا افراط میں مبتلا ہوتا ہے یا تفریط میں اسے اعتدال اور میانہ روی پسند نہیں ہوتا یہی اہل کتاب جہلاء جو پیغمبروں کو ان کے بلند منصب سے گرا کر ان کی تقریب یا انہیں قتل کیے یا دوسرے رخ پر چل کر انہیں معبود اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا غلو کا اطلاق افراط و تفریط دونوں پر ہوتا ہے جبکہ صحیح مقام اعتدال کا ہے جس کو قرآن حکیم نے وسط سے تعبیر فرمایا "وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا " (البقرہ) جو کام افراد یا تفریط کا شکار ہوگا اس کا انجام برا اور تباہ کن ہوگا جبکہ اعتدال اور میانہ روی کار آمد اور فائدہ مند ہوگا اس کا انجام بھی بہتر ہوگا۔

امور دینیہ میں غلو نہایت تباہ کن ہے

یہ بات اظہر من الشمس اور واضح ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والی اور چلانے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور اس کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ اور برتر اور بہتر اشرف المخلوقات انسان ہے جس کو اس کی مرضیات پر چلنے اور غیر مرضیات سے بچنے کا پابند بنایا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نہ مرضیات کیسے اور کس طرح معلوم ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دو ذریعے مقرر فرمادیئے ایک اپنی کتابیں جن میں ہر قسم کی ہدایات اور قوانین ہیں دوسرے انبیاء ورسل کرام (علیہم السلام) دراصل کتاب اللہ کی صحیح مرادات و مطالب رجال اللہ کی معرفت ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں اور فطری طور پر انسان کا مسلہ و مربی اور معلم انسان ہی ہو سکتا ہے انبیاء ورسول کے بعد ان کے نائبین علماء مشائخ ان کے نقش قدم پر چل کر اصلاح وتربیت کا کام بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ہیں دنیا میں رجال اللہ سے متعلق افراط و تفریط کی گمراہیاں ہمیشہ پھیلتی رہی ہیں ایک طرف جاہلوں نے انبیاء کرام اور مرشدوں کو بھی خدائی صفات کا حامل قرار دے دیا اور پیر و مرشد پرستی اور قبر مزارات پرستی تک نوبت پہنچ گئی دوسری طرف ان ہی ناعاقبت اندیشوں نے حد درجہ حقیر سمجھ کر انہیں ان کے مقام سے نیچے گرادیا اور ان میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق ہی نہیں رکھا گیا مختلف مذاہب میں جتنے فرقے پیدا ہوتے رہے وہ سب اسی ایک غلطی کی پیداوار ہیں اس لئے ان آیات میں رسولوں کی توہین کرنے والوں کو جس طرح کافر کہا گیا اسی طرح ان کو حدود سے بڑھا کر خدائی درجہ تک پہنچانے والوں کو بھی کافر کہا گیا آیت کریمہ میں "غلو ناحق کو جمہور مفسرین نے تاکید پر محمول کیا ہے کیونکہ غلو فی دین ہمیشہ ناحق ہی ہوا کرتا ہے

غلو فی دین چونکہ تباہ کن اور سراسر گمراہی ہے اس لیے فرمایا "ولا تتبعوا اھواء قوم "اور یہ غلو صرف نفسانی اور شیطانی خواہشات کی وجہ سے ہوتا ہے جس میں حق اور انصاف کا قطعی طور پر کوئی پہلو نہیں ہوتا بلکہ مکمل گمراھی اور تباھی اس کا انجام ہوتا ہے اس لئے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کو سختی سے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا لاتطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ ابن مریم فانما عبدہ فقولوا عبداللہ و رسولہ (رواہ البخاری) یعنی تم میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا میں تو بس اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں میرے بارے میں یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔(منازل)

لہٰذا اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو فرماتے ہیں کہ افراط و تفریط سے کام لینا چھوڑ دو اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کی صحیح تعلیمات پر اپنے عقائد کی بنیاد رکھو۔ تمہارے عقیدہ تثلیث کو حضرت مسیح کی تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ بلکہ تم نے دوسری گم کردہ راہ قوموں کے مشرکانہ نظریات کو اپنانا شروع کردیا ہے اپنے صاف سادہ عقیدہ توحید کو یونانی اور رومی فلسفہ کی بھینٹ چڑھا کر اس کو بالکل مسخ کرکے رکھ دیا۔ چھوڑو اس خود ساختہ عقیدہ کو۔ اور حضرت مسیح کے سچے دین کو مضبوطی سے پکڑ لو۔(ضیاء)

آیت مبارکہ:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

لغۃ القرآن: [لُعِنَ : لعنت کی گئی][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : انہوں نے کفر کیا][مِنْۢ : سے][بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ : بیٹے اسرائیل][عَلٰي : پر][لِسَانِ : زبان][دَاوٗدَ : داؤد][وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ : اور عیسیٰ ابن مریم][ذٰلِكَ : وہ][بِمَا : ساتھ جو][عَصَوْا : انہوں نے نافرمانی کی][وَّكَانُوْا : اور وہ تھے][يَعْتَدُوْنَ : حد سے گزرجاتے]

ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا تھا انھیں داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان پر (سے) لعنت کی جاچکی (ہے)۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔

تشریح: جو کسی بھی آسمانی کتاب یا سچے نبی کی نافرمانی کریں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیئے جاتے ہیں چاہے وہ دنیا کی کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں لیکن یہاں سیاق و سباق کی مناسبت سے صرف بنی اسرائیل کا ذکر کیا گیا ہے اور ہر نبی نے کفار کو ان کے برے انجام سے آگاہ فرمایا، لیکن یہاں خاص طور پر حضرت داؤد (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ ان کی بددعا سے بنی اسرائیل کے کفار پر ایسی لعنت برسی کہ انھیں بندر اور خنزیر بنادیا گیا۔

حضرت داؤد (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی زبان سے جو لعنت بنی اسرائیل پر کی گئی اس کے لیے بائبل کے درج ذیل حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

حضرت داؤد (علیہ السلام) نے کہا: خداوند! تو آ اور ان متکبر لوگوں کا انتظام کر جنھوں نے غریب لوگوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ان کے منہ میں بے ادبی، جھوٹ اور فراڈ کے سوا کچھ نہیں، وہ اپنے غلط منصوبوں پر فخر کرتے ہیں اور رات کی تاریکی میں مسافروں کو قتل کرتے ہیں۔۔خداوند! آ اور ان کو پامال کردے۔۔خداوند! تو ان کی برائیوں کو جانتا ہے اب ان کو سزا دے۔۔ان برے لوگوں کے بازو توڑ دے اور ان کا تعاقب کر یہاں تک کہ ان کا آخری آدمی تک تباہ ہو جائے۔

(زبور: باب 10: ہولی بائبل 1954: اور لیونگ بائبل 1975)

تب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کے اجتماع اور اپنے حواریوں سے کہا: یہ یہودی مذہبی لیڈر اور فریسی جو موسیٰ (علیہ السلام) کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ کرو ممکن ہے وہ صحیح کہہ رہے ہوں لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ جو وہ لوگوں کو کہتے ہیں وہ خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ سب کچھ دکھلاوے اور اپنے آپ کو مقدس ظاہر کرنے کے لیے کرتے ہیں۔۔

اے ریاکار مذہبی لیدر رواور فریسیو تم پر افسوس ! کیونکہ نہ تو تم لوگوں کو آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونے دیتے ہو اور نہ ہی خود داخل ہوتے ہو۔۔اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے بیٹے ہو۔ غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھر دو۔ اسے سانپو اور زہریلے سانپوں کے بچو ! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچوگے ؟"

(متی کی انجیل : باب 23: ہولی بائبل 1954، لیونگ بائبل 1975)

بنی اسرائیل کی نافرمانی اور زیادتی کی داستانیں بائبل کے اندر بکثرت موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

بنی اسرائیل نے بہت سے برے کام کئے جن سے خداوند بہت غضب ناک تھا کیونکہ انھوں نے بتوں کی پوجا کی باوجودیکہ خداوند نے انھیں خصوصی طور پر بار بار وارننگ دی۔ خداوند نے بنی اسرائیل اور یہوداہ کی طرف بار بار نبی بھیجے تاکہ وہ برے کاموں سے باز آجائیں۔۔ لیکن بنی اسرائیل نے ایک نہ سنی۔۔ انھوں نے خداوند کے احکام، معاہدوں اور وارننگز کو پس پشت ڈال دیا۔۔ اور بچھڑے، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع کر دی حتیٰ کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو تھانوں پر آگ سے جلانا شروع کر دیا۔۔ جن سے خداوند غضب ناک ہو گیا۔

(2 سلاطین : 17: 12 تا 17 ہولی بائبل 1954: لیونگ بائبل 1975) (امداد)

تبلیغ نہ کرنے کی وجہ سے بنو اسرائیل پر لعنت کا بیان

حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا : بنو اسرائیل پر ہر زبان میں لعنت کی گئی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد میں ان پر تورات میں لعنت کی گئی ' حضرت داؤد (علیہ السلام) کے عہد میں ان پر زبور میں لعنت کی گئی اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں ان پر قرآن مجید میں لعنت کی گئی۔ (جامع البیان ' جز ٦ ' ص ٤٢٦)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنو اسرائیل میں سے کوئی شخص جب اپنے کسی بھائی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھتا تو اس کو سختی سے منع کرتا ' اور دوسرے دن جب اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھتا تو اس کو منع نہ کرتا اور اس کے ساتھ مل جل کر رہتا اور کھاتا پیتا ' جب انھوں نے اس طرح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دل ایک دوسرے کی طرح کر دیئے اور ان کے نبی حضرت داؤد (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ بن مریم کی زبانوں سے ان پر لعنت کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا اور ضرور برائی کرنے والے کے ہاتھوں کو پکڑ لینا اور اس کو حق پر عمل کرنے کے لیے مجبور کر دینا ' ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کی طرح کر دے گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی ہے۔ (جامع البیان ' جز ٦ ص ٤٢٨۔ ٤٢٧ ' مسند ابو یعلی ' ج ٨ ' رقم الحدیث : ٥٠٣٥ ' مسند احمد ' ج ١ ' ص ٣٩١ ' طبع قدیم)

ابن زید اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ بنو اسرائیل پر انجیل اور زبور میں لعنت کی گئی ہے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایمان کی چکی گھوم رہی ہے۔ جس طرف قرآن پھرے ' تم اس طرف پھر جاؤ۔ جن چیزوں کو فرض کرنا تھا ' اللہ تعالیٰ ان سے فارغ ہو چکا ہے۔ بیشک بنو اسرائیل میں سے ایک گروہ نیک لوگوں کا تھا ' وہ نیکی کا حکم دیتے تھے اور برائی سے روکتے تھے ' ان کی قوم نے ان کو پکڑ کر آروں سے چیر دیا اور ان کو سولی پر لٹکا دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ باقی بچے جن کو بادشاہوں کے پاس جانے اور ان کی مجالس میں بیٹھے بغیر قرار نہیں

آیا 'پھران کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے بغیران کو چین نہیں آیا 'پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب کے دل ایک جیسے کردیئے اور یہ اس آیت کی تفسیر ہے۔ بنواسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا 'ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ (جامع البیان 'جز ۶ ص ۴۲۹)
امام ابویعلی موصلی نے اپنی سند کے ساتھ عمرو بن الحارث سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) کو ولیمہ میں بلایا۔ جب وہ گئے تو وہاں لہو (گانے بجانے) کو سنا تو حضرت ابن مسعود (رض) واپس آگئے۔ اس نے پوچھا آپ کیوں واپس آئے؟ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس شخص نے کسی قوم کی تعداد میں اضافہ کیا 'وہ ان ہی میں سے ہوگا اور جو شخص کسی قوم کے عمل سے راضی ہوا 'وہ اس عمل کے مرتکبین میں شریک ہوگا۔ اور امام ابن المبارک نے کتاب الزھد والرقائق میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری (رض) کو ایک ولیمہ میں بلایا گیا۔ انھوں نے وہاں (گانے بجانے کی) آواز سنی تو واپس آگئے 'ان سے پوچھا گیا 'آپ کیوں نہیں گئے؟ تو فرمایا: میں نے آواز سنی اور جس شخص نے کسی جماعت میں اضافہ کیا 'اس کا شمار ان ہی میں ہوگا اور جو کسی عمل سے راضی ہوا 'وہ اس عمل میں شریک ہوگا۔ (نصب الرایہ 'ج ۴ 'ص ۳۴۷۔ ۳۴۶ 'اتحاف السادۃ المتقین 'ج ۶ 'ص ۱۲۸ 'مسند الفردوس للدیلمی 'رقم الحدیث: ۵۶۲۱ 'المطالب العالیہ العسقلانی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۶۰۵)
حافظ زیلعی 'حافظ عسقلانی اور علامہ زبیدی نے یہ حدیث مسند ابویعلی کے حوالے سے بیان کی ہے 'لیکن مجھے یہ حدیث مسند ابویعلی کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملی اور نہ ہی مجھے حضرت ابوذر کی روایت امام ابن المبارک کی کتاب الزھد میں ملی۔ (تبیان)
ایک قول یہ ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) نے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جلوہ افروزی کی بشارت دی اور انھوں نے ایمان لانے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کرنے سے انکار کیا تو ان منکروں پر آپ نے لعنت فرمائی۔ روح المعانی میں مزید توضیح یہ بھی ہے کہ پانچ ہزار مسخ شدہ افراد کی تعداد میں بچے اور عورتیں شامل نہیں ہیں یہ صرف مردوں کی تعداد ہے۔ اور داؤد (علیہ السلام) کی بددعا کے یہ الفاظ تھے۔
اے اللہ ان پر ایسی لعنت فرما جو ان کے تمام جسم پر لباس کی طرح آجائے یا اس ازار بند کی طرح جو پوری کمر کو لپیٹ لیتا ہے۔ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی بددعا کے یہ الفاظ تھے۔
اے اللہ جس نے مائدہ کھانے کے بعد کفر کیا اس کو ایسی سزا دے کہ وہ سزا تو نے کسی کو بھی نہ دی ہو جہان والوں میں اور ان پر ایسی لعنت فرما جیسی تو نے ہفتہ والوں پر لعنت کی۔

مسئلہ

آیہ کریمہ سے ثابت ہوا کہ نہی المنکر واجب ہے اور منکرات سے روکنے سے باز رہنا مداہنت فی الدین ہے اور یہ سخت گناہ ہے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے اول تو منع کیا جب وہ باز نہ آئے تو پھر وہ علماء بھی ان سے مل گئے اور کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے میں ان کے ساتھ شامل ہوگئے ان کے اس عصیان و تعدی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے حضرت داؤد حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کی زبان سے ان پر لعنت اتار دی۔

حضرت ابو سلمہ (رض) سے روایت ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قسم اس ذات پاک کی جس کی ید قدرت میں میری جان ہے میری امت کے بعض لوگ جب قبروں سے نکلیں گے تو ان کی صورتیں بندروں اور خنزیروں کی ہوں گی اس جرم میں کہ وہ بے دین سیہ کاروں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی زبان بند رکھتے تھے اور منع کرنے کی طاقت کے باوجود بالکل خاموش رہتے تھے۔ (روح المعانی) آگے کافروں سے وداد و محبت رکھنے والوں پر وعید شدید ہے۔ (حسنات)

لعنت کا معنی ہے نیکی کرنے کی توفیق سے محروم ہونا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سزاوار ٹھہرنا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ اہل کتاب خود بھی بد عمل تھے اور ہیں۔ لوگوں کے لیے برائی کا سبب بنے اور یہ اسی روش پر آج تک قائم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت مسلمانوں سے محبت کرنے کی بجائے کفار کے ساتھ محبت کرتی ہے حالانکہ عیسائی اور یہودی اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کے دعوے دار اور انبیاء کے قائل ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے دعویٰ میں سچے ہوتے تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ کفار کی بجائے مسلمانوں سے محبت کرتے لیکن انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں پر کفار کو ترجیح دی ہے۔ جس کا واضح ثبوت امریکہ اور یورپ کا عربوں کی بجائے اسرائیل کے ساتھ اور پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان کو ترجیح دینا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے جہنم میں دھکیلے جائیں گے۔ (فہم)

غرض جب یہود و مشرکین کے گناہ، فتنے، مظالم حد سے بڑھ گئے، معاشرہ برباد ہو گیا، جرائم عام ہو گئے، جرم جرم ہی نہ رہا۔ ارتکاب جرم سے کوئی کسی کو نہ روکتا، عصمت و عفت کی کوئی قیمت نہ رہی سب کچھ نفس پر قربان کیا جائے لگا تو اللہ نے حضرت داؤد اور حضرت مسیح (علیہما السلام) کی زبان سے ان پر لعنت کی شکل انسانی مسخ کر کے ان کو بندر و سور بنا دیا گیا۔ قوم کے دلوں کو بھی مسخ کر دیا گیا ان میں بھی بندر کی سی خود غرضی، لالچ اور بے حیائی پیدا ہو گئی، جو آج تک قائم ہے۔ البتہ یہود و نصاری میں سے نصاریٰ نسبتاً اسلام کی طرف مائل ہوئے، کچھ اس وجہ سے بھی کہ ابھی ان میں حق کے متلاشی، خدا ترب علماء اور درویش موجود تھے، اس رکوع میں اللہ کے قانون توڑنے والوں اور احکامات الٰہی کی توہین کرنے والوں پر عذاب کے نزول کا ذکر ہے اور جن لوگوں میں قبولیت حق کی استعداد و صلاحیت باقی ہے، ان کی تعریف کی گئی ہے۔ (فیوض)

آج کے رکوع کے آغاز میں بظاہر ایک ایسی بات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو سزا کے طور پر ان پر وارد ہوئی۔ لیکن درحقیقت ایک اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔ وہ یہ کہ قومیں اور امتیں جن علائق اور موانع کی وجہ سے بالعموم راہ راست پر نہیں آتیں ' وہ فطری نتائج ہیں اس کوتاہیِ فکر کے جس نے ان کے اندر ایک ایسا رویہ جنم دیا جس کی وجہ سے وہ کبھی اپنی تاریخ سے کبھی دامن چھڑانے کی کوشش نہیں کرتیں اور اپنے ماضی کی اسیر ہو کر کبھی بھی صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرتیں۔ اقبال نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

بنی اسرائیل بھی اس تصور سے دست کش ہونے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ہم اس کی خاص قوم ہیں۔ ہم انبیاء کی اولاد ہیں۔ صدیاں گزر گئیں ' نبوت ہمیشہ ہم میں آتی رہی۔ آج اگر بنی اسماعیل کو اس نعمت سے نوازا جارہا ہے اور ان میں آخری نبی کو اٹھا کر دنیا کی سیادت و قیادت انھیں دی جارہی ہے تو بنی اسرائیل کا احساس تفاخر کسی قیمت پر بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ بنی اسماعیل جن کو ہم ہمیشہ امی ّ کہہ کے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور جنھیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں ' یہ

کیسے ممکن ہے کہ ہم جیسی معزز قوم ان کے نبی پر ایمان لے آئے اور ان کی قیادت کو قبول کرلے یعنی وہ اپنے ماضی کی بنیاد پر اللہ کے اس آخری پیغام کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ پروردگار نے اس رکوع کی پہلی آیتوں میں انھیں تاریخ کا آئینہ دکھا کر ان کے اس خیال باطل کا علاج کیا ہے کہ نادانو! تم جس تاریخ پر اتراتے ہو اور جس کی وجہ سے تم راہ ہدایت اختیار کرنے سے انکار کر رہے ہو، تمھیں خوب معلوم ہے کہ تمہارے اپنے پیغمبر تاریخ کے مختلف ادوار میں تم پر لعنت برساتے رہے ہیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ (المائدہ: ۷۸)

" بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے"۔

بنی اسرائیل پر تمام انبیاءؑ نے لعنت کی

یہاں ذکر صرف دو نبیوں کا کیا گیا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ توراۃ اور قرآن کریم پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رسول شاید ایسا نہیں گزرا، جس نے ان کی بداعمالیوں کے باعث، ان سے ناخوشی کا اظہار نہ کیا ہو اور اللہ کی جانب سے ان پر لعنت نہ کی ہو۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حوالے سے چند رکوع پہلے ہم ایسی ہی صورت حال پڑھ چکے ہیں اور یہاں حضرت داؤد (علیہ السلام) کا ذکر شاید اس لیے کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) وہ رسول ہیں کہ جنھیں بنی اسرائیل اپنی عظمتوں کا امین سمجھتے اور دنیوی رفعتوں کے اعتبار سے انھیں تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کرتے تھے اور ان کے بنی اسرائیل میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرح پرجلال پیغمبر نہیں تھے بلکہ ان کی طبیعت پر جمال کا غلبہ تھا اور شاید اسی جمال ہی کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے ان کو خوبصورت آواز عطا فرمائی تھی۔ تاریخ میں آج تک خوبصورت آواز کے لیے "لحنِ داؤدی" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور پھر آواز میں ایسا سوز و گداز تھا کہ جب وہ پہاڑوں میں مزامیر زبور کی تلاوت کرتے تھے تو پہاڑ ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور پرندے جھوم جھوم کے اترتے اور بعض دفعہ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کا اندازہ فرمایئے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) جیسی دل آویز شخصیت بھی ان پر لعنت کرتی اور ناگواری کا اظہار کرتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کی بدعہدیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کا دل زخمی تھا۔ اس لیے اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں بار بار اپنی نارضامندی کا اظہار فرماتے۔ ہم ان کی مناجاتوں میں سے صرف ایک مناجات کا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے انداز کی وضاحت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

لیکن خدا شریر سے کہتا ہے

تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ

اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے؟

جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔

اور میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔

تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔
اور زانیوں کے شریک رہا ہے۔
تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے۔
اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے۔
تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔
اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔
تو نے یہ کام کیے اور میں خاموش رہا۔
تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔
لیکن میں تجھے ملامت کر کے ' ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا
ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ (زبور ۵۰: ۱۶۔۲۲)

اسی طرح سیدنا مسیح نے بھی ان پر بارہا لعنت کی ہے جن کی مثالیں انجیلوں میں موجود ہیں۔ ہم اختصار کے خیال سے ان کے خطاب سے صرف دو اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

(اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟ اس لیے دیکھو! میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راست باز ہابل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک ' جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے جمع کر لیتی ہے ' اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو! تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہر گز نہ دیکھو گے ' جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے) (متی ۲۳: ۱۴۔۳۹)

لعنت کے دو مفہوم

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے ابتدائی دور کے ایک عظیم رسول اور پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کے آخری رسول ' دونوں کے حوالے سے ان پر لعنت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس طرح اس تاریخ کے درمیان میں جو ہزاروں نبی گزرے ہیں ' ان کا ذکر اگرچہ نہیں کیا گیا ' لیکن پہلی اور آخری کڑی کا ذکر کر کے گویا پوری تاریخ کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس تاریخ کے تناظر میں جو بات انتہائی قابل توجہ ہے ' وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنی تاریخ میں کچھ بھی رہے ہوں ' بہر حال ایک حامل دعوت امت تھے۔ ایسی امت پر بار بار لعنت کا برسنا ' یہ ان کی تاریخ کا ایسا داغ ہے جس کو

کبھی بھی دھویا نہیں جاسکتا کیونکہ لعنت کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی رحمت سے دوری اور دوسرا اس بات کا اعلان کہ یہ قوم قبولیت حق سے پوری طرح محروم ہوچکی ہے ' اب ان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہم اپنے معاشرے میں آج بھی اس لفظ کا استعمال تقریباً اس کے قریب قریب معنی کے لیے کرتے ہیں۔ کسی آدمی پر لعنت اس وقت کی جاتی ہے جب اس کے اخلاق اور شرافت کی طرف سے بالکل مایوسی ہو جاتی ہے۔ یہ قوم بھی معلوم ہوتا ہے ' ایسی ہی انتہاء کو بار بار چھوتی رہی۔ اب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کی صورت میں انھیں جو آخری موقع دیا جارہا ہے ' اسے تو انھیں غنیمت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس کے نتیجے میں انھیں ایک نئی زندگی مل سکتی تھی۔ لیکن یہ لوگ چونکہ اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کے اسیر تھے ' اس لیے یہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاسکے۔ البتہ ! ایک سوال باقی رہ جاتا ہے ' وہ یہ کہ لعنت جیسا کہ عرض کیا سب سے بڑی محرومی کا نام ہے۔ بنی اسرائیل سے ایسا کونسا جرم سرزد ہوا تھا کہ انھیں اتنی بڑی محرومی کی سزا دی گئی ؟

بنی اسرائیل پر لعنت کی وجوہات

اس کا جواب ان دو آیات کریمہ میں دیا گیا ہے۔

1 فرمایا گیا کہ ان کا پہلا جرم تو یہ تھا ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا کہ یہ لعنت ان پر اس لیے کی گئی کہ وہ لوگ نافرمانی کرتے تھے یعنی وہ اللہ کے احکام کے نافرمان تھے۔ قرآن کریم سے ان کی اس نافرمانی کی تین شکلیں معلوم ہوتی ہیں :

(ا) ان بنی اسرائیل میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا کہ جو اللہ کے احکام کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیتا تھا۔ چنانچہ اس کی مثالیں ان کی ابتدائی تاریخ کے آخری دور تک آپ کو جابجا ملیں گی۔ جب ان پر تورات نازل کی گئی ' جس طرح انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور پھر کوہ طور کو ان کے سروں پر لا کر ان کو اسے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ' یہ ان کی ابتدائی تاریخ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ پھر جزیرہ نمائے سینا میں جب انھیں فلسطین پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے جس طرح اس حکم سے سرتابی کی بلکہ ایک حد تک بغاوت کردی ' اس کا تذکرہ خود تورات میں موجود ہے اور بعد کی تاریخ میں ان کی سرتابیوں اور نافرمانیوں کا تذکرہ مختلف صحیفوں میں موجود ہے۔

(ب) بنی اسرائیل کا ایک خاصہ بڑا عنصر ایسا تھا جو صاف صاف اللہ کے احکام کو قبول کرنے سے تو انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس میں چور دروازے نکالنے اور اپنی بے عملی کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے ' پے در پے سوالات کرتا تھا۔ قرآن کریم نے سورۃ البقرہ میں ان کی اس بری عادت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس امت کو تنبیہ کی ہے کہ تم قوم موسیٰ کی طرح نہ ہوجانا۔

(ج) ان لوگوں میں ایک اور عادت تھی۔ وہ یہ کہ احکام حق سے انحراف نہیں کرتے تھے ' البتہ وہ آداب زندگی جو پیغمبر کے واسطے سے ملتے ہیں کیونکہ اللہ کی کتاب تو اصول اور احکام دیتی ہے ' لیکن زندگی کے آداب اللہ کے نبیوں کی سنت سے ملتے ہیں اور یہی وہ آداب ہیں جو ثقافت و تہذیب کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل پیغمبر کی دی ہوئی اس زندگی سے معلوم ہوتا ہے ' اختلاف کرتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث پاک میں ان کی اس خوئے بد کا ذکر فرمایا :

انما اهلك الذين من قبلكم كثرة مسائلهم و اختلافهم على انبياءهم

(تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے ' کثرت سوالات نے اور اپنے انبیاء سے اختلاف نے۔)

نافرمانی کی یہ تینوں شکلیں بتمام و کمال بنی اسرائیل میں موجود تھیں۔

2 ان کا دوسرا جرم اور برائی جو ان کے لیے لعنت کا باعث ہوئی وہ ہے :

كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

(یہ لوگ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔)

نافرمانی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت نہ کی جائے۔ حد سے گزر جانا اس کا اگلا مرحلہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں یہ احساس بھی مر جائے کہ میں نے اطاعت نہ کرکے کوئی جرم کیا ہے ' بلکہ بڑے سے بڑے جرم کو بھی آنحضرت کے ارشاد کے مطابق یوں سمجھا جائے کہ ایک مکھی تھی جو چہرے پر بیٹھی اور اڑ گئی جبکہ ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو یوں محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ اس کے سر پر گر گیا ہو۔

معصیت اور اس کے احساس کا مٹ جانا یہ بجائے خود بہت بڑی محرومی کی علامتیں ہیں۔ لیکن ایسی صورت حال میں اگر اس قوم یا اس معاشرے میں خیر کی دعوت دینے والے نیکی کی طرف بلانے والے اور برائی سے روکنے والے لوگ موجود رہیں اور وہ اپنا فرض انجام دیتے رہیں ' اس کے نتیجے میں کسی نہ کسی حد تک قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ رہتا ہے ' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے افراد کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملتا اور قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملے میں تساہل شروع کر دے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کی بجائے انھیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دے اور خیر کی طرف بلانے والے لوگ اشرار کے خوف سے گھر میں چھپ کے بیٹھ جائیں تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود ہوتی ہے ' پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب قوم قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہو جاتی ہے اور پھر برائی کا احساس آہستہ آہستہ دم توڑ جاتا ہے۔ اب اگر برائی کی طرف سے روکنے کی کوشش بھی کی جائے تو لوگ اسے دیوانگی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں یہی صورت حال پیدا ہوئی جس کا اس آیت کریمہ میں تذکرہ کیا جا رہا ہے ۔ (روح)

مسائل

۱۔ برائی سے منع نہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

۲۔ برائی سے منع نہ کرنا بڑا گناہ ہے۔

۳۔ بنی اسرائیل نے ایک دوسرے کو برائی سے منع کرنا چھوڑ دیا تھا۔

۴۔ بنی اسرائیل کی اکثریت کفار سے دوستی کرتی ہے۔

۵۔ برے اعمال کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

آیت مبارکہ :

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

لغۃ القرآن: [كَانُوْا : وہ تھے][لَا : نہیں][يَتَنَاهَوْنَ : وہ منع کرتے][عَنْ : سے][مُّنْكَرٍ ؛ برائی][فَعَلُوْهُ : انہوں نے کیا اس کو][لَبِئْسَ : البتہ برا][مَا كَانُوْا : جو وہ تھے][يَفْعَلُوْنَ : وہ کام کرتے]

ترجمہ: (اور اس لعنت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ) وہ جو برا کام کرتے تھے ایک دوسرے کو اس سے منع نہیں کرتے تھے۔ بیشک وہ کام برے تھے جنہیں وہ انجام دیتے تھے .

تشریح:

روک ٹوک نہ کرنے کا نتیجہ

لَایَتَنَاهَوْنَ کے دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) نہیں رکتے تھے کما فی روح المعانی (۲) نہیں روکتے تھے ایک دوسرے کو کما ھوالمشہور جب بدی کسی قوم میں پھیلے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں کرتا لیکن اس وقت کہ برائیاں ان میں پھیل جائیں اور وہ باوجود قدرت کے انکار نہ کریں اس وقت عام خاص سب کو اللہ تعالیٰ عذاب میں گھیر لیتا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم سے پہلے بنی اسرائیل میں سے اگر کوئی شخص گناہ کرتا تھا تو دوسرا شخص اس کو منع کرتا تھا۔ لیکن دوسرے روز صبح کو یہی منع کرنے والا اسی مرتکب گناہ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل گناہ میں اس کو آلودہ اس نے دیکھا ہی نہ تھا۔ جب اللہ نے ان کی یہ حالت ملاحظہ فرمائی تو سب کے دل ایک جیسے کردیئے اور کچھ لوگوں کو ان میں سے بندر اور سوٴر بناڈالا اور داؤد و عیسیٰ کی زبانی ان پر لعنت کی اس کا سبب ان کی نافرمانی اور حدود وممانعت سے تجاوز تھا۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم کو ضرور نیکی کی ہدآیت اور برائی سے بازداشت اور بیوقوف کے ہاتھوں پر گرفت اور حق پر اجتماعی موافقت کرنی لازم ہے۔ ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ ایک جیسا کردے گا (یعنی سب کے دلوں پر مہر لگادے گا) اور جس طرح ان پر لعنت کی اسی طرح تم پر بھی لعنت کرے گا۔ رواہ الترمذی وابوداؤد۔ من حدیث عبداللہ بن مسعود مرفوعاً۔

حضرت ابو بکر صدیق (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے میں نے خود سنا آپ فرمارہے تھے کہ لوگ جب ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو اغلب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب پر آجائے۔ (گلدستہ)

گناہ سے روکنا واجب اور منع کرنے سے باز رہنا گناہ ہے

اس سے معلوم ہوا کہ برائی سے لوگوں کو روکنا واجب ہے اور گناہ سے منع کرنے سے باز رہنا سخت گناہ ہے۔ اس سے ان علماء کو اور بطور خاص ان پیروں کو اپنے طرز عمل پر غور کرنے کی حاجت ہے کہ جو اپنے ماننے والوں میں یا مریدین و معتقدین میں اعلانیہ گناہ ہوتے دیکھ کر اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے منع کرنے سے لوگ گناہ سے باز آجائیں گے پھر بھی "یا شیخ اپنی اپنی دیکھ" کا نعرہ لگاتے نظر آتے ہیں۔
حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن عذری (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اس علم کو ہر پچھلی جماعت میں سے پرہیزگار لوگ اٹھاتے رہیں گے اور وہ غُلُوّ کرنے والوں کی تحریفیں، اہل باطل کے جھوٹے دعوؤں اور جاہلوں کی غلط تاویل و تشریح کو دین سے دور کرتے رہیں گے۔

(سنن الکبری للبیہقی، کتاب الشہادات، باب الرجل من اہل الفقہ۔۔ الخ، ۱۰/۳۵۳، الحدیث: ۲۰۹۱۱)

مفتی احمد یار خاں نعیمی (رح) فرماتے ہیں "اس میں غیبی بشارت ہے کہ تاقیامت میرے دین میں علماء ے خیر پیدا ہوتے رہیں گے۔ جو علم دین کو پڑھتے پڑھاتے اور تبلیغ کرتے رہیں گے۔ خیال رہے کہ گزشتہ صالحین کو سلف اور پچھلوں کو خلف کہا جاتا ہے لہٰذا ہر جماعت صالحین اگلوں کے لحاظ سے خلف اور پچھلوں کے لحاظ سے سلف ہے۔ حدیث پاک کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یعنی مسلمانوں میں بعض جاہل علماء کی شکل میں نمودار ہو کر قرآن و حدیث کی غلط تاویلیں اور معنوی تحریفیں کریں گے، وہ مقبول جماعت ان تمام چیزوں کو دفع کرے گی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! آج تک ایسا ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوگا، دیکھ لو علماء ے دین کی سرپرستی نہ حکومت کرتی ہے نہ قوم لیکن پھر بھی یہ جماعت پیدا ہو رہی ہے اور خدمت دین برابر کر رہی ہے۔ (مراٰۃ المناجیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ۱/۲۰۱، تحت الحدیث: ۲۳۰) (صراط)
سید دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لیے جو اصول دیئے ہیں ان میں اس بات کو بے حد اہمیت حاصل ہے کہ تم اپنی نیکی پر اس وقت تک قائم رہو گے 'جب تک تم خیر کی دعوت دیتے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے رہو گے۔ جب تم دیکھو کہ کسی گروہ پر تمہاری کاوشیں بے نتیجہ ہو رہی ہیں اور وہ خیر کی طرف آنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تو پھر تمہارے لیے لازم ہے کہ تم ایسے لوگوں سے ترک تعلق کر دو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دعائے قنوت میں ہمیں اس عہد کو بار بار دہرانے کا حکم دیا ہے 'تاکہ اسے یاد رکھنے میں ہمیں آسانی رہے۔ وہ عہد یہ ہے:

وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ

('ہم بائیکاٹ کر دیں گے اور ترک تعلق کر دیں گے اس آدمی سے جو تیرا قانون توڑے گا اور تیری نافرمانی کرے گا)
حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل پر لعنت کے اسباب تین تھے:
1 اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی۔
2 نافرمانی میں حد سے گزر جانا۔

3 ایک دوسرے کو برائی سے نہ روکنا اور اگر روکا جائے تو رکنے سے انکار کر دینا۔
اللہ فرماتا ہے کس قدر برے تھے وہ کرتوت 'جو یہ لوگ کرتے تھے۔
کہیں خدانخواستہ ہم بھی اللہ کی لعنت کی طرف تو نہیں بڑھ رہے؟ استغفر اللہ!
بنی اسرائیل اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ قرآن کریم نے ان کے واقعات کا تذکرہ کرکے ہمارے لیے نصیحت و عبرت کا سامان بہم پہنچایا۔ یہاں رک کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا یہ تینوں برائیاں اس امت میں موجود تو نہیں۔ کہیں ہم بھی اللہ کی نافرمانی تو نہیں کرتے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نافرمانی میں ہم بھی حد سے گزر چکے ہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم کسی برائی کا ارتکاب کر رہے ہیں تو اس میں ہمارا رویہ یہ ہو گیا ہے کہ جو ہمیں اس سے روکتا ہے 'ہم اس کا منہ نوچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس سے رکنے کا کبھی نام نہیں لیتے؟ اگر امت کی اجتماعی حالت دیکھی جائے اور اپنے اجتماعی اداروں بالخصوص احتسابی اداروں 'عدالتوں اور ایوان ہائے حکومت کے طرز عمل کو سامنے رکھا جائے تو یہ دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ یہ تینوں بیماریاں بہت حد تک ہم میں در آئی ہیں اور سود کے مسئلے میں تو ہمارا نظام حکومت اور نظام عدالت بالکل عریاں ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس لیے ہمیں صرف بنی اسرائیل ہی کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے بارے میں سوچنا ہے کہ اگر ہم نے اپنا فرض نہ پہچانا تو کہیں اس لعنت کا رخ ہماری طرف تو نہیں ہو جائے گا۔
انسان کا ذوق اس کے اعمال کا سرچشمہ ہوتا ہے
بقول اقبال:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

کسی بھی انسان کا اصلی جوہر جو اس کی انسانی قدر و قیمت کی پاسبانی کرتا ہے۔ درحقیقت اس کا اپنا احساس ہے 'جس کو دل کی بیداری بھی کہا گیا ہے۔ جب تک یہ دل کی زندگی کی صورت زندہ رہتا ہے تو آدمی زندہ رہتا ہے اور جب یہ مر جاتا ہے تو آدمی اور اس کی ہر چیز مر جاتی ہے۔ (روح)
اس لیے اقبال نے کہا

اے دل زندہ کہیں تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

درحقیقت ایک آدمی خود تو نیک کام کرتا ہے مگر اس کے آس پاس برائی کا بازار گرم ہے اور وہ طاقت ہونے کے باوجود لوگوں کو برائی سے نہیں روکتا تو اس کا یہ فعل بذات خود ایک ایسی برائی ہے جو اسے بھی بروں کی صف میں شامل کر دیتی ہے، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ خاص گنہگاروں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ ہاں جب وہ اپنے درمیان برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتے ہوں مگر نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ خاص مجرموں کے ساتھ عام لوگوں کو بھی مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔
(مسند احمد 4: ص 192)

برے لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں لیکن ہر قوم کی یہ اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ ان پر پردہ نہ ڈالے بلکہ ان کی نشاندہی کرے۔ وہ مجرموں کو تحفظ فراہم نہ کرے بلکہ قانون کے حوالہ کرے اور ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرے۔ جب کوئی قوم مجرموں سے چشم پوشی کرتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ پوری قوم جرائم کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور ہر ایک کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

لغۃ القرآن: [تَرٰى: آپ دیکھیں][كَثِيْرًا : بہت زیادہ][مِّنْهُمْ : ان سے][يَتَوَلَّوْنَ : وہ دوستی رکھتے ہیں][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : جنہوں نے کفر کیا][لَبِئْسَ : البتہ برا][مَا قَدَّمَتْ : جو آگے بھیجا انہوں نے][لَهُمْ : ان کے لیے][اَنْفُسُهُمْ : ان کے نفس][اَنْ : یہ کہ][سَخِطَ : ناراض ہوا][اللّٰهُ : اللہ][عَلَيْهِمْ : ان پر][وَفِي : اور میں][الْعَذَابِ : عذاب][هُمْ : وہ][خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے]

ترجمہ: آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں۔ کیا ہی بری چیز ہے جو انھوں نے اپنے (حساب آخرت) کے لیے آگے بھیج رکھی ہے (اور وہ) یہ کہ اللہ ان پر (سخت) ناراض ہو گیا، اور وہ لوگ ہمیشہ عذاب ہی میں (گرفتار) رہنے والے ہیں

تشریح: يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : کافروں سے دوستی کرتے ہیں۔ } پچھلی آیات میں گزشتہ زمانے کے یہودیوں کی مذموم صفات اور ان کے عیوب و نقائص کا بیان تھا اب حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ مبارکہ کے یہودیوں کی برائیوں اور سازشوں کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔

شان نزول

کعب بن اشرف یہودی اور اس کے ساتھی سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بغض وعناد کی وجہ سے مشرکین مکہ کے پاس پہنچے اور انھیں تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کرنے پر ابھارا، لیکن یہ لوگ اپنی اس کوشش میں ناکام و نامراد ہوئے، اس واقعے سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منافقین میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے کہ وہ یہودیوں سے دوستی کرتے ہیں۔ (خازن، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۸۰، ۵۱۷/۱)
کفار سے دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر نازل ہوا اور آخرت میں دائمی عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

کفار سے دوستی کا دم بھرنے والے مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت

معلوم ہوا کے کفار سے دوستی اور موالات حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے۔ یہ آیت مبارکہ ان مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے جو کفار کی مسلمانوں سے کھلی دشمنی اپنی روشن آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود، صرف اپنے منصب کی بقا کی خاطر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے، ان کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ان کی ناراضی سے خوف کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ کی توفیق عطا فرمائے (. صراط)

اہل کتاب ہونے کی وجہ سے یہود اور مسلمانوں میں کئی مشترک اقدار ہیں جن میں سب سے اہم اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام (علیہم السلام) پر ایمان ہے۔ مسلمان اور یہود دونوں اس عقیدہ میں مشترک ہیں۔ اب حق تو یہ بنتا تھا کہ یہود اور مسلمان اکٹھے ہو کر کفار اور مشرکین کے مقابلہ میں آتے، کیونکہ دونوں توحید پرست تھے مگر مدینہ کے یہود بڑے عجیب لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام (علیہم السلام) کو ماننے والے مسلمانوں کو چھوڑ کر مکہ کے ان کافروں اور مشرکوں کے ساتھ دوستی اور ہمدردی کے رشتے استوار کرتے ہیں جو نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی نبی کو مانتے ہیں۔
یہود کے ان افعال سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام (علیہم السلام) پر ایمان ہی نہیں رکھتے کیونکہ اگر ان کا توحید پر محکم یقین ہوتا تو کفار (خدا کے منکروں) کا ساتھ دے کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت نہ دیتے کیونکہ تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) کے دینوں میں کفار سے گہری دوستی کی ممانعت ہے حتیٰ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے غیر اسرائیلی لوگوں کو کتوں سے تشبیہ دی اور ان کی ہمدردی سے انکار کر دیا تھا۔

(متی کی انجیل: باب 15: آیت نمبر 26: لیونگ بائبل 1975)

قرآن مجید نے ہر ایسی قوم کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کیا ہے جو اسلام یا مسلم دشمنی میں براہ راست یا بالواسطہ سرگرم ہو اور اگر کوئی غیر مسلم قوم ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہو تو قرآن مجید نے ان کے ساتھ حسن سلوک اور منصفانہ برتاؤ کی ترغیب دی ہے اور ان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی خوشخبری سنائی ہے جو پرامن غیر مسلموں کے ساتھ منصفانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

(قرآن: 60: 8 تا 9)

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر دنیا کی ہر قوم آج عمل پیرا ہے۔ کوئی قوم اپنے دشمن کے ساتھ دوستی کے مراسم استوار نہیں کرتی اور نہ ہی کسی غیر دشمن قوم کے ساتھ خواہ مخواہ تعلقات خراب کرتی ہے۔
یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کفار کا ساتھ دیتے ہیں جو مسلمانوں کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔ بلا شبہ پر امن غیر مسلم اقوام کے ساتھ اچھے تعلقات اور دوستانہ مراسم پیدا کرنے سے اسلام نہیں روکتا اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دور میں اس پر عمل بھی کیا ہے لیکن مسلمانوں کی قیمت پر کسی غیر مسلم قوم کا ساتھ دینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (امداد)
انسانی فطرت ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہمیشہ پڑھے لکھے سے دوستی کرتا ہے ' ایک مہذب آدمی اپنے رفاقت کے لیے کوئی مہذب آدمی چنتا ہے ' ایک عالم فاضل شخص کسی جاہل کی دوستی سے کبھی خوش نہیں رہ سکتا ' ایک نیک آدمی برے کی صحبت سے بچتا ہے اور اپنے جیسے آدمی کو ہم نشینی کے لیے تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ ہم جانوروں تک میں دیکھتے ہیں کہ ہر جانور اپنے ہم جنسوں میں خوش ہوتا ہے اور ناجنسوں کے قریب نہیں جاتا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر باز با باز

یہی حال قوموں کا بھی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلقات رکھتی ہیں اور جب کبھی یہ نظر آئے کہ کوئی حامل مذہب قوم لامذہب لوگوں سے دوستی کا تعلق پیدا کر رہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ حامل مذہب قوم مذہب سے بغاوت اختیار کر کے اپنے اندر لامذہب لوگوں جیسا ذوق پیدا کر چکی ہے۔ اس لیے ہم یہود کو دیکھتے ہیں کہ ان کے ذوق اور مزاج کے بگاڑ کی انتہا یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار مکہ کو ترجیح دیتے تھے کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اس سے ان کی ذہنی پستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اعتقادی اور عملی بگاڑ نے ان کے ذوق کو کس حد تک پست کر دیا تھا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں پروردگار نے ان کی اس حالت پر اظہار تعجب بھی فرمایا ہے اور ان کی اس حرکت کی بناء پر ان پر لعنت بھی کی ہے:
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ط وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۔ (النساء ۴: ۵۱۔۵۲)
(کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا ' جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا اور وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں؟ یہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو ان کا تم کوئی مددگار نہیں پا سکتے)
یہود کے مجموعی رویے نے ان کے اندر یہ مزاج پیدا کیا کہ ان کو مسلمانوں کی بجائے وہ کافر اور مشرکین اچھے لگتے تھے جو سرے سے مذہب ہی کے منکر تھے۔ نہ آخرت پر یقین رکھتے تھے اور نہ کسی نبی اور رسول کے قائل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں اور یہود میں زندگی کے اساسی عقائد اور مسلمات کے حوالے سے کوئی ایک چیز بھی مشترک نہیں تھی ' سوائے اس کے کہ دونوں میں اللہ کے احکام سے بغاوت کا جذبہ یکساں تھا۔ آج ہم مسلمان بفضلہ تعالیٰ ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسلامی شریعت کے ساتھ تعلق کا ہمیں بھی دعویٰ ہے لیکن اس کے باوجود ہم پورے عالم اسلام میں اس بیماری کو رواں دواں دیکھ رہے ہیں ' جس کا ابھی یہود کے مزاج کے حوالے سے تذکرہ ہوا کہ جس طرح ان کی دوستیاں کافروں کے ساتھ تھیں باوجود اس کے کہ یہ اس دور کے مسلمان تھے۔ آج ہم مسلمان ہیں ' اپنے پاس ایک دین رکھتے ہیں اور شہادت حق کی ذمہ داری ہم پر عائد کی گئی ہے۔ لیکن ہماری دوستیاں اور ہماری محبتیں مسلمانوں سے کم ' غیر مسلموں سے زیادہ ہیں۔ اسلامی اخوت کو معمولی ذاتی اور ملکی

مفاد پر قربان کرتے ہوئے ہمیں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ کسی بھی مسلمان ملک کے خارجی تعلقات اور تجارتی معاہدوں کو دیکھ لیجئے ' مسلمان ملکوں سے کم ہوں گے اور غیر مسلم ممالک سے زیادہ۔ مشرق وسطیٰ ہی کے ممالک کو دیکھ لیجئے۔ وہ ہمارے ساتھ اخوت اسلامی میں شریک ہیں ' وہ خوب جانتے ہیں کہ کشمیر میں ہندوستان کس حد تک مظالم توڑ چکا ہے اور پاکستان کو ہندوستان سے تین جنگیں لڑنی پڑی ہیں اور بین الاقوامی معاملات میں اس نے کبھی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بااین ہمہ ! پورے عرب ممالک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہندوستان کو پاکستان پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے تجارتی روابط اور معاہدے پاکستان کی نسبت ہندوستان سے زیادہ ہیں اور سیاسی اور سفارتی تعلقات پاکستان کی نسبت ہندوستان سے زیادہ گہرے ہیں۔ اسی طرح فلسطین کو دیکھ لیں اس میں اسلامی ممالک کا کردار کیا رہا ہے؟ کسی ملک کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا ورنہ ایک ایک ملک کے تعلقات کی نوعیت کو دیکھ لیجئے ' آپ کو تعجب ہوگا کہ یا اللہ ! ہندوستان کے ساتھ آخر ان کی قدر مشترک کیا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں عالم اسلام میں یہود جیسا ذوق اور مزاج پیدا تو نہیں ہو گیا۔ اس سے آگے بڑھ کر میں تو خود پاکستان کے بارے میں متفکر ہوں کہ ہمارا بالائی طبقہ ' اپنے دل و دماغ کے رشتے خود اپنے ملک کی نسبت مغربی ملکوں سے زیادہ محسوس کرتا ہے اور اپنے مفادات کو مغربی ملکوں میں زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ یہ ایک مستقل وجہ پریشانی ہے ' مجھے نہیں معلوم آپ اس کو کیسا دیکھتے ہیں ' میرا حال تو یہ ہے کہ :

پریشاں ہوں مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی
بڑی مدت ہوئی اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے :

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ

(نہایت برا توشہ ہے جو انھوں نے اپنے لیے بھیجا ہے کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے)

افراد یا قومیں ' وہ جو کچھ یہاں کرتی ہیں ' اس کے نتائج کچھ یہاں بھی انھیں بھگتنے پڑتے ہیں ' لیکن اصل جزا و سزا کا معاملہ تو آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ یہاں آدمی اعمال کی صورت میں جو کچھ کرتا ہے ' وہ آخرت کے سفر کے لیے توشہ تیار کرتا ہے اور یہی زاد سفر ہے ' جسے اس کو ساتھ لے کر جانا ہے۔ اسی سے اسے سفر میں آسانی ہوگی اور اسی سے اس کے انجام کا تعین ہوگا۔ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان نادانوں نے اپنے لیے جو توشہ بھیجا ہے ' ان کو اندازہ نہیں کہ وہ توشہ ایسا ہے ' جس نے اللہ کے غضب کو دعوت دی ہے کیونکہ افراد اور اقوام کے انفرادی اعمال سے بعض دفعہ صرف نظر بھی کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اعمال اس قوم کا اجتماعی رویہ بن جائیں اور مزید یہ کہ ان اعمال کا تعلق اللہ کے باغیوں کے ساتھ دوستی کی صورت میں نکلے تو یہ وہ خطرناک رویہ ہے ' جس سے اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے ساتھ تعلق کا کم سے کم تقاضہ یہ تو ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے اللہ سے جو وفا کا رشتہ رکھتا ہے ' اسے ٹوٹنے نہ دے۔ لیکن اگر انتہا یہ ہو جائے کہ وہ اللہ کے مقابل میں اس کے باغیوں اور دشمنوں سے جا کر رشتہ محبت قائم کر لے تو یہ ایسا خطرناک اقدام ہے جس کو پروردگار کبھی معاف نہیں فرماتے۔ اس لیے یہود کے اس رویے نے ان پر اللہ کے غضب کو بھڑکایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ فرماتا ہے کہ اب یہ لوگ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کیونکہ انھوں نے ہم سے تعلق توڑ کر ہماری مغفرت اور رحمت سے تعلق توڑ لیا ہے اور ہمارے دشمنوں سے تعلق جوڑ کر انھوں نے عذاب سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے اپنے اختیار کردہ رشتے کے نتیجے میں ' یہ ہمیشہ عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اسی سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے پروردگار نے ان کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے کہ ان ظالموں نے یہ جو رویہ اختیار کیا ہے ' جو ان کے مجموعی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ یہ اچانک پیدا نہیں ہوگیا بلکہ اس کے ڈانڈے تاریخ کے ان ادوار سے ملتے ہیں جس پر انھیں بڑا ناز ہے اور جس کے حوالے سے ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہم ہی تو ہیں جو آج بھی توحید کے علمبردار ہیں ' رسالت کو مانتے ہیں ' آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور پوری دنیا کی امامت و سیادت کے منصب پر صدیوں سے ہم فائز ہیں اس لیے ہم جیسا کون ہو سکتا ہے ؟ اس لیے ان سے فرمایا جارہا ہے کہ درخت ہمیشہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور آدمی کے اندر کا اعتقاد اس کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تم اگر واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر تمہارا تعلق اسلامی قوتوں کو چھوڑ کر کافر قوتوں کے ساتھ کیوں۔ اس لیے کہ نبی کا ماننے والا ' نبی کے منکر سے تو کبھی رشتہ نہیں رکھ سکتا۔ اللہ کا پرستار اللہ کے سامنے سر نہ جھکانے والے سے کیسے محبت رکھ سکتا ہے ؟ اور ان دونوں کے درمیان آخر فکری ہم آہنگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے ؟ اسی طرح جو آدمی اللہ کی کتاب اور اس کی نازل کردہ شریعت پر ایمان رکھتا ہے ' وہ کتاب اور شریعت کے انکار کرنے والے کے ساتھ محبت و اخوت کی پینگیں کیسے بڑھا سکتا ہے ؟ جس طرح تاریخ کے دو باب کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے ' جس طرح اندھیرا اور اجالا یکساں نہیں ہو سکتا اور جس طرح زمین و آسمان ہم آغوش نہیں ہو سکتے ' اسی طرح صاحب ایمان اور بے ایمان میں ' خدا پرست اور خدا کے منکر میں ' نبی کے ماننے والے اور اس کے انکار کرنے والے میں بھی کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تم جن ادوار پر فخر کرتے ہو کہ تم اللہ کے نبی پر ایمان رکھتے تھے اور اللہ کو مانتے تھے ' اگر اس میں واقعی کوئی حقیقت ہے تو پھر تمہارے آج کے طرز عمل کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے۔ (روح)

آیت مبارکہ :

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

لغۃ القرآن : [وَلَوْ : اور اگر][كَانُوْا : وہ تھے][يُؤْمِنُوْنَ : وہ ایمان لاتے ہیں][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ][وَالنَّبِيِّ : اور نبی][وَمَآ : اور جو][اُنْزِلَ : نازل کیا گیا][اِلَيْهِ : ان کی طرف][مَا : نہ][اتَّخَذُوْهُمْ : بناتے وہ ان کو][اَوْلِيَآءَ : دوست][وَلٰكِنَّ : اور لیکن][كَثِيْرًا : زیادہ][مِّنْهُمْ : ان سے][فٰسِقُوْنَ : فاسق ہیں]

ترجمہ : اور اگر وہ اللہ پر اور نبی (آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور اس (کتاب) پر جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے ایمان لے آتے تو ان (دشمنان اسلام) کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں

تشریح: کفار و مشرکین سے دوستی اور محبت کا رشتہ اُستوار کرنے والے یہودی اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کی نازل کردہ کتاب قرآن پاک پر صدق و اخلاص کے ساتھ ایمان لائے ہوتے تو کسی صورت بھی ان کے ساتھ دوستی کا سلسلہ قائم نہ کرتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ان میں بہت زیادہ فاسق ہیں۔ ان آیات کے پسِ منظر پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا اصل مقصود ریاست کی حکمرانی اور منصب کا حصول تھا اور اس کے لیے انھیں کوئی بھی طریقہ اپنانا پڑا، کسی بھی ذریعے کو اختیار کرنا پڑا وہ کر گزرے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال فی زمانہ ہم مسلمانوں میں عام ہو چکی ہے۔ اپنی کرسی کو بچانے کے چکر میں کفار کے سامنے گھٹنے ٹیکتے اور ایڑیاں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ (صراط)

اہل کتاب پر ناراضگی کا اظہار کرنے کے باوجود ان کو ایک موقع اور دیا گیا ہے کہ اگر ایمان لائیں تو آخرت کے عذاب اور دنیا کی ذلت سے بچ سکتے ہیں۔

اہل کتاب پھٹکار کے مستحق قرار دیے گئے ہیں تو یہ ان کے عقیدہ اور کردار کا نتیجہ ہے تاہم اگر یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر خالص ایمان لائیں۔ قرآن کی اتباع کریں، خدا کے باغیوں اور منکروں سے محبت کرنے کی بجائے مسلمانوں سے محبت و اخوت کا رشتہ جوڑیں تو لعنت کی بجائے اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پائیں گے یہاں اللہ، اس کے رسول اور قرآن مجید پر ایمان کے ساتھ تیسری شرط یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی ہمدردیاں، رشتہ داریاں کفار کی بجائے مسلمانوں کے ساتھ ہونی چاہئیں یہی ان کی عزت رفتہ کا زینہ ہے یہاں یہ بات دوٹوک انداز میں واضح کر دی ہے کہ اہل کتاب دنیا اور آخرت کی ذلت مول لے لیں گے لیکن اللہ، اس کے رسول پر مخلصانہ ایمان لانے اور مسلمانوں سے رشتہ اخلاص قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے کیونکہ ان کی غالب اکثریت فاسق افراد پر مشتمل ہے۔ (فہم)

اس آیت کریمہ میں ان کی مدحت ہے جو زمانہ اقدس تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے دین پر رہے اور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کا علم ہونے پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئے۔ چنانچہ اس کا شان نزول یہ ہے۔

شان نزول

ابتداء اسلام میں جب کفار قریش نے مسلمانوں کو بہت ایذائیں دیں تو صحابہ کرام میں سے گیارہ مرد چار عورتیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے حبشہ کی طرف ہجرت کرکے روانہ ہوئے ان گیارہ مردوں اور چار عورتوں کے اسماء ہیں۔

حضرت ذوالنورین عثمان (رض) اور ان کی زوجہ مطہرہ رقیہ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت زبیر بن عوام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پھوپھی حضرت صفیہ (رض) کے بیٹے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت ابو سلمہ (رض) حضور علیہ الصلوۃ کی بیوی ام المومنین حضرت ام سلمہ (رض) کے پہلے شوہر اور ان کی بیوی حضرت ام سلمہ بنت امید (رض)۔ حضرت عثمان بن مظعون (رض) جن کی وفات کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کا بوسہ لیا اور حضرت عامر بن ربیعہ اور ان کی بیوی حضرت لیلیٰ بنت ابی خثیمہ (رض)۔ حضرت حاطبؓ بن عمرو اور ایک صحابی اور ہیں اور حضرت سہیل بن بیضاء (رض) اجمعین۔

یہ حضرات نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب المرجب میں بحری سفر کرکے حبشہ پہنچے۔ یہی وہ ہجرت ہے جسے مسلمان ہجرت اولیٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب (رض) گئے اور رفتہ رفتہ بہت سے مسلمان روانہ ہوتے رہے حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ مہاجرین کی تعداد بیاسی مردوں تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد قریش کے کفار کو اس ہجرت کا علم ہوا تو انھوں نے بھی ایک جماعت تحفے تحائف لے کر حبشہ کی طرف نجاشی کے پاس روانہ کی ان لوگوں نے شاہی دربار تک باریابی حاصل کرکے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے ملک میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور نادان لوگوں کو اپنے آباؤاجداد کے دین سے منحرف کردیا ہے۔

اب ان میں سے ایک جماعت آپ کے ملک میں آئی ہے اور یہاں بھی وہ فتنہ و فساد کرے گی اور آپ کی رعایا کو باغی بنائے گی۔ ہم آپ کو خبر دینے کے لیے آئے ہیں اور ہماری قوم کی درخواست ہے کہ آپ انھیں ہمارے حوالے کردیں۔ بادشاہ نجاشی نے جواب دیا کہ اول ہمیں ان سے گفتگو کرلینے دو اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا یہ کہہ کر نجاشی نے ان مہاجرین کو طلب کیا اور ان سے پوچھا۔ آپ لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ صدیقہ کے حق میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں ؟ حضرت جعفر بن ابی طالب (رض) نے جواب دیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور خدا کے رسول اور کلمتہ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کنواری پاک ہیں۔ یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا خدا کی قسم تمہاری آقا ﷺ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعریف میں اتنا بھی فرق نہ کیا جتنا یہ تنکا ہے۔ یہ دیکھ کر مشرکین مکہ کے چہرے اتر گئے اور ان پر یاس و ناامیدی چھا گئی۔ پھر نجاشی نے ان مہاجرین سے قرآن شریف سننے کی خواہش کی۔ حضرت جعفر (رض) نے چند آیتیں سورۃ مریم کی تلاوت فرمائیں۔

اسی وقت دربار نجاشی میں نصرانی عالم اور رہبان موجود تھے سب کے سب قرآن کریم سن کر بے اختیار رونے لگے۔ نجاشی نے بعد میں ان مصیبت زدہ مہاجرین کو تسلی دی اور کہا تمہارے لیے میری قلمرو میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مشرکین مکہ خائب و خاسر واپس مکہ آگئے۔ پھر مسلمان مہاجرین نجاشی کے پاس عزت وآرام وآشائش کے دن گزارتے رہے حتیٰ کہ فضل الٰہی سے نجاشی کو دولت ایمان کا شرف حاصل ہوا۔ اس آیت کریمہ میں اسی واقعہ کو ظاہر کیا گیا۔ (معالم التنزیل) اور اس طرز بیان سے عامہ مومنین کو یہ سبق ملا کہ علم اور ترک تکبر اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور یہ سبب ہدایت کا ہوتا ہے۔

آیت مبارکہ:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

لغۃ القرآن: [لَتَجِدَنَّ : یقیناً آپ پائیں گے][اَشَدَّ النَّاسِ : بہت سخت لوگ][عَدَاوَةً : دشمنی][لِّلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے][اٰمَنُوا : جو ایمان لائے][الْيَهُوْدَ : یہودیوں کو][وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][اَشْرَكُوْا : انہوں نے شرک کیا][وَلَتَجِدَنَّ : اور یقیناً آپ پائیں گے][اَقْرَبَهُمْ : بہت قریب ان کو][مَّوَدَّةً : دوستی][لِّلَّذِيْنَ : ان لوگوں کے لیے][اٰمَنُوا : جو ایمان لائے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اِنَّا : بیشک ہم][نَصٰرٰى : نصاریٰ][ذٰلِكَ : وہ][بِاَنَّ : اس وجہ سے بیشک][مِنْهُمْ : ان سے][قِسِّيْسِيْنَ : پڑھے ہوئے ہیں][وَرُهْبَانًا : اور راھب][وَّاَنَّهُمْ : اور بیشک وہ][لَا : نہیں][يَسْتَكْبِرُوْنَ : وہ تکبر کرتے ہیں]

ترجمہ: آپ یقیناً ایمان والوں کے حق میں بلحاظ عداوت سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور آپ یقیناً ایمان والوں کے حق میں بلحاظ محبت سب سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں: بیشک ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں علماء (شریعت بھی) ہیں اور (عبادت گزار) گوشہ نشین بھی ہیں اور (نیز) وہ تکبر نہیں کرتے

تشریح:

اگرچہ سارے کفار اسلام دشمنی میں سخت ہیں مگر یہود و مشرکین کی اسلام دشمنی کے مقابلہ میں نصاریٰ کا رویہ کچھ نرم ہے، لہٰذا دوستی کے اعتبار سے

عیسائی لوگ مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی تین وجوہات بیان کی ہیں

1۔ عیسائیوں میں قسیس یعنی اہل علم ہیں جو کسی کی بات سننے اور اس میں غور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور جب ان پر حق واضح ہو جائے تو قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے جبکہ یہود اپنے تعصب کی وجہ سے حق کو حق جانتے ہوئے بھی قبول نہیں کرتے۔

2۔ عیسائیوں میں راہب یعنی درویش متقی لوگ بھی ہیں جو دنیا کو چھوڑ کر ساری زندگی عبادت میں گزار دیتے ہیں جبکہ یہود دنیا پرستی کے زیادہ حریص ہیں۔

3۔ عیسائی غرور نہیں کرتے یعنی تواضع اور رواداری سے پیش آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیم بھی یہی تھی یعنی: خود غرض اور دوسروں سے بڑا بننے کی کوشش نہ کرو۔ عاجزی اختیار کرو اور دوسروں کو اپنے سے بہتر خیال کرو۔ (فلپیوں 3:2: لیونگ بائبل: 1975)

جن عیسائی حضرات میں یہ صفات پائی جاتی تھیں وہ ہر دور میں اسلام کے قریب رہے اور ان میں اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی ایک تاریخی مثال حبشہ کے عیسائی علماء اور راہب تھے جو قرآن مجید کی تلاوت سن کر مسلمان ہو گئے۔ اس کی تفصیل آئندہ آیت کے ضمن میں ملاحظہ کریں۔

آج بھی جن عیسائی حضرات میں ان تین صفات میں سے ایک بھی پائی جائے تو وہ یہود کی نسبت مسلمانوں سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں، جیسے فرانس کا مورس بکائی اور امریکہ کا مائیکل ایچ ہارٹ۔ جنہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتابوں میں اسلام کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ جنوری 2001ء میں جب مجھے فلسطین جانے کا موقع ملا تو میں نے اس کے مشہور اور عظیم شہر بیت اللحم میں خود مشاہدہ کیا کہ وہاں مسلمان اور عیسائی اتفاق سے رہتے ہیں اور جب کبھی یہود سے لڑائی کا موقع آئے تو عیسائی مسلمانوں کے شانہ بشانہ یہودیوں کے خلاف لڑتے ہیں۔ 2003ء میں جب امریکہ اور برطانیہ نے صدام حسین کے خاتمہ کے لیے عراق پر حملہ کیا تو ان کو سب سے زیادہ حمایت یہودیوں کی حاصل تھی جبکہ عیسائی حکمرانوں کی اکثریت نے اقوام متحدہ میں اس کی مخالفت کی اور امریکہ و یورپ میں لاکھوں عیسائی عوام نے بازاروں میں نکل کر ان کے خلاف احتجاج کیا۔

ان متقی عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین ہیں کیونکہ وہ ان صفات سے محروم ہیں جو عیسائی حضرات میں پائی جاتی ہیں یعنی:

1۔ یہود علم کے تقاضوں سے ہٹ کر تعصب اور عناد کا شکار ہیں اور انبیائے کرام (علیہم السلام) جیسی مقدس ہستیوں کو بھی قتل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

2۔ وہ خدا کی رضاجوئی اور عبادت کے بجائے دولت کمانے میں سرگرم رہتے ہیں اور ہر وہ ذریعہ استعمال کرتے ہیں جس سے دولت میں اضافہ ہو۔

3۔ وہ انکساری اور رواداری کے بجائے تکبر کا شکار ہیں اور اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہود کے متعلق فرمایا:

کہ وہ ریاکار، سانپ اور زہریلے سانپ کے بچے ہیں۔ (متی کی انجیل: باب 23) اور حضرت داؤد (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا کہ وہ متکبر، بے ادب، جھوٹے اور دھوکا باز ہیں۔

(زبور: باب 10)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم، ترک دنیا اور تواضع قابل قدر صفات ہیں اور ان کے اچھے اثرات ظاہر ہوتے ہیں چاہے وہ اہل اسلام میں ہوں یا غیر مسلموں میں جبکہ جہالت، حب دنیا اور تکبر قابل نفرت صفات ہیں اور ان سے نجات لازمی ہے۔

رہبانیت

اس آیت میں راہب ہونا ایک قابل تعریف صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ اسلام رہبانیت کو پسند کرتا ہے یا اسلام عیسائیت کے رہبانیت کے تصور سے کلی طور پر متفق ہے۔ اسلام جہاں رہبانیت کے چند پہلوؤں (حب دنیا کی نفی اور رجوع الی اللہ وغیرہ) کو پسند کرتا ہے وہیں رہبانیت کی ناروا پابندیوں، بے جا مشقتوں اور افراط و تفریط مثلاً رزق حلال کمانے، اچھا کھانے پینے اور شادی سے مکمل اجتناب وغیرہ سے برات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہم پر رہبانیت فرض نہیں کی گئی۔ (احمد: جلد 6: ص 226) مجھے رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا۔ (سنن دارمی: کتاب النکاح: باب 3) اسلام دنیا کو بالکل چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی معبود حقیقی کو بھول کر اور عبادت کو چھوڑ کر صرف دنیاوی عیش و عشرت کو برداشت کرتا ہے۔ اسلام دنیا اور عبادت دونوں میں توازن کا درس دیتا ہے کیونکہ انسان کی کامیاب زندگی کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ (امداد)

نجاشی کا اسلام لانا

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ نجاشی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک وفد بھیجا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا 'وہ مسلمان ہو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی 'پھر وہ وفد نجاشی کے پاس گیا اور اس کو خبر دی تو نجاشی بھی مسلمان ہو گیا 'اور وہ تادم مرگ مسلمان رہا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارا بھائی نجاشی فوت ہو گیا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھو 'پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ میں اس پر نماز پڑھی اور نجاشی (کا جنازہ) اس وقت حبشہ میں تھا۔ (جامع البیان 'جز٦ص ٣ 'مطبوعہ ١٤١٥ھ)

مسلمانوں کا حبشہ ہجرت کرنا اور کفار مکہ کا ان کو واپس بلانے کی سعی کرنا

حضرت ام سلمہ (رض) (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ محترمہ) بیان کرتی ہیں کہ جب ہم حبشہ میں پہنچے تو ہمیں نجاشی نے وہاں پناہ دی 'ہم نے اپنے دین کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ ہم کو نہ کوئی ایذا دی جاتی تھی 'نہ ہم کوئی ناگوار بات سنتے تھے۔ جب یہ خبر قریش کو پہنچی تو انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ ہمارے متعلق نجاشی کے پاس دو قوی آدمی بھیجے جائیں اور مکہ کی عمدہ چیزوں میں سے نجاشی کے لیے ہدیئے بھیجے جائیں۔ ان لوگوں کو چمڑا پسند تھا 'تو انھوں نے بہت سے چمڑے جمع کر لیے 'ان کے سرداروں میں سے ہر شخص کو انھوں نے چمڑے اور تحفے دینے کا فیصلہ کیا 'پھر انھوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص کو یہ ہدیئے دے کر روانہ کیا اور ان سے کہا: مسلمانوں کے متعلق نجاشی سے بات کرنے سے پہلے تمام سرداروں کو ہدیئے دے دیئے جائیں وہ حبشہ پہنچ گئے اور نجاشی کے ساتھ ملاقات سے پہلے تمام سرداروں کو ہدیئے دیئے اور ہر سردار سے یہ کہا: تمہارے ملک میں، بادشاہ، ہمارے چند نادان لڑکوں نے آکر پناہ لی ہے 'وہ اپنی قوم کے دین کو چھوڑ چکے ہیں اور تمہارے دین میں داخل نہیں ہوئے۔ وہ ایک نیا دین لے کر آئے ہیں 'جس کو ہم پہچانتے ہیں نہ تم جانتے ہو 'اور ہماری قوم نے اپنے معزز لوگوں کو بھیجا ہے تاکہ وہ ان کو واپس لے جائیں۔ سو جب ہم بادشاہ سے اس معاملہ میں بات کریں تو تم بادشاہ کو یہ مشورہ دینا کہ وہ ان کو ہمارے حوالے کر دیں اور بادشاہ ان سے بات نہ کرے۔

کیونکہ ہماری قوم ان کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ سرداروں نے کہا اچھا 'پھر انھوں نے نجاشی کو ہدیئے اور تحفے پیش کیے جن کو اس نے قبول کر لیا۔ پھر انھوں نے کہا اے بادشاہ آپ کے ملک میں ہمارے کچھ نادان لوگ آ گئے ہیں جو اپنی قوم کے دین کو چھوڑ چکے ہیں 'اور آپ کے دین میں داخل نہیں ہوئے۔ وہ ایک نیا دین لیکر آئے ہیں جس کو ہم پہچانتے ہیں نہ آپ 'اور ہم کو آپ کی طرح ان کی قوم کے معزز لوگوں نے بھیجا ہے 'جو ان کے آباء واجداد اور رشتہ دار ہیں 'تاکہ آپ انھیں واپس لے جائیں۔ سو جب ہم بادشاہ سے اس معاملہ میں بات کریں تو تم بادشاہ کو یہ مشورہ دینا کہ وہ ان کو ہمارے حوالے کر دیں اور بادشاہ ان سے بات نہ کرے۔

حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص کو اس سے زیادہ اور کوئی بات ناپسند نہیں تھی کہ نجاشی مسلمانوں کی بات سنے 'اس کے سرداروں نے کہا ان دو آدمیوں نے سچ کہا ہے۔ ان لوگوں کے کرتوتوں کو ان کی قوم ہی بہتر طور سے جانتی ہے 'سو آپ ان لوگوں کو ان دونوں کے حوالوں کر دیجئے 'تاکہ یہ ان کو ان کی قوم کے پاس واپس لے جائیں۔

حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا یہ سن کر نجاشی غضبناک ہوا 'اس نے کہا نہیں خدا کی قسم 'میں ان لوگوں کو ان کے حوالے نہیں کروں گا جن لوگوں نے میری پناہ لی ہے اور میرے ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے دوسروں کی بجائے مجھے اختیار کیا ہے 'جب تک میں ان سے سوالات کرکے تحقیق نہ کرلوں 'ان کو تم لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ اگر وہ ایسے ہی نکلے جیسا تم نے کہا ہے 'تو میں ان کو تمہارے حوالے کر دوں گا 'اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا ت تو میں ان کی حفاظت کروں گا 'اور جب تک یہ میری پناہ میں رہیں گے 'ان سے حسن سلوک کروں گا۔ پھر اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کو بلایا۔ جب مسلمان آ گئے 'تو نجاشی نے اپنے علماء کو بھی بلایا اور وہ اس کے گرد اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئے۔

حضرت جعفر کا نجاشی کے دربار میں اسلام کا تعارف کرانا

پھر نجاشی نے مسلمانوں سے سوال کیا 'وہ کونسا دین ہے جس کی وجہ سے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور تم اس کی وجہ سے نہ میرے دین میں داخل ہوئے اور نہ ان ادیان میں سے اور کسی دین میں داخل ہوئے؟ حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا جس شخص نے ان کو جواب دیا 'وہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضوان اللہ علیہ تھے۔ انھوں نے کہا اے بادشاہ 'ہم جاہلوں کی قوم تھے 'بتوں کی عبادت کرتے تھے 'مردار کھاتے تھے 'بے حیائی کے کام کرتے تھے 'رشتوں کو توڑتے تھے 'پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے 'ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا 'ہم اسی حال پر تھے کہ اللہ نے ہم میں سے ہی ہماری طرف ایک رسول بھیج دیا۔ جن کے نسب 'ان کے صدق 'ان کی امانت داری اور ان کی پاکیزگی کو ہم پہلے سے جانتے تھے۔

انہوں نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی 'تاکہ ہم اس کو واحد مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس سے پہلے ہم اور ہمارے باپ دادا جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے تھے 'اس کو چھوڑ دیں 'اور انھوں نے ہمیں سچ بولنے 'امانت ادا کرنے 'رشتوں کو ملانے 'پڑوسیوں سے نیک سلوک کرنے 'حرام کاموں اور خون ریزیوں سے باز رہنے کا حکم دیا اور بے حیائی کے کاموں 'جھوٹ بولنے 'یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں کو تہمت لگانے سے منع کیا 'اور ہم کو حکم دیا کہ ہم فقط اللہ کی عبادت کریں 'اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم کو نماز پڑھنے 'زکوۃ ادا کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا انھوں نے اسلام کے تمام احکام گنوائے۔ سو ہم نے اس رسول ﷺ کی تصدیق کی اور ہم اس پر ایمان لے آئے 'اور وہ اللہ کے پاس سے جو احکام لائے تھے 'ہم نے ان پر عمل کیا اور فقط اللہ وحدہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کیا اور جن چیزوں کو انھوں نے ہم پر حرام کیا تھا 'ان کو ہم نے حرام قرار دیا 'اور جن چیزوں کو انھوں نے ہمارے لیے حلال کیا تھا 'ان کو ہم نے حلال رکھا۔ اس بناء پر ہماری قوم ہماری دشمن ہو گئی۔

انہوں نے ہم کو عذاب میں مبتلا کیا اور ہم کو ہمارے دین سے چھڑانے کے لیے آزمائشوں میں مبتلا کیا 'تاکہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے چھڑا کر بتوں کی عبادت کی طرف لے آئیں 'اور پھر ان ہی بدکاریوں کو حلال کرنے لگیں جن کو ہم پہلے حلال سمجھ کر کرتے تھے۔ سو جب انھوں نے ہم پر قہر اور ظلم کیا اور ہم پر ہماری معیشت کو تنگ کر دیا اور ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہو گئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے اور ہم نے دوسروں کی بجائے آپ کو پسند کر لیا اور آپ کی پناہ میں رغبت کی 'اور ہم نے یہ امید رکھی کہ اے بادشاہ! آپ کے پاس ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا پھر نجاشی نے کہا کیا تم کو اللہ کے کلام کی کچھ آیتیں یاد ہیں؟ حضرت جعفر (رض) نے کہا ہاں نجاشی نے کہا مجھے سناؤ۔ تو حضرت جعفر (رض) نے سورۃ مریم کی ابتدائی آیات پڑھیں۔ حضرت ام سلمہ (رض) نے کہا خدا کی قسم وہ آیتیں سن کر نجاشی رونے لگا اور اس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی اور اس کے علماء بھی رونے لگے اور ان کے مصاحف ان کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ پھر ان سے نجاشی نے کہا بیشک یہ دین اور جس دین کو عیسیٰؑ لے کر آئے تھے 'یہ دونوں دین ایک ہی طاق سے نکلے ہیں 'پھر ان دونوں مشرکوں سے کہا: جاؤ! تم واپس جاؤ بخدا میں ان مسلمانوں کو تمہارے حوالے ہر گز نہیں کروں گا۔

کفار قریش کا مسلمانوں کو نکلوانے کی مہم میں ناکام ہونا

حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا جب وہ دونوں نجاشی کے دربار سے نکل گئے تو عمرو بن العاص نے کہا بخدا میں کل پھر اس کے پاس جاؤں گا اور اس کے سامنے ایسی چیز پیش کروں گا جس سے ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ عبداللہ بن ربیعہ نے کہا ایسا نہ کرو ' اگرچہ یہ ہمارے مخالف ہیں ' لیکن ہماری ان کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں ' اس نے کہا میں نجاشی کو ضرور بتاؤں گا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ اللہ کے بندے ہیں ' پھر اگلے دن وہ گیا اور نجاشی سے کہا: اے بادشاہ! یہ عیسیٰ ابن مریمؑ کے متعلق بہت سخت بات کہتے ہیں۔ آپ ان کو بلا کر ان سے پوچھئے کہ یہ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا پھر بادشاہ نے ہم کو بلوایا اور اس جیسی آزمائش ہم پر پہلے نہیں آئی تھی ' جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بادشاہ نے پوچھا تم لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق کیا کہتے ہو؟

جب ان کے متعلق سوال کیا جاتا ہے؟

حضرت جعفر بن ابی طالب (رض) نے کہا ہم ان کے متعلق وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ' اس کے رسول اور اس کی پسندیدہ روح ہیں اور کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاک دامن مریمؑ کی طرف القاء کیا۔ حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا پھر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اٹھایا۔ پھر کہا بخدا تم نے جو کچھ بیان کیا ہے ' عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) اس سے ایک تنکے سے بھی زیادہ نہیں ہیں۔ جب نجاشی نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے متعلق یہ کہا: تو اس کے گرد بیٹھے ہوئے سرداروں نے غصہ سے پھنکارنا شروع کر دیا۔ نجاشی نے کہا: ہر چند کہ تم غصہ سے پھنکار رہے ہو (اور مسلمانوں سے کہا) تم میری سرزمین میں مامون ہو ' جو شخص تم کو گالی دے گا ' اس پر جرمانہ ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے پاس سونے کا پہاڑ ہو اور میں اس کے بدلہ میں تم میں سے کسی شخص کو ایذا پہنچاؤں۔ ان لوگوں کے ہدیئے اور تحفے ان کو واپس کر دو۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں ہے '

بخدا جب اللہ نے مجھے میرا ملک واپس کیا تو مجھ سے رشوت نہیں لی تو میں ان سے کیسے لوں گا؟

حضرت ام سلمہ (رض) نے فرمایا تو وہ دونوں (عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ) نجاشی کے پاس سے ناکام اور نامراد ہو کر لوٹے ' اور ہم نجاشی کے ملک میں اچھے گھر اور اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہے۔ اسی اثناء میں نجاشی کے ملک پر کسی نے حملہ کیا ' ہم نے اس کے غلبہ کے لیے اللہ سے دعا کی ' حتیٰ کہ وہ کامیاب ہو گیا اور ہم اس کے ملک میں اچھی طرح رہے۔ حتیٰ کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مکہ واپس آگئے (علامہ احمد شاکر نے لکھا ہے اس حدیث کی سند صحیح ہے) (مسند احمد ' بتحقیق احمد شاکر ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۷۴۰ ' طبع دارالحدیث : قاہرہ ' مسند احمد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۷۴۰ ' طبع دارالفکر بیروت ' مسند احمد ' ج ۱ ' ص ۲۰۳۔ ۲۰۱ ' طبع قدیم ' السیرۃ النبویہ ' ج ۱ ص ۳۷۵۔ ۳۷۳ ' الروض الانف ' ج ۱ ص ۲۱۴ ' ۔ ۲۱۰ ' مجمع الزوائد ' ج ۶ ' ص ۲۷۔ ۲۴ ' البدایہ النہایہ ' ج ۳ ' ص ۷۵۔ ۷۲) (تبیان)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب][سَمِعُوْا : سنا انہوں نے][مَآ : جو][اُنْزِلَ : نازل کیا گیا][اِلَى: طرف][الرَّسُوْلِ : رسول][تَرٰٓي : آپ دیکھیں گے][اَعْيُنَهُمْ : ان کی آنکھیں][تَفِيْضُ : بہہ پڑتی ہیں][مِنَ : سے][الدَّمْعِ : آنسو][مِمَّا : جو][عَرَفُوْا : انہوں نے پہچانا][مِنَ : سے][الْحَقِّ : حق ۚ][يَقُوْلُوْنَ : وہ کہتے ہیں][رَبَّنَآ : ہمارے رب][اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے][فَاكْتُبْنَا : توہم کو لکھ لے][مَعَ : ساتھ][الشّٰهِدِيْنَ : گواہی دینے والے]

ترجمہ: اور (یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض سچے عیسائی جب اس (قرآن) کو سنتے ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف اتارا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھوں کو اشک ریز دیکھتے ہیں۔ (یہ آنسوؤں کا چھلکنا) اس حق کے باعث (ہے) جس کی انھیں معرفت (نصیب) ہو گئی ہے۔ (ساتھ یہ) عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم (تیرے بھیجے ہوئے حق پر) ایمان لے آئے ہیں سو تو ہمیں (بھی حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے

تشریح: اگرچہ آیات کا حکم عام ہے لیکن ان کے نازل ہونے کی وجہ حبشہ کے وہ عیسائی علماء اور راہب تھے جن کو نجاشی نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کے لیے مدینہ بھیجا تھا۔ یہ واقعہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کی کتب میں بالتفصیل موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ (امداد)

نرم دل ہونے کی پہچان

لفظی تحقیق: تفیض: یہ لفظ "فیظ: سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز سے بھر کر ابل پڑنا یہاں مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آتے ہیں کہ باہر نکل پڑے ہیں۔ شھدین: "شاھد" کی جمع ہے وہ شخص جو کسی بات کو سچا کہے اور اس کو مانے۔

سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے "سورۃ آل عمران" میں گزر چکا ہے "لیسوا سوء" یعنی سارے یہودی اور عیسائی برابر نہیں، پچھلی سورۃ میں بھی دو دفعہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان آ چکا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بعض اچھی خصلت کے لوگ بھی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، البتہ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں، یہاں بھی جن لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ اچھی خصلت والے، اعتدال پسند، سادہ لباس اور عاجزی والے لوگ تھے، ان میں آسمانی کتابوں کے عالم اور درویش طبیعت لوگ تھے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس وقت وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو پیغمبر کی طرف اتاری گئی ہے، آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھیں گے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وفد کے لوگ نے جب "سورۃ یسین" سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ان کا تفصیلی بیان چھٹے پارے کے آخر میں گزر چکا ہے بہر حال یہ آیت نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اتری۔

اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جانا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا تھا، "سورۃ یسین" میں اسلام کے تمام بنیادی عقیدوں کا بیان ہے، اس میں توحید، پیغمبری، قیامت، قرآن کریم کے حق ہونے اور دوسرے تمام اہم باتیں اس سورۃ میں موجود ہیں، چنانچہ وفد کے لوگ یہ سچا کلام سن کر رو دیے، انہوں نے حق کو پہچان لیا اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں۔

اس آیت میں اس زمانے کے یہودیوں اور عیسائیوں میں فرق دیکھا یا گیا ہے کہ یہودی اتنے سخت دل تھے کہ قرآن پاک سن کر اس کی ہنسی اڑاتے تھے، دوسری طرف عیسائی قرآن کریم سن کر اس کی سچائی کی تاثیر سے روتے تھے، ایک تو جس وقت مکہ مکرمہ سے کچھ مسلمان مجبور ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی کو قرآن شریف کی "سورۃ مریم" سنائیں تو بادشاہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ رونے لگا اور قرآن شریف کی سچائی کو مان گیا۔ (ربانی)

جب حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے صحابہ کرام (رض) نجاشی کے دربار میں جمع تھے اور مشرکین مکہ کا وفد بھی وہاں موجود تھا تو اس وقت نجاشی نے حضرت جعفر طیار (رض) سے عرض کی: کیا آپ (رض) کی کتاب میں حضرت مریم (علیہ السلام) کا ذکر ہے؟ حضرت جعفر (رض) نے فرمایا: قرآن پاک میں ایک مکمل سورت حضرت مریم (علیہ السلام) کی طرف منسوب ہے، پھر سورۃ مریم اور سورۃ طٰہٰ کی چند آیات تلاوت فرمائیں تو نجاشی کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گیا۔ اسی طرح جب پھر حبشہ کا وفد سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں 70 آدمی تھے اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے سامنے سورۃ یسین کی تلاوت فرمائی تو اسے سن کر وہ لوگ بھی زار و قطار رونے لگے۔ جب عیسائی مذہبی لیڈروں کا یہ وفد مدینہ سے واپس حبشہ پہنچا اور نجاشی کو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات اور اپنے اسلام قبول کرنے کی خبر دی تو بادشاہ نجاشی بھی مسلمان ہو گیا اور آخر دم تک مسلمان رہا حتیٰ کہ جب نجاشی فوت ہوا تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) کو فرمایا: تمہارا بھائی نجاشی فوت ہو گیا ہے اس کی نماز جنازہ پڑھو، چنانچہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ میں اس کی نماز جنازہ پڑھی جبکہ نجاشی کی میت حبشہ میں تھی۔ (بخاری و مسلم: کتاب الجنائز)

اس آیت میں ان واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ (1) انہی سب کے متعلق فرمایا گیا کہ جب یہ لوگ اس کو سنتے ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف نازل کیا گیا تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑتی ہیں کیونکہ وہ حق کو پہچان گئے اور وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! عَزَّوَجَلَّ، ہم محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے برحق ہونے کی شہادت دی، پس تو ہمیں حق کی گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ دے اور ہمیں اس حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں داخل فرما جو روز قیامت تمام امتوں کے گواہ ہوں گے۔ (اور یہ بات انھیں انجیل سے معلوم ہو چکی تھی۔) اس آیت سے معلوم ہوا کہ ذکر الٰہی کے وقت عشق و محبت میں رونا اعلیٰ عبادت ہے۔ اسی طرح عذاب الٰہی کے خوف اور رحمت الٰہی کی امید میں رونا بھی عبادت ہے۔ بہت سے عاشقان قرآن، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے جھومتے ہیں، یہ قرآن کریم سے لذت و سرور حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ صبح کی خوشگوار ہوا سے نرم شاخیں حرکت کرتی ہیں اور تلاوت کرنے والا رحمت الٰہی کی نسیم سے ہلتا ہے۔ (صراط)

دراصل یہ ایک زندہ منظر ہے اور اس میں اس گروہ کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ گروہ جو اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں دوسرے کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ یہ ایسا گروہ ہے کہ جب قرآن مجید کا تازہ ترین حصہ نازل ہوتا ہے تو اس گروہ کے جذبات جوش میں آجاتے ہیں۔ ان کے دل نرم ہو جاتے اور وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس قرآن سے نہایت ہی گہرا اثر لیتے ہیں۔ وہ اس تاثر کا اظہار صرف آنسوؤں کی زبان میں کرتے ہیں اور اس قسم کا اظہار اس وقت کیا جاتا ہے جب انسان کے لیے الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے اس تاثر کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس طرح دباؤ اور گھٹن ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جذبات کا دباؤ نہایت ہی سخت اور گہرا ہوتا ہے۔

یہ لوگ محض آنسو بہا کر رک نہیں جاتے بلکہ قرآن کو سن کر جس سچائی سے وہ متاثر ہو چکے ' اس کے بارے میں منفی رویہ اختیار نہیں کرتے۔ قرآن کریم میں جس سچے شعور کا حامل ہے ' اور جو شدید احساس وہ پیدا کرتا ہے ' اس کے مقابلے میں خاموش نہیں رہتے۔ وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتے کہ بس سن کر متاثر ہوئے اور آنسو بہا کر رک گئے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھتے ہیں اور مثبت رویہ اختیار کرکے اس سچائی اس شعور اور احساس کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں یقین کر لیتے ہیں اور یہ بھی نہیں بلکہ وہ اپنے ایمان اور یقین کا اعلان بھی کرتے ہیں اور یہ اعلان وہ بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔

(آیت) "يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (83) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ (84)

" وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار ' ہم ایمان لائے ' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟۔

دیکھئے یہ لوگ اس سچائی کا اعلان کرتے ہیں جو ان تک پہنچی اور وہ اسے پہچان گئے۔ اس کے بعد وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں گواہوں کی فہرست میں شامل فرمادے اور ہمیں اس لڑی میں شامل کردے اور ہمیں اس لڑی میں شامل کردے جو اس کرہ ارض پر اس سچائی کو قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اس امت میں داخل کردے جس پر یہ قرآن گواہ ہے کہ وہ امت حقہ ہے اور جو اپنی زبان اپنے عمل اور اپنی جدوجہد کے ذریعے فریضہ شہادت حق ادا کر رہی ہے اور لوگوں کی زندگیوں میں اس سچائی کو جاری وساری دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ

فریضہ شہادت حق ادا کرنے والوں میں خود شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کو اس بات پر گواہ ٹھہراتے ہیں کہ وہ اس امت میں داخل ہو گئے ہیں اور پھر یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ہمارا نام رجسٹر کر لیا جائے۔ (ظلال)

تلاوتِ قرآن کے 2 فضائل

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو مومن قرآن پڑھتا ہے، اس کی مثال ترنج کی سی ہے کہ خوشبو بھی اچھی ہے اور مزہ بھی اچھا ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا، وہ کھجور کی مثل ہے کہ اس میں خوشبو نہیں مگر مزہ شیریں ہے۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے، وہ پھول کی مثل ہے کہ اس میں خوشبو ہے مگر مزہ کڑوا اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا، وہ اندرائن کی مثل ہے کہ اس میں خوشبو بھی نہیں ہے اور مزہ کڑوا ہے۔ (1)

حضرت عائشہ (رض) سے مروی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو قرآن پڑھنے میں ماہر ہے، وہ کراماً کاتبین کے ساتھ ہے اور جو شخص رک رک کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس پر شاق ہے یعنی اس کی زبان آسانی سے نہیں چلتی، تکلیف کے ساتھ ادا کرتا ہے، اس کے لیے دو اجر ہیں۔ (2) (3)

تلاوتِ قرآن کے وقت رونے کی ترغیب

تلاوتِ قرآن کے وقت رونا مستحب ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر بندوں کا طریقہ ہے کہ بلند مراتب پر پہنچنے کے باوجود بھی ان کی دلی کیفیات یہ ہوتی ہیں کہ جب ان کے سامنے کلام الٰہی کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو انھیں سن کر وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے لگتے ہیں جیسا کہ سورۃ مریم کی آیت نمبر 58 میں بیان ہوا، اسی طرح ان کی ایک اور کیفیت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ"

ترجمہ اللہ نے سب سے اچھی کتاب اتاری کہ ساری ایک جیسی ہے، بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس سے ان لوگوں کے بدن پر بال کھڑے ہوتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل اللہ کی یاد کی طرف نرم پڑ جاتے ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "یہ قرآن غم کے ساتھ نازل ہوا تھا، جب تم اسے پڑھو تو روؤ اور اگر رونہ سکو تو رونے کی شکل بنالو۔

حضرت بریدہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قرآن کو غم کے ساتھ پڑھو کیونکہ یہ غم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "جب تم سورۃ سبحان میں سجدہ کی آیت پڑھو تو سجدہ کرنے میں جلدی نہ کرو یہاں تک کہ تم روؤ اور اگر تم میں سے کسی کی آنکھ نہ روئے تو دل کو رونا چاہیے (اور تکلف کے ساتھ رونے کا طریقہ یہ ہے کہ دل میں حزن وملال کو حاضر کرے کیونکہ اس سے رونا پیدا ہوتا ہے)۔

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "غم ظاہر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے ڈرانے، وعدہ اور عہد وپیمان کو یاد کرے پھر سوچے کہ اس نے اس کے احکامات اور ممنوعات میں کتنی کوتاہی کی ہے تو اس طرح وہ ضرور غمگین ہوگا اور روئے گا اور اگر غم اور رونا ظاہر نہ ہو جس طرح صاف دل والے لوگ روتے ہیں تو اس غم اور رونے کے نہ پائے جانے پر روئے کیونکہ یہ سب سے بڑی مصیبت ہے۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

لغۃ القرآن: [وَمَا : اور کیا][لَنَا : ہمارے لیے][لَا نُؤْمِنُ : نہ ہم ایمان لائیں][بِاللّٰهِ : ساتھ اللہ][وَمَا : اور جو][جَآءَنَا : آیا ہمارے پاس][مِنَ : سے][الْحَقِّ : حق][ۙ وَنَطْمَعُ : اور ہم چاہتے ہیں][اَنْ : یہ کہ][يُّدْخِلَنَا : وہ ہمیں داخل کریگا][رَبُّنَا : ہمارا رب][مَعَ : ساتھ][الْقَوْمِ : قوم][الصّٰلِحِيْنَ : صالحین]

ترجمہ: اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق (یعنی حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید) پر جو ہمارے پاس آیا ہے، ایمان نہ لائیں حالانکہ ہم (بھی یہ) طمع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ (اپنی رحمت وجنت میں) داخل فرمادے

تشریح:

نیک لوگوں کی تفسیر میں تین قول ہیں

(ا) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب ہیں۔ (۲) ابن زید نے کہا اس سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب ہیں۔ (۳) مقاتل نے کہا اس سے مراد مہاجرین اولین ہیں (زاد المسیر ج ۲ 'ص ۴۱۰ ' مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '۱۴۰۷ھ)

حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ حبشہ کے علماء اور راہب جب اسلام قبول کرکے مدینہ سے واپس اپنے وطن لوٹے تو یہود نے ان کو طعنہ دیا اور ملامت کی (تفسیر البحر المحیط) کہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا تو اس پر ان نو مسلموں نے یہود کو جو جواب دیا وہ اس آیت میں مذکور ہے یعنی ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق ﷺ پر ایمان کیوں نہ لائیں، جب وہ رسول ﷺ ہمارے پاس آگیا اور ہم نے اسے پہچان بھی لیا تو ایمان لانا ضروری تھا جو ہم لے آئے اور اب ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ شامل کردے۔ ان کے اس قول (تصدیق حق) کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں جنت عطا فرمائی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نیک لوگوں کی یہی جزا ہے اور جو لوگ حق کو تسلیم نہیں کرتے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

جن خوش نصیب حضرات کا مذکورہ آیات میں ذکر کیا گیا اور انھیں جنت کی خوشخبری سے بھی نوازا گیا، ایمان لانے کے بعد ان کے دل کی تمنا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو نیک لوگوں میں شامل کردے۔ اس سے نیک لوگوں کی صحبت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے نیکوں کی سنگت کے متعلق چند انبیائے کرام (علیہم السلام) کی دعائیں بھی ذکر کی ہیں، مثلاً حضرت یوسف (علیہ السلام) دعا کرتے ہیں: "اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام کی حالت میں وفات دے اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملادے۔" (قرآن: 101:12) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں: "مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملادے۔" (قرآن: 83:26) حضرت سلیمان (علیہ السلام) عرض کرتے ہیں: "اے میرے پروردگار! مجھے اپنی رحمت کے باعث اپنے نیک بندوں میں شامل کرلے"۔ (قرآن: 19:27) (امداد)

صدق و اخلاص کا نتیجہ رجوع الی الحق

سو اس سے صحت باطن اور صدق دل کے آثار و ثمرات کا ایک عمدہ نمونہ پیش فرمایا گیا ہے۔-ایسے لوگ اپنے باطن کے صدق و صفا کی بنا پر کہتے ہیں کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک بخت لوگوں کے ساتھ اپنی رحمت میں داخل فرمادے۔ یعنی انبیاء و مومنین کے ساتھ جنت میں۔ (محاسن التاویل)۔ یعنی ایسے میں جبکہ ہم یہ طمع بھی رکھتے ہیں اور حق بھی ہمارے پاس پہنچ گیا ہے ہمیں ضرور اس دین حق پر ایمان لے آنا چاہیے کہ اس کے بعد اس ضمن میں ہمارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا۔ پس جب انسان کی فطرت صحیح ہو تو وہ ندائے حق کے جواب میں ایسے ہی دل و جان سے لبیک کہتا ہے۔ اور حق کی اس دعوت و پکار کو وہ اپنے ضمیر و وجدان کی آواز پکار سمجھتا ہے۔ روایات میں وارد ہے کہ یہ بات ان حضرات نے ان یہود وغیرہ اعدائے اسلام کے جواب میں کہی جنھوں نے ان کو عار دلائی اور طعنہ دیا کہ تم کیسے لوگ ہو کہ فوراً اس دین پر ایمان لے آئے ہو۔ حالانکہ تم نے اس نئے پیغمبر کو دیکھا بھی نہیں وغیرہ۔

سیدنا ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تین شخص ایسے ہیں کہ جن کے لیے دوگنا ثواب ہے: 1 وہ شخص جو اہل کتاب میں سے ہو، اپنے نبی پر ایمان لایا ہو اور پھر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی ایمان لائے۔ 2 مملوک غلام، جب وہ اللہ کے حق کو اور اپنے مالک کے حق کو ادا کرتا رہے۔ 3 وہ شخص جس کے پاس اس کی لونڈی ہو، اس نے اسے ادب سکھایا اور عمدہ تربیت کی اور اسے اچھی اور عمدہ تعلیم دی، پھر اسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح کر لیا، پس اس کے لیے دوگنا ثواب ہے۔" [بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل إمتہ وإہلہ: ۹۷]

الغرض نیک لوگوں کی صحبت، سنگت اور ان کے زمرے میں شمولیت ایک عظیم نعمت اور سعادت ہے جس کے لیے انبیائے کرام (علیہم السلام) نے بھی دعائیں کیں۔ کاش ہم بھی آج اس کی اہمیت کو سمجھیں اور فضول مجلسوں سے اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو دور رکھیں۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

لغۃ القرآن: [فَاَثَابَهُمُ : پھر بدلہ دیا ان کو][اللّٰهُ : اللہ][بِمَا : ساتھ جو][قَالُوْا : انہوں نے کہا][جَنّٰتٍ : باغات][تَجْرِيْ : چلتی ہیں][مِنْ : سے][تَحْتِهَا : ان کے نیچے][الْاَنْهٰرُ : نہریں][خٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہنے والے][فِيْهَا : ان میں][وَذٰلِكَ : اور وہ][جَزَاۗءُ : جزا][الْمُحْسِنِيْنَ : نیکی کرنے والے]

ترجمہ: سو اللہ نے ان کی اس (مومنانہ) بات کے عوض انھیں ثواب میں جنتیں عطا فرما دیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (وہ) ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اور یہی نیکوکاروں کی جزا ہے

تشریح: بات چل رہی تھی اہل حبشہ اور ان کی کہ جن عیسائیوں نے دین حق کو پہچان لیا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے صلہ میں جنتیں عطا فرمائیں اور جن عیسائیوں اور یہود اور مشرکین نے واضح دلائل اور معجزات دیکھنے کے باجود تکبر اور ہٹ دھرمی سے اللہ تعالیٰ کے وجود ' اس کی وحدانیت اور اس کے انبیاء کے صدق کا انکار کیا ' اللہ تعالیٰ ان کو اپنے عدل کے تقاضے سے دوزخ میں ڈال دے گا۔ اہل سنت کا یہی مذہب ہے کہ ثواب اللہ کا فضل ہے اور عذاب اللہ کا عدل ہے۔ (تبیان)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نکتہ نواز ہے۔ اگر ایک لفظ قبول فرمالے تو سارے گناہ معاف فرما دے۔ ان وفد والوں کو صرف اس جواب پر بخش دیا۔ ان کے صدقہ سے اللہ ہمارے گناہ بھی بخش دے۔ (نور)

ایمان کا بدلہ

جن لوگوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرآن مجید سنا اور کہا کہ یہ سچے پیغمبر ہیں اور یہ سچی کتاب ہے ان کے لئے ان کے اس کہنے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے بڑا اچھا انعام تیار کر رکھا ہے جو ان کو آخرت میں دیا جائے گا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا اس لیے اس آیت میں اس کو اس طرح کہا گیا ہے کہ "دے دیا گیا" یہ لوگ جو قرآن مجید سن کر ایمان لے آئے عیسائیوں میں بہت زیادہ تھے اور یہودیوں میں بہت کم، اسی لیے پچھلی آیتوں میں کہا گیا ہے کہ یہودی مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں اور عیسائی اتنے سخت نہیں، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ بات صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے نہیں بلکہ جس قوم میں یہ باتیں ہوں گی، یعنی: دین کا علم، دنیا سے دل ہٹا ہوا ہونا اور تکبر نہ ہونا، وہ قوم مسلمانوں سے جلد محبت کرنے لگے گی ورنہ پھر وہ مسلمانوں کے سخت دشمن ہوں گے۔

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو بدلے میں سرسبز و شاداب باغوں میں رہنے کی جگہ دیں گے، جس میں خوش گوار نہریں بہتی ہوں گی اور ان کے رہنے کی جگہ ہمیشہ کے لیے وہی ہوگی، نیک لوگوں اور اچھے عمل والوں کا بدلہ یہی ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ: جو لوگ ہماری اتاری ہوئی آیتوں کو جھوٹی بتلاتے ہیں ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقہ کار

قرآن مجید کو اس دنیا میں اس راستہ پر چلنا سکھاتا ہے، جس پر چلنے سے اس کو دنیا میں چین اور آرام ملے اور مرنے کے بعد بھی اس کو ہمیشہ کی راحت نصیب ہو، حقیقت میں انسان کے لئے یہی مقصد ہے، اس کو چھوڑ کر وہ جو راستہ بھی اختیار کرے گا پچھتائے گا اور اگر اس دنیا میں ظاہری طور پر بڑی آفتوں سے بچا ہوا بھی نظر آئے پھر بھی اس کو اصلی خوشی نہیں حاصل ہو سکتی اور مرنے کے بعد تو یقیناً اس کو بڑی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔

قرآن مجید کے سمجھانے کا طریقہ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور اس کی سمجھ میں نہ آئے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہر ایک کو آسانی سے نصیب نہیں ہوتا۔

اس سورۃ میں بہت پہلے سے کافروں، مشرکوں، یہودیوں، عیسائیوں اور منافقوں کا کچا چٹھا کھولا جا رہا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جس کی قسمت میں بچنا ہو ان برائیوں سے بچے اور صحیح راستہ اختیار کرے، ان پانچوں قسم کے لوگوں میں سے جس کا جی چاہے ایمان لا کر نیک کام کر کے اپنی دنیا اور آخرت سنوار لے ورنہ وہ پچھتائے گا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ سر پکڑ کر روئے گا۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر زیادہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان سے توقع تھی کہ یہ بات کو سمجھیں گے اور خود بھی گمراہی سے رکیں گے اور دوسروں کو بھی روکیں گے لیکن یہودیوں کا یہ حال تھا کہ پہلے زمانہ میں نیک ہونے کا اقرار کر کے پھر گئے اور اپنے نصیحت کرنے والوں کو

تکلیفیں پہنچائیں یہاں تک کہ پیغمبروں تک کو قتل کر ڈالا، عیسائی ان سے کسی قدر بہتر تھے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہ نفرت نہیں برتی جیسی یہودیوں نے برتی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے بھی اسلام کو نہ مانا اور اپنے ہی خیالات میں پھنسے رہے، آخر میں جو سبق سکھایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سے وہ شخص فائدہ اٹھائے گا جو دین کا علم سیکھے گا اور دنیا سے زیادہ دل نہ لگائے گا اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا نہ سمجھے گا، یعنی: تکبر میں مبتلا نہ ہوگا، عیسائیوں میں پہلے یہی باتیں تھیں اور یہودی ان سے کورے تھے اس لئے ان کے دل بنسبت یہودیوں کے اسلام کی طرف جلد مائل ہو جاتے تھے۔ (ربانی)

دراصل اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کے دل سچے ہیں اور ان کی زبان صداقت شعار ہے۔ وہ صراط مستقیم پر چلنے کا عزم کئے ہوئے ہیں 'وہ اس دین کے لیے فریضہ شہادت حق ادا کرنے کے لیے تیار ہیں جس میں وہ داخل ہوئے ہیں۔ وہ صداقت کے ساتھ اسلامی صفوں میں داخل ہوئے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہادت حق کی ادائیگی اللہ کا ایک احسان ہے جو اپنے بندوں میں سے کسی پر وہ کرتا ہے۔ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ اب وہ صرف اسلامی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اللہ ان کو نیکوں میں شامل کرے گا۔ چونکہ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں اس لیے اللہ نے ان کی اس بات کو قبول کر لیا اور ان کے لیے جزائے آخرت لکھ دی۔ اس پر اپنی گواہی قائم کر دی کہ یہ لوگ نیک ہیں اور یہ ہے جزائے محسنین:

(آیت) "فَأَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُواْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاء الْمُحْسِنِينَ (85)

" ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہ جزاء ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔" (ظلال)

وذلك جزآء المحسنين۔ "اور یہ (جنت) نیکوکاروں کی جزاء ہے"۔ یعنی ان نیکوکاروں کی جزاء اعمال ہے جو حضور قلب اور انتہائی خشوع سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا احسان (عبادت کی انتہائی خوبی) یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا (وہ تمہارے سامنے ہے اور) تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ (یقین رکھو) کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ قرآن مجید کا ضابطہ یہ ہے کہ ترغیب کے بعد خوف بھی دلاتا ہے دونوں کو جوڑ کر (یعنی متصل ۱۲) بیان کرتا ہے اس لیے آئندہ آیت میں کافروں کی سزا کا ذکر کیا اور چونکہ اہل ایمان کے ذکر میں قلبی تصدیق معرفت حق اور اقرار قولی کو بیان کیا تھا اس لیے (اس کے مقابل) انکار حق اور تکذیب کا ذکر کیا اور فرمایا۔ (مظہری)

خاص سے عام کی طرف آنا اور جزئیات سے کلیات پیدا کرنا قرآن مجید کا ایک عام اسلوب بیان ہے۔ اوپر ایک خاص گروہ کے انعامات کا ذکر تھا، اب عام قاعدہ بیان کر دیا ہے کہ ہمارے قانون میں ایسی جزائے خیر تو ہر نیکوکار کو ملتی ہی رہتی ہے اور اخلاص طلب رائگاں نہیں جاتا۔ وھکذا من خلص ایمانہ وصدق یقینہ یکون ثوابہ الجنتہ (قرطبیؒ) (آیت) "فاثابھم اللہ بما قالوا"۔ سے معلوم ہوا کہ جنت اس اقرار اور اس معرفت سے معاً واجب ہو جاتی ہے۔ (ماجدی)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ۝۸۶ ع

لغتہ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][كَفَرُوْا : جنہوں نے كفر كيا][وَكَذَّبُوْا : اور انہوں نے جھٹلايا][بِاٰيٰتِنَآ : ہماری آيات كو][اُولٰٓئِكَ : يہی لوگ][اَصْحٰبُ : والے][الْجَحِيْمِ : جہنم]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہیں

تشریح: جن عیسائیوں نے دین حق کو پہچان لیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے صلے میں جنتیں عطا فرمائیں اور جن عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکین نے واضح دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود تکبر اور ہٹ دھرمی سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کے انبیاء کے صدق کا انکار کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے عدل کے تقاضے سے دوزخ میں ڈال دے گا۔۔المختصر۔۔ ثواب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور عذاب اللہ تعالیٰ کا عدل ہے۔اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ دین حق پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماننے والا افراط و تفریط کا شکار ہو جائے۔(اشرفی)

یہاں (آیت) " (والذین کفروا) سے مراد قطعیت کے ساتھ وہی لوگ ہیں ' جو نصاری میں سے سچائی کو سنتے ہیں لیکن مانتے نہیں۔ سچائی کو سن کر نہ ماننے والے نصاری کے بارے میں قرآن یہاں کافرین کا لفظ استعمال کرتا ہے ' لہٰذا نصاری جب بھی ایسا موقف اختیار کریں گے ان پر کفر کا اطلاق ہوگا۔اس میں یہود و نصاری کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب تک وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل شدہ کلام کو تسلیم نہیں کرتے جو کلام برحق ہے ان میں اور مشرکین اور یہودیوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔جب تک وہ منکر رہیں گے اور اسلام میں داخل نہ ہوں گے ' اس لیے کہ اب اللہ کے ہاں دین اسلام کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں ہے اور یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں دہرایا گیا ہے۔(ظلال)

شان نزول

ترمذی وغیرہ نے حضرت ابن عباس (رض) : کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب میں گوشت کھالیتا ہوں تو میری خواہش مردانہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اس لیے میں نے اپنے لیے گوشت حرام کر لیا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔(مظہری)

اور تفسیر مدارک التنزیل میں یوں آیا ہے

پہلی آیت میں اولیائے برحق کے قبول کرنے کا اثر مذکور تھا۔ یہ صحابہ کرام (رض) کی اس جماعت کے سلسلہ میں اتری جنہوں نے حلف اٹھایا کہ وہ رہبانیت اختیار کرلیں اور ٹاٹ پہنیں اور ساری رات قیام کریں اور تمام دن روزے رکھیں اور زمین میں سیاحت کریں اور اپنے مذاکیر کو کاٹ ڈالیں اور گوشت وچربی کو ترک کردیں اور عورتوں سے قربت ترک کردیں اور خوشبو نہ لگائیں تو یہ آیت اتری۔ (مدارک)

اس آیت میں بنیادی حکم یہ دیا گیا ہے کہ مومنوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حلال اور طیّب چیزوں کو من مرضی سے حرام قرار دیں۔ حرام وحلال کی تاریخ دیکھی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ لوگوں نے لذت نفس کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیا اور کچھ لوگوں نے تقویٰ اور نیکی کے حصول کے لیے حلال کو حرام ٹھہرایا۔ جس طرح کہ آجکل بعض نام نہاد بہروپیے صوفیائے کرام، ہندو پنڈت، جوگی، بدھ مت کے پیروکار اور عیسائیوں میں بعض پادریوں نے من ساختہ نیکی کے حصول کے لیے لذّات سے اجتناب اور تارک الدّنیا ہونے کا طریقہ اختیار کیا۔ دین اسلام نے اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دی کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیں اور حدود اللہ سے تجاوز کر جائیں۔ یاد رہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک موقع پر یوں فرمایا ہے کہ ہر حکومت کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اگر کوئی شخص اپنے مویشی سرکاری چراگاہ کی حدود کے قریب لے جائے گا تو خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی اس کے جانور چراگاہ میں داخل ہو جائیں۔ احتیاط اور تقویٰ کی بات یہ ہے کہ کسی گلہ بان کو اپنا ریوڑ سرکاری چراگاہ کے قریب نہیں لے جانا چاہیے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے حرام وحلال کے ضابطوں کے اندر رہ کر زندگی بسر کرنا ہی تقویٰ ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ صحت مند مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔ البتہ طبعی کراہت یا پرہیز کی خاطر کسی چیز کو ترک کرنا حرام کے زمرے میں نہیں آتا ہے بشرطیکہ آدمی خدا کی حلال کردہ چیز کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھتا ہو۔ اگر کسی کو حقیقی ایمان نصیب ہو تو یہ بات سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اسی میں تقویٰ اور تزکیہ نفس ہے۔

"حضرت عبداللہ بن دینار (رض) بیان کرتے ہیں انھوں نے عبداللہ بن عمر (رض) کو فرماتے سنا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سانڈھے (گوہ) کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اس کو کھاتا ہوں نہ اس کو حرام کرتا ہوں۔"

(عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ (رض) يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهٖ وَعِرْضِهٖ) [رواہ البخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبرألدینہ]

"حضرت نعمان بن بشیر (رض) کہتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے دونوں کے درمیان متشابہ چیزیں ہیں ان کو لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی ہے جو کوئی متشابہ چیزوں سے بچے گا اس نے اپنا دین اور عزت محفوظ کرلی۔"

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) .. قَالَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ) [رواہ مسلم: کتاب الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ایمان والو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر کی وجہ سے پراگندہ بالوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اے میرے رب! اے میرے رب! کہتا ہے اس کا کھانا پینا حرام، اس کا لباس بھی حرام اور اس کا سامان بھی حرام مال کا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔" (فہم)

منکروں کا انجام دوزخ۔ والعیاذ باللہ جل وعلا

سو ارشاد فرمایا گیا کہ جو لوگ اڑے رہے ہوں گے کفر و باطل پر۔ والعیاذ باللہ۔ تو وہ یار ہوں گے دوزخ کی دہکتی بھڑکتی آگ کے۔ "۔جَحِیْم" دراصل اس آگ کو کہا جاتا ہے جس کو کسی گہرے گڑھے میں جلایا جائے تاکہ اس کی لہیب یعنی شعلہ زنی اور دہک میں کمی نہ آنے پائے۔ (تفسیر التحریر والتنویر للعلامۃ ابن عاشور)۔ پھر دوزخ کی وہ آگ ایسی سخت اور اس قدر ہولناک ہوگی کہ ان کو چھوڑے گی بھی نہیں کہ وہ اس سے کوئی راحت و سکون پا سکیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ اس طرح چمٹی اور لپٹی رہے گی جس طرح کہ ایک دوست دوسرے دوست سے اور ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ اسی لیے یہاں پر {اَصْحَابُ الْجَحِیْمِ} فرمایا گیا ہے جو کہ جمع ہے "صاحب" کی۔ جسکے معنیٰ ساتھی اور دوست کے آتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ دوزخ کی اس دہکتی بھڑکتی آگ کے ساتھی اور اس کے یار ہوں گے۔ نہ وہ آگ ان کو چھوڑے گی اور نہ یہ کبھی اس سے الگ ہو سکیں گے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ عام طور پر اس کا ترجمہ "جہنمی" یا "دوزخی" وغیرہ جیسے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے وہ پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا جو کہ {اَصْحَابُ الْجَحِیْمِ} کے الفاظ کے اندر پایا جاتا ہے۔ سو ہم نے اپنے ترجمے میں اسی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ والحمد للہ۔ اور دوزخ کی وہ آگ چونکہ دنیاوی آگ کی طرح اندھی بہری آگ نہیں ہوگی کہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، بلکہ وہ ایسی آگ ہوگی جو مجرم کو اور اس کے جرم کو پہچانتی ہوگی۔ اس لیے وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گی جس کا وہ اپنے کفر و باطل اور اپنے جرم و قصور کی بنا پر اہل اور مستحق ہوگا۔ کہ وہ دلوں تک جھانکنے والی آگ ہوگی۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر اس کی تصریح فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا۔ {اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ} ۔ (الھمزۃ: 7)۔ نیز فرمایا گیا کہ ۔ {تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی} ۔ (المعارج: 17) یعنی وہ آگ بلاتی پکارتی ہوگی ان لوگوں کو جن کے دنیا میں یہ اور یہ کرتوت رہے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ سو جن لوگوں نے زندگی بھر اپنے کفر و باطل اور حق دشمنی کو سینے سے لگائے رکھا ہوگا وہ اسی لائق ہوں گے کہ وہ ایسی دہکتی بھڑکتی آگ کے ساتھی اور یار قرار پائیں جس سے وہ کبھی چھٹکارا نہ پا سکیں۔ اپنے خود کردہ جرم عظیم اور گناہ سنگین کے نتیجے میں تاکہ ان کو بھرپور بدلہ۔ جزاء وفاق۔ مل سکے اپنے زندگی بھر کے کیے کرائے کا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اللہ ہمیشہ اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔ (مدنی کبیر)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام نہیں گردانناچاہیے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ پاکیزہ چیزیں ہی کھانی چاہئیں۔ ۴۔ تقویٰ ہی مومنین کو اعتدال و فرمان برداری کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][لَا تُحَرِّمُوْا : نہ تم حرام کرو][طَيِّبٰتِ : پاک چیزیں][مَآ : جو][اَحَلَّ : اس نے حلال کیں][اللّٰهُ : اللہ][لَكُمْ : تمہارے لیے][وَلَا تَعْتَدُوْا : اور نہ تم زیادتی کرو][اِنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][لَا : نہیں][يُحِبُّ : وہ پسند کرتا][الْمُعْتَدِيْنَ : حد سے بڑھنے والے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انھیں (اپنے اوپر) حرام مت ٹھہراؤ اور نہ (ہی) حد سے بڑھو، بیشک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا

تشریح:

شان نزول

چند جلیل القدر صحابہ جن میں حضرت صدیق و علی (رض) بھی شریک تھے۔ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر میں جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کریں گے، ساری رات عبادت میں گزاریں گے۔ بستروں پر نہیں سوئیں گے۔ گوشت، گھی وغیرہ نہیں کھائیں گے۔ عورتوں اور خوشبو سے بالکل اجتناب کریں گے۔ اونی لباس پہنیں گے۔ اور دنیا سے قطع تعلق کرلیں گے۔ رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اطلاع ملی تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں بلا کر یہ حقیقت افروز ارشاد فرمایا :۔ مجھے ان باتوں کا حکم نہیں دیا گیا۔ ان لانفسكم عليكم حقا فصوموا وافطروا وقوموا وناموا فانی اقوم وانام واصوم وافطروا کل اللهم والدسم واتی النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (کشاف وغیرہ)

اے میرے صحابہ ! تمہارے نفسوں کا بھی تم پر حق ہے اس لیے روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ راتوں میں جاگ کر عبادت بھی کرو اور آرام سے سوؤ بھی۔ کیونکہ میں رات کو جاگتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ گوشت اور گھی بھی

کھاتا ہوں۔ اور اپنی ازواج سے بھی مقاربت کرتا ہوں (یہ میرا طریق کار اور سنت ہے) جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ میری جماعت سے نہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تو یہودیوں کی طرح لذات دنیا میں کھو جاؤ اور نہ مسیحی راہبوں کی طرح دنیا کی حلال لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر دو بلکہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ یہی دین اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اس آیت میں لا تحرموا کا معنی یہ ہے کہ نہ تو یہ اعتقاد رکھو کہ یہ چیزیں حرام ہیں اور نہ زبان سے ایسا کہو اور نہ ان کے استعمال کو اس طرح ترک کرو جیسے حرام چیز کو ترک کیا جاتا ہے۔ اولیا کرام نفس سرکش کی سرکوبی کے لیے بعض حلال چیزوں کو استعمال نہیں کرتے تو وہ ان کی حرمت کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ جس طرح جسمانی طبیب بعض اشیاء کو صحت جسمانی کے لیے مضر خیال کرکے مریض کو ان کے استعمال سے روک دیتا ہے اسی طرح یہ روحانی معالج بعض روحانی مفاسد کے پیش نظر بعض چیزوں سے وقت طور پر اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جاہل اللہ تعالیٰ کی کسی حلال کردہ چیز کو اعتقادی یا قولی طور پر حرام جانے تو یہ باطل ہے اور گمراہی ہے۔ (ضیاء)

اعمال میں اعتدال کا حکم

احادیثِ مبارکہ میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اعتدال کا حکم فرمایا اور عبادت کرنے میں خود کو بہت زیادہ تکلیف میں ڈالنے سے منع فرمایا۔ اس کے لیے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

(1 نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ خویلہ بنت حکیم جو حضرت عثمان بن مظعون کے نکاح میں تھیں 'وہ میرے پاس آئیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو ابتر حال میں دیکھا 'آپ نے مجھ سے فرمایا اے عائشہ! خویلہ کس قدر ابتر حال میں ہے۔ حضرت عائشہ (رض) نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس عورت کا خاوند دن کو روزہ رکھتا ہوں اور ساری رات نماز پڑھتا ہوں 'وہ اس عورت کی طرح ہے جس کا کوئی خاوند نہ ہو۔ سو اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کے لیے چھوڑ دیا 'پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عثمان بن مظعون کو بلوایا۔ جب حضرت عثمان بن مظعون آئے تو آپ نے فرمایا اے عثمان! کیا تم میری سنت سے اعراض کرنے والے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں! بخدا یا یارسول اللہ لیکن میں آپ کی سنت کو طلب کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں 'روزہ بھی رکھتا ہوں اور کھاتا پیتا بھی ہوں 'اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان! اللہ سے ڈرو 'کیونکہ تمہارے اہل (بیوی) کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے 'اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ سو تم روزہ رکھو اور کھاؤ پیو بھی 'اور نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ (علامہ احمد شاکر 'متوفی ۱۳۷۷ھ نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے 'مسند احمد 'ج ۱۸ رقم الحدیث: ۲۶۱۸۶ 'طبع دارالحدیث قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۱۰ 'رقم الحدیث: ۲۶۳۶۸ 'طبع دارالفکر 'مسند احمد 'ج ۶ 'ص ۲۶۸ 'طبع قدیم 'سنن ابوداؤد 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۳۶۹ 'سنن دارمی ج ۲ 'رقم الحدیث: '۲۱۶۹ 'مصنف عبدالرزاق 'ج ۶ 'رقم الحدیث: '۱۰۳۷۵ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۹ 'موارد الظمان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۲۸۸ 'مسند البزار 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۱۴۵۸۔ ۱۴۵۷ 'اس کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد 'ج ۴ 'ص ۳۰۱ 'طبع قدیم 'المعجم الکبیر 'ج ۹ 'رقم الحدیث: '۸۳۱۹ 'مسند ابویعلی 'ج ۱۳ 'رقم الحدیث: '۷۲۴۲)

(2)-- حضرت انس (رض) فرماتے ہیں، رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد میں تشریف لائے، اس وقت مسجد کے دو ستونوں کے درمیان رسی تانی ہوئی تھی، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: یہ حضرت زینب (رض) کی رسی ہے وہ نماز پڑھتی ہیں اور جب ان پر تھکن یا سستی طاری ہوتی ہے تو اس رسی کو پکڑ لیتی ہیں۔ حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اس رسی کو کھول دو، تم میں سے ہر شخص اس وقت تک نماز پڑھے جب تک وہ آسانی سے نماز پڑھ سکے اور جب اس پر تھکن یا سستی طاری ہو تو وہ بیٹھ جایا کرے۔

(3)-- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) فرماتے ہیں "میں ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور ہر رات قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے میرا ذکر کیا گیا تو آپ نے مجھے بلوایا، میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم ہمیشہ روزے رکھتے ہو اور ہر رات قرآن مجید پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں، یارسول اللہ! لیکن میں نے اس عبادت سے صرف خیر کا ارادہ کیا ہے۔ سرکارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ تم مہینے میں صرف تین دن روزے رکھ لیا کرو۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں اس سے افضل کی طاقت رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تم اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نبی حضرت داؤد (علیہ السلام) کے روزے رکھو کیونکہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے نبی! حضرت داؤد (علیہ السلام) کے روزے کس طرح تھے؟ ارشاد فرمایا "وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور فرمایا "ہر ماہ میں ایک قرآن پاک ختم کیا کرو۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں اس سے افضل کی طاقت رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: "پھر بیس دن میں ایک قرآن پاک ختم کرلو۔ میں نے عرض کی: میں اس سے افضل کی طاقت رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا "پھر دس دن میں ایک قرآن پاک ختم کرلو۔ میں نے عرض کی: میں اس سے افضل کی طاقت رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا "پھر سات دن میں قرآن پاک ختم کرلو اور اس سے زیادہ اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالو کیونکہ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔

حضرت ابو جحیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء (رض) کو آپس میں بھائی بنایا۔ ایک حضرت سلمان ' حضرت ابوالدرداء سے ملنے گئے تو انھوں نے حضرت ام الدرداء (رض) کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھا ' انھوں نے کہا یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ انھوں نے کہا آپ کے بھائی ابوالدرداء کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جب حضرت ابو الدرداء آئے تو انھوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا ' حضرت سلمان نے کہا آپ بھی کھائیے۔ انھوں نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان (رض) نے کہا جب تک آپ کھانا نہیں کھائیں گے ' میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ پھر حضرت ابوالدرداء نے کھانا کھایا ' جب رات ہوئی تو حضرت ابوالدرداء نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ حضرت سلمان نے کہا سو جائیں ' وہ سو گئے ' پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے پھر کہا۔ سو جائیں ' جب رات کا آخری حصہ رہ گیا تو حضرت سلمان نے کہا اب کھڑے ہوں۔ پھر دونوں نے نماز (تہجد) پڑھی ' پھر حضرت سلمان (رض) نے کہا آپ کے رب کا آپ پر حق ہے اور آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے اور آپ کے اہل (بیوی) کا آپ پر حق ہے ' ہر حقدار کو اس کا حق ادا کریں۔ حضرت ابوالدرداء نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گئے اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا ' آپ نے فرمایا سلمان نے سچ

کہا۔ (صحیح البخاری ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۹۶۸ ' سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۴۲۱ ' صحیح ابن حبان ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۲۰ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۴ ' ص ۲۷۶)

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عثمان بن مظعون (رض) کو نکاح نہ کرنے کی اجازت نہیں دی ' اگر آپ ان کو اجازت دیتے تو ہم خصی ہوجاتے۔ (صحیح البخاری ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۵۰۷۳ ' صحیح مسلم ' نکاح ' ٦ ' (۱۴۰۲) ۳۳۴۴ ' سنن ترمذی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۰۸۴ ' سنن النسائی ج ٦ ' رقم الحدیث : ۳۲۱۰ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۸۴۸ ' مسند احمد ' ج ۱ ' ص ۱۷۵ ' طبع قدیم ' مصنف عبدالرزاق ج ٦ ' رقم الحدیث : ۱۰۳۷۵)

مسند ابویعلی میں یہ روایت اس طرح ہے حضرت عثمان بن مظعون (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملے تو آپ نے فرمایا اے عثمان ' کیا تمہارے لیے میری سیرت میں نمونہ نہیں ہے ! انھوں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں اس ارشاد کا کیا سبب ہے ؟ آپ نے فرمایا تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو ' حالانکہ تمہارے اہل (زوجہ) کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے ' تم نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی اور روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ پھر اس کے بعد ان کی بیوی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات کے پاس اس طرح خوشبو میں بسی ہوئی آئیں کہ وہ دلہن ہوں ازواج نے ان سے پوچھا کیا ہوا ؟ انھوں نے کہا وہی ہوا جس طرح وہ عورتیں ہوتی ہیں جن کی طرف ان کے خاوند رغبت کرتے ہیں۔

اور مصنف عبدالرزاق ' سنن دارمی ' صحیح ابن حبان اور المعجم الکبیر میں یہ روایت اس طرح ہے :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عثمان بن مظعون سے ملے اور آپ نے فرمایا اے عثمان ! ہم پر رہبانیت فرض نہیں کی گئی کیا تمہارے لیے میری سیرت میں اچھا نمونہ نہیں ہے ؟ میں تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اس کی حدود کی حفاظت کرنے والا ہوں۔ (تبیان)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ ان کے پاس نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے ' اس وقت ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہے ؟ حضرت عائشہ (رض) نے کہا یہ فلاں عورت ہے ' اس کی نمازوں کا بڑا چرچا ہے۔ آپ نے فرمایا چھوڑو ' اتنا عمل کرو جو ہمیشہ کرسکو ' بخدا اللہ اس وقت تک نہیں اکتاتا جب تم نہ اکتاؤ ' اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر بندہ ہیشگی کرے۔ (صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۴۳ ' صحیح مسلم ' مسافرین ' ۲۲۱ ' (۷۸۵) ۱۸۰۳ ' سنن النسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۶۴۱ ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۵۰۵۰ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۴۲۳۸ ' مسند احمد ' ج ۹ ' رقم الحدیث : ۲۴۲۹۹ ' طبع دارالفکر ' مسند احمد ' ج ٦ ' ص ۵۱ ' طبع قدیم ' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ۲٦۰)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خطبہ دے رہے تھے ' اچانک ایک شخص کو (دھوپ میں) کھڑے ہوئے دیکھا ' آپ نے پوچھا یہ کون ہے ؟ صحابہ نے کہا یہ ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ یہ کھڑا رہے گا ' بیٹھے گا نہیں ' نہ سایہ میں آئے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس سے کہو کہ بات کرے ' سایہ میں آئے اور بیٹھے اور اپنا روزہ پورا کرے۔ (صحیح البخاری ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ٦۷۰۴ ' سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۳۰۰ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' : ۲۱۳٦ ' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ۱۰۲۹ ' مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۱٦۸ ' طبع قدیم)

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میری بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ پیدل چل کر بیت اللہ جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے سوچا کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق فتوی معلوم کروں ' میں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا وہ حج کو جائے اور سوار ہو۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ اس کے پیدل چلنے سے مستغنی ہے ' اس سے کہو سوار ہو۔ (صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ١٨٦٦' صحیح مسلم ' نذر ' ١١ ' (١٦٤٤) ٤١٧٢ ' سنن ترمذی ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ' ١٥٤١ ' سنن ابوداؤد ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ٣٢٩٩ ' سنن النسائی ' ج ٧ ' رقم الحدیث : ' ٣٨١٤)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دیکھا ' ایک بوڑھا شخص جو چل نہیں سکتا تھا ' اسے اس کے دو بیٹے پکڑ کر چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ ایسا کیوں کر رہا ہے ؟ صحابہ نے کہا اس نے پیدل حج کرنے کہ کی نذر مانی تھی۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے کہ یہ اپنے نفس کو عذاب دے اور اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔ (صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ١٨٦٥ ' صحیح مسلم ' نذر ٩ ' (١٦٤٢) ٤١٦٩ ' سنن ابوداؤد ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ٣٣٠١ ' سنن ترمذی ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ' ١٥٤٢ ' سنن نسائی ' ج ٧ ' رقم الحدیث : ' ٣٨٦٢ ' ٣٨٦١ ' مسند احمد ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ١٢١٢٨ ' مسند ابویعلی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ' ٣٥٣٢ ' صحیح ابن حبان ' ج ١٠ ' رقم الحدیث : ' ٤٣٨٣ ' ابن الجارود ' رقم الحدیث : ' ٩٣٩ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ١٠ ' ص ٧٨)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک لشکر میں گئے ' ایک شخص ایک غار میں گیا جس میں پینے کے لیے پانی بھی تھا ' اس شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ اس غار میں رہے تو اس میں پانی بھی ہے اور اس کے ارد گرد سبزیاں بھی ہیں ' وہ دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر اس غار میں رہ کر زندگی بسر کرسکتا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جا کر اس کا ذکر کروں۔ اگر آپ نے اجازت دے دی ' تو میں اس غار میں رہوں گا ' ورنہ نہیں رہوں گا۔ اس نے آپ سے عرض کیا یا نبی اللہ ! میں ایک غار کے پاس سے گزرا اس میں زندگی بسر کرنے کے لیے پانی بھی ہے اور سبزیاں بھی ہیں ' میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس غار میں رہوں اور دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو جاؤں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں یہودیت اور نصرانیت کے ساتھ نہیں مبعوث کیا گیا ' میں ملت حنیفہ کے ساتھ بھیجا گیا ہوں ' جو بہت آسان ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے اللہ کی راہ میں ایک صبح کرنا یا ایک شام گزارنا ' دنیا ومافیہا سے بہتر ہے ' اور تم میں سے کسی ایک شخص کا جہاد کے لیے صف میں کھڑے ہونا اس کی (تنہا) ساٹھ سال کی نمازوں سے بہتر ہے۔ (علامہ احمد شاکر متوفی ١٣٧٧ ھ نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے۔ مسند احمد ' بتحقیق احمد شاکر ' ج ١٦ ' رقم الحدیث : ' ٢٢١٩٢ ' طبع ' دارالحدیث : ' قاہرہ۔ مسند احمد ' ج ٥ ' ص ٢٦٦ ' طبع قدیم المعجم الکبیر للطبرانی ' ج ٨ ' رقم الحدیث : ' ٧٨٦٨ ' مجمع الزوائد ' ج ٥ ' ص ٢٧٩)

دین آسان ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

(آیت) ” یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر “۔ (البقرہ : ١٨٥)

ترجمہ : اللہ تمہارے لیے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے ' تم کو مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بلاشبہ دین آسان ہے جو شخص اس دین کو مشکل بنانے کی کوشش کرے گا، دین اس پر غالب آجائے گا۔ (الحدیث) (صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم آسانی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔ (صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۲۰، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اسلام معتدل، سہل اور دین فطرت ہے

ان آیات اور احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، وہ توسط اور اعتدال کا تقاضا کرتا ہے اور اس میں افراط اور تفریط ممنوع اور مذموم ہے، اسی طرح اسلام میں سخت اور مشکل عبادات مطلوب نہیں ہیں، بلکہ اسلامی احکام میں، نرمی ملائمت، سہولت اور آسانی مرغوب ہے۔ اسلام کا کوئی حکم خلاف فطرت نہیں ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے ہم رہبانیت نہیں ہے۔ (العال المتناھیہ، ج ۲، ۱۵۲)

اور آپ نے فرمایا اے عثمان! ہم پر رہبانیت فرض نہیں کی گئی۔ (مصنف عبدالرزاق، ج، رقم الحدیث: ۱۰۳۷۵، سنن دارمی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۱۶۹) اسلام میں ترک لذائذ، سخت ریاضات اور عبادات شاقہ ممنوعہ ہیں "مصنوعی زاہدوں اور جعلی صوفیوں نے جو خود ساختہ شریعت وضع کرلی ہے اس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

نیکی اور فضیلت حاصل کرنے کا اصل اور صحیح طریقہ وہ ہے جس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عمل کیا اور جو راستہ ہمارے لیے مقرر کیا اور جس طریقہ پر صحابہ کرام گامزن رہے اور اخیار تابعین نے جس کو اپنایا۔

حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن صبح کی نماز کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو بہت بلیغ نصیحت کی، جس سے ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہمارے دل خوف زدہ ہوگئے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور امیر کا حکم سننے اور اس پر عمل کرنے کی "خواہ وہ حبشی غلام ہو، کیونکہ جو شخص تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت اختلافات دیکھے گا، اور تم بدعات (سیہ) سے بچتے رہنا کیونکہ وہ گمراہی ہیں، تم میں سے جو شخص اس اختلاف کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ میری سنت پر عمل کرے اور خلفاء راشدین مھدیین کی سنت پر عمل کرے اور اس کو داڑھوں سے پکڑ لے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے (سنن ترمذی، ج ۴، رقم الحدیث: ۲۶۸۵، سنن ابوداؤد "ج ۳، رقم الحدیث: ۴۶۰۷، سنن ابن ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۴۲، سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۵، مسند احمد، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۷۱۴۵)

سنن ترمذی کے علاوہ باقی کتب حدیث میں اس طرح مذکور ہے، کیونکہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلافات دیکھے گا، سو تم پر لازم ہے کہ میری سنت پر عمل کرو، اور خلفاء راشدین مھدیین کی سنت پر عمل کرو، اور اس کو داڑھوں سے پکڑ لو۔ (تبیان)

حلال چیزوں سے اجتناب کی ممانعت

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے مسلمانو ! جن چیزوں کی طرف تمہارا دل مائل ہوتا ہے ان کی لذت حاصل کرنے سے اپنے آپ کو منع نہ کرو ' جس طرح عیسائیوں کے علماء اور راہبوں نے کھانے پینے کی عمدہ اور لذیذ چیزوں کو اور عورتوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا اور بعض نے اپنے آپ کو گرجوں میں مقید کرلیا اور بعض سیاحت کرنے لگے۔ سو اے مسلمانو ! تم ان کی طرح حد سے نہ بڑھنا۔

اس مضمون کی قرآن مجید میں اور بھی آیات ہیں :

(آیت) "یایھا الذین امنوا کلوا من طیبات ما رزقنا کم واشکروا اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون"۔ (البقرہ : ١٧٢)

ترجمہ : اے ایمان والو ان حلال چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

(آیت) "قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق" (الاعراف : ٣٢)

ترجمہ : آپ کہئے کہ اللہ کی اس زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور حلال چیزوں کو (کس نے حرام کیا ہے ؟)

عبادات اور معاملات میں میانہ روی کے متعلق آیات اور احادیث

(آیت) "والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما"۔ (الفرقان : ٦٧)

ترجمہ : اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو یہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی سے کام لیتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا میانہ روی سے ہوتا ہے۔

(آیت) "وات ذالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا"۔ (بنو اسرائیل : ٢٦)

ترجمہ : اور (اے مخاطب) رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرو اور مسکینوں اور مسافروں کو اور بے جا خرچ نہ کرو۔

(آیت) "ولا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا"۔ (بنو اسرائیل : ٢٩)

ترجمہ : اور اپنا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ 'اور نہ اس کو پوری طرح کھول دے کہ بیٹھا رہ ملامت زدہ ' تھکا ہارا۔ (تبیان)

یعنی ابوقلابہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض صحابہ نے یہ ارادہ کیا کہ دنیا کو ترک کردیں اور عورتوں کو چھوڑ دیں اور راہب ہوجائیں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے ناراض ہو کر فرمایا تم سے پہلے لوگ صرف (دین میں) سختی کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر سختی کی 'ان کے بچے کھچے لوگ مندروں اور گرجوں میں ہیں۔ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو 'حج کرو اور عمرہ کرو 'تم سیدھے رہو تو تمہارے لیے استقامت ہوگی 'اور ان ہی لوگوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی :

اے ایمان والو ! تم ان پسندیدہ چیزوں کو حرام قرار نہ دو جن کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کردیا ہے۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ان صحابہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے ارادہ کیا تھا کہ اچھے کپڑے اتار دیں 'عورتوں کو چھوڑ دیں اور زاہد بن جائیں ان میں حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالب (رض) تھے۔ (جامع البیان 'جز ٧ ص ١٣ 'مطبوعہ ١٤١٥ ھ)

مجیبہ باہلیہ اپنے والد یا چچا سے روایت کرتی ہیں کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گئے 'پھر واپس چلے آئے۔ پھر ایک سال کے بعد دوبارہ آپ سے ملنے گئے 'اس وقت ان کا جسم کمزوری کی وجہ سے بہت متغیر ہو چکا تھا۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ ! کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ آپ نے پوچھا تم کون ہو ؟ انھوں نے کہاں فلاں باہلی ہوں جو ایک سال پہلے آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ نے پوچھا تم کس وجہ سے اس قدر بدل گئے ہو تم تو بہت خوبصورت تھے ؟ انھوں نے کہا میں جب سے آپ کے پاس سے گیا ہوں 'میں کبھی دن کو کھانا نہیں کھایا 'صرف رات کو کھانا کھایا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم نے اپنے نفس کو کیوں عذاب میں ڈالا ؟ پھر آپ نے فرمایا رمضان کے روزے رکھا کرو اور ہر مہینہ میں ایک روزہ رکھ لیا کرو۔ انھوں نے کہا زیادہ کریں مجھ میں اس کی طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا ہر ماہ دو روزے رکھ لو 'انھوں نے پھر کہا زیادہ کریں 'آپ نے فرمایا ہر ماہ تین روزے رکھ لو۔ انھوں نے پھر کہا زیادہ کریں۔ فرمایا حرم کے مہینہ میں روزہ رکھو۔ پھر چھوڑ دو 'حرم کے مہینہ میں روزہ رکھو پھر چھوڑ دو 'حرم کے مہینہ میں روزہ رکھو پھر چھوڑ دو۔ آپ نے تین انگلیوں کو ملا کر اشارہ کیا 'پھر چھوڑ دیا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم کے مہینہ میں تین مسلسل روزے رکھو 'پھر تین دن چھوڑ دو 'اور اس طرح تین بار کرو۔ یعنی صرف حرم کے مہینہ میں نو نفلی روزے رکھنے کی اجازت دی۔ (حرم کے مہینہ سے مراد ایام حج کے مہینے ہیں) (سنن ابوداؤد 'ج ۲ رقم الحدیث ۲۴۲۸ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۶ھ)

حلال چیزوں کو ترک کرنے کا شرعی حکم

حلال چیزوں کو ترک کرنا جائز ہوتا ہے کہ ان کا کرنا کوئی فرض و واجب نہیں ہوتا لیکن جس طرح حرام کو گناہ و نافرمانی سمجھ کر ترک کیا جاتا ہے اس طرح حلال چیزوں کو ترک کرنے کی اجازت نہیں۔ نیز کسی حلال چیز کے متعلق بطور مبالغہ یہ کہنے کی اجازت نہیں کہ ہم نے اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔ صوفیاءِ کرام (رح) سے جو بہت سی چیزوں کو ترک کرنے کے واقعات ملتے ہیں وہ بطور علاج ہیں یعنی جس طرح بیمار آدمی بہت سی غذاؤں کو حلال سمجھنے کے باوجود اپنی صحت کی خاطر پرہیز کرتے ہوئے کئی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح صوفیاء کرام (رح) نفس کے علاج کیلئے بعض حلال چیزوں کو حلال سمجھنے کے باوجود ترک کر دیتے ہیں، لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حلال چیزوں کو ترک کرنے کی اجازت تو ہے لیکن یہ اجازت نہیں کہ ان کے ساتھ حرام جیسا سلوک کیا جائے۔

حلال چیزوں کو حرام قرار دینے کے بارے میں ایک اہم مسئلہ

اس آیتِ مبارکہ میں پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دینے سے منع فرمایا، اس سے ان لوگوں کو بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو مقبولان بارگاہِ الٰہی کی طرف منسوب ہر چیز پر حرام کے فتوے دینے پر لگے رہتے ہیں اور ہر چیز میں انھیں شرک ہی سوجھتا ہے۔ (صراط)

انسان اپنی مملوکہ چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اختیار دے رکھا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ چیز حلال ہو، اور کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق، مالک اور رازق ہے، یا پھر یہ اختیار اللہ تعالیٰ کی عطا اور وحی کے واسطہ سے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ اعظم ہیں۔ اب

اگر کوئی انسان اپنے اختیار سے کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کی کوشش کرے تو وہ اپنی حدود سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تصرف کرنے کا مرتکب ہوگا جو کہ سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔

لہٰذا بندہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی حلال چیز کے حرام ہونے کا نہ عقیدہ رکھے، نہ زبان سے اسے حرام کہے، نہ حرام کی طرح اس سے اجتناب کرے، نہ اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے اور نہ کسی حرام چیز کی نذر مانے۔ہاں ایک شخص اگر کسی حلال چیز کو اپنی جسمانی یا روحانی بیماری کے علاج کے لیے عارضی طور پر اس سے اجتناب کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے ذیابیطس کے مریض کو ڈاکٹر کہے کہ میٹھی چیز کھانا چھوڑ دے تاکہ اس کی شوگر کنٹرول میں رہے یا کسی بے نماز مرید کو شیخ طریقت کہے کہ تین دنوں کے لیے اپنے گھر کو چھوڑ دے اور مسجد میں اعتکاف کی نیت سے بیٹھ کر کثرت سے استغفار کرے تاکہ اسے نماز کی عادت پڑ جائے۔(امداد)

آیت مبارکہ:

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

لغۃ القرآن: [وَكُلُوْا : اور کھاؤ][مِمَّا : اس سے جو][رَزَقَكُمُ : رزق دیا تم کو][اللّٰهُ : اللہ][حَلٰلًا : حلال][طَيِّبًا : پاکیزہ][وَّاتَّقُوا : اور تم ڈرو][اللّٰهَ : اللہ][الَّذِيْٓ : وہ][اَنْتُمْ : تم ہو][بِهٖ : اسکے ساتھ][مُؤْمِنُوْنَ : ایمان لانے والے]

ترجمہ: اور جو حلال پاکیزہ رزق اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے کھایا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو

تشریح: نعمتوں سے سرفرازی کا تقاضا شکر و سپاس خداوندی: سو ارشاد فرمایا گیا اور کھاؤ [پیو] تم لوگ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم کو اللہ نے عطا فرمائی ہیں۔اور اس نے تم کو وہ محض اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائیں ورنہ تمہارا نہ کوئی حق تھا نہ استحقاق۔اور نہ ہی کوئی سوال و درخواست۔سو کتنا کرم اور کس قدر فضل و احسان ہے اس وحدہ لاشریک کا تم پر۔پس اس کے بدلے میں تم لوگ سراپا شکر و سپاس بن جاؤ اس واہب مطلق کیلئے۔سبحانہ و تعالیٰ۔کہ نعمتوں سے سرفرازی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اس واہب مطلق کیلئے سراسر شکر و سپاس بن جائے تاکہ اس طرح اس کا حقِّ شکر بھی ادا ہو اور تاکہ اس طرح یہ نعمتیں تمہارے لیے دارین کی سعادت و سرخروئی کا ذریعہ بھی بن سکیں۔اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا التَّوْفِیْقَ لِذَالِکَ۔سو اس ارشاد ربانی سے دو بڑے عظیم الشان درس دیئے گئے۔ایک یہ کہ انسان کو جو بھی کوئی نعمت ملتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔{ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ } ۔

(النحل: 53) اور دوسرا اہم درس اس ارشاد سے یہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کی بخشی ہوئی ان گونا گوں نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور ان پر دل و جان سے اس واہب مطلق کا شکر ادا کرے۔ وبِاللّٰہِ التوفیق لمایُحِبُّ وَیُرِید وعلی مایحب ویرید۔ (مدنی کبیر)

حلال

حلال سے مراد وہ چیزیں ہیں جو شریعت میں حرام نہ ہوں۔ حرام چیزوں کی تین قسمیں ہیں:

1۔ بذات خود حرام ہو جیسے کتا اور گدھا وغیرہ۔

2۔ کسی حادثہ کی وجہ سے حرام ہو جیسے مردار مرغی اور مردار بکری وغیرہ۔

3۔ حصول کا طریقہ حرام ہو جیسے رشوت اور چوری وغیرہ کا مال۔

طیب

طیب سے مراد عمدہ اور پاکیزہ چیزیں ہیں جو گلی سڑی اور گندی نہ ہوں۔ بعض چیزیں حلال ہوتی ہیں مگر بہت پرانی یا کسی اور عارضہ کی وجہ سے ان کا رنگ، ذائقہ اور اثر بدل جاتا ہے اور ان کا استعمال طبیعت اور صحت دونوں کے لیے مضر ہو سکتا ہے لہٰذا ان سے اجتناب کیا جائے۔
اس آیت میں حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو چیزیں حلال ہیں انھیں کھا جاؤ، ایسا نہیں۔ حکم یہ ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ یعنی ساری نہ کھا جاؤ بلکہ جو ضرورت ہے اور جتنا ضرورت ہے اتنا کھاؤ۔ اسراف یعنی ضائع اور فضول خرچی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ان میں سے کچھ صدقہ و خیرات بھی کرو۔ (امداد)

افضل یہ ہے کہ کبھی نفس کے جائز تقاضوں کو پورا کرے اور کبھی نہ کرے

ہر چند کہ اس آیت میں اللہ کے دیئے ہوئے حلال رزق سے کھانے کا ذکر ہے، لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی تمام نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو۔ اس میں کھانے پینے کے علاوہ لباس، مکان، سواری اور ازدواج کی نعمتیں شامل ہیں اور بالخصوص کھانے پینے کی نعمتوں کا اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ یہ انسان کی اولین اور بنیادی ضرورت ہے۔ کھانے اور لباس میں لذائذ اور مرغوبات کے متعلق بعض علماء کا یہ نظریہ ہے کہ ان کو ترک کرنا اور ان سے اعراض کرنا افضل ہے، تاکہ انسان نفسانی خواہشوں کا غلام نہ بن جائے اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جب اللہ نے انسان کو وسعت دی ہو تو اس کو توسع اختیار کرنا چاہیے۔ لذیذ کھانے، عمدہ لباس، خوبصورت مکان اور اعلیٰ درجہ کی سواریوں سے متمتع ہونا چاہیے اور اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے۔ اور حق داروں کے حقوق کو ادا کرتا رہے، تاہم توسط اور اعتدال زیادہ پسندیدہ ہے۔ کبھی مرغوبات نفسی سے حظ حاصل کرے اور کبھی نفس کے تقاضوں کو پورا نہ کرے، تاکہ فقر اور غنا کے دونوں مرتبوں کا جامع ہو جائے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گھر میں جو مل جاتا تھا وہ آپ کھا لیتے تھے۔ کبھی گوشت اور میٹھی چیزوں کی طرح عمدہ اور لذیذ طعام تناول فرماتے اور کبھی بہت سادہ کھانا کھاتے۔ آپ نمک ' زیتوں کے تیل یا سرکہ کے ساتھ جو کی روٹی کھا لیتے تھے۔ کبھی آپ بھوکے رہتے اور پیٹ پر دو دو پتھر باندھ لیتے اور کبھی سیر ہو کر کھانا تناول فرماتے۔ غرض آپ کی سیرت طیبہ میں تنگ دست اور خوش حال اور غنی اور فقیر سب کے لیے نمونہ ہے۔ آپ طعام سے زیادہ مشروبات کا اہتمام کرتے تھے اور آپ کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہت پسند تھا ' اور آپ ہر حال میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ خرچ کم کرتے تھے اور نہ فضول خرچ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ :

(آیت) "لینفق ذوسعۃ من سعتہ ومن قدر علیہ رزقہ فلینفق مما اتہ اللہ لا یکلف اللہ نفسا الا ما اتہا"۔ (الطلاق : ۷)

ترجمہ : صاحب حیثیت کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جو تنگ دست ہو وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ ہر شخص کو اس کے مطابق مکلّف کرتا ہے جتنا اس کو دیا ہے۔

روایت ہے کہ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مرغی اور فالودہ نوش فرماتے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میٹھی چیز کو پسند فرماتے تھے اور شہد بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مرغوب تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مومن شیریں زبان ہوتا ہے اور شیریں چیز کو پسند کرتا ہے۔

حضرت حسن (رح) سے ہے کہ آپ کو کسی دعوت میں بلایا گیا۔ آپ کے ساتھ فرقد سنجی اور ان کے ہمراہی بھی تھے سب دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ انواع واقسام کے کھانے تھے جن میں مرغی اور فالودہ بھی تھے تو فرقد سنجی ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تو حضرت حسن نے فرمایا کیا فرقد روزے سے ہیں۔ عرض کیا نہیں لیکن وہ ایسے اطعمہ وانعمہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ تو حسن (رح) آگے بڑھے اور فرمایا اے فرقد شہد اور آش جو گھی کے ساتھ کھانا تمہیں ناپسند ہے اور اس کی کراہت کوئی مسلمان کر سکتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ سے عرض کیا گیا کہ فلاں فالودہ نہیں کھاتا اور کہتا ہے اتنی نعمت کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا تو حضرت حسن نے فرمایا کیا وہ ٹھنڈا پانی پیتا ہے عرض کیا ہاں۔ فرمایا پھر وہ جاہل ہے اللہ کی نعمتوں سے تو سرد پانی بھی نعمت ہے اور فالودہ سے بڑی نعمت ہے۔ (تفسیر نسفی)

علامہ آلوسی (رح) اپنی تفسیر روح المعانی میں ایک طویل روایت نقل فرماتے ہیں اس کا ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک روز قیامت اور آخرت کے واقعات بیان فرمائے جن کو سن کر صحابہ کرام پر اس قدر رقت پیدا ہو گئی کہ صحابہ روتے جاتے تھے۔ ان کے دلوں پر عجیب وغریب کیفیت تھی۔

دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجتماع حضرت عثمان بن مظعون کے مکان پر ہوا۔ جن میں حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت علی المرتضٰی۔ عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عبداللہ بن عمرو۔ حضرت ابوذر غفاری۔ حضرت ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم۔ حضرت مقداد بن اسود۔ حضرت سلمان فارسی۔ حضرت معقل بن مقرن اور عثمان شامل تھے۔ ان سب حضرات نے متفقہ فیصلہ کیا کہ

"ہم سب تارک الدنیا ہو جائیں گے۔ ٹاٹ کا لباس پہن لیں گے۔ ہمیشہ روزے رکھیں گے رات بھر نماز میں رہیں گے۔ بستر پر آرام نہ کریں گے۔ گوشت اور چربی نہیں کھائیں گے۔ عورتوں اور خوشبو کے قریب نہیں جائیں گے۔ "

جیسے ہی اس کی اطلاع حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہنچی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عثمان بن مظعون کے مکان پر تشریف لائے۔ اس وقت مکان پر سوائے حضرت خولہ ام حکیم بنت ابی امیہ جو حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی تھیں کے سوا کوئی موجود تھا

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت خولہ زوجہ محترمہ حضرت عثمان سے اس اجتماع اور فیصلے کے بارے میں دریافت فرمایا۔ حضرت خولہ نے عرض کیا کہ اگر عثمان نے یہ بات آپ سے عرض کی ہے تو درست ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واپس قیام گاہ پر تشریف لے آئے۔ حضرت عثمان جب اپنے مکان پر پہنچے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری کی خبر پائی۔ فوراً بمعہ رفقاء کے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے یہ فیصلے کئے ہیں۔

حضرت ابن مظعون اور ان کے سب رفقاء نے اقرار کیا اور عرض کیا کہ ان فیصلوں سے ہمارا مقصد صرف نیکی ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا مجھے ان باتوں کا حکم نہیں دیا گیا پھر فرمایا تم پر تمہاری جانوں کا حق ہے۔ روزے رکھو لیکن ناغہ بھی کرو۔ رات کی عبادت میں قیام کرو اور نیند بھی لو میں رات کے حصہ میں اٹھتا ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور کچھ حصہ میں سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں۔ گوشت اور چکنائی بھی کھاتا ہوں اور بیویوں سے قربت بھی کرتا ہوں جو میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔

پھر عام اجتماع سے خطاب فرمایا۔ ارشاد فرمایا۔

کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو۔ کھانے کو۔ خوشبو کو۔ نیند کو۔ دنیوی خواہشات کو بالکل حرام قرار دے رکھا ہے۔ میرے دین میں گوشت چکنائی عورتوں کو ترک کر دینے کا حکم نہیں لار ھبانیۃ فی الاسلام میری امت کی سیاحت روزہ اور ان کی رہبانیت صرف جہاد ہے اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دو۔ حج کرو۔ نمازیں قائم کرو۔ زکوۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو اور سیدھی چال چلو تمہارے امور درست ہو جائیں گے۔

تم سے پہلے لوگ شدت پسندی کی وجہ سے ہی تباہ ہوئے انھوں نے اپنے اوپر سختیاں خود ہی عائد کیں تو اس کے بعد ان لوگوں پر اللہ نے بھی سختیاں کر دیں۔ گرجاؤں اور یہودی کنیساؤں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہی کے پسماندہ نشانات ہیں۔ اس پر یہ آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

آگے ارشاد ہے۔

حد سے تجاویز نہ کرو جو شریعت نے حلال و حرام کے ساتھ تم پر لگا دی ہے یا یہ معنی ہیں کہ جس حد تک حلال ہیں اس سے متجاوز ہو کر حرام تک نہ بڑھو اور فضول خرچی پاک چیزوں کے استعمال میں نہ کرو۔ (نسفی) اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

وکلوامما رزقکم اللہ حلٰلاً طیباً اور جو چیزیں اللہ نے حلال فرمائیں انھیں کھاؤ اور اس میں اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو اس لیے کہ ایمان لانے سے تقویٰ واجب ہو جاتا ہے اور تقویٰ مقتضی اطاعت بامر اللہ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آیت: **وکلوا مما رزقکم اللہ حللا طیبا** اس میں ایک مسئلہ ہے۔ الاکل سے مراد کھانے، پینے، پہنے اور سونے سے فائدہ اٹھنا ہے۔ اکل (کھانے) کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ مقصود اعظم ہے اور انسان کے انتفاعات میں سے خاص ہے۔ کھانے، پینے اور پہننے کا ذکر سورۃ اعراف میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

رہی لذت امیز اشیاء کی شہوت، اور شہوت والی چیزوں کی طلب میں نفس کا جھگڑ نا ان پر لوگوں کے نفس کو قدرت دینے میں مذاہب مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نفس کو شہوات کی اتباع سے روکنا بہتر ہے تاکہ وہ انسان کا مطیع ہو جائے گا اور اس کے عناد کو روندنا آسان ہو جائے، کیونکہ جب وہ نفس کو اس کی مراد عطا کرے گا تو بہت زیادہ شہوات میں چلنے والا ہوگا اور شہوات کا مطیع ہوگا۔ حکایت ہے کہ ابو حازم پھلوں کے اوپر سے گزرے تو

نفس نے اس کی خواہش کی، ابو حازم نے نفس کو کہا: تیرے وعدہ کی جگہ جنت ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: نفس کو لذات پر قدرت دینا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کے ارادہ کو پانے کے ساتھ نشاط اور چستی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: توسط اولیٰ ہے۔
کیونکہ کبھی نفس کو خواہش پوری کرنا اور کبھی پوری نہ کرنا دونوں امروں کو جمع کرنا ہے اور یہ بغیر کسی عیب کے نصف ہے۔(قرطبیؒ)
طیبت۔ جمع طیبہ کی ہے۔ طیب کے معنی عمدہ اور اعلیٰ چیز۔ نکھار دی ہوئی چیز۔ پسندیدہ چیز۔
واتقوا اللہ الذی انتم بہ مومنون۔ تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود میں رہا جائے۔ حلال و طیب روزی تقویٰ کے لیے کھاؤ کیونکہ عبادت کی روح اور عبادت کا نور اکل حلال اور صدق مقال ہے۔ اس کے بعد احکام قسم اور اقسام یمین کی تفصیل اور اس کی تشریح بیان ہوئی حیث قال تعالیٰ۔ (حسنات)

اکل طیبات کیلئے دو شرطیں

سو ارشاد فرمایا گیا کہ تم لوگ کھاؤ پیو پاکیزہ چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ۔ سو اکل طیبات کیلئے تو دو شرطیں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز حلال ہو حرام نہ ہو۔ اور دوسری یہ کہ حلال ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پاکیزہ بھی ہو۔ اسمیں کوئی ناپاک چیز شامل نہ ہو۔ تو جب حلال و پاکیزہ چیزیں بیشمار ہیں اور ان کو کھانے اور استعمال کرنے کی تمہیں اجازت بھی ہے۔ اور حرام چیزیں اس کے مقابلے میں بہت تھوڑی اور گنی چنی تو پھر تم لوگوں کو ان حلال اور پاکیزہ چیزوں کو چھوڑ کر ناپاک اور ممنوع و محذور چیزوں کی طرف لپکنے اور ہاتھ بڑھانے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ؟۔ پس تم لوگوں کیلئے صحت و سلامتی کی راہ یہی ہے کہ تم اپنے خالق و مالک کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر حلال اور پاکیزہ چیزوں سے استفادہ کرو۔ اور اس پر اس واہب مطلق کا شکر ادا کرو۔ سبحانہ و تعالیٰ ۔(مدنی کبیر)

تقویٰ و پرہیز گاری ایمان کا تقاضا

ارشاد فرمایا گیا کہ تم لوگ ہمیشہ ڈرتے رہا کرو اس اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو کہ تمہارے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ تم ہمیشہ اور ہر حال میں اس وحدہ لاشریک سے ڈرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ ورنہ ایمان کا دعویٰ محض زبانی جمع خرچ ہو گا جس سے اصل مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ۔ سو تقویٰ و پرہیز گاری ایمان کا لازمی تقاضا اور ثبوت ہے۔ اسی لیے یہاں پر اس کو ایمان کیلئے شرط قرار دیا گیا۔ وباللّٰہِ التوفیق ۔ سو ارشاد فرمایا گیا کہ تم ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو اگر تم لوگ واقعی ایماندار ہو۔ وباللّٰہِ التوفیق۔ سو تقویٰ و پرہیز گاری سے محرومی کی صورت میں ۔ والعیاذ باللہ۔ ایمان و یقین کا دعویٰ محض زبانی جمع خرچ بن کر رہ جائے گا۔ والعیاذ باللہ العظیم (مدنی)

یاد رہے حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ پیو۔ مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ نیک اعمال سے غافل نہ رہو۔ دنیا مثل صفر کے ہے اگر دین سے خالی ہو تو بے کار اور اگر دین کے ساتھ ہو تو اسے دس گنا کر دیتی ہے۔ (نور العرفان)

آیت مبارکہ:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

لغۃ القرآن: [لَا : نہیں][يُؤَاخِذُكُمُ : پکڑے گا تمہیں][اللّٰهُ : اللہ][بِاللَّغْوِ : ساتھ فضول][فِيْٓ: میں][اَيْمَانِكُمْ : قسمیں تمہاری][وَلٰكِنْ : اور لیکن][يُّؤَاخِذُكُمْ : وہ پکڑے گا تم کو][بِمَا : ساتھ جو][عَقَّدْتُّمُ : تم نے پختہ کیں][الْاَيْمَانَ : قسمیں][فَكَفَّارَتُهٗٓ: اس کا کفارہ][اِطْعَامُ : کھاناکھلانا][عَشَرَةِ : دس][مَسٰكِيْنَ : مساکین][مِنْ : سے][اَوْسَطِ : درمیانہ درجہ][مَا : جو][تُطْعِمُوْنَ : تم کھلاتے ہو][اَهْلِيْكُمْ : اپنے اہل کو][اَوْ كِسْوَتُهُمْ : یا انہیں پہنانا ہے][اَوْ تَحْرِيْرُ: یا آزاد کرنا][رَقَبَةٍ: گردن][فَمَنْ : پھر جو][لَّمْ يَجِدْ : نہ وہ پائے][فَصِيَامُ : پھر روزے][ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ : تین دن (جمع)][ذٰلِكَ : وہ][كَفَّارَةُ : کفارہ][اَيْمَانِكُمْ : تمہاری قسمیں][اِذَا : جب][حَلَفْتُمْ : تم قسمیں اٹھاؤ] [وَاحْفَظُوْٓا : اور حفاظت کرو][اَيْمَانَكُمْ : اپنی قسمیں][كَذٰلِكَ : اسی طرح][يُبَيِّنُ : وہ بیان کرتا ہے][اللّٰهُ : اللہ][لَكُمْ : تمہارے لیے][اٰيٰتِهٖ : اپنی نشانیاں][لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم][تَشْكُرُوْنَ : تم شکر کرو]

ترجمہ: اللہ تمہاری بے مقصد (اور غیر سنجیدہ) قسموں میں تمہاری گرفت نہیں فرماتا لیکن تمہاری ان (سنجیدہ) قسموں پر گرفت فرماتا ہے جنہیں تم (ارادی طور پر) مضبوط کرلو، (اگر تم ایسی قسم کو توڑ ڈالو) تو اس کا کفّارہ دس مسکینوں کو اوسط (درجہ کا) کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا (اسی طرح) ان (مسکینوں) کو کپڑے دینا ہے یا ایک گردن (یعنی غلام یا باندی کو) آزاد کرنا ہے، پھر جسے (یہ سب کچھ) میسر نہ ہو تو تین دن روزہ رکھنا ہے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفّارہ ہے جب تم کھالو (اور پھر توڑ بیٹھو)، اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں خوب واضح فرماتا ہے تاکہ تم (اس کے احکام کی اطاعت کرکے) شکر گزار بن جاؤ.

تشریح:

جس طرح اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام ٹھہرانا ناجائز ہے اس طرح اللہ کے عظیم نام کو غلط استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان پر یہ بھی کرم ہے کہ وہ اپنے نام کو بے وجہ استعمال کرنے کے باوجود اس پر گرفت نہیں کرتا۔ لغو کا معنی بے ہودہ، بے وجہ اور بلاارادہ ہے۔ البتہ لغو کام اور بات سے منع کیا گیا ہے۔ عزم اور شعوری طور پر اٹھائی ہوئی قسم پر مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عظیم اور مقدس نام کی لاج رکھنا مسلمان پر فرض ہے۔ انسان کی جبلت میں یہ بات شامل ہے کہ جب اپنی بات کو موثر اور مضبوط کرنا چاہتا ہے تو شواہد اور دلائل کے ساتھ کسی عزیز یا محترم چیز کی قسم اٹھایا کرتا ہے تاکہ سننے والا اس کی بات پر اعتماد اور یقین کرلے۔ اس لیے ہر دور کے مشرک اپنے باطل خداؤں کی قسمیں اٹھایا کرتے ہیں۔ نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طریقہ گفتگو کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ بلاوجہ قسمیں اٹھانے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر قسم اٹھانا ناگزیر ہو تو غیر اللہ کی قسم اٹھانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھانا چاہیے۔ دوسری طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بات کو بہت ہی برا جانا ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کو دنیاوی فائدے اور محض ڈھال کے طور پر استعمال کرے۔ قسم اٹھانا در حقیقت اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانے کے مترادف ہے اس لیے آدمی کو حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ منہ سے نکلی ہوئی قسم اور بات کی پاسداری کرے قسم کے لیے یمین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی دایاں ہاتھ ہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ حلف اٹھاتے وقت ایک دوسرے کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا کرتے تھے جس سے قسم اٹھانے والا اپنی بات کو قوی اور موکد کیا کرتا تھا۔

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ لغو قسموں سے مراد ایسی قسمیں ہیں جو انسان تاکید کلام کے طور پر کہتا ہے جیسے لا واللہ۔ وغیرہ (رواہ البخاری: کتاب التفسیر) (فہم)

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ لغو قسموں سے مراد ایسی قسمیں ہیں جو انسان تاکید کلام کے طور پر کہتا ہے جیسے لا واللہ۔ وغیرہ (رواہ البخاری: کتاب التفسیر)

کفارہ کا لفظ

کفّارہ کا لفظ کفر سے مشتق ہے کفر کا ایک معنی ستر ڈھانپنا ہے۔ قسم توڑنے کی وجہ سے جس گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے کفارہ اس گناہ کو ڈھانپ دیتا ہے۔

(عن ابن عمر (رض) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یَنْھٰکُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِاٰبَآءِکُمْ مَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ اَوْ لِیَصْمُتْ) [رواہ البخاری : کتاب الشادات، باب کیف یستحلف]

”حضرت عبداللہ بن عمر (رض) ہی بیان کرتے ہیں : رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ تم اپنے باپ داداکے نام کی قسمیں کھاؤ۔ جسے قسم اٹھانی ہو وہ اللہ کے نام کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے۔“

(عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلِفِہٖ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِہٖ تَعَالَ اُقَامِرْکَ فَلْیَتَصَدَّقْ) [رواہ البخاری : کتاب التفسیر، باب افرایتم اللات والعزی]

”حضرت ابوہریرہ (رض) نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کافرمان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے لات وعزیٰ کی قسم کھائی وہ دوبارہ لاالٰہ الااللہ پڑھے اور جس نے اپنے ساتھی سے کہاکہ آؤجوا کھیلیں ‘ وہ صدقہ کرے۔“

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ آدمی کے بہترین اسلام کی نشانی یہ ہے کہ وہ فضول یعنی لاحاصل باتوں کو چھوڑدے۔“ [رواہ الترمذی : کتاب الزہد]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہاری وہی قسم قابل اعتماد ہوگی جس کی تصدیق قسم لینے والا کرے گااور عمرو (رض) نے کہاکہ تمہاری تصدیق تمہاراساتھی کرے گا۔“ [رواہ مسلم : باب یمین الحالف علیٰ نیۃ المستحلف]

شان نزول

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلمی رحمہم اللہ کی روایت سے بیان کیاکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ (رض) نے ایک مہمان کی ضیافت پر اپنے گھر والوں کو مامور کیااور کھانے کے وقت خود بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہوگئے جب رات گئے کو گھر پہنچے تو دیکھاکہ ان کے انتظار میں مہمان اور گھر والے بیٹھے ہیں اور مہمان کو کھانا نہیں کھلایا۔ توابن رواحہ نے بیوی سے کہاکہ تم نے میری وجہ سے مہمان کو کھانا نہیں کھلایااب مجھ پر یہ کھانا حرام ہے۔ بیوی نے کہاکہ مجھ پر بھی یہ کھانا حرام ہے۔ مہمان نے کہاکہ مجھ پر بھی حرام ہے۔ حضرت ابن رواحہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو قسم کو توڑدیااور کھانے میں ہاتھ ڈال کر کہابسم اللہ پڑھ کر سب کھاؤ پھر دربار نبوی میں حاضر ہو کر تمام واقعہ پیش کیاتواس واقعہ کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (حسنات)

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمٰنِکُمْ : اللہ تمہیں تمہاری فضول قسموں پر نہیں پکڑے گا۔ } اس سے پہلی آیت میں بیان ہوا کہ صحابہ کرام (رض) کی ایک جماعت نے کھانے پینے کی چند حلال چیزیں اور کچھ لباس اپنے اوپر حرام کرلیے اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی، مزید یہ کہ اس پر انھوں نے قسمیں بھی کھالیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اس چیز سے منع کیاتو انھوں نے عرض کی : یارسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اب ہم اپنی قسموں کا کیا کریں ؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس میں قسم کے احکام بیان کئے گئے۔

قسم کی اقسام

قسم کی تین قسمیں ہیں: (1)۔۔یمینِ لَغْو یعنی غلط فہمی کی قسم، یہ وہ قسم ہے کہ آدمی کسی واقعہ کو اپنے خیال میں صحیح جان کر قسم کھالے اور حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو، ایسی قسم پر کفارہ نہیں۔

(2)۔۔یمینِ غَمُوس یعنی جھوٹی قسم، کسی گزشتہ واقعے کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا، یہ حرام ہے۔

(3)۔۔یمینِ مُنعقدہ، جو کسی آئندہ کے معاملے پر اسے پورا کرنے یا پورا نہ کرنے کیلئے کھائی جائے، کسی صحیح معاملے پر کھائی گئی ایسی قسم توڑنا منع بھی ہے اور اس پر کفارہ بھی لازم ہے۔ قسم کی تیسری صورت پر ہی کفارہ لازم آتا ہے۔

قسم کا کفارہ

یہاں آیتِ مبارکہ میں قسم کا کفارہ بیان کیا گیا ہے اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ اگر کوئی قسم توڑے تو ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر درمیانے درجے کا کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کی اجازت ہے اور اگر تینوں میں سے کسی کی بھی طاقت نہ ہو تو مسلسل تین روزے رکھنا کفارہ ہے۔ (صراط)

حضرت امام ابو حنیفہ (رح) نے ارشاد فرمایا اللہ کی جن صفات کی عرفاً قسم کھائی جائے ان کی قسم سے انعقاد قسم ہوگا جیسے اللہ کی عزت کی قسم عظمت و بزرگی کی قسم وغیرہ وغیرہ ہو۔

قسم دو قسم پر ہے ایک یمین لغو دوسرے یمین منعقدہ۔ یمین لغو میں غلط فہمی کی قسم سے لے کر تمہارے سر کی قسم۔ تمہاری جان کی قسم۔ قرآن کی قسم وغیرہ سب داخل ہیں۔ اللہ کی قسم۔ رسول کی قسم۔ غوث پاک کی قسم اور غلط فہمی یہ کہ آدمی کسی واقعہ کو اپنے خیال میں صحیح جان کر قسم کھالے اور وہ ایسا نہ ہو ایسی قسم کی قسموں پر کفارہ نہیں۔

اور یمین منعقدہ یہ کہ کسی آئندہ امر پر قصد کرکے قسم کھائی جائے ایسی قسم توڑنا گناہ بھی ہے اور اس پر کفارہ بھی لازم ہے۔ کفارہ دس مسکینوں کو دونوں وقت کھانا کھلانا ضروری ہے یا پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو صدقہ فطر کی طرح دے دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایک مسکین کو دونوں وقت دس دن کھلادے یا دے دے اوسط درجہ کے معنی یہ ہیں کہ کھانا نہ اعلیٰ ہو نہ بالکل ادنیٰ ہو بلکہ متوسط درجہ کا ہو۔ اوسط درجہ کے کپڑے سے مراد یہ ہے کہ اکثر بدن ڈھک سکے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ ایک تہ بند اور کرتہ یا ایک تہ بند اور ایک چادر ہو۔ کفارہ میں ان تینوں باتوں کا اختیار ہے خواہ کھانا دے خواہ کپڑا خواہ غلام آزاد کرے ہر ایک سے کفارہ ادا ہو جائے گا اور جب استطاعت نہ ہو تو تین دن روزے رکھے۔

اس میں یہ شرط ضروری ہے کہ تین روزے متواتر رکھے جائیں ورنہ کفارہ ادا نہ ہوگا۔ (تفسیر نسفی)

قسم کے کفارے کے چند مسائل

قسم کے کفارے سے متعلق چند مسائل یاد رکھیں:

(1)-- مسکینوں کو کھانا کھلانے کی بجائے انھیں صدقہ فطر کی مقدار بھی دے سکتا ہے۔

(2)-- یہ بھی جائز ہے کہ ایک مسکین کو دس روز دیدے یا کھلا دیا کرے۔

(3)-- بہت گھٹیا قسم کا کھانا کھلانے کی اجازت نہیں، درمیانے درجے کا ہونا چاہیے۔

(4)-- مسکینوں کو کپڑے پہنائے تو وہ بھی درمیانے درجے کے ہونے چاہئیں اور درمیانے درجے کے وہ ہیں جن سے اکثر بدن ڈھک سکے اور درمیانے درجے کے لوگ پہنتے ہوں یعنی سوٹ بہت گھٹیا نہ ہو اور تین مہینے تک چل سکتا ہو۔

(5)-- روزہ سے کفارہ جب ہی ادا ہو سکتا ہے جب کہ کھانا کھلانے، کپڑا دینے اور غلام آزاد کرنے کی قدرت نہ ہو۔

(6)-- روزے رکھنے کی صورت میں ضروری ہے کہ یہ روزے مسلسل رکھے جائیں۔

(7)-- کفارہ قسم توڑنے سے پہلے دینا درست نہیں۔

وَاحْفَظُوا اَيْمٰنَكُمْ : اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ } قسم کی حفاظت کا حکم ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں پورا کرو اگر اس میں شرعاً کوئی حرج نہ ہو اور یہ بھی حفاظت ہے کہ قسم کھانے کی عادت ترک کی جائے۔ (صراط)

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کا کیا کہنا۔ بندہ جرم کرکے اپنے نامہ اعمال کو داغدار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس داغ کو ڈھانپنے کی ایسی میٹھی سزا تجویز کرتا ہے جس سے اس کا جرم بھی چھپ جاتا ہے اور مسکینوں کو کھانا یا کپڑے دینے کی صورت میں غریب پروری کے صلے میں ان کی دعائیں لیتا ہے اور روزے رکھنے کی صورت میں روزے کی برکتوں سے فیضیاب ہوتا ہے۔ مثلاً حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"روزہ دار کے منہ سے جو بو آتی ہے بارگاہ خداوندی میں وہ کستوری سے بھی زیادہ محبوب ہے۔" (مسلم: کتاب الصیام) سبحان اللہ! بندہ ایک طرف اپنے گناہ معاف کرا رہا ہے اور دوسری طرف اس کے منہ کی بو خدا کے قرب اور خوشنودی کا سبب بن رہی ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

یمین کا لغوی اور اصطلاحی معنی

یمین کے از روئے لغت تین معنی ہیں۔ (۱) قوت ' (۲) داہنا ہاتھ (۳) قسم۔

یمین بہ معنی قوت اس آیت میں ہے:

(آیت) "ولو تقول علینا بعض الاقاویل، لاخذنا منہ بالیمین"۔ (الحاقہ: ۴۵-۴۴)

ترجمہ: اور اگر وہ (رسول) کوئی بھی بات ہم پر بنا کر اپنی طرف سے کہتے تو ہم ان کو پوری قوت سے پکڑ لیتے۔

یمین کا معنی داہنا ہاتھ بھی اس وجہ سے ہے کہ اس میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ یمین بہ معنی دایاں ہاتھ اس آیت میں ہے:

(آیت) "واما ان کان من اصحب الیمین، فسلم لک من اصحب الیمین"۔ (الواقعہ: ۹۱-۹۰)

ترجمہ: اور اگر وہ (مرنے والا) دائیں طرف والوں سے ہو (تو اس سے کہا جائے گا) تجھ پر سلام ہو (تو) دائیں طرف والوں سے ہے۔

یمین کا تیسرا معنی قسم ہے جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے اور قسم پر یمین کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے کے لیے حلف اٹھاتے تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے۔ نیز قسم کے ذریعہ سے قسم کھانے والا اپنے کلام کو قوی اور موکد کرتا ہے۔

قسم کھانے کا جواز اور مشروعیت

قسم کھانا مشروع ہے ٗکیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود بھی قسم کھائی ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی قسم کھانے کا حکم دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے کی یہ چند مثالیں ہیں:

(آیت) "والنجم اذا ھوی"۔ (النجم: ١)

ترجمہ روشن ستارے کی قسم جب وہ غروب ہوا۔

(آیت) "لااقسم بھذاالبلد"۔ (البلد: ١)

ترجمہ: میں اس شہر کی قسم فرماتا ہوں۔

(آیت) "والشمس وضحھا"۔ (الشمس: ١)

ترجمہ: سورج اور اس کی چمک کی قسم۔

(آیت) "والضحی واللیل اذا سجی"۔ (الضحی: ٢۔١)

ترجمہ: چاشت کی قسم اور رات کی قسم جب وہ (تاریکی کا) پردہ ڈالے۔

اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان آیات میں قسم کھانے کا حکم دیا ہے:

(آیت) "ویستنبؤنک احق ھو قل ای وربی انہ لحق وماانتم بمعجزین"۔یونس: ٥٣)

ترجمہ: اور آپ سے پوچھتے ہیں کیا واقعی وہ (دائمی عذاب) برحق ہے؟آپ کہیے ہاں میرے رب کی قسم وہ برحق ہے اور تم (میرے رب کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

(آیت) "قال الذین کفروالا تاتینا الساعۃ قل بلی وربی لتاتینکم عالم الغیب"۔ (سبا: ٣)

ترجمہ: اور کافروں نے کہا ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔آپ کہیے میرے رب عالم الغیب کی قسم وہ ضرور تم پر آئے گی۔

(آیت) "زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلی وربی لتبعثن"۔ (التغابن: ٧)

ترجمہ: کافروں نے اپنے فاسد گمان سے کہا: وہ مرنے کے بعد ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے ٗآپ کہیے کیوں نہیں! میرے رب کی قسم: تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

احادیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قسم کھانے کا ذکر ہے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گئے اور آپ سے سواری طلب کی۔آپ نے فرمایا تمہیں سوار کرنے کے لیے میرے پاس سواری نہیں ہے۔خدا کی قسم میں تم کو سوار نہیں کروں گا ٗپھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہماری طرف چتکبرے کوہان والے تین اونٹ بھیجے۔ہم نے کہا ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سواری طلب کرنے گئے تھے تو آپ نے قسم کھائی تھی کہ ہم کو سواری نہیں دیں گے ٗہم نے آپ کے پاس جا کر آپ کو اس قسم کی خبر دی ٗآپ نے فرمایا میں جب بھی کسی چیز کی قسم کھاتا ہوں پھر اس کے غیر کو بہتر سمجھتا ہوں تو میں وہی کرتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم ٗالایمان ١٠

(۱۶۴۹) ۱۹۰ ۴ ' صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ' ۴۳۸۵ ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ' ۵۵۵۷ ' سنن نسائی ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ' ۳۷۸۰ ' مسند احمد ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ' ۱۹۵۳۶)

جھوٹ کا خدشہ نہ ہو تو زیادہ قسمیں کھانے کا جواز

فقہاء کے نزدیک ہرچند کہ قسم کھانا مباح ہے لیکن کثرت قسم کھانا مکروہ ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ قسم کھانے کی مذمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) "۔**ولا تطع کل حلاف مھین**"۔ (القلم : ۱۰)

ترجمہ : اور آپ کسی ایسے شخص کی بات نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا 'انتہائی ذلیل ہے۔

لیکن اگر بہ افراط قسمیں نہ کھائی جائیں تو پھر قسم کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ بلا کراہت جائز ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قسم کھانا مطلقاً مکروہ ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "**ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم**"۔ (البقرہ : ۲۲۴)

ترجمہ : اور اللہ (کے نام) کو تم اپنی قسموں کے لیے بہانہ نہ بناؤ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت قسم کھاتے تھے 'بعض اوقات ایک حدیث میں کئی قسمیں ہوتی ہیں۔

آپ نے خطبہ کسوف میں فرمایا اے محمد کی امت اللہ کی قسم اللہ سے زیادہ اس پر کوئی غیرت دار نہیں ہے کہ اس کا بندہ زنا کرے یا اس کی بندی زنا کرے 'اے امت محمد اللہ کی قسم اگر تم وہ چیزیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور روؤ زیادہ۔ (صحیح البخاری 'ج ا رقم الحدیث : ۱۰۴۴ ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت)

آپ نے ترک دنیا کو ارادہ کرنے والے صحابہ سے فرمایا سنو : خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں ' لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں اور میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ (صحیح البخاری 'ج ٦ رقم الحدیث : ۵۰٦۳)

آپ نے ابو طالب سے اس کے مرتے وقت فرمایا سنو اللہ کی قسم میں تمہارے لیے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے تمہاری استغفار سے منع نہ کیا جائے (صحیح البخاری 'ج ۲ رقم الحدیث : ۱۳٦۰)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی قسم میں ضرور قریش سے جنگ کروں گا 'اللہ کی قسم ! میں ضرور قریش سے جنگ کروں گا 'اللہ کی قسم ! میں ضرور قریش سے جنگ کروں گا۔ پھر فرمایا انشاء اللہ (سنن ابو داؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۲۸۵)

اس ایک حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین بار قسم کھائی ہے۔

اور بہ افراط قسمیں کھانا اس لیے مکروہ ہے کہ اس میں یہ خدشہ ہے کہ انسان کسی جھوٹ پر اللہ کی قسم کھالے اور مانعین نے جو آیت پیش کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ان کی دلیل نہیں ہے 'کیونکہ پوری آیت اس طرح ہے :

(آیت) "**ولا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم ان تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس**"۔ (البقرہ : ۲۲۴)

ترجمہ: اور اللہ (کے نام) کو تم اپنی قسموں کے لیے بہانہ نہ بناؤ جن سے مقصد نیکی ' خداخوفی اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے باز رہنا ہو۔ یعنی کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ وہ نیکی نہیں کرے گا ' خداخوفی نہیں کرے گا اور لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرائے گا ' پھر اور نیک کاموں سے یہ کہہ کر باز رہے کہ میں تو یہ کام کرنے کی قسم کھا چکا ہوں ' سوای سے شخص پر لازم ہے کہ وہ نیکی کرکے قسم توڑنے اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے کسی چیز کی قسم کھائی پھر وہ اس چیز کے خلاف کرنے کو بہتر جانے تو وہ اس قسم کے خلاف کرے اور اس قسم کا کفارہ دے۔ (صحیح مسلم ' ایمان ' ۱۱ ' (۱۶۵۰) ۴۱۹۲)

فی نفسہ قسموں کی اقسام

فی نفسہ قسموں کی پانچ اقسام ہیں۔ واجب ' مستحب ' مباح ' مکروہ اور حرام:
واجب: اگر کسی بے قصور مسلمان کو قتل یا ہلاکت سے بچانا قسم کھانے پر موقوف ہو تو قسم کھانا واجب ہے۔
حضرت سوید بن حنظلہ (رض) بیان کرتے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارادہ سے نکلے ' ہمارے ساتھ حضرت وائل بن حجر (رض) بھی تھے ' ساتھیوں نے قسم کھانے میں ناگواری محسوس کی اور میں نے قسم کھالی کہ یہ میرے بھائی ہیں تو دشمن نے ان کو چھوڑ دیا۔ پس ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے ' میں نے بتایا کہ ساتھیوں نے قسم کھانے میں ناگواری محسوس کی تھی ' اور میں نے قسم کھالی کہ یہ میری بھائی ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا: مسلمان ' مسلمان کا بھائی ہے۔ (سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث: ۳۲۵۶ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث: ۲۱۱۹ ' مسند احمد ' ج ۵ ' رقم الحدیث: ۱۶۷۲۶ ' طبع دارالفکر مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۷۹ ' طبع قدیم)
مستحب: جب دو مسلمانوں میں رنجش ہو اور ان میں صلح کرانا قسم کھانے پر موقوف ہو ' یا کسی مسلمان کے دل سے کینہ کو زائل کرنا قسم کھانے پر موقوف ہو ' یا کسی شر کو رفع کرنا قسم کھانے پر موقوف ہو ' تو ان صورتوں میں قسم کھانا مستحب ہے۔ اسی طرح کسی عبادت کے کرنے پر کسی گناہ کے ترک کرنے پر قسم کھانا مستحب ہے۔
مباح: کسی مباح کام کرنے کے یا اس کو ترک کرنے پر قسم کھانا مباح ہے ' جس خبر کے صادق ہونے کا یقین ہو ' یا اس کے صدق کا غلبہ ظن ہو ' اس پر قسم کھانا بھی مباح ہے۔
مکروہ: کسی مکروہ کام کے کرنے پر ' یا کسی مستحب کرنے پر قسم کھائی جائے تو یہ قسم مکروہ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت مسطح (رض) حضرت عائشہ (رض) پر تہمت لگانے والوں میں شامل تھے ' حالانکہ حضرت ابوبکر (رض) حضرت مسطح (رض) کو خرچ دیتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ (رض) کی اس تہمت سے برات بیان کردی تو حضرت ابوبکر نے قسم کھائی کہ وہ پہلے جو حضرت مسطح (رض) کو خرچ دے کر ان کی مدد کرتے تھے وہ اب بند کردیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:
(آیت) "ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمھجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم "۔ (النور: ۲۲)

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ صاحب وسعت اور خوش حال ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں 'اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے اور ان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بہت بخشنے والا 'بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کسی کار خیر کو ترک کرنے کی قسم کھانا ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔

حرام: جھوٹی قسم کھانا اور خلاف واقع قسم کھانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "ویحلفون علی الکذب وھم یعلمون، اعداللہ لھم عذابا شدیدا انھم سآء ما کانوا یعملون"۔ (المجادلہ: ۱۴-۱۳)

ترجمہ: اور منافق جان بوجھ کر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے 'بیشک وہ (دنیا میں) بہت برا کام کرتے تھے۔

اسی طرح معصیت پر اور ترک واجب پر قسم کھانا حرام ہے۔ مثلا کوئی شخص ناجائز کام کرنے کے لیے قسم کھائے تو یہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(آیت) "ان الذین یشترون بعھد اللہ و ایمانھم ثمنا قلیلا اولئك لا خالق لھم فی الاخرۃ ولا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم"۔ (آل عمران: ۷۷)

ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ اللہ ان سے قیامت کے دن کلام فرمائے گا 'اور نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا 'اور نہ ان کو پاک کرے گا 'اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اپنا حق ثابت کرنے کے لیے قسم کھانے کے متعلق فقہاء کے نظریات

جب حاکم کے سامنے اپنے حقوق پر قسم کھانی ہو تو اس میں فقہاء کے دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اپنا حق ترک کر دیا جائے اور قسم نہ کھائی جائے اور یہ اولی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اپنے حق پر قسم کھانا جائز ہے۔ پہلی رائے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عثمان (رض) اور حضرت مقداد میں اس رقم کے متعلق اختلاف تھا 'جو حضرت عثمان (رض) سے قرض لی تھی۔ چونکہ حضرت عثمان (رض) کے پاس گواہ نہیں تھے 'اس لیے حضرت عمر (رض) نے حضرت مقداد میں اس رقم کے متعلق اختلاف تھا جو حضرت عثمان (رض) سے قرض لی تھی۔ چونکہ حضرت عثمان کے پاس گواہ نہیں تھے 'اس لیے حضرت عمر (رض) نے حضرت مقداد پر قسم لازم کی۔ حضرت مقداد نے حضرت عثمان پر قسم لوٹا دی۔ حضرت عثمان (رض) نے قسم کھانے کی بجائے ان کے قول کے مطابق رقم لے لی اور خود قسم نہیں کھائی۔ اور فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ مقداد پر کوئی مصیبت آئے اور یہ کہے کہ یہ مصیبت عثمان کی قسم کی وجہ سے آئی ہے۔ سو دونوں صحابہ نے قسم پر اپنا حق چھوڑنے کو ترجیح دی 'اور دوسرے قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ محمد بن کعب القرظی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر (رض) منبر پر کھڑے تھے اور آپ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! قسم کھانے کی وجہ سے اپنے حقوق نہ چھوڑنا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے بیشک میرے ہاتھ میں عصا ہے 'اور عمر بن شبہ نے کتاب قضاۃ البصرۃ میں اپنی سند کے ساتھ شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر (رض) اور حضرت ابی (رض) نے ایک کھجور کے درخت کے متعلق حضرت زید بن ثابت کے پاس مقدمہ دائر کیا۔ حضرت ابی بن کعب کا اس

درخت پر دعویٰ تھا 'تو حضرت عمر پر قسم آئی۔ حضرت زید نے کہا تم امیر المومنین سے قسم کو معاف کر دو 'حضرت عمر (رض) نے فرمایا امیر المومنین کو کیوں معاف کیا جائے ؟ اگر مجھے معلوم ہو کہ کسی چیز پر میرا حق ہے اور قسم کھانے سے مجھے وہ حق مل جائے گا تو میں ضرور قسم کھاؤں گا ورنہ میں قسم کو ترک کر دوں گا 'اور اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے یہ کھجور کا درخت میرا درخت ہے اور اس پر ابی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جب وہ دونوں عدالت سے نکلے تو حضرت عمر (رض) نے وہ درخت ابی کو بخش دیا۔ ان سے کہا گیا اے امیر المومنین ! آپ نے قسم کھانے سے پہلے ابی کو درخت کیوں نہیں دیا 'حضرت عمر (رض) نے کہا مجھے یہ خوف تھا کہ اگر میں نے قسم نہیں کھائی تو لوگ میرے بعد اپنے حقوق پر قسم نہیں کھائیں گے اور یہی طریقہ مقرر ہو جائے گا 'اور یہ حق پر سچی قسم ہے تو جس طرح یہ قسم حاکم کے علاوہ دوسرے کے سامنے کھانا جائز ہے 'وہ حاکم کے سامنے بھی جائز ہے۔ (المغنی ج ۹ 'ص ۳۸۹۔ ۳۸۸ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۰۵ ھ)

قسم کھانے کا طریقہ

قسم اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے اسماء میں سے کسی اسم یا اس کی صفات میں سے کسی صفت کی کھائی جاتی ہے۔ مثلا اس طرح قسم کھائے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے 'یا اس ذات کی قسم جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح قسم کھاتے تھے 'اس ذات کی قسم محمد کی جان جس کے قبضہ وقدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء مثلا یہ ہیں اللہ 'رحمٰن 'رحیم 'خالق 'باری 'رزاق 'رب 'وغیرہ۔ ان اسماء کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے اور اللہ کی صفات یہ ہیں 'اللہ کی عظمت اللہ کا جلال 'اللہ کی قدرت 'اللہ کا علم 'اللہ کا کلام وغیرہ 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یوں قسم کھاتے "لا ومقلب القلوب "دلوں کے پلٹنے والے کی قسم۔ (صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۷۳۹۱ 'سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : ۲۰۹۲) اگر کسی شخص نے کہا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں 'اس میں اگر وہ قسم کی نیت کرے گا تو قسم ہے 'ورنہ نہیں۔

غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت کی تحقیق

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) سواروں کی ایک جماعت میں اپنے باپ کی قسم کھا رہے تھے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو ندا کر کے فرمایا : سنو اللہ تمہیں تمہارے آباء کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے۔ سو جس شخص نے قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۶۱۰۸ 'صحیح مسلم 'الایمان '۳ '(۱۶۴۶) ۴۱۷۸)

غیر اللہ کی قسم سے ممانعت کی حکمت یہ ہے کہ جس کی قسم کھائی جائے اس کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور حقیقی تعظیم اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے 'اس لیے غیر اللہ کی قسم کھا کر اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشابہ نہیں کیا جائے گا۔ نیز جس کی قسم کھائی جائے اس کو گواہ بنایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر وقت ہر چیز پر گواہ ہو۔ اس لیے اللہ کے سوا اور کسی کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس

(رض) نے فرمایا اگر میں سو مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر اس کو توڑ دوں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں ایک بار غیر اللہ کی قسم کھا کر اس کو پورا کروں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود غیر اللہ کی قسم کھائی ہے۔ مثلا فرمایا: (آیت) "والطور: ١) پہاڑ طور کی قسم"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حکم کا پابند نہیں ہے۔ وہ مالک علی الاطلاق ہے 'جو چاہے کرے 'اس پر کوئی سوال یا اعتراض نہیں ہے اور پہاڑ طور 'درخت انجیر وغیرہ کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی فضیلت ظاہر کی ہے۔ نیز یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ چیزیں اللہ کی ذات پر گواہ ہیں۔

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ١٠٨٨ ھ لکھتے ہیں:

کیا اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم کھانا مکروہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہاں کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے 'اور عام فقہاء نے یہ کہا ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے 'اور ہمارے زمانہ میں فقہاء نے اسی پر فتوی دیا ہے اور حدیث میں ممانعت اس پر محمول ہے جب اس قصد سے غیر اللہ کی قسم کھائے کہ اگر قسم پوری نہیں کی تو وہ حانث ہوگا اور اس کا کفارہ ادا کرے گا 'اور جب یہ قصد نہ ہو تو پھر غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے 'جیسے کوئی کہے کہ تمہارے باپ کی قسم! یا تمہاری زندگی کی قسم۔ (در مختار علی ھامش رد المختار ج ٣ ص ٤٦ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت ١٤٠٧ ھ)

ہمارے زمانہ میں چونکہ لوگ اللہ کی قسم کھا کر اس کو پورا کرنے میں تساہل برتتے ہیں 'اس لیے لوگ تاکید اور توثیق کے لیے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تم طلاق کی قسم کھاؤ مثلا اگر میں نے فلاں کو فلاں کام نہ کیا تو میری بیوی کو طلاق 'توثیق کے حصول کے لیے طلاق کی قسم کھائی جاتی ہے۔ اس میں حرف قسم نہیں ہوتا 'اور کبھی حرف قسم کے ساتھ باپ یا زندگی کی قسم کھائی جاتی ہے اس لیے توثیق مطلوب نہیں ہوتی 'اور نہ اس میں قسم پوری نہ کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔ جس کی قسم کھائی جائے صرف اس کے ساتھ تعلق اور محبت کا اظہار مقصود ہوتا ہے 'اور اگر طلب ثوثیق کے لیے حرف قسم کے ساتھ غیر اللہ کی قسم کھائی جائے تو یہ بالاتفاق مکروہ ہے 'کیونکہ میں غیر اللہ کو تعظیم میں اللہ کے ساتھ مشابہ کرنا ہے۔ (در مختار علی ھامش رد المختار ج ٣ ص ٤٧۔ ٤٦ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت ١٤٠٧ ھ)

یمین لغو کی تعریف

ازہری نے کہا ہے: کہ لغو کے کلام عرب میں دو معنی ہیں۔ ایک معنی بے فائدہ اور باطل کلام جس سے کوئی عقد نہ کیا جائے۔ دوسرا معنی ہے فحش اور بے ہودہ کلام 'جو گناہ کا موجب ہو۔ قرآن مجید میں ہے

(آیت) "لایسمعون فیھا لغوا الا سلما"۔ (مریم: ٦٢)

ترجمہ: وہ جنت میں کوئی فضول اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے بجز سلام کے۔

جس شخص کا ارادہ قسم کھانے کا نہ ہو اور بلا قصد اس کی زبان پر قسم کے الفاظ آجائیں 'یا وہ شخص کسی چیز پر قسم کھانے کا ارادہ کرے اور اس کی زبان سے کوئی چیز نکل جائے تو یہ یمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہاری گرفت نہیں فرمائے گا اور حضرت ابن عمر 'ابن عباس اور حضرت عائشہ (رض) سے مروی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کہے 'نہیں 'خدا کی قسم! ہاں خدا کی قسم اور جو چیز

زبان پر بلا قصد آجائے اس میں مواخذہ نہیں ہوتا ' جیسے سبقت لسان سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہے۔ (المھذب ' ج ۲ 'ص ۱۲۸ 'مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

انسان کو گمان ہو کہ یقینی طور پر فلاں واقعہ ہوا اور وہ اس پر قسم کھالے اور در حقیقت واقعہ اس کے خلاف ہو تو یہ یمین لغو ہے۔ اس میں نہ کفارہ ہے نہ گناہ ہے۔ (بدایۃ المجتہد 'ج ا ص ۲۹۹ 'مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

ایک شخص اپنے گمان کے مطابق کسی چیز پر قسم کھائے اور وہ اس کے گماں کے مطابق نہ ہو تو یہ یمین لغو ہے اور اکثر اہل علم کے نزدیک اس میں کفارہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس 'حضرت ابوہریرہ 'حضرت ابومالک 'حضرت زرارہ بن اوفی (رض) کا یہ نظریہ ہے۔ حسن بصری 'نخعی ' امام مالک 'امام ابوحنیفہ 'امام اوزاعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ اس میں کفارہ ہے۔ امام احمد سے بھی ایک یہی روایت ہے۔ (المغنی ج ۹ ص '۳۹۳ مطبوعہ دارالفکر ' بیروت '۱۴۰۵ھ ')

ایک شخص ماضی کے کسی واقعہ پر قسم کھائے اور اس کے گمان میں وہ واقعہ اسی طرح ہو اور در حقیقت واقعہ اس کے برخلاف ہو تو یہ یمین لغو ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے مواخذہ نہیں فرمائے گا اور ایک شخص کے متعلق قسم کھائے کہ یہ زید ہے اور اس کا یہی گمان ہو اور وہ در حقیقت عمرو ہو تو یہ بھی یمین لغو ہے۔ (ھدایہ اولین 'ص ۴۷۹۔ ۴۷۸ 'مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ 'ملتان)

یمین منعقدہ کی تعریف

مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائی جائے تو یہ یمین منعقدہ ہے۔ اس قسم کو پورا کرنا لازم ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ (المائدہ : ۸۹) اور جب اس قسم کو توڑ دے تو اس کا کفارہ دینا لازم ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیکن اللہ تمہاری پختہ قسموں پر تمہاری گرفت فرمائے گا۔ سو اان کا کفارہ دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا کھلانا ہے۔ الآیہ (المائدہ : ۸۹) اس قسم میں کفارہ بالاتفاق مقرر ہے 'خواہ کسی طاعت پر قسم کھائی ہو یا کسی معصیت پر 'لیکن اگر اس نے کسی معصیت پر قسم کھائی ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ معصیت نہ کرے اور اس قسم کا کفارہ دے 'جیسا کہ ہم اس سے پہلے (صحیح مسلم 'ایمان '۱۱ (۱۶۵۰) ۴۱۹۲) کے حوالے سے بیان کرچکے ہیں۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک قسم توڑنے پر کفارہ لازم ہے 'خواہ اس نے عمدا قسم توڑی ہو 'یا بھول کر 'یا خطا سے 'یا جبر سے 'کیونکہ قرآن مجید نے قسم توڑنے پر مطلقا کفارہ لازم کیا ہے اور اس میں عمد اور نسیان کا فرق نہیں کیا۔ (بدایۃ المجتہد 'ج ا ص ۳۰۴ 'بدائع الصنائع 'ج ۳ 'ص ۱۷)

امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے نسیان 'خطا یا جبر سے قسم توڑ دی 'تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ (المھذب 'ج ۲ ص ۱۲۸ ' المغنی 'ج ۹ 'ص ۳۹۱)

امام شافعی اور امام احمد کی دلیل یہ حدیث ہے :

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میری امت سے خطا نسیان اور جبر سے مواخذہ اٹھالیا گیا ہے۔ (المعجم الاوسط 'ج ۹ 'رقم الحدیث : ۸۲۶۹ 'مطبوعہ مکتبہ المعارف 'ریاض '۱۴۱۵ھ)

یمین غموس کی تعریف :

ماضی یا حال کے کسی واقعہ پر عمداً جھوٹی قسم کھائی جائے تو یہ یمین غموس ہے اور اس کا ارتکاب پر جھوٹی قسم کھانے والا عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس میں کفار نہیں ہے اس پر توبہ لازم ہے ' کیونکہ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ پر توبہ لازم ہے۔ فقہاء احناف ' فقہاء مالکیہ اور فقہاء حنبلیہ کا یہی مذہب ہے۔ (بدائع الصنائع ' ج ۳ ص ۱۵ ' ۳ ' الشرح الکبیر علی ھامش الدسوقی ' ج ۲ ' ص ۱۲۸ ' المغنی ج ۹ ص ۳۹۲)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے قسم کھائی اور وہ اس میں جھوٹا تھا تاکہ کسی مسلمان شخص کے مال کو حاصل کرے تو اللہ اس پر جنت کو حرام کردے گا اور اس کو دوزخ میں داخل کردے گا۔ (صحیح مسلم ' ایمان ۲۱۸ ' (۱۳۷) ۳۴۶ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ۲۳۲۴ ' سنن الدارمی ' رقم الحدیث : ۲۵۰۵ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ' ۵۰۸۷ ' مسند احمد ' ج ۵ ' ص ۲۶۰ ' ۲۶۰ ' سنن کبری ' ج ۱۰ ' ص ۱۷۹)

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے جھوٹی قسم کھا کر کوئی فیصلہ کروایا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۳۲۴۲ ' مسند احمد ج ۴ ' ص ۴۴۱ ۔ ۴۳۶)

حضرت عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا گناہ کبیرہ یہ ہیں : اللہ کے ساتھ شریک کرنا ' ماں باپ کی نافرمانی کرنا یا فرمایا : یمین غموس (جھوٹی قسم) اور شعبہ کہتے ہیں آپ نے فرمایا : کبائر یہ ہیں : اللہ کے ساتھ شریک کرنا ' یمین غموس ' ماں باپ کی نافرمانی کرنا یا فرمایا کسی کو قتل کرنا۔ (صحیح البخاری ' ج ۶ ' رقم الحدیث : ۶۸۷۰ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ' ۳۰۳۲ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ۴۰۲۲ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ۵۵۶۲ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۶۹۰۱)

امام شافعی کے نزدیک یمین غموس میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور یمین غموس میں جھوٹ کا گناہ کفارہ سے ساقط ہو جاتا ہے ' جیسے یمین منعقدہ میں قسم توڑنے کا گناہ کفارہ سے ساقط ہوتا ہے۔ (المہذب ' ج ۲ ' ص ۱۲۸)

کفارہ قسم کی مشروعیت

کفارہ کا لفظ کفر سے مشتق ہے ' کفر کا معنی ہے ستر اور ڈھانپنا۔ سو توڑنے کی وجہ سے جس گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے کفارہ اس گناہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ کفارہ کی مشروعیت سورۃ مائدہ کی زیر تفسیر آیت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سو ان کا کفارہ دس مسکینوں کو درمیانی قسم کا کھانا کھلانا ہے جیسا تم اپنے گھروں کو کھلاتے ہو ' یا ان مسکینوں کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے جو ان میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے ' یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ (اور توڑ دو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو (المائدہ : ۸۹) اور حسب ذیل حدیث سے بھی کفارہ کی مشروعیت ثابت ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے کسی کام کے کرنے کی قسم کھائی ' پھر وہ اس کے خلاف کرنے کو بہتر جانے تو وہ اس قسم کے خلاف کرے اور اس قسم کا کفارہ دے۔ (صحیح مسلم ' ایمان ' ۱۱ ' (۱۶۵۰) ۴۱۹۲)

کفارہ قسم کے احکام میں مذاہب ائمہ

قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ کفارہ قسم میں دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے ' یا ان کو کپڑے پہنانا ہے اور یا غلام آزاد کرنا ہے 'اور جو شخص ان میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

فقہاء احناف کے نزدیک کھانا کھلانے سے مراد یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا پیش کر دیا جائے اور ان کو کھانے کی اجازت دی جائے 'اس کو اصطلاح میں اباحت کہتے ہیں۔ اس سے مراد ان کو اس کھانے کا مالک بنانا نہیں ہے 'اور باقی فقہاء کے نزدیک اس طعام کا مالک بنانا ضروری ہے۔ کھانے کی مقدار میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی 'امام مالک اور امام احمد کے نزدیک ہر مسکین کو ایک کلو گرام گندم دی جائے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہر مسکین کو دو کلو گندم یا چار کلو کھجور یا جو دیئے جائیں یا ان کی قیمت دی جائے۔

اگر ایک مسکین کو دس روز صبح و شام کھانا کھلایا جائے یا دس دن تک ہر روز اس کو دو کلو گندم یا اس کی قیمت دی جائے تو یہ جائز ہے 'لیکن اگر ایک مسکین کو ایک دن میں بیک وقت وقت دس آدمیوں کا کھانا دے دیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دس مسکینوں کی بھوک مٹانے کا حکم دیا ہے 'خواہ بیک وقت یا دس دنوں میں اور یہ مقصود اس صورت میں حاصل نہیں ہو گا۔ جن مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے وہ مسلمان ہوں۔ فقہاء احناف کے نزدیک ذمی کو بھی کھانا کھلایا جا سکتا ہے 'اور باقی فقہاء کے نزدیک کافر کو قسم کا کفارہ کھلانا جائز نہیں ہے۔

اگر کفارہ میں کپڑے دیئے جائیں تو فقہاء احناف کے نزدیک بھی ان کا مالک بنانا ضروری ہے 'بخلاف کھانا کھلانے کے کیونکہ اس سے مقصود بھوک کو مٹانا ہے اور وہ فقط کھانے کی اجازت سے بھی مٹ جاتی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اتنا کپڑا ہونا چاہیے جس سے عام بدن چھپ جائے اور امام احمد کے نزدیک جتنی مقدار سے نماز جائز ہو جائے اور امام مالک کے نزدیک جتنے کپڑے سے تمام بدن چھپ جائے اور امام شافعی کے نزدیک کپڑے کا اطلاق دو چادروں پر ہوتا ہے ' یہ مقدار ضروری ہے 'ورنہ مردوں کو قمیص 'شلوار اور ٹوپی دی جائے اور عورتوں کو قمیص 'شلوار اور دوپٹہ۔

اس دور میں غلامی کا رواج ختم ہو گیا ہے 'اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم ضابطہ یہ ہے کہ ایسا غلام آزاد کیا جائے جو کامل الاعضاء ہو اور عیب دار نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ غلام عام ہے 'مومن ہو یا کافر 'کیونکہ قرآن مجید کی اس آیت میں مطلّقا فرمایا (آیت) "او تحریر رقبۃ" (المائدہ: ۸۹) اور اس کو کسی قید سے مقید نہیں کیا اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ضروری ہے ' کیونکہ کفارہ قتل خطا میں فرمایا ہے۔ (آیت) "او تحریر رقبۃ مؤمنۃ" (النساء: ۹۲) ائمہ ثلاثہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کا اصول یہ ہے کہ جب مطلق اور مقید دو الگ الگ احکام میں ذکر کیے جائیں تو مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جاتا اور جس حکم میں کوئی چیز مطلق ذکر کی گئی ہے وہاں اس کے اطلاق پر عمل کیا جائے گا 'اور جہاں اس کو مقید ذکر کیا ہے وہاں اس کی۔۔ پر عمل ہو گا۔

اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر قسم توڑنے والا دس مسکینوں کو کھانا کھلانے یا ان کو کپڑے پہنانے یا غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو 'تو وہ تین دن کے روزے رکھے گا۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک مسلسل تین دن کے روزے رکھنا ضروری نہیں ہے لیکن اگر اس نے لگاتار تین دن کے روزے رکھے تو یہ مستحب ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی اس آیت میں مطلّقا فرمایا ہے (آیت) "فصیام ثلاثۃ ایام" (المائدہ: ۸۹) اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک لگاتار تین روزے رکھنا ضروری ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود (رض) کی قرات میں ہے "فصیام ثلاثۃ ایام متتابعات"۔ ہر چند کہ یہ قرات متواتر نہیں ہے 'لیکن یہ آیت خبر واحد اور آپ سے روایت کے درجہ میں ہے اور خبر واحد حجت ہوتی ہے اور

اس سے قرآن کے کسی حکم میں زیادتی ہو سکتی ہے۔ جس طرح عمداً روزہ توڑنے کے کفارہ میں جو ساٹھ روزے لگاتار رکھے جاتے ہیں ان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور ان کا لگاتار رکھنا صرف حدیث سے ثابت ہے۔ سو اسی طرح اس کا حکم ہے۔ (الکافی فی فقہ الامام احمد ' ج ۴ 'ص ۱۹۵ ' المہذب ' ج ۲ 'ص ۱۴۲ 'بدایۃ المجتہد ' ج ۲ 'ص ۱۰۷ '۱۰۵ 'ردالمختار ' ج ۳ 'ص ۶۲۔ ۶۰ 'فتح القدیر ' ج ۵ 'ص ۹۱۔ ۷۵)

آیت مبارکہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

لغۃ القرآن: [يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْۤا : جو ایمان لائے][اِنَّمَا : یقیناً][الْخَمْرُ : شراب][وَالْمَيْسِرُ : اور جُوا][وَالْاَنْصَابُ : اور بت][وَالْاَزْلَامُ : اور فال نکالنے کے تیر][رِجْسٌ: پلید][مِّنْ : سے][عَمَلِ : عمل][الشَّيْطٰنِ : شیطان][فَاجْتَنِبُوْهُ : تو تم بچو اس سے][لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم][تُفْلِحُوْنَ : تم کامیاب ہوجاؤ]

ترجمہ: اے ایمان والو ! بیشک شراب اور جوا اور (عبادت کے لئے) نصب کئے گئے بت اور (قسمت معلوم کرنے کے لئے) فال کے تیر (سب) ناپاک شیطانی کام ہیں۔ سو تم ان سے (کلیتًا) پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

تشریح:

مشکل الفاظ کے معانی

خمر: انگور کا کچھ شیرہ 'جو پڑے پڑے سڑ کر بدبودار ہو جائے اور جھاگ چھوڑ دے تو وہ نشہ آور ہو جاتا ہے 'اس کو خمر کہتے ہیں۔ خمر کا معنی ہے ڈھانپنا اور نشہ انسان کی عقل کو ڈھانپ لیتا ہے۔

میسر: ہر وہ عقد جس کی رو سے ہارنے والا جیتنے والے کو ایک معین اور پہلے سے طے شدہ رقم ادا کرنے 'اس کو میسر کہتے ہیں۔ میسر یسر سے بنا ہے 'اور جوئے کے ذریعے جیتنے والے فریق کو ہارنے والے فریق کی رقم آسانی سے مل جاتی ہے۔ اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں۔

ازلام: تیروں کی ہیئت کی پتلی پتلی لکڑیاں 'ان سے زمانہ جاہلیت میں قسمت کا حال اور شگون معلوم کرتے تھے اور فال نکالتے تھے۔

انصاب : بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر جن کی عبادت کی جاتی تھی اور بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔ (المفردات ' ج ۲ 'ص ۶۳۸)

رجس : جو چیز حسا یا معنا گندی اور ناپاک ہو 'انسان کی طبیعت اس سے گھن کھائے یا عقل اس کو برا جانے یا شریعت نے اس کو ناپاک قرار دیا ہو۔

عرب میں شراب کا عام رواج تھا۔ گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ سب اس کے متوالے تھے۔ شراب جو ان گنت جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب، اخلاقی اور معاشی خرابیوں کی جڑ اور فتنہ و فساد کی علت ہے اسلام کے پاکیزہ نظام حیات میں اس کی کیوں کر گنجائش ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قطعی حرام کر دیا۔ لیکن حرمت کا حکم آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل ہوا تاکہ لوگوں کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں تو اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ فیھما اثم کبیر و منافع للناس۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی ولا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری۔ کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔ یہ آیات اس آخری حکم کا پیش خیمہ تھیں۔ اگرچہ شراب کی حرمت کا صراحۃ ان میں ذکر نہ تھا لیکن کئی سلیم طبیعتوں نے اس وقت ہی شراب چھوڑ دی تھی۔ حضرت عمر فاروق اعظم (رض) بارگاہ الٰہی میں اس کی قطعی حرمت کے لیے التجائیں کیا کرتے۔ عرض کرتے۔ اللھم بین لنا بیانا شافیا۔ اس اثنا میں چند ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جس سے شراب پینے کے مفاسد اور نقصانات کا صحابہ کرام کو زیادہ سے زیادہ احساس ہونے لگا۔ جب ایمان پختہ ہو گئے۔ تعلیمات اسلامیہ قلب و روح کی گہرائیوں میں بس گئیں اور اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی عادت فطرت بن گئی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضور رحمت عالمیان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک خادم کو حکم دیا کہ مدینہ کے گلی کوچوں میں پھر کر بلند آواز سے ان آیات کا اعلان کرے۔ جب وہ منادی کرنے والا اعلان کرنے نکلا تو کئی جگہ شراب کی محفلیں آراستہ تھیں۔ میخوار جمع تھے۔ پیارے گردش میں تھے۔ جونہی کان میں ھل انتم منتھو کی آواز پہنچی ہاتھوں پر رکھے ہوئے پیالے زمین پر پٹخ دیئے گئے۔ ہونٹوں سے لگے ہوئے جام خود بخود الگ ہو گئے۔ جام و سبو توڑ دیئے گئے۔ مشکوں اور مٹکوں میں بھری ہوئی مئے ناب انڈیل دی گئی۔ وہ چیز جو انھیں از حد عزیز تھی اب گندے پانی کی طرح گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ اس کے بعد کسی صحابی نے شراب پینے کی خواہش کا اظہار تک نہ کیا۔ قرآن کی اثر آفرینی، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیض تربیت، صحابہ کرام کی کامل ترین اطاعت و فرمان برداری اور اسلام کی انقلاب آفرین قوت کا یہ وہ عدیم النظیر مظاہرہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ شراب کے زہریلے اثرات دیکھ کر یورپ و امریکہ کے ڈاکٹر اور دانشور لرزہ براندام ہیں۔ اس مصیبت سے اپنی قوم کو چھٹکارا دلانے کے لیے بڑی بڑی مخلصانہ اور حکیمانہ کوششیں کی جارہی ہیں۔ حکومت امریکہ نے پورے چودہ سال تک شراب کے خلاف زور شور سے جہاد جاری رکھا۔ اور اس جہاد میں نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے جدید ترین اور قوی تر وسائل اختیار کیے۔ اخبارات، رسالے، لیکچرز، تصاویر اور فلمیں سبھی شراب سے نفرت دلانے کے لیے برسرپیکار رہے۔ اس عظیم مہم پر حکومت نے تقریباً چھ کروڑ ڈالر (16863990000 موجودہ پاکستانی روپے) خرچ کیا۔ پچیس کروڑ پونڈ کا خسارہ برداشت کیا۔ تین سو افراد کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ پانچ لاکھ سے زیادہ اشخاص کو قید و بند کی سزائیں دیں۔ بھاری جرمانے کیئے۔ بڑی بڑی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ لیکن یہ ساری چیزیں بیکار ثابت ہوئیں۔ آخر کار حکومت کو اپنی شکست فاش کا اعتراف کرنا پڑا اور اس نے شراب نوشی جس کے خلاف عرصہ دراز تک وہ معرکہ آرا رہی تھی کو 1933ء میں قانونا جائز قرار دے دیا"۔ (ماخوذ از ماذا خسر العالم)

والمیسر الخ۔ اسی طرح برطانیہ میں جوا اس پر برائے نام پابندی تھی اسے بھی 1961ء میں واپس لے لیا گیا۔ اور اس کی بیخ کنی کے لیے ساری مساعی کے ناکام ہو جانے کے بعد اسے بھی قانونی طور پر سند جواز مل گئی۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی 1964ء)

لیکن سب بے فائدہ، سب بے اثر ایہ اسلام کی قوت قاہرہ تھی جس نے اپنے ایک فرمان سے ساری قوم کو اس بلائے بے درماں سے رہائی دلا دی۔ (ضیاء)

رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ : ناپاک شیطانی کام ہیں۔} اس آیت مبارکہ میں چار چیزوں کے نجاست و خباثت اور ان کا شیطانی کام ہونے کے بارے میں بیان فرمایا اور ان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وہ چار چیزیں یہ ہیں جن سے بچنے کا حکم ہے

(1) شراب۔ (2) جوا۔ (3) اَنصاب یعنی بت۔ (4) اَزلام یعنی پانسے ڈالنا۔ ہم یہاں بالترتیب ان چاروں چیزوں کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہیں۔

(1)۔۔ شراب۔ صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی (رح) فرماتے ہیں: شراب پینا حرام ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے گناہ پیدا ہوتے ہیں، للہٰذا اگر اس کو معاصی (یعنی گناہوں) اور بے حیائیوں کی اصل کہا جائے تو بجا ہے۔

حضرت معاذ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "شراب ہر گز نہ پیو کہ یہ ہر بدکاری کی اصل ہے۔

شراب پینے کی وعیدیں

احادیث میں شراب پینے کی انتہائی سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت انس بن مالک (رض) فرماتے ہیں: حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شراب کے بارے میں دس شخصوں پر لعنت کی:

(1) شراب بنانے والے پر۔ (2) شراب بنوانے والے پر۔ (3) شراب پینے والے پر۔ (4) شراب اٹھانے والے پر۔ (5) جس کے پاس شراب اٹھا کر لائی گئی اس پر۔ (6) شراب پلانے والے پر۔ (7) شراب بیچنے والے پر۔ (8) شراب کی قیمت کھانے والے پر۔ (9) شراب خریدنے والے پر۔ (10) جس کے لیے شراب خریدی گئی اس پر۔

(2)۔۔ حضرت ابو مالک اشعری (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میری امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھیں گے، ان کے سروں پر باجے بجائے جائیں گے اور گانے والیاں گائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے کچھ لوگوں کو بندر اور سور بنا دے گا۔

(3)۔۔ حضرت ابو امامہ (رض) سے روایت ہے، رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "قسم ہے میری عزت کی! میرا جو بندہ شراب کی ایک گھونٹ بھی پئے گا میں اس کو اتنی ہی پیپ پلاؤں گا اور جو بندہ میرے خوف سے اسے چھوڑے گا میں اس کو حوض قدس سے پلاؤں گا۔

شراب حرام ہونے کا 10 انداز میں بیان

اس آیت اور اس سے بعد والی آیت میں شراب کے حرام ہونے کو 10 مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے:

(1)-- شراب کو جوئے کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

(2)-- بتوں کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

(3)-- شراب کو ناپاک قرار دیا ہے۔

(4)-- شیطانی کام قرار دیا ہے۔

(5)-- اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

(6)-- کامیابی کا مدار اس سے بچنے پر رکھا ہے۔

(7)-- شراب کو عداوت اور بغض کا سبب قرار دیا ہے۔

(9,8)-- شراب کو ذکر اللہ اور نماز سے روکنے والی چیز فرمایا ہے۔

(10)-- اس سے باز رہنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔(1)

شراب نوشی کے نتائج

یہاں ہم شراب نوشی کے چند وہ نتائج ذکر کرتے ہیں جو پوری دنیا میں نظر آرہے ہیں تاکہ مسلمان ان سے عبرت حاصل کریں اور جو مسلمان شراب نوشی میں مبتلا ہیں وہ اپنے اس برے عمل سے باز آجائیں۔

(1)-- شراب نوشی کی وجہ سے کروڑوں افراد مختلف مہلک اور خطرناک امراض کا شکار ہو رہے ہیں۔

(2)-- لاکھوں افراد شراب نوشی کی وجہ سے ہلاک ہو رہے ہیں۔

(3)-- زیادہ تر سڑک حادثات شراب پی کر گاڑی چلانے کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔

(4)-- ہزاروں افراد شرابیوں کے ہاتھوں بے قصور قتل و غارت گری کا نشانہ بن رہے ہیں۔

(5)-- لاکھوں عورتیں شرابی شوہروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔

(6)-- لاکھوں عورتیں شرابی مردوں کی طرف سے جنسی حملوں کا شکار ہو رہی ہیں۔

(7)-- والدین کی شراب نوشی کی وجہ سے زندگی کی توانائیوں سے عاری اور مختلف امراض میں مبتلا بچے پیدا ہو رہے ہیں۔

(8)-- لاکھوں بچے شرابی والدین کی وجہ سے یتیمی اور اسیری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

(9)-- شرابی شخص کے گھر والے اور اہل و عیال اس کی ہمدردی اور پیار و محبت سے محروم ہو رہے ہیں۔

(10)-- ان نقصانات کے علاوہ شراب کے اقتصادی نقصانات بھی بہت ہیں کہ اگر شراب کی خرید و فروخت اور امپورٹ ایکسپورٹ سے حاصل ہونے والی رقم اور ان اخراجات کا موازنہ کیا جائے جو شراب کے برے اثرات کی روک تھام پر ہوتے ہیں تو سب پر واضح ہو جائے گا کہ شراب سے حاصل ہونے والی آمدنی ان اخراجات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو اس کے برے نتائج کو دور کرنے پر ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر شراب نوشی کی وجہ سے ہونے والی نفسیاتی اور دیگر بیماریوں کے علاج، نشے کی حالت میں ڈرائیورنگ سے ہونے والے حادثات، پولیس کی گرفتاریاں اور زحمتیں، شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال، شراب سے متعلقہ جرائم کے لیے عدالتوں کی مصروفیات، شرابیوں کے لیے قید خانے وغیرہ امور پر ہونے والے اخراجات دیکھے جائیں تو یہ شراب سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کہیں زیادہ نظر آئیں گے اور اس کے علاوہ کچھ

نقصانات تو ایسے ہیں کہ جن کا موازنہ مال و دولت سے کیا ہی نہیں جا سکتا جیسے پاک نسلوں کی تباہی، سستی، بے راہ روی، ثقافت و تمدن کی پسماندگی، احساسات کی موت، گھروں کی تباہی، آرزوؤں کی بربادی اور صاحبان فکر افراد کی دماغی صلاحیتوں کا نقصان، یہ وہ نقصانات ہیں جن کی تلافی روپے پیسے سے کسی صورت ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل سلیم اور ہدایت عطا فرمائے اور شراب نوشی کی آفت بد سے نجات عطا فرمائے۔
(2)۔۔جوا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں: جوئے کا روپیہ قطعی حرام ہے۔

جوئے کی مذمت میں 2 احادیث

احادیث میں جوئے کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے چنانچہ جوئے کے ایک کھیل کے بارے میں حضرت بریدہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے نرد شیر (جوئے کا ایک کھیل) کھیلا تو گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون میں ڈبو دیا۔
اور حضرت ابو عبدالرحمٰن خطمی (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو شخص نرد کھیلتا ہے پھر نماز پڑھنے اٹھتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو پیپ اور سوئر کے خون سے وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے۔

جوئے کے دنیوی نقصانات

دینِ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہر اس عمل اور عادت سے روکا ہے جس سے ان کا مالی اور جسمانی نقصان وابستہ ہو اور وہ انھیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے۔ ایسی بیشمار چیزوں میں سے ایک چیز جوا بازی ہے جو کہ معاشرتی امن و سکون اور باہمی محبت و یگانگت کے لیے زہر قاتل سے بڑھ کر ہے اور قرآن و حدیث میں مختلف انداز سے مسلمانوں کو اس شیطانی عمل سے روکا گیا ہے لیکن افسوس کہ فی زمانہ مسلمانوں کی ایک تعداد اس خبیث ترین عمل میں مبتلا نظر آ رہی ہے اور یہ لوگ دنیا و آخرت کے لیے حقیقی طور پر مفید کاموں کو چھوڑ کر اپنے شب و روز کو اسی عمل میں لگائے ہوئے ہیں اور ان کی اسی روش کا نتیجہ ہے کہ ان مسلمانوں کی نہ تو دنیوی پسماندگی دور ہو رہی ہے اور نہ ہی وہ اپنی اخروی کامیابی کے لیے کچھ کر پا رہے ہیں۔ ہم یہاں جوئے بازی کے 3 دنیوی نقصانات ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلمان انھیں پڑھ کر اپنی حالت پر کچھ رحم کریں اور جوئے سے باز آ جائیں۔
(1)۔۔جوئے کی وجہ سے جوئے بازوں میں بغض، عداوت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات قتل و غارت گری تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔
(2)۔۔جوئے بازی کی وجہ سے مالدار انسان لمحوں میں غربت و افلاس کا شکار ہو جاتا ہے، خوشحال گھر بدحالی کا نظارہ پیش کرنے لگتے ہیں، اچھا خاصا آدمی کھانے پینے تک کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، معاشرے میں اس کا بنا ہوا وقار ختم ہو جاتا ہے اور سماج میں اس کی کوئی قدر و قیمت اور عزت باقی نہیں رہتی۔
(3)۔۔جوئے باز نفع کے لالچ میں بکثرت قرض لینے اور کبھی کبھی سودی قرض لینے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے اور جب وہ قرض ادا نہیں کر پاتا یا اسے قرض نہیں ملتا تو وہ ڈاکہ زنی اور چوری وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے حتّٰی کہ جوئے باز چاروں جانب سے مصیبتوں میں ایسا گھر جاتا ہے کہ بالآخر وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے اور انھیں اس شیطانی عمل سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔
(3)۔۔انصاب۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہیں جن کے پاس کفار اپنے جانور ذبح کرتے تھے۔

امام عبداللہ بن احمد نسفی (رح) فرماتے ہیں: اس سے مراد بت ہیں کیونکہ انھیں نصب کرکے ان کی پوجا کی جاتی ہے۔
علامہ ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی (رح) فرماتے ہیں "اگر انصاب سے مراد وہ پتھر ہوں جن کے 2۔۔مدارک، المائدۃ، تحت الآیۃ: ۹۰، ص ۳۰۲۔
پاس کفار اپنے جانور ذبح یا نحر کرتے تھے تو ان پتھروں کو ناپاک اس لیے کہا گیا تاکہ کمزور ایمان والے مسلمانوں کے دلوں میں اگر ان کی کوئی عظمت باقی ہے تو وہ بھی نکل جائے، اور اگر انصاب سے مراد وہ بت ہوں جن کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے (ان کے پاس جانور ذبح کئے جاتے ہوں یا نہیں) تو انھیں ناپاک اس لیے کہا گیا تاکہ سب پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جس طرح اصنام سے بچنا واجب ہے اسی طرح انصاب سے بچنا بھی واجب ہے۔
(4)۔۔ازلام۔ زمانہ جاہلیت میں کفار نے تین تیر بنائے ہوئے تھے، ان میں سے ایک پر لکھا تھا "ہاں" دوسرے پر لکھا تھا "نہیں" اور تیسرا خالی تھا۔ وہ لوگ ان تیروں کی بہت تعظیم کرتے تھے اور یہ تیر کاہنوں کے پاس ہوتے اور کعبہ معظّمہ میں کفار قریش کے پاس ہوتے تھے (جب انھیں کوئی سفر یا اہم کام درپیش ہوتا تو وہ ان تیروں سے پانسے ڈالتے اور جو ان پر لکھا ہوتا اس کے مطابق عمل کرتے تھے)۔ پرندوں سے اور وحشی جانوروں سے برا شگون لینا اور کتابوں سے فال نکالنا وغیرہ بھی اسی میں داخل ہے۔

کاہنوں اور نجومیوں کے پاس جانے کی مذمت

احادیث میں کاہنوں اور نجومیوں کے پاس جانے کی شدید مذمت کی گئی ہے، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں:
(1)۔۔حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو کسی نجومی یا کاہن کے پاس گیا اور اس کے قول کی تصدیق کی تو گویا اس نے اس کا انکار کر دیا جو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔
(2)۔۔حضرت واثلہ بن اسقع (رض) سے مروی ہے، سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو کاہن کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو چالیس (40) راتوں تک اس کی توبہ روک دی جاتی ہے اور اگر اس نے اس کی تصدیق کی تو کفر کیا۔
(3)۔۔حضرت قبیصہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "خط کھینچنا، فال نکالنا اور پرندے اڑا کر شگون لینا جِبْت (یعنی شیطانی کاموں) میں سے ہے۔ 5۔۔ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الخط وزجر الطیر، ۲۲/۴، الحدیث: ۳۹۰۷۔
آیت "فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" سے معلوم ہونے والے مسائل:
اس آیت سے دو مسئلے معلوم ہوئے:
(1)۔۔صرف نیک اعمال کرنے سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی بلکہ برے اعمال سے بچنا بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں تقویٰ کے دو پر ہیں، پرندہ ایک پر سے نہیں اڑتا۔
(2)۔۔نیکیاں کرنا اور برائیوں سے بچنا دنیا اور دکھلاوے کے لیے نہ ہونا چاہیے بلکہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

لغۃ القرآن: اِنَّمَا : بیشک][یُرِیْدُ : ارادہ کرتا ہے][الشَّیْطٰنُ : شیطان][اَنْ : یہ کہ][یُّوْقِعَ : وہ ڈال دے][بَیْنَکُمُ : تمہارے درمیان][الْعَدَاوَۃَ : دشمنی][وَالْبَغْضَآءَ : اور بغض][فِي : میں][الْخَمْرِ : شراب][وَالْمَیْسِرِ : اور جُوا][وَیَصُدَّکُمْ : اور وہ روک دے تم کو][عَنْ : سے][ذِکْرِ اللّٰهِ : ذکر اللہ][وَعَنِ : اور سے][الصَّلٰوۃِ : نماز][فَهَلْ : تو کیا اَنْتُمْ : تم ہو][مُّنْتَهُوْنَ : باز آنے والے]

ترجمہ: شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور کینہ ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے۔ کیا تم (ان شر انگیز باتوں سے) باز آؤگے۔

تشریح: شراب اور جوا کو حرام کرنے کی حکمت بیان فرمائی جارہی ہے۔ اگرچہ ان کی خرابیاں بے حد و بیشمار ہیں اور وہ قومیں جو اس کو شیر مادر سمجھ کر پیا کرتی ہیں وہ بھی اگرچہ اس کو چھوڑ دینے سے عاجز ہیں لیکن ان خرابیوں اور نقصانات کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مختصر سے الفاظ میں ان کی دو مضر ترین خرابیوں کا ذکر کر کے ان کی قباحت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔ بتایا کہ شراب اور جوا کی حرمت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس سے عداوت اور دشمنی کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ گہرے دوسرے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے، سگے بھائی ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان نماز اور یاد الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور بد نصیبی اور محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ موذن اللہ کے حضور میں شرف باریابی حاصل کرنے کی دعوت دے رہا ہو اور کوئی اس وقت شراب کے نشہ میں مدہوش پڑا ہو یا جوا کی بازی جیتنے میں یوں کھویا ہوا ہو کہ اسے خبر تک نہ ہو کہ رحمت کی گھڑی آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ اور جب شراب اور جوا کی حرمت کی یہ وجہ ہے کہ وہ یاد خدا سے غفلت کا سبب بنتے ہیں تو شطرنج اور تاش وغیرہ جب اپنے کھیلنے والوں کو اتنا منہمک کر دیں کہ نماز کی

ہوش تک نہ رہے تو یہ کیوں حرام نہ ہوں گے فان کانت الخمر انما حرمت لانھا تسکر فتصد بالاسکار عن الصلوۃ فلیحرم النرد والشطرنج لانہ یغفل ویلھی فیصد بذالک عن الصلوۃ واللہ اعلم۔ (قرطبی وضیاء)

جواء اور بغض وعداوت

جہاں تک یَسِر یعنی "جوئے" کا تعلق ہے 'اس کے ذریعے بھی شیطان مسلمانوں میں یہی بغض وعداوت کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے اور جہاں جہاں بھی جواء ہوتا ہے 'جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں ایسی صورت حال بالعموم دکھائی دیتی ہے 'ہمارے احتسابی ادارے مجھے نہیں معلوم کہ اس طرف دھیان دیتے ہیں یا نہیں۔ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ یہ اندھے قتل اور نامعلوم وارداتیں 'جہاں ان کے اور بہت سارے اسباب ہیں وہاں اس کا ایک بڑا سبب یہ قمار باز بھی ہیں کیونکہ قمار اور جوئے کی بازی میں یہ تو طے شدہ بات ہے کہ دو فریقوں میں سے ایک فریق ہارتا ہے لیکن وہ اپنے اس شغل ناپاک سے کبھی دست کش نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ آج میں بازی ہار گیا ہوں ' کل ضرور جیت لوں گا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ گھر کا اثاثہ تک اس کی نذر ہو جاتا ہے اور بعض ناہنجار تو اپنی بیویاں تک اس میں ہار دیتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے ! جب ایک آدمی سب کچھ ہار دینے کے بعد فاقوں کی نذر ہوتا ہے اور گھر میں بچے بھوک سے بلکنے لگتے ہیں اور اس کا اپنا پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے غیظ وغضب کا تنور بن جاتا ہے تو پھر یہ شخص خود سے جیتے ہوئے آدمی کے بارے میں کیا محبت کے جذبات رکھے گا؟ یقینا اس کے اندر غیظ وغضب کی فصل اگے گی اور عداوت اس کی رگ رگ میں سما جائے گی۔ جیسے جیسے قمار بازوں کی تعداد بڑھے گی ویسے ویسے اسلامی معاشرے میں غیظ وغضب کی فصل بھی بڑھتی جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک نہ ایک دن یہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ یہی وہ صورت حال ہے 'جس کے بارے میں یہاں توجہ دلائی جارہی ہے کہ خمر اور قمار سے شیطان تمہارے اندر عداوت اور بغض کے جذبات پیدا کر کے 'تمہیں تباہ کردینا چاہتا ہے۔

2- دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ اس خمر اور میسر یعنی شراب اور جوئے سے شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اللہ کے ذکر سے روک دے۔ اب ہم الگ الگ دونوں حوالوں سے دیکھتے ہیں کہ شیطان کس طرح ان کے ذریعہ ذکر اللہ سے روکتا ہے۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے 'اس کا سب سے پہلا اثر جو ایک مے خوار یعنی شرابی پر ہوتا ہے 'وہ یہ ہے کہ شراب کا نشہ اسے زندگی کی ضرورتوں اور زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا راستہ دکھاتا ہے 'وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے جب اپنی کوتاہیوں کے باعث عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ حالات کا مقابلہ کرے اور محنت اور کوشش سے ناکامیوں پر غالب آنے کی کوشش کرے 'وہ شراب کے نشے میں مغلوب ہو کر گریز کی ایک صورت پیدا کرلیتا ہے۔ شروع شروع میں تو ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے اس کی مشکلات بڑھتی جاتی ہیں 'ویسے ویسے اس کی خیالی جنت کی طلب افزوں ہوتی جاتی ہے 'آخر وہ مرحلہ بھی آجاتا ہے کہ انسانی ذمہ داریوں سے فرار کے بعد 'وہ اللہ کی یاد سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسے یہ بات بھول جاتی ہے کہ مجھے کل کو اللہ کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کوئی ٹیم اس وقت تک کامیابی حاصل کرتی ہے 'جب تک ان میں کپتان کی اطاعت کا جذبہ اور ٹیم ورک موجود ہو۔ کوئی ادارہ بھی اسی وقت تک اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکتا ہے 'جب تک اسے اپنے سربراہ کا احساس اور اپنی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود فراموشی 'یہ کسی کے لیے بھی سب سے بڑی سزا ہے اور یہ اس کی ناکامیوں کا اصل باعث ہے۔ یہاں یہی کہا جارہا ہے کہ شیطان

تمہیں شراب کے ذریعے سے اللہ کے ذکر سے روک کر تمہیں اصل قوت سے محروم کردے گا۔ شروع میں تمہارے اندر خدا فراموشی آئے گی ،جس کے نتیجے میں تمہیں خود فراموشی کی سزا ملے گی اور یہ وہ سزا ہے ،جس کے بعد نہ کوئی فرد باقی رہتا ہے ،نہ کوئی قوم زندہ رہتی ہے۔
جواء اور قمار کے ذریعہ بھی شیطان اللہ کے ذکر سے روکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ جوا کھیلنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں بغیر محنت کیے ،بغیر تکلیف اٹھائے ،بغیر حالات سے لڑے ،بغیر دوڑ بھاگ کیے اور بغیر عرصہ دراز تک امید کے چراغ جلائے ،کوئی ایسا ہاتھ ماروں جس کے نتیجے میں مجھے ایک بڑی دولت مل جائے۔ میں راتوں رات امیر بن جاؤں۔ پھر زندگی کو میں عیش و عشرت سے گزاروں۔ یہ خواہش یوں تو بڑی مختصر اور بڑی معصوم سی لگتی ہے ،لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ہوس زر اور دنیا کی محبت کا ایسا شدید غلبہ ہوتا ہے ،جس کے سامنے نہ حلال و حرام کی تمیز باقی رہتی ہے ،نہ کسی اخلاقی قدر کا وجود رہتا ہے۔ نہ انسانیت کے رشتے باقی رہتے ہیں ،نہ ذمہ داریوں کے احساس کا وجود رہتا ہے۔ آدمی کے سر پر پیسے دھیلے کی ایک ایسی دھن سوار ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کی سب سے بڑی قدر ،سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی عزت کی علامت صرف دولت دنیا کو سمجھتا ہے۔ یہی اس کا معبود ہے ،جس کی وہ رات دن پوجا کرتا ہے۔ یہی اس کا محبوب ہے ،جس کے وہ راتوں کو سپنے دیکھتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے وہ اس طرح فرار اختیار کرتا ہے ،جس طرح ایک سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا اور اس سے دوڑتا ہے۔ قمار اسی دولت دنیا کی ہوس کو عبادت کی حد تک پہنچا دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں جیسے میں نے عرض کیا کہ ہر تعلق بھول جاتا ہے اور انسانیت تک پسپا ہو جاتی ہے۔ آدمی شہنشاہ بھی ہو تو حب دنیا کا اسیر ہو کر وہ اسلامی دنیا کو تباہ کرنے پر تل جاتا ہے۔ یہ ہم تاریخ میں جتنے غداروں کے نام پڑھتے ہیں ،ان کی اگر آپ تحقیق کریں تو ان میں سے ایک ایک فرد آپ کو حب دنیا کا اسیر بلکہ اس کی محبت میں پاگل اور دیوانہ دکھائی دے گا۔ کسی نے اس کے نتیجے میں ملک بیچا ،کسی نے قوم تک فروخت کر ڈالی۔ یہ میر جعفر و میر صادق (ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کے غدار) قسم کی مخلوق ،اسی خطرناک بیماری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مستعصم عباسی جیسا خلیفہ بھی خلافت کو تار تار کرکے رکھ دیتا ہے۔ یہ بیماری کئی اور اسباب سے بھی پیدا ہوتی ہے ،لیکن اس کا اہم تر ذریعہ یہی جوا اور قمار ہے ،جس کا آخری نتیجہ خدا فراموشی ہے۔ جس کی سزا خود فراموشی کی شکل میں ملتی ہے اور بالآخر تمام ذمہ داریوں ،تعلقات ،رشتے ناطے حتیٰ کے اپنی ذات کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔
-3 تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ "شیطان تمہیں نماز سے روک دینا چاہتا ہے"۔ یہ اگرچہ ذکر اللہ ہی کا ایک حصہ ہے ،لیکن الگ سے اس کا ذکر یقینا بے سبب نہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شراب ہو یا قمار ،ان خانہ خراب قسم کی برائیوں کے نتیجے میں شیطان سب سے پہلے جس عظیم نعمت سے مسلمانوں کو محروم کرتا ہے ،وہ نماز ہے کیونکہ نماز ہی اصل میں اللہ کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پانچ وقت نماز کے ذریعہ اللہ کی یاد دہانی اس طرح آسان کر دی گئی ہے کہ اگر آدمی تھوڑے سے احساس سنجیدگی کے ساتھ نماز ادا کرے تو اللہ کی یاد سے غافل ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس معاشرے کو اللہ کی یاد سے غافل کرنا مقصود ہو ،اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ اسے نماز سے غافل کر دیا جائے اور جس معاشرے کو اللہ سے جوڑنا مقصود ہو ،اس کا بھی اہم تر راستہ یہ ہے کہ اسے نماز کا عادی بنا دیا جائے اور نماز کے شعور سے بہرہ ور کر دیا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اندر جو سب سے پہلی خرابی پیدا ہوئی ، جس کے نتیجے میں پھر وہ دوسری خرابیوں کا شکار ہوئے اور آخر اپنے انجام کو پہنچ گئے ،وہ خرابی یہی تھی کہ انھوں نے نماز ضائع کر دی تھی۔

شراب توآدمی کو ہوش وحواس سے بے بہرہ کردیتی ہے اور خود اس کو اپنی ذات سے محروم کردیتی ہے اور جواء دنیا طلبی کی محبت میں ڈبو کر اور آئے دن جوئے کی سکیموں میں اندھوں کی طرح لگا کر باقی ہر رشتے سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کی موجودگی میں نماز سے تعلق باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب نماز غائب ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی یاد یعنی ذکر اللہ کا کونسا موقع باقی رہ جاتا ہے۔
خمر اور قمار کے بارے میں تفصیل سے ان برائیوں کا ذکر کرنے اور اس کی ممکن قباحتوں اور خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد مسلمانوں سے پوچھا جارہا ہے:

فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ

(تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو)
استفہام عربی زبان میں تاکید ' اقرار ' تنبیہ ' انکار ' زجر ' امر اور تحقیر کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ امر کے مفہوم میں ہے۔ لیکن اس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر ' موعظت ' تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہوگیا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شراب اور جوئے کے مقاصد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے آچکی ہے کہ اب اس معاملے میں کسی کے لیے بھی کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تو بتاؤ اب بھی اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ اب تمہارے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ اگر تم ان تمام خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کے بچھائے ہوئے جال سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت میں آجاؤ اور اس کی نافرمانی اور سرکشی سے بچو۔ (روح)

شراب پینے سے عداوت یوں اٹھتی ہے کہ شرابی لوگ جب شراب پی کر مخمور ہوتے ہیں تو آپس میں خوب جھگڑتے اور پھر لڑ مرتے ہیں، جیسے ایک انصاری نے شراب کے نشے میں حضرت سعد بن وقاص کو اونٹ کی ہڈی ماری تو وہ زخمی ہو گئے تھے۔۔ یونہی۔۔ قمار بازی میں عداوت یوں پیدا ہوتی ہے، کہ ایسے مال، اہل و عیال کی بھی شرط لگا دیتے ہیں اور جب ان میں ایک کامیاب ہو گیا، تو دوسرا اسپر کڑھتا رہا اور اپنے حریف کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دشمن بن گیا۔
چونکہ شراب نوشی عرب کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔۔ تو رب کریم نے کرم فرمایا اور یکبارگی شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں فرمادیا، بلکہ پہلے پہل مختلف انداز سے شراب نوشی کی قباحت وشناعت ان کے دل ودماغ میں راسخ فرمادی۔۔ کہیں اسے پلید قرار دیا
۔۔ کہیں اسے شیطان کے کاموں سے قرار دیا۔۔ کہیں اس سے کنارہ کشی کو بہتر فرمایا
۔۔ کہیں مفاسد و مصائب سے جھٹکارے کو اس سے پرہیز پر موقوف و متعلق رکھا۔۔۔
کہیں اسے دشمنی و خصومت کا سبب قرار دیا۔۔ کہیں اسے یاد الٰہی سے باز رکھنے والی چیز بتایا۔۔ کہیں اسے نماز سے مانع فرمایا۔
نبی کریم کی حکیمانہ دعوت اور آپ کی بابرکت صحبت کا اثر یہ ہوا کہ فاروق اعظم نے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمادیا، کہ کاش کہ مولیٰ تعالیٰ اس کی حرمت کا حکم فرمادے، پھر کہیں جا کر رب کریم نے صاف صاف لفظوں میں شراب نوشی سے اجتناب کو فرض قرار دیکر اس کی حرمت کا اعلان فرمادیا۔ نبی کریم نے تو یہاں تک ارشاد فرمادیا کہ: مدمن الخمر کعابد الوثن۔

ہمیشہ شراب پینے والا بت پرست کے مانند ہے

شراب پینے سے عداوت یوں اٹھتی ہے کہ شرابی لوگ جب شراب پی کر مخمور ہوتے ہیں تو آپس میں خوب جھگڑتے اور پھر لڑ مرتے ہیں، جیسے ایکانصاری نے شراب کے نشے میں حضرت سعد بن وقاص کو اونٹ کی ہڈی ماری تو وہ زخمی ہو گئے تھے۔۔ یونہی۔۔ قمار بازی میں عداوت یوں پیدا ہوتی ہے، کہ ایسے مال، اہل و عیال کی بھی شرط لگا دیتے ہیں اور جب ان میں ایک کامیاب ہو گیا، تو دوسرا اسپر کڑھتا رہا اور اپنے حریف کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دشمن بن گیا۔

چونکہ شراب نوشی عرب کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔۔ تو رب کریم نے کرم فرمایا اور یکبارگی شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں فرمادیا، بلکہ پہلے پہل مختلف انداز سے شراب نوشی کی قباحت و شناعت ان کے دل و دماغ میں راسخ فرمادی۔۔ کہیں اسے پلید قرار دیا

۔۔ کہیں اسے شیطان کے کاموں سے قرار دیا۔۔ کہیں اس سے کنارہ کشی کو بہتر فرمایا

۔۔ کہیں مفاسد و مصائب سے جھٹکارے کو اس سے پرہیز پر موقوف و متعلق رکھا۔۔۔

کہیں اسے دشمنی و خصومت کا سبب قرار دیا۔۔ کہیں اسے یاد الٰہی سے باز رکھنے والی چیز بتایا۔۔ کہیں اسے نماز سے مانع فرمایا۔

نبی کریم کی حکیمانہ دعوت اور آپ کی بابرکت صحبت کا اثر یہ ہوا کہ فاروق اعظم نے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمادیا، کہ کاش کہ مولیٰ تعالیٰ اس کی حرمت کا حکم فرمادے، پھر کہیں جاکر رب کریم نے صاف صاف لفظوں میں شراب نوشی سے اجتناب کو فرض قرار دیکر اس کی حرمت کا اعلان فرمادیا۔ نبی کریم نے تو یہاں تک ارشاد فرمادیا کہ: مدمن الخمد کعابد الوثن۔

ہمیشہ شراب پینے والا بت پرست کے مانند ہے۔

۔۔ المختصر۔۔ شراب و قمار کے استعمال سے دنیا کے بڑے بڑے فسادات برپا ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا ارشاد میں صرف شراب قمار سے 'نہی 'مقصود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ 'ازلام وانصاب 'جس سے اہل ایمان پہلے ہی سے دور تھے، کا ذکر صرف یہ ظاہر کرنے کیلئے کر دیا گیا، کہ شراب وجوا بھی خرابیوں کے لحاظ سے 'ازلام وانصاب 'سے کچھ کم نہیں۔ پس اے ایمان والو 'جیسے تم 'ازلام وانصاب 'کو برا سمجھتے ہو 'ایسے ہی یہ شراب و قمار بھی ہیں۔ یہ شراب و قمار دینی امور میں بھی بہت خلل ڈالتے ہیں، اس لیے کہ شراب سے طرب و مستی پیدا ہوتی ہے اور لذت جسمانیہ اور شہوت نفسانیہ شراب سے نشو و نما پاتی ہے اور یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ذکر، یہاں تک کہ افضل الذکر نماز سے روکتے ہیں۔

اسی طرح قمار بھی، کہ اس کا انہماک بھی عبادت سے غفلت کا سبب بنتا ہے، جبکہ اپنے حریف پر غلبہ پاجائے تو بھی اسے حرص ہوتی ہے کہ کام بن رہا ہے، اسے مکمل کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سے غفلت چھاجائیگی، تو عبادت و ذکر و فکر اور نماز چلی جائے گی۔ اور اگر مغلوب ہو رہا ہے، تو بھی چاہے گا کہ نماز و عبادت وغیرہ جاتی ہے تو جانے دو، میں اپنے حریف سے بدلہ لونگا۔ اس طرح سے نماز اور ذکر الٰہی سے محروم ہو جائیگا۔

(اور) شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ (روک دے تم کو ذکر الٰہی سے، اور) خصوصیت کے ساتھ سب زیادہ عظیم ذکر (نماز سے)۔ (تو) ایمان والو! ان بری باتوں کے عیبوں سے مطلع ہو چکنے، بلکہ اس کے مفاسد کو بچشم خود دیکھ لینے کے بعد، (اب کیا تم باز آئے)؟

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب شراب و قمار کے جملہ عیوب تم پر ظاہر ہو چکے، تو تم ان کے قریب نہ ہو جاؤ اور ان کو انجام دینے سے مکمل طور پر اپنے کو روک لو۔ (گلدستہ)

۔۔المختصر۔۔شراب وقمار کے استعمال سے دنیا کے بڑے بڑے فسادات برپا ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا ارشاد میں صرف شراب قمار سے 'نہی 'مقصود ہے۔اس کے ساتھ ساتھ 'ازلام وانصاب 'جس سے اہل ایمان پہلے ہی سے دور تھے،کا ذکر صرف یہ ظاہر کرنے کیلئے کردیا گیا،کہ شراب وجوا بھی خرابیوں کے لحاظ سے 'ازلام وانصاب 'سے کچھ کم نہیں۔پس اے ایمان والو 'جیسے تم 'ازلام وانصاب 'کو برا سمجھتے ہو 'ایسے ہی یہ شراب وقمار بھی ہیں۔یہ شراب وقمار دینی امور میں بھی بہت خلل ڈالتے ہیں،اس لیے کہ شراب سے طرب ومستی پیدا ہوتی ہے اور لذت جسمانیہ اور شہوت نفسانیہ شراب سے نشو ونما پاتی ہے اور یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ذکر، یہاں تک کہ افضل الذکر نماز سے روکتے ہیں۔

اسی طرح قمار بھی،کہ اس کا انہماک بھی عبادت سے غفلت کا سبب بنتا ہے،جبکہ اپنے حریف پر غلبہ پاجائے تو بھی اسے حرص ہوتی ہے کہ کام بن رہا ہے،اسے مکمل کرنا ضروری ہے۔اس طرح سے غفلت چھا جائیگی،تو عبادت وذکر وفکر اور نماز چلی جائے گی۔اور اگر مغلوب ہو رہا ہے، تو بھی چاہے گا کہ نماز وعبادت وغیرہ جاتی ہے تو جانے دو،میں اپنے حریف سے بدلہ لونگا۔اس طرح سے نماز اور ذکر الٰہی سے محروم ہو جائیگا۔

(اور) شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ (روک دے تم کو ذکر الٰہی سے،اور) خصوصیت کے ساتھ سب زیادہ عظیم ذکر (نماز سے)۔(تو) ایمان والو! ان بری باتوں کے عیبوں سے مطلع ہو چکنے،بلکہ اس کے مفاسد کو بچشم خود دیکھ لینے کے بعد،(اب کیا تم باز آئے)؟

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب شراب وقمار کے جملہ عیوب تم پر ظاہر ہو چکے،تو تم ان کے قریب نہ ہو جاؤ اور ان کو انجام دینے سے مکمل طور پر اپنے کو روک لو۔(اشرفی)

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے،وہ بری ہے۔چھوڑنے کے قابل ہے۔اسی لیے جمعہ کی اذان کے بعد تجارت حرام ہے۔(نور)

آیت مبارکہ:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

لغۃ القرآن: [وَاَطِيْعُوا : اور تم اطاعت کرو][اللّٰهَ : اللہ][وَاَطِيْعُوا : اور اطاعت کرو][الرَّسُوْلَ : رسول][وَاحْذَرُوْا : اور تم ڈرو][فَاِنْ : پس اگر][تَوَلَّيْتُمْ : تم پھرگئے][فَاعْلَمُوْٓا : تو جان لو][اَنَّمَا : یقینا][عَلٰي : پر][رَسُوْلِنَا : ہمارا رسول][الْبَلٰغُ : پہنچادینا][الْمُبِيْنُ : واضح]

ترجمہ: اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور (خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت سے) بچتے رہو، پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صرف (احکام کا) واضح طور پر پہنچا دینا ہی ہے (اور وہ یہ فریضہ ادا فرما چکے ہیں) (عرفان)

تشریح:

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو احکام قرآن مجید میں نازل فرمائے یا جن احکام کی نشاندہی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حدیث پاک میں فرمائی، تم ان سب کی نافرمانی سے بچو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اور اگر تم نے احتیاط سے کام نہ لیا اور ان احکام سے روگردانی کی تو پھر یاد رکھو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو فرض تبلیغ تھا وہ تو انھوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کر دیا ہے اب تمہارے پاس کیسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ (امداد)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے روایت کی ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جس نے شراب پی اللہ اس کی چالیس صبح تک کی نماز قبول نہیں فرماتا اگر وہ توبہ کرے تو اللہ توبہ قبول فرماتا ہے پھر اگر وہ اس ذلیل گناہ میں دوبارہ مشغول ہو جائے تو چالیس دن تک کی نماز قبول نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ بار بار تکرار پر توبہ بھی قبول نہیں کرتا۔ طینتہ الخبال کا پانی اس کو پلائے گا۔ (رواہ الترمذی) اس کا حال تو یہ ہے۔

شب کو مے پی صبح کو توبہ کر لی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

یہ وعید و تہدید ہے کہ جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم الٰہی عزوجل صاف صاف پہنچا دیا تو ان کا فرض ادا ہو گیا اب جو اعراض و انحراف کرے وہ مستحق عذاب آخرت ہے۔ اب وہ جو شراب حرام کئے جانے سے قبل وفات پا چکے ان کی برأت کی گئی۔ (حسنات)

قرآن مجید نے بارہا اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ رسول کی ذمہ داری فقط یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے پیغام من و عن لوگوں تک پہنچائے اور اس پر خود عمل کر کے اپنے آپ کو نمونہ کے طور پر پیش کرے۔ تاکہ لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ یہاں یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ممنوعات سے بچنا اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا ہے۔

اس بات کو اس طرح بھی بیان فرمایا جو کچھ تمہیں رسول دیتا ہے اسے قبول کرو اور جس سے روکتا ہے اس سے رک جاؤ کیونکہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ یہاں ماضی کے حوالے سے ایک استفسار کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ جب شراب حرام ہونے کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام (رض) نے کہا اے اللہ کے رسول! ہمارے ان بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے تھے اور اسی دور میں فوت ہو گئے اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (مسند احمد) (فہم)

نفع نقصان کا احاطہ نہ کرسکو تو بھی اطاعت کرو

اگر کسی چیز کے منافع و مضار کا احاطہ نہ کرسکو تب بھی خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ اگر نہ بچوگے تو ہمارے پیغمبر تم کو قانون و احکام الٰہی کھول کر پہنچا چکے۔ نتیجہ خلاف ورزی کا خود سوچ لو کیا ہوگا۔ (گلدستہ)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ اور گزشتہ آیات میں محرمات شرعیہ کے سلسلے میں جس طرح تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں اتمام حجت کے طور پر کہا جارہا ہے کہ جہاں تک سمجھانے بجھانے اور مختلف پیرایوں میں شرعی احکام کی وضاحت کا تعلق تھا اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی 'اب بھی اگر تم بجائے اطاعت کے معصیت کا راستہ اختیار کرتے ہو تو تم اللہ کے حضور اپنی ذمہ داری کے حوالے سے پکڑے جاؤگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ ان کا کام صاف صاف واضح طور پر اللہ کے احکام کو پہنچانا ہے 'سوانھوں نے پوری طرح اس کا حق ادا کردیا اور مکمل طور پر اتمام حجت کردیا۔ اب جو اس کے بعد بھی بے راہ روی اختیار کرے گا وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھے۔
شراب کی حرمت کا ذکر جس تفصیل اور شدت کے ساتھ کیا گیا ہے اور پھر آخر میں جس طرح اس سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے 'اس میں یقینا ایک زجر اور توبیخ مضمر ہے۔ کوئی وجہ نہیں تھی اسلامی معاشرے پر اس کے اثرات مرتب نہ ہوتے جبکہ وہ معاشرہ صحابہ کرام (رض) کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے واقعی اثرات محسوس کیے اور اس کی وجہ سے 'وہ اس پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ شراب کی حرمت کے اس حکم کے نزول سے پہلے دو ابتدائی حکم بھی آچکے تھے 'کیا ہی اچھا ہوتا کہ بعض دوسرے صحابہ (رض) کی طرح ہم اسی وقت شراب نوشی سے رک جاتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شراب کی برائی کے ذکر کے باوجود (اگرچہ اس کی حرمت کا ذکر نہیں آیا تھا) ہم نے نہ رک کر کوئی برائی کی ہو اور یہ جو تاخیر ہم سے ہوئی ہے 'کہیں اللہ کے ہاں اس کی بازپرس نہ ہو۔ مزید پریشانی انھیں یہ بھی لاحق ہوئی کہ کتنے مسلمان شراب کی اس مکمل حرمت کے نزول سے پہلے اللہ کو پیارے ہوگئے اور اس دوران وہ شراب پیتے رہے 'کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے اس بارے میں سوال ہو 'چنانچہ یہی احساسات زبانوں پر بھی آئے اور اس کے جواب میں پروردگار نے اگلی آیت نازل فرمائی۔ (روح)

ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو

گزشتہ آیات میں شراب اور جوئے کے نقصانات بتلا کر ان کی ممانعت کا حکم فرمایا گیا تھا۔ گویا ایک حکم خاص کے امتثال کا امر فرمایا تھا۔ اب آگے مطلقاً تمام احکامات میں اہل اسلام کو اطاعت کرنے کا امر فرمایا جارہا ہے اور عام ہدایت دی جارہی ہے کہ تمام امور کی حلت اور حرمت میں خدا اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق عمل کرو اور ہر قسم کی نافرمانی اور قانون الٰہی کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ پھر یہ بھی بتلا دیا کہ اگر ایسا نہ کروگے اور خدا اور اس کے رسول کے احکام کو نہ مانوگے تو اس میں نہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان ہے نہ اس کے رسول کا۔ اطاعت و نافرمانی سے تمہارا ہی نفع نقصان وابستہ ہے خدا کی کوئی غرض متعلق نہیں ہے نہ اس کے رسول کی۔ اس کے رسول کا کام صرف علی الاعلان واضح طور پر احکام الٰہی کی تبلیغ ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پوری طرح پہنچا چکے۔ اب اگر تم خلاف ورزی کروگے تو نتیجہ خود سوچ لو۔

مومن کی شان

یہاں اطیعوااللہ واطیعواالرسول کے ساتھ واحذروایعنی احتیاط رکھو۔ پرہیز رکھو کا لفظ استعمال فرما کر مومن کی شان کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ مومن کی شان تو اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا ہی ہے اس کی تو یہ شان ہی نہیں کہ دیدہ دانستہ دلیری اور بے باکی سے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی مخالفت کرے۔ ہاں بشریت کی کمزوری کی بناء پر کبھی تقصیرات ہو سکتی ہیں۔ کبھی خطائیں اور لغزشیں ممکن ہیں۔ اس لیے ہدایت فرمائی کہ غور اور اہتمام سے اللہ اور رسول کے احکامات میں تقصیرات اور لغزشوں اور خطاؤں سے بچتے رہنا۔

اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اہمیت

یہاں آیت میں اطیعوااللہ اوطیعواالرسول علیحدہ علیحدہ فرمایا اور کئی جگہ قرآن پاک میں اہل ایمان کو مخاطب کرکے یہ حکم دیا گیا گویا اس حکم میں "اطیعواالرسول" کو "اطیعوااللہ" سے الگ مستقل جملہ میں ذکر کیا گیا ہے جس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے۔ نیز اللہ اور رسول کی اطاعت کو الگ الگ بیان فرمانے میں اشارہ ہے کلام اللہ اور اسوہ رسل دونوں کی اطاعات کا۔ اگرچہ حقیقت میں اسوہ رسول اور کلام اللہ دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے۔ اسوہ احکام قرآنی پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عمل کرنے کی ایک صورت ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بہتر احکام قرآن پر عمل کون کرسکتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید اگر حکم الٰہی ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عمل اس کی تعمیل کا بہترین نمونہ ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ صرف کلام الٰہی کے پہنچادینے والے تھے بلکہ تعمیل احکام الٰہی کے لیے بہترین نمونہ بھی تھے۔ اور اسی طرح مقصد تبلیغ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ آپ نے احکام الٰہی پر عمل کرکے دکھلا دیا تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہوجائے اور اس طرح تبلیغ احکام الٰہی کی تکمیل فرمائی۔

دعا کیجئے: یااللہ ہم کو اپنی اور اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کامل اطاعت وفرمان برداری نصیب فرما اور ظاہراً و باطناً وحالاً و قالاً شریعت مطہرہ کی پابندی عطافرما۔ یااللہ آپ کے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تو آپ کے تمام احکام کو صاف صاف امت تک پہنچا دیا مگر ہم نے احکام الٰہیہ سے اعراض کرکے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یااللہ ہمارے اس جرم عظیم کو اپنی رحمت سے معاف فرمادے اور گزشتہ پر توبہ اور تلافی کی توفیق عطافرمادے۔ اور آئندہ کے لیے ہر معاملہ میں اطیعوااللہ واطیعواالرسول کی توفیق عطافرمادے۔ آمین۔ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین (درس اسحاق)

فوائد

1: اللہ کی اطاعت صرف اس کے احکام میں ہے۔ رسول کی اطاعت قولی احکام میں بھی ہے اور عملی سنتوں میں بھی۔ کہ جس کا حکم دیں وہ فرض یا واجب ہے۔ جو ہمیشہ عمل کریں وہ سنت موکدہ۔

2: اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے نہ ماننے سے حضور پر نور پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سورج کے انکار سے اس کی روشنی میں کمی نہیں آجاتی۔ کیونکہ ان پر تبلیغ لازم تھی جو انھوں نے بدرجہ اتم فرمادی۔ ہم ہی ان کے حاجت من دہیں وہ ہمارے حاجت مند نہیں۔ (نور)

آیت مبارکہ:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾

لغۃ القرآن: [لَيْسَ : نہیں][عَلَي : پر][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][وَعَمِلُوا : اور عمل کیے][الصّٰلِحٰتِ : نیک][جُنَاحٌ: کوئی گناہ][فِيْمَا : اس میں جو][طَعِمُوْٓا : وہ کھاچکے][اِذَا : جب][مَا اتَّقَوْا : وہ پرہیز کریں][وَّاٰمَنُوْا : اور وہ ایمان لائیں][وَعَمِلُوا : اور عمل کریں][الصّٰلِحٰتِ : نیک][ثُمَّ اتَّقَوْا : پھر وہ ڈرجائیں][وَّاٰمَنُوْا : اور ایمان لائیں][ثُمَّ اتَّقَوْا : پھر وہ ڈرجائیں][وَّاَحْسَنُوْا: اور نیکی کرو][وَاللّٰهُ : اور اللہ][يُحِبُّ : پسند کرتا ہے][الْمُحْسِنِيْنَ : نیکی کرنے والے]

ترجمہ: ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اس (حرام) میں کوئی گناہ نہیں جو وہ (حکم حرمت اترنے سے پہلے) کھا پی چکے ہیں جب کہ وہ (بقیہ معاملات میں) بچتے رہے اور (دیگر احکامِ الٰہی پر) ایمان لائے اور اعمال صالحہ پر عمل پیرا رہے، پھر (اَحکامِ حرمت کے آجانے کے بعد بھی ان سب حرام اشیاء سے) پرہیز کرتے رہے اور (ان کی حرمت پر صدقِ دل سے) ایمان لائے، پھر صاحبانِ تقویٰ ہوئے اور (بالآخر) صاحبانِ احسان (یعنی اللہ کے خاص محبوب و مقرب و نیکوکار بندے) بن گئے، اور اللہ احسان والوں سے محبت فرماتا ہے۔ (عرفان)

تشریح: جب شراب وجوا کی حرمت کے احکام نازل ہوئے تو بعض صحابہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمارے وہ مسلمان بھائی جو اس حکم سے پہلے انتقال کر گئے اور مختلف جنگوں میں شہادت پائی حالانکہ وہ شراب پیا کرتے تھے ان کا کیا بنے گا؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس آیت میں اتقواوامنوا۔ اتقواوامنوا۔ اور اتقواواحسنو کے الفاظ کا تکرار بہت غور طلب اور معنی خیز ہے۔ علامہ بیضاوی (رح) فرماتے ہیں کہ ان مکرر الفاظ سے صحابہ کرام کی تین حالتوں یا ان کے تین مقامات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ پہلے اتقواوامنوا سے ان کے تقویٰ وایمان کی اس حالت کا بیان ہے جس کا تعلق ان کے اپنے قلب وروح کے ساتھ ہے۔ دوسرے وا تقواوامنوا سے ان کے تقویٰ وایمان کی اس کیفیت کا ذکر ہے جو ان کے اور

دوسرے لوگوں کے درمیان تھی۔ اور آخری اتقوا واحسنوا سے تقویٰ واحسان کی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان تھی۔ یا پہلے ان کے ابتدائی مقام کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ان کی درمیانی حالت کی طرف اور آخرت میں ان کی اعلیٰ ترین کیفیت کی طرف جب کہ عابد و معبود، ساجد و مسجود میں دوری کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور نعمت مشاہدہ سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اسی لیے آخر میں و اتقوا واحسنوا فرمایا جب کہ انسان مقام احسان پر فائز ہوتا ہے۔ اور احسان کا مفہوم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ یعنی احسان اس کیفیت کو کہتے ہیں جب کہ تو اللہ تعالیٰ اس طرح عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے یا حالت عبادت میں تم یہ سمجھ رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یعنی وہ صحابہ کرام تقویٰ اور ایمان کی منزلیں طے کرتے کرتے جب مقام احسان پر فائز ہوگئے تو وہ خداوند عالم کے محبوب بن گئے۔ اب ان سے ایسی چیزوں کی پرسش نہ ہوگی جن کی حرمت کا حکم اس وقت تک نازل نہ ہوا تھا۔ (ضیاء)

شان نزول کا بیان

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب شراب حرام ہونے کا حکم نازل ہوا تو صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ہمارے ان بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے تھے اور اسی حال میں فوت ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے جو کچھ (پہلے) کھا پی چکے ہیں ' ان سے ان پر کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ (الایہ) (مسند احمد 'ج ۱ 'رقم الحدیث : '۱۶۹۱۔ ۲۴۵۲۔ ۲۰۸۸ 'دارالفکر 'مسند احمد 'ج ۱ ص ۲۳۴ ' طبع قدیم 'جامع البیان 'جزء ۷ 'ص ۵۰ 'امام حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی 'المستدرک ج ۴ 'ص ۱۴۳)
حضرت براء (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب میں سے کچھ لوگ شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے فوت ہوگئے 'جب شراب حرام کردی گئی تو صحابہ نے کہا ہمارے ان اصحاب کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے رہے اور فوت ہوگئے 'تب یہ آیت نازل ہوئی امام ابو عیسیٰ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۳۰۶۲۔ ۳۰۶۱ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۲ ' رقم الحدیث : '۵۳۵۰ 'مسند ابو یعلی '۱۷۲۰ 'جامع البیان 'ج ۷ 'ص ۵۰)

تحریم خمر کی تاریخ

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ ھ لکھتے ہیں
میں نے سورۃ مائدہ کی تفسیر میں یہ لکھا تھا کہ شراب فتح مکہ کے سال (۸ ھ) میں فتح مکہ سے پہلے حرام کی گئی تھی 'پھر میں نے دیکھا کہ علامہ دمیاطی نے اپنی سیرت میں جزم کے ساتھ لکھا ہے کہ شراب کو حدیبیہ کے سال حرام کیا گیا اور حدیبیہ کا واقعہ چھ ہجری میں ہوا تھا 'اور امام ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یہ حکم بنو نضیر کے واقعہ میں نازل ہوا تھا اور جنگ احد کے بعد کا واقعہ ہے اور راجح قول کے مطابق یہ چار ہجری کا واقعہ ہے ' لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو میں (انس) لوگوں کو شراب پلا رہا تھا اور میں اس وقت قوم میں سب سے چھوٹا تھا۔ (صحیح البخاری 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۵۵۸۳) تو اگر چار ہجری میں شراب کی تحریم نازل ہوئی تو

حضرت انس اس وقت چودہ سال کے ہوں گے ' تو پھر وہ ان میں سب سے چھوٹے کیسے ہوئے۔ (فتح الباری ' ج ۱۰ 'ص ۳۱ 'مطبوعہ لاہور ' ۱۴۰۱)

شراب کو حرام کرکے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے 'کیونکہ شراب عقل کو زائل کردیتی ہے سو جو چیز عقل کو زائل کردے 'اس کو حرام کردینا ہم پر بہت بڑا انعام ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے تو پھر گزشتہ امتوں میں خمر کو کیوں حلال رکھا گیا 'جبکہ عقل کی ان کو بھی ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نشہ کرنا تمام ادیان میں حرام رہا ہے 'ان پر خمر کی قلیل مقدار حلال تھی 'ہم پر خمر کی قلیل مقدار بھی حرام کردی گئی 'تاکہ قلیل مقدار میں خمر کا پینا کثیر مقدار میں خمر پینے کا ذریعہ نہ بن جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر خصوصی کرم ہے 'کیونکہ اس نے ہم کو خیر امم قرار دیا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پھر اس حکمت کی وجہ سے ابتداء اسلام میں خمر کو حرام کیوں نہیں قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء اسلام میں خمر کو مباح رکھا 'تاکہ مسلمان خمر کے فساد کا خود مشاہدہ کریں 'حتیٰ کہ جب ان پر خمر حرام کردی گئی تو انھوں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم برحق ہے۔

اللہ کے خوف کو تین بار ذکر کرنے کی توجیہات

اس آیت میں فرمایا ہے بشر طیکہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور ایمان پر برقرار رہیں اور نیک عمل کرتے رہیں 'پھر اللہ سے ڈرتے رہیں اور بدستور ایمان پر قائم رہیں 'پھر اللہ سے ڈرتے رہیں اور اچھے کام کرتے ہیں۔

اس آیت میں دو مرتبہ ایمان لانے اور تین مرتبہ اللہ سے ڈرنے کا ذکر فرمایا ہے 'اس کی کئی تفسیریں ہیں۔

(۱) پہلے ایمان اور تقوی سے مراد اصل ایمان اور اصل تقوی ہے 'یعنی انھوں نے شرک اور کفر کو ترک کیا اور اللہ پر ایمان لائے اور دوسری مرتبہ اللہ سے ڈرنے اور اس پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس ایمان اور تقوی پر برقرار رہے اور تیسری مرتبہ اللہ سے ڈرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے خوف سے اس کے بندوں پر ظلم کرنے سے باز رہے 'اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرتے رہے۔

(۲) پہلی بار اللہ کے ڈر اور اس پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور اس کے نازل کیے ہوئے سابقہ احکام مثلاً نماز 'روزہ اور جہاد وغیرہ پر ایمان لائے اور دوسری مرتبہ اللہ کے خوف اور اس پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے خوف سے بعد میں نازل ہونے والے احکام پر ایمان لائے 'مثلاً بعد میں شراب 'جوئے 'انصاب اور ازلام کو حرام کیا گیا 'تو وہ ان کی حرمت پر ایمان لے آئے۔ پھر تیسری بار اللہ کے ڈر سے مراد یہ ہے کہ وہ خوف خدا سے محرمات سے اجتناب کرنے پر برقرار رہے اور نیک سلوک کرتے رہے۔

(۳) پہلی بار اللہ کے ڈر اور اس پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ خوف خدا سے محرمات سے بچتے تھے اور ایمان اور اعمال صالحہ پر برقرار رہتے تھے 'اور دوسری بار ذکر سے مراد یہ ہے کہ وہ خوف خدا سے بعد میں حرام کی جانے والی چیزوں 'مثلاً شراب سے مجتنب ہوئے اور اس کی تحریم پر ایمان لائے اور تیسری بار ذکر سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے ڈر سے اس اجتناب اور اعمال صالحہ پر برقرار رہے۔

(۴) تین بار ذکر سے تین اوقات مراد ہیں 'یعنی وہ ماضی میں اللہ سے ڈرتے تھے 'حال میں بھی اللہ سے ڈرے اور مستقبل میں بھی اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

(۵) تین بار ذکر سے تین احوال مراد ہیں ٬یعنی وہ خوف خدا سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو اللہ عزوجل کی شان کے لائق نہ ہو ٬اور نہ وہ کوئی ایسی بات کہتے ہیں جو آداب رسالت کے منافی ہو ٬اور نہ کوئی ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے اپنے نفس اور عام مسلمانوں کے لیے باعث ضرر ہو ٬ بلکہ اس کے بر عکس وہ اللہ تعالیٰ ٬اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی میں کوشاں رہتے ہیں۔

(٦) وہ خوف خدا سے کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے بچتے ہیں ٬خلاف سنت اور خلاف اولی کاموں سے بچتے ہیں اور بعض ایسے مباح کاموں سے بچتے ہیں جو دناءت اور خست نفس کا سبب ہوں۔

(۷) اس سے مراد سلوک کی ابتداء سلوک کا وسط اور سلوک کی انتہاء ہے جس میں انسان حقیقی سے واصل ہو جاتا ہے۔ (تبیان)

(۸) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے عمر کے تین ادوار مراد ہوں ٬یعنی وہ عمر کی ابتداء میں بھی اللہ سے ڈرتے تھے ٬وسط میں بھی اور آخر میں بھی۔

(۹) وہ شراب کی تحریم نازل ہونے سے پہلے بھی اس سے اجتناب کرتے تھے ٬اس کی تحریم نازل ہونے کے بعد بھی اس سے اجتناب کرتے رہے اور باقی اعمال میں خوف خدا سے گناہوں سے اجتناب کرتے رہے اور نیک عمل کرتے رہے۔

(۱۰) اس تکرار سے ایمان اور خوف خدا کی تاکید اور اس میں مبالغہ مقصود ہے ٬تاکہ مسلمان اس پر نہایت اہمیت کے ساتھ برقرار رہیں۔ (تبیان)

فوائد

۱: اس سے پتہ لگا کہ شرعی حکم آنے سے پہلے انسان پر گناہ کی پکڑ نہیں کیونکہ ابھی وہ کام گناہ نہیں ہوا تھا سوا شرک کے، کہ اگر کسی کو نبوت کے احکام نہ بھی پہنچیں، تب بھی اسے توحید کا اقرار کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ ہر ذرہ اس کی توحید کی گواہی دے رہا ہے۔

۲: یہ آیت ان بزرگوں کے حق میں نازل ہوئی جو شراب حرام ہونے سے پہلے وفات پا چکے تھے اور شراب استعمال فرماتے رہے تھے۔

۳: یہاں تقوی تین جگہ مذکور ہوا ہے۔ پہلے سے مراد برے عقیدوں سے بچنا ہے۔ دوسرے سے شراب، جوئے سے بچنا۔ تیسرے سے تمام بری باتوں سے بچنا مراد ہے۔ (خزائن العرفان)

آیت مبارکہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

لغۃ القرآن: [يَآيُّهَاالَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][لَيَبْلُوَنَّكُمُ : ضرور آزمائے گا تم کو][اللّٰهُ : اللہ][بِشَيْءٍ : کسی چیز][مِّنَ : سے][الصَّيْدِ : شکار][تَنَالُهٗٓ: پہنچے اس تک][اَيْدِيْكُمْ : تمہارے ہاتھ][وَرِمَاحُكُمْ : اور تمہارے نیزے][لِيَعْلَمَ : تاکہ جان لے][اللّٰهُ : اللہ][مَنْ : کون][يَّخَافُهٗ : اس سے ڈرتا ہے][بِالْغَيْبِ : غیب میں][فَمَنِ : پھر جو][اعْتَدٰي : وہ حد سے گزرے][بَعْدَ ذٰلِكَ : بعد وہ][فَلَهٗ : اس کیلئے][عَذَابٌ : عذاب][اَلِيْمٌ : دردناک]

ترجمہ: اے ایمان والو ! اللہ کسی قدر (ایسے) شکار سے تمہیں ضرور آزمائے گا جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں تاکہ اللہ اس شخص کی پہچان کروادے جو اس سے غائبانہ ڈرتا ہے پھر جو شخص اس کے بعد (بھی) حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے

تشریح: عرب کے بادیہ نشین جانوروں اور پرندوں کا شکار کرکے گزراوقات کیا کرتے تھے۔ احرام کی حالت میں ان کا شکار سے باز رہنا کچھ کم صبر آزمانہ تھا۔ خصوصاایسی حالت میں جب کہ قدم قدم پر ہرنوں کی ٹولیاں اور پرندوں کے جھرمٹ دلوں کو للچار ہے ہوں۔ اس کی حقیقت کسی شکاری سے پوچھئے جس کے سامنے سے ہرنوں اور نیل گاؤں کا غول گزر رہا ہو اور وہ انھیں آسانی سے نشانہ بھی بنا سکتا ہو اور اس وقت اسے شکار کرنے سے روک دیا جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس حکم سے مسلمانوں کا امتحان لیا جارہا ہے کہ جب تم احرام باندھ لو تو کسی جانور یا پرندے کو شکار نہ کرو۔ اس میں رسیاں، جال، تیر، بندوق، شکاری کتے غرضیکہ شکار کا ہر ذریعہ داخل ہے۔ (ضیاء)

6 ہجری جس میں حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس سال مسلمان حالت احرام میں تھے۔ اس حالت میں وہ اس آزمائش میں ڈالے گئے کہ شکار کئے جانے والے جانور اور پرندے بڑی کثرت سے آئے اور ان کی سواریوں پر چھاگئے۔ اتنی کثرت تھی کہ صحابہ کرام (رض) کیلئے انھیں ہتھیار

سے شکار کر لینا بلکہ ہاتھ سے پکڑ لینا بالکل اختیار میں تھا، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) لیکن صحابہ کرام (رض) حکمِ الٰہی کی پابندی میں ثابت قدم رہے اور حالت احرام میں شکار نہ کیا۔ اس سے صحابہ کرام (رض) کی عظمت بھی ظاہر ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی گناہ کے اسباب و مواقع جس قدر کثرت سے موجود ہوں ان سے بچنے میں اتنا ہی زیادہ ثواب ہے، جیسے نوجوان کو تقویٰ وپرہیزگاری اور پارسائی کا ثواب بوڑھے کی بَنسبت زیادہ ہے۔ یونہی جو برے لوگوں کے درمیان بھی نیک رہے وہ نیکوں کے درمیان نیک رہنے والے سے بہتر ہے۔ حضرت سیدنا یوسف عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُوَالسَّلَام اور زلیخا کا واقعہ بھی اس بات کی قوی دلیل ہے لیکن یہاں یہ یاد رہے کہ ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ برے دوستوں کی صحبت میں رہ کر یا گناہ کی جگہ جا کر نیک بننے کی کوشش کرے تاکہ زیادہ بڑا متقی بنے بلکہ حتی الامکان ایسی صحبت اور مقام سے بچنا ہی چاہیے کہ زیادہ تقویٰ کی امید پر کہیں اصل ہی سے نہ جاتے رہیں۔ (صراط)

شان نزول

امام ابن ابی حاتم نے مقاتل سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عمرہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ' جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وحشی جانوروں کے شکار کی آزمائش میں مبتلا کیا اور وہ اس وقت احرام باندھے ہوئے تھے ' وحشی جانور بکثرت ان کی سواریوں کے گرد پھر رہے تھے ' اور وہ ان کے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں تھے۔ حضرت ابو جعفر (رض) نے فرمایا پرندوں کے چوزے اور وحشی جانوروں کے بچے اور انڈے ان کے ہاتھوں کی زد میں تھے اور بڑے جنگلی جانور ' مثلا جنگلی گدھا گائے اور اونٹ وغیرہ ان کے نیزوں کی زد میں تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ جو شکار قریب تھے ' وہ ان کے ہاتھوں کی دسترس میں تھے اور جو شکار دور تھے ' وہ ان کے نیزوں کے نشانوں پر تھے۔ نیزہ کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ وہ شکار کرنے کا بڑا ہتھیار ہے ' تیر اور دیگر ہتھیار بھی اس میں شامل ہیں۔ (روح المعانی جز ۷ ص ' ۲۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)
ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم جب حدیبیہ کے سفر پر روانہ ہوئے تو میرے سوا تمام صحابہ (رض) نے احرام باندھا ہوا تھا۔ میرے ساتھیوں نے راستہ میں ایک جنگلی گدھا دیکھا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں اپنا جوتا سینے میں مشغول تھا لیکن انھوں نے مجھے نہیں بتلایا اگرچہ وہ چاہتے تھے کہ میں اسے دیکھ لوں۔ اچانک میں نے نظر اٹھائی تو گدھا دیکھا۔ گدھا سے مراد نیل گائے ہے۔ میں گھوڑے پر زین کس کر اس پر سوار ہوا اور جلدی میں کوڑا اور نیزہ لینا بھول گیا میں نے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے کوڑا اور نیزہ اٹھا کر پکڑا دو۔ انھوں نے کہا اللہ کی قسم ! ہم اس کام میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ مجھے غصہ آیا۔ لیکن میں نے اتر کر کوڑا اور نیزہ پکڑا اور سوار ہو گیا۔ پھر میں نیل گائے پر حملہ آور ہوا اور نیزہ مار مار کر اسے روک لیا میں نے اس دوران ان سے مدد طلب کی انھوں نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر ہم سب نے اس میں سے کھایا۔ اس کے بعد میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جا ملا۔ میں نے آپ سے عرض کی کہ ہم نے ایک جنگلی گدھے کا شکار کیا ہے۔ آپ نے صحابہ (رض) سے پوچھا کیا تم میں سے کسی نے شکار کیا یا حملہ کرنے کو کہا تھا یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا یا کسی قسم کی مدد کی تھی ؟ صحابہ نے عرض کی نہیں پھر آپ نے محرم صحابہ سے فرمایا تم اسے کھا سکتے ہو۔ پوچھا کیا تمہارے پاس اس میں سے کچھ باقی ہے ؟ میں نے نیل گائے کی دستی پیش کی جسے آپ نے کاٹ کر کھایا۔ (رواہ مسلم : کتاب الحج، بخاری : ابواب العمرۃ) مطلب یہ ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے میں کسی قسم کی مدد نہ کی ہو تو محرم اس شکار میں سے کھا سکتا ہے۔ البتہ جو شخص احرام کی حالت میں ارادۃً شکار کرے اس کا جرمانہ شکار کے برابر حلال جانور بیت اللہ کے قریب قربان کرنا ہوگا جس کا فیصلہ دو منصف مزاج مسلمان کریں گے۔ اگر اس نے نیل گائے شکار

کیا ہو تو وہ اس کے برابر گائے یا بکرا قربان کرے گا۔ اگر اس سے چھوٹا جانور شکار کیا ہو تو اس کے برابر کوئی جانور ذبح کرنے کا منصف فیصلہ دیں گے اگر کوئی شخص ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کا کفارہ دو مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دو روزے رکھنا ہوں گے یہ جرمانہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی غلطی کی سزا پائے، ہاں جو یہ حکم آنے سے پہلے ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ اسے معاف کرنے والا ہے جو جان بوجھ کر احرام کی حالت میں شکار کرنے کی غلطی کا اعادہ کرے گا اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بدلہ لے گا اور وہ بدلہ لینے کی ہر اعتبار سے قوت رکھتا ہے۔ (فہم)
اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جن پاکیزہ اور پسندیدہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے 'ان جانوروں کے شکار کرنے کو محرم پر حرام قرار دیا 'اور شکار کرنے پر اس کی تلافی اور تدارک کے لیے تاوان بیان فرمایا۔

"تاکہ اللہ یہ جان لے" کی توجیہات

اس آیت کے دوسرے جز کا لفظی معنی یہ ہے 'تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ہمیشہ سے جاننے والا ہے اور کسی شخص کے کسی کام کرنے یا نہ کرنے پر اس کا علم موقوف نہیں ہے 'اس لیے ہم نے اس کا معنی یہ کیا ہے 'تاکہ اللہ یہ ظاہر کردے کہ کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم سے مراد علم ظہور ہے۔ اس کو حکماء کی اصطلاح میں علم تفصیلی سے تعبیر کرتے ہیں 'جو معلومات کا عین ہے 'اس کے برخلاف علم اجمالی عالم کا عین ہوتا ہے۔
علامہ بیضاوی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کا ذکر کیا ہے اور اس سے مراد معلوم کو واقع کرنا اور اس کو ظاہر کرنا ہے۔ نیز علامہ بیضاوی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے 'اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علم بالفعل متعلق ہو جائے اور بعض مفسرین نے کہا یہاں پر مضاف محذوف ہے یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء جان لیں کہ کون اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے 'تاکہ اللہ پہچان کرادے اس کی جو بن دیکھے اللہ سے ڈرتا ہے۔

حالت احرام میں شکار کرنے کی سزا

اس کے بعد فرمایا سو جس نے اس تنبیہ کے بعد حد سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک عذاب ہے کیونکہ تنبیہ کے بعد محرم کا شکار کے درپے ہونا اللہ تعالیٰ کے حکم سے محض لاپرواہی برتنا ہے اور بے باکی ہے اور اس کے ڈر اور خوف سے اپنے آپ کو آزاد رکھنا ہے اور جو شخص اپنے نفس کو لگام ڈالنے پر قادر نہ ہو اور اس قسم کے آسان احکام میں آزمائش پر پورا نہ اتر سکے 'اس سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑے بڑے اور سخت احکام میں آزمائش پر پورا اتر سکے گا۔ متبادر یہ ہے کہ یہ عذاب آخرت میں ہوگا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کی پشت برہنہ کرکے اس پر کوڑے لگائیں جائیں گے اور شیخ الاسلام نے کہا اس کو دنیا میں بھی سزا دی جائے گی اور وہ آخرت میں بھی عذاب کا مستحق ہوگا۔ (تبیان)
محرم کو بحالت احرام ہر وحشی جانور کا شکار کا منع ہے خواہ وہ حلال جانور ہو یا حرام۔ مندرجہ ذیل جانور مارنا معاف ہے۔
حضرت عائشہ صدیقہ (رض) کی روایت میں چھ جانوروں کا ذکر آیا ہے۔ سانپ کا مزید ذکر ہے۔ یہ روایت بخاری اور ابوداؤد رحمھم اللہ نے حضرت ابو سعید خدری (رض) سے کی ہے۔ کاٹنے والا کتا۔ کوا۔ بچھو۔ چیل۔ چوہا۔ بھیڑیا۔ سانپ یہ وہ جانور ہیں جنہیں حضور (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) نے فاسق فرمایاان کے قتل کی بحالت احرام اجازت ہے۔ مچھر، پسو، چیونٹی، مکھی، حشرات الارض، حملہ آور درندے ان کا مارنا معاف ہے۔ (تفسیر احمدی)

محرم کی بحالت احرام جو جانور شکار کرنا ممنوع ہیں وہ عمداً ہوں یا خطاً ہر حال میں ممنوع ہیں۔ عمداً کی ممانعت تو آیہ کریمہ سے واضح ہے اور خطا کا منع حدیث ابوالیسر سے ثابت ہے چنانچہ تفسیر نسفی میں ہے۔ عن الزھری انزل الکتاب لغمہ ودارب السنہ بالخطائ۔ (حسنات)

حالت احرام میں شکار کا کفارہ

ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک اعرابی حضرات ابوبکر صدیق (رض) کے پاس آیا اور کہا میں نے ایک شکار کو احرام کی حالت میں قتل کر دیا ہے اب آپ فرمایئے کہ اس میں مجھ پر بدلہ کیا ہے؟ آپ نے حضرت ابی بن کعب کی طرف دیکھ کر ان سے دریافت فرمایا کہ آپ فرمایئے کیا حکم ہے؟ اس پر اعرابی نے کہا سبحان اللہ میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں آپ خلیفہ رسول ہیں اور آپ کسی سے دریافت فرمارہے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس میں تیرا کیا بگڑا؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ دو عادل جو فیصلہ کر دیں اس لیے میں نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔ جب ہم دونوں کسی بات پر اتفاق کرلیں گے تو تجھ سے کہہ دیں گے۔ اس کی سند تو بہت مضبوط ہے لیکن اس میں میمون اور صدیق کے درمیان انقطاع ہے۔ یہاں یہی چاہیے تھا حضرت صدیق (رض) نے جب دیکھا کہ اعرابی جاہل ہے اور جہل کی دوا تعلیم ہے

ایک دن اسی طرح جارہے تھے کہ ایک ہرن ہماری نگاہ میں پڑا ہم میں سے ایک شخص نے اسے پتھر مارا جو اسے پوری طرح لگا اور وہ مر کر گر گیا وہ شخص اسے مردہ چھوڑ کر اپنی سواری پر سوار ہوگیا۔ ہمیں یہ کام بڑا برا معلوم ہوا اور ہم نے اسے بہت کچھ کہا سنا مکہ شریف پہنچ کر میں اسے حضرت عمر بن خطاب (رض) کے پاس لے گیا اس نے سارا واقعہ خود بیان کیا اس وقت جناب فاروق کے پہلو میں ایک صاحب کھڑے تھے جن کا چہرہ چاندی کی طرح جگمگا رہا تھا یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رض) تھے آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کچھ باتیں کیں پھر میرے ساتھ سے فرمایا کہ تو نے اسے جان بوجھ کر مار ڈالا یا بھول چوک سے اس نے کہا میں نے پتھر اسی پر پھینکا اور قصداً پھینکا لیکن اسے مار ڈالنے کی مری نیت نہ تھی۔ آپ نے فرمایا پھر تو خطا اور عمد کے درمیان درمیان ہے۔ جا تو ایک بکری ذبح کر دے اس کا گوشت صدقہ کر دے اور اس کی کھال اپنے کام میں لا۔

اور جس میں صحابہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو تو پھر اپنے زمانے کے عادلین کی طرف رجوع کریں۔ مالک اور ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ حکم اپنے اپنے زمانے کے ہر ہر فرد پر الگ الگ لگے گا اور اپنے زمانے ہی کے عادل قرار پائیں گے خواہ صحابہ کا کوئی حکم اور فتویٰ موجود نہ ہو کیونکہ اللہ پاک نے منکم کا لفظ فرمایا ہے۔ (گلدستہ)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چند حقائق منکشف فرمائے ہیں جو انسانی سیرت و کردار یعنی تقویٰ کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ ان کے بغیر انسانی سیرت و کردار کی تعمیر اولاً تو ہو نہیں سکتی اور اگر کسی حد تک ہو بھی جائے تو وہ دیر پا ثابت نہیں ہوتی۔ اس میں سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے 'وہ یہ ہے کہ تمہاری سیرت و کردار کی تعمیر اور تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرنے اور اس کو مستحکم بنانے کے لیے جو بات انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں آزمائش کے مرحلے سے گزارا جائے کیونکہ دنیا میں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی آدمی کسی نظریے یا شخصیت سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی اس وابستگی کے دعوے کو ضرور آزمایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر دعوے کی آزمائش نہ ہو تو پھر تو دنیا میں دعویٰ کرنے والوں کے سچے یا جھوٹے ہونے کی کوئی کسوٹی باقی نہ رہ جائے اور یہ دعویٰ چاہے معمولی درجے کا ہو یا آخری درجے کا 'یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا امتحان نہ کیا جائے۔ وہ چیز جسے میں یہاں وابستگی کا نام دے رہا ہوں 'اسی کو ہماری زبان میں محبت کا نام دیا

جاتا ہے اور یہ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی کسی سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ اس محبت کو آزمائش کی کٹھالی سے نہ گزرنا پڑے۔ بقول شاعر

محبت کے مقدر میں کہاں آرام ہے ہمدم
کہیں شعلہ ، کہیں بجلی ، کہیں سیماب ہوتی ہے

اس لیے قرآن کریم میں سورۃ العنکبوت میں واضح طور پر ارشاد فرمایا: "کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ جب ایمان کا دعویٰ کریں گے تو ہم انھیں آزمائش میں نہیں ڈالیں گے ، ہم نے تو انھیں بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اور اب مسلمانوں کو بھی آزمائیں گے)"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وابستگی اور محبت کے دعوے داروں کے لیے دنیا کے عام دستور اور الہامی زبان دونوں میں آزمائش ضروری ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔

دوسری بات جو ہمیں قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ اس طرح کی آزمائشیں دو حوالوں سے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ کسی سے وابستگی اور محبت کا دعویٰ کرنا ، یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن یہ جاننا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا ، اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے ، جب آزمائش کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ جس طرح خالص سونے کی پہچان اس وقت ہوتی ہے ، جب اسے بھٹی میں تپایا جاتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ اس میں خالص سونا کتنا ہے اور کھوٹ کتنا۔ انسانی سیرت و کردار، عقیدہ اور ایمان کا معاملہ سونے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سچے جھوٹے اور کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے انھیں آزمائشوں سے نہ گزارا جائے۔

دوسری بات یہ کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی اور اسے جلا دینے کے لیے آزمائشوں کے مراحل انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ بعض لوگ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں ، لیکن جب تک ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور کٹھن مراحل سے گزار کر ان کی صلاحیتوں کو جلا پانے کا موقع نہیں ملتا اس وقت تک ان کی غیر معمولی صلاحیتیں کبھی ابھر کر سامنے نہیں آتیں بلکہ رفتہ رفتہ دم توڑ دیتی ہیں۔ ایک آدمی جو کبھی پانی میں نہیں اترا ، آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ تیراک بنے تو ضروری ہے کہ آپ اسے پانی میں دھکا دے دیں۔ جس آدمی کے بارے میں یہ خواہش ہو کہ وہ تیز دوڑنے لگے تو ضروری ہے کہ آپ روزانہ اسے تیز دوڑنے پر مجبور کریں۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب اس قابل ہوتے جائیں گے کہ اس کے لیے تیز دوڑنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ جن لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ بوجھ اٹھا لیتے ہیں ، اگر ہم ان کی صلاحیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ صلاحیت مسلسل بوجھ اٹھانے اور اپنے آپ کو اس مشقت میں مبتلا کرنے سے ان کے اندر پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ انسانی وابستگیوں کے حوالے سے مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا ، یہ غلط لوگوں کے لیے تو سزا ہو سکتی ہے ، لیکن فرمان برداروں کے لیے ان کے جذبہ عبودیت و سرفروشی کو جلا دینے کی انتہائی حکیمانہ کاوش ہے ، جس کے بغیر ان بنیادی جذبوں میں مطلوب پختگی ، جسے ہم تقویٰ کا نام دیتے ہیں ، کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو ہمیشہ ان مراحل سے گزارا گیا ہے۔ وہ جب بھی سعادت مندی کے ساتھ ان مراحل سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے تو دنیوی اور اخروی نعمتوں کا راستہ ان کے لیے کھل گیا اور جب جب انھوں نے اس میں کمزوری دکھائی تو اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ قرآن کریم نے جابجا اس کی مثالیں ذکر کی ہیں۔ انہی میں سے ایک مثال جو اس آیت میں بیان کردہ آزمائش سے بہت ملتی جلتی ہے ، اسے سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۶۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تھا جو ساحل سمندر کی کسی بستی میں آباد تھا۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو جب ہفتہ کے بارے میں خاص احکام

دیئے کہ تم اس دن کا پوری طرح احترام بجالاؤ گے اس میں سوائے اللہ کی عبادت کے اور کوئی دنیوی مصروفیت پیدا نہیں کروگے۔ اس دن تمہارے چولہے تک نہیں جلیں گے ' بلکہ سارا دن تمہارا روزے اور عبادت میں گزرے گا اور پھر اس حوالے سے ان کی آزمائش کی گئی اور حکم دیا گیا کہ تم اس دن مچھلیاں نہیں پکڑو گے۔ ساحل بحر پر رہنے کی وجہ سے چونکہ مچھلیوں کا شکار ان کی گزر بسر کا سب سے بڑا ذریعہ تھا ' اس لیے اس پر عمل کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن ایسا مشکل بھی نہیں تھا ' کیونکہ باقی ہفتے کے دنوں میں مچھلیاں پکڑ سکتے تھے اور دوسرا کاروبار بھی کر سکتے تھے۔ لیکن وہ چونکہ اپنے سیرت و کردار کو بگاڑ چکے تھے اس لیے اس امتحان میں پورے نہ اترے اور بری طرح ناکام ہو کر اللہ کے عذاب کے سزاوار ہوئے۔ پھر یہ بات بھی ایسی آزمائشوں میں نمایاں نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی نعمت سے کسی قوم کو آزماتے ہیں تو ان کی آزمائش کو مشکل بنانے کے لیے اس نعمت کو فراوانی سے ان کے دائیں بائیں مہیا کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قرآن کریم میں ہے :

اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا لَا تَاْتِيْهِمْ ج كَذٰلِكَ ج نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ (اعراف ۷ : ۱۶۳)

(اور یاد کرو ! جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے ' جب کہ ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے نمودار ہوتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں نمودار نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں بوجہ اس کے کہ وہ ہماری نافرمانی کرتے تھے)

مسلمانوں کو بھی اسی طرح کی آزمائش سے دوچار کیا گیا اور کرم یہ فرمایا گیا کہ یہ بتادیا گیا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ایسے ایک شکار سے آزمائے گا اور وہ شکار اتنی فراوانی سے تمہارے دائیں بائیں ہوگا کہ تم چاہو تو آگے بڑھ کر اسے پکڑ سکو گے اور چاہو تو نیزوں سے شکار کر سکو گے۔ جس طرح بنی اسرائیل کی آزمائش میں قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ مچھلیاں سر اٹھائے ہوئے ان کی طرف آتی تھیں حالانکہ مچھلی ہمیشہ پانی میں ڈوب کے تیرتی ہے۔ لیکن وہ کشتی کی طرح سطح آب پر تیرتی ہوئی آتی تھی تاکہ ان کے شوق کو بڑھایا جائے اور آزمائش سخت کی جائے۔ یہاں بھی مسلمانوں کو اسی طرح آزمایا گیا اور مزید یہ کہ جس طرح بنی اسرائیل کی آزمائش ان کی ایسی غذا کے حوالے سے کی گئی جو ان کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس طرح مسلمانوں کو بھی حج کے سفر کے دوران صحرا سے گزرتے ہوئے ایک ایسی چیز سے آزمایا گیا جو ان کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صحرائے عرب میں بہت کم ایسے علاقے ہیں ' جہاں کوئی چیز اگتی ہو۔ اس لیے ان کی گزر بسر کا زیادہ تر دارومدار تجارت ' گلہ بانی یا پھر شکار پر تھا۔ حج کے سفر میں اگر ان کے پاس زاد سفر ختم ہو جاتا یا کم ہو جاتا تو راستے میں کسی چیز کا ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اب نہ تو ان کے لیے کوئی تجارت کا موقع تھا اور نہ گلہ بانی کا۔ ایک ہی صورت تھی ' جس سے ان کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں ' وہ شکار تھی۔ جب اس سے انھیں روک دیا گیا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتنی شدید آزمائش تھی اور اس آزمائش کو مزید مشکل اس حوالے سے بنادیا گیا کہ جانوروں کی ڈاروں کی ڈاریں ' ان کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ کتنے جانور تھے جو ان کے دائیں بائیں اچھلتے کودتے پھرتے تھے۔ لیکن وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے بھی مجاز نہ تھے اور پھر بنی اسرائیل کی آزمائش تو ایک دن کے لیے تھی اور یہ تو جتنے دنوں حالت احرام میں رہتے اتنے ہی دنوں یہ آزمائش بھی جاری رہتی۔ لیکن چونکہ اس امت کو آخری امت کے طور پر ایک عظیم مقصد کے لیے تیار کیا جارہا تھا ' اس لیے ان کے ایمان و عمل کو جلا بخشنے اور ان کے تقویٰ میں گہرائی پیدا کرنے کے لیے انھیں ایسی آزمائشوں سے گزارنا بہت ضروری تھا تاکہ ان کے اندر وہ جوہر پیدا ہو سکے اور وہ حقیقی ملکہ ان کے اندر راسخ ہو سکے جو اصلاً زندگی کی پاکیزگی کی ضمانت ہے۔ اس کو بیان

کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: لِيَعْلَمَ اللهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ کہ مسلمانوں کو اس آزمائش میں ہم نے اس لیے ڈالا ہے تاکہ اللہ ممیّز کردے ان لوگوں کو جو اللہ سے غیب میں رہ کر ڈرتے ہیں 'ان لوگوں سے جو غیب میں اللہ کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ پر ایمان کی کیفیت اور اس کے ثمرات

اللہ کو بن دیکھے ماننا 'اس کی صفات کا یقین رکھنا 'ہر وقت اس کی ذات کو متحضر رکھنا 'اپنی تنہائیوں کو اس کی یاد سے آباد رکھنا 'اپنی ذات کو ہر وقت اس کی دسترس میں سمجھنا اور اپنے دل و دماغ کے خیالات تک کو اس کے علم کی گرفت میں جاننا 'یہ وہ تصورات ہیں جن کے نتیجے میں دل و دماغ میں وہ جوہر پیدا ہوتا ہے 'جو ایک مضبوط سیرت و کردار یعنی تقویٰ کو جنم دیتا ہے 'جس کے پیدا ہو جانے کے بعد شیطان کا کوئی حملہ کار گر نہیں ہوتا۔ ہوس کا بڑے سے بڑا ابہلاوا بھی اپنا اثر پیدا کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ انسان انتہائی عاجز ہوتے ہوئے بھی اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ وہ بکتا ہے 'نہ جھکتا ہے۔ نہ وہ کبھی سر کشی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور نہ کبھی معصیت کا کوئی چھینٹا اس کے دامن کو داغ دار کر سکتا ہے۔
اگر وہ بادشاہ بھی ہو تو تخت پر بیٹھ کر بھی فقیری کرتا ہے 'کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر وہ فقیر ہو تو قناعت اور خودداری کا ایسا پیکر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اس کے چہرے پر شاہوں کی بے نیازی دیکھتے ہیں 'کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا تعلق اس خالق کائنات سے ہے 'جو کائنات کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔ قرون اولیٰ میں مسلمانوں میں جو نہایت خوبصورت سیرت و کردار اور اعلیٰ صفات دیکھتے ہیں 'ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تربیت نے اسلامی معاشرے کو جن مضبوط بنیادوں پر اٹھایا تھا 'ان میں سب سے مضبوط بنیاد یہی تصور تھا کہ ہم ہر وقت اللہ کے سامنے ہیں 'ہمارا ہر عمل اس کے علم میں ہے 'ہمارے تصورات اور خیالات تک سے وہ واقف ہے 'ہمارا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں 'ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے 'وہ ہم سے ایک ایک بات 'ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحے کا حساب لے گا 'اگر ہم نے کہیں بھی معصیت یا خیانت کا ارتکاب کیا ہو گا تو وہاں ہماری سخن سازی ہمیں بچا نہیں سکے گی 'ہمارا ایک ایک رونگٹا ہمارے خلاف یا ہمارے حق میں گواہی دے گا۔ اللہ کے ساتھ اس مضبوط رشتے نے انسان کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔
اصحابِ سیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق (رض) مسلمانوں کے احوال جاننے کے لیے دورے پر تھے کہ انھوں نے جنگل میں ایک چرواہے کو دیکھا 'جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس سے کہا: میں بھوکا ہوں 'مجھے کسی بکری کا دودھ پلاؤ۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت میرے ریوڑ میں کوئی دودھ دینے والی بکری نہیں۔ آپ نے کہا: تم کوئی بکری میرے پاس بیچ دو اور اسے ذبح کر کے مجھے کھلا دو اور مالک اگر تم سے پوچھے کہ بکری کہاں گئی تو اسے کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا۔ میری بھوک کا علاج ہو جائے گا اور تمہیں دام مل جائیں گے۔ اس نے یہ بات سن کر نہایت غصے سے حضرت عمر ص کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

فاین اللہ ایھا الرجل

(اے شخص! پھر اللہ کہاں ہے 'اللہ کہاں گیا؟)
تم یہ سمجھتے ہو کہ مالک کو دھوکا دے کر میں اللہ کے عذاب سے بچ جاؤں گا؟ مالک تو نہیں دیکھ رہا 'لیکن میرا اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتا ہے اور ہمیشہ اسے راہ راست پہ چلنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی کو پروردگار فرما رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو اس لیے

آزمائش میں ڈالا کہ لوگوں کو معلوم تو ہوسکے کہ کون ان دیکھے خدا سے دیکھے بغیر ڈرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اس کے بعد اس بات کو مکمل کرتے ہوئے فرمایا کہ جس آدمی یا جس قوم کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی کہ وہ آزمائشوں میں پڑ کر اپنے یقین اور ایمان کو مضبوط کرسکے کہ نہ دیکھتے ہوئے بھی اللہ کو کبھی نہ بھولے 'ایسی قوم اور ایسا فرد زندگی میں وہ رویہ اختیار کرتے ہیں 'جس پر صرف ان کی خواہشات کی چھاپ ہوتی ہے۔ وہ ہوس کے اسیر ہو کر حیوانی زندگی گزارتے ہیں اور انسانی رشتوں کو پامال کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اعمال کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے لیے عذاب الیم ہے۔

قوانین حلت و حرمت ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں

حلت و حرمت کے حوالے سے یہاں ایک اور فتنے کا ذکر کردینا شاید منفعت سے خالی نہ ہو۔ اگرچہ عام مسلمانوں کی اسلامی زندگی ابھی تک اس سے محفوظ ہے۔ لیکن بعض دانشور ایسے ہیں 'جو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اسلام میں حلت و حرمت کے تصور پر جو اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے کو عذاب الیم سے ڈرایا ہے 'وہ کوئی اسلام کا مستقل فلسفہ نہیں بلکہ ایک عارضی حکم تھا 'جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں چونکہ اشیائے خوردنی کی بہت کمی تھی 'عرب کا بیشتر حصہ صحرا پر مشتمل تھا 'بارشیں بہت کم ہونے کی وجہ سے عموماً قحط سالی کا سماں رہتا تھا 'چند علاقوں کو چھوڑ کر کہیں بھی زراعت کا نام تک نہیں تھا 'ایسی صورت حال میں مسلمان معاشرے کو جرائم سے بچانے اور بے اطمینانی کی کیفیت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان پر کچھ چیزیں حرام کردی جاتیں تاکہ وہ از خود بہت ساری چیزوں سے جب احتراز کریں گے تو تھوڑی چیزیں ان کی ضرورت کے لیے کفایت کر جائیں گی۔ اس طرح جزیرہ عرب کی معاشی پریشانیوں کا کسی حد تک علاج ہوسکے گا 'لیکن آج جبکہ خود جزیرہ عرب میں ہر طرح کی اشیائے ضرورت کی فراوانی ہے اور دنیا بھر سے ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچ رہی ہیں اور پوری دنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئی ہے اور کسی بھی ملک سے کسی ضرورت کی چیز کا درآمد کرلینا کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تو اب حلت و حرمت پر اتنا اصرار کرنا 'کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔

ان دانشوروں کے ذہن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دانش کے سوا اور سب کچھ ہے۔ اگر انھیں معمولی عقل و دانش بھی میسر ہوتی تو دو باتوں کا سمجھنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے احکام مستقل ہیں 'کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لیے نہیں۔ علاوہ ازیں پروردگار نے قرآن کریم میں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے بھی مسلمانوں کو یہ بات مکہ معظّمہ ہی میں باور کرادی تھی کہ تمہاری معاشی تنگ دستی اور سیاسی مغلوبیت کا یہ زمانہ کوئی طویل نہیں بلکہ اسلام کے غلبہ عمومی کا دور عنقریب شروع ہونے والا ہے ' جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی فارغ البالی عطا فرمائیں گے کہ تم زکوۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر نکلو گے اور تمہیں زکوۃ لینے والا نہیں ملے گا۔ تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کو معاشی فراوانی کی خوشخبریاں سنائی جارہی ہیں 'کیا انہی لوگوں کو حلت و حرمت کے وقتی احکام دیئے جائیں گے ؟

دوسری یہ بات کہ ان دانشوروں کا اپنے پروردگار کے بارے میں نجانے کیا تصور ہے کہ اگر وہ اس طرح بعض چیزوں کی حرمت کے احکام نازل نہ کرتا تو لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی حالانکہ ایک معمولی آدمی بھی جانتا ہے کہ اللہ کے خزانے بیشمار اور بے پناہ ہیں 'جن میں قیامت تک کبھی کمی نہیں آئے گی۔ دنیا ظلم کے ذریعے بعض لوگوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کردے تو اور بات ہے ورنہ اللہ کے پیدا

کردہ وسائل ہر دور میں اس کی مخلوق کی ضرورت سے زیادہ رہے ہیں نیز ہمارے پیش نظر تو صرف انسانی ضرورتیں ہیں ' اس کی مخلوقات تو بیشمار ہیں ' جن میں سے بیشتر کو ہم نہیں جانتے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے ' پھر بھی اس کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اسرائیلی روایات میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو جب اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا سے منفرد حکومت عطا کی کہ ان کی رعایا میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات اور پرندے بھی شامل تھے اور بہت سارے عناصر قدرت پر انھیں اختیار عطا فرمایا گیا تھا تو انھوں نے اپنے وسیع اختیارات کو دیکھتے ہوئے پروردگار سے دعا کی کہ یا اللہ ! آپ نے مجھے اتنی بڑی حکومت عطا فرمائی ہے اور ایسے وسائل بخشے ہیں ' میں ان کے شکر کے طور پر یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن تیری ساری مخلوق کی دعوت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : سلیمان ! تم ایسا نہیں کرسکتے ' تمہارے وسائل اس کے لیے کافی نہیں۔ لیکن حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بار بار التجا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی۔ کہا جاتا ہے کہ جنات نے دعوت کا اہتمام کیا۔ سینکڑوں میل لمبا دستر خوان بچھایا گیا۔ سہ پہر کے وقت سمندر سے ایک بہت بڑی مچھلی نے سر اٹھایا اور پوچھا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ آج میری دعوت سلیمان کے یہاں ہے ' چنانچہ اسے کھانا کھانے کی دعوت دی گئی۔ مچھلی باہر آئی اور وہ اس دستر خوان کی بیشتر نعمتیں چٹ کر گئی اور پھر کہنے لگی کہ اور بھی کچھ ہے ؟ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم ابھی سیر نہیں ہوئی ہو ؟ مچھلی نے کہا : کیا میزبان کی طرف سے مہمان کو ایسا جواب زیب دیتا ہے ؟ مجھے تو روزانہ اللہ کی جانب سے اتنا ہی رزق مہیا کیا جاتا ہے۔ اس پر حضرت سلیمان (علیہ السلام) پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہوگئے اور استغفار کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا اللہ ! تو ہی رازق ہے ' تیرے ہی خزانے اس قابل ہیں کہ وہ تیری مخلوق کی ضرورت کے لیے کافی ہو سکیں۔ یہ ایک عام سی مثال سہی ' لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے ' وہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے یہاں حلت و حرمت کے حوالے سے جو کچھ کہا جا رہا ہے ' وہ اصلاً اس بات کا امتحان ہے کہ انسان اللہ کے احکام کی اطاعت میں کہاں تک مخلص ہے اور وہ بن دیکھے کہاں تک اس سے ڈرتا ہے۔

سورۃ المائدہ کے آغاز میں ' جانوروں کی حلت و حرمت کا ذکر کرتے ہوئے ' پروردگار نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ لیکن اس کی حرمت کے بارے میں نہ تو تاکیدی حکم دیا اور نہ تفصیلی مسائل بیان فرمائے اور نہ یہ بتایا کہ اگر کوئی آدمی اس جرم کا ارتکاب کر بیٹھے تو دنیا میں اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی اور آخرت میں وہ اس کی جواب دہی سے کس طرح بچ سکے گا۔ ابھی ہم نے جس آیت کریمہ کا مطالعہ کیا ہے ' اس میں بھی بطور آزمائش اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن صراحتاً ان باتوں میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے جب بھی کوئی آدمی سورۃ المائدہ کی پہلی آیت اور اس رکوع کی پہلی آیت کو پڑھے گا تو اس کے ذہن میں یقیناً تفصیلی احکام کے بارے میں سوالات پیدا ہوں گے ' چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں انہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : وہ ایمان لائے][لَا تَقْتُلُوا : نہ تم مارو][الصَّيْدَ : شکار][وَاَنْتُمْ : اور تم ہو][حُرُمٌ : احرام میں][وَمَنْ : اور جو][قَتَلَهٗ : جس نے اس کو مارا][مِنْكُمْ : تم سے][مُّتَعَمِّدًا : جان بوجھ کر][فَجَزَآءٌ: تو سزا][مِّثْلُ : اس جیسا][مَا : جو][قَتَلَ : اس نے قتل کیا][مِنَ : سے][النَّعَمِ : چوپائے][يَحْكُمُ : وہ فیصلہ کرے گا][بِهٖ : اس کا][ذَوَا عَدْلٍ : دو والے عادل][مِّنْكُمْ : تم سے][هَدْيًا : قربانی][بٰلِغَ : پہنچنے والی][الْكَعْبَةِ : کعبہ][اَوْ كَفَّارَةٌ: یا کفارہ][طَعَامُ : کھانا][مَسٰكِيْنَ : مسکین (جمع)][اَوْ عَدْلُ : یا برابر][ذٰلِكَ : وہ][صِيَامًا : روزے][لِّيَذُوْقَ : تاکہ وہ چکھے][وَبَالَ : سزا][اَمْرِهٖ : اپنے کام کی][عَفَا : معاف کیا][اللّٰهُ : اللہ][عَمَّا : اس سے][سَلَفَ : گزرچکا][وَمَنْ : اور جو][عَادَ : پھر کرے][فَيَنْتَقِمُ : تو انتقام لے گا][اللّٰهُ : اللہ][مِنْهُ : اس سے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][عَزِيْزٌ : غالب][ذُو انْتِقَامٍ : انتقام لینے والا]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم احرام کی حالت میں شکار کو مت مارا کرو، اور تم میں سے جس نے (بحالت احرام) قصداً اُسے مار ڈالا تو (اس کا) بدلہ مویشیوں میں سے اسی کے برابر (کوئی جانور) ہے جسے اس نے قتل کیا ہے جس کی نسبت تم میں سے دو عادل شخص فیصلہ کریں (کہ واقعی یہ جانور اس شکار کے برابر ہے بشرطیکہ) وہ قربانی کعبہ پہنچنے والی ہو یا (اس کا) کفّارہ چند محتاجوں کا کھانا ہے (یعنی جانور کی قیمت کے برابر معمول کا کھانا جتنے بھی محتاجوں کو پورا آجائے) یا اس کے برابر (یعنی جتنے محتاجوں کا کھانا بنے اس قدر) روزے ہیں تاکہ وہ اپنے کیے (کے بوجھ) کا مزہ چکھے۔ جو کچھ (اس سے) پہلے ہو گزرا اللہ نے اسے معاف فرمادیا، اور جو کوئی (ایسا کام) دوبارہ کرے گا تو اللہ اس سے (نافرمانی) کا بدلہ لے لے گا، اور اللہ بڑا غالب بدلہ لینے والا ہے

تشریح: اس آیت مبارکہ میں حالت احرام میں شکار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہاں اس کے چند مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔

حالتِ احرام میں شکار کرنے کے شرعی مسائل

(1)۔۔ مُحرِم یعنی احرام والے پر شکار یعنی خشکی کے کسی وحشی جانور کو مارنا حرام ہے۔
(2)۔۔ جانور کی طرف شکار کرنے کے لیے اشارہ کرنا یا کسی طرح بتانا بھی شکار میں داخل اور ممنوع ہے۔
(3)۔۔ حالتِ احرام میں ہر وحشی جانور کا شکار ممنوع ہے خواہ وہ حلال ہو یا نہ ہو۔
(4)۔۔ کاٹنے والا کتا، کوا، بچھو، چیل، چوہا، بھیڑیا اور سانپ ان جانوروں کو احادیث میں فَوَاسِق فرمایا گیا ہے اور ان کے قتل کی اجازت دی گئی ہے۔
(5)۔۔ مچھر، پِسّو، چیونٹی، مکھی اور حشرات الارض اور حملہ آور درندوں کو مارنا معاف ہے۔
(6)۔۔ حالتِ احرام میں جن جانوروں کا مارنا ممنوع ہے وہ ہر حال میں ممنوع ہے جان بوجھ کر ہو یا غلطی سے۔ جان بوجھ کر مارنے کا حکم تو اس آیت میں موجود ہے غلطی سے مارنے کا حکم حدیث شریف سے ثابت ہے۔ (صراط)

حالتِ احرام میں شکار کے کفارے کی تفصیل

حالت احرام میں شکار کرنا منع ہے لیکن اگر کوئی انسان احرام کی حالت میں جان بوجھ کر شکار کو مار ڈالے تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ درج ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک پر عمل کرے:

1۔ شکار کردہ جانور کی قیمت کا اندازہ اس علاقے کے دو معتبر آدمی کریں جس علاقے میں وہ شکار کیا گیا پھر شکار کرنے والا اس قیمت سے جانور خریدے اور اس جانور کو حرم میں لا کر ذبح کرے اور وہاں کے فقراء میں اس کا گوشت تقسیم کردے۔

2۔ یا اس قیمت سے غلہ خریدے اور دو کلو گرام گندم یا چار کلو گرام کھجور فی کس کے اعتبار سے اسی علاقے میں یا حرم شریف میں لا کر مسکینوں میں تقسیم کردے۔

3۔ یا اس کی قیمت سے دو کلو گرام گندم فی کس کے اعتبار سے جتنے مسکینوں میں وہ غلہ تقسیم ہو سکتا ہے اتنے روزے رکھے یعنی اس کی قیمت سے اگر دس کلو گرام گندم مل سکتی ہے تو یہ گندم پانچ مسکینوں میں تقسیم ہو گی، لہٰذا یا تو پانچ مسکینوں میں یہ گندم تقسیم کر دے یا پانچ روزے رکھ لے۔

اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے جس کسی نے احرام کی حالت میں شکار کیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے لیکن اس کے بعد جس نے احرام کی حالت میں شکار کیا تو وہ توبہ کرے اور مذکورہ تین طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ اس کا تاوان بھی ادا کرے اور اگر وہ تاوان ادا نہیں کرے گا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے انتقام اور عذاب کا شکار ہو گا۔

نوٹ : موذی جانور مثلاً سانپ، بچھو اور باؤلا کتا وغیرہ کو احرام کی حالت میں بھی مارنے کی اجازت ہے کیونکہ یہ انسانی جان کے لیے خطرہ ہیں جس کی حفاظت فرض ہے۔ (امداد)

خشکی کے جانوروں کے قتل کی ممانعت سے پانچ فاسق جانوروں کا استثناء

خشکی کے شکار کو مارنا محرم پر حرام ہے اور سمندر شکار کو مارنا اس کے لیے حلال ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

(آیت) "احل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارۃ " (المائدہ : ۹۶)

ترجمہ : تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام حلال کر دیا گیا ہے ' تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے۔

خشکی کا شکار وہ ہے جو خشکی میں پیدا ہوا ہو اور خشکی میں رہتا ہو اور سمندری شکار وہ ہے جو پانی میں (خواہ دریا ہو یا سمندر) پیدا ہوا ہو ' اور پانی میں رہتا ہو اور شکار اس جانور کو کہتے ہیں جو اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے انسانوں سے غیر مانوس ہو اور ان سے متنفر اور متوحش ہو۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خشکی کے جانوروں کو قتل کرنے کی ممانعت کے عمومی حکم سے پانچ خبیث جانوروں کو مستثنیٰ فرما لیا ہے۔

کاٹنے والا کتا ' بھیڑیا ' چیل ' کوا ' سانپ ' اور بچھو۔ کیونکہ یہ جانور ابتداء حملہ کرتے ہیں اور ایذا پہنچاتے ہیں ' اور کوے سے مراد وہ ہے جو مردار کھاتا ہے۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پانچ جانور فاسق ہیں جن کو حرم یا غیر حرم میں قتل کر دیا جائے گا۔ سانپ ' کوا ' (جس کی پشت اور پیٹ پر سفیدی ہو) چوہا اور کاٹنے والا کتا اور چیل۔ (صحیح مسلم ' ج ٦٦ ' (١١٩٨) ٢٨١٥ ' سنن نسائی ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ' ٢٨٢٩ ' سنن ابن ماجہ ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' : ٣٠٨٧)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ پانچ جانور کل کے کل فاسق ہیں ' ان کو حرم میں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ کوا ' چیل ' کاٹنے والا کتا ' بچھو اور چوہا۔ (صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ١٨٢٩ ' صحیح مسلم ' ج ٧١ ' (١١٩٨) ٢٨٢٠ ' سنن النسائی ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ' ٢٨٩٠)

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ محرم اور غیر محرم کے لیے کاٹنے والے کتے کو حرم اور غیر حرم میں قتل کرنا جائز ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے یہی معروف کتا مراد ہے۔ امام اوزاعی ' امام ابوحنیفہ ' اور حسن بن صالح کا یہی قول ہے اور انھوں نے بھیڑیے کو بھی اسی کے ساتھ لاحق کیا ہے ' اور امام زفر کے نزدیک کتے سے مراد صرف بھیڑیا ہے ' اور جمہور علماء نے یہ کہا ہے کہ کاٹنے والے کتے سے مراد بالخصوص یہ معروف کتا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ درندہ ہے جو عادۃ حملہ کرتا ہو ' مثلا بھیڑیا اور چیتا وغیرہ۔

امام شافعی 'امام احمد 'سفیان ثوری وغیر ھم کا یہی قول ہے۔ قاضی عیاض نے اس قول کو جمہور علماء کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (صحیح مسلم مع شرحہ للنووی 'ج ۵ 'ص ۳۲۳۴ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفٰی مکہ مکرمہ '۱۴۱۷ھ)

کھیتوں کے کوے کے علاوہ ہر کوے کو قتل کرنے کا حکم

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کوے کو قتل کرنے کے حکم سے وہ چھوٹا کوا مستثنی ہے جو دانہ کھاتا ہے۔اس کو غراب زرع اور زاغ کہا جاتا ہے۔اس کے کھانے پر جواز کا فتوی دیا گیا ہے 'اس کے علاوہ کوے کی جتنی قسمیں ہیں 'ان سب کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ فتح الباری کے مطابق کوے کی پانچ قسمیں ہیں۔ایک عقعق ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ یہ سفید اور سیاہ رنگ کا پرندہ ہے 'اس کی آواز عین اور قاف کے مشابہ ہے اور دوسرا ابقع ہے 'جس کی پیٹھ اور پیٹ پر سفیدی ہے۔ تیسرا غداف ہے۔اہل لغت اس کو ابقع کہتے ہیں اور اس کو غراب لبین بھی کہا جاتا ہے 'کیونکہ جب نوح (علیہ السلام) نے اس کو زمین کی خبر لانے کے لیے بھیجا 'تو یہ ان سے علیحدہ ہو کر مردار کھانے میں مشغول ہو گیا۔ چوتھی قسم اعصم ہے۔ یہ وہ ہے جس کی ٹانگ یا پیر یا پیٹ میں سفیدی یا سرخی ہو اور پانچویں قسم زاغ ہے 'اس کو غراب زرع بھی کہتے ہیں 'یہ چھوٹا کوا ہے جو دانہ کھاتا ہے۔ (فتح الملھم 'ج ۳ 'ص ۲۳۱ 'مطبوعہ مکتبہ الحجاز 'کراچی)

شیخ عثمانی نے زاغ یا غراب زرع کے سوا کوے کی باقی اقسام کو حرام قرار دیا ہے اور فقہاء کی عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ زاغ (غراب زرع) اور عقعق کے سوا کوے کی باقی اقسام حرام ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ زاغ (غراب زرع) اور عقعق دونوں اس عام کوے سے چھوٹے ہوتے ہیں 'ان تصریحات سے واضح ہوا کہ یہ عام معروف کوا جو ہمارے درختوں پر پایا جاتا ہے 'حرام ہے۔

تین صورتوں میں محرم کے لیے شکاری جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت

اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر محرم شکار کو قتل کردے تو اس پر اس کی جزا (تاوان) واجب ہوتی ہے 'جیسا کہ سورۃ مائدہ کی اس آیت ۹۵ میں صراحتا مذکور ہے، شکار کے قتل کی بھی قسمیں ہیں 'ایک قسم مباح ہے اور ایک قسم حرام ہے۔ حرام وہ قسم ہے جس میں محرم شکار کو بغیر کسی سبب موجب یا سبب مبیح کے قتل کردے۔ سبب موجب یہ ہے کہ کوئی جانور محرم پر حملہ کردے 'اور اس کو قاتل کیے بغیر اس جانور سے جان بچانے کی اور کوئی صورت نہ ہو 'اس صورت میں اس جانور کو قتل کرنا واجب ہے۔ کیونکہ جان بچانا فرض ہے 'یہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے قاعدہ کے مطابق ہے 'اور سبب مبیح یہ ہے کہ انسان کے پاس حلال ذرائع سے کھانے پینے کی کوئی چیز نہ ہو اور جان بچانے کی صرف یہ صورت ہو کہ انسان کسی جانور کو شکار کرکے کھالے 'تو اس صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے اس جانور کو شکار کرکے کھانا مباح ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"(آیت) "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکم "۔ (البقرہ : ۱۹۵)

ترجمہ : اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی جانور کو کسی درندہ یا کسی کے پھندہ سے بچانے کی کوشش کرے اور وہ جانور ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان نہیں ہے۔

محرم عمداً قتل کرے یا خطاء ' ہر صورت میں اس پر ضمان کا وجوب

ائمہ مذاہب کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ محرم شکار کو عمداً قتل کرے یا خطا قتل کرے ' ہر صورت میں اس پر ضمان واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس بجو کو محرم شکار کرے ' اس کا تاوان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مینڈھا قرار دیا اور اس کو شکار میں شمار فرمایا: (سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث: ۳۰۸۵ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۱۵ ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: محرم شتر مرغ کا انڈا شکار سے حاصل کرے تو اس کا تاوان اس کی قیمت ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث: ۳۰۸۶ ' مطبوعہ بیروت)

وجہ استدلال یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ضمان کو عمد کے ساتھ مقید نہیں فرمایا: بلکہ شکار کرنے پر مطلقاً تاوان کو واجب فرمایا ہے۔

شکار کی تعریف

شکار کو قتل کرنا محرم پر حرام ہے ' خواہ اس نے حج کا احرام باندھا ہو یا عمرہ کا اور شکار وہ ہے جس میں تین اوصاف ہوں۔ اس کا کھانا حلال ہو ' اس جانور کا کوئی مالک نہ ہو ' وہ فی نفسہ پالتو جانور نہ ہو ' اور انسانوں سے غیر مانوس ہو ' ان کو دیکھ کر بھاگنے والا ' متنفر اور وحشی ہو۔ سو اگر کوئی شخص کسی درندے کو یا پھاڑنے چیرنے والے پرندے کو یا حشرات الارض میں سے کسی جانور مثلاً چھپکلی یا گرگٹ وغیرہ اور دیگر کیڑے مکوڑے کو قتل کر دے تو اس پر ضمان نہیں ہے ' اسی طرح محرم اگر کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے مثلاً گائے ' بکری اور مرغی وغیرہ کو تو اس پر بالاتفاق ضمان نہیں ہے ' اور یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سمندری اور دریائی جانور کو شکار کرنا جائز ہے ' صرف خشکی کے جانور کو شکار کرنا محرم کے لیے جائز نہیں ہے۔

شکار پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمان کے لزوم میں مذہب آئمہ

امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک جس طرح شکار کو قتل کرنے سے محرم پر جزا لازم آتی ہے۔ اسی طرح اگر محرم کسی اور کو شکار کی طرف رہنمائی کرے یا اس پر دلالت کرے تو اس پر بھی ضمان لازم آتی ہے اور امام شافعی اور امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ ضمان کا تعلق قتل سے ہے ' اور شکار پر دلالت کرنا ' اس کو قتل کرنا نہیں اور یہ ایسا ہے جیسے غیر محرم ' غیر محرم کو کسی شکار پر دلالت کرے ' فقہاء احناف کا استدلال اس حدیث سے ہے۔

حضرت ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ گئے ' حتی کہ ہم " قاحہ " میں پہنچے ہم میں سے بعض محرم اور بعض غیر محرم تھے ' اچانک میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی کسی چیز کو دیکھ رہے ہیں ' میں نے دیکھا کہ وہ ایک جنگلی گدھا تھا ' میں نے اپنے گھوڑے پر زین ڈالی ' اپنا نیزہ سنبھالا اور سوار ہوگیا۔ اتفاقا میرا چابک گر گیا ' میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا مجھے چابک اٹھا دو ' ساتھی محرم تھے ' انھوں نے کہا خدا کی قسم ہم تمہاری اس معاملہ میں بالکل مدد نہیں کریں گے ' میں نے اتر کر چابک اٹھایا اور سوار ہوگیا۔ میں نے اس جنگلی گدھے کو پیچھے سے جا کر پکڑ لیا درآنحالیکہ وہ ٹیلہ کے پیچھے تھا ' میں نے نیزہ مار کر اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس کو اپنے ساتھیوں کے پاس لایا۔ بعض ساتھیوں نے کہا کھالو اور بعض نے کہا نہ کھاؤ ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے آگے تھے۔ میں گھوڑا بڑھا کر آپ تک پہنچا ' آپ نے فرمایا وہ حلال ہے اس کو کھالو۔ (صحیح مسلم ' الحج ' ٥٦ ' (١١٩٦) ٢٨٠٤ ' صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ١٨٢٣ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ١٨٥٢ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ٨٤٧ ' سنن النسائی ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ٢٨١٦)

درج ذیل حدیث میں زیادہ وضاحت ہے :

حضرت ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حج کے لیے گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے بعض صحابہ کو ایک طرف روانہ کیا جس میں ابو قتادہ بھی تھے۔ آپ نے فرمایا تم لوگ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلو ' پھر مجھ سے آملنا ' پھر وہ سب سمندر کے کنارے کنارے چل پڑے ' جب وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف جانے لگے تو حضرت ابو قتادہ (رض) کے سوا سب نے احرام باندھ لیا ' انھوں نے احرام نہیں باندھا تھا ' چلتے چلتے انھوں نے جنگلی گدھے دیکھے۔ حضرت ابو قتادہ (رض) نے ان پر حملہ کیا اور ایک گدھی کی کونچیں کاٹ ڈالیں ' پھر سب نے اتر کر اس کا گوشت کھایا۔ حضرت ابو قتادہ (رض) کہتے ہیں کہ پھر انھوں نے سوچا کہ ہم نے (شکار کا) گوشت کھالیا ہے ' حالانکہ ہم محرم ہیں۔ حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اس جنگلی گدھی کا باقی ماندہ گوشت اپنے ساتھ رکھ لیا اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا ' یا رسول اللہ ! ہم نے احرام باندھ لیا تھا اور ابو قتادہ (رض) نے احرام نہیں باندھا تھا ' ہم نے جنگلی گدھے دیکھے ' ابو قتادہ (رض) نے ان پر حملہ کیا اور ان کی کونچیں کاٹ ڈالیں ' پھر ہم نے اتر کر اس کا گوشت کھایا۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ ہم محرم تھے ' اور ہم نے شکار کا گوشت کھالیا ' پھر ہم نے باقی گوشت رکھ لیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی نے شکار کا امر کیا تھا یا اس کی طرف کسی قسم کا اشارہ کیا تھا ؟ انھوں نے کہا نہیں ' آپ نے فرمایا اس کا باقی ماندہ گوشت بھی کھالو۔ شیبان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تم میں سے کسی شخص نے اس کو حملہ کرنے کا حکم دیا تھا ؟ یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا ؟ اور شعبہ کی روایت میں ہے کہ تم نے اشارہ کیا تھا یا امداد کی تھی ؟ یا شکار کیا تھا ؟ (صحیح مسلم ' الحج ' ٦٠ ' (١١٩٦) ٢٨١٠ ' صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ١٨٢٤ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ١٨٥٢ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ٨٤٨ ' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ٢٨٢٥ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ٣٠٩٣ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ٣٩٦٦ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : ٨٣٣٧ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ٥ ' ص ٣٢٢ ' سنن دار قطنی ' ج ٢ ص ٢٩١ ' ملتان ' مسند احمد ' ج ٥ ' ص ٣٠٦ ' ٣٠٥ ' ٣٠١ ' طبع قدیم)

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شکار کے حلال ہونے کو اس کی طرف اشارہ نہ کرنے پر موقوف فرمایا ہے۔ سو اگر کوئی شخص زبان سے شکار کی رہنمائی کرے گا تو وہ بطریق اولی حرام ہوگیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سے تو صرف اس شکار کا حرام ہونا لازم آئے گا ' ضمان لازم نہیں آئے گی ' تو ہم کہیں گے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ محرم کے لیے شکار کی طرف اشارہ کرنا ' یا اس کی طرف رہنمائی کرنا حرام ہے ' اور اس کے اس اشارہ کرنے کی وجہ سے اس شکار کا امن زائل ہوگیا اور اس کی جان تلف ہوگئی اور اس کے اشارہ

اور اعانت کی وجہ سے وہ شکار قتل کر دیا گیا ٗسو شکار کی طرف اشارہ کرنے والے محرم پر بھی وہی ضمان ہو گی جو شکار کو قتل کرنے والے محرم پر ہوتی ہے۔ عطاء نے کہا ہے کہ تمام لوگوں کا اس اجماع ہے کہ شکار پر دلالت کرنے والے پر بھی ضمان ہے ٗاور اس زمانہ کے لوگ صحابہ کرام اور تابعین تھے۔ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے۔ کہ حضرت علی (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) کا بھی یہی مذہب ہے اور امام طحاوی نے اس کو متعدد صحابہ سے نقل کیا ہے ٗاور کسی صحابی سے اس کے خلاف منقول نہیں ہے اس پر اجماع صحابہ ہے اور حضرت ابن عمر سے جو یہ منقول ہے کہ دلالت کرنے والے پر ضمان نہیں ہے ٗاس کا معنی یہ ہے کہ جب دلالت کرنے سے شکار کو قتل نہ کیا جائے۔ (فتح القدیر ٗج ٣ ٗص ٦٤۔ ٦٣ ٗمطبوعہ دارالفکر ٗبیروت ١٤١٥ ھ)

شکار پر دلالت کرنے سے بھی ضامن بنایا جائے گا پس جب کسی محرم کو شکار پر دلالت کی اور اس نے اس شکار کو تلف کر دیا ٗتو اس کی پوری جزا محرم پر ہو گی۔ حضرت علی (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے اور مجاہد ٗبکر مزنی ٗاسحاق اور فقہاء احناف کا بھی یہی مذہب ہے ٗاور امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے کہ دلالت کرنے والے پر کچھ ضمان نہیں ہے۔ کیونکہ ضمانت جنایت سے لازم آتی ہے ٗدلالت سے لازم نہیں آتی اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو قتادہ (رض) کے اصحاب سے فرمایا تھا ٗکیا تم میں سے کسی نے اس کو حملہ کرنے کا حکم دیا تھا؟ یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ نیز شکار پر دلالت کرنا اس کو تلف کرنے کا ذریعہ ہے ٗلہٰذا اس کی وجہ سے ضمان لازم آئے گی اور یہ حضرت علی (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) کا قول ہے ٗاور صحابہ میں سے کوئی ان کا مخالف نہیں ہے۔ (المغنی ج ٣ ص ١٤٣ ٗمطبوعہ دارالفکر ٗبیروت ١٤١٥ ھ)

شکار کی جزا میں اس کی مثل صوری ضروری ہے یا اس کی قیمت؟

امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک شکار کو قتل کرنے کی جزا یہ ہے کہ جس مقام پر شکار کو قتل کیا گیا یا جو جگہ اس کے قریب ترین ہو ٗوہاں اس شکار کی قیمت مقرر کی جائے اور دو نیک شخص اس کی قیمت مقرر کریں ٗپھر فدیہ دینے میں محرم کو اختیار ہے ٗاگر اتنی رقم سے قربانی کا جانور خریدا جا سکتا ہے تو اس قربانی کا جانور خرید کر اس کو ذبح کر دے اور اگر چاہے تو اس رقم سے طعام خرید کر مسکینوں پر صدقہ کرے ٗہر مسکین کو دو کلو گرام گندم یا چار کلو گرام کھجوریں یا جو صدقہ کرے اور اگر چاہے تو جتنے مساکین پر صدقہ لازم آتا ہے اتنے دنوں کے روزے رکھے ٗمثلا فدیہ کی رقم سے دس کلو گندم آتی ہے ٗجو پانچ مسکینوں پر صدقہ کی جائے گی تو اس کو اختیار ہے کہ وہ پانچ مسکینوں پر دس کلو گندم صدقہ کرے ٗاور چاہے تو اس کے بجائے پانچ دنوں کے روزے رکھ لے۔

امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی نظیر ہو سکتی ہو ٗاس میں اس کی نظیر کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ ہرن کی نظیر بکری ہے ٗاور بجو کی نظیر بھی بکری ہے اور خرگوش کی نظیر بکری کا بچہ ہے ٗاور جنگلی چوہے کی نظیر چار ماہ کا بکری کا بچہ ہے اور شتر مرغ کی نظیر اونٹ ہے اور جنگلی گدھے کی نظیر گائے ہے ٗکیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت) ” فجزآء مثل ما قتل من النعم “۔ (المائدہ: ٩٥)

ترجمہ: تو اس کا تاوان اس جانور کی مثل ہے۔

اور مقتول جانور کی مثل وہ ہوگی جو صورۃ اس کی مثل ہو اور قیمت اس جانور کی مثل نہیں ہے اور صحابہ کرام (رض) نے بھی خلقت اور ظاہری صورت کے اعتبار سے مثل کو واجب کیا ہے۔ شتر مرغ ' ہرن ' جنگلی گدھے اور خرگوش میں انھوں نے ان ہی جانوروں کو مثل قرار دیا ہے ' جو ہم نے بیان کی ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا ' کیا بجو شکار ہے؟ فرمایا ہاں جب محرم اس کا شکار کرے تو اس میں ایک مینڈھا ہے۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ٣٨٠١' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ٨٥١' سنن النسائی ' رقم الحدیث : ٢٨٣٦' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ٣٢٣٦' سنن دارمی ' ١٨٧٧' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ٣٩٦٥' مسند احمد ' ج ٣' ص ٢٩٧' سنن دارقطنی ج ٢' ص ٢٤٥' ملتان ' المستدرک ' ج ١' ص ٤٥٢)

جس جانور کی نظیر نہ ہو ' اس میں امام محمد رحمۃ اللہ عنہ کے نزدیک قیمت واجب ہے ' مثلا چڑیا اور کبوتر اور ان کی مثل دوسرے پرندے ' اور جب قیمت واجب ہو تو امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں مثل کو مطلقا ذکر کیا ہے ' اور مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے اور مثل کامل وہ ہے جو صورۃ اور معنی دونوں اعتبار سے مثل ہو ' اور جب کامل مثل متحقق نہیں ہو سکتی ' تو اس کو معنی مثل پر محمول کیا جائے گا ' کیونکہ مثل معنوی شریعت میں متعارف ہے ' جیسا کہ حقوق العباد میں ہے ' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

(آیت) فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم "۔ (البقرہ : ١٩٤)

ترجمہ : سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کا بدلہ لو ' اس زیادتی کی مثل جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

نیز جن جانوروں کی مثل نہیں ہے ان میں امام شافعی کے نزدیک بھی مثل معنوی مراد ہوتی ہے پس مثل معنوی بالاجماع مراد ہے۔ لہذا سب جگہ مثل معنوی ہی مراد لینی چاہیے ' ورنہ قرآن مجید کے ایک لفظ سے دو معنی مراد لینے لازم آئیں گے ' کہیں مثل صوری اور کہیں مثل معنوی۔ نیز مثل معنوی میں عموم ہے اور مثل صوری میں خصوص ہے اور عموم خصوص پر راجح ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ محرم نے جس شکار کو قتل کیا ہے ' اس پر اس کے تاوان میں اس کی قیمت واجب ہے۔ نیز قرآن مجید میں قتل کیے ہوئے شکار کے لیے نعم کا لفظ ہے اور یہ لفظ جنگلی اور پالتو دونوں قسم کے جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے۔

جزاء میں اختیار منصفوں کی طرف راجع ہے یا محرم کی طرف؟

امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جزاء میں اختیار محرم کی طرف راجع ہے ' یعنی محرم کو اختیار ہے ' خواہ وہ اس جانور کی قیمت سے قربانی کا جانور خرید کر اس کی قربانی کر دے ' یا اس کی قیمت کا طعام خرید کر مساکین پر صدقہ کر دے ' یا ان مسکینوں کی تعداد کے برابر روزے رکھ لے ' اور امام شافعی اور امام محمد کے نزدیک یہ اختیار فیصلہ کرنے والے دو نیک حاکموں کی طرف راجع ہے۔ اگر وہ قربانی کا حکم دیں تو اس جانور کی نظیر خرید کر اس کی قربانی کرے ' اور اگر وہ طعام صدقہ کرنے کا حکم دیں یا روزے رکھنے کا حکم دیں تو اس کی قیمت کا طعام خرید کر مساکین پر صدقہ کرے یا مساکین کی تعداد کے برابر روزے رکھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کی دلیل یہ ہے کہ یہ اختیار محرم کی آسانی کے لیے دیا گیا ہے اور محرم کے لیے آسانی اسی وقت ہوگی جب یہ اختیار اس کی طرف راجع ہو۔ امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ہے تم میں سے دو منصف اس (کی مثلیت) کا فیصلہ کریں گے درآنحالیکہ یہ قربانی کعبہ کو پہنچنے والی ہو ' یا اس پر چند مسکینوں کا کھانا ہے ' یا ان کی تعداد کے برابر روزے رکھنا ہیں اور ظاہر آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختیار ان منصفوں کی طرف راجع ہے۔

طعام کا صدقہ مکہ میں کرنا ضروری ہے یا دوسرے شہر میں بھی جائز ہے

قربانی کا جانور صرف مکہ میں ذبح کیا جائے گا اور مسکینوں کو طعام کا صدقہ کسی اور شہر میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی صدقہ طعام کو قربانی پر قیاس کرکے کہتے ہیں کہ یہ طعام بھی مکہ کے مسکینوں پر صدقہ کیا جائے اور ان دونوں میں مشترک چیز یہ ہے کہ حرم کے رہنے والوں کے ساتھ حسن سلوک ہو۔ امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ شکار کی جزاء میں کسی جانور کو ذبح کرنا غیر معقول فعل ہے ' لہٰذا وہ زمان اور مکان کے اعتبار سے اپنے امور میں بند رہے گا اور صدقہ کرنا ایک معقول فعل ہے۔ اس لیے وہ ہر جگہ ہو سکتا ہے اور روزہ میں اتفاق ہے کہ وہ کسی بھی شہر میں رکھے جا سکتے ہیں۔ (ہدایہ اولین 'ص ۲۸۰ ' ۲۷۷ ' مختصرا و موضحا 'مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ 'ملتان)

دوسری بار شکار کو مارنے سے جزاء لازم ہو گی یا نہیں؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو گزر گیا اس کو اللہ نے معاف کر دیا اور جو دوبارہ یہ کام کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ بہت غالب منتقم ہے۔ (المائدہ: ۹۵)

اس آیت کا معنی ہے محرم نے پہلی بار شکار کو قتل کیا اور اس کی ضمان یا یا جزاء ادا کر دی ' تو اللہ اس کو معاف کر دے گا اور جس محرم نے دوسری بار شکار کو قتل کیا ' وہ اخروی عذاب کا مستحق ہو گا۔

دوسری بار شکار کو قتل کرنے والا ضمان ادا کرے گا یا نہیں ' اس میں دو قول ہیں۔ عطاء ' ابراہیم ' ابن جبیر ' حسن اور جمہور کا قول یہ ہے کہ تکرار قتل سے تکرار جزاء واجب ہوتی ہے اور حضرت ابن عباس (رض) اور قاضی شریح کا قول یہ ہے کہ اگر محرم نے دوبارہ شکار کو قتل کیا تو اس کو کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا ' حتی کہ جب ان سے کوئی محرم سوال کرتا کہ اس نے شکار کو قتل کر دیا ہے ' اب وہ کیا کرے تو وہ اس سے سوال کرتے تھے کہ اس نے پہلی بار شکار کو قتل کیا ہے یا دوسری بار۔ اگر اس نے پہلی بار قتل کیا ہوتا تو اس کو کفارہ کا حکم دیتے اور اگر دوسری بار قتل کیا ہوتا ' تو اس کو کفارہ کا حکم نہ دیتے ' اور وہ چونکہ عذاب اخروی کا مستحق ہے ' اس لیے اب اس پر صرف توبہ کرنا لازم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے کہ اس کی توبہ قبول فرمائے یا اس کو عذاب دے ' جس طرح باقی کبیرہ گناہوں کا حکم ہے۔

اس آیت کی توجیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے دوبارہ حالت احرام میں شکار کو قتل کیا اور کفارہ نہیں دیا ' تو اللہ اس سے انتقام لے گا ' لیکن یہ توجیہ ظاہر آیت سے بعید ہے۔ اس آیت میں گناہ کبیرہ پر اصرار کرنے والے کے لیے بہت سخت وعید ہے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کو دوبارہ کرنے پر انتقام لینے کی وعید سنائی ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ ہر آن اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کو دوبارہ کرنے پر انتقام لینے کی وعید سنائی ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ ہر آن اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا

رہے اور کسی بھی گناہ کو دوبارہ کرنے سے اجتناب کرے۔ مبادا وہ اللہ تعالیٰ کے انتقام کا شکار ہو جائے 'میں جب بھی اس آیت کو پڑھتا ہوں ' تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

اضطرار کی صورت میں شکار اور مردار میں سے کس کو اختیار کرنا اولی ہے

اگر محرم کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ ملے اور وہ بھوک سے جاں بلب ہو اور اس کو مردار اور شکار دونوں میسر ہوں تو اس میں اختلاف ہے کہ وہ مردار کھا کر جان بچائے یا شکار کو مار کر کھائے۔ امام زفر نے کہا وہ مردار کھالے 'کیونکہ مردار ایک وجہ سے حرام ہے اور شکار کو قتل کر کے کھانا کئی وجہ سے حرام ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ وہ شکار کو قتل کر کے کھالے اور اس کی جزاء ادا کرے 'کیونکہ مردار کی حرمت زیادہ غلیظ ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شکار کی حرمت عارضی ہے 'احرام سے نکلنے کے بعد یہ حرمت ختم ہو جاتی ہے 'اس کے برخلاف مردار کی حرمت دائمی ہے اور جب اسے دو حرمتوں میں سے کسی ایک حرمت کا ارتکاب کرنا پڑے تو زیادہ غلیظ حرمت کے مقابلہ میں ضعیف حرمت کو اختیار کرے جیسا کہ دو مصیبتوں میں سے کم درجہ کی مصیبت کو اختیار کیا جاتا ہے 'جس کو فقہاء "اھون البلیتین" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مبسوط میں اسی طرح مذکور ہے اور فتاوی قاضی خان میں لکھا ہے کہ اس صورت میں امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے قول کے مطابق مردار کھانا شکار کو قتل کر کے کھانے سے اولی ہے۔ امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد نے کہا کہ شکار کو ذبح کرلے اور اگر شکار حلال ہو اور مذبوح ہو تو سب کے نزدیک شکار کو کھانا مردار سے اولی ہے اور اگر ایک طرف شکار ہو اور دوسری طرف خنزیر کا گوشت ہو تو جان بچانے کے لیے محرم کے واسطے اولی یہ ہے کہ وہ شکار کھالے۔ (روح المعانی جز ۷ ص ۳۰۔ ۲۹ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)
مبسوط اور فتاوی قاضی خاں کی نقل میں تعارض ہے 'ہمارے نزدیک مبسوط کی نقل معتمد ہے اور قوت دلیل کے اعتبار سے وہی راجح ہے۔
(تبیان)
اس کے متعلق بعض احکام سورۃ مائدہ کے شروع میں میں گزر چکے۔
حضور نے سمندر کے کنارے پر ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا جس کا سردار حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رض) کو مقرر کیا، یہ لوگ کوئی تین سو تھے حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں میں بھی ان میں سے تھا ہم ابھی راستے میں ہی تھے جو ہمارے توشے تھے ختم ہو گئے، امیر لشکر کو جب یہ علم ہوا تو حکم دیا کہ جو کچھ جس کسی کے پاس ہو میرے پاس لاؤ چنانچہ سب جمع کرلیا اب حصہ رسدی کے طور پر ایک مقررہ مقدار ہر ایک کو بانٹ دیتے تھے یہاں تک کہ آخر میں ہمیں ہر دن ایک ایک کھجور ملنے لگی آخر میں یہ بھی ختم ہو گئی۔ اب سمندر کے کنارے پہنچ گئے دیکھتے ہیں کہ کنارے پر پہنچ گئے دیکھتے ہیں کہ کنارے پر ایک بڑی مچھلی ایک ٹیلے کی طرح پڑی ہوئی ہے، سارے لشکر نے اٹھارہ راتوں تک اسے کھایا، وہ اتنی بڑی تھی کہ اس کی دو پسلیاں کھڑی کی گئیں تو اس کے نیچے سے ایک شتر سوار نکل گیا اور اس کا سر اس پسلی کی ہڈی تک نہ پہنچا، یہ حدیث بخاری مسلم میں بھی ہے ایک اور روایت میں ہے کہ اس کا نام عنبر تھا ایک روایت میں ہے کہ یہ مردہ ملی تھی اور صحابہ نے آپس میں کہا تھا کہ ہم رسول اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں اور اس وقت سخت دقت اور تکلیف میں ہیں اسے کھالو ہم تین سو آدمی ایک مہینے تک وہیں رہے اور اسی کو کھاتے رہے یہاں تک کہ ہم موٹے تازے اور تیار ہو گئے اس کی آنکھ کے سوراخ میں سے ہم چربی ہاتھوں میں بھر بھر کر نکالتے تھے تیرہ شخص اس کی آنکھ کی گہرائی میں بیٹھ گئے تھے، اس کی پسلی کی ہڈی کے درمیان سے سانڈنی سوار گزر جاتا تھا، ہم نے اس کے گوشت اور چربی سے مٹکے

بھر لیے جب ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس واپس پہنچے اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا یہ اللہ کی طرف سے روزی تھی جو اللہ جل مجدہ نے تمہیں دی کیا اس کا گوشت اب بھی تمہارے پاس ہے؟ اگر ہو تو ہمیں بھی کھلاؤ، ہمارے پاس تو تھا ہی ہم نے حضور کی خدمت میں پیش کیا اور خود آپ نے بھی کھایا۔

مینڈک کو نہ مارو۔

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مینڈک کو مارنے کی ممانعت کی ہے اور فرمایا کہ اس کی آواز خدا کی تسبیح ہے۔

دوبارہ جرم کرنے کی سزا

امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک صاحب احرام نے شکار کیا اس پر فدیہ کی سزا عائد کی گئی۔ اس نے دوبارہ یہ جرم کیا تو آسمان سے آگ اتری بجلی گری اور اسے جلا دیا۔ یہی معنی فینتقم اللہ منہ کے ہیں۔ اللہ اپنی سلطنت میں غالب ہے کوئی اس کو مغلوب نہیں کر سکتا

اللہ نے آئندہ امتحان کی پہلے سے اطلاع مؤمنوں کی اعانت کے طور پر دے دی تا کہ نافرمانی سے کامل طور پر بچتے رہیں۔

فمن اعتدی بعد ذلک اس (امتحان یا اطلاع) کے بعد جو شخص زیادتی کرے گا یعنی شکار کرلے گا۔

فلہ عذاب الیم اس کو خصوصیت کے ساتھ دردناک عذاب ہوگا کیونکہ حقیر چیز سے جب وہ اپنے نفس کو

نہ روک سکا اور اللہ کے حکم کا اس نے پاس لحاظ نہیں کیا تو ایسی چیزوں سے اپنے کو کیسے روک سکے گا جن کی طرف طبعی میلان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ (آیت مذکورہ کے نزول کے بعد) ایک شخص نے جس کو ابوالیسر کہا جاتا تھا (احرام کی حالت میں) ایک گورخر پر حملہ کرکے قتل کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

یا یہاالذین امنوالا تقتلواالصید وانتم حرم اے مسلمانو! بحالت احرام شکار کو نہ مارو۔

شکار کی تعریف

یعنی اس حیوان کو قتل نہ کرو جو اصل خلقت کے لحاظ سے جنگلی اور محفوظ القتل ہو۔ خواہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ کذا فی القاموس۔ امام ابو حنیفہ (رح) نے صید کی یہی تعریف کی ہے اور یہی مراد لی ہے۔ لیکن ان جانوروں کو حکم سے الگ قرار دیا ہے جن کے قتل کا جواز احادیث میں آگیا ہے یعنی سانپ، بچھو، چوہا، چیل، کوا اور لاگو درندہ، جو لاگو نہ ہو اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی بناء پر کتے کو خصوصاً کٹ کھنے کتے کو قتل کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ہر کتا شکار ہے (یعنی اصل خلقت کے اعتبار سے جنگلی ہے) کتے کا پالتو بن جانا عارضی ہے (سکھانے سے پالتو بن جاتا ہے) کچھ لوگ کہتے ہیں کتا طبعاً جنگلی نہیں ہے اس لیے اس کو شکار نہیں قرار دیا جاسکتا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا گیا محرم کن جانوروں کو قتل کر سکتا ہے فرمایا ان (مندرجہ ذیل) جانوروں کو (بحالت احرام) قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے بچھو، چوہا، کوا، چیل، کٹ کھنا کتا، صحیحین میں

حضرت عائشہ (رض) کی روایت میں بھی انہی پانچ کا ذکر ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ کلب سے مراد درندہ ہے کلب کا اطلاق عام درندہ پر ہوتا ہے عتبہ بن ابی لہب کے قصہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی تھی الٰہی اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط فرمادے (چنانچہ عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا) اللہ نے فرمایا ہے من الجوارح مکلبین۔

امام ابو حنیفہ (رح) نے فرمایا اگر لغتہً لفظ کلب کا اطلاق ہر درندہ پر تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی عرفاً اس لفظ کا غالب استعمال صرف کتے ہی کے لیے ہوتا ہے اور حدیثِ مذکورہ بالا (یعنی جس حدیث میں پانچ جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت ہے) کو عرف عام پر محمول کرنا اولیٰ ہے (للذا کلب سے مراد کتا ہی ہے ہر درندہ مراد نہیں ہے) ابو عوانہ نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے چھ جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ سانپ کا ذکر مزید ہے۔ یہ روایت بطریق بخاری ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا محرم سانپ کو بچھو کو چوہے کو کٹ کھنے کتے کو چیل کو اور عادی درندہ کو قتل کرسکتا ہے کوے کو قتل نہ کرے کوئی اینٹ پتھر اس پر پھینک سکتا ہے۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے مگر اس روایت میں عادی درندہ کا ذکر نہیں ہے۔

سعید بن مسیب کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا محرم سانپ اور بھیڑیئے کو قتل کردے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور اور ابوداؤد نے نقل کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مسلم نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے صرف چار کا ذکر کیا ہے مشہور پانچ میں سے بچھو کا ذکر ساقط کردیا ہے۔

قاضی ثناء اللہؒ کا فیصلہ

میرے نزدیک قابل فتویٰ وہ قول ہے جس کو صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے کہ صحرائی جانور کچھ ماکول ہوتے ہیں (یہ تو سب صید ہیں ان کو بحالت احرام شکار کرنا حرام ہے) اور کچھ غیر ماکول۔ غیر ماکول کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو ابتدائی طور پر دکھ پہنچانے والے ہیں کچھ ایسے نہیں ہوتے ابتدائی دکھ پہنچانے وال ' غیر ماکول جانوروں کو قتل کرنا جائز ہے جواز صید کی علت مرحجہ ابتدائی اذیت رسانی ہے (یعنی جو جانور عموماً ابتدائی طور پر اذیت رساں ہوتے ہیں ان کو بحالت احرام قتل کرنے درست ہے) ایک روایت میں امام ابو یوسف کا بھی یہی قول آیا ہے کذافی فتویٰ قاضی خاں۔

ایذاء کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں (۱) بدن میں زہر پہنچانا جیسے بچھو کرتا ہے ' اس علت میں عقرب (بچھو) کے تحت تمام زہریلے جانور جو ڈنک مارتے اور ڈستے ہیں آگئے۔ (۲) کترنا سوراخ کرنا۔ جیسے چوہا کرتا ہے چوہے کے تحت اس علت کی وجہ سے نیولا آگیا ہے۔ (۳) جھپٹا مارنا جیسے کوا اور چیل جھپٹا مار کرلے جاتے ہیں اس علت کی وجہ سے شکرا ' باز ' شاہین وغیرہ چیل کوے کے ذیل میں آگئے۔ (۴) حملہ کرکے کاٹنا اس مناسبت سے کٹ کھنے کتے کے تحت ہر درندہ آگیا۔ پالتو پلا چونکہ جنگلی جانور نہیں ہے اس لیے امام صاحب کے نزدیک وہ صید میں داخل نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ پالتو پلا بھی اصلاً جنگلی جانور ہی ہے اس کا پالتو ہونا عارضی ہے۔ اس کے برخلاف وہ چوپائے ہیں جو خلقتاً تو پالتو ہیں لیکن کبھی بھاگ کر جنگلی بن جاتے ہیں (جیسے کوئی گائے بھینس گھوڑا بیل جنگلی بن جاتا ہے) اس کا شمار جنگلی جانوروں میں نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ : شکاری کو اشارہ سے شکار بتانا یا ایسی حرکت کرنا جس سے شکاری شکار کو دیکھ لے باجماع علماء قتل کے حکم میں ہے شکار کا جانور جنگلی ہونے اور آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے قتل ہونے سے محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن اشارہ کرنے والے کے اشارہ کی وجہ سے اس کا امن سے رہنا ختم

ہو جاتا ہے۔اس لیے اشارہ بھی قتل کا حکم رکھتا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ سب صحابہ (رض) نے احرام باندھا ہوا تھا حضرت ابو قتادہ (رض) محرم نہ تھے ' اثنائِ سفر میں لوگوں نے ایک گورخر دیکھا اور ابو قتادہ نے حملہ کرکے اس کو قتل کردیا اور ذبح کرکے اس کا گوشت لائے اور سب نے وہ گوشت کھایا اس حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ (رض) کو حملہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا یا گورخر کی طرف اشارہ کیا تھا 'صحابہ (رض) نے عرض کیا جی نہیں فرمایا تو جو گوشت باقی رہ گیا ہے اس کو (بھی) کھا سکتے ہو۔اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھانے کے جواز کے لیے اشارہ نہ کرنے کی شرط لگائی (جس سے معلوم ہوا کہ محرم کے لیے شکار کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ غیر محرم کو معلوم ہوجائے اور وہ شکار کرلے جائز نہیں ہے)

مسئلہ : پرندہ کے انڈوں کا حکم بھی شکار کا ہے۔داؤد ظاہری کے نزدیک انڈوں کو توڑنے کا کچھ ضمان نہیں۔اب آگے حدیث اور اقوال صحابہ (رض) ذکر کریں گے جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ انڈوں کو توڑنے کا محرم پر ضمان ہے۔

مسئلہ : محرم نے اگر شکار کیا یا ذبح کیا تو جمہور کے نزدیک وہ مردار ہے اس کا کھانا نہ احرام والے کو جائز ہے نہ غیر محرم کو۔

مسئلہ : اگر غیر محرم نے شکار کیا مگر محرم نے اس کو شکار کرنے کو کہا تھا یا اشارہ کیا تھا یا اپنی کسی حرکت سے راہ نمائی کی تھی تو محرم کے لیے اس کا کھانا حرام ہے۔ابو قتادہ (رض) والی حدیث ہم اوپر نقل کرچکے ہیں لیکن غیر محرم کے لیے اس کو کھانا جمہور کے نزدیک حلال ہے۔

جان بوجھ کر شکار کو قتل کرنا

جان کر مارنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنا محرم ہونا یاد ہو اور یہ بھی مستحضر ہو کہ حالت احرام میں شکار جائز نہیں۔یہاں صرف متعمد کا حکم بیان فرمایا کہ اس کے فعل کی جزا یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا وہ الگ رہا جیسا کہ ومن عاد فینتقم اللہ منہ سے تنبیہ فرمائی۔اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزاء تو یہی رہے گی یعنی ہدی یا طعام یا صیام البتہ خدا اس سے انتقامی سزا اٹھالے گا۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص شکار کرنا چاہتا ہو اور کوئی محرم اس کو زبان سے یا ہاتھ کے اشارہ سے شکار بتادے اور وہ قتل کردے تو امام ابو حنیفہ (رح) اور امام احمد کے نزدیک بتانے والے محرم پر پاداش عائد ہوگی امام شافعی (رح) اور امام مالک (رح) کے نزدیک بتانے والا گناہ گار نہ ہوگا پاداش اس پر عائد نہ ہوگی جیسے کوئی شخص کسی روزہ دار کو کسی عورت کی طرف زبان یا اشارہ سے راہ نمائی کرے اور روزہ دار اس سے جا کر جماع کرلے تو بتانے والے پر کفارہ نہیں پڑے گا نہ روزہ دار کے جماع کرنے سے بتانے والے کا روزہ ٹوٹے گا۔ہاں بتانے والا گناہ گار ضرور ہوگا راہ نمائی قتل نہیں ہے اور کفارہ قاتل پر عائد ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں بتانا درحقیقت قتل ہی ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اشارہ کو قتل کے مساوی قرار دیا ہے جیسا کہ ابو قتادہ والی حدیث سے ظاہر ہے پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر بتانے والے پر پاداش عائد نہیں کی جائے گی تو بتانے کا گناہ بتانے والے پر باقی رہے گا۔

کیونکہ بتانا باجماع امت ممنوع ہے اور قتل کا گناہ کفارہ سے دور ہوجاتا ہے اس صورت میں قتل سے زیادہ بتانے کا گناہ قرار پائے گا (جو بداہت کے خلاف ہے)۔

ایک شبہ

اگر بتانا قتل کے مساوی ہے تو بتانے کے بعد بتانے والے پر پاداش کا وجوب ہونا چاہیے خواہ بتانے کے بعد شکاری شکار کو قتل کرے یا نہ کرے۔

جواب

بتانا قتل کا سبب ہے جیسے تیر مارنا قتل کا سبب ہے لیکن صرف تیر مارنا موجب پاداش نہیں جب تک شکار مارا نہ جائے اسی طرح بتانے کے بعد اگر شکار قتل نہ کیا جائے تو موجبِ پاداش نہیں کیونکہ جب تک قتل نہ ہوگا نہ بتانے کو سبب قتل کہا جاسکتا ہے نہ تیر یا پتھر مارنے کو۔)

احرام میں شکار پکڑنے اور مارنے کا کفارہ

حنفیہؒ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے۔ اگر مار دیا تو صاحب بصیرت اور تجربہ کار معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائی اسی قدر قیمت کا مویشی میں سے ایک جانور لے کر (مثلاً بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) کعبہ کے نزدیک یعنی حدود حرم میں پہنچا کر ذبح کرے، اور خود اس میں سے نہ کھائے یا اسی قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۃالفطر کی مقدار تقسیم کر دے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا، اتنے ہی دنوں کے روزے رکھ لے۔

فجزآء مثل ما قتل من النعم تو اس پر پاداش واجب ہے. برابر اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے

نکتہ: جزائٌپر فاء اس لیے لایا گیا کہ مبتدا معنیٔ شرط کو مشتمل ہے یعنی اس پر پاداش واجب ہے

کس قسم کی مثل واجب ہے

امام ابو حنیفہ (رح) اور امام ابو یوسف (رح) کے نزدیک قربانی کا جانور قیمت میں شکار کے برابر ہونا چاہیے۔

بعض قسم کے شکار کی تو بالاجماع قیمت ہی کا حساب لگانا ضروری ہے مثلاً اس جانور کا شکار کیا ہو جس کا اونٹ گائے بھینس بکری مینڈھے وغیرہ میں سے کوئی مثل نہ ہو یا کبوتر سے چھوٹا ہو مثلاً چڑیا ٹڈی وغیرہ ہو لہٰذا مثل معنوی مراد لینا ہی ضروری ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ شرع میں جہاں لفظ مثل بلا قید آیا ہے اس سے مراد یا نوعی مثل ہوتا ہے یا وہ چیز جو قیمت میں برابر ہو اللہ فرماتا ہے:

فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ اگر کسی نے تم پر زیادتی کی ہو تو جیسی اور جتنی زیادتی اس نے کی ہو اتنا اور ویسا ہی انتقام تم لے سکتے ہو۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہی ہے کہ من النعم مثل کی صفت ہے اور مثل سے مراد وہ پالتو چوپایہ ہے جو قیمت میں شکار کی مثل ہو بعض اوصاف میں مماثلت مراد نہیں ہے۔ شکار کرنے والا محرم اگر جرم کے کفارہ میں قربانی دے تو پالتو چوپایوں میں سے جس کی قیمت شکار کے برابر ہو یا شکار سے زائد ہو اس کی قربانی کرے۔

اگر شکار کی قیمت پوری بکری کی قیمت سے کم ہو مثلاً بجو 'جنگلی 'چوہا 'ہرن 'گرگٹ 'گوہ 'لومڑی وغیرہ تو بکری کے بچے مختلف عمر کے (جیسے شکار کی قیمت ہو) قربانی میں پیش کرے لیکن بکری کے بچے ایسے ہوں کہ ان کی قیمت شکار کی قیمت سے کم نہ ہو۔
کبوترا اور کبوتر سے کم درجہ کے شکار کے عوض اگر قربانی دینا چاہے تو بکری کی قربانی دے مگر بکری ایسی ہو جس پر لفظ بکری کا اطلاق ہو سکتا ہو (یعنی نہ بے عیب کی شرط ہے نہ کسی عمر کی نہ تندرست کی) ہمارا یہ قول ہمارے نزدیک قابل فتویٰ ہے اور جمہور کے مسلک کے مطابق بھی ہے۔
ہماری (یعنی جمہور کی) دلیل یہ ہے کہ صحابہ (رض) نے بکری کا چھوٹا بچہ واجب قرار دیا ہے (اور چھوٹے بچے کی قربانی شرعاً درست نہیں ہے)۔
ابن ابی شیبہ نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک کبوترا اور دو کبوتر کے چوزوں کو حجرہ کے اندر بند کر دیا بند کر کے عرفات اور منا کو چلا گیا واپس آیا تو دیکھا تینوں مر چکے ہیں وہ شخص حضرت ابن عمر (رض) کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا 'آپ نے اس پر تین بکریوں کی قربانی لازم قرار دی اور آپ کے ساتھ ایک اور شخص نے بھی یہی فیصلہ کیا (کیونکہ قرآنی آیت میں مثلیت کی جانچ کے لیے دو صالح مسلمانوں کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے)۔

دو معتبر مسلمانوں کا فیصلہ

یحکم بہ ذواعدل منکم جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں یعنی پاداش کا فیصلہ یا مثل ہونے کا فیصلہ دو معتبر مسلمان کر دیں۔ اکثر حنفیہ قائل ہیں کہ مثل ہونے کی جانچ کے لیے ایک شخص کا فیصلہ بھی کافی ہے۔ بکثرت صحابہ (رض) نے انفرادی فیصلے کئے ہیں یہ انفرادی فیصلے روایات میں آئے ہیں۔ اگر دو کا اجتماعی فیصلہ ہو تو زیادہ اچھا ہے تاکہ غلطی سے بخوبی احتیاط ہو جائے۔
میمون بن مران کی روایت ہے کہ ایک بدو حضرت ابو بکر (رض) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے بحالت احرام ایک شکار مار دیا میں کیا پاداش ادا کروں، حضرت ابو بکر نے حضرت ابی بن کعب سے دریافت کیا آپ کی کیا رائے ہے بدو بولا میں آپ کے پاس آیا ہوں آپ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین ہیں میں آپ سے پوچھتا ہوں اور آپ دوسروں سے پوچھتے ہیں حضرت ابو بکر نے فرمایا کیا تم کو اللہ کے اس فرمان کا انکار ہے اللہ نے فرمایا یحکم بہ ذواعدل منکم اس حکم کی تعمیل میں میں اپنے ساتھی سے مشورہ لے رہا ہوں جب دونوں کی رائے متفق ہو جائے تو ہم ویسا ہی تجھے حکم دے دیں گے۔
ابو بکر مزنی کی روایت ہے کہ دو آدمی احرام بند تھے ایک نے ایک ہرن کو ہنکا دیا اور دوسرے نے قتل کر دیا پھر دونوں حضرت عمر (رض) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ان کی رائے دریافت کی۔
حضرت عبدالرحمٰن نے کہا میری رائے میں بکری ہونی چاہیے۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے۔ پھر فرمایا دونوں بکری کی قربانی دو۔ جب دونوں واپس لوٹے تو ایک نے دوسرے سے کہا امیر المومنین کو جواب معلوم نہ تھا تب ہی تو اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔
حضرت عمر (رض) نے یہ بات سن پائی فوراً واپس بلوایا اور کہنے والے کا استقبال درہ کی ضرب سے کرتے ہوئے فرمایا، حالت احرام میں شکار بھی مارتے ہو اور شرعی فیصل سے آنکھیں بھی بند رکھتے ہو اللہ نے فرمایا۔ یحکم بہ ذواعدل منکم اللہ نے فیصلہ کے لیے تنہا عمر کو پسند نہیں کیا اس لیے میں نے اپنے ساتھی سے مدد لی۔

ہر زمانہ میں دو عادل مسلمان مستقل فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

کفارہ کی تین صورتیں

او کفارۃ طعام مسکین اس آیت میں لفظ او بتا رہا ہے کہ قصور کرنے والے کو اختیار ہے قربانی کرے یا بطور کفارہ مسکینوں کو کھانا دے دے یا روزے رکھے۔ شعبی اور نخعی نے کہا کہ شکار کرنے کا عوض اسی ترتیب سے ادا کیا جائے گا جس ترتیب سے آیت میں آیا ہے (اوّل قربانی "قربانی کا جانور نہ ملے تو طعام مساکین اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے)۔

شکار کرنے کی سزا کو ہلکا کرنے کے لیے اللہ نے مجرم کو تینوں باتوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دیا جیسے قسم کے کفارہ میں اختیار دیا ہے یہ قول امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا ہے۔

اور جب وہ قیمت کا اندازہ کر دیں تو اب مجرم کو اختیار ہے کہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو پسند کر لے اس قیمت سے قربانی کا جانور خرید کر کعبہ کو بھیج دے یا کھانا خرید کر مساکین کو دیدے یا ہر مسکین کے کھانے کے عوض ایک روزہ رکھے۔

قربانی کے لیے شرط

بالغ الکعبۃ کا یہ مطلب ہے کہ قربانی کے لیے حرم شرط ہے 'حرم سے باہر قربانی نہ ہونی چاہیے۔ یہ مطلب نہیں کہ باہر سے خرید کر ہی بھیجی جائے۔ اسی پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ حج الوداع کے قصہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں سے فرمایا جس نے قربانی بھیج دی وہ حج پورا کرنے سے پہلے باندھا ہوا احرام نہ کھولے اور جس نے قربانی نہ بھیجی ہو وہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرکے بال کتروا کر احرام کھول دے پھر حج کا احرام باندھے اور قربانی کرے اور جس کو قربانی کا جانور نہ ملے وہ روزے رکھے۔

اس حدیث میں صاف صراحت ہے کہ بعض صحابیوں نے باہر سے قربانی کا جانور نہیں بھیجا تھا بلکہ مکہ میں خریدا تھا اور جن لوگوں کو مکہ میں قربانی کا جانور نہیں ملا تھا انھوں نے روزے رکھے تھے دیکھو مکہ کے اندر خریدے ہوئے قربانی کے جانور کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حدیث میں ہدی فرمایا اور صراحت فرمایا { ثُمَّ یمعل بالحج ولیہد } اللہ نے بھی تمتع کے سلسلہ میں فرمایا ہے { فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ } (اس آیت میں ہر قربانی کے جانور کو ہدی فرمایا ہے خواہ اس کو باہر سے نہ بھیجا گیا ہو)

مسئلہ : یہ امر اجماعی ہے کہ کھانا قیمت کے مطابق دیا جائے گا۔ اگر شکار کی مثل کوئی چوپایہ نہ ہوگا تو شکار کی قیمت لگا کر اس قیمت کا کھانا دیا جائے گا اور اگر شکار مثلی ہوگا تو شکار کی مثل جس چوپایہ کو قرار دیا گیا ہوگا۔ اس چوپایہ کی قیمت لگا کر اس کا کھانا خرید کر دیا جائے گا اس وقت شکار کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں شکار کی قیمت واجب نہیں ہے بلکہ شکار کی مثل چوپایہ واجب ہے کھانا دینا تو چوپایہ کے قائم مقام ہے۔ یہ قول جمہور کا ہے۔ اس قول پر کبوتر کے عوض اگر کھانا دینا ہو تو کبوتر کی قیمت کا نہیں 'بلکہ ایک بکری کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا کیونکہ اصل میں وجوب نظیر کا ہے۔

امام مالک نے خواہ نخواہ ایک شرط لگائی ہے کہ اگر قربانی کا جانور مکہ میں خریدا ہو تو واجب ہے کہ اس کو بوقت ارادہ حج عرفہ کو لے جائے اور وہاں سے بھیجے) امام مالک کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ: قربانی کے جانور کا گوشت صرف مکہ کے فقراء کو تقسیم کر دیا جائے۔ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کیونکہ کعبہ تک پہنچنے کی شرط بتا رہی ہے کہ حرم کے مسکینوں کو ہی تقسیم کرنا واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ (رح): عموم جواز کے قائل ہیں حرم کے فقراء ہوں یا بیرون حرم کے سب کو تقسیم کرنا جائز ہے۔ آیت میں مساکین حرم کی کوئی تخصیص نہیں صرف حرم کے اندر ذبح کرنے کی شرط ہے اگر بیرون حرم ذبح کرے گا تو کافی نہ ہوگا اور ذبح کے لیے مکان کی خصوصیت خلاف قیاس ہے (لیکن آیت میں آ گئی ہے لہٰذا ذبح سے آگے بڑھ کر تقسیم تک یہ حکم متجاوز نہ ہوگا جتنا آیت میں آیا ہے اسی حد پر حکم محدود رکھا جائے گا) اور گوشت کی تقسیم بہر حال ایسی عبادت ہے جو موافق عقل ہے اور اس سے فقراء کی پرورش ہوتی ہے جو عقلاً مستحسن ہے)۔

اسلام یا نزول حکم سے پہلے کا جرم معاف ہے:

یعنی نزول حکم سے پہلے یا اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کسی نے یہ حرکت کی تھی تو اس سے اب خدا تعرّض نہیں کرتا۔ حالانکہ اسلام سے پہلے بھی عرب حالت احرام میں شکار کو نہ آیت۔ برا جانتے تھے اس لیے اس پر مواخذہ ہونا بیجا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے موافق جرائم میں داخل تھی اس کا ارتکاب کیوں کیا گیا۔

واللہ عزیز ذوانتقام:

یعنی نہ کوئی مجرم اس کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے اور نہ مقتضائے عدل و حکمت جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں نہ خدا ان سے درگزر کرنے والا ہے۔

احرام کے ساتھ دوبارہ غلطی کرنے پر حضرت ابن عباسؓ کا رویہ

حضرت ابن عباس کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی محرم شکار کر لیتا ہے تو آپ اس سے پوچھتے کیا تو نے اس سے پہلے کبھی حالتِ احرام میں شکار کیا ہے؟ (یا یہ پہلا جرم ہے) اگر وہ کہتا یہ پہلا جرم ہے تو آپ اس کو (قربانی کرنے یا کھانا دینے یا روزے رکھنے کا) حکم دے دیتے اور اگر وہ کہتا پہلے بھی مجھ سے ایسا جرم ہوا ہے تو آپ کوئی حکم نہ دیتے اور ظاہر آیت کے مطابق فرماتے اللہ تجھ سے انتقام لے گا' پھر اس کی پشت اور سینہ پر درد رساں ضرب رسید کرتے۔ کذا قال البغوی۔ (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

لغۃ القرآن: [اُحِلَّ : حلال کیا گیا][لَکُمْ : تمہارے لیے][صَیْدُ : شکار][الْبَحْرِ : سمندر][وَطَعَامُهٗ : اور اس کا کھانا][مَتَاعًا : فائدہ][لَّكُمْ : تمہارے لیے][وَلِلسَّيَّارَةِ : اور مسافروں کیلئے][وَحُرِّمَ : اور حرام کیا گیا][عَلَيْكُمْ : تم پر][صَيْدُ الْبَرِّ : شکار خشکی کا][مَا دُمْتُمْ : جب تک تم ہو][حُرُمًا : احرام میں][وَاتَّقُوا : اور ڈرو][اللّٰهَ : اللہ][الَّذِيْٓ : وہ جو][اِلَيْهِ : اسکی طرف][تُحْشَرُوْنَ : تم اکٹھے کیے جاؤ گے]

ترجمہ: تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے اور مسافروں کے فائدے کی خاطر حلال کر دیا گیا ہے، اور خشکی کا شکار تم پر حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالت احرام میں ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی (بارگاہ کی) طرف تم (سب) جمع کئے جاؤ گے۔

تشریح: اس آیت میں یہ مسئلہ بیان فرمایا گیا کہ محرم کے لیے دریا کا شکار حلال ہے اور خشکی کا حرام۔ دریا کا شکار وہ ہے جس کی پیدائش دریا میں ہو اور خشکی کا وہ جس کی پیدائش خشکی میں ہو۔ (1)

حرام شکاروں کا بیان

یادرہے کہ دو شکار حرام ہیں: محرم کا کیا ہوا اور حرم کا۔ حرم شریف میں رہنے والے شکار کئے جانے والے جانور کو نہ وہ آدمی شکار کر سکتا ہے جو حالت احرام میں ہو اور نہ بغیر احرام والا، وہ اللہ تعالیٰ کی امان میں ہیں۔ یہاں احرام کے شکار کی حرمت کا ذکر ہے جو احرام ختم ہونے پر ختم ہو جاتی ہے مگر حرم کا شکار ہمیشہ ہر شخص کے لیے حرام ہے خواہ وہ شخص احرام میں ہو یا احرام سے فارغ بلکہ حرم کے شکار کو اس کی جگہ سے اٹھانا بھی منع ہے۔ (صراط)

دراصل پہلے زمانے میں بحری سفر بڑا طویل اور مشکل ہوا کرتا تھا جیسا کہ کچھ ملکوں کے لیے آج بھی یہ سفر بڑا طویل اور دشوار ہوتا ہے ان ملکوں کے لوگ کئی کئی ہفتے بحری سفر کرنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زائر اپنے ساتھ ایک حد تک ہی زادراہ لے سکتا ہے۔ کبھی کبھار بحری سفر کے دوران جہاز کا اپنے راستہ سے بھٹکنے یا کسی بھنور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سفر کے ایام غیر معینہ مدت تک بڑھ جاتے ہیں اور پہلے زمانے میں یہ اکثر ہوا کرتا تھا کہ باد مخالف کی وجہ سے بحری جہاز کئی کئی دن تک ٹھہرے رہتے تھے اور بسا اوقات جہاز اپنے راستے سے کئی میل دور ہٹ جایا کرتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر زادراہ کا ختم ہو جانا بحری سفر کا حصہ شمار کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص کرم فرماتے ہوئے بحری سفر میں زائرین کعبہ کے لیے یہ رعایت بخشی کہ اگر وہ عمرہ یا حج کے لیے بحری سفر اختیار کریں تو حالت احرام میں بحری شکار کرنے، اس کے کھانے اور ذخیرہ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ تاہم یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اس سفر کو عبادت سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اس اجازت کا ہر گز معنی نہیں کہ احرام کی حالت میں آدمی عبادت کا ماحول اپنانے کے بجائے شکار کی پکڑ دھکڑ میں مصروف رہے اس لیے اجازت دینے کے ساتھ ہی حکم فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے یہ سفر کرو کیونکہ بالآخر تم اس کے حضور پیش ہونے والے ہو۔ (فہم)

حج و عمرہ پر انسان اس لیے جاتا ہے تاکہ زندگی کے کچھ ایام صرف اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے وقف کر دے، اس لیے ایسی چیزوں سے منع کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد میں رکاوٹ بن سکتی جن میں سے ایک شکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احرام کی حالت میں خشکی کا شکار منع کر دیا کیونکہ اس کے مواقع بہت زیادہ تھے لیکن پانی کے شکار کی اجازت دے دی کیونکہ اس کا موقع بہت کم میسر آتا ہے۔ حرم شریف کی حدود میں تو کوئی دریا یا نہر ہی نہیں کہ ان میں شکار کیا جائے، البتہ وہ لوگ جو سمندر کے راستے سے مکہ حاضری دیتے ہیں انھیں احرام کے بعد محدود وقت کے لیے سمندر میں شکار کا موقع مل سکتا ہے اور بعض دفعہ سمندر میں زادراہ ختم ہو جانے سے شکار ان کی ضرورت بن سکتا ہے، لہٰذا انھیں سمندری شکار کی اجازت ہے تاکہ وہ شکار سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس آیت کے آخر میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچوں کیونکہ ایک دن سب کو اس کے حضور جمع ہونا ہے جہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

نوٹ: خشکی کا شکار صرف احرام کی حالت میں حرام ہے۔ احرام کھولنے کے بعد اس کی اجازت ہے۔ پانی کا شکار ہر حالت میں جائز ہے چاہے احرام میں ہو یا بغیر احرام کے۔ حرم شریف کا شکار ہر حال میں حرام ہے چاہے احرام میں ہو یا بغیر احرام کے کیونکہ حرم میں رہنے والے جانور اللہ تعالیٰ کی امان میں ہیں۔ (امداد)

شکار کے گوشت کا احرام میں کھانا

حارث بن نوفل راوی ہیں کہ دوران حج میں حضرت عثمان بن عفان (رض) کی خدمت میں اس شکار کا گوشت پیش کیا گیا جس کو غیر محرم نے شکار کیا تھا آپ نے اس میں سے کھا لیا مگر حضرت علی نے نہیں کھایا۔ حضرت عثمان نے فرمایا بخدا ہم نے یہ نہ خود شکار کیا نہ حکم دیا نہ اشارہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما۔

حسن راوی ہیں کہ اگر محرم کے لیے شکار نہ کیا گیا ہو بلکہ غیر محرم نے کسی دوسرے غیر محرم کے لیے شکار کیا ہو تو ایسے شکار کے گوشت کو حضرت عمر بن خطاب محرم کے لیے بھی حلال جانتے تھے لیکن حضرت علی مکروہ قرار دیتے تھے (رواہ ابن ابی شیبہ)

مسلم نے نقل کیا کہ معاذ (رض) بن عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی کے باپ (عبدالرحمٰن) نے بیان کیا کہ ہم احرام کی حالت میں حضرت طلحہ (رض) بن عبداللہ کے ساتھ تھے۔ حضرت طلحہ (رض) : کو ایک پرندہ (یعنی شکار کیا ہوا) ہدیہ میں پیش کیا گیا آپ اس وقت سو رہے تھے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے تو اس کو کھالیا اور بعض نے کھانے سے پرہیز رکھا 'طلحہ بیدار ہوئے تو آپ نے کھانے والوں کی موافقت کی اور فرمایا ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی ہم رکابی میں شکار کھایا تھا۔

عمرو بن سلمہ ضمیری نے بہزی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : مکہ جانے کے ارادہ سے احرام بند برآمد ہوئے۔ روحا کے مقام میں پہنچے تو ایک زخمی گورخر پر نظر پڑی (جو ذبح کیا ہوا تھا) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو رہنے دو ممکن ہے اس کو شکار کرنے والا آجائے کچھ دیر کے بعد بہزی آگئے۔ بہزی نے اس کا شکار کیا تھا۔ بہزی نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : آپ کو اختیار ہے جیسا چاہیں اس میں تصرف کریں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رض) : کو حکم دیا (کہ اس کو تقسیم کردو) حسب الحکم حضرت ابوبکر (رض) نے قافلہ والوں کو اس کا گوشت بانٹ دیا۔ رواہ مالک واصحاب السنن۔ ابن خزیمہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

تقریر سابق سے ظاہر ہو گیا کہ آیت میں صید سے مراد ہے شکار کرنا۔

امام مالک (رح) نے مؤطا میں حضرت عبداللہ بن ابی بکر (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے فرمایا میں نے مقام العرج میں حضرت عثمان (رض) بن عفان کو دیکھا گرمی کا زمانہ تھا آپ احرام بند تھے اور چہرہ کو چادر سے ڈھانکے ہوئے تھے کچھ دیر کے بعد شکار کا گوشت پیش کیا گیا آپ نے ساتھیوں سے فرمایا تم لوگ کھاؤ 'عرض کیا گیا کیا آپ نہیں کھائیں گے۔ فرمایا میری حالت تمہاری طرح نہیں ہے میرے لیے شکار کیا گیا ہے (اس لیے میرے لیے حلال نہیں)۔

اگر غیر محرم نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا (محرم اور غیر محرم) سب کے لیے جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ محرم اس کو نہ کھائے چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھا کر جواز کا اظہار فرمادیا اور نہ کھا کر تنبیہ فرمادی کہ نہ کھانا مستحب ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں آتا ہے کہ حضرت جبرائیل نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا احسان (عبادت کی خوبی) کیا ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے رب کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو تو کم سے کم اتنا یقین رکھنا کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

حضرت مفسر کی آخری تفسیر کی بناء اسی حدیث پر ہے۔

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ صید بر تمہارے لیے حلال ہے بشرطیکہ خود تم نے بحالت احرام شکار نہ کیا ہو یا تمہارے ایماء سے یا تمہارے مقصد سے شکار نہ کیا گیا ہو۔

عامر بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے عثمان بن عفان کو جب وہ عرج میں تھے اور محرم تھے اور سرما کا زمانہ تھا دیکھا کہ آپ نے اپنا چہرہ ارغوانی چادر سے چھپالیا تھا۔ پھر شکار کا گوشت لایا گیا تو آپ نے اصحاب سے کہا کہ تم لوگ کھاؤ میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ شکار میری خاطر کیا گیا ہے اور تمہاری خاطر نہیں کیا گیا ہے۔

دریا کا شکار اور دریا کا کھانا

حضرت عمر (رض) بن خطاب نے فرمایا صید البحر وہ ہے جس کو (سمندر سے) شکار کیا جائے اور طعام البحر وہ ہے جس کو سمندر خود باہر پھینک دیتا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) : ' حضرت ابوہریرہ (رض) اور حضرت ابن عمر (رض) : کا قول ہے کہ طعام البحر وہ ہے جس کو پانی مردہ حالت میں کنارہ پر پھینک دیتا ہے۔ سعید بن جبیر بن سعیب مسیب (رض) ' عکرمہ قتادہ نخعی اور مجاہد نے کہا صید البحر وہ ہے جو تازہ پکڑا گیا ہو اور طعام البحر ہے وہ جس کو نمک لگا دیا گیا ہو۔

مسئلہ : اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ : اشارہ دلالت واعانت شکار میں مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔

معارف و مسائل

مسئلہ : صید یعنی شکار، ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقۃً اہلی ہوں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ : البتہ جو دلیل سے مستثنیٰ ہوگئے ہیں اور ان کو پکڑنا، قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، لقولہ تعالیٰ اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ، اور بعضے خشکی کے جانور، جیسے کوا اور چیل اور بھیڑیا اور سانپ اور بچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے، حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الصید میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ : جو حلال شکار غیر احرام اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں معین یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے، اور آیت کے الفاظ لَا تَقۡتُلُوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لَا تَقۡتُلُوا فرمایا ہے لا تاکلوا نہیں فرمایا۔

مسئلہ : شکار حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے، اسی طرح خطاء ونسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخرجہ الروح)

مسئلہ : جیسا پہلی بار میں جزاء واجب ہے اسی طرح دوسری تیسری بار قتل کرنے میں بھی واجب ہے۔ (گلدستہ)

سمندری شکار کی تعریف اور اس میں مذاہب ائمہ :

سمندری شکار سے مراد ہے جس جانور کو پانی میں شکار کیا جائے ' خواہ وہ پانی سمندر میں ہو ' دریا میں ہو ' نہر میں ہو یا تالات میں ہو اور اس سے مقصود وہ جانور ہے جو پانی میں پیدا ہوا ہو ' اور اس کی نشو و نما اور بقا بھی پانی میں ہو اور اس کے طعام سے مراد ' پانی میں کیا ہوا شکار ہے۔

فقہاء احناف کے نزدیک اس سے مراد صرف مچھلی ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں ' مچھلی اور ٹڈی۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٣٢١٨ ' مسند احمد ج ٢ ' رقم الحدیث : ٥٧٢٧)

اس حدیث کی سند کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن یزید ضعیف ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس سے مراد پانی کے تمام جانور ہیں ' ان کا استدلال اس آیت کے ظاہر سے ہے اور حضرت عمر (رض) ' حضرت ابوہریرہ (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ سمندری طعام سے مراد وہ تمام جانور ہیں جن کو سمندر ساحل پر پھینک دے اور حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا سمندری طعام سے مراد وہ چیز ہے جو سمندر سے نکالی جائے اس کو کھالو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور سمندر کی ہر چیز کھائی جائے گی ' خواہ وہ مردار ہو ' سمندر میں ہو یا سمندر کے ساحل پر ہو۔ (جامع البیان ' جز ۷ ' ص ۸۸۔۸۶)
خشکی کے شکار سے مراد وہ جانور ہیں جو خشکی میں پیدا ہوئے ہوں اور ان کی نشو و نما اور بقا بھی خشکی میں ہو اور شکار سے مراد وہ جانوری ہیں جو اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے انسانوں سے غیر مانوس اور متوحش اور متنفر ہوں ' جیسے ہرن اور نیل گائے وغیرہ اور بکری گائے اور اونٹ وغیرہ شکار نہیں ہیں ' کیونکہ وہ انسانوں سے مانوس ہیں ' خشکی کے جانوروں کو قتل کرنے کی ممانعت کے حکم سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانچ فاسق جانوروں کو مستثنی فرمادیا ہے۔ وہ یہ ہیں: بچھو ' چوہا ' کاٹنے والا کتا ' کوا ' اور چیل ان کی تفصیل اور تحقیق ہم اس سے متصل پہلی آیت کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں۔

شکار کا گوشت محرم کے لیے ناجائز ہونے کے متعلق احادیث

اس آیت میں فرمایا ہے اور جب تک تم احرام میں ہو ' تمہارے لیے خشکی کا شکار حرام کردیا ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے اس آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر غیر محرم ' محرم کے لیے کسی جانور کو شکار کرے تو محرم کے لیے اس کو کھانا جائز نہیں ہے ' وہ حسب ذیل احادیث سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں۔
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت صعب بن جثامہ لیثی (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک جنگلی گدھا (شکار کرکے) پیش کیا ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ ان کو واپس کردیا۔ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے چہرے پر افسوس کے آثار دیکھے تو آپ نے فرمایا ہم نے تم کو یہ صرف اس لیے واپس کیا ہے کہ ہم محرم ہیں۔ (صحیح مسلم ' حج ' ۵۰ ' (۱۱۹۳) ۲۷۹۹ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث: ۱۸۲۵ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث: ۸۵۰ ' سنن النسائی ' رقم الحدیث: ۲۸۱۹ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث: ۳۰۹۰)
حضرت عثمان (رض) نے حارث کو طائف کا گورنر مقرر کیا تھا ' اس نے کچھ پرندوں اور جنگلی جانوروں کا شکار کیا اور یہ طعام حضرت عثمان (رض) کی طرف بھیجا ' حضرت عثمان (رض) نے یہ طعام حضرت علی (رض) کے پاس بھیج دیا ' جس وقت ان کا قاصد حضرت علی (رض) کے پاس پہنچا ' تو وہ اپنے اونٹوں کے لیے اپنے ہاتھ سے درختوں سے پتے جھاڑ رہے تھے ' لوگوں نے آپ سے کہا یہ طعام کھائیں۔ آپ نے فرمایا تم لوگ کھالو ' کیونکہ میں محرم ہوں۔ پھر فرمایا قبیلہ اشجع کے جو لوگ یہاں موجود ہیں ' میں ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شخص نے جنگلی گدھے کا گوشت پیش کیا درآنحالیکہ آپ محرم تھے ؟ آپ نے اس گوشت کو کھانے سے انکار کیا ؟ انھوں نے کہا ہاں !

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اے زید بن ارقم! کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شکار کی دستی پیش کی گئی تو آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا میں محرم ہوں۔ انھوں نے ہاں! (سنن ابو داؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۸۵۰۔ ۱۸۴۹ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۶ھ)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان (رض) اور حضرت علی (رض) نے ایک ساتھ حج کیا۔ ایک غیر محرم نے شکار کرکے حضرت عثمان (رض) کے پاس اس کا گوشت بھیجا 'حضرت عثمان (رض) نے اس میں سے کھایا اور حضرت علی (رض) نے نہیں کھایا۔ حضرت عثمان (رض) نے فرمایا بخدا ہم نے شکار کیا ہے 'نہ اس کا حکم دیا ہے 'نہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت علی (رض) نے یہ آیت پڑھی جب تک تم احرام میں ہو تمہارے لیے خشکی کا شکار حرام کردیا گیا ہے۔

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر (رض) جب محرم ہوتے تو شکار کو نہیں کھاتے تھے 'خواہ اس کو غیر محرم نے شکار کیا ہو۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۹۷۔ ۹۴ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانے کے متعلق مذاہب ائمہ

جب محرم خود شکار کرے یا شکار کو ذبح کرے تو محرم پر اس کے حرام ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے 'جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جب تک تم احرام میں ہو 'تمہارے لیے خشکی کا شکار حرام کردیا گیا ہے۔ (المائدہ: ۹۶) اور اگر محرم اس شکار میں اعانت کرے یا اس پر دلالت کرے یا اس کی طرف اشارہ کرے 'تب بھی وہ محرم کے لیے جائز نہیں ہے اور اگر غیر محرم 'محرم کی خاطر شکار کرے تو یہ محل اختلاف ہے۔ امام احمد 'امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک اس صورت میں بھی اس شکار کو کھانا محرم پر حرام ہے اور یہی حضرت عثمان بن عفان (رض) سے منقول ہے 'اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ فرماتے ہیں 'اس صورت میں محرم کے لیے شکار کو کھانا جائز ہے 'کیونکہ حدیث صحیح میں اس کا جواز ہے۔

صحابہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا 'یارسول اللہ! ہم نے احرام باندھ لیا تھا اور ابوقتادہ نے احرام نہیں باندھا تھا 'ہم نے جنگلی گدھے دیکھے۔ حضرت ابوقتادہ (رض) نے ان پر حملہ کیا 'اور ان کی کونچیں کاٹ ڈالیں 'ہم نے اتر کر اس کا گوشت کھایا 'پھر ہمیں خیال آیا کہ ہم محرم تھے اور ہم نے شکار کا گوشت کھایا 'پھر ہم نے باقی گوشت رکھ لیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی نے شکار کا امر کیا تھا یا اس کی طرف کسی قسم کا اشارہ کیا تھا؟ انھوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اس کا باقی ماندہ گوشت بھی کھالو۔ (صحیح البخاری 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۸۲۴ 'صحیح مسلم 'ج ۲۰ (۱۱۹۶) ۲۸۱۰ 'سنن ابو داؤد 'رقم الحدیث: ۱۸۵۲ 'سنن ترمذی 'رقم الحدیث: ۸۴۸ 'سنن النسائی 'رقم الحدیث: ۲۸۲۵ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث: ۳۰۹۳ 'صحیح ابن حبان 'رقم الحدیث: ۳۹۶۶ 'مصنف عبدالرزاق 'رقم الحدیث: ۸۳۳۷ 'سنن کبریٰ للبیہقی 'ج ۵ 'ص ۳۲۲ 'سنن دار قطنی 'ج ۲ 'ص ۲۹۱ 'ملتان 'مسند احمد 'ج ۵ 'ص ۳۰۶ '۳۰۵ '۳۰۱ 'طبع قدیم)

اور حضرت علی (رض) حضرت ابن عمر (رض) حضرت عائشہ 'اور حضرت ابن عباس (رض) کا موقف یہ ہے کہ شکار کا گوشت محرم پر ہر حال میں حرام ہے۔ (المغنی 'ج ۳ 'ص ۱۴۵ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۰۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تین نظریات ہیں:

(۱) حضرت علی (رض) حضرت ابن عمر (رض) ' حضرت عائشہ (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) کا موقف یہ ہے کہ شکار کا گوشت محرم پر ہر حال میں حرام ہے۔

(۲) حضرت عثمان (رض) کا موقف یہ ہے کہ اگر غیر محرم نے محرم کی خاطر شکار کیا ہے تو محرم پر اس شکار کا گوشت حرام ہے ' ورنہ نہیں اور یہی ائمہ ثلاثہ کا موقف ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ اگر محرم نے شکار میں غیر محرم کی اعانت نہیں کی ' نہ اس کی طرف اشارہ کیا ' نہ دلالت کی ' تو پھر محرم کے لیے اس شکار کو کھانا جائز ہے ' خواہ غیر محرم نے محرم کی خاطر شکار کیا ہو۔

محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانے کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے موقف پر دلائل

قوت دلائل کے اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کا نظریہ راجح ہے ' کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ نے حضرت ابوقتادہ (رض) کی حدیث سے استدلال کیا ہے اور وہ صحیح بخاری ' صحیح مسلم اور دیگر کتب صحاح میں ہے اور ائمہ ثلاثہ نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ سنن ابوداؤد ' سنن ترمذی اور سنن نسائی میں ہے ' اور صحاح کی احادیث سنن کی احادیث پر مقدم ہیں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت جابر کی حدیث میں لام تملیک کے لیے ہے ' یعنی شکار کا گوشت تمہاری ملک کردیا جائے تو پھر تمہارے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ' جبکہ تم محرم ہو۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ جب تمہاری اعانت سے تمہارے لیے شکار کیا جائے اور اس صورت میں اس کا کھانا بالاتفاق حرام ہے۔

حضرت صعب بن جثامہ کی حدیث میں ہے انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں جنگلی گدھا پیش کیا تو آپ نے یہ فرما کر رد کردیا کہ میں محرم ہوں۔ یہ حدیث ائمہ ثلاثہ کے بھی خلاف ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کے بھی ' ائمہ ثلاثہ اس حدیث کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ حضرت صعب بن جثامہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خاطر شکار کیا تھا ' اس لیے آپ نے اس شکار کو واپس کردیا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کی طرف سے یہ جواب ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ صحیح مسلم ' الحج ' ۵۰ ' میں ہے کہ حضرت صعب (رض) نے آپ کی خدمت میں جنگلی گدھا پیش کیا اور الحج ' ۵۲ میں ہے ' جنگلی گدھے کا گوشت پیش کیا اور الحج ' ۵۴ میں ہے جنگلی گدھے کی ایک ٹانگ پیش کی اور حدیث مضطرب سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اس لیے یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کے موقف کے خلاف حجت نہیں ہے ' کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کا استدلال اس حدیث سے ہے جو بخاری ' مسلم اور دیگر کتب صحاح میں ہے اور غیر مضطرب ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید کی زیر تفسیر آیت میں ہے جب تک احرام میں ہو تمہارے لیے خشکی کا شکار حرام کردیا گیا ہے ' یہ آیت بھی بظاہر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ اور ائمہ ثلاثہ دونوں کے خلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس پر

محمول ہے کہ خشکی کا شکار تم پر حرام کر دیا گیا ہے جبکہ تم نے حالت احرام میں خود شکار کیا ہو یا شکار کرنے والے غیر محرم کی اعانت کی ہو 'امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃاللہ عنہ کی تائید میں مزید احادیث حسب ذیل ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں بحرین کے پاس سے گزرا تو مجھ سے سوال کیا گیا کہ غیر محرم شکار کرے تو آیا اس کا گوشت محرم کے لیے کھانا جائز ہے یا نہیں ؟ میں نے اس کے جواز کا فتوی دیا 'لیکن میرے دل میں کچھ اضطراب تھا 'میں نے حضرت عمر (رض) سے اس کا ذکر کیا 'حضرت عمر (رض) نے فرمایا اگر تم اس کے خلاف فتوی دیتے تو تاحیات تم فتوی نہ دے سکتے۔ (کتاب الاثار 'رقم الحدیث : ۳۵۹ ' مطبوعہ ادارہ القرآن 'کراچی)

امام ابن جریر کی روایت میں یہ الفاظ ہیں 'اگر تم اس کے خلاف فتوی دیتے تو میں تمہیں درے مارتا۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۵۹ ۳ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

حضرت زبیر بن عوام (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم دھوپ میں سکھایا ہوا شکار کا گوشت لے کر جاتے اور اس کو سفر میں کھاتے تھے 'حالانکہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ احرام میں ہوتے تھے۔ (کتاب الاثار 'رقم الحدیث : ۳۶۰ 'مطبوعہ کراچی)

حضرت طلحہ بن عبید اللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم اس میں بحث کر رہے تھے کہ محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے یا نہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوئے ہوئے تھے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ نے پوچھا 'تم کس چیز میں بحث کر رہے تھے ؟ ہم نے عرض کیا کہ محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے یا نہیں ؟ تو آپ نے ہمیں اس کے کھانے کا حکم دیا۔ امام محمد نے فرمایا ہم اس حدیث پر عمل کرتے ہیں جب غیر محرم شکار کرے تو محرم کے لیے اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے 'خواہ اس کو محرم کی خاطر ذبح کیا گیا ہو 'اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ عنہ کا قول ہے۔ (کتاب الاثار 'رقم الحدیث : ۳۶۱ 'مطبوعہ کراچی) (تبیان)

آیت مبارکہ:

جَعَلَ اللّٰهُ الۡـكَعۡبَةَ الۡبَيۡتَ الۡحَـرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهۡرَ الۡحَـرَامَ وَالۡهَدۡىَ وَالۡقَلَاۤئِدَ‌ ؕ ذٰ لِكَ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۹۷﴾

لغۃ القرآن: [جَعَلَ : اس نے بنایا][اللّٰهُ : اللہ نے][الْكَعْبَةَ : کعبہ][الْبَيْتَ : گھر][الْحَرَامَ : حرمت والا][قِيٰمًا : قیام کیلئے][لِّلنَّاسِ : لوگوں کیلئے][وَالشَّهْرَ : اور مہینے][الْحَرَامَ : حرمت والے][وَالْهَدْيَ : اور قربانی][وَالْقَلَاۗىِٕدَ : اور پٹوں والے جانور

][ذٰلِكَ : وہ][لِتَعْلَمُوْٓا : تاکہ تم جان لو][اَنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][يَعْلَمُ : جانتا ہے][مَا فِي :: جو میں][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَمَا فِي الْاَرْضِ : اور جو میں زمین][وَاَنَّ : اور بیشک][اللّٰهَ : اللہ][بِكُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز][عَلِيْمٌ : جاننے والا]

ترجمہ: اللہ نے عزت (وادب) والے گھر کعبہ کو لوگوں کے (دینی و دنیوی امور میں) قیام (امن) کا باعث بنادیا ہے اور حرمت والے مہینے کو اور کعبہ کی قربانی کو اور گلے میں علامتی پٹے والے جانوروں کو بھی (جو حرم مکہ میں لائے گئے ہوں سب کو اسی نسبت سے عزت واحترام عطا کردیا گیا ہے)، یہ اس لیے کہ تمہیں علم ہو جائے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ خوب جانتا ہے اور اللہ ہر چیز سے بہت واقف ہے۔

تشریح:

مشکل الفاظ کے معنی

کعبہ : یہ چوکور اور بلند بیت ہے جس کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) نے مکہ میں بنایا ‘کعب کے معنی بلند ہونا ہے اور یہ چونکہ بلند بیت ہے ‘اس لیے اس کو کعبہ کہا گیا۔ (تبیان)

کعبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے جو عکرمہ اور مجاہد رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ کعبہ کو کعبہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مربعہ ہے۔ کاہنہ کی جمع کواعب ہے۔ کعبہ کی سطح سمندر سے بہت اونچی ہے۔ اس کا چرچا اس کا ذکر دنیا میں بہت بلند ہے اس لیے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ اور تکعیب تربیع ہے اور لغت میں ہر اس گھر کو کعبہ کہہ سکتے ہیں جو مربع ہو اور کبھی بلندی کے معنی میں بھی تکعب آتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کعبہ کو کعبہ اس کی بلندی کی وجہ میں کہا گیا۔ جیسے کعب اور انسان ٹخنے کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اونچا ہوتا ہے۔ کعبت المراۃ عورت کی چھاتیوں کو کہتے ہیں جبکہ وہ اٹھی ہوئی ہوں۔ ایک اور قول یہ بھی ہے کہ کعبہ نام اس کی یکتائی او بے مثل ہونے کی بناء پر ہوا لیکن کرمانی نے اس کا رد کردیا ہے۔ (حسنات بحوالہ روح المعانی)

پھر کعبہ کو بیت الحرام اس لیے کہا دنیا میں اس کی عظمت ہے اسی لیے اس کی حرمت کے لیے بیت الحرام کہا گیا۔

قیاما للناس : جس چیز کے سبب سے لوگوں کے معاملات قائم اور درست ہوں ‘کعبہ کی زیارت کرکے اور اس کا طواف کرکے لوگوں حج اور عمرہ کی عبادات کو انجام دیتے ہیں ‘جس سے ان کی آخرت درست ہوتی ہے ‘اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو امن کی جگہ بنادیا ہے اور تمام دنیا سے تجارتی سامان کھنچ کر کعبہ کی سرزمین میں چلا آتا ہے اس سے ان کی دنیا درست ہوتی ہے۔ (تبیان)

قیما اللناس۔ اس لیے کہا گیا کہ وہاں امور دین و دنیوی کا قیام ہوتا ہے۔ خائف وہاں پناہ لیتا ہے چنانچہ اس کی حرمت کے لیے ہی ارشاد ہوا من دخلہ کان امنا ضعیفوں کو وہاں امن ملتا ہے تاجر وہاں نفع پاتے ہیں حج و عمرہ کرنے والے وہاں حاضر ہو کر مناسک ادا کرتے ہیں اور والشھر الحرام ۔ سے مراد ماہ ذی الحجہ ہے یہ وہ مہینہ ہے جس کی نویں تاریخ کو حج کرتے ہیں۔ (حسنات)

الشھر الحرام: چار حرمت والے مہینے ہیں۔ ذوالقعدہ ٗذوالحجہ ٗمحرم اور رجب۔ ان مہینوں کے سبب سے بھی ان کے معاملات قائم اور درست رہتے ہیں ٗکیونکہ ان مہینوں میں جنگ اور قتال کرنا جائز نہیں ہے۔
الھدی: جن جانوروں کو قربان کرنے کے لیے حرم میں بھیجا جائے ٗان کو الھدی کہتے ہیں ٗغرباء اور فقراء ان کا گوشت کھاتے ہیں ٗجس سے ان کی مدد ہوتی ہے۔
القلائد: قلادہ پٹے کو کہتے ہیں ٗاس سے مراد قربانی کا وہ جانور ہے جس کے گلے میں ہار یا پٹا ہو۔ اہل عرب کا طریقہ تھا کہ جس جانور کو قربانی کے لیے کعبہ کی طرف بھیجتے ٗاس کے گلہ میں پٹا ڈال دیتے ٗاس کی اہمیت کی وجہ سے اس کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ (تبیان)
والھدی والقلآئد۔ ہدی قربانی کا جانور اور اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا قلاوہ ڈالنا۔ یہ قلائد قلاوہ کی جمع ہے یعنی ہار جو ہدی کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تاکہ پہچان لیا جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اور حرم سے منٰی کی طرف ہدی یعنی قربانی ہار ڈال کر لے جانا زیادہ ثواب ہے۔
ان تمام امور میں تمارے مصالح مضمر ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے جانتا ہے اور اسے ہر شے کا علم ہے اس کا کوئی فعل اور حکم حکمت سے خالی نہیں۔ (حسنات)
مکعب نما ہونے کی وجہ سے اس گھر کو کعبہ کہا گیا۔ حدود حرم میں شکار کی ممانعت کرنے کے بعد اب بتایا جارہا ہے کہ جس طرح کعبہ اور اس کی حدود جانوروں کے لیے امن گاہ ہیں اسی طرح کعبہ انسانوں کے حفظ وبقا کا بھی سبب ہے۔ قیام اصل میں قوام تھا واؤ کا ما قبل مکسور تھا اس لیے اسے یاء سے بدل دیا گیا۔ والمراد بہ ما یقوم بہ امر الناس (المنار) کعبہ مقدسہ تکوینی اور تشریعی دونوں لحاظ سے لوگوں کے حفظ وبقا کا ذریعہ ہے۔ تکوینی لحاظ سے تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی عزت وعظمت لوگوں کے دلوں میں ایسی مستحکم کردی ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ جزیرہ عرب میں کوئی حکومت نہ تھی، کوئی قانون نہ تھا، کوئی دین نہ تھا اور قتل وغارت کی گرم بازاری تھی اس وقت بھی یہاں کوئی کسی کو چھیڑتا نہیں تھا۔ باپ کا قاتل بھی اگر وہاں آجاتا تو اس کی طرف بھی بری نظر سے نہ دیکھا جاتا۔ باوجود اس کے کہ گردونواح کا علاقہ سب صحرا اور ریگستان تھا لیکن تجارتی قافلوں کی یہی منڈی تھی۔ عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ یہاں ہی جمع ہوتے اور کاروبار کرتے۔ یہ گویا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اس دعا کی برکت تھی۔ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات۔ اور تشریعی طور پر اس طرح کہ حج وعمرہ کی عبادات یہاں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ ہر مسلمان دنیا کے کسی گوشہ میں ہو نماز کے وقت کعبہ کی طرف ہی رخ کرکے کھڑا ہوتا ہے۔ حج کے موقع پر دنیا کے کونے کونے سے کلمہ گو کھچے چلے آتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے یہاں خوب لکھا ہے فرماتے ہیں۔ "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم الہٰی میں پہلے ہی مقدر ہوچکا تھا کہ نوع انسانی کے لیے اسی جگہ سے عالم گیر اور ابدی ہدایت کا چشمہ پھوٹے گا اور مصلح اعظم اور سید کائنات محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مولد ومسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہان میں سے اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا"۔
حرمت والے مہینے بھی لوگوں کے حفظ وبقا کا سبب تھے۔ کیونکہ انھیں چار مہینوں میں تجارتی قافلے بےخوف خطر ادھر ادھر جاسکتے تھے۔ لوگ مطمئن ہوکر اپنے مقاصد کے لیے دور دراز کے سفر کرسکتے تھے۔ خوف وہراس کے بادل جو ہر وقت افق پر منڈلاتے رہتے تھے وہ بھی ان مہینوں میں چھٹ جاتے تھے۔ انھیں دنوں میں لوگ حج وعمرہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوسکتے تھے۔ انہی وجوہ کے پیش نظر ان حرمت والے مہینوں کو بھی قیام للناس فرمایا گیا۔ (ضیاء)

مناسبت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے محرم پر شکار کرنے کو حرام فرمایا تھا 'اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ جس طرح حرم وحشی جانوروں اور پرندوں کے لیے باعث امن ہے 'اسی طرح وہ انسانوں کے لیے بھی امن کا باعث ہے اور دنیا اور آخرت کی بھلائیوں اور سعادتوں کے حصول کا سبب ہے۔

کعبہ اور دیگر شعائر حرم کا لوگوں کے لیے مصلح اور مقوم ہونا

عرب میں کوئی امیر اور رئیس نہیں تھا جو ضعیف اور مظلوم کا حق قوی اور ظالم سے دلاسکے اور جو کسی بدکار کو سزا اور نیکوکار کو جزا دے سکے 'تو اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو البیت الحرام ہے 'لوگوں کے معاملات کی درستگی اور اصلاح کا سبب بنادیا 'جیسے کسی ملک کا بادشاہ اپنی رعیت کے معاملات کو درست اور قائم رکھتا ہے اور ان میں عدل وانصاف برقرار رکھتا ہے 'اسی طرح سے کعبہ اور حرمت والے مہینے زمانہ جاہلیت میں ان کی اصلاح اور درستگی کا سبب تھے 'کیونکہ وہ البیت الحرام کی تعظیم کرتے تھے 'اور اس شہر میں جنگ وجدال سے اجتناب کرتے تھے اور سال کے چار حرمت والے مہینوں میں بھی لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرتے تھے 'کیونکہ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ میں لوگ حج کے لیے سفر کرتے تھے اور محرم میں سفر حج سے واپس جاتے تھے 'اور رجب میں عمرہ کے لیے سفر کرتے تھے اور وہ زائرین بیت کو بیت اللہ کی تعظیم کی وجہ سے مامون اور محفوظ رکھتے تھے۔ اسی طرح قربانی کے جو جانور حرم میں لے جائے جاتے تھے جن کو الھدی اور القلائد کہا جاتا تھا 'ان کی بھی بیت اللہ کی وجہ سے تعظیم کرتے تھے 'بیت اللہ کی تعظیم ان کے دل ودماغ میں مستحکم ہوچکی تھی اور ان کے رگ وپے میں سرایت کرچکی تھی۔

اور زمانہ اسلام میں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی تعظیم کو اسلامی عبادات کا اہم حصہ بنادیا 'سوفرمایا:

(آیت) "**واذجعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی وعھدنا الی ابراھیم واسمعیل ان طھرا بیتی لطآئفین والعکفین والرکع السجود**"۔ (البقرہ: ۱۲۵)

ترجمہ: اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرجع اور مقام امن بنادیا اور (ہم نے حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو 'اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ وہ میرے بیت کو طواف کرنے والوں 'اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھیں۔

مناسک حج کی ادائیگی کی وجہ سے اس بے آب وگیاہ 'ویران اور بنجر زمین میں تمام دنیا سے مسلمان ٹوٹ کر آتے ہیں 'اور ہر جگہ سے یہاں تجارتی سامان 'پھل اور غلہ پہنچتا ہے 'اور یوں اس بیت کی وجہ سے ساکنان حرم کے لیے اسباب زلیت فراہم ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "**اولم نمکن لھم حرما امنا یجبی الیہ ثمرات کل شیء رزقا من لدنا ولکن اکثرھم لایعلمون**"۔ (القصص: ۵۷)

ترجمہ: کیا ہم نے انھیں حرم میں نہیں بسایا؟ جو امن والا ہے 'اس کی طرف ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں جو ہماری طرف سے عطا کردہ ہیں 'لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

دور دور سے لوگ حرم میں آ کر عبادت کرتے ہیں اور دنیا کی زیب وزینت سے اجتناب کرتے ہیں ' احرام کی ممنوعات سے باز رہتے ہیں ' قرآن مجید کی حرم میں تلاوت کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ حرم میں نمازیں پڑھتے ہیں اور طواف کرنے کی سعی کرتے ہیں ' حج کے اجتماع کو دیکھ کر محشر کو یاد کرتے ہیں ' ان کے دلوں میں خدا کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف زیادہ ہوتا ہے اور وہ برے کاموں سے باز رہنے اور بقیہ عمر میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کا عہد کرتے ہیں ' حرم میں کی ہوئی نیکیوں کا اللہ تعالیٰ ایک لاکھ گنا اجر عطا فرماتا ہے ' زائرین یہاں آتے ہیں اور واپس جاتے ہوئے اپنا دل یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور ساری عمر یہیں آنے کی پیاس رہتی ہے۔

ان چیزوں کو لوگوں کی حفظ وبقا کا باعث بنا دینا اللہ تعالیٰ کے علم محیط کی دلیل ہے۔ کیونکہ عرب لوٹ مار کے عادی تھے۔ حکومت اور قانون وہاں موجود نہ تھا۔ اگر کعبہ اور حرمت والے مہینے بھی نہ ہوتے تو وہاں کی حالت اور خستہ ہوتی۔ (تبیان)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلی چیز کعبہ جو کہ عزت والا گھر ہے۔ دوسری چیز حرمت والے چار مہینے ہیں یعنی رجب، ذوالقعدۃ، ذوالحجۃ اور محرم۔ (ذوالقعدۃ اور ذوالحجۃ میں لوگ حج کے لیے سفر کرتے۔ محرم میں حج سے واپس جاتے اور جب میں عمرہ کے لیے سفر کرتے)۔ تیسری چیز قربانی کے جانور جن کو حاجی حرم شریف میں ذبح کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور چوتھی چیز وہ جانور جن کو حاجی حرم شریف میں ذبح کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے اور ان کے گلے میں قربانی کی نشانیاں آویزاں کر دیتے تھے۔

ان مذکورہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص عزت اور عظمت عطا فرمائی ہے یعنی ان چیزوں کو لوگوں کی امن وسلامتی، حفظ وبقاء اور طلب معاش کا سبب بنایا، نیز بہت سے دینی اور دنیاوی معاملات بھی ان سے وابستہ کر دیئے۔

عرب کے اکثر لوگ غریب تھے۔ مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور اکثر ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ تجارتی قافلوں کو لوٹ لیتے۔ نہ کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی قانون بلکہ ہر طرف بدامنی اور خوف وہراس کا دور دورہ تھا۔ اگر سارا سال حالات ایسے ہی رہتے تو کمزور قبیلے ظلم کی چکی میں پس کر رہ جاتے اور غریب بے چارے بھوک سے مر جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو زمین وآسمان کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے اس نے اہل عرب پر کرم فرمایا اور ان کے دلوں میں کعبہ، حرمت والے مہینے اور قربانی کے جانوروں کا احترام پیدا کر دیا جس کی بدولت سال کا تیسرا حصہ یعنی پورے چار مہینے وہ لوٹ مار اور قتل وغارت سے باز آ جاتے اور اس طرح پورے ملک میں تجارتی قافلے امن وسکون کے ساتھ سفر کرتے اور غریب لوگ ان چار ماہ میں تجارت کے ذریعہ سال بھر کی معیشت جمع کر لیتے اور حرم شریف میں تو بہت بڑی سالانہ منڈی کا انتظام ہوتا تھا۔ اس طرح اہل عرب کی معاشی کفالت کا سامان پیدا ہو جاتا اور قربانی کے جانور حرم شریف میں پہنچ جاتے اور اس بے آب وگیاہ علاقہ کے غریب لوگوں کی معیشت کو بھی سہارا مل جاتا اور حرم شریف کو تو پورے سال کے لیے ایسی عزت عطا فرمائی کہ باپ کا قاتل بھی اگر وہاں آ جاتا تو اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا جاتا۔ ان دنیاوی مفادات کے علاوہ حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنے کا ذریعہ کعبہ تھا اور قربانی کے جانور حرم شریف تک لے جانے کا ذریعہ حرمت والے مہینے تھے وگرنہ قافلوں کو لوٹ لیا جاتا۔ (امداد)

اور تمہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو شدید ترین عذاب دینے والا اور تابع فرمان لوگوں کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔

"حضرت انس (رض) فرماتے ہیں بیشک رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والے لوگ ہیں۔ " [رواہ مسلم : کتاب الایمان]

قرآن مجید نے سورۃ آل عمران آیت ۹۶ میں بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے جو گھر معرض وجود میں آیا وہ بیت اللہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے مبارک اور ہدایت کا مرکز قرار دیا ہے۔ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ قیامت کے قریب حبشہ کا ایک آدمی جس کی پنڈلیاں عام لوگوں سے لمبی ہوں گی بیت اللہ کو شہید کرے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب تک بیت اللہ ہے اس وقت دنیا قائم رہے گی۔

بیت اللہ کا لوگوں کے لیے باعث قیام ہونے کا یہ مفہوم بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی برکت کی وجہ سے اس کی زیارت کرنے والوں کو حفظ وامان سے نوازا ہے اور بے آب وگیاہ سرزمین میں اللہ تعالیٰ اس کے زائرین اور اس کے گرد وپیش رہنے والوں کو انواع واقسام کے کھانوں، پھلوں اور نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ (فہم)

صحیحین میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے دن یہ فرمایا "یہ شہر حرام ہے 'اس کے درخت نہ کاٹے جائیں گے 'اور یہاں کے سبزے کو بھی خراب نہ کیا جائے گا 'یہاں کے شکار کو نہ بھگایا جائے گا اور یہاں کی گمشدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے گا مگر وہ شخص جو اعلان کرنا چاہے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرم میں محرم کے لیے زندہ چیزوں میں سے صرف کوے 'چیل 'بچھو 'چوہے اور کاٹنے والے کتے کو مستثنیٰ فرمایا۔ حضرت عائشہ (رض) کی حدیث میں ہے "حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانچ چیزوں کے قتل کا حکم دیا۔ یہ مضر چیزیں ہیں اور حالت حلت اور احرام دونوں میں یہ حکم دیا۔ کوا چیل 'بچھو 'چوہا اور کاٹنے والا کتا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر (رض) سے سانپ کا اضافہ آیا ہے۔

حضرت علی (رض) کی روایت کی رو سے یہی حرمت مدینہ کے لیے بھی عائد ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے " عیر " سے لے کر "ثور" مدینہ کو حرم قرار دیا ہے۔ اور صحیحین ہی میں ایک دوسری روایت ہے۔ یہ حضرت عبادہ ابن تمیم سے وارد ہوئی ہے۔ کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا فرمائی اور میں نے مدینہ کو اسی طرح حرم کر دیا ہے جس طرح ابراہیم (علیہ السلام) نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا۔"

اس کے علاوہ مزید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ علاقہ اور یہ مہینے ہی صرف امن کے لیے مخصوص نہیں اور صرف یہ بات نہیں ہے کہ اس امن وامان کا دائرہ صرف انسان اور حیوان تک ہی محدود ہے بلکہ اس امن اور سکون کا دائرہ انسانی ضمیر تک وسیع ہو جاتا ہے اس لیے کہ انسانی ضمیر انسانی نفس کی گہرائیوں کے اندر ایک معرکہ کارزار ہے۔ ضمیر کے اندر جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو اس کے شعلے اور اس کا دھواں زمان ومکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ پھر تمام انسان اور حیوان اس کی زد میں آجاتے ہیں حرمین اس اندرونی معرکہ کارزار میں بھی امن کا سامان پیدا کر دیتے ہیں اور جب ضمیر کے اندر امن وسکون پیدا ہو جاتا ہے تو ایک محرم کسی جاندار کی طرف ہاتھ بڑھانے میں بھی حرج محسوس کر دیتے ہیں اور جب ضمیر کے اندر امن وسکون پیدا ہو جاتا ہے تو ایک محرم کسی جاندار کی طرف ہاتھ بڑھانے میں بھی حرج محسوس کرتا ہے اگرچہ یہ شکار حرم سے باہر ہو۔ یہ عرصہ نفس انسانی کی تربیت کا عرصہ ہے تاکہ وہ صاف وشفاف ہو جائے۔ وہ ہلکا ہو جائے اور بلند ہو کر ملاء اعلیٰ سے واصل ہو جائے اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

یہ انسانیت 'یہ خوفزدہ 'مصیبت زدہ 'پسی ہوئی انسانیت کس قدر محتاج ہے 'اس علاقہ امن کی۔ وہ منطقہ امن جس کو اللہ نے اس دین کے پیروکاروں کے لیے بنایا ہے 'اور جس کا اعلان عام قرآن کریم کے اندر کر دیا گیا۔

(آیت) "ذَٰلِكَ لِتَعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ وَأَنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ (97)

" تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ اس جگہ یہ عجیب اختتامیہ ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ جو شریعت مقرر کرتا ہے اور لوگوں کے لیے یہ جائے امن جو قرار دیتا ہے ' یہ اس لیے بتاتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اللہ ان تمام حالات سے باخبر ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے ' تاکہ انھیں معلوم ہو کہ اللہ انسانوں کے مزاج سے باخبر ہے ' وہ ان کی خفیہ نفسیات سے بھی خبردار ہے۔ وہ ان کی روح کی پکار کو سنتا ہے اور وہ ایسا قانون بناتا ہے جس کے ذریعے ان کے مزاج کے تقاضے ' ان کی ضروریات اور ان کے میلانات پورے ہوتے ہیں۔ جب لوگ یہ محسوس کریں گے کہ قانون سازی میں اللہ نہایت ہی شفیق ورحیم ہے۔ اور جب لوگوں کے دلوں نے اس شریعت اور ان کی فطرت کے درمیان پوری ہم آہنگی کا مزہ چکھا تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ان تمام امور کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

دین اسلام انسانی فطرت اور اس کے میلانات اور خواہشات کے پورے پورے تقاضے ملحوظ رکھنے میں بہت ہی عجیب ہے۔ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اسلامی شریعت کی اسکیم انسانی فطرت کی اسکیم کے عین مطابق ہے۔ شریعت کی تشکیل اور انسان کی فطرت کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب انسان کو اس دین کے بارے میں شرح صدر ہو جاتا ہے تو پھر وہ جس قدر غور کرتا ہے اسے کمال و جمال ہی نظر آتا ہے ' پھر اسے انس و محبت ہی نظر آتی ہے اور اسے وہ سکون ملتا ہے جس کا تصور وہ شخص نہیں کر سکتا جس کو شریعت پر شرح صدر حاصل نہ ہو۔

اب حالت احرام اور حالت غیر احرام میں جائز و ناجائز امور کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب سخت ہے اور دوسری جانب وہ غفور ورحیم بھی ہے۔ (ظلال)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ تمام لوگوں کے لیے قیام کا باعث بنایا ہے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔

۳۔ اللہ نافرمانوں کو سخت سزا دینے والا ہے۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ فرمان برداروں پر بہت رحمت کرنے والا ہے۔

آیت مبارکہ:

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ؕ﴿۹۸﴾

لغۃ القرآن: [اِعْلَمُوْٓا : جان لو][اَنَّ : بیشک][اللّٰهَ : اللہ][شَدِيْدُ : سخت] [الْعِقَابِ : سزا دینے والا][وَاَنَّ : اور یقیناً][اللّٰهَ : اللہ][غَفُوْرٌ : بخشنے والا][رَّحِيْمٌ : رحم والا]

ترجمہ: جان لو کہ اللہ سخت گرفت والا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا (بھی) ہے

تشریح : یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے اور جو توبہ کرکے فرمان بردار بن جائے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کو دیکھ کر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ خلوص نیت سے توبہ کرو تو اللہ تعالیٰ معاف کردے گا۔ اسی طرح اس کی وسیع رحمت کو دیکھ کر نافرمانی کی جرات نہ کرو ورنہ اس کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ الغرض ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت پر امید رکھنا اور دوسری طرف اس کی سزا سے ڈرتے رہنا ایسا حسین توازن ہے جس سے انسان کے ایمان میں نکھار اور اس کے اعمال میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ امام ابو زہرہ لکھتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر مومن کے خوف (خداوندی) اور اس کی امید (رحمت) کا وزن کیا جائے تو دونوں کا وزن برابر ہوگا۔

(زہرۃ التفاسیر)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نرمی کی آیت سختی کی آیت کے ساتھ اور سختی کی آیت نرمی کی آیت کے ساتھ ذکر فرمائی تاکہ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی رغبت اور اس کی سزا کا خوف پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ سے باطل امید نہ کرنے لگے اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالے۔ (امداد بحوالہ تفسیر درمنثور)

اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہی نہیں عادل بھی ہے

جب تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کائنات کی ہر چیز کو جاننے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہر عمل سے بھی مکمل آگاہی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ صفت عدل کا مالک بھی ہے تو پھر تم یہ کیسے سمجھتے ہو کہ وہ اچھوں اور بروں کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔ یعنی قیامت کے دن ایک آدمی ایسا آئے گا 'جس نے زندگی بھر اس کی کبھی نافرمانی نہیں کی ہوگی بلکہ اس کی رضا پر چلتے ہوئے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹا ہوگا اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہوئے نجانے کتنی دفعہ اسے حالات سے لڑنا پڑا ہوگا 'حتیٰ کہ اسی کے دین کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس نے اس کے راستے میں جان بھی دی ہوگی اور دوسرا اس کے ساتھ ایک ایسا آدمی آئے گا 'جس نے کبھی اللہ کے کسی حکم کے سامنے سر نہیں جھکایا ہوگا۔ اولاً تو اس کی کبریائی کو مانا نہیں اور اگر زبان کی حد تک مانا بھی تو اس پر عمل کبھی نہیں کیا۔ پوری زندگی اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل میں گزار دی اور عیش و عشرت میں ڈوب کر اللہ کے پاس جا پہنچا۔ ان دونوں کے بارے میں پروردگار مکمل علم رکھتا ہے تو کیا انسانی عقل یہ سمجھتی ہے کہ ان دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے؟ قرآن کریم نے ایک دفعہ نہیں 'متعدد دفعہ یہ بات فرمائی کہ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اور نیکی کی زندگی گزارنے والوں کے ساتھ قیامت کے دن یکساں سلوک کریں گے؟ فرمایا:

سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ

(کس قدر برا ہے 'وہ فیصلہ جو یہ لوگ کر رہے ہیں)

اس آیت کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ لوگو اس بات کو اچھی طرح سمجھو کہ اللہ کی صفت عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی اعمال کی جزا و سزا کے لیے اس کی دونوں صفتیں بروئے کار آئیں۔ یعنی وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے اور بخشنے والا مہربان بھی ہے۔ اسی بات پر ایک اور جگہ اس طرح ارشاد فرمایا کہ

(میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی بتلا دو کہ میرا عذاب 'عذاب الیم ہے)
رہی یہ بات کہ وہ کن باتوں پر رحم فرمائے گا اور کن باتوں پر عذاب دے گا۔ اس بات کو پروردگار نے ہماری عقلوں پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کا کرم ہے کہ اس نے کتابیں اتاریں 'رسول بھیجے اور سب سے آخر میں آخری رسول تشریف لائے 'جنھوں نے پیغامبری کا حق ادا کر دیا اور جس کے بعد کہا جاسکتا ہے۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

اس رسول کے آجانے اور دین کے پوری طرح پہنچ جانے اور پیغامبری کے حق ادا ہو جانے کے بعد اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں پر انعام فرمائیں گے اور کن باتوں پر سزا دیں گے۔ (روح)

آیت مبارکہ:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿٩٩﴾

لغۃ القرآن: [مَا : نہیں][عَلَي : پر][الرَّسُوْلِ : رسول][اِلَّا : مگر][الْبَلٰغُ : پہنچادینا][وَاللّٰهُ : اور اللہ][يَعْلَمُ : جانتا ہے][مَا : جو][تُبْدُوْنَ : تم ظاہر کرتے ہو][وَمَا : اور جو][تَكْتُمُوْنَ : تم چھپاتے ہو]

ترجمہ: رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر (احکام کاملًا) پہنچا دینے کے سوا (کوئی اور ذمہ داری) نہیں، اور اللہ وہ (سب) کچھ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو

تشریح:

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے شدید العقاب اور غفور رحیم ہونے کا بیان تھا، اب یہاں اس آیت میں جناب رسول کریم آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے رسول برحق ہونے کا ذکر ہے۔

مطلب

مطلب یہ ہے کہ جناب رسول کریم آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم رسول برحق ہیں اور ان کا فرض صرف دین الہی کی تبلیغ ہے جو لوگ ان کے ارشادات پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ اللہ کو معلوم ہیں اور جو آپ کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی اللہ سے چھپ نہیں سکتے۔ (کاشف)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام انسانوں کی ذمہ داری ہے اور جو اس پر عمل نہیں کرتے انھیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن، ان کے قول و فعل اور ان کے نفاق واخلاص سے خوب آگاہ ہے اور اسی کے مطابق وہ انسانوں کو ثواب اور عذاب دے گا، یعنی جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے دین پر عمل کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے فیضیاب ہوں گے اور جو اس کا انکار کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے دوچار ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پوری دیانتداری کے ساتھ پہنچا دیا، اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغام حق کو آنے والی نسلوں تک پہنچائے اور اس میں کمی بیشی نہ کرے اور جو اس میں سے کچھ چھپانے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے ظاہر و باطن سے خوب آگاہ ہے اور ان کی نیتوں کے مطابق انھیں جزا اور سزا دے گا۔ (امداد)

اصبہانی نے ترغیب میں نیز واحدی نے حضرت جابر (رض) کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شراب کی حرمت کا ذکر کیا۔ یہ سن کر ایک اعرابی نے عرض کیا 'میری تو یہی تجارت تھی' اسی سے میں نے مال کمایا ہے اگر اسی مال میں سے میں کچھ اللہ کی اطاعت میں صرف کروں تو کیا مجھے (آخرت میں) کچھ فائدہ ہوگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ صرف پاک (کمائی) قبول فرماتا ہے اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قول کی تائید میں آیت ذیل نازل ہوئی۔ (ا) [ابن ابی حاتم نے یعقوب اسکندرانی کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عمر (رض) بن عبدالعزیز کو کسی گورنر نے تحریر بھیجی کہ لگان کی آمدنی ٹوٹ گئی حضرت عمر (رض) بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا۔ اللہ فرماتا ہے ناپاک اور پاک برابر نہیں خواہ ناپاک کی کثرت تمہارے دل کو لبھا رہی ہو۔ اگر انصاف 'بھلائی اور اصلاح میں تم اس درجہ پر پہنچ سکو جس پر تمہارا سابق ظلم گناہ اور اللہ کی نافرمانی میں پہنچ گیا تھا تو ایسا کرو۔ وَلاَ قُوَّۃَ الاَّ باللّٰہِ۔] (ابن عباس و مظہری)

رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو حق و باطل اور اچھے، برے سے آگاہ کرے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ برائی کے رواج اور اس کی کثرت سے مرعوب ہونے کے بجائے رسول کی اطاعت کریں اسی میں کامیابی ہے۔

اس جاری خطاب کی آیت نمبر ۹۲ میں یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ ہمارے رسول کا منصب لوگوں تک پیغام پہنچانا ہے جبراً منوانا نہیں۔ یہاں پھر فرمایا ہے کہ رسول کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے پیغام ٹھیک ٹھیک لوگوں تک پہنچانا ہے۔ اس کا کام لوگوں کے پیچھے پیچھے رہنا اور ان کی خلوتوں کی نگرانی کرنا نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ جو کچھ تم چھپاتے یا ظاہر کرتے ہو وہ تمہارے ایک ایک لمحہ اور کام کو جانتا ہے۔ رسول کا کام فقط یہ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے برے بھلے اور نیک و بد کی تمیز واضح کر دے، بیشک برائی کتنی غالب اور لوگوں کی نظر میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہو۔ رسول کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ لوگوں کو خوف خدا سے آگاہ کرے تاکہ صاحب دانش اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی دانائی کی علامت اور کامیابی کا راستہ ہے۔ جہاں تک خبیث اور طیب یعنی اچھے اور برے اور نیک اور بد کا تعلق ہے یہ فرق ہر چیز اور کام میں پایا جاتا ہے۔ ہر چیز مفید بھی ہوتی ہے اور اس میں نقصان اور ضرر بھی موجود ہوتا ہے۔ انسانوں میں بھی نیک و بد پائے جاتے ہیں اس طرح کچھ کام دنیا اور

آخرت کے لحاظ سے مفید ہوتے ہیں جبکہ کئی کام آدمی کے لیے دنیا میں نقصان اور آخرت میں خسارے کا باعث ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی کام دنیا کے لحاظ سے بظاہر فائدہ مند ہو لیکن آخرت کے اعتبار سے دائمی نقصان کا باعث ہو حقیقی عقل اور خدا خوفی کا تقاضا ہے کہ آدمی وہی کام کرے جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کے لحاظ سے اس کے لیے بہتر ہو۔ للذا ہر انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا اور معاف کر دینے والا، نہایت مہربان ہے۔ اسی کو کائنات کے عظیم دانشور نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں بیان فرمایا ہے:

(عَنْ أَبِي يَعْلَى شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا ثُمَّ تَمَنَّى عَلَى اللّٰهِ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ]

"حضرت ابو یعلی شداد بن اوس (رض) بیان کرتے ہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عقلمند وہ ہے جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور مرنے کے بعد فائدہ دینے والے اعمال سرانجام دیتا ہے اور نادان وہ ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے نفس کے پیچھے لگایا اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ سے تمنا کرے۔" (فہم)

مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ تمام ظاہری و پوشیدہ چیزوں کا علم رکھنے والا ہے۔

۲۔ اللہ کے فرمان بردار اور نافرمان کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۳۔ برائی کا چلن خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو وہ گناہ ہی رہتا ہے۔

۴۔ تقویٰ اختیار کرنے میں ہی کامیابی ہے۔

آیت مبارکہ:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][لَّا : نہیں][يَسْتَوِي : برابر][الْخَبِيْثُ : ناپاک][وَالطَّيِّبُ : اور پاک][وَلَوْ : اور اگر][اَعْجَبَكَ : آپ کو تعجب میں ڈالے][كَثْرَةُ : كثرت][الْخَبِيْثِ : ناپاک کی][فَاتَّقُوا : پھر تم ڈرو][اللّٰهَ : اللہ سے][يٰٓاُولِي : اے والو][الْاَلْبَابِ : عقل][لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم][تُفْلِحُوْنَ : کامیاب ہوجاؤ]

ترجمہ: فرمادیجئے: پاک اور ناپاک (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے (اے مخاطب!) اگرچہ تمہیں ناپاک (چیزوں) کی کثرت بھلی لگے۔ پس اے عقلمند لوگو! تم (کثرت و قلّت کا فرق دیکھنے کی بجائے) اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ

تشریح:

دنیا میں ناپاک چیزیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان کی کثرت سے مرعوب ہو کر ان کو اچھا تصور کرنے لگے یا ان کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر ان کا گرویدہ ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناپاک چیزیں اچھی ہو گئی ہیں۔ بلکہ جس طرح خیر و شر، روشنی و تاریکی، عالم و جاہل اور دوزخ و جنتی برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح ناپاک چیزیں بھی پاک چیزوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔
الغرض کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے میں کسی انسان کی ذاتی پسند کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی کسی چیز کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اچھی ہے۔ دراصل جس چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرے وہی پاک بھی ہے اور اچھی بھی، چاہے وہ بہت کم ہو اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرے وہ ناپاک بھی ہے اور بری بھی چاہے وہ بہت زیادہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی خاصیت اور انسانی ضرورت دونوں سے بخوبی آگاہ ہے اور انسان کے لیے وہی چیزیں پسند کرتا ہے جو اس کے لیے مفید ہیں۔ لہٰذا اہل عقل کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور ناپاک سے دامن بچا کر پاک لوگوں اور پاک چیزوں سے وابستہ رہنا چاہیے تاکہ فلاح دارین کے مستحق قرار پائیں۔ (امداد)
قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ: تم فرمادو کہ گندا اور پاکیزہ برابر نہیں ہیں۔} اس آیت میں فرمایا گیا کہ حلال و حرام، نیک و بد، مسلم و کافر اور کھرا کھوٹا ایک درجہ میں نہیں ہو سکتے بلکہ حرام کی جگہ حلال، بد کی جگہ نیک، کافر کی جگہ مسلمان اور کھوٹے کی جگہ کھرا ہی مقبول ہے۔
{**وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ**: اگرچہ گندے کی کثرت تمہیں تعجب میں ڈالے۔} اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا داروں کو مال و دولت کی کثرت اور دنیا کی زیب و زینت بھاتی ہے حالانکہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ باقی رہنے والی ہیں کیونکہ دنیا کی زینت و آرائش اور اس کی نعمتیں ختم ہو جائیں گی جبکہ وہ نعمتیں ہمیشہ باقی رہیں گی جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ (1)
دنیا کی مذمت:
اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے مال و دولت کی چاہت، اس کی نعمتوں اور آسائشوں کی خواہشات اور اس کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی تمنا میں لگے رہنا اور اپنی آخرت کی تیاری سے غافل رہنا انتہائی مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:
"زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَاۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ(۱۴)" (2)
ترجمہ کنزالعرفان: لوگوں کے لیے ان کی خواہشات کی محبت کو آراستہ کر دیا گیا یعنی عورتوں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیروں اور نشان لگائے گئے گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتیوں کو (ان کے لیے آراستہ کر دیا گیا۔) یہ سب دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے اور صرف اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے:
"وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَاۚ وَ مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَاؕ وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ(۱۴۵)" (1)

ترجمہ کنزالعرفان : اور جو شخص دنیا کا انعام چاہتا ہے ہم اسے دنیا کا کچھ انعام دیدیں گے اور جو آخرت کا انعام چاہتا ہے ہم اسے آخرت کا انعام عطا فرمائیں گے اور عنقریب ہم شکر ادا کرنے والوں کو صلہ عطا کریں گے۔

حضرت زید بن ثابت (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو شخص ہمیشہ دنیا کی فکر میں مبتلا رہے گا (اور دین کی پروانہ کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام پریشان کردے گا اور اس کی مفلسی ہمیشہ اس کے سامنے رہے گی اور اسے دنیا اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور جس کی نیت آخرت کی جانب ہو گی تو اللہ تعالیٰ اس کی دل جمعی کے لیے اس کے تمام کام درست فرما دے گا اور اس کے دل میں دنیا کی بے پروائی ڈال دے گا اور دنیا اس کے پاس خود بخود آئے گی۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "دنیا اس کا گھر ہے جس کا (آخرت میں) کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا دوسرا کوئی مال نہیں اور دنیا کے لیے وہ آدمی جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس نے اپنی دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی آخرت سے محبت کی اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا، پس تم فنا ہونے والی (دنیا) پر باقی رہنے والی (آخرت) کو ترجیح دو۔ (4)

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی دنیوی بہتری کے ساتھ ساتھ اپنی اخروی تیاری کی طرف بھی توجہ کرنے اور اس کے لیے بھرپور کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (صراط)

اللہ کے نزدیک نیکوکاروں اور بدکاروں کا برابر نہ ہونا

پاک اور ناپاک کو برابر کرنا اور صالح اور فاسق و فاجر کو برابر رکھنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے ' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(آیت) "ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار "۔ (ص : ۲۸)

ترجمہ : کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو زمین میں فساد کرنے والوں کی مثل کردیں گے یا ہم متقین کو بدکاروں کی مثل کردیں گے۔

(آیت) "ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصلحت سوآء محیاھم ومماتھم سآء ما یحکمون "۔ (الجاثیہ : ۲۱)

ترجمہ : کیا جن لوگوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے ان کا یہ گمان ہے کہ ہم انھیں ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی مثل کردیں گے کہ ان کی زندگی اور موت برابر ہو جائے ؟ وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں۔

(آیت) "افنجعل المسلمین کالمجرمین، مالکم کیف تحکمون "۔ (القلم : ۳۶۔ ۳۵)

کیا ہم فرمان برداروں کو مجرموں کی مثل کردیں گے ؟ تمہیں کیا ہو گیا تم کیسا فیصلہ کر رہے ہو ؟

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اے رسول ! آپ انھیں بتا دیجئے کہ کھرا اور کھوٹا ' نفع بخش اور ضرر رساں ' نیک اور بد ' حلال اور حرام ' عادل اور ظالم کبھی برابر نہیں ہو سکتے ' خواہ دیکھنے والوں کو دنیا میں بدکردار اور بے ایمان لوگ زیادہ عیش و عشرت اور زیادہ عزت و جاہ میں کیوں نہ

دکھائی دیتے ہوں جیسے مسلمانوں کی بہ نسبت کفار زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ قوی اور مستحکم ہیں ' حتی کہ امریکی جس ملک پر چاہے فضائی پابندی لگوا دیتا ہے ' جیسے کئی سالوں سے لیبیا پر پابندی لگوائی ہوئی تھی ' اور جس ملک پر چاہے تجارتی اور اسلحہ سازی کی پابندی لگوادے ' جیسے کئی سالوں سے عراق پر یہ پابندی لگوائی ہوئی ہے ' اسی طرح مسلمانوں میں بھی زیادہ عزت دار ' زیادہ خوشحال اور زیادہ طاقتور وہ لوگ ہیں جو بدعنوان سیاست دان اور بددیانت سرمایہ دار ہیں ' جو اسمگلنگ اور چور بازاری کرتے ہیں ' سودی کاروبار کرتے ہیں ' ٹیکس ادا نہیں کرتے ' قومی کاروبار معاہدوں میں رشوت اور ناجائز کمیشن لیتے ہیں اور بینکوں سے قرضے لے کر کھا جاتے ہیں ' یا معاف کرالیتے ہیں ' معاشرہ میں یہی لوگ عزت دار سمجھے جاتے ہیں اور سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا موچی جو اپنی محنت سے رزق حلال کماتا ہے ' اخبار فروش ' ملوں میں کام کرنے والے محنت کش اور راج اور مستری کا کام کرنے والے مزدور جو اپنے خون اور پسینہ سے حلال کمائی کھاتے ہیں ' ان کو معاشرہ میں ذلیل اور پسماندہ خیال کیا جاتا ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال کھانے والے اور حرام کھانے والے ' پاک اور ناپاک ' طیب اور خبیث ہرگز برابر نہیں ہیں۔
سوائے صاحبان عقل ان خبیث لوگوں کی ظاہری آن بان کو نہ دیکھو ' شیطان کے دام میں نہ آؤ ' اور مال حرام کی زیب وزینت سے مسحور مت ہو ' کیونکہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اللہ سے ڈرے اور فانی کو باقی پر ' عارضی کو دائمی پر ' باطل کو حق پر ' فساد کو صلاح پر اور حرام کو حلال پر ترجیح نہ دے اور دنیا کے بدلہ میں آخرت کا سودا نہ کرے ' کہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ (تبیان)
حضرت جابر بن عبداللہ (رض) فرمایت ہیں کہ ایک نو مسلم بارگاہ نبوت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حالت کفر میں شراب کی تجارت کرتا تھا مجھے اس سے بہت نفع حاصل ہوا اب میں بہت مالدار ہوں اور وہ مال میرے پاس موجود ہے اگر میں وہ مال کار خیر میں خرچ کروں تو کیا مجھے ثواب ملے گا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اگر وہ مال تم حج و جہاد جیسی اعلیٰ عبادت میں بھی خرچ کرو تب بھی وہ تم کو مچھر کے پر کے برابر بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ تعالیٰ طیب وہ طیب ہی قبول کرے گا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (حسنات)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اپنے گورنروں کو جواب

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لیے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہو گیا اور آمدنی بہت محدود ہو گئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی، لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم وجور کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل وانصاف قائم کرکے اپنے خزانہ کو کم کرلو اور کوئی پروانہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم مقدار سے پورے ہوں گے۔

حلال کے چھوارے کی خیرات

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے چھوارے کا ایک ٹکڑا (پاک کمائی کا) خیرات کیا اور اللہ پاک (مال) کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو لیتا ہے اور اس کو بڑھاتا چلا جاتا ہے جیسے تم لوگ اپنے بکری کے بچہ (پر ہاتھ پھیر کر اس) کو بڑھاتے ہو' یہاں تک کہ وہ چھوارے کا ٹکڑا پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ متفق علیہ اور مخلص نیکوکار (خواہ تھوڑے ہوں) زمین بھر بدکاروں سے اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔

ایک نیک آدمی کی اہمیت

حضرت سہل بن سعد راوی ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی طرف سے گزرا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اس وقت ایک آدمی اور بیٹھا ہوا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا اس (گزرنے والے) آدمی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس شخص نے جواب دیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ شخص شریف لوگوں میں سے ہے اس قابل ہے کہ اگر کہیں اپنے نکاح کا پیام بھیجے تو اس کا پیام قبول کرلیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کلام سن کر خاموش رہے اتنے میں ایک اور آدمی ادھر سے گزرا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ صحابی (رض) نے عرض کیا حضور ! یہ تو ایک غریب مسلمان ہے بس اس قابل ہے کہ اگر کہیں نکاح کی درخواست بھیجے تو قبول نہ کی جائے اور سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی نہ جائے اور اگر کچھ کہے تو اس کی بات سنی نہ جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ شخص اس جیسے زمین بھر لوگوں سے بہتر ہے۔ متفق علیہ۔۔ (گلدستہ)

المختصر۔۔ گندگی کی کمیت و کیفیت کچھ بھی ہو، وہ گندگی ہی ہے۔۔ یوں۔۔ پاکیزگی کی مقدار اور اس کی شکل و ہیئت کیسی بھی ہو وہ پاکیزگی ہی ہے۔ طیب و خبیث کے پہچاننے کی آسمان شکل یہ ہے۔

(۱) ۔۔ شریعت جسے مامور فرمائے وہ طیب، اور جس کو حرام ارد ے وہ خبیث۔

(۲) ۔۔ ہر مومن طیب۔۔ ہر کافر خبیث۔

(۳) ۔۔ ہر متقی طیب۔۔ ہر فاسق خبیث۔

(۴) ۔۔ ہر جائز رزق حلال طیب۔۔ ہر ناجائز رزق حرام خبیث۔

(۵) ۔۔ جملہ صفات حمیدہ اور اوصاف جمیلہ طیب، اس کے مقابلے میں جملہ اعمال رذیلہ اور افعال قبیحہ خبیث، وغیرہ غیرہ۔۔ المختصر۔۔ اچھائی اور برائی معتبر ہے، کمی اور زیادتی نہیں۔

(تو) حرام چیزوں کو حلال کر لینے میں (اللہ تعالیٰ) (سے ڈرواے عقل مندو) ! کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں خبیث وطیب سمجھ لینے کی عقل عطا فرمائی ہے، تو اس عقل سے کام لو۔ نہ خود خبیث بنو اور نہ ہی کسی خبیث کو اپنے قریب آنے دو، تم خود بھی طیب بنے رہو اور اپنے اعمال واقوال واحوال کو بھی طیب بناکے رکھو تا (کہ) دنیا میں تکلیف ہی سہی، آخرت کی (فلاح تو پاؤ) اور وہاں کی رسوائی سے اپنے کو بچالو۔ (اشرفی)

آیت مبارکہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

لغۃ القرآن: [يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][لَا تَسْـَٔلُوْا : نہ تم سوال کرو][عَنْ : سے][اَشْيَآءَ : چیزیں][اِنْ : اگر][تُبْدَ لَكُمْ : ظاہر کردی جائیں تمہارے لیے][تَسُؤْكُمْ : تم کو بری لگیں][وَاِنْ : اور اگر][تَسْـَٔلُوْا : تم سوال کرو][عَنْهَا : اس سے][حِيْنَ : جب][يُنَزَّلُ : اتاراجا رہاہو][الْقُرْاٰنُ : قرآن][تُبْدَ لَكُمْ : ظاہر کردی جائیں گی تمہارے لیے][عَفَا : درگزر کیا][اللّٰهُ : اللہ نے][عَنْهَا : ان سے][وَاللّٰهُ : اور اللہ][غَفُوْرٌ : بخشنے والا][حَلِيْمٌ : بردبار ہے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم ایسی چیزوں کی نسبت سوال مت کیا کرو (جن پر قرآن خاموش ہو) کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کردی جائیں تو تمہیں مشقت میں ڈال دیں (اور تمہیں بری لگیں)، اور اگر تم ان کے بارے میں اس وقت سوال کروگے جبکہ قرآن نازل کیا جارہا ہے تو وہ تم پر (نزول حکم کے ذریعے ظاہر (یعنی متعیّن) کردی جائیں گی (جس سے تمہاری صواب دید ختم ہو جائے گی اور تم ایک ہی حکم کے پابند ہو جاؤگے)۔ اللہ نے ان (باتوں اور سوالوں) سے (اب تک) درگزر فرمایا ہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے

تشریح:

جب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی ذمہ داری کماحقہ نبھاتے ہوئے اچھائی اور برائی میں فرق واضح کر رہے ہیں تو تمہیں بے وجہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ادب کے منافی ہونے کے ساتھ تمہارے لیے مشکل کا باعث ہوگا۔

نزول قرآن کے وقت سوال کرنے سے اس لیے منع کیا گیا تھا کہ جب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وحی من وعن لوگوں تک پہنچا رہے ہیں جس میں حلال و حرام، خبیث اور طیّب، جائز اور ناجائز کے درمیان پوری طرح فرق کیا جارہا ہے تو پھر خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنا جائز نہیں۔ اس میں ایک طرف گستاخی کا پہلو نکلتا ہے اور دوسری طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کی طرح اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرنا ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اس لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب میں کوئی مسئلہ بیان کروں تو اسے سنو اور اس پر حتی المقدور عمل کرو۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کوئی بات کرتے ہوئے بھولتا نہیں۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ خَطَبَنَا وَقَالَ مَرَّةً خَطَبَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ فَرَضَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَاءِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ)

[رواہ احمد]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا اے لوگو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو تم حج کرو۔ ایک شخص نے کہا اے رسول مکرم! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموش ہوگئے یہاں تک کہ اس شخص نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا۔ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر حج واجب ہوجاتا اگرچہ تم میں سے اس کی کوئی طاقت نہ رکھتا۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جن معاملات کے متعلق میں نے تم کو چھوڑ دیا ہے تم بھی اس کے بارے میں مجھے چھوڑ دو بلاشبہ تم سے پہلے لوگ کثرت سوال اور انبیاء کے بارے میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ جب میں تم کو کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس کو پورا کرو اور جب کسی چیز سے روکوں تو اس کو چھوڑ دو۔“

بے مقصد سوال کرنے والا مجرم ہے

(عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ (رض) عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ، فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ) [رواہ البخاری: باب مَا يُكْرَهُ مِنْ كَثْرَةِ السُّؤَالِ وَتَكَلُّفِ مَا لاَ يَعْنِيهِ
]

”سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے جس کو لوگوں پر حرام قرار نہیں دیا گیا تھا لیکن اس کے سوال کی وجہ سے اس چیز کو حرام قرار دے دیا گیا۔“ (روح)

بعض لوگ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عجیب وغریب اور غیر ضروری سوالات پوچھتے جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طبیعت پر گراں گزرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات سے منع فرمایا، مثال کے طور پر:

1۔ کچھ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ازراہ مذاق سول کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ میرا باپ کون ہے؟ کوئی پوچھتا: میری واٹنی گم ہو گئی ہے وہ کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (بخاری: تفسیر القرآن: سورۃ المائدہ) صحابہ کرام (رض) کا بارگاہ نبوی کا ادب واحترام ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسے سوالات کرتے ہوں گے۔ غیر شعوری طور ضرا اور لاعلمی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو تو الگ بات ہے، البتہ اس وقت منافقین بھی بظاہر مسلمان ہی شمار ہوتے تھے اس لیے میرے خیال میں ایسی ناشائستہ حرکات کے اصل محرک منافقین ہی ہوں گے۔

2۔ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بکثرت سوال کرتے اور بار بار اصرار کرتے، تو ایک دن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منبر پر تشریف فرما ہو کر فرمایا: آج تم جس چیز کے متعلق مجھ سے سوال کروگے میں تمہیں اس چیز کے بارے میں کھول کر بیان کروں گا۔ (پوچھو کیا پوچھتے ہو؟) حضرت انس (رض) کہتے ہیں: یہ سن کر میں نے دائیں بائیں دیکھا ہر شخص اپنے کپڑوں میں سر ڈالے ہوئے رو رہا تھا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن حذفہ (رض) جن کے نسب کے متعلق لوگ شبہ کرتے تھے اٹھے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ (آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ سوال میرے علم سے بالاتر ہے بلکہ اپنے خداداد وسیع علم کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا: تیر باپ حذفہ ہے۔ (مسلم: 6123: کتاب الفضائل: باب 37)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوالات کیے ' حتی کہ بہت زیادہ سوال کیے تو ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا: تم مجھ سے جس چیز کے متعلق سوال کروگے میں تمہیں اس چیز کے متعلق بیان کروں گا ' میں دائیں اور بائیں دیکھ رہا تھا ' اس وقت ہر شخص اپنے کپڑوں میں سر ڈالے ہوئے رو رہا تھا ' ایک شخص کا جب کسی سے جھگڑا ہوتا تھا تو لوگ اس کو اس کے باپ کے غیر کی طرف منسوب کرتے تھے ' وہ کہنے لگا اے اللہ کے نبی میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تیرا باحذافہ ہے ' پھر حضرت عمر (رض) نے کہا ہم اللہ کو رب مان کر راضی ہیں ' اور اسلام کو دین مان کر اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رسول مان کر ' ہم برے فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے آج کی طرح خیر وشر کو نہیں دیکھا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی تصویر کو پیش کیا گیا ' حتی کہ میں نے ان کو اس دیوار کے پاس دیکھا۔ قتادہ اس حدیث کا اس آیت کو پڑھتے وقت ذکر کرتے تھے: "اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔۔ " (صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث: ' ۷۰۸۹ ' صحیح مسلم ' فضائل ۱۳۷ ' (۲۳۵۹) ۶۰۰۸ ' مسند احمد ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث: ' ۱۲۷۵۶ ' طبع دارالحدیث ' قاہرہ ' مسند احمد ' ج ۴ ' رقم الحدیث: ۱۳۶۶۷۔ ۱۲۸۲۰ ' طبع دارالفکر ' بیروت ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۱۷۷ ' طبع قدیم) (تبیان)

3۔ حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج کرو، تو ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال (حج فرض ہے)؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموش رہے۔ اس

نے دوبارہ اور سہ بارہ اپنا سوال دہرایا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہر سال حج کرنا تمہارے لیے ممکن نہ ہوتا۔ (مسلم: 3257: کتاب الحج: باب 73)

نبی اس مقدس انسان کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا سے غیب اور مستقبل کی خبریں دیتا ہے۔ (المنجد) لہٰذا اس کی بارگاہ میں ایسی چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کا اظہار تمہارے لیے مشکلات پیدا کردے اور پھر پچھتانے لگو کہ کاش یہ سوال نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن حذافہ (رض) نے پوچھا تھا کہ ان کے باپ کون ہے؟ خدانخواستہ اگر ان کے باپ حذافہ نہ ہوتے کوئی اور ہوتے تو وہ خود بھی رسوا ہو جاتے اور ان کی ماں کی ناموس بھی داغدار ہو جاتی۔ اسی طرح جو شخص نے یہ سوال کیا تھا: کیا ہر سال میں حج کرنا فرض ہے؟ اگر آپ ہاں فرما دیتے تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور مسلمان اس کے سوال کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو جاتے۔ اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں ان کو ضائع نہ کرو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے ان میں ملوث نہ ہو اور بعض چیزوں کے متعلق دانستہ سکوت فرمایا ہے ان کے متعلق بحث نہ کرو۔ (سنن کبریٰ للبیہقی: جلد 10: ص 12)

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال بالکل نہ کیا جائے بلکہ کسی چیز کا حکم معلوم کرنے کے لیے، کسی

حکم کی وضاحت کے لیے اور کسی اشتباہ کو دور کرنے کے لیے سوالات کرنے جائز ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے سوال کرو۔ (قرآن: 43:16) اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جہالت (ایک بیماری ہے اور اس) کی شفا سوال کرنا ہے۔ (سنن ابوداؤد: 336: کتاب الطھارۃ: باب 125) اور اس آیت کے آخری حصہ میں بھی اس طرف اشارہ ہے: "اور اگر تم ایسے وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جارہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔" یعنی نزول قرآن کے وقت جو حکم مجمل یا سمجھ سے بالاتر ہو اس کے متعلق سوال کرو تاکہ وضاحت کر دی جائے۔

اس حکم کے نزول سے پہلے جو بے مقصد سوالات تم پوچھا کرتے تھے اور ان سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو تکلیف پہنچی اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس کوتاہی کو معاف کر دیا ہے لیکن آئندہ ایسے فضول سوالات نہ کرو جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طبیعت پر گراں گزریں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہے مسلمان کو تو کسی عام آدمی سے بھی ایسی فضول اور بے مقصد گفتگو نہیں کرنی چاہیے جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسلمان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ (امداد)

(ترمذی: 2317: ابواب الزھد: باب 11)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت پر شفقت

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت پر نہایت شفیق ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر ایک مرتبہ ہاں فرمادیتے تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا لیکن تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے امت پر آسانی فرمائی اور ہاں نہیں فرمایا۔
(4)۔۔حلت و حرمت کا اہم اصول: اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جس امر کی شریعت میں ممانعت نہ آئی ہو وہ مباح و جائز ہے۔ حضرت سلمان (رض) سے مروی حدیث میں ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "حلال وہ ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا اور حرام وہ ہے جس کو اس نے اپنی کتاب میں حرام فرمایا اور جس سے سکوت کیا تو وہ معاف ہے۔ (صراط)

آپ ﷺ سے سوال کرنے کی ممانعت کی وجوہات

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جن چیزوں کے متعلق سوال کیے جاتے تھے ان میں سے بعض مخفی ہوتی تھیں ' جن کے ظاہر ہونے سے کسی کا پردہ فاش ہو سکتا تھا اور اس کی رسوائی کا خطرہ تھا۔ مثلا حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی نے پوچھا تھا: کہ میرے باپ کون ہیں؟ فرض کیجئے کہ ان کے باپ حذافہ نہ ہوتے ' کوئی اور ہوتے تو لوگوں میں رسوا ہو جاتے اور ان کی ماں کی ناموس پر دھبہ لگ جاتا ' اسی طرح جس شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ہر سال میں حج کرنا فرض ہے ' اگر آپ ہاں فرمادیتے تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور مسلمان محض اس وجہ سے مشکل میں پڑ جاتے۔
سلمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے گھی ' پنیر اور جنگلی گدھے کے متعلق سوال کیا گیا ' آپ ﷺ نے فرمایا حلال وہ ہے جو اللہ کی کتاب میں حلال ہے اور حرام وہ ہے ' جو اللہ کی کتاب میں حرام ہے اور جس سے اللہ نے سکوت کیا ' وہ معاف ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث: ۱۷۳۲ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث: ۳۳۶۷ ')
حضرت ابوثعلبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں ' ان کو ضائع مت کرو اور کچھ حدود مقرر کی ہیں ' ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے ' ان میں ملوث نہ ہو اور کچھ اشیاء سے سکوت فرمایا ' ان میں تمہارے لیے رخصت ہے ' اللہ انھیں بھولا نہیں ہے ' تم ان سے بحث نہ کرو۔ (سنن کبری للبیہقی ' ج ۱۰ ' ص ۱۲ ' المستدرک ' ج ۲ ص ۱۲۲)
حضرت سعد بن وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو مسلمانوں پر حرام نہیں تھی اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے وہ ان پر حرام کر دی گئی۔ (صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث: ۲۸۹ ' صحیح مسلم ' فضائل ' ۱۳۲ ' (۲۳۸۸) ۶۰۰۱ ' سنن ابوداؤد ' ج ۳ ' رقم الحدیث: ۴۶۱۰ ')
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے تم کو جن چیزوں سے منع کیا ہے ' ان میں سے اجتناب کرو اور جن کا حکم دیا ہے ' ان کو بجالاؤ جتنی تمہاری استطاعت ہے ' کیونکہ تم سے پہلے لوگ محض زیادہ سوالات کرنے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ (صحیح مسلم ' فضائل: ۱۳۰ (۱۳۳۷) ۵۹۹۸)

آپ ﷺ سے سوال کرنے کی ممانعت اور اجازت کے محامل

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زیر تفسیر آیت اور احادیث مذکورۃ الصدر میں سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے ' حالانکہ قرآن مجید کی ایک اور آیت اور ایک حدیث میں سوال کرنے کا حکم فرمایا ہے ' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

(آیت) "فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون "۔ (الانبیاء : ۷)

ترجمہ : اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے سوال کرو۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں گئے ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگ گیا ' جس سے اس کا سر پھٹ گیا ' پھر اس کو احتلام ہوگیا ' اس نے اپنے اصحاب سے پوچھا کیا میرے لیے تیمّم کرنے کی رخصت ہے ؟ انھوں نے کہا نہیں ' تم پانی کے استعمال پر قادر ہو ' تمہارے لیے تیمّم کی رخصت نہیں۔ سو اس نے غسل کیا اور وہ فوت ہوگیا ' جب ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے تو ہم نے آپ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی ' آپ ﷺ نے فرمایا انھوں نے اس کو مار ڈالا ' اللہ ان کو ہلاک کردے ' جب ان کو مسئلہ کا علم نہیں تھا تو انھوں نے سوال کیوں نہیں کیا ؟ کیونکہ جہالت کی شفا سوال کرنا ہے ' اس کے لیے تیمّم کرنا کافی تھا ' یا وہ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کرتا اور باقی جسم پر پانی بہاتا۔ (سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۳۳۶ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۵۷۲ ' مسند احمد ج ۱ ' ص ۳۰۷ ' طبع قدیم)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتحان لینے کے لیے یا آپ ﷺ سے استہزاء کے طور پر سوال کرنے سے ان کو منع کیا گیا تھا ' یا جس عبادت کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم نہیں دیا تھا ' نہ اس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا ' اس کے متعلق سوال کرنے سے مسلمانوں کو منع فرمایا تھا ' یا جس چیز سے کسی کی پردہ دری ہوتی ہو اس کے متعلق سوال کرنے سے منع فرمایا تھا ' لیکن جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اس کا وجوب ثابت ہوچکا ہو ' اس کی وضاحت کے متعلق سوال کرنا جائز ہے ' جیسا کہ اس آیت کے آخری حصہ میں فرمایا : اور اگر تم ایسے وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جارہا ہوگا تو وہ تم پر ظاہر کردی جائے گی۔ (المائدہ ۱۰۱)

اثناء وحی میں جو حکم مجمل ہو اس کی وضاحت کے لیے سوال کرنا ' جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کو پوچھنا ' کسی پیش آمدہ حاجت کے متعلق سوال کرنا ' یہ تمام سوالات جائز ہیں اور قرآن مجید اور احادیث میں ان کی بہت نظائر ہیں۔

آپ ﷺ سے کیے ہوئے سوالات کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی عدت بیان فرمائی ' اور جس کا خاوند فوت ہوگیا ہو اس کی عدت بیان فرمائی اور حاملہ کی عدت بیان فرمائی اور اس عورت کی عدت بیان نہیں فرمائی جس کو حیض آتا ہو ' نہ حمل ٹھہرتا ہو ' یعنی وہ بہت بوڑھی ہو ' تو صحابہ نے اس کے متعلق سوال کیا ' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(آیت) "والی یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر "۔ (لطلاق : ۴)

ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تمہیں اشتباہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہو گی؟) تو ان کی عدت تین مہینے ہے

(آیت) "یسئلونك ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمی والمسکین وابن السبیل"۔ (البقرہ: ۲۱۵)

ترجمہ: وہ آپ سے خرچ کے متعلق سوال کرتے ہیں 'آپ کہیئے کہ تم جو (مال) بھی خرچ کرو تو وہ ماں باپ 'قریبی رشتہ داروں 'یتیموں ' مسکینوں اور مسافروں کے لیے خرچ کرو۔

(آیت) "یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فیه قل قتال فیه کبیر وصد عن سبیل الله و کفر به والمسجد الحرام واخراج اهله منه اکبر عندالله والفتنة اکبر من القتل"۔ (البقرہ: ۲۱۷)

ترجمہ: وہ آپ سے ماہ حرام میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں 'آپ کہیئے اس میں قتل کرنا بڑا گناہ ہے 'اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام جانے سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکلنا 'اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے اور فساد کرنا قتل سے زیادہ سخت ہے۔

(آیت) "یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما"۔ (البقرہ: ۲۱۹)

ترجمہ: وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں 'آپ کہیئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے (بھی) ہیں 'اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑا ہے۔

(آیت) "یسئلونك عن الیتمی قل اصلاح لهم خیر"۔ (البقرہ: ۲۲۰)

ترجمہ: وہ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں 'آپ کہیئے کہ ان کی اصلاح زیادہ بہتر ہے۔

(آیت) "یسئلونك عن المحیض قل هو اذی فاعتزلوا النسآء فی المحیض۔"۔ (البقرہ: ۲۲۲)

ترجمہ: وہ آپ سے حیض کے حکم کا سوال کرتے ہیں 'آپ کہیئے کہ وہ گندگی ہے 'پس عورتوں سے حالت حیض میں الگ رہو۔

قرآن مجید میں اس طرح کے سوالات کی پندرہ آیتیں ہیں 'جن میں سے بارہ آیتوں میں صحابہ کرام کے سوالات ہیں 'ان آیات سے معلوم ہوا کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں 'کسی چیز کا حکم معلوم کرنے کے لیے 'کسی شرعی حکم کی وضاحت کے لیے 'اور کسی اشتباہ کو دور کرنے کے لیے سوال جائز ہے 'احادیث میں بھی اس کی بہت نظائر ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے ہوئے سوالات کے متعلق احادیث

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صحابہ کرام امور مستقبلہ کے متعلق بھی سوال کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک مجلس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ کرام سے گفتگو فرما رہے تھے 'کہ ایک اعرابی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے دوران سوال کیا: قیامت کب ہو گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حدیث جاری رکھی 'پھر سائل کو متوجہ کر

کے فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا 'اس نے پوچھا امانت کیسے ضائع ہو گی ؟آپ ﷺ نے فرمایا جب کوئی منصب نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ صحیح البخاری 'ج ۱' رقم الحدیث : ۵۹ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۲ھ)

صحابہ کرامؓ کسی پیش آمدہ مسئلہ اور حادثہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کرتے تھے

حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ حجۃالوداع میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے لیے ٹھہر گئے ' لوگ آپ سے سوال کر رہے تھے 'ایک شخص نے کہا مجھے پتا نہیں چلا اور میں نے ذبح سے پہلے سر منڈا لیا 'آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں (اب) ذبح کر لو ایک اور شخص نے کہا مجھے پتا نہیں چلا میں نے رمی سے پہلے نحر کر لیا 'آپ ﷺ نے فرمایا اب رمی کر لو 'کوئی حرج نہیں ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جس چیز کے متعلق بھی سوال کیا گیا جس کو مقدم یا موخر کیا گیا ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا کر لو کوئی حرج نہیں ہے۔ (صحیح بخاری 'ج ۱' رقم الحدیث : ۸۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۲ھ)

امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک تقدیم تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس سے دم لازم آتا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) سے اسی طرح مروی ہے 'اور اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس سے آخرت میں حرج یعنی گناہ نہیں ہو گا۔

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ابو اھاب کی بیٹی سے شادی کی 'ایک عورت نے ان سے کہا : میں نے عقبہ اور اس کی بیوی کو دودھ پلایا ہے 'حضرت عقبہ نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تم نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ تم نے پہلے مجھے بتایا تھا 'پھر وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مدینہ پہنچے اور آپ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا 'تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم اس سے الگ کیوں نہیں ہوتے ؟ جبکہ یہ کہا گیا ہے 'تو عقبہ اس عورت سے الگ ہو گئے۔ (صحیح بخاری 'ج ۱' رقم الحدیث : ۸۸ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۲ھ)

آپ کا یہ ارشاد بطور استحباب ہے 'ورنہ ایک عورت کے قول سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی 'ثبوت رضاعت کے لیے دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھے مذی بہت آتی تھی 'میں نے حضرت مقداد سے کہا کہ اس کے متعلق سوال کریں انھوں نے آپ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس میں وضو ہے۔ (صحیح البخاری : ج ارقم الحدیث : ۱۳۲)

خواتین آپ ﷺ سے عورتوں کے خصوصی مسائل دریافت کرتی تھیں

حضرت ام سلمہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلیم (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں فرماتا 'کیا عورتوں پر بھی احتلام کی وجہ سے غسل فرض ہے ؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں

جب وہ پانی دیکھ لے 'حضرت ام سلمہ (رض) نے کپڑے میں اپنے منہ کو چھپا کر کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ! تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہوں پھر بچہ کس وجہ سے اس کے مشابہ ہوتا ہے۔ (صحیح البخاری: ج ا رقم الحدیث: ۱۳۰ بیروت)

قرآن مجید کی کسی اصطلاح کے متعلق بھی صحابہ آپ ﷺ سے سوال کرتے تھے

حضرت ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا یارسول اللہ ! اللہ کی راہ میں قتال کرنے کی کیا تعریف ہے؟ ہم میں سے کوئی شخص غصب کی وجہ سے قتال کرتا ہے 'کوئی گروہی تعصب کی وجہ سے قتال کرتا ہے 'آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف سر اٹھایا 'اس وقت وہ شخص کھڑا ہوا تھا 'آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ کی دین کی سربلندی کے لیے قتال کیا 'وہی اللہ عزوجل کی راہ میں قتال کرتا ہے (صحیح البخاری: ج ارقم الحدیث: ۱۲۳ مطبوعہ بیروت)

بعض اوقات صحابہ آپ ﷺ کی حدیث کے معارضہ قرآن مجید کی آیت پیش کرتے 'پھر آپ ﷺ اس کا جواب دیتے تھے:

ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ (رض) جب بھی آپ ﷺ سے کوئی حدیث سنتیں اور آپ ﷺ اس کے مطلب کو نہ پہنچتیں تو آپ ﷺ سے رجوع کرتی تھیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص سے حساب لیا گیا 'اس کو عذاب دیا گیا حضرت عائشہ (رض) نے کہا کیا اللہ یہ نہیں فرماتا اس سے عنقریب بہت آسان حساب لیا جائے گا۔ (الانشقاق '۸) آپ ﷺ نے فرمایا اس آیت میں حساب کا پیش کرنا مراد ہے 'لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا 'وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (صحیح البخاری: ج ارقم الحدیث: ۱۰۳ بیروت)

مشکل سوالات اور بجھارت ڈالنے کی ممانعت

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلیوں اور بجھارتوں کے ڈالنے سے منع فرمایا 'کسی کو ساکت اور عاجز کرنے کے قصد سے اس پر بجھارت ڈالنا منع ہے 'اور شاگردوں کا امتحان لینے کے لیے بجھارت ڈالنا جائز ہے 'خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ سے پوچھا درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مسلمان کی مثل ہے 'بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ا 'رقم الحدیث: ۶۳)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان (رض) کے سامنے لوگوں نے سوالات کیے تو انھوں نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشکل سوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا میں نے سید نا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب سے افضل کوئی قوم نہیں دیکھی اور انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صرف تیرہ سوالات کیے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ وہ تیرہ سوالات یہ ہیں :

(۱) (آیت) "واذا سالك عبادی عنی"۔

(۲) (آیت) "یسئلونك عن الاھلة"۔

(۳) (آیت) "یسئلونك ماذا ینفقون"۔

(۴) (آیت) "یسئلونك عن الشھر الحرام"۔

(۵) (آیت) "یسئلونك عن الخمر والمیسر"۔

(۶) (آیت) "یسئلونك عن الیتامی"۔

(۷) (آیت) "ویسئلونك ماذا ینفقون"۔

(۸) (آیت) "ویسئلونك عن المحیض"۔ یہ آٹھ سوالات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔

(۹) (آیت) "یسئلونك ماذا احل لھم"۔ (المائدہ)

(۱۰) (آیت) "یسئلونك عن الساعة۔"۔ (الاعراف)

(۱۱) (آیت) "یسئلونك عن الانفال"۔ (الانفال)

(۱۲) (آیت) "یسئلونك عن الجبال"۔

تحقیق یہ ہے کہ صرف سوالات صحابہ نے کیے تھے "قرآن میں "یسئلونک" کے صیغہ سے باقی جو سوال ہیں وہ یہود اور مشرکین کے ہیں۔
طاؤس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) نے فرمایا کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس چیز کے لیے متعلق سوال کرے جو نہیں ہے ' کیونکہ جو چیز بھی ہونے والی ہے 'اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ (جامع البیان العلم وفضلہ 'ج ۲ 'ص ۱۴۲ 'ملخصا 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت)

سوالات کرنے کے جائز اور ناجائز مواقع

بہر حال اب حصول علم کے لیے شرعی سوالات کا کرنا جائز ہے 'کیونکہ اب یہ خوف نہیں کہ کسی کے سوال کرنے کی وجہ سے کسی شے کی حرمت نازل ہو جائے گی 'حلال و حرام احکام نازل ہونے کا معاملہ وحی پر موقوف ہے 'اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد سلسلہ وحی ختم ہو چکا ہے۔ پس اگر کوئی شخص پیش آمدہ مسئلہ میں یا کسی نئے حادثہ میں یا کسی غیر منصوص صورت نازلہ میں کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لیے علماء سے سوال کرتا ہے تو اس کا یہ سوال کرنا جائز ہے۔ قرآن مجید میں ہے 'اگر تم کو علم نہیں ہے تو علم والوں سے سوال کرو۔ (الانبیاء : ۱۷) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جہالت کی شفا سوال کرنا ہے۔ (سنن ابوداؤد : ۳۳۶) اور جو شخص کسی پر اپنا علمی تفوق ظاہر کرنے کے لیے سوال کرے 'تاکہ اس کو جواب نہ آئے اور وہ عاجز ہو جائے یا جو شخص محض ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے سوال کرے یا جو شخص عنادا سوال کرے 'سوای سے سوال ناجائز ہیں 'خواہ کم ہوں یا زیادہ البتہ ! علماء کسی مسئلہ میں ایک دوسرے کی

رائے معلوم کرنے کے لیے جو سوال کرتے ہیں اور مذاکرہ اور مباحثہ کرتے ہیں 'وہ جائز ہے۔اسی طرح کسی کی دلیل پر نقض وارد کرنا اور مسلمات بین الفریقین سے معارضہ کرنا بھی جائز ہے اور احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے مناظرہ کرنا بھی جائز ہے 'تاہم مناظرہ میں فریق مخالف کو حکمت کے ساتھ کسی کفریہ کلمہ سے بچانا چاہیے 'اور اگر یہ چاہے کہ وہ کوئی کفریہ کلمہ کہے اور میں اس کی تکفیر کروں تو یہ خود کفر ہے اور اگر یہ چاہے کہ وہ دین میں کوئی ناروا بات کہے اور میں اس کی مذمت کروں تو یہ حرام ہے 'بلکہ یہ نیت ہونی چاہیے کہ میں دلائل پیش کرکے حکمت کے ساتھ فریق مخالف کو حق کا قائل کرلوں 'نہ یہ کہ اس کو مناظرہ میں شکست دوں۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

لغۃ القرآن: [قَدْ : یقیناً][سَاَلَهَا : پوچھا ان کی بابت][قَوْمٌ : قوم][مِّنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے][ثُمَّ : پھر][اَصْبَحُوْا : وہ ہوگئے][بِهَا : اسکے ساتھ][كٰفِرِيْنَ : انکار کرنے والے]

ترجمہ: بیشک تم سے پہلے ایک قوم نے ایسی (ہی) باتیں پوچھی تھیں، (جب وہ بیان کردی گئیں) پھر وہ ان کے منکر ہو گئے

تشریح:

مسلمانوں کو ایک حکم دینے کے بعد سابقہ امتوں کے واقعات سے سمجھایا کہ تم سے پہلی قوموں نے بھی اپنے انبیاء (علیہ السلام) سے بے ضرورت سوالات کئے اور جب حضرات انبیاء (علیہ السلام) نے احکام بیان فرمادیئے تو وہ ان احکام کو بجانہ لاسکے۔ تو تم سوالات کرنے ہی سے بچو کیونکہ اگر تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب دے دیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ کسی سوال کا جواب تمہیں برا لگے۔

بے ضرورت سوالات کرنے کی مذمت

احادیث میں بے ضرورت سوالات کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے، اس سے متعلق احادیث درج ذیل ہیں، چنانچہ

(1)۔۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو حرام نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے سوال کرنے کے باعث حرام کردی گئی۔

(2)۔۔ حضرت ابو ثعلبہ خُشَنی (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے کچھ حدیں مقرر کی ہیں تو ان سے آگے نہ بڑھو، کچھ فرائض لازم فرمائے ہیں تو انھیں ضائع نہ کرو، کچھ چیزیں حرام کی ہیں تو ان کی حرمت نہ توڑو اور تم پر رحمت فرماتے ہوئے کچھ چیزوں سے بغیر بھولے سکوت فرمایا ہے تو ان کے بارے میں بحث نہ کرو۔ (صراط)

کثرت سوالات اور مطالبات کی وجہ سے پچھلی امتوں کا ہلاک ہونا

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ تم سے پہلی قوموں نے اپنے نبیوں سے چند فرمائشی معجزات کا سوال کیا تھا 'جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سوالات کو پورا کر دیا اور ان نبیوں کو وہ معجزات عطا فرما دیئے تو وہ ان نبیوں پر ایمان لانے کی بجائے اپنے انکار اور کفر میں پختہ ہوگئے 'جیسے حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم نے اونٹنی کا سوال کیا تھا 'اور جب وہ اونٹنی آگئی تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں 'اور حضرت علیہ (علیہ السلام) کی قوم نے یہ سوال کیا تھا کہ ان پر آسمان سے دستر خوان نازل کیا جائے اور جب ان پر دستر خوان نازل کر دیا گیا تو وہ کفر میں مبتلا ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وساطت سے اور ان کی زبان سے تنبیہہ کی ہے کہ وہ سوالات کرنے کے معاملہ میں اپنے سے پہلی امتوں کے راستہ پر نہ چل پڑیں 'اس لیے فرمایا کہ تم فرمائشی معجزات کا سوال نہ کرو 'نہ کسی کا پوشیدہ راز معلوم کرو 'اور جو چیز تم پر فرض یا حرام نہیں کی گئی اس کا سوال نہ کرو 'کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بیان کیا جائے تو تم کو ناگوار ہو یا تم کسی دشواری میں پڑ جاؤ۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے تم کو جن چیزوں سے منع کیا ہے 'ان سے اجتناب کرو 'اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے 'ان کو بجالاؤ 'جتنی تمہاری استطاعت ہے 'کیونکہ تم سے پہلے لوگ محض زیادہ سوالات کرنے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ (صحیح مسلم 'فضائل '۱۳۰ '(۱۳۳۷) ۵۹۹۷)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے تمہارے لیے جو چیزیں چھوڑی ہیں 'تم بھی ان کو چھوڑ دو 'تم سے پہلے لوگ اپنے سوالوں کی وجہ سے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے 'پس جب میں تم کو کسی چیز سے منع کردوں تو اس سے اجتناب کرو 'اور جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو اس کو بجالاؤ 'اپنی استطاعت کے مطابق۔ (صحیح بخاری 'ج ۸ 'رقم الحدیث : '۷۲۸۸ 'صحیح مسلم 'الحج '۴۱۲ '(۱۳۳۷) ۳۱۹۹ 'سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۲۶۸۸ 'سنن نسائی ج ۵ 'رقم الحدیث : '۲۶۱۹ ' صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث : '۲۱۔ ۲۰۔ ۱۹۔ ۱۸ 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۷۳۷۱) (تبیان)

"تم سے پہلے ایک قوم نے اسی قسم کے سوالات کیے تھے 'پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہوگئے"۔

انھوں نے احکامات پر عمل کرنے کی بجائے مسلسل سوالات کے ذریعہ 'جب اپنے لیے آسانیاں تلاش کرنا شروع کیں تو سوالات کے نتیجے میں تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کر لیا۔ پھر خود ہی اس میں الجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ انھوں نے تو اپنے لیے چور دروازے تلاش کیے تھے 'لیکن ان کی نادانیوں کے نتیجے میں مزید احکام نازل ہوتے گئے اور احکام میں شدت آتی گئی۔ لیکن اصل چیز جس کی طرف اس قوم کی مثال سے توجہ دلائی گئی ہے 'وہ اس قوم کی بد عملی پر مبنی ان کا ذہنی رویہ ہے (اور یہ یاد رہنا چاہیے کہ یہاں اس قوم سے مراد یہود ہیں) ان کے ذہنی رویے کی عکاسی قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ میں ایک واقعہ سے کی ہے 'جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومیں

جب بد عمل یا بے عمل ہو جاتی ہیں تو وہ احکام کی تعمیل کرنے کی بجائے کس طرح کا رویہ اختیار کرتی ہیں اور اس رویے کے نتیجے میں اپنے لیے کیسی کیسی مشکلات پیدا کر لیتی ہیں۔

وہ واقعہ سورۃ البقرۃ میں آیت نمبر ۶۷ تا ۷۱ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم اس کا ترجمہ نقل کر دیتے ہیں :

(پھر وہ واقعہ یاد کرو ! جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو ؟ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا : میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے ' اچھا ! اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا ! اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے ' جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے ' اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے ! اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا : وہ فرماتا ہے ' زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے ' جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے ! اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ ' کیسی گائے مطلوب ہے ' ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پا لیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا : اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے ' جس سے خدمت نہیں لی جاتی ' نہ زمین جوتتی ہے ' نہ پانی کھینچتی ہے ' صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں ! اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا ' ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے)

یہ ذہنیت یا ذہنی رویہ یہود کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جب بھی کسی امت میں بے عملی اپنی جڑ بنا لیتی ہے ' اس کی کیفیت اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں میں اگر آپ دیکھنا چاہیں تو آپ کو جابجا اس کی مثالیں ملیں گی۔ اسلامی شریعت کے کسی بھی حکم کی بات چھیڑ کے دیکھ لیجئے ' ایک فرد سے لے کر اجتماعی اداروں تک ' بجائے اس پر عمل کرنے کے ' یہی رویہ آپ کو کارفرما دکھائی دے گا۔ بحثوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ایک مخلص اور سنجیدہ آدمی یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ یا اللہ ! یہ کیا رویہ ہے ؟ لیکن پریشان کن چیز یہ رویہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے وہ ذہنیت ہے ' جس کے نتیجے میں یہ رویہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیشہ کے لیے اس امت کو بلاضرورت سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ ہر ایسے کام سے منع فرمایا ہے ' جس کا دنیا اور دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ارشاد فرمایا :

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

(کسی بھی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے)

اس لیے آج بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں کہ ہم اپنا قیمتی وقت بجائے ضروری امور میں صرف کرنے اور دین سیکھنے میں لگانے کے فضول سوالات میں ضائع کریں اور اسے ہم دینی خدمت سمجھیں۔ آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہو گا جو عجیب و غریب ' غیر متعلق باتوں میں وقت صرف کر رہے ہوتے ہیں اور اسے تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا نام کیا تھا ؟ کسی نے یہ تحقیق شروع کر رکھی ہے کہ کشتی نوح کا طول و عرض کیا تھا ؟ کوئی حروف مقطعات کے معنی معلوم کرنے کی فکر میں ہے اور کسی کو یہ فکر لاحق ہے کہ متشابہات کا مفہوم معلوم کیا جائے حالانکہ خود قرآن کریم نے متشابہات کے پیچھے پڑنے والے کو ذہنی کج روی کا مریض قرار دیا ہے کیونکہ متشابہات بالعموم اللہ کی صفات پر مشتمل ہیں یا اللہ کی ان مخلوقات سے متعلق ہیں ' جن کا تعلق عالم غیب سے ہے ' کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ عالم غیب پر رسائی حاصل کر سکے۔ اب اگر وہ اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے تو اندازہ فرمایئے ! آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کی مصروفیات ہیں ' جو قوائے عمل کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہیں۔ (روح)

آیت مبارکہ:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

لغۃ القرآن: [مَا : نہیں][جَعَلَ : بنایا][اللّٰهُ : اللہ][مِنْ: سے][بَحِيْرَةٍ : بحیرہ][وَّلَا : اور نہ][سَآئِبَةٍ : سائبہ][وَّلَا وَصِيْلَةٍ : اور نہ وصیلہ][وَّلَا حَامٍ : اور نہ حام][وَّلٰكِنَّ : اور لیکن][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : جنہوں نے انکار کیا][يَفْتَرُوْنَ : وہ باندھتے ہیں][عَلَي : پر][اللّٰهِ : اللہ][الْكَذِبَ : جھوٹ][وَاَكْثَرُهُمْ : اور اکثر ان کے][لَا : نہیں][يَعْقِلُوْنَ : وہ عقل کرتے]

ترجمہ: اللہ نے نہ تو بحیرہ کو (اَمر شرعی) مقرر کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حام کو، لیکن کافر لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے

تشریح:

کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے یا اس کے اذن سے اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو۔ اگر کوئی شخص اللہ اور رسول کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام اور حرام کی ہوئی چیز کو حلال کرتا ہے تو وہ تشریع اور قانون سازی کا حق اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے اور حقوق ربانی میں مداخلت کرنے کا مجرم بن رہا ہے۔ اس آیت میں کفار کی ایسی مداخلت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ کہ جن جانوروں کا گوشت اور دودھ اللہ تعالیٰ نے حلال کیا، ان سے خدمت لینے، ان پر سواری کرنے، بوجھ لادنے کی اجازت بخشی، یہ کفار اپنی من گھڑت تجویزوں سے ان کو اپنے اوپر حرام کر دیتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہوتا ہے۔ جن جانوروں کو مشرکین اپنے اوپر مختلف طریقوں سے حرام کر دیا کرتے تھے۔ (ضیاء)

مَا جَعَلَ اللّٰہُ: اللہ نے مقرر نہیں کیا۔ } زمانہ جاہلیت میں کفار کا یہ دستور تھا کہ جو اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی اور آخری مرتبہ اس کے نر ہوتا تو اس کا کان چیر دیتے پھر نہ اس پر سواری کرتے اور نہ اس کو ذبح کرتے اور نہ پانی اور چارے پر سے ہنکاتے، اس کو بَحِیرَہ کہتے۔ اور جب سفر درپیش ہوتا یا کوئی بیمار ہوتا تو یہ نذر کرتے کہ اگر میں سفر سے بخیریت واپس آؤں یا تندرست ہو جاؤں تو میری اونٹنی سائِبَہ ہے اور اس اونٹنی سے بھی نفع اٹھانا بَحِیرَہ کی طرح حرام جانتے اور اس کو آزاد چھوڑ دیتے اور بکری جب سات مرتبہ بچے جن دیتی تو اگر ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو مرد کھاتے اور اگر مادہ ہوتا تو بکریوں میں چھوڑ دیتے اور ایسے ہی اگر نر، مادہ دونوں ہوتے تو کہتے کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی، اس کو وَصِیلَہ کہتے اور جب نر اونٹ سے دس مرتبہ اونٹنی کو گابھن کروالیا جاتا تو اس کو چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کرتے، نہ اس سے کام لیتے اور نہ اس کو چارے پانی سے روکتے، اس کو اَلْحَامِی کہتے۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ بحیرہ وہ ہے جس کا دودھ بتوں کے لیے روکتے تھے، کوئی اس جانور کا دودھ نہ نکالتا اور سائبہ وہ جس کو اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے کوئی ان سے کام نہ لیتا۔

یہ رسمیں زمانہ جاہلیت سے ابتدائے عہد اسلام تک چلی آرہی تھیں اس آیت میں ان کو باطل کیا گیا اور فرمایا کہ یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے مقرر نہیں کئے بلکہ کفار اللہ عَزَّوَجَلَّ پر جھوٹ باندھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو حرام نہیں کیا اس کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ یہ لوگ بیوقوف ہیں کہ جو اپنے سرداروں کے کہنے سے ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور اتنا شعور نہیں رکھتے کہ جو چیز اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرام نہ کی اس کو کوئی حرام نہیں کر سکتا۔ (صراط)

سعید بن المسیب نے بیان کیا کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ دوہنا بتوں کی وجہ سے منع کر دیا جاتا تھا ' اور کوئی شخص اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا ' اور سائبہ وہ اونٹنی ہے جس کو وہ اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے ' اور اس پر کسی چیز کو لادا نہیں جاتا تھا ' اور حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا ' وہ دوزخ میں اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا ' اور یہی وہ شخص ہے جس نے سب پہلے سائبہ اونٹیوں کو چھوڑا تھا ' اور وصیلہ وہ اونٹنی ہے جو پہلی بار اونٹ جنتی ہے اور دوسری بار اونٹنی جنتی ہے ' وہ اس کو اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے ' بشرطیکہ وہ یکے بعد دیگرے مادہ کو جنم دے اور اس کے درمیان نر نہ ہو ' اور حامی نر اونٹ ہے ' جو چند معین مرتبہ گیا بھن کرے ' جب وہ اپنا عدد پورا کرے تو وہ اس اونٹ کو بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے ' اور اس پر سامان نہیں لادتے تھے ' اور اس کو الحامی کہتے تھے۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے دیکھا کہ دوزخ کی بعض آگ بعض کو کھا رہی تھی ' اور میں نے دیکھا کہ عمرو اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا اور یہ پہلا شخص تھا جس نے سائبہ اونٹیوں کو چھوڑا۔ (صحیح البخاری ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۴۶۲۴۔ ۴۶۲۳ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت)

حضرت ابوالاحوص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تمہاری اونٹنیاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کے کان سالم ہوتے ہیں ' پھر تم استرا لے کر ان کے کان کاٹ ڈالتے ہو ' اور کہتے ہو کہ یہ بحیرہ ہے ' اور ان کے کان چیر دیتے ہو ' اور کہتے ہو کہ یہ حرام ہیں ؟۔ انھوں نے کہا ہاں ! آپ نے فرمایا اللہ کی کلائی بہت سخت ہے اور اس کا استرا بہت تیز ہے اور تمہارا ہر مال جو تمہارے لیے حلال ہے ' اس میں سے کوئی چیز حرام نہیں کی گئی۔ (مسند احمد ج ۵ ' رقم الحدیث : ۱۵۸۸۸ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۱۰ ' ص ۱۰ ' جامع البیان ' جز ۷ ' ص ۱۱۹۔ ۱۱۸)

امام عبدالرزاق ' امام ابن ابی شیبہ اور امام ابن جریر نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں اس شخص کو ضرور پہچانتا ہوں جس نے سب سے پہلے سائبہ اونٹیوں کو چھوڑا اور بتوں کے بتوں کے سامنے ذبح کرنے کے پتھر نصب کیے اور جس شخص نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کو تبدیل کیا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ شخص کون ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ شخص بنو کعب کا بھائی عمرو بن لحہ ہے۔ میں نے اس کو دیکھا وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا ' اور اس کی آنتوں کی بدبو سے دوزخیوں کو اذیت پہنچ رہی تھی ' اور میں اس شخص کو پہچانتا ہوں جس نے سب سے پہلے بحیرہ کے کان چیرے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بنو مدلج کا ایک شخص ہے جس کی دو اونٹنیاں تھیں ' اس نے ان کے کان چیرے اور ان کا دودھ دوہنا اور ان پر سامان لادنا حرام کردیا ' پھر اس کو ضرورت ہوئی تو اس نے ان کا دودھ پیا اور ان کی پشت پر سوار ہوا میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ' وہ اونٹنیاں اس کو اپنے مونہوں سے بھنجھوڑ رہی تھیں اور اپنے کھروں سے روند رہی تھیں (یہ حدیث مرسل ہے) (درمنثور ' ج ۲ ص ۳۳۸ ' جامع البیان ' جزء ۷ ' ص ۱۱۸ ' روح المعانی ' جزء ۷ ' ص ۴۴) (تبیان)

ایصال ثواب کے لیے نامزد جانوروں کا حلال اور طیب ہونا

اللہ تعالیٰ نے ان چار جانوروں کو حرام نہیں کیا لیکن زمانہ جاہلیت میں مشرکوں نے بحیرہ ' سائبہ ' وصیلہ اور حامی ٹھہرائے ' ان کو اپنے بتوں کے لیے نامزد کیا ' اور ان سے نفع حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ' اور یہ محض اللہ پر افتراء ہے ' سو ان جانوروں کو جب مسلمان ' اللہ کے نام پر ذبح کرے گا تو ان کا کھانا حلال اور طیب ہوگا ' اسی طرح قربانی کے لیے جو جانور لوگوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں ' یہ عبداللہ کی گائے ہے ' یہ عبدالرحمٰن کا بکرا ہے ' اور اولیاء اللہ کو ایصال ثواب کرنے کے لیے جو جانور ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں کہ مثلاً اس بکرے کو ذبح کرکے اس کے طعام کے صدقہ کے ثواب کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ یا حضرت داتا بخش علی ہجویری قدس سرہ کی روح کو پہنچایا جائے گا اور اس اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ یہ غوث پاک کا بکرا ہے یا یہ داتا صاحب کا بکرا ہے ' تو جب اس کو مسلمان اللہ کے نام پر ذبح کرے گا تو اس کا گوشت بھی حلال اور طیب ہے۔

جانور پر کسی کا نام پکارنے سے متعلق اہم مسئلہ

آیتِ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جانور کی زندگی میں اس پر کسی کا نام پکارنا اسے حرام نہیں کردیتا۔ ہاں ذبح کے وقت غیر خدا کا نام پکارنا حرام کردے گا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو جانور حلال ہو اسے خواہ مخواہ حرام کہنا مشرکین کا طریقہ اور سراسر جہالت ہے۔

المختصر۔۔مذکورہ بالا تمام جانور دین الٰہی میں حلال تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں حرام نہیں قرار دیا۔ (لیکن جنھوں نے کفر کیا) اور عمرو بن الحہ خزاعی کی پیروی کی، جو ان تمام باتوں کا سب سے بڑا مفتری تھا، اس نے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے دین کو بگاڑا اور اوی نے ہی بہت بت گڑھے اور اوثان کھڑے کئے،۔ اسی نے ہی بحیدۃ، سائبۃ، وصیلۃ اور حام کے رسوم جاری کئے، تو وہ اور اس کے سارے پیروکار (وہ) ہیں جو

(بہتان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ) (پر جھوٹ کا)۔ اپنی خود ساروش کو خدائی دین باور کرانا، یہ خدا کی ذات پر ایک کھلا ہوا افتراء ہے، جس کا سچ سے کوئی تعلق نہیں۔ (اشرفی)

سن لو (اور) اچھی طرح یاد رکھو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی پر اکسانے والے (ان) ذلیل ترین لوگوں (کی اکثریت بے عقل ہے)۔۔ چنانچہ۔۔ وہ نہیں سمجھتے کہ واقعی یہ فعل افتراء اور باطل ہے۔ اسی لیے وہ ان کی مخالفت نہیں کر سکتے کہ اس باطل کو چھوڑ کر اپنے کو حق کی طرف لا سکیں بلکہ مرتے دم تک وہ اس تقلید بد کی قید میں پھنسے رہتے ہیں۔ ان کی بے عقلی کا عالم یہ ہے کہ از روئے ہدایت۔۔ مذکورہ جانور دراصل حلال ہیں اور یہ جانور جب مال غنیمت کی صورت میں اہل ایمان کے قبضہ میں آجاتے تو وہ انھیں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کرکے کھایا کرتے تھے۔ صرف بحیرہ اور وصیلہ وغیرہ کے ناموں سے شہرت انھیں حرام نہی کر سکتی بشرطیکہ ذبح کرنے یا کرانے والے کا مقصد غیر اللہ کی عبادت نہ ہو۔ اسی طرح اگر جانور کو صدقہ، عقیقہ، ولیمہ قربانی اور ایصال ثواب کے لیے کسی بزرگ یا والدین کے نام سے پکارا جائے اور اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو اس کا گوشت کھانا حلال ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں ہے اور اگر ہم ان جانوروں کو اس لیے حرام قرار دیں گے کہ وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہیں تو پھر وصیلہ اور بحیرہ وغیرہ بھی حرام ہونے چاہئیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حلال قرار دیا ہے، لہٰذا اہل اسلام کو بھی عقل سے کام لینا چاہیے اور کفار کی طرح حلال جانورں کو حرام قرار دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (امداد)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب][قِيْلَ : کہاجاتا ہے][لَهُمْ : انکے لیے][تَعَالَوْا : تم آؤ][اِلٰى: طرف][مَآ اَنْزَلَ : جو نازل کیا][اللّٰهُ : اللہ][وَاِلَى: اور طرف][الرَّسُوْلِ : رسول][قَالُوْا : وہ کہتے ہیں][حَسْبُنَا : ہمیں کافی ہے][مَا : جو][وَجَدْنَا : ہم نے پایا][عَلَيْهِ : اس پر][اٰبَآءَنَا: ہمارے آباواجداد][اَوَلَوْ : اور اگرچہ][كَانَ : تھے][

اٰبَآؤُهُمْ : انکے آبا و اجداد][لَا يَعْلَمُوْنَ : نہیں وہ جانتے][شَيْـًٔا : کچھ بھی][وَّلَا : اور نہ][يَهْتَدُوْنَ : وہ ہدایت یافتہ]

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (قرآن) کی طرف جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے اور رسول (مکرّم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف رجوع کرو تو کہتے ہیں: ہمیں وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ (دین کا) علم رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں

تشریح:

کفار کو جب شرک اور بت پرستی سے باز آنے اور قرآن کریم اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کے لیے دعوت دی جاتی تو کہتے: ہمیں تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے صرف وہ راستہ کافی ہے جس پر ہمارے باپ دادا چلا کرتے تھے اور ہم صرف اپنے باپ دادا کی ہی تقلید کریں گے، اور جب کوئی نصیب دعوت حق کو قبول کرتے ہوئے مسلمان ہو جاتا تو کفار اس پر طعنوں کی بارش برسا دیتے کہ تو نے اپنے باپ دادا کو بیوقوف قرار دیا اور ان کے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ان کے باپ دادا جاہل اور گمراہ ہوں تو کیا وہ پھر بھی اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے یعنی اگر ان کے باپ دادا اہل علم اور ہدایت یافتہ ہوتے تو ان کی پیروی درست تھی لیکن جب ان کے اسلاف خود گمراہ ہوں تو ان کی پیروی ان کو بھی گمراہی میں لے جائے گی۔
اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار کے پاس اپنے کفر پر قائم رہنے کے لیے اپنے باپ دادا کی تقلید کے علاوہ کوئی اور عقلی یا نقلی دلیل نہیں تھی اور کسی نظام کی صداقت کے لیے یہ دلیل ناکافی ہے اور دنیا کا کوئی اہل عقل و دانش اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس آیت میں جاہل اور گمراہ لوگوں کی تقلید سے منع کیا گیا ہے چاہے وہ گمراہ کسی کے باپ دادا ہی کیوں نہ ہوں۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ تقلید تو صرف اہل علم اور ہدایت یافتہ لوگوں کی مناسب ہے چاہے وہ ہدایت یافتہ لوگ کسی بھی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں کیونکہ صحیح عالم اور ہدایت یافتہ وہی ہو گا جس کا قول و فعل قرآن وسنت کے مطابق ہو تو ان کی تقلید کرنے والا دراصل قرآن وسنت پر عمل کرتا ہے۔
ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ علیہم اجمعین) کے مقلدین اپنے امام کے قول پر اس لیے عمل ہیں کرتے کہ یہ ان کے امام کا قول ہے بلکہ اس قول پر اس لیے عمل کرتے ہیں کہ ان کا قول قرآن وسنت کی کسی نہ کسی دلیل پر مبنی ہے، اور ائمہ کرام کی خدا خوفی اور نیک نفسی کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے کہا: اگر ہمارا کوئی قول کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو تو ہمارا قول مسترد کر دو اور حدیث پر عمل کرو وہی ہمارا مذہب ہے،

تقلید کے بارے میں ائمہ کے اقوال

امام ابو حنیفہ (رض) کا قول: (إِذَا صَحَّ الْحَدِيْثُ فَهُوَ مَذْهَبِيْ) [تفسیر مظہری]
"جب صحیح حدیث موجود ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔"

امام مالک (رح) کا قول :
امام مالک نے روضۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا : "ہر شخص کی بات تسلیم کی جاسکتی ہے اگر درست ہو۔ اور اسے ٹھکرایا جاسکتا ہے جب درست نہ ہو۔ مگر اس روضے والے کی بات کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔" [حیات امام مالک۔ از امام زہری]
امام شافعی (رح) کا قول :
(اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی اَنَّ مَنِ اسْتَبَانَ لَهٗ سُنَّةٌ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّدَعَهَا لِقَوْلِ اَحَدٍ)
[اعلام المعوقین]
"اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سامنے آجائے، پھر اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسے کسی کے قول کی بناپر ترک کر دیا جائے۔"
امام احمد بن حنبل (رح) کا قول : (مَنْ رَدَّ حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَهُوَ عَلٰی شَفَا هَلَكَتِهٖ) [ابن جوزی]
"جس نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث کو رد کیا وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔" (فہم)
نیز ایک عام آدمی کا علم اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ وہ قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کر سکے، اس لیے اسے کسی ایسے عالم با عمل کی طرف رجوع کرنا ہی پڑتا ہے جو قرآن و حدیث کا عالم ہو، تاکہ انسان اس کی تقلید کرتے ہوئے قرآن و سنت کا منشاء پورا کر سکے۔ الغرض کسی کو اپنا رہبر و مقتدا بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لو کہ جس مقصد کے لیے تم اس کو رہبر بنا رہے ہو کیا وہ اس مقصد کا پورا علم رکھتا ہے؟ اور اگر علم رکھتا ہے تو کیا اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے؟ اگر اس کا علم صحیح اور عمل درست ہے تو اس کی پیروی ذریعہ نجات ہے۔
نوٹ : اس آیت سے معلوم ہوا کہ فقط قرآن مجید کی طرف آنا کافی نہیں بلکہ صاحب قرآن نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بھی رجوع ضروری ہے کیونکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان اقدس ہی قرآن مجید کے ثبوت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ (امداد)

تقلید مذموم اور تقلید محمود

کفار عقل سے کام لیتے تو بت پرستی نہ کرتے اور نہ بتوں کی خاطر ان جانوروں کو حرام کرتے لیکن وہ بغیر غور و فکر کے اپنے آباؤ و اجداد کی اندھی تقلید میں گرفتار ہیں ' حالانکہ ان کے آباؤ اجداد جاہل اور گمراہ تھے اور جاہلوں کی تقلید ضرر محض ہے۔ عقل 'علم اور دین کے منافی ہے اور مصلحت کے خلاف ہے 'اس آیت میں مطلقا تقلید کی مذمت نہیں کی 'بلکہ ان لوگوں کی تقلید کی مذمت کی ہے جو جاہل اور گمراہ ہوں 'اور اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو لوگ عالم اور ہدایت یافتہ ہوں ان کی تقلید جائز اور صحیح ہے 'امام رازی نے لکھا ہے کہ ہدایت یافتہ عالم کی تقلید اس وقت صحیح ہے 'جب مقلد کو معلوم ہو کہ اس عالم کا قول دلیل اور حجت پر مبنی ہے 'اور بوقت ضرورت وہ اس عالم سے دلیل معلوم کر کے بیان کر سکے 'اس صورت میں یہ محض اندھی تقلید نہیں ہو گی اور وہ شخص دراصل اسی دلیل کے مطابق عمل کر رہا ہے 'اور یہ چیز عقل اور علم کے خلاف نہیں ہے۔
ہر دور میں ان پڑھ عوام اپنے پیش آمدہ مسائل میں علماء اور مفتیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں 'اور عالم اور مفتی اس مسئلہ کا جو حل بیان کرتا ہے 'اس پر عمل کرتے ہیں 'کیونکہ ان کو علم ہوتا ہے کہ یہ فتوی قرآن اور حدیث کی کسی دلیل پر مبنی ہے اور بوقت ضرورت وہ دلیل بیان

بھی کر دی جاتی ہے 'سو در حقیقت وہ شخص قرآن اور حدیث پر عمل کر رہا ہے مقلد محض نہیں ہے 'اور ہدایت یافتہ عالم کا مقلد ہے ' جاہل اور گمراہ کا مقلد نہیں ہے 'اسی طرح ائمہ اربعہ کے مقلدین ہیں 'وہ اپنے امام کے قول پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ ان کے امام پر عمل نہیں کر رہا 'بلکہ قرآن اور حدیث پر عمل کر رہا ہے اور چونکہ عام آدمی کا عمل قرآن اور حدیث کو محیط نہیں ہے اور وہ ان سے مسائل کے استنباط پر قادر نہیں ہے اور قرآن و حدیث سے حاصل شدہ احکام کو اپنے پیش آمدہ مسئلہ پر منطبق کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا 'اس لیے اسے کسی قرآن اور حدیث کے متبحر اور ماہر عالم کی طرف رجوع کی ضرورت ہوتی ہے 'اس لیے وہ کسی ہدایت یافتہ متبحر اور ماہر دین کی تقلید کرتا ہے اور ائمہ ہدایت یافتہ اور قرآن و حدیث کے علوم کے ماہر اور امام تھے۔ سو ان کی تقلید کرنا بالکل جائز ' صحیح اور عقل سلیم کے مطابق ہے 'ان کے اقوال قرآن و حدیث پر مبنی ہیں ' یہ دلائل انھوں نے خود بھی بیان کیے اور ان کے متبع علماء نے بھی بیان کیے 'اس کے باوجود ان کی نیک نفسی اور علم و دیانت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے کہا اگر ہمارا کوئی قول کسی حدیث صحیح کرنا ہے۔ یہ محض ان کی تقلید نہیں ہے اور نہ ہی اندھی تقلید ہے ' کیونکہ ان کے اقوال قرآن و حدیث پر مبنی ہیں اور نہ یہ کسی جاہل اور گمراہ کی تقلید ہے 'بلکہ یہ ان کی تقلید ہے جو اپنے اپنے دور اور ہدایت کے آفتاب و ماہتاب تھے 'سو اس آیت سے ائمہ اربعہ کی تقلید پر طعن کرنا علم اور دیانت کے خلاف ہے۔ (تبیان)

آباؤ اَجداد کی ناجائز رسمیں پوری کرنے کی مذمت

اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کی دعوت ملنے پر کفار نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے مقابلے میں جاہل باپ دادوں کی رسم اختیار کرنا کفار کا طریقہ ہے۔ اس سے ان لوگوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے جو خوشی کی تقریبات میں اور غمی کے مواقع پر ناجائز و حرام رسمیں کرتے ہیں اور ان رسموں میں شامل نہ ہونے والے کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان رسموں سے منع کرنے والے سے کہتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں یہ رسمیں عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہیں، ہم انھیں نہیں چھوڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین (صراط)

دراصل عرب کے جاہل معاشرے میں جس چیز نے ان کو جہالت پر ثابت قدم رکھا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنی نادانیوں اور بے وقوفیوں کو بھی عقل اور ہدایت کی بات سمجھتے تھے 'وہ ان کی تقلید آباء کی ایک مستقل روایت تھی 'جس سے وہ دستبردار ہونے کو کسی بھی طرح تیار نہیں تھے۔ اس آیت کریمہ میں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ زندگی میں صحیح راہ عمل اختیار کرنے اور صحیح اہداف مقرر کرنے اور پھر کامیابی سے اس پر چلنے کے لیے دو چیزیں درکار ہیں اور جس کے بھی دماغ میں تھوڑی سی عقل موجود ہے 'وہ ان دونوں باتوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہیں علم اور اہتداء (تقلید محمود)۔ آپ کسی بھی چیز کو اختیار کرنا چاہیں 'کوئی رویہ اپنانا چاہیں 'کسی طرز عمل کا فیصلہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے آپ اس کے مَالَہٗ وَمَا عَلَیۡہِ سے واقف ہونا ضروری سمجھیں گے۔ آدمی تجارت کرنا چاہے تو تجارت کے رموز و اسرار سے آگاہی حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ملازمت کرنے کا ارادہ ہو تو ملازمت کی تمام شرائط کو جاننا اور اس کی پوری تفصیلات کو سمجھنا 'یہ ہماری جانی پہچانی سی بات ہے۔ کھیلوں سے لے کر زندگی کے سنجیدہ فرائض تک کوئی سا کام بھی پیش نظر ہو 'جب تک اس کی مکمل واقفیت حاصل نہیں کر لی جاتی 'اس وقت تک اس کام کو شروع کرنا 'بے عقلی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے "علم" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری چیز جس کا جاننا اسی طرح ضروری ہے 'وہ یہ کہ جس طرح آپ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا علم حاصل کرتے ہیں 'اسی طرح آپ یہ بھی ضروری

سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے کامیابی سے اس کام کو سرانجام دیا ہے ،میں ان لوگوں سے مل کر دیکھوں ،تاکہ مجھے یہ معلوم ہوسکے کہ اس راستے کے نشیب وفراز کیا ہیں اور اس راستے میں کیا کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ یعنی علم کے ساتھ ساتھ اس راستے پر چلنے والوں کا عمل ،ان کا تجربہ ،نئے چلنے والوں کے لیے راہنمائی کا کام دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے ،جس کو اہتداء کہا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ،اگر اختصار سے ہم ان دونوں لفظوں کی تعریف کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ علم نام ہے منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کی آگاہی کا اور اہتداء اس علم کے مطابق عمل مستقیم کا نام ہے۔ یہی دو چیزیں جس طرح زندگی کے عام معمولات کے لیے ضروری ہیں "خود زندگی کے لیے "اس سے بھی زیادہ ضروی ہیں اور پھر ایسی زندگی جس کا تعلق صرف دنیا سے ہی نہیں بلکہ آخرت سے بھی ہو اس میں تو ان دونوں چیزوں کی پابندی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ خود زندگی کا مقصود کیا ہے ؟زندگی کے سفر کی آخری منزل کیا ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے طریقے کیا ہیں اور پھر وہ کونسی شخصیت ہے ،جس نے ان طریقوں پر چل کر اور منزل مقصود کو آسان بنا کر انسانی زندگی کے لیے راہنمائی فراہم کی ہے ؟اگر کسی شخص کے دل ودماغ پر اندھی عصبیت کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے تو اس کے لیے یہ جاننا کوئی مشکل نہیں کہ یہ علم وہ ہے ،جو نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا جارہا ہے اور اس راستے کے راہنما وہ ہیں ،جنھیں ہم نبی آخرالزماں کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن عرب کے مشرکین کی نادانی ملاحظہ فرمایئے کہ انھیں جب علم اور اہتداء کے انہی دونوں ذرائع کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ! اسے قبول کرو اور اس کی راہنمائی میں زندگی گزارو ،تو وہ اس کے جواب میں کس قدر نادانی کی بات کہتے ہیں کہ ہمیں اس طرف نہیں آنا بلکہ ہماری راہنمائی کے لیے تو وہ چیز کافی ہے ،جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر علم اور اہتدا (تقلید محمود) کو نظرانداز کرکے صرف تقلید آباء ہی کو زندگی کا راہنما مان لیا جائے تو پھر وہ علم اور عقل جو انسانیت کے جوہر ہیں ،ان کا تو دنیا سے جنازہ اٹھ جائے گا اور اس کے بعد خود انسان کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیونکہ تقلید آباء تو زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہاں یہ دیکھا جانا چاہیے کہ اگر آباء واجداد علم اور ہدایت کے نور سے بہرہ ور ہوں اور وہ یہی روشنی آئندہ نسلوں کے سپرد کرنا چاہتے ہوں تو پھر یقیناً ان کی تقلید ہونی چاہیے کیونکہ یہ تقلید اصلاً ان کی نہیں بلکہ اس علم وہدایت کی ہے ،جس کی خود وہ تقلید کرتے رہے ہیں ،اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل جس راہنمائی کے پیچھے چلنا ہے ،وہ علم اور ہدایت ہے ،آباؤاجداد نہیں۔ اس لیے مشرکین عرب کو اپنی جہالت سے نکل کر اور عصبیت سے جان چھڑا کر علم وہدایت کی روشنی سے اکتساب فیض کرنا چاہیے ،اسی میں ان کی دنیا ہے اور اسی میں آخرت۔

مشرکینِ عرب کے رویے پر قرآن کریم کی اس تنقید کی روشنی میں ہمارے سوچنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں۔ ہم جب اپنے حالات پر نظر ڈالتے اور اپنے گرد وپیش کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کے سارے دعوؤں کے باوجود ،ہم بھی اس بیماری کے شکار ہیں۔ دیہات میں برادریوں کے فیصلے بالعموم آباؤاجداد کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں۔ کوئی سی بات کرکے دیکھ لیجئے ،ان کا سب سے بڑا حوالہ یہی ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اگر کبھی ان کی غلطیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اسے ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں تک شہروں کا تعلق ہے ،دینی معاملات میں شہروں کے رہنے والوں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں ،بجز اس کے کہ اللہ نے کسی پر اپنا فضل کیا ہو اور وہ اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھنے کی وجہ سے یا اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں دین کی بنیادی باتیں سمجھ چکا ہو تو اور بات ہے ورنہ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ لوگ اپنی مذہبی تعلیم سے یکسر بیگانہ ہیں ،اس لیے ان کی راہنمائی کا بھی سب سے بڑا ذریعہ ان کے اپنے آباؤاجداد کا طرز عمل ہی بنتا ہے۔ آپ اگر ان کی غلطیوں پر انھیں آگاہ کیجئے تو وہ جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے

دیکھا ہے اور جہاں تک ہمارے سیاسی معاملات کا تعلق ہے 'اس میں بھی وسعت ظرف اور شعور وآگہی کا چلن کوئی زیادہ دکھائی نہیں دیتا 'بلکہ پارٹی کی روایت، بڑے لیڈروں کے فیصلے اور اگر کوئی ایسا بڑا لیڈر ہو جس کی عقیدت نے اکثریت کو اسیر کر رکھا ہو تو اس کے ذاتی فیصلے اور ذاتی پسند و ناپسند پوری پارٹی کی راہنما بن جاتی ہے 'قطع نظر اس سے کہ اس میں علم و ہدایت کا کوئی دخل ہے یا نہیں۔ اس لیے ہمارے لیے بھی یہ سوچنا از بس ضروری ہے کہ قرآن کریم کی دی ہوئی اس راہنمائی کے مطابق ہم اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔ (روح)
آخر میں یہ جاننا ضروری ہے

نیک لوگوں کی پیروی ضروری ہے

آیت کے آخری حصے سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی اتباع اور ان کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۱۱۹) " (1)

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

حضرت سفیان بن عیینہ (رح) فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ارشاد ہے: ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جن کی صورت دیکھ کر تمہیں خدا یاد آئے، جن کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جن کا عمل تمہیں آخرت کا شوق دلائے۔ (صراط)

فائدہ

۱: معلوم ہوا کہ فقط قرآن کی آنا کافی نہیں بلکہ قرآن والے محبوب کی طرف بھی رجوع ضروری ہے۔ یعنی قرآن کے ساتھ حدیث شریف کو بھی مانے، ہاتھ میں قرآن ہو اور دل میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں۔ جب ہدایت ملتی ہے۔

۲: معلوم ہوا کہ شریعت کے مقابلہ میں جاہل باپ دادوں کی رسم اختیار کرنا کفار کا طریقہ ہے۔ صالحین کی اتباع ضروری ہے۔ رب فرماتا ہے وکونوا مع الصادقین اس لیے یہاں لایعلمون اور لایھتدون کی قید لگائی گئی۔ (نور)

آیت مبارکہ:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى ٱللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

لغۃ القرآن: [يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][عَلَيْكُمْ : تم پر][اَنْفُسَكُمْ : تمہاری جانیں][لَا يَضُرُّكُمْ : نہ وہ نقصان دے گا تم کو][مَّنْ : جو][ضَلَّ : گمراہ ہوا][اِذَا : جب][اهْتَدَيْتُمْ : تم ہدایت پر ہو][اِلَى : طرف][اللّٰهِ : اللہ کی][مَرْجِعُكُمْ : تمہارا لوٹنا ہے][جَمِيْعًا : سب][فَيُنَبِّئُكُمْ : پھر وہ خبردے گا تم کو][بِمَا : ساتھ اسکے جو][كُنْتُمْ : تم تھے][تَعْمَلُوْنَ : تم عمل کرتے]

ترجمہ: اے ایمان والو ! تم اپنی جانوں کی فکر کرو، تمہیں کوئی گمراہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت یافتہ ہو چکے ہو، تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمہیں ان کاموں سے خبر دار فرمادے گا جو تم کرتے رہے تھے

تشریح:

کفار کا رعناد اور کفر پر ان کا اصرار دیکھ کر صحابہ کرام بہت رنجیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ان کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔کہ تم اپنی اصلاح اور سلامت روی کے ذمہ دار ہو۔اگر تم راہ راست پر ثابت قدم رہے تو کسی کی گمراہی تمہیں ضرر نہیں پہنچائے گی۔ ہر شخص اپنے اعمال کی جزا وسزا بھگتے گا۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ جب ہم خود نیکوکار اور صالح ہیں تو کسی کو نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ہم پر لازم نہیں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی تعالیٰ عنہ نے اس غلط فہمی کا پہلے ہی ازالہ فرمادیا تھا۔آپ ایک روز خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے۔حمد وثنا کے بعد فرمایا۔تم یہ آیت علیکم انفسکم الخ پڑھتے ہو اور اس کا غلط مفہوم ذہن میں رکھتے ہو۔ میں نے حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ان الناس اذارإوا المنکر ولم یغیر وہ یوشک ان اللہ عزوجل ان یعمہم بعقابہ (سنن اربعہ) : لوگ جس وقت برائی کو دیکھیں اور پھر اس کو درست نہ کریں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔(ضیاء)

دراصل مسلمان کفار کی اسلام سے محرومی پر افسوس کرتے تھے اور انھیں رنج ہوتا تھا کہ کفار عناد میں مبتلا ہو کر دولت اسلام سے محروم رہے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی فرمادی کہ اس میں تمہارا کچھ ضرر نہیں، اَمْرِ بِالْمَعْرُوف وَنَہْیِ عَنِ الْمُنْکَر کا فرض ادا کرکے تم بری الذمہ ہو چکے ہو، تم اپنی نیکی کی جزا پاؤ گے۔
حضرت عبداللہ بن مبارک (رح) نے فرمایا: "اس آیت میں اَمْرِ بِالْمَعْرُوف وَنَہْیِ عَنِ الْمُنْکَر کے وجوب کی بہت تاکید کی ہے، کیونکہ اپنی فکر رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ "ایک دوسرے کی خبر گیری کرے، نیکیوں کی رغبت دلائے اور بدیوں سے روکے۔
اور مفتی احمد یار خاں نعیمی (رح) نے کتنی پیاری بات ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ ہے کہ تم اپنی فکر کرو یعنی عقائد درست کرکے، نیک اعمال کر کے اپنی فکر کرو، اعمال میں تبلیغ بھی شامل ہے لہٰذا جو قدرت کے باوجود تبلیغ نہ کرے وہ راہ پر ہی نہیں۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے بارے میں احادیث

یہاں نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا ذکر ہوا، اس کی مناسبت سے ہم یہاں نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے بارے 3 احادیث ذکر کرتے ہیں:
(1)۔۔حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے فرمایا "اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ "اور میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اسے (ظلم سے) نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلاء کر دے۔ (3)
(2)۔۔اور ایک مرتبہ آپ (رض) نے فرمایا "اے لوگو تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ "کو پڑھ کر دھوکے میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تم میں سے کوئی کہنے لگے "میں تو بس اپنی جان کی فکر کروں گا "اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم! تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے ورنہ تم پر تمہارے شریر لوگ حکمران بن جائیں گے جو تمہیں بڑی سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ دعا کریں گے بھی تو ان کی دعا قبول نہ کی جائے گی۔ (4)
(3)۔۔حضرت ابو درداء (رض) فرماتے ہیں "اے لوگو! تمہیں لازمی طور پر نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہوگا ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر ظالم حکمران مُسلَّط کر دے گا جو تمہارے بڑوں کی بزرگی کا خیال نہیں رکھے گا اور تمہارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرے گا، تمہارے نیک لوگ اس کے خلاف دعا مانگیں گے لیکن ان کی دعا قبول نہ ہوگی اور تم مدد مانگو گے لیکن تمہیں مدد نہ ملے گی۔ (صراط)

مناسبت اور شان نزول

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب مشرکین کو اللہ کے دین کی طرف بلایا جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہ طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ اور دادا کو پایا غرض! ان جاہلوں اور گمراہوں کو اسلام کی طرف بلانے کی مسلمانوں نے پوری کوشش کی۔ اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور اخروی انعامات کی ترغیب دی۔ اس کے باوجود جب ان جاہلوں نے اپنی جہالت اور گمراہی پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اے مسلمانو ! تم ان کی جہالت اور گمراہی کی پروانہ کرو اور ان کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ بلکہ تم اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے رہو اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے ' ان سے اجتناب کرتے رہو، اس لیے اس آیت میں فرمایا اے ایمان والو ! تم اپنی فکر کرو ' جب تم ہدایت پر ہو تو کسی کی گمراہی سے تمہیں کوئی ضرر نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل کتاب سے جزیہ قبول کرلیتے تھے اور عرب کے مشرکین سے جزیہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے صرف دو راستے تھے ' یا اسلام قبول کرلیں یا پھر جنگ کے لیے تیار رہیں۔ تب منافقوں نے مسلمانوں کو ملامت کی کہ تم بعض کفار سے جزیہ قبول کرتے ہو اور بعض سے قبول نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تم ہدایت پر ہو تو ان کی ملامت کی پروانہ کرو ' مسلمانوں کو اس سے بہت سخت تکلیف ہوتی تھی کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بسیار تبلیغ ' اس قدر معجزات کے مشاہدہ اور آپ کی اتنی کوششوں کے باوجود یہ کفار کفر کو نہیں چھوڑتے اور اپنی گمراہی پر ڈٹے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی ' جس کا معنی یہ ہے کہ تم ان کو مسلمان کرنے کے مکلّف نہیں ہو ' تم صرف اپنی فکر کرو ' جب تم ہدایت پر ہو تو ان کی جہالت اور گمراہی سے تمہیں کوئی ضرر نہیں ہوگا۔ (تفسیر کبیر ' ج ۳ ' ص ۴۶۱ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۳۹۸ ھ)

نجات کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ضرور ہونا

" تم اپنی فکر کرو " کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو گناہوں کے ارتکاب سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رکھو اور اپنی آخرت اور عاقبت سنوارنے کی فکر کرو۔ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ برے کام کر رہے ہیں تو کرنے دو تم صرف اپنی فکر کرو ' جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی کو نیکی کا حکم دینا یا برائی سے روکنا واجب نہیں ہے ' صرف اپنی اصلاح کرلینا کافی ہے۔ حالانکہ یہ معنی قرآن مجید اور احادیث کی دوسری نصوص کے خلاف ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسروں کو نیکی کا حکم نہیں دیتا اور برائی سے نہیں روکتا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا ' کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے ' اس لیے تم اپنی فکر کرو کا معنی یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کرو اور امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کرتے رہو ' اس کے باوجود اگر لوگ برے کاموں سے باز نہ آئیں تو تم فکر نہ کرو ' جب تم ہدایت پر ہو ' نیکی کر رہے ہو اور نیکی کا حکم دے رہے ہو ' تو کسی کی برائی سے تمہیں ضرر نہیں ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب بنو اسرائیل میں گناہ بہت بڑھ گئے تو ان کے علماء نے منع کیا ' وہ باز نہیں آئے۔ وہ علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے تو اللہ نے ان کے دل بھی ان کی طرح کردیئے اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی ' کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ٹیک لگائے ہوئے تھے ' پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا : اس ذات کی قسم جس

کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے۔ (امام ابو داؤد کی روایت میں ہے) تم ان کو ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا اور تم ظالموں کے ہاتھوں کو پکڑ لینا اور اس کو حق کے مطابق عمل پر مجبور کرنا۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۳۰۵۸ 'سنن ابو داؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۴۳۳٦ 'سنن ابن ماجہ '۲ 'رقم الحدیث : '۴۰۰٦)

قیس بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر (رض) نے اللہ کی حمد وثنا کرنے کے بعد فرمایا اے لوگو ! تم یہ آیت تلاوت کرتے ہو اے ایمان والو ! تم اپنی فکر کرو 'جب تم ہدایت پر ہو تو کسی کی گمراہی سے تمہیں کوئی ضرر نہیں ہوگا (المائدہ : ۱۰۵) اور تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو اور ہم نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے 'جب لوگ ظالم کو دیکھیں 'اور اس کے ہاتھوں کو نہ پکڑیں تو اللہ ان سب پر عذاب لے آئے گا اور ھیثم کی روایت میں ہے جس کسی قوم میں گناہوں پر عمل کیا جاتا ہے اور وہ ان گناہوں کو مٹانے پر قادر ہوں پھر نہ مٹائیں تو عنقریب اللہ ان سب پر عذاب لے آئے گا۔ (سنن ابو داؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۴۳۳۸ 'سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۳۰٦۸ 'سنن کبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث : '۱۱۱۵۷ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۴۰۰۵)

المائدہ : ۷۹۔ ۷۸ کی تفسیر میں ہم نے اس سلسلہ میں بہت احادیث پیش کی ہیں۔ (تبیان)

ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے لیکن اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ لوگ اپنی خواہشات کے غلام بن جائیں اور داعی کے لیے مشکلات اور خطرات پیدا کردیں تو پھر داعی کے لیے گنجائش ہے کہ وہ اپنی فکر کرے اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

" نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو حتیٰ کہ جب تم یہ دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جارہی ہے، خواہش کی پیروی کی جارہی ہے، دنیا کو ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر اترا رہا ہے تو پھر تم اپنی جان کی فکر کرو اور عام لوگوں کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ "

(ترمذی : حدیث نمبر 3058) (امداد)

ہدایت ایسا گراں قدر سرمایہ ہے جو چاہت اور محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اگر یہ لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں تو ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب سب کے سب بے چون وچرا رب کبریا کی بارگاہ میں حاضر کیے جائیں گے۔ وہ انھیں ایک ایک پل کی خبر اور ہر برے عمل کی سزا دے گا۔ وہاں انھیں نہ بڑے بچا سکیں گے اور نہ ہی ان کے آباؤاجداد چھڑا سکیں گے۔ بعض لوگ اس آیت سے غلط استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمی کو کسی دوسرے کی فکر کرنے کے بجائے اپنا خیال اور اپنے کام کی طرف دھیان رکھنا چاہیے۔ اس کی بلا سے کوئی جو چاہے کرتا رہے۔ ایسے نام نہاد دانشور تمام احکامات کو جان بوجھ کر فراموش کردیتے ہیں جن میں ہر شخص کو اپنے متعلقین کا مسؤل بنایا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس امت کے وجود کی ہی نفی کردیتے ہیں حالانکہ اس امت کا مقصد اپنی اور لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔

(كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ) [آل عمران : ۱۱۰]

" (اے مسلمانو !) تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں (کی اصلاح وہدایت) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو بھلے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ لوگ مومن ہیں مگر ان کی اکثریت فاسق ہے۔ "

(عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ (رض) سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ)

[رواہ مسلم : کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان وان الایمان۔۔ الخ]

"حضرت طارق بن شہاب (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو کوئی تم میں سے برائی دیکھے اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ساتھ روکے اگر وہ اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ دل سے برا جانے۔ یہ ضعیف ایمان کی نشانی ہے۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ (رض) يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْءُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ) [رواہ البخاری : کتاب الجمعۃ، باب جمعۃ فی القری والمدن]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور وہ اپنی ذمہ داری کا جواب دہ ہے۔" (فہم)

مسائل

۱۔ دوسروں کے بجائے اپنی فکر مقدم ہونی چاہیے۔

۲۔ حقیقی ہدایت یافتہ لوگوں کو کوئی بھی گمراہ نہیں کر سکتا۔

۳۔ تمام لوگوں کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔

۴۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اس کے اچھے برے اعمال کی جزا اور سزا دے گا۔

آیت مبارکہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

لغۃ القرآن: [يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ : اے وہ لوگو][اٰمَنُوْا : جو ایمان لائے][شَهَادَةُ : گواہی][بَيْنِكُمْ : تمہارے درمیان][اِذَا : جب][حَضَرَ : حاضر ہو][اَحَدَكُمُ : ایک تم سے][الْمَوْتُ : موت][حِيْنَ : جب][الْوَصِيَّةِ : وصیت][اثْنٰنِ : دو][ذَوَا عَدْلٍ : عدل والے][مِّنْكُمْ : تم سے][اَوْ اٰخَرٰنِ : یا دوسرے][مِنْ : سے][غَيْرِكُمْ : تمہارے علاوہ][اِنْ اَنْتُمْ : اگر ہو تم][ضَرَبْتُمْ : تم چلو][فِي الْاَرْضِ : میں زمین][فَاَصَابَتْكُمْ : پھر پہنچے تم کو][مُّصِيْبَةُ : مصیبت][الْمَوْتِ : موت][تَحْبِسُوْنَهُمَا : تم روک لودونوں کو][مِنْۢ: سے][بَعْدِ : بعد][الصَّلٰوةِ : نماز][فَيُقْسِمٰنِ : پھر وہ دونوں قسمیں اٹھائیں][بِاللّٰهِ : اللہ کی][اِنِ : اگر][ارْتَبْتُمْ : تم شک کرو][لَا نَشْتَرِيْ : نہیں بیچتے ہم][بِهٖ : اسکے ساتھ][ثَمَنًا : قیمت][وَّلَوْ : اور اگرچہ][كَانَ : ہوں][ذَا قُرْبٰى : قریبی رشتہ دار][وَلَا : اور نہیں][نَكْتُمُ : ہم چھپاتے][شَهَادَةَ : گواہی][ۙاللّٰهِ : اللہ کی][اِنَّآ : بیشک ہم][اِذًا لَّمِنَ : اس وقت سے][الْاٰثِمِيْنَ : گناہ گار (جمع)]

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کی موت آئے تو وصیت کرتے وقت تمہارے درمیان گواہی (کے لئے) تم میں سے دو عادل شخص ہوں یا تمہارے غیروں میں سے (کوئی) دوسرے دو شخص ہوں اگر تم ملک میں سفر کر رہے ہو پھر (اسی حال میں) تمہیں موت کی مصیبت آ پہنچے تو تم ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو، اگر تمہیں (ان پر) شک گزرے تو وہ دونوں اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہم اس کے عوض کوئی قیمت حاصل نہیں کریں گے خواہ کوئی (کتنا ہی) قرابت دار ہو اور نہ ہم اللہ کی (مقرر کردہ) گواہی کو چھپائیں گے (اگر چھپائیں تو) ہم اسی وقت گناہ گاروں میں ہو جائیں گے

تشریح:

شانِ نزول

آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ مہاجرین میں سے ایک صاحب جن کا نام بُدَیْلُ تھا وہ تجارت کے ارادے سے دو عیسائیوں کے ساتھ ملک شام کی طرف روانہ ہوئے۔ اُن عیسائیوں میں سے ایک کا نام تمیم بن اَوْس داری تھا اور دوسرے کا عدی بن بداء۔ شام پہنچتے ہی بُدَیْلُ بیمار ہو گئے اور انھوں نے اپنے تمام سامان کی ایک فہرست لکھ کر سامان میں ڈال دی اور ہمراہیوں کو اس کی اطلاع نہ دی۔ جب مرض کی شدت ہوئی تو بدیل نے تمیم اور عدی دونوں کو وصیت کی کہ ان کا تمام سرمایہ مدینہ شریف پہنچ کر ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ پھر بُدَیْلُ کی وفات ہو گئی ان دونوں نے ان کی موت کے بعد ان کا سامان دیکھا تو اس میں ایک چاندی کا جام تھا جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا، اس میں تین سو مثقال چاندی تھی، بُدَیْلُ یہ جام بادشاہ کو نذر کرنے کے قصد سے لائے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے دونوں ساتھیوں نے اس جام کو غائب کر دیا اور اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد جب یہ لوگ مدینہ طیبہ پہنچے تو انھوں نے بُدَیْلُ کا سامان ان کے گھر والوں کے سپرد کر دیا، سامان کھولنے پر فہرست ان کے ہاتھ آ گئی جس میں تمام سامان کی تفصیل تھی۔ سامان کو اس فہرست کے مطابق کیا لیکن جام نہ ملا۔ اب وہ تمیم اور عدی کے پاس پہنچے اور انھوں نے دریافت کیا کہ کیا بدیل نے کچھ سامان بیچا بھی تھا؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ گھر والوں نے پوچھا کہ کیا کوئی تجارتی معاملہ کیا تھا؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر گھر والوں نے دریافت کیا کہ کیا بُدَیْلُ بہت عرصہ بیمار رہے اور انھوں نے اپنے علاج میں کچھ خرچ کیا تھا؟ انھوں نے کہا "نہیں"۔ وہ تو شہر پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اس پر ان لوگوں نے کہا کہ ان کے سامان میں ایک فہرست ملی ہے اس میں چاندی کا ایک جام سونے سے مُنَقَّش کیا ہوا جس میں تین سو مثقال چاندی ہے یہ بھی لکھا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہے۔ تمیم و عدی نے کہا، ہمیں نہیں معلوم، ہمیں تو جو وصیت کی تھی اس کے مطابق سامان ہم نے تمہیں دے دیا، جام کی ہمیں خبر بھی نہیں۔ یہ مقدمہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں پیش ہوا۔ تمیم و عدی وہاں بھی انکار پر جمے رہے اور قسم کھالی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کی روایت میں ہے کہ پھر وہ جام مکہ مکرمہ میں پکڑا گیا، جس شخص کے پاس تھا اس نے کہا کہ میں نے یہ جام تمیم وعدی سے خریدا ہے۔ جام کے مالک کے گھر والوں میں سے دو شخصوں نے کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ قبول کی جانے کی مستحق ہے، یہ جام ہمارے فوت ہونے والے شخص کا ہے اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت میں یہ حکم فرمایا گیا کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے اور زندگی کی امید نہ رہے، موت کے آثار وعلامات ظاہر ہوں تو اپنوں میں سے دو آدمیوں کو وصیت کا گواہ بنالو اور سفر وغیرہ میں ہو اور اپنے آدمی یعنی مسلمان نہ ملیں تو غیر مسلموں کو گواہ بنالو۔

{ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنۡ وَسَلّمَ کے بَعْدِ الصَّلٰوۃِ: تم ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لو۔ } اس سے پہلے وصیت پر گواہ بنانے کا طریقہ بتایا گیا اب قرائن اور علامات کی روشنی میں گواہی میں جھوٹ کا عنصر نمایاں ہوتا نظر آئے تو اس صورت میں گواہی لینے کا طریقہ بتایا گیا کہ جب میت کے ورثا کو وصیت کی گواہی میں شک گزرے تو وہ عصر کی نماز کے بعد گواہوں سے اس طرح گواہی لیں: دونوں گواہ یہ اقرار کرتے ہوئے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم کھائیں کہ ہم گواہی کے بدلے کسی سے کوئی مال نہ لیں گے اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم گواہی چھپائیں گے یعنی جھوٹی قسم نہ کھائیں گے اور نہ کسی کی خاطر ایسا کریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو اس وقت ہم ضرور گنہگاروں میں سے ہوں گے۔ آیت میں نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ سب لوگ چاہے ان کا تعلق کسی بھی دین اور مذہب سے ہو اس وقت کی تعظیم کرتے تھے اور اس وقت میں جھوٹی قسم کھانے سے بچتے تھے۔ (صراط)

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ هِلَالَ بْنَ أُمَيَّةَ قَذَفَ امْرَأَتَهُ فَجَاءَ فَشَهِدَ وَالنَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ أَنَّ أَحَدَكُمَا كَاذِبٌ فَهَلْ مِنْكُمَا تَائِبٌ ثُمَّ قَامَتْ فَشَهِدَتْ)

[رواہ البخاری: کتاب الطلاق، باب یبدء الرجل بالتلاعن]

”حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہ (رض) نے اپنی بیوی پر الزام لگایا تو وہ آئے اور گواہی دی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو توبہ کرے؟ پھر وہ عورت کھڑی ہوئی اور اس نے گواہی دی۔“

(عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ الْكَبَائِرُ الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِينُ الْغَمُوسُ)

[رواہ البخاری: کتاب الایمان والنذور، باب یمین الغموس]

”عبداللہ بن عمرو (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم اٹھانا کبیرہ گناہوں میں سے ہیں۔“

(عَنْ عَبْدِاللّٰهِ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ، هُوَ عَلَيْهَا فَاجِرٌ، لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى (إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلاً) الآيَةَ)

[رواہ البخاری: باب الخصومۃ]

"حضرت عبداللہ (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا جو آدمی کسی کا مال بٹورنے کے لیے قسم اٹھاتا ہے اور وہ اس میں جھوٹا ہے۔ وہ اللہ کو اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (بے شک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور قسموں کے عوض تھوڑی قیمت وصول کرتے ہیں)" (فہم)

ان تین آیات کو اعراب، معنی اور حکم کے اعتبار سے قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں شمار کیا گیا ہے۔ (تفسیر قرطبیؒ) ان آیات سے درج ذیل احکام کی نشاندہی ہوتی ہے:

1۔ جب کسی مسلمان کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیت کرنا چاہیے تو وہ دو قابل اعتبار مسلمان گواہوں کی موجودگی میں وصیت کرے تاکہ بعد میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

2۔ اگر سفر کی حالت میں کسی مسلمان کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیت کرنا چاہے تو وہ بھی دو قابل اعتبار مسلمان گواہوں کی موجودگی میں وصیت کرے لیکن پردیس میں اگر مسلمان گواہ دستیاب نہ ہوں تو غیر مسلم گواہوں کے سامنے بھی وصیت کرسکتا ہے۔ اگرچہ مسلمان کے خلاف کافر کی گواہی قبول نہیں لیکن بعض فقہاء کے نزدیک پردیس میں وصیت کے لیے کافر کو گواہ بنایا جاسکتا ہے جب کہ کوئی مسلمان گواہ دستیاب نہ ہوسکے۔

3۔ اگر میت کے وارثوں کو گواہوں پر خیانت کا شبہ پڑجائے اور وہ خیانت کے منکر ہوں تو ان دونوں گواہوں سے نماز کے بعد مسجد میں لوگوں کے سامنے قسم لی جائے جس میں وہ دونوں گواہ اقرار کریں کہ وہ رشوت کا مال لے کر جھوٹی گواہی نہیں دیں گے اور نہ کسی رشتہ دار کی وجہ سے حق بات کو چھپائیں گے بلکہ ہر صورت میں سچی گواہی دیں گے۔ اس صورت میں وارث مدعی ہیں اور گواہ منکر ہیں اس لیے ان سے قسم لی جارہی ہے کیونکہ اسلام میں مدعی گواہ پیش نہ کرسکے تو منکر سے قسم لی جاتی ہے۔

4۔ بعد میں اگر ثابت ہوجائے کہ گواہوں نے جھوٹی قسم کھا کر وارثوں کے بعض مال پر ناجائز قبضہ کرلیا اور دعویٰ یہ کیا کہ ان کا قبضہ درست ہے (جیسا کہ تمیم اور عدی نے بدیل (رض) کے پیالے پر ناجائز قبضہ کرلیا اور پھر خریدنے کا جھوٹا دعویٰ کردیا) ایسی صورت میں جھوٹے دعویداروں سے گواہ طلب کئے جائیں گے اور گواہ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں میت کے وارث ان کے دعویٰ کے خلاف قسم اٹھائیں گے اور ان کی قسم سے سابق گواہوں کی جھوٹی قسمیں مسترد کردی جائیں گی اور وارثوں کی قسم کے مطابق فیصلہ صادر کردیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں جھوٹے گواہ مالک ہونے کے مدعی تھے اور وارث ان کے دعویٰ کے منکر تھے اس لیے وارثوں سے قسم لی گئی۔ (امداد)

سفر میں وصیت پر اہل کتاب کو گواہ بنانے کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں بنو سہم (عاص بن وائل سہمی کے قبیلہ) میں سے ایک شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ (سفر میں) گیا۔ سہمی ایسی جگہ میں فوت ہوگیا جہاں کوئی مسلمان نہیں تھا ' جب وہ دونوں سہمی کا ترکہ لے کر آئے تو اس کے ورثاء نے اس میں چاندی کا پیالہ گم پایا جس میں سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے حلف لیا ' پھر وہ پیالہ مکہ میں پایا گیا اور ان لوگوں نے کہا ہم نے یہ پیالہ تمیم اور عدی سے خریدا ہے ' پھر سہمی کے ورثاء میں سے دو شخصوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہماری شہادت ان کی شہادت

سے زیادہ برحق ہے اور یہ پیالہ ان کے ساتھی کا ہے اور انھیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے۔ (المائدہ : ۱۰۸۔۱۰۶) (صحیح البخاری ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۲۷۸۰ ' سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۶۰۶ ')

حضرت ابن عباس (رض) اس آیت (المائدہ : ۱۰۶) کے متعلق تمیم داری سے روایت کرتے ہیں ' تمیم داری نے کہا وہ اور عدی بن بداء دونوں نصرانی تھے ' اور اسلام لانے سے پہلے شام کا سفر کرتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ دونوں تجارت کے لیے شام روانہ ہوئے ' تو ان کے پاس بنو سہم کے آزاد شدہ غلام بھی تجارت کے مقصد سے آئے ' ان کا نام بدیل بن ابی مریم تھا ' ان کے پاس چاندی کا ایک پیالہ تھا ' وہ اس کو بادشاہ کے پاس لے جانا چاہتے تھے ' وہ راستہ میں بیمار ہوگئے۔ انھوں نے ہم دونوں کو وصیت کی اور یہ کہا : ان کا ترکہ ان کے اہل کو پہنچادیں۔ تمیم نے کہا جب وہ فوت ہوگئے تو ہم نے اس پیالہ پر قبضہ کرلیا ' اس کو ہم نے ایک ہزار درہم میں فروخت کردیا۔ پھر میں نے اور عدی بن بداء نے اس رقم کو آپس میں تقسیم کرلیا ' جب ہم بدیل سہمی کے گھر پہنچے تو اس کا باقی ترکہ جو ہمارے پاس تھا ' وہ ہم نے اس کے گھر والوں کو دے دیا ' انھوں نے اس ترکہ میں پیالہ کو گم پایا ' تو ہم سے اس متعلق سوال کیا۔ ہم نے کہا اس نے اس کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا تھا ' اور نہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہمیں دی تھی۔

تمیم نے کہا جب میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ تشریف لانے کے بعد مسلمان ہوگیا ' تو میں نے اس فعل میں گناہ جانا ' میں ان کے گھر گیا اور ان کو اصل واقعہ کی خبر دی ' اور ان کو پانچ سو درہم واپس کردیئے ' اور ان کو بتایا کہ میرے ساتھی کے پاس بھی اتنے درہم ہیں۔ وہ اس (عدی بن بداء) کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لائے ' آپ نے سہمی کے ورثاء سے گواہ طلب کیے ' ان کے پاس گواہ نہیں تھے۔ پھر آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ عدی بن بداء سے قسم طلب کریں جو ان کے دین میں سب سے بڑی قسم ہو ' اس نے قسم کھالی ' تب یہ آیت نازل ہوئی (المائدہ : ۱۰۸۔ ۱۰۲) پھر عمرو بن العاص اور ایک اور شخص نے (ورثاء سہمی کے موقف پر اور عدی کے خلاف) قسم کھائی تو عدی بن بداء سے سو درھم وصول کیے گئے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۳۰۷۰ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

سفر میں وصیت کرنے اور غیر مسلموں کو گواہ بنانے کے جواز پر امام احمد کے دلائل

ان آیتوں میں سفر اور حضر میں وصیت کرنے پر ترغیب دی گئی ہے ' وصیت کے ثبوت اور اس کو نافذ کرنے کے لیے گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل میں مسلمان گواہوں کو مقرر کرنا چاہیے ' اور یہ کہ ضرورت یا حاجت کے پیش نظر غیر مسلموں کو بھی گواہ بنایا جاسکتا ہے اس آیت میں فرمایا ہے تم میں سے دو شخص گواہ ہوں اس کا معنی ہے تمہارے دین اور تمہاری ملت سے دو گواہ ہوں یہ حضرت ابن مسعود ' حضرت ابن عباس ' سعید بن مسیب ' سعید بن جبیر ' شریح ' ابن سیرین اور شعبی کا قول ہے۔ امام احمد کا بھی یہی مختار ہے۔ پھر فرمایا ہے اور سفر میں غیروں میں سے ہی دو گواہ بنا لیے جائیں حضرت ابن مسعود ' حضرت عباس اور دیگر مذکور الصدر فقہاء تابعین کے نزدیک اس سے مراد ہے جو لوگ تمہارے دین اور تمہاری ملت کے غیر ہوں ' یعنی اہل کتاب میں سے ہوں ' اور حسن اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے اقرباء اور رشتہ داروں کے غیر ہوں۔

جب یہ مراد لی جائے کہ غیروں سے مراد غیر مسلم اور اہل کتاب ہیں اور یہ کہ سفر میں وصیت پر اہل کتاب کو گواہ بنالیا جائے ' تو پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت محکمہ اور غیر منسوخ ہے یا یہ کہ اب یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے یا یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) ابن المسیب ' ابن جبیر ' ابن سیرین ' قتادہ ' شعبی ' ثوری اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محکمہ اور اب بھی اہل کتاب کو سفر میں وصیت پر گواہ بنانا جائز ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہوئی :

(آیت) " واشھدوا ذوی عدل منکم "۔ (الطلاق : ۲)

ترجمہ : اور اپنوں (یعنی مسلمانوں) میں سے دو نیک شخصوں کو گواہ بناؤ۔

زید بن اسلم ' امام مالک اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ کا بھی اسی طرح میلان ہے " انھوں نے کہا کہ اہل کفر عادل (نیک) نہیں ہیں اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے ' کیونکہ یہ حاجت اور ضرورت کا مقام ہے اور ایسے مواقع پر صرف عورتوں کی گواہی بھی صحیح ہوتی ہے۔ جیسے حیض ' نفاس اور بچے کی پیدائش میں عورتوں کی گواہی صحیح ہوتی ہے۔ (زادالمیسر ج ۲ ص ' ۷ ۴۴۔ ۴۴۶ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۴۰۷ ھ)

سفر میں وصیت پر غیر مسلموں کو گواہ بنانے کے عدم جواز پر جمہور فقہاء کے دلائل :

جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمانوں کے معاملات میں کفار کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے ' اور اس آیت میں جو غیروں کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے ' اس آیت میں غیروں سے مراد غیر مسلم ہو تو پھر یہ آیت " واشھدوا ذوی عدل منکم "۔ سے منسوخ ہے اور یا اس آیت سے منسوخ ہے :

(آیت) " واستشھدوا شھیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامراتن ممن ترضون من الشھدآء "۔ (البقرہ : ۲۸۲)

ترجمہ : اور اپنے (مسلمان) مردوں میں سے دو گواہ بنالو ' اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔

اور ظاہر ہے کہ ذمی یا اہل کتاب شرعا پسندیدہ ہیں ' سو یہ آیت سورة مائدہ کی زیر تفسیر آیت کے لیے ناسخ ہے۔ اور ماضی میں مسلمانوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اہل کتاب کو سفر میں وصیت پر گواہ بنانے کی اجازت دی گئی ' کیونکہ اس وقت مسلمان صرف مدینہ میں تھے اور آج کے دور میں تو ہر جگہ مسلمان موجود ہیں ' اس لیے کفار کی شہادت ساقط ہوجائے گی ' اس لیے اب مسلمانوں کا کافروں کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ شریح سے روایت کیا ہے کہ یہود و نصاری کی صرف سفر میں وصیت پر گواہ بنانا جائز ہے ' اور کسی موقع پر جائز نہیں ہے۔ (جامع البیان ' ج ۷ ' ص ۱۴۲) امام احمد بن حنبل سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور وہ اس میں منفرد ہیں۔ ائمہ ثلاثہ نے ان سے اختلاف کیا ہے ' انھوں نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اہل ذمہ کی گواہی جائز نہیں ہے۔ (جامع البیان ' ج ۷ ' ص ۱۴۴) اور امام طحاوی نے ابو داؤد سے روایت کیا ہے کہ ایک مسلمان شخص دقوقا میں فوت ہوگیا اور اس کو مسلمانوں میں سے کوئی شخص نہیں ملا جس کو وہ اپنی وصیت پر گواہ بناتا ' تو اس نے دو اہل کتاب عیسائیوں کو گواہ بنالیا ' وہ دونوں کوفہ میں حضرت ابو موسیٰ کے پاس آئے ' حضرت ابو موسیٰ نے کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد کے بعد اس طرح نہیں ہوتا تھا ' پھر عصر کے بعد ان دونوں سے حلف لیا کہ انھوں نے خیانت کی ہے ' نہ جھوٹ بولا ہے نہ وصیت میں کوئی تبدیلی کی ہے ' پھر ان کی شہادت کو نافذ کردیا۔ (سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۶۰۵ ' جامع البیان ' جزء ۷ ' ص ۱۴۳) امام طحاوی نے کہا یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اور حضرت ابن عباس (رض) کے نزدیک یہ آیت محکمہ (غیر منسوخ) تھی اور میرے علم کے مطابق صحابہ میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی ہے ' اور اکثر فقہاء تابعین کا بھی یہی نظریہ ہے ' اور نحاس نے ذکر کیا ہے کہ جو فقہاء یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور کسی حال میں کافر کی شہادت جائز نہیں ہے ' جس طرح فاسق کی شہادت جائز نہیں ہے۔ وہ زید بن اسلم

'امام شافعی اور نعمان (امام ابو حنیفہ) ہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہ نے کافروں کی ایک دوسرے کی خلاف شہادت کو جائز کہا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۴ 'ص ۴۷ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ھ)

اہل ذمہ کی آپس میں گواہی کے جواز پر امام ابو حنیفہ کے دلائل

امام ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ کافروں کی ایک دوسرے کے خلاف گواہی جائز ہے 'اور مسلمانوں کے خلاف ان کی گواہی جائز نہیں ہے 'کیونکہ شہادت کی تمام آیات اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے مسلمانوں کے متعلق ہیں 'اور کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے متعلق قبول کی جائے گی۔ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "والذین کفروا بعضھم اولیآء بعض"۔ (الانفال: ۷۳)

ترجمہ: اور کافر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

قرآن مجید نے کافروں کی ایک دوسرے پر ولایت ثابت کی ہے اور ولایت شہادت سے اعلی درجہ ہے اور حدیث میں بھی اہل کتاب کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت کا ثبوت ہے۔

حضرت جابر جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ یہود ایک مرد اور عورت کو لے کر آئے 'جنہوں نے زنا کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تم میرے پاس ایسے مردوں کو لے کر آؤ جو تمہارے سب سے بڑے عالم ہوں 'وہ صوریا کے دو بیٹوں کو لے کر آئے آپ نے ان کو قسم دی کہ یہ بتاؤ کے توراۃ میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا توراۃ میں یہ مذکور ہے کہ جب چار آدمی یہ گواہی دیں کہ انھوں نے مرد کے آلہ کو عورت کے اندام نہانی میں اس طرح دیکھا ہے جس طرح سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے تو ان دونوں کو رجم کر دیا جائے گا 'آپ نے فرمایا پھر تم کو انھیں رجم کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ انھوں نے کہا ہماری سلطنت (اقتدار) چلی گئی 'تو پھر ہم نے قتل کرنے کو ناپسند جانا 'پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گواہوں کو بلایا 'سو چار گواہ آئے اور انھوں نے یہ شہادت دی کہ انھوں نے اس مرد کے آلہ کو اس عورت کے اندام نہانی میں اس طرح دیکھا ہے 'جس طرح سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے 'تب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو رجم (سنگسار) کرنے کا حکم دیا۔ (سنن ابو داؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۴۴۵۳ 'سنن دار قطنی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۴۳۰۵)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ اہل کتاب کی اہل کتاب کے خلاف شہادت جائز ہے 'ایک اور حدیث سے بھی یہ بات مفہوم نکلتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک ملت والے دوسری ملت والوں کے وارث نہیں ہوتے اور ایک ملت والوں کی دوسری ملت والوں کے خلاف شہادت جائز نہیں ہے۔ ماسوا میری امت کے 'کیونکہ ان کی شہادت دوسروں کے خلاف جائز ہے۔ (سنن دار قطنی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۶۸ 'المعجم المعجم الاوسط للطبرانی 'ج ٦ 'رقم الحدیث: ۵۴۳۰ 'مجمع الزوائد 'ج ۴ 'ص ۲۰۱)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ملت کے افراد کی اپنی ملت والوں کے خلاف شہادت جائز ہے۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی ۵۹۳ لکھتے ہیں:

اہل ذمہ کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت قبول کی جائے گی 'خواہ ان کی ملتیں مختلف ہوں۔ (مثلا یہود کی گواہی نصاری کے خلاف مقبول ہوگی) امام مالک اور امام شافعی نے کہا ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی 'کیونکہ یہ فاسق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "(آیت) "والکافرون ھم الفاسقون"۔

(قرآن مجید میں یہ آیت نہیں ہے ' یہ صاحب ہدایہ کا تسامح ہے۔البتہ اس معنی میں یہ آیت ہے (آیت) "ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون "۔ (النور: ۵۵)

اس لیے ان کی خبر پر توقف کرنا واجب ہے 'اسی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف ان کی گواہی قبول نہیں کی جاتی اور وہ بمنزلہ مرتد ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصاری کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ نیز ان کو اپنے اوپر اور اپنے چھوٹے بچوں کے اوپر ولایت حاصل ہے۔ لہذا ان کو اس کی جنس پر شہادت کا حق بھی حاصل ہوگا 'اور فسق اعتقادی شہادت کو قبول کرنے سے مانع نہیں ہے 'کیونکہ وہ اپنے دین میں جس چیز کو حرام اعتقاد کرتے ہیں 'اس سے اجتناب کرتے ہیں اور جھوٹ بولنا تمام ادیان میں حرام ہے۔ اس لیے وہ جھوٹی گواہی نہیں دیں گے اور ان کو مرتد پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے 'کیونکہ مرتد کو کسی پر بھی ولایت حاصل نہیں ہوتی 'اور ذمیوں کی گواہی مسلمانوں کے خلاف اس لیے مقبول نہیں ہے 'کہ ذمیوں کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

(آیت) "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا"۔ (النساء: ۱۴۱)

اور اللہ کافروں کے لیے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کا کوئی راستہ ہرگز نہیں بنائے گا۔

اور چونکہ کافر مسلمان سے دشمنی رکھتا ہے اور دار اسلام میں اس سے مغلوب ہے 'اس لیے وہ اس پر غلبہ پانے کے لیے جھوٹ بولے گا اور کفر کی ملتیں ہرچند کہ مختلف ہیں 'لیکن دار اسلام میں وہ ایک دوسرے سے مغلوب نہیں ہیں 'اس لیے ان میں باہم دشمنی نہیں ہوگی 'جو ان کو جھوٹی گواہی پر اکسائے اور حربی مستامن (جو کافر پاسپورٹ لے کر ہمارے ملک میں آئے) کی گواہی ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی اور جو کافر الگ الگ ملکوں میں رہتے ہیں 'ان کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی۔ (ہدایہ اخیرین 'ص ۱۶۳ 'مطبوعہ شرکت علمیہ 'ملتان)

اور اس سے پہلے جو ہم نے حدیث ذکر کی ہے کہ ایک ملت والوں کی دوسری ملت والوں کے خلاف قبول نہیں ہوگی اس سے مراد دو مختلف ملکوں میں رہنے والے کافر ہیں 'اور جو مختلف ملتوں والے ایک ملک کے کافر ہمارے ملک میں پاسپورٹ لے کر آئیں 'ان کی گواہی ایک دوسرے خلاف قبول کی جائے گی 'کیونکہ یہاں وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں ہیں اور ان میں باہم دشمنی نہیں ہے 'جو ان کو ایک دوسرے کے خلاف جھوٹی گواہی پر ابھارے۔ البتہ! مستامن کی شہادت ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی اور نہ مختلف ملکوں میں رہنے والے کافروں کی شہادت ایک دوسرے کے خلاف قبول کی جائے گی۔ (ہدایہ اخیرین 'ص ۱۶۳)

امام ابوحنیفہ کے استدلال پر علامہ قرطبی کے اعتراض کا جواب

فقہاء مالکیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اہل ذمہ کی شہادت مطلقا مقبول نہیں ہے 'مسلمان کے خلاف 'نہ اہل کتاب کے خلاف۔ اس لیے علامہ محمد بن احمد مالک قرطبی ۶۶۸ ھ فقہاء احناف کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ نے اس آیت (المائدہ: ۱۰۸۔ ۱۰۶) سے یہ استدلال کیا ہے کہ اہل ذمہ کی آپس میں شہادت جائز ہے کیونکہ "اواخران من غیر کم" کا معنی ہے "یا ان کو گواہ بناؤ جو دین میں تمہارے غیر ہیں" اور جب اہل ذمہ کو مسلمان گواہ بنا سکتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو بطریق اولی گواہ بنا سکتے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تمہارے نزدیک تو مسلمانوں کا اہل ذمہ کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے اور تمہارے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے ' اس لیے تمہارا یہ استدلال جائز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عبارت النص سے اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل ذمہ کو مسلمانوں کے خلاف گواہ بنانا جائز ہے اور بہ طریق تنبیہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل کتاب کی آپس میں گواہی بھی جائز ہے 'کیونکہ جب ان کی شہادت مسلمانوں

کے خلاف جائز ہے تو اپنی ملت والوں کے خلاف بہ طریق اولی جائز ہوگی۔ پھر جب دوسرے دلائل سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے خلاف ان کی شہادت باطل ہے 'تو آپس میں ان کی شہادت کا جواز اپنے حال پر باقی رہا 'لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے 'کیونکہ اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کا جائز ہونا اس مسئلہ کی فرع ہے کہ اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت جائز ہونا اس مسئلہ کی فرع ہے کہ اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت جائز ہو اور جب اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت باطل ہوگی جو اصل تھی 'تو جو اس کی فرع ہے یعنی اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کا جواز وہ بہ طریق اولی باطل ہو جائے گا۔ (الجامع لاحکام القرآن 'ج ٦ 'ص ٢٧٠۔٢٦٩ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '١٤١٥ھ)

علامہ قرطبی کی اس عالمانہ بحث کی متانت سے ہمیں انکار نہیں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کے جواز پر اس آیت سے استدلال نہیں کیا 'بلکہ ان کا استدلال اس آیت سے (آیت) "والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض"۔ (الانفال : ٧٣) یہ آیت اور اس کے علاوہ دو حدیثیں جن سے امام اعظم نے استدلال کیا ہے 'ہم اس سے متصل پہلے عنوان میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ذمہ آپس میں خرید و فروخت کرتے ہیں 'اجرت اور قرض کا لین دین کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے ساتھ زیادتی بھی کرتا ہے۔ مثلا قتل کرتا ہے یا زخمی کرتا ہے اور ان میں دیگر جرائم بھی ہوتے ہیں اور باہمی تنازعات بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ اپنے مقدمات مسلمان حاکموں کے پاس لے جاتے ہیں 'اگر ان کے معاملات 'جرائم اور تنازعات میں ان کی اپنی شہادت قبول نہ ہو تو ان کے حقوق معطل ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک میں ان کو انصاف نہیں مل سکے گا اور ظلم اور فساد کا غلبہ ہوگا 'اور یہ اسلام کے منشاء کے خلاف ہے 'اس لیے ضرورت کا یہ تقاضا ہے کہ دارالاسلام میں اہل ذمہ میں ایک دوسرے کے متعلق شہادت کو قبول کیا جائے۔ اور اس مسئلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہ کا موقف ہی قرآن مجید 'احادیث اور عقل سلیم کے مطابق ہے۔

ناگزیر صورت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کا جواز

بعض اوقات سفر میں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسلمان کو وصیت کے وقت کوئی مسلمان گواہ میسر نہ ہو 'تو اب اگر مسلمانوں کے معاملات میں اہل کتاب کی شہادت بالکل میسر نہ ہو تو بعض مواقع پر مسلمانوں کے حقوق معطل ہو جائیں گے۔ اس لیے جہاں ایسی صورت ہو وہاں کسی غیر مسلم سے اس کے مذہب کے مطابق قسم لے کر امام احمد بن حنبل کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے 'اس کو گواہ بنا لیا جائے 'تو اس کی گنجائش ہے 'کیونکہ اس آیت کا منسوخ ہونا متفق علیہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس 'ابن المسیب 'ابن جبیر 'ابن سیرین 'قتادہ شعبی 'ثوری اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محکمہ ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی ایسی صورت میں کسی غیر مسلم کو اس کے مطابق قسم لے کر گواہ بنا لیا جائے 'تو یہ ظاہر قرآن کے بھی مطابق ہے اور اس میں آسانی ہے اور مسلمانوں کے حقوق کا بھی تحفظ ہے۔

شک اور شبہ کی بناء پر ملزم یا متہم کو قید میں رکھنے کا جواز

اس آیت میں فرمایا ہے:

اگر تمہیں ان پر شک ہو تو تم ان دو گواہوں کو نماز کے بعد روک لو۔

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جس شخص پر کسی قسم کا شبہ ہو اس کو روکنا اور قید کرنا جائز ہے۔

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں :
بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو تہمت کی بنا پر قید کر لیا۔ امام ترمذی کی روایت میں ہے 'بعد میں اس کو رہا کر دیا۔ (سنن ابو داؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۶۳۰ 'سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۴۲۲ 'سنن نسائی 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۴۸۹۱)
علامہ احمد بن محمد خطابی متوفی ۳۸۸ھ لکھتے ہیں :
قید کرنے کی دو قسمیں ہیں۔ بطور سزا کے قید کرنا اور بطور تفتیش کے قید کرنا اور بطور سزا کے اس وقت قید کیا جائے گا جب اس پر کوئی حق واجب ہو گا یا جرم ثابت ہو گا 'اور جس شخص کو تہمت کی بناء پر قید کیا جائے گا تو اس کی تفتیش کیا جائے گی اور حدیث میں ہے 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو دن کے تھوڑے وقت کے لیے قید کیا 'پھر اس کو رہا کر دیا۔ (معالم السنن مع مختصر سنن ابو داؤد 'ج ۵ 'ص ۲۳۷ 'مطبوعہ دارالمعرفہ 'بیروت)
نیز امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں :
عبداللہ حزاری بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ کلاعیین کے لوگوں کی چوری ہو گئی 'انھوں نے حاکہ کے کچھ لوگوں پر چوری کی تہمت لگائی 'وہ لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابی حضرت نعمان بن بشیر (رض) کے پاس گئے 'حضرت نعمان نے حاکہ کے لوگوں کو چند روز قید رکھا 'پھر ان کو رہا کر دیا۔ کلاعیین حضرت نعمان کے پاس گئے اور کہا 'آپ نے ان لوگوں کو بغیر مارے پیٹے اور بغیر امتحان لیے رہا کر دیا۔ حضرت نعمان (رض) نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں ان کو مار لگاؤں 'پھر اگر تمہارا سامان نکل آیا تو فبھا 'ورنہ میں تمہاری پشت پر اتنے کوڑے لگاؤں گا جتنے ان کو لگائے ہوں گے۔ انھوں نے کہا یہ آپ کا فیصلہ ہے؟ حضرت نعمان نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ہے۔ امام ابو داؤد نے کہا اعتراف سے پہلے کسی کو مارنا جائز نہیں ہے۔ (سنن ابو داؤد ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۳۸۲ 'سنن النسائی 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۴۸۸۹)
ہمارے ملک میں محض شبہ کی بنا پر کسی شخص کو حوالات میں اتنی مار لگائی جاتی ہے کہ وہ مار سے بچنے کے لیے اپنے ناکردہ جرائم کو اعتراف کر لیتا ہے 'یہ اسلام کے خلاف ہے۔ علامہ سندی نے لکھا ہے کہ تہمت اور شبہ کی بناء پر کسی کو قید کرنا جائز ہے۔

مجرموں کو قید میں رکھنے کا جواز

مجرموں کو قید میں رکھنے کی اصل یہ حدیث ہے :
امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑے سواروں کی ایک جماعت نجد کی طرف بھیجی 'وہ ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے جس کا نام ثمامہ بن آثال تھا 'صحابہ نے اس کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس تشریف لائے اور پوچھا اے ثمامہ ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا اے محمد ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا نیک خیال ہے۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو آپ ایک خونی کو قتل کریں گے اور آپ مجھ پر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو جتنا چاہیں مجھ سے سوال کریں 'اس کو اسی طرح رکھا گیا۔ آپ نے دوسرے دن پھر اس سے فرمایا : اے ثمامہ ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے

کہا وہی جو میں نے آپ سے کہا تھا' اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں گے' اس کو پھر اسی طرح رکھا گیا۔ تیسرے دن آپ نے پھر اس سے سوال کیا: اے ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا وہی جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔ آپ نے فرمایا ثمامہ کو کھول دو' پھر ثمامہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے درخت کے پاس گیا' اس نے غسل کیا' پھر مسجد میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔ "اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمد رسول اللہ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بخدا (پہلے) تمام روئے زمین پر مجھے آپ کا چہرہ سب سے زیادہ برا لگتا تھا' اور اب آپ کا چہرہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے' اور بخدا! میں پہلے سب سے زیادہ آپ کے دین سے بغض رکھتا تھا اور اب آپ کا دین مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور پہلے میں آپ کے شہر سے سب سے زیادہ بغض رکھتا تھا اور اب آپ کا شہر مجھے تمام شہروں میں سب سے زیادہ محبوب ہے'۔ آپ کے سواروں نے مجھے گرفتار کر لیا تھا' اور اب میں عمرہ کرنا چاہتا ہوں' آپ کی کیا رائے ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بشارت دی اور اسے عمرہ کرنے کا حکم دیا' جب وہ مکہ میں پہنچا تو اس سے کسی شخص نے کہا کیا تم نے دین بدل لیا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں! بخدا میں سیدنا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مسلمان ہو گیا ہوں' بخدا تمہارے پاس اب یمامہ سے اس وقت تک گندم کا ایک دانہ بھی نہیں پہنچے گا جب تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ (صحیح البخاری' ج ۵' رقم الحدیث: ۴۳۷۲' سنن ابوداؤد' ج ۲' رقم الحدیث: ۲۶۷۹' صحیح مسلم' جہاد' ۸۹' (۱۷۶۹) ۴۵۰۸' سنن النسائی ج ۱' رقم الحدیث: ۱۸۹' مسند احمد' ج ۲' ص ۴۵۲' ج ۳' ص ۸۲' طبع قدیم)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین دن ثمامہ بن آثال کو قید رکھا اور یہ حدیث مجرموں کو قید میں رکھنے کی اصل ہے۔

نادہندہ مقروض کو قید کرنے کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

ہرماس بن حبیب نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنے مقروض کو لے کر آیا' آپ نے فرمایا اس کو قید کر لو' پھر مجھ سے فرمایا: اے بنو تمیم کے بھائی! تم اپنے قیدی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ (سنن ابوداؤد' ج ۲ رقم الحدیث: ۳۶۲۹' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

اس حدیث میں نادہندہ مقروض کو قید میں رکھنے کی دلیل ہے۔

عمرو بن الشرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا متمول آدمی کی (قرض واپس کرنے میں) سستی اور تاخیر اس کی عزت اور سزا کو حلال کر دیتی ہے۔

امام ابن المبارک نے کہا کہ عزت کو حلال کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس سے سختی اور درشت کلام کے ساتھ تقاضا کیا جائے اور سزا حلال کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کو قید کر لیا جائے۔ (علامہ نووی اور علامہ سندی نے بھی یہی تشریح کی ہے) (سنن ابوداؤد' ج ۲' رقم الحدیث: ۳۶۲۸' سنن النسائی' ج ۷' رقم الحدیث: ۴۷۰۴۔ ۴۷۰۳' سنن ابن ماجہ' ج ۲' رقم الحدیث: ۲۴۲۷' مسند احمد' ج ۶' رقم الحدیث: ۱۷۹۶۸' طبع جدید' دار الفکر' مسند احمد' ج ۴' ص ۳۸۹۔ ۳۸۸۔ ۲۲۲' طبع قدیم' امام بخاری نے اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ کتاب الاستقراض' باب ۱۳)

نیز امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ قاضی شریح مقروض کو مسجد کے ستون سے باندھنے کا حکم دیتے تھے۔ (کتاب الصلوۃ' باب ۷۶)

نادھندہ مقروض کو قید کرنے کے متعلق مذاہب ائمہ

علامہ احمد بن محمد خطابی متوفی ۳۸۸ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :
اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ تنگ دست اور غریب مقروض کو عدم ادائیگی پر قید نہیں کیا جائے گا 'کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو جائز کہا ہے جو ادائیگی پر قادر ہو اور اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ قاضی شریح کا نظریہ یہ تھا کہ متمول اور تنگ دست دونوں کو قید کر دیا جائے 'اصحاب رائے کا بھی یہی نظریہ ہے۔ (فقہاء احناف کا یہ نظریہ نہیں ہے سعیدی غفرلہ) امام مالک نے کہا تنگ دست کو قید نہیں کیا جائے گا 'اس کو ادائیگی کے لیے مہلت دی جائے گی 'امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص بظاہر تنگ دست ہو 'اس کو قید نہیں کیا جائے گا اور جو شخص بظاہر متمول ہو اور وہ اپنے حق کو ادا نہ کرتا ہو 'تو اس کو قید کیا جائے گا اور بعض اصحاب شافعیہ نے اس میں مزید قیود کا اضافہ کیا ہے۔ (معالم السنن مع مختصر سنن ابو داؤد ج ۵ 'ص ۲۳۷۔۲۳۶)
حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں
اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب مقروض قرض ادا کرنے پر قادر ہو (اور قرض ادا نہ کرے) تو اس پر سختی کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۶۲ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ 'لاہور ۱۴۰۱ھ)
علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں :
اس حدیث یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب مقروض قرض ادا کرنے پر قادر ہو (اور قرض ادا نہ کرے) تو اس پر سختی کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے 'کیونکہ اس وقت وہ ظالم ہے اور ظلم حرام ہے 'خواہ وہ قلیل ہو اور اگر مقروض کا تنگ دست ہونا ثابت ہو تو اس کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کو قید کرنا حرام ہے 'اور جس شخص کا تنگ دست ہونا ثابت ہو گیا ہو اور اس کو قید سے نکال دیا گیا ہو تو اس میں اختلاف ہے 'کہ آیا قرض خواہ مقروض کے ساتھ لازم رہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ جب تک اس کے پاس کسی اور مال کا ثبوت نہ ہو 'وہ اس کے ساتھ لازم نہ رہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ حاکم قرض خواہوں کو اس کے ساتھ لزوم سے منع نہ کرے (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۳۶ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ھ)
جس طرح مالی حقوق میں اس شخص کو قید کرنا جائز ہے جس پر کسی کا مالی حق ہو 'اسی طرح بدنی حقوق میں استغاثہ کو حق دلانے کے لیے اس شخص کو قید کرنا جائز ہے جس پر قصاص لازم ہو 'اسی طرح جس شخص نے حدود میں سے کسی حد کا ارتکاب کیا ہو 'اس پر حد نافذ کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے۔

گواہ بنانے کے لیے بعد از نماز وقت کی خصوصیت

اس آیت میں فرمایا ہے :
اگر تمہیں ان پر شک ہو تو تم ان دو گواہوں کو نماز کے بعد روک لو 'وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں۔
اکثر علماء نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں "بعد از نماز" سے مراد از نماز عصر ہے 'کیونکہ تمام ادیان میں اس وقت کو عظیم گردانا جاتا ہے اور وہ اس وقت میں جھوٹ بولنے سے اور جھوٹی قسم کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس وقت میں دن کے فرشتے بندہ کے اعمال لکھ کر جا ہوتے ہیں اور رات

کے فرشتے اس کے اعمال لکھنے کے لیے آ رہے ہوتے ہیں اور یہ وقت دونوں فرشتوں کے اجتماع کا ہوتا ہے اور اس وقت جو عمل کیا جائے اس کو دن کے فرشتے بھی لکھ لیتے ہیں اور رات کے فرشتے بھی لکھ لیتے ہیں 'اس وقت بندوں کے اعمال قبول کیے جانے کے لیے عرش کی طرف فرشتے لے جاتے ہیں 'اس لیے اس وقت میں زیادہ سے زیادہ نیک عمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے 'اور برے اعمال سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے 'خصوصیت سے اس وقت میں جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ کلام نہیں کرے گا 'اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا 'اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے 'ایک وہ شخص جس کے پاس راستہ میں فاضل پانی ہو اور وہ مسافروں کو پانی (لینے) سے منع کرے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی شخص سے محض دنیا کے لیے بیعت کرے 'اگر وہ اس کی خواہش کے مطابق دے تو اس سے بیعت کو پورا کرے 'ورنہ بیعت پوری نہ کرے۔ اور تیسرا وہ شخص جو عصر کے بعد کسی آدمی کو کسی چیز کی قیمت بتائے 'اور اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اسے وہ چیز اتنے اتنے میں ملی ہے اور وہ آدمی اس کو لے لے 'حالانکہ اسے اتنے میں نہ ملی ہو۔ (صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۶۷۲ 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۷۲۱۲)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ جو شخص عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے گا 'اللہ عزوجل اس سے کلام نہیں کرے گا 'نہ اس کی طرف نظر رحمت فرمائے گا 'نہ اس کو پاک کرے گا اور اس کو دردناک عذاب ہوگا۔

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں

عصر کے وقت کو زیادہ گناہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ حالانکہ جھوٹی قسم ہر وقت کھانا حرام ہے 'کیونکہ یہ عظیم الشان وقت ہے 'اس وقت میں ملائکہ جمع ہوتے ہیں اور یہ اعمال کے ختم ہونے کا وقت ہے اور امور کا مدار خاتمہ پر ہے۔ اس لیے اس وقت میں گناہ کے ارتکاب پر سخت سزا رکھی ہے ' تاکہ لوگ اس وقت میں گناہوں پر جرات نہ کریں اور متقدمین عصر کے بعد حلف لیتے تھے اور اس سلسلہ میں حدیث بھی ہے۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۳ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ 'لاہور ۱۴۰۱ھ)

قسم دلانے اور گواہ بنانے میں مقام کی خصوصیت میں مذاہب

جس طرح قسم کو پختہ کرنے کے لیے زمان کے اعتبار سے عصر کے بعد کے وقت کی خصوصیت ہے 'اسی طرح مکان اور مقام کے اعتبار سے کسی جگہ کی بھی اہمیت ہے یا نہیں ؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ مدعی علیہ جہاں چاہے قسم کھائے اور اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جائے گا اور اس کے تحت یہ اثر ذکر کیا ہے کہ مروان نے حضرت زید بن ثابت (رض) کے خلاف فیصلہ کیا کہ وہ منبر پر قسم کھائیں 'حضرت زید (رض) نے کہا میں اپنی جگہ قسم کھاؤں گا 'پھر زید قسم کھانے لگے اور انھوں نے منبر پر قسم کھانے سے انکار کیا ' مروان کو اس سے تعجب ہوا 'حضرت زید (رض) نے کہا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم دو گواہ پیش کرو یا وہ قسم اٹھائے گا اور آپ نے کسی جگہ کی تخصیص نہیں فرمائی۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں :

امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک قسم دلانے کے لیے کسی خاص مقام کی ضرورت نہیں ہے 'اور امام بخاری کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ علامہ ابن عبد البر مالکی نے کہا قسم میں امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب چوتھائی دینار یا اس سے زائد کے معاملہ پر قسم کھائی ہو تو جامع مسجد میں یا جامع مسجد کے منبر پر قسم دلائی جائے گی 'اور جب اس سے کم کا معاملہ ہو تو حاکم کی مجلس میں ' بازار میں یا کسی بھی جگہ قسم کھائی جاسکتی ہے 'اور اس پر قبلہ کی طرف متوجہ ہونا ضروری نہیں ہے 'اور امام مالک منبر مدینہ کے سوا اور کسی منبر کو نہیں پہچانتے تھے 'اور جو شخص منبر مدینہ کے پاس قسم کھانے سے انکار کرے 'وہ ان کے نزدیک قسم کھانے سے منکر ہے اور قسامت کی قسموں میں امام مالک کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ رکن اور مقام کے درمیان قسم کھائے۔ علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے: کہ امام شافعی کا مذہب بھی امام مالک کی طرح ہے 'لیکن ان کے نزدیک منبر مدینہ یا مکہ میں رکن اور مقام کے نزدیک قسم کھانا اس وقت ضروری ہے جب بیس دینار دینار یا اس سے زائد کا معاملہ ہو اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ عنہ اور صاحبین کے نزدیک کسی شخص سے کسی بھی معاملہ میں خواہ قلیل مال کا معاملہ ہو ' یا کثیر مال کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منبر پر قسم لینا ضروری نہیں ہے 'اور نہ قصاص اور دیت میں اور نہ کسی اور چیز میں 'اور جس شخص پر قسم واجب ہو تو حکام اپنی مجلس میں اس سے قسم لے لیں۔ امام ابو حنیفہ نے حضرت زید بن ثابت کے اثر سے استدلال کیا ہے 'کیونکہ انھوں نے منبر پر قسم نہیں کھائی اور جو اس کو ضروری قرار دیتے ہیں 'وہ مروان کے قول سے بلادلیل استدلال کرتے ہیں۔ صاحب التوضیح نے امام شافعی کی طرف سے استدلال کیا ہے کہ اگر حضرت زید بن ثابت (رض) کو یہ یقین ہوتا کہ منبر پر قسم کھانا سنت نہیں ہے تو وہ مروان پر رد کرتے اور کہتے کہ نہیں 'خدا کی قسم! میں منبر پر قسم نہیں کھاؤں گا 'میں صرف تمہاری مجلس میں قسم کھاؤں گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عجیب استدلال ہے 'اگر حضرت زید کو علم ہوتا کہ منبر پر قسم کھانا سنت ہے 'تو وہ مروان کی مجلس میں قسم نہ کھاتے اور منبر پر ہی قسم کھاتے 'لیکن انھوں نے مروان کے کلام کی طرف توجہ نہیں کی اور اسی مجلس میں قسم کھائی اور یہ مروان کا رد نہیں تو اور کیا ہے! (عمدۃ القاری ج ۱۳ص ۲۵۳'۔ ۲۵۲ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں

حضرت زید بن ثابت (رض) کی تائید میں یہ اثر ہے۔ امام ابو عبیدہ نے کتاب القضاء میں سند صحیح کے ساتھ نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) ایک شخص کے وصی تھے 'ان کے پاس ایک شخص ایک دستاویز لے کر آیا 'جس میں گواہوں کے نام مٹ چکے تھے۔ حضرت ابن عمر (رض) نے نافع سے کہا: اس کو منبر پر لے جا کر اس سے حلف لو۔ اس شخص نے کہا جب یہ منبر پر مجھ سے حلف لے گا تو آپ تو نہیں سن رہے ہوں گے حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا تم نے سچ کہا: اور اس شخص سے اسی مجلس میں حلف لیا۔

مروان کی تائید میں بھی اثر ہے۔ امام کرابیسی نے آداب القضاء میں سند قوی کے ساتھ سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ ایک شخص نے کسی آدمی پر یہ دعوی کیا کہ اس نے اس شخص کا اونٹ غصب کر لیا ہے 'اس نے حضرت عثمان (رض) کے پاس مقدمہ پیش کیا 'حضرت عثمان (رض) نے اس کو حکم دیا کہ وہ منبر پر قسم کھائے 'اس نے قسم کھانے سے انکار کیا اور کہا: منبر کے علاوہ اور آپ جہاں چاہیں میں قسم کھاؤں گا 'حضرت عثمان (رض) نے فرمایا نہیں تم کو منبر پر قسم کھانی ہوگی 'ورنہ اونٹ تاوان میں دینا پڑے گا 'اس شخص نے اونٹ تاوان میں دے دیا اور منبر پر قسم نہیں کھائی۔

جس طرح زمان کے اعتبار سے قسم کی تغلیظ میں عصر کے بعد کے وقت کی تخصیص ہے۔ اسی طرح مکان کے اعتبار سے قسم کی تغلیظ میں منبر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تخصیص ہے 'اور اس سلسلہ میں دو مرفوع حدیثیں ہیں:

(۱) امام مالک ٗ امام ابو داؤد ٗ امام نسائی ٗ امام ابن ماجہ ٗ امام ابن خزیمہ نے تصحیح کے ساتھ اور امام ابن حبان اور امام حاکم وغیرہم نے حضرت جابر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائے گا ٗ خواہ وہ ایک سبز مسواک پر قسم کھائے ٗ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

(۲) امام نسائی نے ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے حضرت ابو امامہ بن ثعلبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائی ٗ جس سے وہ کسی مسلمان شخص کا مال ہڑپ کرنا چاہتا ہوں ٗ اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو ٗ اللہ اس کا کوئی فرض قبول کرے گا ٗ نہ نفل۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۲۸۵ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ ٗ لاہور ۱۴۰۱ ھ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ منبر رسول پر جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے ٗ اور جس قسم میں تغلیظ مقصود ہو ٗ تو وہ منبر رسول پر قسم دینی چاہیے ٗ لیکن یہ ہے کہ کیا یہ واجب ہے ؟ اور کیا تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن ہے ؟ عصر کے بعد کا وقت تو دنیا میں ہر جگہ حاصل ہو سکتا ہے ٗ اس لیے سخت اور قوی قسم دینے کے لیے عصر کے وقت کی خصوصیت درست ہے۔ لیکن رکن اور مقام پر قسم دینا یا منبر رسول پر قسم دینا ٗ یہ عملا صرف حرمین طیبین میں ہی ممکن ہے اور اب اسلام تمام دنیا میں پھیل چکا ہے۔ خصوصا پاسپورٹ اور ویزے کی پابندی کے اس دور میں معقول مذہب صرف امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا ہے ٗ اور وہی قابل عمل ہے۔

صرف اللہ کی ذات کی قسم کھائی جائے یا اس کی صفات کا بھی ذکر کیا جائے

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ ھ لکھتے ہیں :

جس ذات کی قسم کھائی جائے اس کی صفات کے ذکر میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ان الفاظ کے ساتھ قسم کھائے "باللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ الرحمن الرحیم " امام شافعی نے کہا اس میں یہ اضافہ بھی کرے "الذی یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور والذی یعلم من السر ما یعلم من العلانیۃ " علامہ سحنون مالکی نے کہا اللہ اور مصحف کی قسم کھائے اور ہمارے اصحاب احناف کے نزدیک صرف اللہ کے نام کی قسم کھانا کافی ہے ٗ طلاق کی قسم نہ کھائے (یعنی اگر میں نے یہ کام کیا ہے تو میری بیوی کو طلاق) ہاں ! اگر فریق مخالف اللہ کی قسم کو اہمیت نہ دیتا ہو اور طلاق کی قسم کا مطالبہ کرے تو پھر طلاق کی قسم کھالے ٗ لیکن اگر اس نے طلاق کی قسم کھانے سے انکار کیا تو اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا ٗ کیونکہ اس نے اس چیز سے انکار کیا ہے جو شرعا ممنوع ہے ٗ اور اگر اس کے خلاف فیصلہ کر بھی دیا گیا ٗ تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔ قسم کو زیادہ پختہ اور موکد کرنے کے لیے اللہ کی صفات کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ جو شخص عرف میں نیک ہو ٗ اس سے پختہ قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے اور دوسروں سے مطالبہ کیا جائے ٗ اور ایک قول یہ ہے کہ زیادہ مال کے معاملہ میں پختہ قسم کا مطالبہ کیا جائے ٗ اور کم مال کے معاملہ میں نہ کیا جائے اور زمان اور مکان کے اعتبار سے قسم کو پختہ نہ کیا جائے (یعنی عصر کے بعد قسم کا مطالبہ کرے ٗ یا مسجد کے منبر پر قسم کھانے کا مطالبہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جب اس وقت میں اور منبر پر قسم کھانے کا رواج عام ہو جائے گا تو لوگوں کے نزدیک ان کی وقعت کم ہو جائے گی۔ ہاں کسی بہت اہم اور خاص معاملہ میں زمان و مکان کے ساتھ تغلیظ کرنی چاہیے ٗ اور اللہ کی ذات اور صفات کی قسم دینی چاہیے ٗ کیونکہ امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو قسم دی اور فرمایا یہ قسم کھاؤ۔ "باللہ الذی لا الہ الا ھو "۔ میرے پاس مدعی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ (سنن ابو داؤد ٗ ج ۲ ٗ رقم الحدیث : ۳۶۲۰) اس طرح قرآن ٗ حدیث اور آثار صحابہ سب پر عمل ہوگا ٗ کیونکہ قرآن مجید میں (عصر کی) نماز کے بعد قسم دلانے کا حکم ہے اور حدیث میں اللہ کی ذات اور

صفات کے ساتھ قسم دینے کا حکم ہے 'اور آثار صحابہ میں مسجد کے منبر پر قسم دینے کا ذکر ہے۔اس لیے قسم کی تغلیظ 'تاکید اور اس کو پختہ کرنے کے لیے ان امور کے ساتھ قسم دی جائے 'لیکن چونکہ قرآن اور حدیث میں اس تغلیظ کو واجب اور ضروری نہیں قرار دیا 'اس لیے ان امور کے ساتھ تغلیظ کو عام معمول نہ بنایا جائے 'تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت اور اہمیت کم نہ ہو 'اور کسی بہت اہم اور غیر معمولی معاملہ میں جہاں بہت تاکید اور تغلیظ مقصود ہو 'وہاں عصر کے بعد مسجد کے منبر پر اللہ کی ذات اور صفات کی قسم دی جائے۔ (سعیدی غفرلہ) توضیح میں یہ مذکور ہے کہ کیا قسم دیتے وقت مصحف (قرآن مجید) کو بھی حاضر کیا جائے؟اس میں اختلاف ہے۔امام مالک نے اس کا انکار کیا اور بعض مالکی علماء نے کہا بیس دینار یا اس سے زیادہ کی مالیت میں مصحف کو حاضر کرنا لازم ہے 'اور ابن المنذر نے امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا میں نے مطرف کو دیکھا 'وہ مصحف کے سامنے حلف اٹھاتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ص ۲۵۳ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ھ)

مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنے کی توجیہ

اس آیت میں فرمایا ہے پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں 'تو جس لوگوں کا حق ان گواہوں نے ضائع کیا ہے ' ان کی طرف سے دو گواہ ان کی جگہ کھڑے کیے جائیں اور وہ گواہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اس واقعہ میں پہلے میت کے وصیوں نے قسم کھائی کہ ہم کو اس میت نے صرف اتنا ہی مال دیا تھا (جس میں چاندی کا پیالہ نہیں تھا) اور ورثاء نے یہ دعوی کیا کہ انھوں نے پورا مال نہیں پہنچایا 'اور انھوں نے جھوٹی قسم کھائی اور امانت میں خیانت کی ہے 'پھر وصیوں کی قسم کے مقابلہ میں ورثاء کے دو آدمی پیش ہوئے اور انھوں نے ان وصیوں کے خلاف قسم کھائی اور کہا ہماری قسم ان کی قسم کے مقابلہ میں برحق ہے۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ورثاء مدعی تھے اور مدعی کے ذمہ گواہ ہوتے ہیں 'اور قسم مدعی علیہ پر ہوتی ہے اور یہاں مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا 'کیونکہ جب ورثاء کے گواہوں نے قسم کھائی کہ یہ وصی جھوٹے ہیں 'اس سامان میں پیالہ بھی تھا 'تو ان کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا؟اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ پیالہ مکہ میں مل گیا اور وصیوں سے اس کے متعلق پوچھا گیا 'تو انھوں نے کہا کہ ہم نے میت سے یہ پیالہ خرید لیا تھا تو اب معاملہ برعکس ہو گیا 'اب وہ مدعی ہو گئے اور میت کے ورثاء اس خریداری کے منکر تھے 'وہ مدعی علیہ ہو گئے اور چونکہ وصیوں کے پاس پیالہ خریدنے کے گواہ نہ تھے 'اس لیے ورثاء پر قسم لازم آئی 'انھوں نے قسم کھائی کہ یہ جھوٹے ہیں اور ان کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض ورثاء کو مدعی ہی قرار دیا جائے 'تب بھی اصول یہ ہے کہ اگر کسی خارجی قرینہ سے مدعی علیہ کی خیانت اس کا جھوٹ اور گناہ ثابت ہو جائے تو اس کی قسم غیر معتبر ہو جاتی ہے 'اور پھر مدعی سے قسم لے کر اس کی قسم پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے 'اور اس آیت سے یہی اصول ثابت ہوتا ہے اور جو قاعدہ ہے کہ اگر مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعی علیہ کی قسم پر فیصلہ کیا جاتا ہے 'وہ اس جب مدعی علیہ کی قسم کے جھوٹ ہونے پر کوئی خارجی دلیل اور قرینہ نہ ہو۔اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جس میں گواہ کا مسلمان ہونا ضروری فرمایا ہے 'اور اس آیت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کا ذکر ہے 'اس پر مفصل بحث ہم اس آیت کی تفسیر کے شروع میں کر چکے ہیں۔ (تبیان)

مسائل

ا۔گناہ میں ملوث لوگوں کے بجائے دوسرے لوگ گواہی دیں۔ ۲۔ گواہی دینے والوں کو کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

۳۔ اگر مسلمان عادل گواہ نہ ملیں تو غیر مسلم کو بھی گواہ بنایا جاسکتا ہے۔ ۴۔ ذاتی مفاد اور رشتہ داری سے بالاتر ہو کر گواہی دینا چاہیے۔
۵۔ گواہ پر شک ہو تو قسم بھی لی جاسکتی ہے اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ ۶۔ جھوٹی گواہی دینا ظلم اور کبیرہ گناہ ہے۔

آیت مبارکہ:

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

لغۃ القرآن: [فَاِنْ : پھر اگر][عُثِرَ : اطلاع ہوجائے][عَلٰۤي : پر][اَنَّهُمَا : بیشک وہ دونوں][اسْتَحَقَّاۤ : مرتکب ہوئے][اِثْمًا : گناہ][فَاٰخَرٰنِ : پھر دوسرے][يَقُوْمٰنِ : دو کھڑے ہوں][مَقَامَهُمَا : ان دونوں کی جگہ][مِنَ : سے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][اسْتَحَقَّ : مرتکب ہوئے][عَلَيْهِمُ : ان پر][الْاَوْلَيٰنِ : پہلے دونوں][فَيُقْسِمٰنِ : پھر وہ دونوں قسمیں اٹھائیں][بِاللّٰهِ : اللہ کی کہ][لَشَهَادَتُنَاۤ : یقیناً ہماری گواہی][اَحَقُّ : زیادہ سچی][مِنْ : سے][شَهَادَتِهِمَا : ان دونوں کی گواہی][وَمَا : اور نہیں][اعْتَدَيْنَاۤ : ہم نے زیادتی کی][اِنَّاۤ : بیشک ہم][اِذًا : اس وقت][لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ : سے ظلم کرنے والے]

ترجمہ: پھر اگر اس (بات) کی اطلاع ہو جائے کہ وہ دونوں (صحیح گواہی چھپانے کے باعث) گناہ کے سزاوار ہو گئے ہیں تو ان کی جگہ دو اور (گواہ) ان لوگوں میں سے کھڑے ہو جائیں جن کا حق پہلے دو (گواہوں) نے دبایا ہے (وہ میت کے زیادہ قرابت دار ہوں) پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ بیشک ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم (حق سے) تجاوز نہیں کر رہے، (اگر ایسا کریں تو) ہم اسی وقت ظالموں میں سے ہو جائیں گے

تشریح:

وصیت کے گواہوں کا جھوٹ ثابت ہو جائے جیسا کہ یہاں تمیم اور عدی کا جھوٹ ثابت ہوا کہ پیالہ مکہ معظّمہ میں پکڑا گیا تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ میت کے وارثوں میں سے دو آدمی قسم کھا کر کہیں کہ یہ دونوں امین جھوٹے ہیں، ہماری گواہی یعنی قسم ان دونوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے اور ہم حد سے نہیں بڑھے، اگر ہم ایسا کریں گے تو اس وقت ہم ظالموں میں ہوں گے۔ چنانچہ بدیل کے واقعہ میں جب ان کے دونوں ہمراہیوں کی خیانت ظاہر ہوئی تو بدیل کے ورثاء میں سے دو شخص کھڑے ہوئے اور انھوں نے قسم کھائی کہ یہ جام ہمارے مُورِث کا ہے اور ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد پیالے کا فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا۔ (صراط)

مطلب :۔ مطلب یہ ہے کہ گواہوں کی جھوٹی گواہی کی صورت میں مدعیان کو چاہئے کہ وہ اپنے حق کے ثبوت کے لئے خود بیان حلفی دیں کہ ہماری شہادت پہلے گواہوں کی گواہی سے زیادہ معتبر اور بر حق ہے۔ (کاشف)

شان نزول

ان آیات کی شان نزول یہ ہے کہ ایک شخص بُدَیل نامی جو مسلمان تھا دو شخصوں تمیم وعدی کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے بغرض تجارت ملک شام کی طرف گیا۔ شام پہنچ کر بدیل بیمار پڑ گیا۔ اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی۔ مرض جب زیادہ بڑھا تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا۔ انھوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھے اس میں سے نکال لیا۔ وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی۔ انھوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں کچھ خرچ ہوا ہو، ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ آخر معاملہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عدالت میں پیش ہوا۔ چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے، تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی نہ کوئی چیز اس کی چھپائی۔ آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ وہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا۔ چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لیے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔ میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں مرافعہ کیا۔ اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے۔ شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کے ملک تھا اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں۔ چنانچہ جس قیمت پر انھوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

فان عثر علی انھما استحقا اثما پھر اگر اطلاع ملے کہ وصی گناہ کے مستوجب ہوئے ہیں یعنی

انہوں نے اپنی خیانت کی وجہ سے ایسا فعل کیا ہے جو موجبِ گناہ ہے مطلب یہ کہ الزام خیانت کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کے لیے انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائی ہوں یا خریدنے کا دعویٰ کیا ہو یا ایسی ہی کوئی اور حرکت کی ہو۔ عثرٌ کا اصل معنی ہے کسی چیز پر گر پڑنا۔ یہاں مراد ہے اطلاع ملنا۔

فاخران یقومن مقامھا تو دونوں وصیوں کے مقام پر (قسم کھانے کے لئے) دو آدمی دوسرے کھڑے ہوں۔

وارثوں میں سے دو (مدعی) شخصوں کو شاہد اس لیے قرار دیا کہ انھوں نے اپنے حق کا دعویٰ کیا ہے اور شریعت نے بھی ان کے حق کو تسلیم کیا ہے اور وہ دونوں سابق شاہدوں (وصیوں) کے گناہ کو ظاہر کر رہے ہیں تو گویا وصیوں کے گناہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ میّت کے اقربا میں دو گواہوں کی شرط اس وجہ سے لگائی گئی کہ مذکورہ بالا واقعہ میں ایسا ہی تھا ورنہ اگر میت کا وارث ایک ہوگا تو اسی سے قسم لی جائے گی یا اگر دو سے زائد وارث ہوں گے تو سب سے قسم لی جائے گی (گویا دو ہونے کی شرط اس وقت ضروری ہے جب وارث صرف دو ہوں ورنہ ضروری نہیں ایک بھی قسم کھانے والا ہو سکتا ہے اور دو سے زائد بھی) کیونکہ وصی میت سے خریدنے یا کسی اور طرح سے نزاعی چیز کے مالک ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور وارث ان کے دعویٰ کا انکار کرتے ہیں (اور وصیوں کے پاس گواہ نہیں ہوتے لہٰذا مدعی علیہ پر قسم عائد ہوگی)

مسئلہ: کسی معاملہ میں مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ مسئلہ مسلمہ ہے لیکن اکثر اہل تفسیر یہاں تک کہ حضرت ابن عباس (رض) حضرت ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور عبیدہ نے آیت کی تفسیر میں منکم سے مراد مسلمانوں میں سے اور من غیرکم سے مراد کافروں میں سے ہونے کی صراحت کی ہے (اس تفسیر پر لازم آتا ہے کہ مسلمان پر کافر کی شہادت قابل قبول ہو) لہٰذا نخعی اور علماء کی ایک جماعت نے تو اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ابتدائی دور میں یہ حکم تھا مسلمان پر کافر کی شہادت مان لینے کا جواز تھا لیکن پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اب مسلمان پر کافر کی شہادت ناقابل سماعت ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اگر مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو شاہد بنانا درست ہے۔ قاضی شریح نے کہا سفر کی حالت میں اگر وصیت پر گواہ بنانے کے لیے مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو گواہ بنایا جاسکتا ہے مگر یہ حکم صرف وصیت کو گواہ بنانے کا ہے وصیت کے علاوہ اور کسی مسئلہ کا گواہ کافروں کو نہیں بنایا جاسکتا۔

شعبی نے بیان کیا کہ دقوقا میں ایک مسلمان کا وقت وفات آپہنچا اور اس نے کچھ وصیت کرنی چاہی مگر کوئی مسلمان گواہ ملا نہیں آخر اس نے اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو وصیت کا گواہ بنادیا اور دونوں شخص اس کا متروکہ سامان لے کر کوفہ میں پہنچے اور حضرت ابو موسیٰ (رض) اشعری کی خدمت میں حاضر ہو کر سامان پیش کر دیا اور وصیت کی اطلاع دے دی۔ اشعری نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ کے بعد ایسا واقعہ کوئی اور پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے دونوں سے قسم لی اور ان کی شہادت کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کو محکم مانا جائے تو اگر کسی وجہ سے غیر مسلم گواہوں کے بیان میں کوئی جھوٹ محسوس ہو تو وارثوں سے قسم لی جائے (کہ یہ غیر مسلم گواہ غلط کہتے ہیں) (گلدستہ)

قابل غور بات یہ ہے کہ کلام اللہ میں کس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا واضح طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کے اخلاق اور عقائد کی طرح اس کے اعمال وافعال اور باہمی تعلقات بھی درست ہو جائیں کوئی کسی کا حق نہ مار سکے اور اگر کوئی بدکار ایسا کر بیٹھے تو اس کی تلافی کی جاسکے کیونکہ سارے دین کی پرکھ تو معاملات ہی ہیں۔

آیت مسلسل چل رہی ہے پہلے حصہ میں جو بات باقی تھی وہ اب بیان ہو رہی ہے

پھر ارشاد ہے کہ کام تو جب ہی ٹھیک ہوگا جب دل میں اللہ کا ڈر ہوگا اور اس کی سزا کے ڈر سے. بری باتوں سے بچا جائے گا اور اس کی باتیں کان لگا کر سنی جائیں گی۔اس لیے بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی بات سنو جو اس سے نہ ڈرے نہ اس کی بات سنے وہ نافرمان نہیں تو اور کیا ہے اور اللہ کے ہاں قاعدہ مقرر ہے کہ وہ نافرمانوں کو سیدھے راستہ پر نہیں چلاتا اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں جو نہ دھمکی سے ڈرے اور نہ سیدھی بات سنے وہ ٹھیک راستے پر کیسے چل سکتا ہے۔ (درس آسٹریلیا)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٨﴾ؑ

لغۃ القرآن: [ذٰلِكَ : وہ][اَدْنٰٓي : زیادہ قریب][اَنْ يَّاْتُوْا : یہ کہ وہ دیں][بِالشَّهَادَةِ : گواہی][عَلٰي : پر][وَجْهِهَآ : ٹھیک طریقہ][اَوْ يَخَافُوْٓا : یا وہ ڈریں][اَنْ تُرَدَّ : کہ رد کردی جائیں گی][اَيْمَانٌۢ: قسمیں][بَعْدَ : بعد][اَيْمَانِهِمْ : ان کی قسموں کے][وَاتَّقُوا : اور ڈرو][اللّٰهَ : اللہ سے][وَاسْمَعُوْا : اور تم سنو][وَاللّٰهُ : اور اللہ][لَا يَهْدِي : نہیں وہ ہدایت دیتا][الْقَوْمَ : قوم][الْفٰسِقِيْنَ : فسق کرنے والے]

ترجمہ: یہ (طریقہ) اس بات سے قریب تر ہے کہ لوگ صحیح طور پر گواہی ادا کریں یا اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ (غلط گواہی کی صورت میں) ان کی قسموں کے بعد (وہی) قسمیں (زیادہ قریبی ورثاء کی طرف) لوٹائی جائیں گی، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام کو غور سے) سنا کرو، اور اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا

تشریح:

ان آیات کے پس منظر میں ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے کہ تین شخص بسلسلۂ تجارت مدینہ منورہ سے شام روانہ ہوئے، ان میں سے ایک شخص مسلمان اور دو نصرانی تھے، مسلمان کا نام "جبرئیل "اور نصرانیوں کے نام تمیم اور عدی تھے، جب یہ لوگ شام پہنچے تو بدلیل بیمار ہوگیا، اس نے اپنے سامان کی فہرست لکھ کر سامان میں محفوظ طریقے سے چھپادی، جب وہ زیادہ بیمار ہوگیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو وصیت کی کہ میرا سارا سامان میرے گھر پہنچا دینا، اس کا انتقال ہوگیا، "بدیل کے ورثا کے پاس جب اس کا سامان پہنچا تو فہرست بھی ان کے ہاتھ لگی، فہرست میں چاندی کے ایک پیالہ جس پر سونے کا کام کیا ہوا تھا، کا ذکر تھا لیکن سامان میں وہ پیالہ موجود نہیں تھا، رفقاء نے سامان میں سے وہ پیالہ چرالیا تھا، ورثاء نے جب ان سے سامان کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے اس بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا، انہوں نے اس چیز کا بھی اقرار کیا کہ میت نے نہ کوئی سامان فروخت کیا تھا اور نہ ہی سامان میں سے اپنے علاج و معالجہ پر کچھ خرچ کیا تھا، باآخر معاملہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی

خدمت میں پیش ہوا، چونکہ ورثاء کے پاس گواہ نہیں تھے، اس لیے ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی انہوں نے قسم کھالی کہ ہم نے میت کے مال میں نہ کوئی خیانت کی ہے اور نہ ہی کوئی چیز چھپائی ہے، ان سے قسم لینے کے بعد ان کے حق میں فیصلہ کر دیا گیا، کچھ عرصہ بعد "بدیل" کے ورثاء کے علم میں یہ بات آئی کہ ان لوگوں نے مکہ مکرمہ کے ایک سنیارے کو وہ پیالہ فروخت کیا ہے جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ پیالہ تو ہم نے میت سے خریدا تھا، چونکہ اس خریداری کے کوئی گواہ ہمارے پاس نہیں تھے اس لیے ہم نے اس چیز کا ذکر نہیں کیا، "بدیل "کے درثاہ دوبارہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اب معاملہ بر عکس تھا کہ وہ نصرانی پیالہ کی خریداری کے مدعی تھے اور "بدیل کے ورثاء اس چیز کے منکر تھے۔ مدعی کے پاس گواہ نہیں تھے۔ لہٰذا میت کے قریب ترین دور شتہ داروں نے قسم کھائی کہ یہ پیالہ "بدیل "کی ملکیت تھا اور یہ دونوں نصرانی جھوٹ بول رہے ہیں، اس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "بدیل کے ورثاء کے حق میں فیصلہ فرمادیا چنانچہ پیالے کی قیمت ایک ہزار درہم ورثاء کو ادا کی گئی۔ چونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہی آیات کی روشنی میں اس مقدمہ کا فیصلہ فرمایا تھا، اس لیے اس واقعہ کو ان آیات کا سبب نزول قرار دیا جاتا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں ایک حکم شرعی کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔

آیت میں گواہ سے مراد وصی ہیں، ان کے اقرار و بیان کو گواہی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اگر وہ دو نہ ہوں بلکہ ایک ہو یا معتبر نہ ہوں تو بھی انہیں وصی بنایا جاسکتا۔ (فہم طاہر)

ذٰلِكَ اَدْنٰى : یہ قریب تر ہے۔} عدی اور تمیم کے واقعے میں گواہی اور قسم کا جو قانون بیان ہوا یعنی جن کے خلاف دعویٰ دائر کیا گیا قسمیں کھانے کے بعد ان کا جھوٹ ثابت ہو جائے تو اب میت کے ورثا میں سے دو شخص قسمیں کھائیں، اس کی حکمت بتائی جارہی ہے کہ لوگ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور شہادتوں میں راہ حق و صواب نہ چھوڑیں اور اس بات سے ڈرتے رہیں کہ جھوٹی گواہی کا انجام شرمندگی و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی گواہی دینے کی مذمت

فی زمانہ لوگوں کی حالت اتنی ابتر ہو چکی ہے کہ ان کے نزدیک جھوٹی قسم کھانا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹے مقدمات میں پھنسوا کر اپنے مسلمان بھائی کی عزت تار تار کر دینا، لوہے کی سنگین سلاخوں کے پیچھے لاچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دینا، اپنے مسلمان بھائی کا ناحق مال ہڑپ کر جانا گویا کہ جرائم کی فہرست میں داخل ہی نہیں۔ اس دنیا کی فانی زندگی کو حرف آخر سمجھ بیٹھنا عقلمندی نہیں نادانی اور بیوقوفی کی انتہا ہے، انھیں چاہیے کہ ان قرآنی آیات اور ان احادیث کو بغور پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے جھوٹی قسم پر حلف اٹھایا تاکہ اس کے ذریعے اپنے مسلمان بھائی کا مال ہڑپ کرلے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت ناراض ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جھوٹے گواہ کے قدم ہٹنے بھی نہ پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم واجب کر دے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس نے ایسی گواہی دی جس سے کسی مسلمان مرد کا مال ہلاک ہو جائے یا کسی کا خون بہایا جائے تو اس نے (اپنے اوپر) جہنم کو واجب کرلیا۔ (صراط)

آیت مبارکہ:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۱۰۹

لغۃ القرآن: [يَوْمَ : اس دن][يَجْمَعُ : وہ جمع کریگا][اللّٰهُ : اللہ][الرُّسُلَ : رسولوں][فَيَقُوْلُ : پھر وہ کہے گا][مَاذَآ : کیا][اُجِبْتُمْ : جواب دیے گئے تم]][قَالُوْا : انہوں نے کہا][لَا عِلْمَ : نہیں علم][لَنَا : ہمارے پاس][اِنَّكَ : بیشک تو][اَنْتَ : تو][عَلَّامُ : خوب جاننے والا][الْغُيُوْبِ : غیبوں کا]

ترجمہ: (اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع فرمائے گا پھر (ان سے) فرمائے گا کہ تمہیں (تمہاری امتوں کی طرف سے دعوت دین کا) کیا جواب دیا گیا تھا؟ وہ (حضورِ الٰہی میں) عرض کریں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، بیشک تو ہی غیب کی سب باتوں کا خوب جاننے والا ہے

تشریح:

آیات سابقہ سے مناسبت

قرآن مجید میں اللہ کا اسلوب یہ ہے کہ جب اللہ احکام شرعیہ بیان فرماتا ہے تو اس کے بعد اپنی ذات اور صفات کا ذکر فرماتا ہے یا انبیاء (علیہم السلام) کے احوال اور اوصاف کا ذکر فرماتا ہے اور یا احوال قیامت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حج کے احکام بیان فرمائے تھے۔ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ فرمایا: پھر سفر میں وصیت کرنے اور اس پر گواہ بنانے کے احکام بیان فرمائے 'تو اب اس کے بعد اس آیت میں آیت میں احوال قیامت کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد دوسری آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے احوال بیان فرمائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں سفر میں وصیت پر گواہ بنانے کا ذکر تھا اور گواہی میں یہ ضروری ہے کہ وہ خیانت نہ کرے 'اور اپنے کسی فائدہ کی بناء

پر گواہی میں ردوبدل نہ کرے 'اور نہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی رعایت کرے 'اس لیے اس آیت کے بعد اس آیت کا ذکر کیا جس میں قیامت کا ذکر ہے 'تاکہ انسان قیامت کی ہول ناکیوں اور خدا کے سامنے پیش ہونے کے ڈر سے صحیح اور سچی گواہی دے 'اور اس میں خیانت نہ کرے۔ (تبیان)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سارے بنی نوع انسان کو اکٹھا فرمائے گا لیکن اس آیت میں صرف انبیائے کرام (علیہم السلام) کے ذکر پر اس لیے اکتفا کیا کیونکہ امتیں انبیائے کرام (علیہم السلام) کے تابع شمار کی جاتی ہیں اور قیامت کے دن وہ بھی اپنے نبیوں کے ساتھ موجود ہوں گی۔ (تفسیر روح المعانی) لہٰذا امتوں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ انبیائے کرام (علیہم السلام) سے سوال کرے گا کہ ان کی تبلیغ کے جواب میں ان کی امتوں نے کیا کہا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود امتوں کے جواب سے خوب آگاہ ہے۔ اس پر انبیائے کرام (علیہم السلام) از راہ ادب و تعظیم عرض کریں گے: ہمیں کوئی علم نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اور کامل علم کے مقابلہ میں ہمارا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے احوال کو ہماری نسبت بہتر جانتا ہے کیونکہ وہ سب غیبوں کو جاننے والا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انبیائے کرام (علیہم السلام) اپنی امتوں کے احوال سے لاعلم ہیں۔ جن انبیائے کرام (علیہم السلام) کی تکذیب کی گئی، جن کو زخمی یا قتل کیا گیا وہ انبیائے کرام (علیہم السلام) اپنی ان تکالیف سے کیسے لاعلم ہو سکتے ہیں، لیکن پھر بھی اپنی امتوں پر شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود خاموش ہیں لاکہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے جو سلوک ان کی امتوں کے ساتھ کرنا چاہتا ہے کرے۔ میدان حشر میں ہمارے شکوہ سے ان کی سزا میں کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں از راہ ادب اور اپنی امت پر شفقت کی خاطر لاعلمی کا اظہار کریں گے لیکن در حقیقت وہ اپنی امتوں کے احوال سے لاعلم نہیں ہیں، وگرنہ وہ اپنی امتوں پر گواہی کیسے دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لے آئیں گے اور (اے حبیب مکرم!) ہم آپ کو ان سب پر گواہ بنا کر لے آئیں گے۔" (قرآن 41:4 :) اس آیت میں سوال اگرچہ انبیائے کرام (علیہم السلام) سے پوچھا جارہا ہے لیکن مقصد نافرمان امت کی سرزنش اور تحقیر ہے جیسا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زندہ در گور کی ہوئی لڑکی سے سوال کرے گا کہ کس گناہ کے بدلے میں اسے قتل کیا گیا؟ (قرآن: 8:81) یہ سوال بھی اگرچہ زندہ در گور کی گئی لڑکی سے پوچھا جارہا ہے لیکن مقصد قاتل کی سرزنش اور تحقیر ہے۔ اسمیں امت مسلمہ کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ قیامت کے دن کی جوابدہی کے لیے ابھی سے تیاری کرے۔ اس ضمن میں ایک حدیث ملاحظہ کریں، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن کسی آدمی کا قدم اس وقت تک میزان عدل سے علیحدہ نہ ہو سکتے گا جب تک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لیا جائے:

1۔ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں صرف کی۔ (اچھے یا برے)؟

2۔ اس نے اپنی جوانی کس کام میں صرف کی۔ (اچھے یا برے)؟

3۔ اس نے اپنا مال کہاں سے کمایا: (حلال طریقہ سے یا حرام سے)؟

4۔ اس نے اپنا مال کہا خرچ کیا۔ (اچھے کاموں میں یا برے کاموں میں)؟

5۔ اس نے اپنے علم پر کیا عمل کیا۔ (اپنے علم پر کتنا عمل کیا)؟

(ترمذی: 2416: ابواب صفۃ القیامۃ: باب 1) (امداد)

اس سوال ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ سارے انبیاء کو ان کے امتیوں کے جوابات کا علم ہے۔ اس لیے کہ اس علم کے بعد، کہ میرے سوال کا جواب مخاطب کے پاس نہیں ہے سوال کرنا ایک جہالت ہے، جو ذات باری تعالیٰ سے ناممکن ہے۔ تو یہ سوال مبنی بر حکمت ہے،

خواہ یہ منکروں کو ذلیل ورسوا کرنے کے واسطے ہو۔۔یا۔۔اسواسطیے کہ انبیاء (علیہم السلام) اپنی اپنی امت کے مسلمانوں کے اسلام پر گواہی دیں۔ توجب یہ سوال مبنی بر حکمت ہوا۔۔۔

تواسکے تعلق سے (سب)، یعنی سارے انبیاء کرام (کا) جو (جواب ہے کہ ہمارا علم کوئی چیز نہیں ہے، بیشک توہی علام الغیوب ہے) تو یہ جواب بھی مبنی بر حکمت ہے۔

اسلئے کہ انبیاء کرام نے جان لیا تھا کہ ان کے کلام سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی نقصان دور ہوگا، اور ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے سامنے سکوت کیا جائے اور معاملہ اس حکیم اور عادل پر چھوڑ دیا جائے 'جو حی وقیوم ' 'لایموت ' ہے۔(اشرفی)

حق کی شہادت دینا مسلمان کا فریضہ ہے جو انبیاء کا مشن ہے۔جب انبیاء کرام (علیہ السلام) سے ان کے مشن کے بارے میں سوال ہوگا توان کے متبعین کس طرح مسؤلیت سے بچ سکتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقائد میں تین باتیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو یکتا جانتے ہوئے اس پر کامل ایمان رکھنا، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خاتم المرسلین مانتے ہوئے ان کی رسالت پہ ایمان لانا، تیسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے آدمی کا قیامت پر ایمان ہو کہ وہ قائم ہوگی اور ہم سب نے رب کبریا کی عدالت میں اپنی ہر بات اور عمل کا جواب دینا ہے۔ قیام قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ دلائل دیے گئے ہیں یہ ایسا دن ہے کہ جبرائیل امین (علیہ السلام) اور تمام ملائکہ (علیہ السلام) قطار اندر قطار رب کبریا کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ یہ پچاس ہزار سال کا دن ہوگا۔اس میں ہر نبی وقت مقررہ پر اپنی امت کو لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوگا۔ یہاں ہر فرد کو اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں سوال ہوگا۔ قرآن مجید کی تلاوت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب انبیاء (علیہ السلام) اپنی امتوں کے ساتھ پیش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ پہلے اس امت کے نبی سے سوال کرے گا کہ آپ نے میرا پیغام ٹھیک طریقے سے پہنچایا یا نہیں ؟اس کے جواب میں تمہاری امت نے کیا وطیرہ اختیار کیا؟انبیاء کرام (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کناں ہوں گے کہ الٰہی ہم تو نہیں جانتے آپ ہی غیب کو جاننے والے ہیں۔انبیاء کا لاعلمی کا اظہار کرنے کے بارے میں مفسرین نے تین قسم کی تفسیر کی ہے :

ا۔ لَاعِلْمَ لَنَا کہ ہمیں علم نہیں سے مراد علم کامل ہے۔ کیونکہ عَلّامُ الغیوب کے لفظ ظاہر کر رہے ہیں کہ انبیاء صرف انھی حالات سے واقف تھے اور ہوتے ہیں جو ان کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔لوگوں کی خلوت کی زندگی کو انبیاء (علیہ السلام) نہیں جانتے۔

۲۔ لَاعِلْمَ لَنَا کا یہ معنی ہے کہ جب تک ہم ان میں موجود رہے اس وقت تک تو ہمیں کچھ نہ کچھ ان کے حالات کا علم ہے لیکن ان کے بارے میں کامل اور اکمل علم تیرے سوا کوئی نہیں جانتا۔

(فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا) [النساء : ۴۱]

"بھلا اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے، پھر ان پر (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو گواہ بنادیں گے۔"

۳۔ انبیاء اپنی امتوں کے بارے میں شہادت دیں گے لہٰذا اس آیت کا یہ مفہوم لینے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور دبدبہ کی وجہ سے انبیاء کرام (علیہ السلام) پہلے لاعلم لنا کا اظہار کریں گے۔ بہر حال قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بات مسلمہ ہے کہ انبیاء کرام (علیہ السلام) وہی کچھ جانتے تھے جس کا علم اللہ تعالیٰ انھیں عطا کیا تھا یا جو کام ان کی موجودگی میں ہوا کرتے تھے۔

مسائل

ا۔ قیامت کے دن تمام انبیاء کرام (علیہ السلام) سے بھی سوال ہوگا۔

۲۔انبیاء ورسل (علیہ السلام) سے ان کی رسالت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (فہم)

آیت مبارکہ:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

لغۃ القرآن: [اِذْ : جب][قَالَ : کہا اس نے][اللّٰهُ : اللہ][يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ : اے عیسیٰ ابن مریم][اذْكُرْ : یاد کرو][نِعْمَتِيْ : میری نعمتیں][عَلَيْكَ : تجھ پر][وَعَلٰي : اور پر][وَالِدَتِكَ : تیری ماں][ماِذْ : جب][اَيَّدْتُّكَ : میں نے تیری مدد کی][بِرُوْحِ الْقُدُسِ: ساتھ روح پاک/قدس][تُكَلِّمُ : تو کلام کرتا تھا][النَّاسَ : لوگ][فِي الْمَهْدِ : میں گود][وَكَهْلًا : اور ادھیڑ عمر][وَاِذْ : اور جب][عَلَّمْتُكَ : میں نے تجھے سکھائی][الْكِتٰبَ : کتاب][وَالْحِكْمَةَ : اور دانائی][وَالتَّوْرٰىةَ : اور تورات][وَالْاِنْجِيْلَ : اور انجیل][وَاِذْ : اور جب][تَخْلُقُ : تو بناتا تھا][مِنَ : سے][الطِّيْنِ : مٹی][كَهَيْئَةِ : مانند شکل][الطَّيْرِ : پرندے کی][بِاِذْنِيْ : ساتھ میرے حکم][فَتَنْفُخُ : تو

پھونک مارتا تھا][فِيْهَا : اس میں][فَتَكُوْنُ : تو وہ ہوجاتا تھا][طَيْرًاۢ : پرندہ][بِاِذْنِيْ : میرے حکم سے][وَتُبْرِئُ : اور توتندرست کرتا تھا][الْاَكْمَهَ : پیدائشی نابینا][وَالْاَبْرَصَ : اور برص والا][بِاِذْنِيْ : میرے حکم سے ج][وَاِذْ تُخْرِجُ : اور جب تو نکالتا تھا][الْمَوْتٰى: مردے][بِاِذْنِيْ : میرے حکم سے][وَاِذْ كَفَفْتُ : اور جب میں نے روکا][بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ : بنی اسرائیل کو][عَنْكَ : تجھ سے][اِذْ جِئْتَهُمْ : جب تو انکے پاس لایا][بِالْبَيِّنٰتِ : واضح دلیلیں][فَقَالَ : پھر کہا][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : جنہوں نے انکار کیا][مِنْهُمْ : ان سے][اِنْ : نہیں ہے][هٰذَآ : یہ][اِلَّا : مگر][سِحْرٌ : جادو][مُّبِيْنٌ: کھلا]

ترجمہ: جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ ابن مریم ! تم اپنے اوپر اور اپنی والدہ پر میرا احسان یاد کرو جب میں نے پاک روح (جبرائیل) کے ذریعے تمہیں تقویت بخشی، تم گہوارے میں (بعہد طفولیت) اور پختہ عمری میں (بعہد تبلیغ ورسالت یکساں انداز سے) لوگوں سے گفتگو کرتے تھے، اور جب میں نے تمہیں کتاب اور حکمت (و دانائی) اور توراۃ اور انجیل سکھائی، اور جب تم میرے حکم سے مٹی کے گارے سے پرندے کی شکل کی مانند (مورتی) بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ (مورتی) میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی، اور جب تم مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں (یعنی برص زدہ مریضوں) کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے، اور جب تم میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کرکے قبر سے) نکال (کھڑا کر) دیتے تھے، اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تمہارے (قتل) سے روک دیا تھا جب کہ تم ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو ان میں سے کافروں نے (یہ) کہہ دیا کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں

تشریح:

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی ایک یہ صفت بیان کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دن تمام نبیوں سے سوال کرے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا تھا؟ اس آیت میں اس دن کی دوسری صفت بیان فرمائی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ بالخصوص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کلام فرمائے گا اور ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا ' اور اس سے مقصود عیسائیوں کی مذمت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے واسطے سے ان پر اتنے احسانات فرمائے اور ان کی فرمائشیں پوری کیں ' پھر انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ' اور اس کا شریک بنالیا۔ دوسری امتوں کے کافروں نے تو صرف اپنے نبیوں کا کفر کیا تھا ' اور ان کی شان میں نازیبا باتیں کہی تھیں ' یہ کفر میں ان سے بڑھ گئے ' انھوں نے اللہ کی طرف بیوی اور بیٹے کی نسبت کی۔ "تعالیٰ اللہ عن ذالک"۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ پر اپنی

نعمتیں یاد دلائیں تاکہ دنیا کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کتنی عزت اور کرامت عطا فرمائی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا اس کہ اسلام تمام آسمانی مذاہب کے رہنماؤں کی تعظیم اور تکریم کرتا ہے' اور تمام نبیوں کی شان اور ان کے بلند درجات بیان کرتا ہے' اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے سبق اور عبرت ہے جو پیغمبر اسلام سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تنقیص اور توہین میں دن رات کوشاں رہتے ہیں' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اپنی نعمتیں گنواتے ہوئے فرمایا: جب میں نے روح القدس سے تمہاری مدد کی۔

روح القدس کا معنی

روح القدس سے سے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) مراد ہیں۔ اس میں روح کی اضافت قدس کی طرف ہے' قدس سے مراد اللہ عزوجل کی ذات ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ روح' ارواح کی ماہیت مختلف ہوتی ہے' بعض طاہرہ نورانیہ ہوتی ہیں' بعض خبیثہ ظلمانیہ ہوتی ہیں۔
حضرت جبرائیل' وہ روح ہیں جو طاہر اور نورانی ہے' اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ ان کی مدد طاہر اور نورانی روح سے کی گئی ہے۔ (تبیان)

حیات مسیح اور ان کے زمین پر نازل ہونے کی دلیل

تم گہوارے میں بھی لوگوں سے کلام کرتے تھے اور پختہ عمر میں بھی یعنی بچپن میں اور پختہ عمر میں' ہر دور میں ان کا کلام عقل اور حکمت کے مطابق تھا اور انبیاء اور حکماء کے کلام کے موافق تھا' کیونکہ پنگھوڑے میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا میں اللہ کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے' اور میں جہاں بھی ہوں' مجھے برکت والا بنایا ہے اور میں جب تک زندہ ہوں مجھے نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کا حکم دیا۔ (مریم: ۳۰) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے گہوارے میں وحی فرمائی' اب یہاں ایک سوال ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا گہوارہ میں کلام کرنا تو معجزہ ہے' پختہ عمر میں ان کا کلام کرنا کس طرح معجزہ ہوگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کہولت تیس سال کے بعد کی عمر کو کہتے ہیں' اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تیس سال سے آسمانوں کی طرف لیے گئے اور کئی ہزار سال بعد زمین پر ان کا نزول ہوگا' اور اس وقت وہ پختہ عمر کے ہوں گے اور یہ بھی ان کا معجزہ ہے' کہ کئی ہزار سال گزرنے کے بعد بھی وہ صرف کہول ہوں گے' حتی کہ بوڑھے بھی نہیں ہوں گے اور پختہ عمر کی حالت میں کلام کریں گے۔
اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمین میں نزول کی بھی دلیل ہے' کیونکہ وہ پختہ عمر اور کہولت کے زمانہ کو پانے سے پہلے آسمانوں پر اٹھا لیے گئے تھے اور قرآن مجید کے مطابق ان کا کہولت کی عمر میں کلام کرنا بھی ضروری ہے' اس سے لازم آیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) زندہ بھی ہیں اور ان کا زمین پر نزول بھی ہوگا ورنہ اس آیت کا صدق کیسے ہوگا؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے کہولت کا زمانہ پالیا تھا اور وہ کہولت کے زمانہ میں باتیں کرتے تھے تو یہ معجزہ کیسے ہوا؟ کہولت کے زمانہ میں تو سب باتیں کرتے ہیں' یہ معجزہ اسی وقت ہوگا جب

انھیں کہولت کے زمانہ سے پہلے اٹھالیا گیا ہو ‘ اور وہ کئی ہزار برس بعد زمین پر نازل ہوں اور کہولت کا زمانہ پا کر لوگوں سے باتیں کریں ‘ سو اس طرح اس آیت میں ان کے معجزہ کا ذکر بھی ہوگا اور یہ آیت ان کی حیات اور ان کے زمین پر نازل ہونے کی دلیل بھی ہوگی۔

کتاب ‘ حکمت اور توراۃ اور انجیل کا معنی

اور جب میں نے تم کو کتاب ‘ حکمت اور انجیل کا علم دیا کتاب سے مراد یا تو اس کا مصدری معنی ہے ‘ یعنی لکھنا ‘ اور یا کتاب بمعنی مکتوب ہے ‘ اور اس سے مراد جنس کتاب ہے۔ کیونکہ انسان پہلے آسان کتابیں پڑھتا ہے اور پھر مشکل اور ادق کتابیں پڑھتا ہے ‘ اور حکمت سے مراد علوم نظریہ اور علوم عملیہ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد نازل شدہ کتابوں کا علم اور ان کے اسرار کی فہم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد نفس کا کمال علمی اور علم کے تقاضوں پر عمل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد صحیح قول ہے ‘ توراۃ سے مراد وہ کتاب ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل کی گئی اس میں شرائع اور احکام ہیں اور انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل کی گئی ‘ اس میں مواعظ اور اخلاق ہیں ‘ پہلے کتاب کا ذکر فرمایا ‘ پھر توراۃ اور انجیل کا ذکر فرمایا حالانکہ وہ بھی کتابیں ہیں ‘ یہ شرف اور فضیلت کی وجہ سے عام کے بعد خاص کا ذکر ہے ‘ جیسا کہ اس آیت میں ملائکہ کے بعد جبرائیل اور میکائیل کا ذکر کیا گیا ہے ‘ حالانکہ وہ بھی ملائکہ میں سے ہیں :

(آیت) ” من کان عدوا اللہ وملآئکیہ ورسلہ وجبرائیل ومیکل فان اللہ عدو للکافرین“۔ (البقرہ : ٩٨)

ترجمہ : جو شخص اللہ اور فرشتوں اور رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے ‘ تو اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا پرندے بنانا ‘ بیماروں کو شفا دینا اور دیگر معجزات

جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی صورت بناتے تھے ‘ پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ ہوجاتی تھی ‘ اور تم میرے حکم سے مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو تندرست کرتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ لوگوں نے بطور عناد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا ‘ اگر آپ اپنے دعوی میں سچے ہیں تو ہمارے لیے چمگادڑ بنائیں اور اس میں روح ڈال دیں ‘ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے مٹی اٹھائی اور اس سے چمگادڑ کی صورت بنائی۔ پھر اس میں پھونک ماری تو وہ اڑنے لگی ‘ چمگادڑ کو بنانا اور اس میں پھونک مارنا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا کسب تھا ‘ اور اس کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا فعل تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ انھوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ یہ گوشت اور خون سے بنا ہوا عجیب ترین جانور ہے اور یہ پروں کے ساتھ اڑتا ہے اور حیوان کی طرح بچے دیتا ہے ‘ اور باقی پرندوں کی طرح انڈے نہیں دیتا ‘ اس کے تھن ہیں جن سے دودھ نکلتا ہے ‘ انسان کی طرح ہنستا ہے اور اس کو عورت کی طرح حیض آتا ہے ‘ یہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے نہ

رات کے اندھیرے میں ' یہ رات کے ابتدائی حصہ تک دکھائی دیتا ہے۔ (حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی البیضاوی ' ج ۲ 'ص ۱۴۶ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

اعمی اس شخص کو کہتے ہیں جو بصیر پیدا ہو اور بعد میں اندھا ہو جائے اور اکمہ اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو اندھا پیدا ہو۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مادر زاد اندھوں کو اللہ کے حکم سے بینا کرتے تھے 'برص ایک جلدی بیماری ہے جس کی وجہ سے جلد سفید ہو جاتی ہے اور ایک تکلیف دہ خارش ہوتی ہے 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے حکم سے برص کے مریضوں کو تندرست کردیتے تھے۔ اور تم میرے حکم سے مردوں کو نکالتے تھے۔ یعنی تم میرے حکم سے مردوں کو زندہ کرکے قبروں سے نکالتے تھے۔ جب تم اللہ سے دعا کرکے مردے سے یہ کہتے تھے 'اللہ کے اذن سے اپنی قبر سے باہر آ 'ان تینوں افعال میں اللہ کے اذن کا ذکر کیا ہے 'تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان افعال کا فاعل حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔

اور میں نے (ہی) تم کو بنو اسرائیل سے بچایا 'جب تم ان کے پاس روشن معجزات لے کر گئے تو ان میں سے کافروں نے کہا یہ کھلے ہوئے جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے یعنی جب تم بنو اسرائیل کے پاس اپنی نبوت اور رسالت پر دلائل اور معجزات لے کر گئے 'تو انھوں نے تمہاری تکذیب کی اور تم پر تہمت لگائی کہ تم جادو گر ہو 'اور انھوں نے تمہیں قتل کرنے اور سولی دینے کا ارادہ کیا اور میں نے تم کو اپنی طرف اوپر اٹھالیا اور تم کو ان کے شر سے بچایا۔ (تبیان)

دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف حجت قائم کی جارہی ہے تاکہ یہود کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس کو قتل کرنے کی وہ سازشیں کیا کرتے تھے وہ تو اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی ہیں اور عیسائیوں کو پتہ چل جائے کہ جن کو وہ خدا یا خدا کا بیٹا کہتے تھے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا ہے یعنی حضرت مریم سلام اللہ علیہا وہ خوش نصیب ماں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جیسا بیٹا عطا فرمایا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) وہ عظیم نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی عظمتوں سے نوازا، مثلاً:

1۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین (علیہ السلام) کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تائید اور مدد کے لیے بھیجا جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ رہتے تاکہ یہودی انھیں قتل نہ کر سکیں۔

2۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے گہوارے اور بچپن میں بھی کلام کیا اور پختہ عمر میں بھی کلام کریں گے۔ ماں کی گود میں کلام کرنا تو یقیناً ایک معجزہ ہے لیکن پختہ عمر میں کلام کرنا کوئی عیب بات نہیں۔ سارے انسان اس عمر میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پختہ عمر زندگی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہے یعنی جب بال سفید ہونا شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ جب تک سارے بال سیاہ یا پیدائشی رنگت والے ہوں وہ جوانی ہے اور جب سارے بال سفید ہو جائیں تو وہ بڑھاپا ہے۔ ان کے درمیان والی عمر کو پختہ عمر کہا جاتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پختہ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھا لیے گئے تھے، لہٰذا جب وہ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لا کر پختہ عمر کو پہنچ کر کلام کریں گے تو آپ کا دوبارہ زمین پر آکر کلام کرنا بھی ایک خصوصی معجزہ ہوگا۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ماں کی گود میں بھی ایسا ہی علم و حکمت سے لبریز کلام کیا جیسا کہ پختہ عمر میں آپ عاقلانہ کلام کریں گے۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل سکھائی۔ کتاب سے مراد یا تو لکھنا ہے یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے لکھنا سکھایا یا جنس کتاب سے مراد یعنی پہلے عام آسمانی کتابوں کا ذکر کرکے پھر توراۃ و انجیل کا ذکر کیا جیسے قرآن مجید میں پہلے جملہ فرشتوں کا ذکر کرکے پھر جبرائیل امین (علیہ السلام) کا ذکر کیا حالانکہ وہ جملہ فرشتوں میں شامل ہے مگر خصوصی فضیلت کے اعتبار سے دوبارہ ذکر کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث پاک ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قرآن وحدیث کی تعلیم دی کیونکہ آسمان سے نازل ہونے کے بعد آپ قرآن وحدیث کی تبلیغ فرمائیں گے۔ (تفسیر نعیمی)

4۔ کیچڑ سے پرندے کی صورت بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ پرندہ بن جاتا۔

5۔ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تندرست کر دیتے۔

6۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے۔

موجودہ بائبل میں بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بہت سے معجزات کا ذکر موجود ہے، مثلاً:

The home was filled with mourning people, but he said, " Stop the weeping! She is nont dead; -1 Then he took her by the hand and called, "Get up, little girl! And at that --"!she is only asleep (The Living Bible: 1975:55-Luke:8:52)-moment her life returned and she jumped up

ایک سردار کی بچی مر گئی اور اس کا گھر رونے والے لوگوں کے ساتھ بھر گیا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس گھر میں گئے اور لوگوں کو کہا: "رونا بند کردو، وہ مردہ نہیں، صرف سو رہی ہے۔"۔۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پکار کر کہا: "اے لڑکی اٹھ! اسی لمحہ اس کی زندگی واپس آ گئی اور وہ اٹھ بیٹھی۔"

He -Look! a leper is approaching-Large crowds followed Jesus as he came down the hillside-2 Sir, " the leper pleads, " If you want to, you can heal me." Jesus "-kneels before him, worshipping -touches the man, "I want to, " he says; "Be healed."And instantly the leprosy disappears (Living Bible:1975:3-Matthew:8:1)

جب عیسیٰ (علیہ السلام) اس پہاڑ سے اترے تو لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم آپ کے ساتھ ہولیا، دیکھو ایک کوڑھی عبادت کرتے ہوئے اس کے سامنے جھک گیا اور عرض کی: جناب! اگر آپ چاہیں تو آپ مجھے تندرست کر سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس کوڑھی کو اپنے ہاتھ سے چھوا اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ تو تندرست ہو جائے اور فوراً اس کا کوڑھ غائب ہو گیا یعنی وہ تندرست ہو گیا۔

Then he touched their eyes and said, "Beacause of your faith it will happen." And suddenly they -3 (The LIving Bible 1975:30-Natthew:9:29)-could see

دو اندھے آدمیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کی: ہمارے اوپر رحم فرما! تب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کی آنکھیں چھو کر کہا: تمہارے عقیدہ کے مطابق تمہارے لیے ہو جائے اور اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ دیکھنے لگ گئے۔

So he spoke -Master, Master, we are sinking!" The shouted"-They rushed over and woke him up-4 And they ---!to the storm: "Be quiet," he said, and the wind and waves subsided and all was calm

were filled with awe and fear of him and said to one another, " Who is this man, that even the winds

(The Living Bible 1975:25۔Luke:8:24)"?and waves obey him

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے شاگردوں کے ساتھ کشتی میں سفر کررہے تھے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کشتی میں سو گئے اور اچانک ہوا اور پانی کا اتنا زبردست طوفان امڈ آیا کہ ان کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ شاگردوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو جلدی سے جگایا اور چلا کر کہا: صاحب! صاحب! ہم ڈوب رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اٹھ کر ہوا اور پانی کو رکنے کا حکم دیا تو وہ دونوں تھم گئے اور امن ہوگیا۔۔ یہ دیکھ کر شاگردوں پر خوف طاری ہوگیا اور گھبرا کر ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ کون آدمی ہے کہ ہوا اور پانی بھی اس کا حکم مانتے ہیں؟

And there are also many other things which Jesus did, the which, if they should be written -5

۔everyone, I suppose that even the world itself could not contain the books that should be written

(John: 21:25: The Bible 1954)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ایک شاگرد کہتا ہے: "اور بھی بہت سے کام جو یسوع نے کئے۔ اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی یعنی وہ اتنی زیادہ ہوتیں کہ دنیا میں سمانہ سکتیں۔"

(147) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے روشن معجزات کو دیکھ کر یہودیوں نے آ کو جادو گر کہنا شروع کردیا اور مخالفت میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ آپ کے قتل کرنے اور سولی دینے کا فیصلہ کرلیا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی سازشوں سے بچالیا اور زندہ آسمانوں پر اٹھالیا۔ تفصیلات کے لیے سورۃالنساء کی آیات نمبر 157 تا 159 ملاحظہ کریں۔ آپ کو قتل کرنے کی یہودی سازشوں کے چند نمونے موجودہ بائبل میں بھی مذکور ہیں: مثلاً:

But Jesus was hidden from them, and ۔At that point the Jewish leaders picked up stones to kill him-1

(John:8:59: The living Bible 1975)۔walked past them and left the Temple

تب یہودی لیڈروں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کے لیے پتھر اٹھائے لیکن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئے اور ان کے درمیان سے گزر کر ہیکل سے باہر نکل گئے۔

John:10:39: The)۔But he walked away and left them۔Once again they started to arrest him-2

(Living Bible1975

ایک دفعہ پھر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کو چھوڑ کر دور نکل گئے۔ (امداد)

المختصر۔۔ فصاحت و بلاعت کے لحاظ سے آپ کے بچپنے اور بڑھاپے کے کلام میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کے بڑھاپے میں کلام کرنے میں معجزانہ شان اس لیے ہے کہ آپ کا بڑھاپا لوگوں پر عام طور سے عادتاً طاری ہونے والے بڑھاپے کی طرح نہیں، بلکہ آپ جوانی ہی میں آسمان پر اٹھالئے گئے اور پھر ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود، جب زمین پر اتارے جائینگے، تو آپ کی عمر وہی ہوگی جس عمر میں آپ اٹھائے گئے تھے۔ یعنی آپ کڑیل جوان

اور سن رسیدگی کی جملہ علامات سے پاک ہوں گے۔۔ پھر۔۔ یہاں پر رائج فطری دستور کے مطابق وہ بڑھاپے تک پہنچیں گے۔ تو یہ بڑھاپا وہ ہے، جو ایک نوجوان انسان پر ہزاوں سال کے بعد طاری ہوا، تو یہ بڑھاپا بھی ایک معجزہ ہی ہے۔

اس میں یہ واضح اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ آج بھی باحیات ہیں۔ نہ انھیں شہید کیا گیا اور نہ ہی انھیں سولی دی گئی۔۔ چنانچہ۔۔ قرب قیامت تک وہی حیات ان سے وابستہ رہے گی اور ان پر وفات طاری نہیں کی جائے گی۔ جب اسی حیات کے ساتھ وہ زمین پر تشریف لے آئینگے اور زمین پر اپنی طبعی عمر شریف گزار لینگے، تو پھر ان پر وفات طاری کی جائے گی اور پھر گنبد خضریٰ میں ان کی آخری آرام گاہ ہوگی۔۔ تو۔۔

اے عیسیٰ ابن مریم! مذکورہ بالا نعمتوں کے ساتھ ساتھ ان نعمتوں کو بھی یاد کرو (اور) ذہن میں حاضر کرلو (جبکہ سکھادیا میں نے تم کو کتاب) یعنی خط وکتابت (اور حکمت)، یعنی چیزوں کی سمجھ (اور توریت وانجیل) کے معانی اور حقائق۔ (اور جبکہ) میری عطافرمودہ قدرت واختیار سے (بنادیتے تم مٹی سے جیسے چڑیا کی مورت میرے حکم سے، پھر پھونکتے اس میں، تو وہ چڑیا ہوجاتی میرے حکم سے)۔ اس سلسلے میں گو اسباب کو استعمال کرنا تمہارا فعل تھا، لیکن اس کا پرندہ بنکر اڑجانا، یہ سب میری ہی قدرت سے ہوا۔

اسکی وجہ یہ ہوئی کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے ازراہ بغاوت وتعنت سوال کیا کہ ایک چمگادڑ بنا کر اس میں روح پھونک دیجئے، تاکہ معلوم کریں کہ آپ سچے نبی ہیں۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے سوال پر گارا اٹھایا اور اسے چمگادڑ کی طرح بنا کر اس روح پھونکی، تو وہ آسمان اور زمین کے درمیان اڑنے لگا۔ غالبا بنی اسرائیل نے آپ سے چمگادڑ اور پھر اس میں روح پھونکنے کا اس لیے سوال کیا تھا کہ چمگادڑ ایک عجیب الخلقت پرندہ ہے۔۔ مثلا: وہ از سرتاپا، صرف گوشت یا خون ہے، اس میں ہڈیاں نہیں۔ اڑتا ہے تو پروں کے بغیر۔ حیوانوں کی طرح بچے جنتا ہے، پرندوں کی طرح انڈے نہیں دیتا۔ اس کی مادہ کا پستان ہوتا ہے، جس سے دودھ نکلتا ہے۔ نہ وہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں۔ صرف دو وقت دیکھتا ہے: (۱)۔۔ غروب آفتاب کے بعد ایک گھنٹہ۔ (۲)۔۔ طلوع فجر کے بعد صبح کی سفیدی تیز ہونے تک۔ وہ انسان کی طرح ہنستا ہے اور اسے عورتوں کی طرح حیض بھی آتا ہے۔ بنی اسرائیل نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا چمگادڑ اڑتا ہوا دیکھا، تو ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ تو جادو ہے۔

مذکورہ بالا اس اعجاز (اور) قدرت کے مظاہرہ کے ساتھ (تندرست کردیتے) تھے (تم پیدائشی اندھے کو اور سفید داغ والے کو میرے حکم سے)۔ اس دور کے اطباء ان بیماریوں کے علاج سے عاجز تھے۔ (اور جب زندہ نکال دیتے تم مردوں کو) ان کی قبروں سے (میرے حکم سے) میری عطا کردہ قدرت سے۔

۔۔ چنانچہ۔۔ آپ نے سام بن نوح اور ان کے سوا دو مرد ایک خاتون اور ایک لونڈی کو ان کی قبروں سے باہر نکالنے کا اعجاز دکھایا۔

(اور جبکہ روک ڈالدی میں بنی اسرئیل کیلئے تم سے) جبکہ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے تھے اور تمہیں مار ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے، تو ان کے ارادے اور تمہاری ذات کے درمیان میراارادہ حائل ہوگیا اور وہ تمہیں نقصان نہ پہنچاسکے اور نہ ہی قتل کرسکے۔ بنی اسرائیل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی سوچ اس وقت پیدا ہوئی تھی (جبکہ لائے تم ان کے پاس معجزے) جن کے بعض کا ذکر اوپر ہوا، (تو بولے وہ جو کافر تھے ان) بنی اسرائیلیوں (میں، کہ یہ بس کھلا ہوا جادو ہے) یعنی یہ ایسا جادو ہے جس کا جادو ہونا ہم سب پر ظاہر ہوگیا۔ (اشرفی)

مرزا غلام احمد قادیانی نے سرسید علی گرھی کی تقلید میں ان معجزات کا انکار کیا اور اس پر اضافہ کیا کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے اور عیسائیوں کی طرح عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا ماننا ہے پس مرزائے قادیان خدا تعالی کی ان آیات کا منکر ہے اور اللہ نے قرآن کریم میں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات ذکر کیے ہیں

مرزائے قادیان ان کو شرک کی تعلیم قرار دیتا ہے قادیان کے اس نادان کو خبر نہیں کہ معجزات سے کسی کی خدائی ثابت نہیں ہوتی بلکہ معجزات نبوت ورسالت کی دلیل ہوتے ہیں ان سے نبوت ورسالت ثابت ہوتی ہے قرآن کریم میں حضرت مسیح کے معجزات کے ذکر کرنے سے یہود کا رد مقصود ہے جو حضرت عیسیٰ کی نبوت ورسالت کے منکر تھے مرزائے قادیان کہتا ہے کہ وہ احیاء موتی نہ تھا بلکہ قریب الموت مردہ کو مسمریزم کے عمل سے چند منٹ کے لیے حرکت دے دیتے تھے۔

مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے اذناب یہ کہتے ہیں کہ یہود نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی دی مگر وہ اس سولی سے مرے نہیں بلکہ بے ہوش ہو گئے تھے اس لیے قبر ان کو مردہ سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا مگر چونکہ وہ مرے نہ تھے اور صرف بے ہوش ہوئے تھے اس لیے قبر سے زندہ نکل آئے اور چھپ کر ملک شام سے کشمیر پہنچ گئے اور وہاں جا کر اپنے زخموں کا علاج کرایا اور اچھے ہو گئے اور زندگی پوری کر کے اپنی موت سے مرے اور کشمیر کے شہر سری نگر محلّہ خان یار میں دفن ہوئے یہ سب ہذیان ہے اور یہود سے بڑھ کر حضرت مسیح پر بہتان ہے کیونکہ یہود جو قتل اور صلیب کے مدعی ہیں اس کا بظاہر کچھ نہ کچھ منشا تو بیان کرتے ہیں اور مسیلمہ قادیان کے پاس تو سوائے جھوٹ اور بہتان کے کوئی دلیل نہیں (گلدستہ)

فوائد

ف 1: یہ آیت مشائخ کے دم درود کی دلیل ہے۔ ہمیشہ فیض دیتے وقت دم کیا جاتا ہے۔ حضرت جبرائیل نے بی بی مریم کے گریبان میں پھونک ہی ماری تھی۔ حضرت اسرافیل نے پھونک مار کر ہی صورت کے ذریعے لوگوں کو زندہ کریں گے۔ معلوم ہوا، کہ پھونک میں اثر ہے۔ رب نے حضرت آدم میں روح پھونکی تھی۔ اب بھی صوفیاء کرام دم کرتے ہیں۔

ف 2: معلوم ہوا کہ نبی بحکم پروردگار دافع البلاء مشکل کشا ہوتے ہیں کیونکہ اندھا یا کوڑھی ہونا بلا ہے جو حضرت مسیح کے دم سے دفع ہوتی تھی۔ مدینہ پاک کی مٹی خاک شفا ہے۔ آب زمزم جو حضرت اسماعیل کی ایڑی سے پیدا ہوا، شفا ہے۔ حضرت ایوب کے پاؤں کا غسالہ شفا تھا۔ رب فرماتا ہے۔ **ارکض برجلك هذا مغتسل بارد و شراب۔**

ف 3: یعنی قبر میں دفن شدہ مردوں دو زندگی بخشتے تھے۔ چنانچہ آپ نے صدہا سال پیشتر فوت ہوئے۔ حضرت سام بن نوح کی قبر پر جا کر انھیں زندہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ محبوبوں کی کرامت اور معجزے سے ان کو دوبارہ عمر دیتا ہے جو پہلے اپنی عمر پوری کر کے فوت ہو چکے تھے۔ لہٰذا اگر حضور غوث پاک نے بارہ برس کی ڈوبی کشتی کو صحیح سلامت نکالا ہو تو کیا بعید ہے۔ اس برات کے دلہا کا نام کبیر الدین ہے۔ لقب دریائی دولہا۔ اب انھیں شاہدولہ کہا جاتا ہے۔ ان کی قبر شریف گجرات پاکستان میں ہے۔

ف 4: اس طرح کہ یہود آپ کے قتل کے درپے ہو گئے اور سولی دینے کے ارادہ سے آپ کو قید کر دیا۔ رب نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ اور دشمن خائب و خاسر رہ گئے۔

ف 5: آپ کے زمانہ میں طب کا بہت زور تھا۔ آپ کو اسی قسم کا معجزہ دیا گیا جو اس زمانہ میں رائج تھا۔ جیسے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جادو کا بہت زور تھا تو اسی قسم کا آپ کو معجزہ دیا گیا۔ اگر قادیانی نبی ہوتا تو آج کل سائنس کا زور ہے، اسے ایسی ایجاد عطا ہوتی جو ان تمام ایجادوں سے اعلیٰ ہوتی۔ (نور)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب][اَوْحَيْتُ : وحی کی میں نے][اِلَى: طرف][الْحَوَارِيّٖنَ : حواریوں][اَنْ : یہ کہ][اٰمِنُوْا : ایمان لاؤ][بِيْ : مجھ پر][وَبِرَسُوْلِيْ : اور میرے رسول کے ساتھ /پر][قَالُوْٓا : انہوں نے کہا][اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے][وَاشْهَدْ : اور گواہ رہیں][بِاَنَّنَا : بیشک ہم][مُسْلِمُوْنَ : مسلمان (جمع)]

ترجمہ: اور جب میں نے حواریوں کے دل میں (یہ) ڈال دیا کہ تم مجھ پر اور میرے پیغمبر (عیسٰی علیہ السلام) پر ایمان لاؤ، (تو) انھوں نے کہا: ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ ہو جا کہ ہم یقیناً مسلمان ہیں

تشریح:

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں کا مذہب اسلام تھا

" حَوَارِيُّوْنَ " حواری کی جمع ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے ' جس کا معنی ہے " ہمدرد ' خیر خواہ ' غمگسار اور مددگار "۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ " انصار " کا ہم معنی لفظ ہے۔ جس طرح مدینے کے مسلمان ' اسلام کی نصرت و تائید اور مسلمانوں کی ہر طرح کی مدد کی وجہ سے " انصار " کہلائے اور اسلامی تاریخ میں نہایت عزت و وقار کی علامت بن گئے۔ اس کے قریب قریب مقام، عیسائیت میں ان حواریوں کا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں ' جنھوں نے ناگفتہ بہ حالات میں یہود کی دشمنی کی دہکتی آگ کے باوجود ایمان لانے کی ہمت کی۔ پھر اللہ کے اس دین کی تبلیغ و دعوت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مدد کی اور انہی کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے خلفاء کی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ اس لیے بطور خاص ان کے ایمان کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جبکہ ماحول قبولیت اسلام کے لیے بالکل ناسازگار تھا اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی تبلیغ و دعوت مسلسل ناکامی کے زخم اٹھا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ احسان فرمایا کہ ان غریب لوگوں کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائی اور مزید اس میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب اسلام لے آئے اور انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت قبول کرلی تو انھوں نے یہ نہیں

کہاکہ ہم مسیحی ہیں بلکہ یہ کہاکہ ہم مسلمان ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیامیں جب بھی اللہ کا کوئی نبی یا کوئی رسول اللہ کے جانب سے دین لے کرآیا ہے تواس کے ماننے والے ہمیشہ مسلمان ہی کہلائے ہیں۔(روح)

اس سے یہ بھی معلوم ہواکہ تمام انبیاء کا دین جس کی وہ دعوت دیا کرتے تھے وہ اسلام ہی تھا۔یہ کوئی نیادین نہیں ہے۔جو پہلے دینوں سے الگ ہو بلکہ انھیں کی ایک کامل، توانااور حسین صورت ہے۔(ضیاء)

لیکن جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو پھر اس کی انتہاء یہ ہوئی کہ وہ اپنا اصل نام گم کر بیٹھے اور کہیں وہ یہود ہوگئے اور کہیں مسیحی بن گئے۔امت مسلمہ کے لیے یہ بات نہایت فکرمندی کی ہے کہ پہلی امتیں جس فساد کا شکار ہوئیں اور اپنا نام تک انھوں نے کھودیا ، ہمیں اس حوالے سے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔یہ جو آئے دن نئے نئے انتسابات اس امت میں پیدا ہو رہے ہیں اور نئے نئے نام اختراع کیے جارہے ہیں اگر اس صورتحال کو نہ روکا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے انجام کی گرفت میں آجائیں۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ حواریوں کا عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور تبلیغ و دعوت میں ان کا کیا مقام رہا ہے اور امت عیسائیت پر ان کے کیا کیا احسانات ہیں چونکہ اس سلسلہ مضمون میں ان کا ذکر آگیا ہے تو اپنی اس اہمیت کی وجہ سے پروردگار نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ عیسائی جس طرح عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کو صحیح نہ سمجھنے کے باعث گمراہی کا شکار ہوئے ، اسی طرح انھوں نے حواریوں کی طرف بھی بعض غلط باتیں منسوب کردیں اور پھر اسی کو سند جان کر بہت ساری بدعات کو فروغ دینے میں کامیاب ہوگئے۔اس لیے یہاں حواریوں کا تذکرہ کرکے عیسائیوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تم حواریوں کے بارے میں نجانے کیا کیا غلط انتسابات کرچکے ہو۔ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حواری پروردگار اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں کیا تصورات رکھتے تھے۔(روح)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کی حکمتیں

حواری حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے انصار اور ان کے مخلص اصحاب تھے ، حور کا معنی ہے کسی چیز کو صاف کرنا اور ان لوگوں نے اپنے نفوس کا تزکیہ کرکے پاک اور صاف کرلیا تھا ، اس آیت میں مذکور ہے میں نے حواریین کی طرف وحی کی ، ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اللہ جس کلام کو اپنے نبی کی طرف نازل فرماتا ہے ، خواہ فرشتے کے واسطے سے ہو یا بلاواسطہ اس کو وحی کہتے ہیں۔(تبیان)

وحی "کا ایک معنی

یادرہے کہ اس آیت میں لفظ "وحی" کی نسبت غیر انبیاء کی طرف ہے اور جب وحی کی نسبت غیر نبی کی طرف ہو تو اس سے مراد دل میں بات ڈالنا ہوتا ہے۔(صراط)

، اس لیے اس آیت کا معنی ہے ہم نے حواریین کی طرف الہام کیا۔قرآن مجید کی اور بھی کئی آیتوں میں وحی بمعنی الہام ہے :

(آیت) "واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ"۔(القصص : ٧)

ترجمہ : اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف الہام فرمایا کہ انھیں دودھ پلاؤ۔

(آیت) "واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاو من الشجر و مما یعرشون"۔ (النحل : ٦٨)
ترجمہ : اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں ڈالا کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا 'اور درختوں میں اور ان چھپّروں میں جنہیں لوگ اونچا بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائیں 'سو وہ ایمان لے آئے 'ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ہوئی نعمتوں کو شمار کرا رہا ہے 'اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ حواریوں کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں نعمت کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کا اس درجہ میں ہونا کہ لوگ اس کے قول کو قبول کریں 'اس کو محبوب بنائیں اور اس کی اطاعت کریں 'اس کے ماننے پر ان کی نجات موقوف ہو 'یہ اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان آیات کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی ماں پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا؟ پھر جن نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے ان سب کا تعلق حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے ہے نہ کہ ان کی والدہ سے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیٹے کو جو شرف اور مقام ملتا ہے ' وہ اس کی ماں کے لیے عزت اور سرخ روئی کا باعث ہوتا ہے 'سو یہ نعمتیں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر بھی ہیں اور ضمناً اور بالواسطہ ان کی ماں پر بھی ہیں۔

جس زمانہ میں جس قسم کے کمال کا چرچا اور شہرت ہوتی ہے 'نبی کو اس زمانہ میں اسی نوع کا ایسا کمال دے کر بھیجا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اس کمال کے ماہرین اس کی نظیر لانے سے قاصر اور عاجز ہوتے ہیں اور یہی ان کا معجزہ ہوتا ہے جو ان کی نبوت کی دلیل قرار پاتا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں جادو گری اور شعبدہ بازی کا چرچا تھا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو عصا اور ید بیضا دے کر بھیجا جو ان کی جادو گری پر غالب آگیا 'اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں طب اور حکمت کا چرچا تھا تو آپ کو حکمت کا ایسا کمال دے کر بھیجا کہ اس زمانہ کے اطباء اور حکماء اس کی نظیر لانے سے عاجز ہوگئے اور ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کا زور تھا 'تو آپ کو قرآن مجید دے کا بھیجا جس کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال اس زمانہ میں کوئی لا سکا 'نہ آج تک کوئی لا سکا ہے۔ علم اور ادب میں دن بہ دن ترقی ہو رہی ہے اور اسلام کے مخالفین بھی بہت ہیں 'اگر اس کی کسی ایک سورت کی بھی مثال کا لانا ہوتا تو مخالفین اب تک لا چکے ہوتے۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

اِذۡ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ هَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّكَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ‌ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾

لغۃ القرآن: [اِذْ : جب][قَالَ : کہا][الْحَوَارِیُّوْنَ : حواریوں نے][یٰعِیْسَی: اے عیسیٰ][ابْنَ مَرْیَمَ : بیٹا مریم][هَلْ : کیا][یَسْتَطِیْعُ : طاقت رکھتا ہے][رَبُّكَ : تیرارب][اَنْ : یہ کہ][یُّنَزِّلَ : وہ نازل کرے][عَلَیْنَا : ہم پر][مَآئِدَةً : دسترخوان][مِّنَ : سے][السَّمَآءِ : آسمان][قَالَ : اس نے کہا][اتَّقُوا : ڈرو][اللّٰهَ : اللہ سے][اِنْ كُنْتُمْ : اگر ہو تم][مُّؤْمِنِیْنَ : ایمان والے]

ترجمہ: اور (یہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تمہارا رب ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (کھانے کا) خوان اتار دے، (تو) عیسیٰ (علیہ السلام) نے (جواباً) کہا: (لوگو!) اللہ سے ڈرو اگر تم صاحب ایمان ہو

تشریح:

مناسبت اور شان نزول

اس سے پہلی آیتوں میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر آٹھ نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا' اس آیت اور اس کے بعد والی آیتوں میں نویں نعمت کا ذکر فرمایا ہے اور وہ حواریوں کی فرمائش اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے خوان نعمت کا نازل ہونا ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کا قبول ہونا ہے اور ان کے دعا کرنے میں ان کے بندہ ہونے کا اثبات ہے' اور ان کی الوہیت کی نفی ہے اور اس وجہ سے لوگوں کا ان کی نبوت کی تصدیق کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ اور رسول حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر بہت بڑا احسان ہے۔ (تبیان)

اذ قال الحواریون یٰعیسیٰ ابن مریم الخ، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ جب حواریوں کی جانب سے اس آسمانی کھانے کی درخواست پیش ہوئی تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بہت ناگوار گزری، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو جس طرح روزی ملتی رہی ہے

اسی پر قناعت کرو ایسے دستر خوان کی درخواست نہ کرو، اگر مطلوبہ دستر خوان نازل کر دیا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائیگی، قوم ثمود کا بھی یہی معاملہ ہوا تھا، اس کے بعد حواریوں نے جب نیک ارادہ کا اظہار کیا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے دعاء فرمائی تو یہ دستر خوان اس شان کے ساتھ نازل ہوا کہ اس کا رنگ سرخ تھا اس کے اوپر نیچے بادل تھے وہ نظروں کے سامنے بڑے تیزی سے نیچے اترا جب یہ دستر خوان نیچے اترا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اختیار رونے لگے اور دعاء کی کہ اے اللہ ہم کو اس نعمت کا شکر ادا کرنے والا بنا دے اے اللہ تو اسے ہمارے لیے رحمت بنادے، مگر یہود نے اس نعمت عظمیٰ اور خوان **یغمیٰ** کی ناشکری کی جس کے نتیجے میں ان کو سخت عذاب سے دوچار کر دیا جس کے صلہ میں ان کو بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ (اللّٰھم احفظنا من سخطك والنار)۔ (جلالین)

حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل سے فرمایا تم اللہ کے لیے تیس روزے رکھو ' پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو تو اللہ تعالیٰ دعا قبول کرے گا ' کیونکہ جو شخص کسی کے لیے عمل کرے وہ اس کا اجر عطا فرماتا ہے۔ بنو اسرائیل نے تیس روزے رکھے ' پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا اے خیر کی تعلیم دینے والے ! آپ نے کہا تھا کہ جو شخص کسی کے لیے عمل کرے اس کا اجر اس کے ذمہ ہوتا ہے ' اور آپ نے ہمیں تیس روزے رکھنے کا حکم دیا تھا سو ہم نے رکھ لیے اور ہم جس کے لیے بھی تیس دن کام کرتے ' وہ ہمیں سیر کرکے کھانا کھلاتا ' تب انھوں نے کہا کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل کر سکتا ہے ؟ (جامع البیان ' جز ۷ ص ۱۷۵۔ ۱۷۴ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ۱۴۱۵ ھ)

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حواریوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا یعنی وہ آسمان سے مائدہ (پکا پکایا کھانا) نازل کر سکتا ہے یا نہیں ؟ لیکن اس طرح کے اسلوب کلام کا صرف یہی معنی نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مائدہ نازل کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ مائدہ نازل کرنا پسند کرے گا ؟ (تفسیر روح المعانی) بالکل اسی طرح کے الفاظ بخاری شریف میں بھی موجود ہیں جس میں ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن زید (رض) مجھے (عملاً کرکے) دیکھا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یتوضا"۔ (بخاری : 185 : کتاب الوضوئ : باب 38) کیا آپ عبداللہ بن زید (رض) وضو کرنے کا علم رکھتے ہیں یا نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ علم تو رکھتے ہیں لیکن کیا ان کے پاس فرصت ہے اور وہ پسند کریں گے کہ اس وقت مجھے وضو کرکے دکھائیں، اور آج کل انگریزی میں تو یہ انداز تکلم بہت عام ہے : Can I borrow your pen? (کیا میں آپ کا قلم ادھار لے سکتا ہوں ؟) اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ قلم دینے کی طاقت رکھتے ہیں یا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس قوت اپنا قلم مجھے دینا پسند کریں گے، یا اس کی ایک مثال یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ اگر ایک طالب علم پروفیسر کو کہے : اگر آپ پرنسپل صاحب کو کہیں تو کیا پرنسپل صاحب میرے گھر کھانا کھانے کے لیے آ سکتے ہیں ؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرنسپل صاحب طالب علم کے گھر جانے کی طاقت رکھتے ہیں یا نہیں بلکہ سوال کا مقصد یہ ہے کہ کیا ایک طالب علم کا پرنسپل صاحب کو دعوت دینا مناسب ہے یا نہیں ؟ کیا کالج کے اصول و ضوابط اس سے مانع تو نہیں کہ پرنسپل صاحب کسی صاحل علم کے گھر جائیں ؟ اسی طرح حواریوں کے سوال کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ مائدہ نازل کرنے کی طاقت رکھتا ہے یا نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ مائدہ نازل کرنا مناسب سمجھے گا ؟ (بحر محیط) کیا عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے نزول مائدہ کی دعا کرنا پسند کریں گے ؟ (تفسیر کبیر) کیا اللہ تعالیٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا قبول کرلے گا ؟ (روح المعانی) کیا ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسا سوال کرنا جائز ہے ؟ (تفسیر کبیر)

حواریوں کی اس درخواست پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں کہا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور بلا ضرورت معجزات کا مطالبہ کرکے اپنے آپ کو امتحان میں نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ پہلی امتوں کی طرح تم بھی اس عظیم نعمت کا کما حقہ شکرادانہ کرسکو اور پھر ناشکری کی سزا کے مستحق قرار پاؤ، لہٰذا ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ قدرت کے مقرر کردہ ذرائع کے مطابق رزق حلال تلاش کرو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ رکھا ہے اسی پر قناعت کرو اور گھر بیٹھے پکے پکائے آسمانی کھانے کا مطالبہ نہ کرو۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حواری حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا نہیں بلکہ مریم کا بیٹا اور اللہ تعالیٰ کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ پر جو معجزات کا ظہور ہوتا ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ اسی لیے حواریوں نے نزول مائدہ کا مطالبہ براہ راست حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے نہیں کیا بلکہ پوچھا: کیا آپ کا رب آپ کی دعا قبول کرلے گا اور ہم پر مائدہ نازل کرنا پسند کرے گا؟ (امداد)

نزول مائدہ کے فرمائشی معجزہ کی توجیہات

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حواریوں کا یہ قول نقل فرمایا تھا کہ ہم ایمان لے آئے اور اے اللہ! تو گواہ ہوجا کہ ہم مسلمان ہیں' اور اب ان کا یہ قول نقل فرمایا: کیا آپ کا رب آسمان سے خوان نازل کرسکتا ہے؟ اور یہ قول اللہ کی قدرت پر شک کو واجب کرتا ہے۔ پھر وہ مسلمان کیسے ہوئے؟ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایمان کا حکم نہیں لگایا تھا' بلکہ یہ صرف ان کا دعوی تھا کہ وہ مومن ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا یہ فرمانا کہ تم اللہ ڈرو اگر ایمان والے ہو اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ایمان کامل نہیں تھا۔

(۲) وہ اپنے دعوی کے مطابق مومن تھے اور ان کا یہ کہنا کہ کیا اللہ ایسا کرسکتا ہے؟ اللہ کی قدرت پر شک کی وجہ سے نہیں تھا' بلکہ محض طمانیت قلب کے حصول کے لیے تھا' جیسے ابراہیم (علیہ السلام) نے حصول طمانیت کے لیے فرمایا تھا اے رب! تو مجھے دکھا تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا۔

(۳) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھ رہے تھے کہ ایسا سوال کرنا آیا حکمت کے منافی تو نہیں ہے۔

(۴) یستطیع میں سین زائد ہے اور اس آیت کا معنی ہے کیا آپ کا رب آپ کی دعا قبول فرمالے گا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تم اللہ سے ڈرو اس کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ سے فرمائشی معجزہ نہ طلب کرو' کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ تم تقوی اختیار کرو اور اپنے مطالبات پر صبر کرو' کیونکہ جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل پیدا فرمادیتا ہے۔

(آیت) "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا، ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ"۔ (الطلاق: ۳۔ ۲)

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے نجات کی راہ پیدا کردے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے۔

حواریوں نے کہا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ نے ہم سے سچ کہا تھا اس آیت میں حواریوں نے جو اپنا عذر پیش کیا ہے اس کی حسب ذیل تقریریں ہیں :

(۱) ہم اس خوان کو کسی معجزہ کے طور پر طلب نہیں کر رہے 'بلکہ ہم پر بھوک غالب ہے اور ہمیں کہیں اور سے کھانا نہیں ملا 'اس لیے آپ سے دعا کی درخواست کی ہے۔

(۲) ہر چند کہ ہمیں دلائل سے اللہ کی قدرت پر یقین ہے لیکن جب ہم نزول مائدہ کا مشاہدہ کریں گے تو ہمارا یقین اور پختہ ہو جائے گا

(۳) ہر چند کہ ہم نے آپ کے تمام معجزات کی تصدیق کی ہے 'لیکن اس معجزہ کو دیکھ کر ہمارا عرفان اور یقین اور پختہ ہو جائے گا۔

(۴) اس سے پہلے جو آپ کے معجزات تھے ان سب کا تعلق زمین سے تھا اور اس معجزہ کا تعلق آسمان سے ہو گا 'اس کو دیکھ کر ہمارے ایمان میں مزید تقویت ہو گی۔ (تبیان)

ان آیات کے بعض نکات پر غور فرمایئے

1 حواری جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے براہ راست شاگرد اور آپ کے مقرب ترین صحابہ ہیں پہلی آیت کے آغاز ہی میں دیکھئے کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو خطاب کرتے ہوئے "اے عیسیٰ ابن مریم " کہہ رہے ہیں۔ نہ انھیں اللہ کہہ رہے ہیں 'نہ ابن اللہ 'نہ اس طرح کا کوئی اور لقب۔ اگر اس طرح کی کسی بات کی گنجائش ہوتی تو عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت کے اصل راز دان تو یہی لوگ تھے اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے مزاج شناس بھی یہی تھے۔ وہ یقینا اس گنجائش سے فائدہ اٹھاتے اور آپ کو عیسیٰ ابن مریم کہنے کی جسارت کبھی نہ کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو جو دین سکھایا تھا اور دین کی جن بنیادی باتوں پر ان کی تربیت کی تھی 'اس کے حوالے سے وہ آپ کو عیسیٰ ابن مریم ہی سمجھتے تھے کیونکہ یہی اس کا تقاضہ تھا اور اس سے زیادہ یا کم کسی اور لفظ کا استعمال وہ ہر گز آپ کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن میں عیسیٰ (علیہ السلام) ایک انسان تھے الوہیت کا کوئی تصور ان سے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ اس لیے وہ اس سے مختلف کوئی بات آپ کے بارے میں نہ سوچ سکتے تھے اور نہ کہنے کی جسارت کر سکتے تھے۔

2 اس سے پہلے کی آیت میں جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں 'حواریوں نے جس دین کو قبول کیا 'اسے انھوں نے اسلام کا نام دیا اور اپنے آپ کو انھوں نے مسلمان کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی طرح اس بات کو سمجھتے تھے کہ یہ دین یہودیت یا نصرانیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

3 ان آیات میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کریں کہ وہ ہم پر ایک خوان نعمت نازل کرے۔ اس آیت میں انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے براہ راست یہ نہیں کہا کہ آپ آسمان سے ہمارے لیے خوان نعمت اتاریں بلکہ ان سے درخواست کی جارہی ہے کہ آپ اللہ سے دعا مانگیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ایک ذریعہ جانتے تھے اور یہی وہ بنیادی تصور ہے 'جو ایک آدمی کو راہ راست پر رکھ سکتا ہے کیونکہ جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اصل قدرت کا مالک 'وہ پروردگار ہے اور جس کے ہاتھ سے اس قدرت کا اظہار ہو رہا ہے وہ صرف ایک ذریعہ ہے 'قدرت کا مالک نہیں۔ اب وہ جو کچھ بھی عبودیت کے احساسات اپنے اندر محسوس کرے گا اور پھر اس کی اچھی سے اچھی تعبیر لانے کی بھی کوشش کرے گا تو اس کی مصداق پروردگار کی ذات ہو گی اور وہ پیغمبر یا رسول مصداق نہیں ہو گا 'جس کے ہاتھ سے ان معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۱۲میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے "هَلۡ يَسۡتَطِيۡعُ رَبُّكَ "کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ وہ ہماری مطلوب نعمت کو اتار سکے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ حواری جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے صحابہ ہیں 'کیا انھیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی طاقت کے بارے میں کچھ شبہ تھا کہ وہ بعض کام کر سکتا ہے اور بعض نہیں کر سکتا' ظاہر ہے کوئی بھی مومن جو اللہ کو قادر مطلق مانتا ہے 'وہ کبھی بھی ایسے شبہے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کا یہاں وہ مفہوم نہیں ہے 'جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ اصل میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ "آپ اللہ سے اس نعمت کے نازل کرنے کے لیے دعا فرمائیں 'لیکن پہلے یہ معلوم کر لیں کہ کیا اللہ کی حکمت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ ایسے معجزے کو ظاہر فرمائے اور ہمیں اس کی اجازت دے کہ ہم اس معجزے کا مطالبہ کر سکیں "یعنی یہاں مقصود یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا اس کی قدرت میں ہے یا نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کی قدرت کا ظہور ہمیشہ اس کی حکمت کے ساتھ ہوتا ہے 'تو کیا ایسا معجزہ طلب کرنا اس کی حکمت کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ حواری صاحب ایمان لوگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معجزات طلب کرنا 'اس کی بھی ایک خاص حد ہے۔ جب یہ طلب اس حد سے آگے نکل جائے اور وہ ایمان کے بنیادی تقاضوں ہی کو پامال کرنے لگے تو پھر اس کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ بعض دفعہ اس پر خدا کا عذاب آ جاتا ہے۔ وہ یقیناً اس مثال سے واقف تھے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب کوہ طور پر تورات لینے کے لیے گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے چند اشراف کو بھی لے گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر ان اللہ کے بندوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عجیب و غریب چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ وہ یہاں تک بڑھے 'کہنے لگے:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً (البقرۃ ۲: ۵۵)

(ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے 'تاوقتیکہ کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں)

اس پر وہ اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آ گئے کیونکہ اللہ پر ایمان لانا 'ایک آزمائش ہے اور یہ آزمائش اس وقت تک ہے 'جب تک بن دیکھے اللہ کو مانا جائے اور اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ میں اللہ کو دیکھ کر ایمان لاؤں گا تو پھر یہ آزمائش نہیں رہتی کیونکہ دیکھ کر کسی چیز کو مان لینا 'یہ تو ایک معمول کی بات ہے۔ ایمان تو اصل میں اللہ کے نبی پر اعتماد کرتے ہوئے تمام ان باتوں کو ماننا ہے 'جنھیں مانے بغیر آدمی مومن نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے 'جیسے میں کسی سے یہ کہوں کہ فلاں جگہ 'فلاں واقعہ پیش آیا اور وہ مجھے پلٹ کر یہ کہے کہ اس طرح ہم نہیں مانتے۔ آپ ہمیں وہاں لے جا کر دکھایئے 'دیکھنے کے بعد ہم مانیں گے۔ آپ اندازہ فرمایئے کہ اگر وہ دیکھ کر مان بھی گئے تو اس کی میرے نزدیک کیا قدر و قیمت ہوگی کیونکہ میرے نزدیک قدر و قیمت تو تب ہوگی 'جب میرے اعتماد پر اسے تسلیم کیا جائے۔ یہ باتیں حواری جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ بات کہی کہ ہم اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس کا اطمینان کر لیں کہ یہ پروردگار کی حکمت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگرچہ یہ مطالبہ ایسا تو نہیں تھا 'جسے ایمانی حقیقت کے خلاف قرار دیا جاتا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ یہ پیغمبر کے اصحاب کے مقام و مرتبہ سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: اللہ سے ڈرو! اگر تم مومن ہو۔ ایمان لانے کے بعد معجزات کی طلب 'کوئی پسندیدہ روش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرام کے بارے میں کوئی ایک واقعہ بھی ریکارڈ پر نہیں کہ ایمان کے دائرے میں آنے کے بعد کبھی بھی اس طرح کے کسی مطالبے کے بارے میں انھوں نے سوچا بھی ہو۔ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواری یقیناً برگزیدہ لوگ تھے 'لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہے 'جبکہ وہ ابھی زیر تربیت تھے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اصحاب عیسیٰ (علیہ السلام) دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔

سابقہ آیات میں عیسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ کے احسانات کا ذکر ہوا تا کہ یہود پر اتمام حجت ہو جائے۔ پھر اس میں " بِاِذْنِیْ " کی تکرار سے عیسائیوں پر اتمام حجت کیا گیا کہ تم ان معجزات کو عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف بالذات منسوب نہ کرو' وہ صرف ان کا واسطہ ہیں۔ اصل فاعل اللہ کی ذات ہے۔ اس لیے تمہیں اللہ کی قدرت کا قائل ہونا چاہیے نہ یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کے منصب پر فائز کر دو۔ پھر حواریوں کے تذکرے سے مزید عیسائیوں کو سمجھایا گیا کہ دیکھو! جو براہ راست حضرت مسیح کے شاگرد تھے 'ان کا تصور حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بارے میں کیا تھا اور تم ان کو کیا سمجھے بیٹھے ہو۔ (روح)

آیت مبارکہ

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

لغۃ القرآن: [قَالُوْا : کہا انہوں نے][نُرِيْدُ : ہم ارادہ رکھتے ہیں][اَنْ : یہ کہ][نَّاْكُلَ : ہم کھائیں][مِنْهَا : اس سے][وَتَطْمَىِٕنَّ : اور مطمئن ہوجائیں][قُلُوْبُنَا : ہمارے دل][وَنَعْلَمَ : اور ہم جان لیں][اَنْ قَدْ : یہ کہ تحقیق][صَدَقْتَنَا : تونے سچ کہ اہم کو][وَنَكُوْنَ : اور ہم ہوجائیں][عَلَيْهَا : اس پر][مِنَ : سے][الشّٰهِدِيْنَ : گواہی دینے والے]

ترجمہ: وہ کہنے لگے : ہم (تو صرف) یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم (مزید یقین سے) جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس (خوان نعمت کے اترنے) پر گواہ ہو جائیں

تشریح: حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب انھیں خدا خوفی کا حکم دیا تو انھوں نے عرض کیا کہ "ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ حصول برکت کے لیے اس آسمانی دستر خوان سے کچھ کھائیں اور ہمارا یقین قوی ہو جائے اور جیسے ہم نے قدرت الٰہی کو دلیل سے جانا ہے اسی طرح مشاہدے سے بھی اس کو پختہ کرلیں یعنی علم اُلیقین سے ترقی کرکے عین اُلیقین حاصل کریں۔ حواریوں کے جواب نے واضح کر دیا کہ انھوں نے قدرت الٰہی میں شک و شبہ کی وجہ سے سابقہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ حواریوں کی اس درخواست پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں تیس روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا جب تم ان روزوں سے فارغ ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ سے جو دعا کرو گے قبول ہو گی۔

انھوں نے روزے رکھ کر دستر خوان اترنے کی دعا کی۔ اس وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے غسل فرمایا، موٹا لباس پہنا، دو رکعت نماز ادا کی اور سرِ مبارک جھکایا اور رو کر یہ دعا کی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے۔ (صراط)

حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے اپنے مطالبہ کی تائید میں چار وجوہات بیان کیں

1۔ ہمیں آپ کی نبوت یا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک نہیں۔ ہم تو اپنی بھوک کا علاج اور آسمانی کھانے کی برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

2۔ ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس معجزہ کے مشاہدہ کے بعد ہمارے دلوں کو مزید اطمینان نصیب ہوگا جیسا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اطمینان قلب کے لیے عرض کیا تھا: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرمائے گا؟ (قرآن: 260:2)

3۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں لیکن اس معجزہ کے مشاہدہ سے ہمیں آپ کی صداقت کی ایک اور قوی دلیل مل جائے گی۔

4۔ اب تک جن معجزات کا آپ سے ظہور ہوا ہے ان کا تعلق زمین سے ہے، لیکن نزول مائدہ کا تعلق آسمان سے ہوگا، لہٰذا یہ معجزہ دیگر معجزات کے مقابلہ میں زیادہ حیران کن ہوگا، اور جب ہم اس معجزہ کے عینی شاہد ہو جائیں گے اور دوسرے لوگوں کو اس معجزہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کریں گے تو ان کے لیے ہدایت قبول کرنا اور آسان ہو جائے گا۔ (امداد)

(ا) انھوں نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے کھانے کا ارادہ کیا۔ یہ اس لیے تھا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جب نکلتے تھے تو ان کے پیچھے پانچ ہزار یا اس سے زیادہ آدمی ہوتے تھے، بعض تو ان میں آپ کے اصحاب ہوتے تھے اور بعض دیکھتے تھے اور استہزاء کرتے تھے۔ ایک دن آپ ایک علاقہ کی طرف نکلے تو ایک جنگل میں پہنچ گئے جہاں ان کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا وہ بھوکے ہو گئے اور انھوں نے حواریوں سے کہا: حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کرو تاکہ وہ دعا فرمائیں کہ ہم پر آسمان سے خوان نازل ہو۔ شمعون جو حواریوں کے سردار تھے وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ عرض کر رہے ہیں آپ دعا فرمائیں ان پر آسمان سے خوان نازل ہو۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے شمعون سے کہا: ان کو کہو کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ شمعون نے یہ لوگوں کو کہا تو پھر انھوں نے کہا: تم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کرو کہ ہم اس سے کھانا چاہتے ہیں۔ (۲) ناکل منھا تاکہ ہم اس کی برکت حاصل کریں ہمیں کھانے کی حاجت نہیں۔ ماوردی نے کہا: یہ بہتر ہے، کیونکہ اگر وہ کھانے کے محتاج ہوتے تو انھیں سوال کرنے سے منع نہ کیا جاتا۔

و تطمئن قلوبنا میں تین احتمال ہیں: (ا) ہمارے دل مطمئن ہو جائیں کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے (۲) ہم مطمئن ہو جائیں کہ اللہ نے ہمیں ہماری دعوت کے لیے چن لیا ہے (۳) ہمارے دل مطمئن ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سوال کا قبول فرمالیا ہے۔ یہ تینوں احتمال ماوردی نے ذکر کیے ہیں۔ مہدوی نے کہا: ہمارے دل مطمئین ہو جائیں کہ اس نے ہمارے روزے اور عمل کو قبول فرلیا ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہم اس کی قدرت کا یقین کر لیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں۔ (آیت) و نعلم قد صدقتنا ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا کہ آپ

اللہ کے رسول ہیں (آیت) ونکون علیھا من الشھدین اور ہم اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت و نبوت کے گواہی دینے والے ہو جائیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جب ہم لوٹ کر جائیں تو جنہوں نے یہ نہیں دیکھا ہم تمہارے لیے ان کے پاس گواہ ہو جائیں۔ (قرطبیؒ)

آیت مبارکہ:

قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآٮِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ‌ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾

لغۃ القرآن: [قَالَ : کہا][عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ : عیسیٰ بیٹا مریم][اللّٰهُمَّ : اے اللہ][رَبَّنَاۤ : ہمارے رب][اَنۡزِلۡ : نازل کر][عَلَيۡنَا : ہم پر][مَآٮِٕدَةً : دسترخوان][مِّنَ : سے][السَّمَآءِ : آسمانوں (جمع)][تَكُوۡنُ : وہ ہوجائے][لَنَا : ہمارے لیے][عِيۡدًا : عید][لِّاَوَّلِنَا : ہمارے پہلوں][وَاٰخِرِنَا : اور پچھلوں کیلئے][وَاٰيَةً : اور نشانی][مِّنۡكَ : تیری طرف سےۚ][وَارۡزُقۡنَا : اور رزق دے ہم کو][وَاَنۡتَ : اور تو][خَيۡرُ : بہتر][الرّٰزِقِيۡنَ : رزق دینے والوں کا]

ترجمہ: عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے اللہ ! اے ہمارے رب ! ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل فرمادے کہ (اس کے اترنے کا دن) ہمارے لیے عید ہو جائے ہمارے اگلوں کے لیے (بھی) اور ہمارے پچھلوں کے لیے (بھی) اور (وہ خوان) تیری طرف سے نشانی ہو، اور ہمیں رزق عطا کر اور تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے

تشریح:

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب حواریوں کے دلائل سنے تو دعا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے غسل کر کے کمبل کا لباس پہن کر نماز پڑھی اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کیا: "اے اللہ ! اے ہمارے

رب ! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما۔ "اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور سرخ رنگ کا ایک دستر خوان لوگوں کے سامنے نازل فرمایا جس کو دیکھ کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور آپ کے حواری سب سجدہ میں گر گئے تاکہ اس غیبی رزق پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔
(تفسیر در منثور)

آسمان سے خوان اترنے کا دن

ایعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو، ہمارے اگلے پچھلے لوگوں کے حق میں عید ہو جائے کہ ہمیشہ ہماری قوم اس دن کو بطور یادگار تہوار منایا کرے۔ اس تقریر کے موافق تکون لنا عیدا کا اطلاق ایسا ہوا جیسا کہ آیۃ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُم کے متعلق بخاری میں یہود کا یہ مقولہ نقل کیا ہے انکم تَقْرَءُوْنَ اٰیۃ لَوْنَزَلَتْ فِیْنَا لَاتَّخَذْ نَاھَاعِیْداً جس طرح آیۃ کو عید بنانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بنانا ہے (کما ہو مصرح فی الروایات الاخر) اسی پر مائدہ کے عید ہونے کو بھی قیاس کر لو کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا اتوار کو جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید ہے جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ۔

دستر خوان کے کھانے

ترمذی وغیرہ میں عمار بن یاسر سے مرفوعا اور موقوفا مروی ہے کہ وہ مائدہ آسمان سے اترا اور اس میں گوشت تھا اور روٹی تھی اور اس کے متعلق یہ حکم دیا گیا کہ اس میں خیانت نہ کریں اور چھپا نہ کر رکھیں اور دوسرے دن کے لیے ذخیرہ نہ کریں پس جن لوگوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی وہ بندر اور سور کی صورت اور شکل بنا دیے گئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ) اور اس حدیث میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لیے رکھ لینا ممنوع تھا (بیان القرآن)
مائدہ بروزن فاعلہ مَادَیَمِیْدُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے مَیْدٌ دینا اور کھانا کھلانا گویا خوان بھی کھانا دینے والا ہوتا ہے اس لیے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے۔ مجازاً کھانا جو خوان پر ہوتا ہے اس کو بھی مائدہ کہہ لیا جاتا ہے۔ جیسے بہنے کی نسبت نہر کی طرف مجازاً کی جاتی ہے

تکون لنا عیدا جو ہمارے لیے ایک خوشی کی بات ہو جائے

لاولنا واخرنا یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے۔ سدی نے کہا یعنی ہمارے زمانہ والوں کے لیے اور آئندہ لوگوں کے لیے خوشی کا دن ہو جائے ہم اس کو تہوار کا دن بنالیں جو خوشی غم کے بعد آئے اس کو سرور کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آدمی رنج سے خوشی کی طرف لوٹتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اس لیے عیسائیوں نے اتوار کا دن تہوار کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا عید کا معنی ہے عائدہ یعنی اللہ کی طرف سے حجت اور برہان

لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِ نَا لنا سے بدل ہے اول سے مراد ہیں اہل زمانہ اور اخرنا سے مراد ہیں مستقبل میں آنے والے لوگ جو مذہب عیسوی پر ہوں۔
حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا (عیدًلاولناواخرنا سے یہ مراد ہے کہ) اس میں سے جس طرح پہلے لوگ کھائیں اسی طرح آخری لوگ بھی کھائیں (یعنی خوان بابرکت ہو جو سب کے لیے کافی ہو اور اول سے آخر تک سب لوگ اس میں سے کھائیں)
وایۃ منک۔ یعنی تیری قدرت کی اور میری نبوت و صداقت کی نشانی ہو۔
یعنی بدون تعب و کسب کے روزی عطافرمائے۔ آپ کے یہاں کیا کمی ہے اور کیا مشکل ہے۔ (گلدستہ)

عام آدمی کی نظر اور نبی کی نظر

حواریوں نے جب خوان کی درخواست کی تھی تو کہا تھا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ نے سچ کہا تھا ' انھوں نے اس خوان سے دنیاوی غرض 'یعنی کھانے کو پہلے ذکر کیا اور اخروی غرض 'یعنی ایمان کی پختگی کو بعد میں ذکر کیا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب دعا کی تو اخروی غرض کو پہلے ذکر کیا اور وہ ہے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہونا اور اللہ کی طرف سے نشانی ہونا اور دنیاوی غرض کا بعد میں ذکر کیا اور وہ ہے کہ میں رزق عطافرما اور اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی کہ تو سب سے بہتر رزق عطافرمانے والا ہے ' یہ فرق ہے نبی کی نظر میں اور عام آدمی کی نظر میں۔
عید کے دن اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنے کے لیے عبادت کی جاتی ہے 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نظر پہلے اللہ کی عبادت کی طرف تھی ' پھر فرمایا کہ وہ تیری طرف سے نشانی ہو جائے 'یعنی لوگ نزول مائدہ میں غور و فکر کرکے اس کے نازل کرنے والے کی طرف رسائی حاصل کریں اور نظر اور استدلال سے خدا کو پہچانیں 'یوں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نظر ایک بلند مقام سے 'اس سے بھی بلند ترک مقام پر پہنچی۔ پھر جب فرمایا ہمیں رزق عطافرما تو نفس کے حصہ کی طرف نظر کی اور خالق سے مخلوق کی طرف نزول کیا اور جب کہا تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے تو نزول کے بعد پھر خالق کی طرف رجوع کیا 'اور یوں اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے دو مرتبہ خلق سے خالق اور غیر اللہ سے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ اس دعا کے اول میں بھی ان کی نظر اللہ کی طرف تھی اور آخر میں بھی ان کی نظر اللہ کی طرف تھی اور اہل اللہ کا یہی حال ہوتا ہے وہ ہر حال میں اللہ کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ اے اللہ ! ہمیں بھی اس بلند مقام سے حظ وافر عطافرما ! (آمین)

اول اور آخر کے لیے عید ہونے کا معنیٰ

تاکہ وہ دن ہمارے اول اور آخر کے لیے عید ہو جائے ابن جریج نے کہا اول سے مراد اس وقت کے زندہ لوگ ہیں اور آخر سے مراد بعد میں آنے والے لوگ ہیں۔
سفیان نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن ہم دو مرتبہ نماز پڑھیں۔
حضرت ابن عباس (رض) نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ جب ہمارے سامنے خوان رکھا جائے تو اول سے لے کر آخر تک سب لوگ کھالیں۔
سدی نے کہا جس دن مائدہ نازل ہو اس دن کی تعظیم کرتے ہوئے ہم بھی اس دن عید منائیں اور ہمارے بعد آنے والے لوگ بھی۔

امام ابن جریر نے کہا صحیح قول یہ ہے کہ اس دعا کا معنی یہ ہے کہ : یہ دن ہمارے لیے عید ہو جائے اور جس دن یہ خوان نازل ہو 'اس دن ہم نماز پڑھیں 'جیسے لوگ عید کے دن نماز پڑھتے ہیں۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۱۷۸۔۱۷۷ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

بنو اسرائیل پر نازل ہونے والے طعام کا خوان

حضرت عمار بن یاسر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آسمان سے جو خوان نازل کیا گیا تھا 'اس میں روٹیاں اور گوشت تھا 'ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس میں نہ خیانت کریں اور نہ اس کو کل کے لیے بچا کر رکھیں۔ انھوں نے خیانت بھی کی اور کل کے لیے بچا کر بھی رکھا 'سو ان کو مسخ کرکے بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۰۷۶)

بنو عجل کے ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عمار بن یاسر (رض) کے پہلو میں نماز پڑھی۔ انھوں نے نماز سے فارغ ہو کر مجھ سے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ بنو اسرائیل کے خوان کا کیا معاملہ ہوا تھا؟ میں نے نہیں۔ انھوں نے کہا بنو اسرائیل نے حضرت عیسیٰ ابن مریم سے سوال کیا کہ ان کے اوپر کھانے کا ایسا خوان نازل کیا جائے جس سے وہ کھانا کھاتے رہیں اور وہ کبھی ختم نہ ہو 'ان سے کہا گیا کہ وہ خوان تمہارے پاس رہے گا بشرطیکہ تم اس میں سے کچھ چھپا کر نہ رکھو اور خیانت نہ کرو اور اس میں سے کوئی چیز نہ اٹھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم نے ایسا کیا تم نے ایسا کیا تو میں تم کو ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا۔ پھر ایک دن بھی نہیں گذرا حتی کہ انھوں نے اس میں سے چھپایا اور اٹھا لیا اور خیانت کی 'سو ان کو ایسا عذاب دیا گیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا تھا اور اے عرب والو ! تم لوگ اونٹوں اور بکریوں کو چراتے تھے 'پھر اللہ نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا 'جس کے حسب اور نسب کو تم جانتے اور پہچانتے تھے 'تمہارے نبی کی زبان سے تم کو اطلاع دی کہ عنقریب تم پورے عرب پر غلبہ پاؤ گے 'اور تم کو سونے اور چاندی کے جمع کرنے سے منع کیا اور بخدا تم اب دن رات سونا اور چاندی جمع کر رہے ہو 'اور دردناک عذاب کے مستحق ہو رہے ہو۔

حضرت عمار بیان کرتے ہیں کہ بنو اسرائیل پر مائدہ نازل کیا گیا اس میں جنت کے پھول تھے 'ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس میں سے نہ چھپائیں 'نہ خیانت کریں 'نہ ذخیرہ کریں 'ان لوگوں نے خیانت کی 'چھپایا اور ذخیرہ کیا 'تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۱۸۰۔۱۷۹ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ) (تبیان)

اللھم اصل میں یا اللہ ہے۔ حرف ندا کی جگہ دو میم آخر بڑھا دیئے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ایک اسم ذاتی اور دوسرا اسم صفاتی ذکر کیا۔ کیونکہ لفظ اللہ تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے۔ رحمت، بخشش، مغفرت سب اس کے ضمن میں آ گئے۔ اور ربنا سے صفت ربوبیت کو موکد کیا گیا۔ کیونکہ جس چیز کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے اس کا اس صفت سے خصوصی تعلق ہے۔ مائدۃ اس دستر خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ المائدۃ الخوان الذی علیہ الطعام (قرطبی) عید مطلق خوشی اور سرور کے دن کو کہتے ہیں۔ لاولنا واخرنا سے مراد یہ ہے کہ جو اس مائدۃ کے نازل ہونے سے پہلے ایمان لا چکے اور جو بعد میں ایمان لائیں گے یہ سب کے لیے فرحت و شادمانی کا دن ہوگا۔ حضرت صدر الافاضل مراد آبادی قدس سرہ نے یہاں خوب لکھا ہے فرماتے ہیں : اس سے معلوم ہوا کہ جس روز اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت نازل ہو اس روز کو عید بنانا اور خوشیاں منانا، عبادتیں کرنا، شکر الٰہی بجالانا طریقہ صالحین ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ سید عالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور بزرگ ترین رحمت ہے۔ اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت مبارکہ کے دن

عید منانا اور میلاد شریف پڑھ کر شکرِ الٰہی بجالانا اور اظہار فرح و سرور کرنا مستحسن و محمود اور اللہ کے مقبول بندوں کا طریقہ ہے۔ (خزائن العرفان) (ضیاء)

نزولِ رحمت کے دن کو عید بنانا صالحین کا طریقہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس روز اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت نازل ہو اس دن کو عید بنانا، خوشیاں منانا، عبادتیں کرنا اور شکرِ الٰہی بجالانا صالحین کا طریقہ ہے اور بیشک تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری یقیناً قطعاً حتماً اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور بزرگ ترین رحمت ہے۔ اس لیے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت مبارکہ کے دن عید منانا اور میلاد شریف پڑھ کر شکرِ الٰہی بجالانا اور فرحت و سرور کا اظہار کرنا مستحسن و محمود اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے مقبول بندوں کا طریقہ ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں:

جب سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا "یہ کیا ہے؟ یہودیوں نے عرض کی: یہ اچھا دن ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تھی تو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اس کا روزہ رکھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "تمہاری نسبت میرا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے تعلق زیادہ ہے چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔

ترمذی شریف میں ہے، حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے ایک یہودی کی موجودگی میں یہ آیت پڑھی

"اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ"

ترجمہ کنزالعرفان: آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند فرمایا۔"

یہ آیت سن کر اس یہودی نے کہا: اگر یہ آیت ہم پر اترتی تو ہم اسے عید بنالیتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا: یہ آیت ہماری دو عیدوں کے دن میں اتری یعنی جمعہ اور عرفہ کے دن۔

اس کی شرح میں مفسر شہیر، حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان (رح) ارشاد فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ جن تاریخوں میں اللہ کی نعمت ملے انھیں عید بنانا شرعاً اچھا ہے۔

نوٹ: میلاد شریف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے علامہ اسماعیل نبہانی (رح) کی کتاب "جواہرُ البحار" کی تیسری جلد کا مطالعہ فرمائیں۔ (صراط)

یہ بھی یاد رہے کہ رازق کے تین معنی ہیں نمبر 1 رزق دینے والا۔ نمبر 2 رزق پیدا کرنے والا۔ نمبر 3 اور روزی پہنچانے والا۔ یہاں تیسرے معنی مراد ہیں۔ جو دوسروں کے لیے ظاہری طور پر رزق مہیا کرتے ہیں اور سبب رزق ہیں جیسے امیر فقیر کے لیے اور حاکم رعایا کے لیے، کہ وہ رزق کے ظاہری اسباب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ حقیقی رازق مسبّب الاسباب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی حاجت برآری کے لیے بزرگوں سے دعا کرانا بہتر ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے مائدہ اتارنے کی خود دعا نہ کی بلکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کرائی۔ دعا کے لیے الفاظ کی تاثیر کے ساتھ زبان کی بھی تاثیر چاہیے۔ کارتوس کے اثر کے لیے رائفل کی طاقت بھی درکار ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۟ ﴿۱۱۵﴾

لغۃ القرآن: [قَالَ : فرمایا][اللّٰهُ : اللہ نے][اِنِّیْ : بیشک میں][مُنَزِّلُهَا : نازل کرنے والا ہوں اسے][عَلَيْكُمْ : تم پر][فَمَنْ : پھر جس نے][يَّكْفُرْ : انکار کیا][بَعْدُ : بعد اس کے][مِنْكُمْ : تم سے][فَاِنِّیْٓ: تو بیشک میں][اُعَذِّبُهٗ : عذاب دوں گا][عَذَابًا : ان کو عذاب دینا][لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ: نہ عذاب دوں گا][اَحَدًا : انکو کسی ایک][مِّنَ : سے][الْعٰلَمِيْنَ : جہان والے]

ترجمہ: اللہ نے فرمایا : بیشک میں اسے تم پر نازل فرماتا ہوں، پھر تم میں سے جو شخص (اس کے) بعد کفر کرے گا تو یقیناً میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ تمام جہان والوں میں سے کسی کو بھی ایسا عذاب نہ دوں گا

تشریح: یعنی تمہارے سوال پر تمہارے لیے مائدہ نازل فرماتا ہوں۔۔اور کیاشان تھی اس خوان نعمت کی کہ جس فقیر نے کھایا، تو زندگی بھر دولت مندرہا، جس مریض نے کھایا تازیست تندرست رہا(تو) اچھی طرح سن لوکہ (جس نے کفر کیا) اور ناشکری کی (تم میں سے اس کے بعد، تو بلاشبہ اسکو) اس کے کفر کی وجہ سے (وہ عذاب دونگا) اس کے عہد کے لوگوں میں سے کسی اور کو، بل (کہ) سارے (جہاں میں کسی کو وہ عذاب نہ دونگا)۔

اور ہوا بھی ایسا ہی کہ بنی اسرائیلیوں کے منکرین وناشکرے خنزیر بنادیئے گئے اور اس جیسا عذاب تمام جہانوں میں بنی اسرائیل کے سوااور کسی کو نہ ہوا۔ اور یہ اس عذاب کے مستحق اس لیے ہوئے، کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس میں، چھپایا بھی، اور ذخیرہ بھی کیا۔ اور پھر بعض لوگوں نے نبی کے معجزے پر شک کیا اور اسے جادو قرار دیا، تو ایسے ناشکرے کفر کرنے والے تقریبا تین سو تیس آدمی مسخ ہوگئے خنزیر کی صورت میں، اور تین دن کے بعد وہ سب کے سب مر گئے۔ ان سے توالد و تناسل کا سلسلہ نہ چلا۔ کیونکہ مسخ شدہ سے توالد و تناسل کا سلسلہ قادر مطلق نے کبھی نہیں چلایا۔۔ (اشرفی)

نزول مائدہ کی کیفیت کی تحقیق

سلمان الخیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب حواریوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) سے مائدہ (طعام کے خوان) کا سوال کیا تو آپ نے اس کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا اے لوگو اللہ سے ڈرو اور اللہ نے تم کو جو رزق حلال زمین سے دیا ہے 'اس پر قناعت کرو اور آسمان سے مائدہ کا سوال نہ کرو 'کیونکہ اگر وہ تم پر نازل کیا گیا تو وہ تمہارے رب کی طرف سے نشانی ہوگی۔ تم سے پہلے قوم ثمود نے اپنے نبی سے نشانی کا سوال کیا تھا 'وہ اس نشانی میں مبتلا کیے گئے 'پھر اس نشانی کے تقاضے پورے نہ کرنے کی وجہ سے وہ ہلاک کردیئے گئے۔ جب ان کی قوم نے اصرار کیا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نماز پڑھی اور بہت گریہ وزاری سے دعا کی : اے اللہ ! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما 'تو اللہ تعالیٰ نے دو بادلوں کے درمیان ان پر سرخ دستر خوان نازل کیا 'بنو اسرائیل اس کو نازل ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے 'اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خوف زدہ ہو کر بار بار دعا کر رہے تھے 'اے اللہ ! اس خوان کو رحمت بنانا اور اس کو غضب نہ بنانا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دعا کر رہے تھے کہ وہ دستر خوان حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آکر ٹھہر گیا 'حواریوں کو اس سے ایسی خوشبو آئی جیسی انھوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گرگئے 'یہود اس خوان کو دیکھ کر غیظ و غضب سے جل گئے۔ حواری اس دستر خوان کے گرد بیٹھ گئے 'وہ خوان ایک رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا جو شخص سب سے زیادہ عبادت گزار اور اللہ کا شکر گزار ہوگا 'وہ اس کو کھولے گا۔ حواریوں نے کہا یا روح اللہ ! آپ ہی اس کو کھولنے کے لائق ہیں 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے دوبارہ وضو کیا 'نماز پڑھی اور اللہ سے رو رو کر اپنے قوم کے لیے برکت کی دعا کی 'پھر اس کو کھولا 'تو اس میں بہت بڑی بھنی ہوئی مچھلی تھی جس میں کانٹے نہیں تھے اور اسے گھی بہہ رہا تھا اور اس کے گرد ہر قسم کی سبزیاں تھیں اور نمک اور سرکہ تھا اور پانچ روٹیاں تھیں۔ ایک روٹی پر زیتون 'ایک پر کھجور اور باقیوں پر انار تھے۔

شمعون نے کہا یا روح اللہ ! یہ طعام دنیا کے طعام میں سے ہے یا آخرت کے طعام میں سے ؟ آپ نے فرمایا یہ نہ دنیا کا طعام ہے نہ آخرت کا 'اس کو اللہ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تم بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو اور اپنے رب کا شکر ادا کرو 'وہ تم کو مزید عطا فرمائے گا۔ انھوں نے کہا یا روح اللہ ! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس نشانی میں ایک اور نشانی دکھائیں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا سبحان اللہ ! کیا تمہارے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے جو اور نشانی کا سوال کرتے ہو۔ جب انھوں نے اصرار کیا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس مچھلی سے اے مچھلی ! تو اللہ کے حکم سے دوبارہ پہلے کی طرح زندہ ہو جا 'وہ مچھلی اللہ کی قدرت سے زندہ ہوگئی۔ وہ شیر کی طرح منہ پھاڑنے لگی اور اس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں اور وہ پھڑکنے لگی 'حواری خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا پہلے تم نے نشانی کا مطالبہ کیا تھا 'اب نشانی دیکھ کر ڈرتے کیوں ہو ؟ پھر آپ نے مچھلی سے فرمایا اے مچھلی ! اللہ کے حکم سے دوبارہ پہلے کی طرح بھنی ہوئی ہو جا 'پھر انھوں نے کہا اے روح اللہ ! آپ کھانے کی ابتداء کریں۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ ! وہی کھانے کی ابتداء کرے گا جس نے اس کا مطالبہ کیا تھا۔ حواری اور اس کے اصحاب ڈرتے تھے کہ اس کے کھانے سے کہیں وہ مثلہ نہ ہو جائیں 'یا ان پر کوئی آفت نہ آجائے۔ تب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فقراء اور اپاہجوں کو بلایا کہ تم اللہ کے رزق اور اپنے نبی کی دعا سے کھاؤ 'اللہ کے نام سے شروع کرو اور اللہ کے شکر پر ختم کرو 'تم پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ سو اس مائدہ سے تیرہ سو مردوں اور عورتوں نے کھایا 'اور ان میں سے ہر شخص سیر ہو گیا 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حواریوں نے دیکھا وہ طعام اسی طرح تھا اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ مائدہ آسمان کی طرف

اٹھالیا گیا اور جس فقیر نے اس مائدہ سے کھایا تھا وہ غنی ہو گیا اور جس اپاہج نے کھایا وہ تندرست ہو گیا اور وہ لوگ تادم حیات اسی طرح رہے۔ پھر حواری اور ان کے اصحاب اس میں سے نہ کھانے پر پشیمان ہوئے اور تادم مرگ ان کے دل میں اس سے کھانے کی حسرت رہی۔ چند دنوں بعد پھر مائدہ نازل ہوا۔ پھر ہر جگہ سے امیر اور غریب 'صحت منداور بیمار 'چھوٹے اور بڑے 'بنواسرائیل اس پر ٹوٹ پڑے۔ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ دیکھا تو آپ نے باری مقرر کردی۔ ایک دن مائدہ نازل ہوتا اور ایک دن نازل نہ ہوتا 'چالیس دن تک یہی معمول رہا 'جب تک وہ کھاتے رہتے مائدہ ان کے سامنے رہتا اور جب وہ کھا چکتے تو مائدہ آسمان کی طرف اٹھ جاتا 'وہ اس کو دیکھتے رہتے 'حتی کہ وہ ان کی نگاہوں سے غائب ہو جاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی کی کہ اس مائدہ سے یتیموں 'فقیروں اور اپاہجوں کو کھلایا جائے اور امیر لوگوں کو نہ کھلایا جائے۔ تب امیروں نے اس میں شک کرنا شروع کردیا اور اس کے متعلق بری باتیں پھیلادیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ آپ ہمیں مائدہ کے نزول کے متعلق مطمئن کریں 'کیونکہ بہت لوگ اس میں شک کرتے ہیں (کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یا نہیں) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا بخدا! اگر تم نے اس میں شک کیا تو تم ہلاک ہو جاؤ گے 'اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے اسی شرط سے مائدہ نازل کیا تھا کہ جو اس کے بعد کفر کرے گا میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں ایسا عذاب کسی کو نہ دیا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا 'اے اللہ! اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تم ان کو بخش دے تو تو بہت غالب اور حکمت والا ہے۔ شام کو جب شک کرنے والے بستروں پر اپنی عورتوں کے ساتھ لیٹے تو ان کی اچھی صورتیں تھیں اور رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کرکے خنزیر بنادیا 'صبح کو وہ کوڑے اور گندگی کے ڈھیروں پر گندگی تلاش کرکے کھانے لگے۔ پھر باقی بنواسرائیل خوف زدہ ہو کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی اطاعت کرنے لگے۔ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) باہر نکلتے تو وہ خنزیر دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آتے اور آپ کے پیروں پر گرتے اور زار و قطار روتے 'حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان میں سے ہر شخص کا نام لے لے کر پکارتے 'ان میں سے ہر ایک اپنا سر ہلاتا تھا اور بول نہیں سکتا تھا۔ آپ فرماتے 'میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا تھا 'گویا میں پہلے سے یہ دیکھ رہا تھا 'وہ تین دن تک اسی طرح بلکتے رہے اور ان کے گھر والے ان کو دیکھ کر روتے رہے 'لوگوں کے دل ان کا حال دیکھ کر پگھل گئے 'پھر چوتھے دن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ سے دعا کی کہ ان پر موت طاری کردے 'سو چوتھے روز وہ مر گئے اور زمین پر ان کا مردہ جسم نہیں دکھائی دیا 'اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے مردہ اجسام کہاں گئے۔ البتہ 'یہ ایسا عذاب تھا جس سے ان لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور روئے زمین پر ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ (کتاب العظمہ 'ص ۳۶۷۔ ۳۶۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۴ھ)

اس حدیث کو بعض مفسرین نے اختصار سے اور بعض نے تفصیل سے بعض نے اپنی سند سے اور بعض نے بغیر سند کے بیان کیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے: (زادالمسیر 'ج ۲ 'ص ۴۶۱۔ ۴۵۹ 'تفسیر کبیر 'ج ۳ 'ص ۴۷۲ 'الجامع لاحکام القرآن 'جز ۶ 'ص ۲۸۲ 'تفسیر ابن کثیر 'ج ۲ ص ۶۸۵۔ ۶۸۲ 'البیضاوی مع الکازرونی 'ج ۲ 'ص ۳۸۲۔ ۳۸۱ 'الدرالمنثور 'ج ۲ 'ص ۳۴۷۔ ۳۴۶ 'تفسیر ابوالسعود علی ہامش التفسیر الکبیر 'ج ۴ 'ص ۹۷۔ ۹۵ 'تفسیر الجمل 'ج ۱ 'ص ۵۴۶۔ ۵۴۵ 'روح المعانی 'ج ۷ 'ص ۶۴۔ ۶۳ 'قصص الانبیاء للثعلبی 'ص ۴۰۲۔ ۴۰۱ 'تفسیر السمرقندی 'ج ۱ 'ص ۴۶۸)

علامہ سیوطی نے اس حدیث کو حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے۔ میں نے ان کی چاروں جلدیں دیکھیں 'ان میں یہ حدیث نہیں ہے۔ امام رازی 'علامہ سمرقندی اور علامہ قرطبیؒ نے اس حدیث کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے 'باقی سب نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ ان مفسرین نے بغیر کسی جرح کے اس روایت کو نقل کردیا ہے۔ علامہ ابوالحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ میں اس

روایت کے ذکر سے اعراض کرتا ہوں ٗکیونکہ اس روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس پر قرآن مجید کی آیت دلالت کرتی ہو اور سب سے اچھی وہ روایت ہے جس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا ٗاس میں گوشت اور روٹیاں تھیں۔ بنو اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس میں سے بچا کر نہ رکھیں اور خیانت نہ کریں ٗانھوں نے اس حکم کی معصیت کی تو یہ مائدہ اٹھالیا گیا اور ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ (البحر المحیط ٗج ۴ ٗص ۴۱۵۔ ۴۱۴)

امام ترمذی کی روایت کا مفاد یہ ہے کہ بنو اسرائیل نے کفران نعمت کیا تو ان پر عذاب نازل ہوا اور سلمان الخیر کی مفصل روایت کا مفاد یہ ہے کہ انھوں نے اس مائدہ کے نزول کے بعد بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت میں شک کیا اور یہ کفر ہے تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ لیکن ترمذی کی حدیث صحاح میں سے ہے اور وہ حدیث مرفوع ہے اور اس حدیث کی سند میں وھب بن منبہ ہیں یہ اسرائیلی عالم تھے ٗبعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ سو یہ حدیث اسرائیلیات میں سے ہے ٗاس لیے ہمارے نزدیک بھی اس کے مقابلہ میں امام ترمذی کی روایت ہی کو ترجیح ہے ٗہم نے صرف تحقیق مقام کے لیے اس روایت کو پوری تفصیل کے ساتھ اس کے ماخذ کے ساتھ درج کیا ہے ٗواللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

یہ واضح رہے کہ عیسائیوں کی کتابوں میں نزول مائدہ کا ذکر نہیں ہے ٗنہ وہ اس دن کو عید مناتے ہیں ٗلیکن قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں مائدہ کو نازل فرماؤں گا اس لیے ہمارے نزدیک حجت قرآن اور حدیث ہے ٗعیسائیوں کا نقل نہ کرنا ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں :

اس (سلمان الخیر) کی حدیث میں بحث کی گنجائش ہے اور یہ سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) ابو عبدالرحمٰن سلمی نے کہا مائدہ کا طعام روٹی اور مچھلی تھی۔ حضرت عمار بن یاسر اور قتادہ نے کہا مائدہ آسمان سے نازل ہوتا تھا اور اس میں جنت کے پھل تھے ٗاور وھب بن منبہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے جو کی روٹیاں اور مچھلیاں نازل کی تھیں اور یہ تین اقوال امام ترمذی کی حدیث کے خلاف ہیں۔ اس میں مذکور ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آسمان سے مائدہ نازل ہوا ٗاس میں روٹیاں اور گوشت تھا اور ترمذی کی حدیث ان اقوال سے اولی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ٗجز ۶ ٗص ۲۸۷ ٗمطبوعہ دار الفکر ٗبیروت) (تبیان)

جناب پیر کرم شاہ الازہریؒ اس بارے یوں فرماتے ہیں : بعض جلیل القدر تابعین، مجاہد اور حسن کی رائے تو یہ ہے کہ جب انھوں نے ناشکری پر سخت ترین عذاب کی دھمکی سنی تو اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ لیکن جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ مائدہ بالفعل نازل ہوا۔ اس میں کون کون سے کھانے تھے ؟ اس کی تفصیل کا نہ یقینی علم ہے اور نہ اس کے جاننے کی ضرورت۔ والمقطوع بہ انھا نزلت وکان علیھا الطعام یؤکل واللہ اعلم بتعیینہ۔ (قرطبیؒ) (ضیاء)

جبکہ ان کے شاگرد خاص امداد حسین شاہ صاحب یوں لکھتے ہیں :

جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ مائدہ بالفعل نازل ہوا تھا، اور اگر یہ کہا جائے کہ مائدہ نازل نہیں ہوا تھا تو پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نزول مائدہ کے لیے دعا مانگنا، اسے عید اور نشانی قرار دینا اور اللہ تعالیٰ کا اس دعا کو قرآن مجید میں پورے اہتمام کے ساتھ بیان کرنا ایک عجیب سی بات لگتی ہے، لہٰذا میری رائے بھی یہی ہے کہ مائدہ بالفعل نازل ہوا تھا اور اس آیت کے الفاظ بھی نزول مائدہ کی تائید کرتے ہیں یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : "بیشک میں اس مائدہ کو تم پر نازل کرنے والا ہوں۔ "یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ (تفسیر خازن) اور اس آیت میں بیان کی گئی تنبیہ بھی اسی رائے کی تائید کرتی ہے یعنی جب میں یہ وعدہ پورا کروں تو تمہیں اس عظیم نعمت پر میرا شکر ادا کرنا ہوگا اور اگر تم میں سے کسی نے بھی میری اس نعمت کی ناشکری کی تو

میں اسے ایسی سخت سزا دوں گا جو بعد میں تمام جہان والوں میں کسی کو بھی نہ دوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جادو گر کہنے والوں کو بندر اور خنزیر بنادیا گیا۔ یہ سزا نزول مائدہ سے پہلے تو کچھ لوگوں کو دی جاچکی تھی لیکن نزول مائدہ کے منکروں کو بندر و خنزیر بنانے کے بعد جہان والوں میں کسی اور کو نہیں دی گئی۔

امام ترمذی کی روایت بھی اسی رائے کی تائید کرتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "آسمان سے جو مائدہ نازل کیا گیا تھا اس میں روٹی اور گوشت تھا۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس میں خیانت نہ کریں اور نہ اس کو کل کے لیے بچا کر رکھیں۔ انھوں (ان میں سے بعض) نے خیانت بھی کی اور اگلے دن کے لیے بچا کر بھی رکھا۔ (تو یہ مائدہ اٹھالیا گیا۔ بحر محیط) پس ان کو بندر اور خنزیر بنادیا گیا۔ "(ترمذی: 3061: ابواب تفسیر القرآن: باب 5) (امداد)

دستر خوان اور میز پر کھانا کھانے کا شرعی حکم

سلمان الخیر کی حدیث میں مائدہ کا بیان ہے اور اس میں یہ مذکور ہے کہ وہ سفرہ (چمڑے کا دستر خوان) تھا 'وہ کوئی خوان (میز) نہیں تھی جس کے پائے ہوں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عربوں کا مائدہ سفرہ (چمڑے کا دستر خوان تھا) حکیم ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی خوان کے اوپر کھانا کھایا نہ پالی میں اور نہ کبھی آپ کے لیے چپاتی پکائی گئی۔ قتادہ نے حضرت انس (رض) سے پوچھا پھر وہ کس چیز پر کھانا کھاتا تھے؟ انھوں نے کہا: سفرہ پر۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا خوان ایک نئی چیز ہے جس کو عجمیوں نے ایجاد کیا ہے 'عرب سفرہ پر کھانا کھاتے تھے 'سفرہ چمڑے کا دستر خوان ہے جس کو کھولا بھی جاتا ہے اور لپیٹا بھی جاتا ہے 'کپڑے کے دستر خوان کو مائدہ کہتے ہیں اور خوان چوکی یا میز کو کہتے ہیں جس کے پائے ہوں اور سفرہ چمڑے کا دستر خوان ہے حسن نے کہا میز پر کھانا کھانا بادشاہوں کا فعل ہے اور کپڑے کے دستر خوان پر کھانا عجمیوں کا فعل ہے اور سفرہ پر کھانا عربوں کا طریقہ ہے اور یہی سنت ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن 'جز ٦ 'ص ٢٨٨ ' ـ ٢٨٧ مطبوعہ دار الفکر 'بیروت)

امام مسلم نے حضرت ابن ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے 'اگر گوہ حرام ہوتی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مائدہ پر نہ کھائی جاتی۔ (صحیح مسلم 'الصید '٤٦ '(١٩٤٧) ٤٩٥٠ 'صحیح البخاری 'رقم الحدیث '٢٥٧٥ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث: ٣٧٩٣ 'سنن النسائی 'رقم الحدیث: ٤٣١٨) اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے کے دستر خوان اور چمڑے کے دستر خوان دونوں پر کھانا سنت ہے 'اور میز ایک نئی چیز ہے 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر کھانے سے منع نہیں فرمایا 'اس لیے اس پر کھانا مباح ہے۔ اور اگر میز پر کپڑے یا چمڑے کا دستر خوان بچالیا جائے اور اس پر کھانا کھایا جائے تو سنت پر بھی عمل ہوگا۔ (تبیان)

آیت مبارکہ:

وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِحَقٍّ‌ؕ اِنۡ كُنۡتُ قُلۡتُهٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَهٗ‌ؕ تَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِىۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِكَ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۱۱۶﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب][قَالَ : فرمایا][اللّٰهُ : اللہ][يٰعِيْسَى: اے عیسیٰ][ابْنَ مَرْيَمَ : ابن مریم][ءَاَنْتَ : کیا تو][قُلْتَ : تونے کہا تھا][لِلنَّاسِ : لوگوں سے][اتَّخِذُوْنِيْ : بناؤ مجھے][وَاُمِّيَ : اور میری ماں][اِلٰهَيْنِ : دوالٰہ][مِنْ : سے][دُوْنِ : علاوہ][اللّٰهِ: اللہ][قَالَ : کہا اس نے][سُبْحٰنَكَ : تو پاک][مَا يَكُوْنُ : نہیں ہے][لِيْٓ: میرے لیے][اَنْ : یہ کہ][اَقُوْلَ : میں کہوں][مَا لَيْسَ : جو نہیں][لِيْ : میرے لیے][بِحَقٍّ : کوئی حق][گ اِنْ : یہ کہ][كُنْتُ : میں ہوں][قُلْتُهٗ : میں کہوں اس کو][فَقَدْ : تو تحقیق][عَلِمْتَهٗ: تو جانتا ہے اسکو][تَعْلَمُ : تو جانتا ہے][مَا فِيْ : جو میں][نَفْسِيْ : میرے نفس][وَلَآ اَعْلَمُ : اور نہیں میں جانتا][مَا فِيْ : جو میں][نَفْسِكَ : تیرے نفس][اِنَّكَ : بیشک تو][اَنْتَ عَلَّامُ : تو خوب جانتا ہے][الْغُيُوْبِ : غیبوں کو]

ترجمہ: اور جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ ابن مریم ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ تم مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنالو، وہ عرض کریں گے : تو پاک ہے، میرے لیے یہ (روا) نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو یقیناً تو اسے جانتا، تو ہر اس (بات) کو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں ان (باتوں) کو نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہیں۔ بیشک تو ہی غیب کی سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے

تشریح:

قیامت میں حضرت عیسیٰ سے الوہیت کے بارے میں سوال

پچھلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی۔ پچھلے رکوع کی ابتدا میں (یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ) فرما کر آگاہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے ان کی امتوں کے مواجہ میں علی رؤس الاشہاد سوال وجواب ہوں گے پھر ان میں سے خاص حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدہ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے جو ان پر اور ان کی والدہ ماجدہ پر فائض ہوئے۔ بعدہ ارشاد ہوگا، (ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ) (کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے سوا معبود مانو) حضرت مسیح (علیہ السلام) اس سوال پر کانپ اٹھیں گے اور وہ عرض کریں گے جو آگے آتا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوگا (هٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُهُمۡ) ہذا کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو یوم یجمع اللّٰہ الرسل میں مذکور تھا۔ بہر حال یہ سب واقعہ روز قیامت کا ہے جسے متیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے قرآن وحدیث میں بصیغہ ماضی (قال) تعبیر فرمایا ہے۔

نکتہ: اتخذونی وامی الٰھین کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو۔

مریم کی جگہ امی کا لفظ اس امر پر سرزنش کر رہا ہے کہ تو پیدا شدہ ہے اور مریم (علیہ السلام) تیری والدہ ہے پھر الوہیت کے دعوے کا کیا جواز ہو سکتا ہے لہ الٰہ کو تو توالد اور تماثل سے پاک ہونا چاہیے۔

ترکیب نحوی:

من دون اللہ اللہ کے علاوہ یہ اِلٰہَیۡن کی صفت ہے یعنی اللہ کے علاوہ دو معبود یا اتخذوا کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔

نکتہ: لفظ دون مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کی عبادت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا عبادت نہ کرنے کی طرح ہے جو شخص اللہ کی عبادت کے ساتھ عیسیٰ (علیہ السلام) اور مریم (علیہ السلام) کی بھی عبادت کرتا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔ دون کا معنی کم بھی ہو سکتا ہے یعنی مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ مگر اللہ کی معبودیت سے کم درجہ کا۔ اس مطلب کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی عیسیٰ (علیہ السلام) اور مریم (علیہ السلام) کو مستقل معبود تو جانتے نہیں ہیں بلکہ ان کی پرستش کو عبادت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ (گلدستہ)

اس سوال پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی حالت

امام ابن کثیر (رض) نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ فریاد کرتے ہوئے عیسیٰ (علیہ السلام) اس قدر عاجزی وانکساری کا اظہار کریں گے کہ ان کے جسم کے ایک ایک رونگٹے سے پسینا بہنا شروع ہو جائے گا۔ بالآخر سراپا التجا بن کر عرض گزار ہوں گے کہ تو انھیں عذاب کرے تیرے ہی بندے ہیں اگر معاف فرمادے تو تجھے روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ تو اپنے فیصلے صادر کرنے پر غالب اور نہایت حکمت والا ہے۔ اس عاجزی اور بار بار فریاد کرنے کے باوجود رب ذوالجلال فرمائے گا کہ آج سچے لوگوں کو ان کی سچائی کا ہی فائدہ پہنچے گا۔" (فہم)

ابو روق نے کہا عیسیٰ (علیہ السلام) یہ کلام سن کر لرز جائیں گے ان کا جوڑ جوڑ کانپ جائے گا اور ہر بُن مُو سے خون پھوٹ نکلے گا۔ (گلدستہ)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب

یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو اس کا شریک کیا جائے۔ اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں۔ اس کی یہ شان نہیں کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے۔ پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا اقتضاء یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی، اگر فی الواقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا اعلانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا۔ بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیال کا خطور بھی نہیں ہوا۔ آپ سے میرے یا کسی کے دل کے چھپے ہوئے ہواجس و خواطر بھی پوشیدہ نہیں۔

امت محمدی پر خصوصی مہربانی

حذیفہ بن الیمان کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دن دیر سے تشریف لائے اور پھر سجدے میں گر پڑے اور اتنی دیر کی کہ گویا روح ہی پرواز ہو گئی ہو۔ پھر آپ نے جب سر اٹھایا تو فرمایا کہ میرے رب نے امت کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے ؟ تو میں نے کہا اے رب ! یہ تو تیرے ہی بندے اور تیری مخلوق ہیں دوسری بار پوچھا۔ پھر بھی میں نے یہی کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد میں امت کے بارے میں تم کو رسوانہ کروں گا۔

قال سبحنك : عرض کریں گے تو پاک ہے یعنی میں تیری پاکی کا اعتراف کرتا ہوں ہر طرح کے شرک سے یا میں تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں کہ تو حقیقت واقعہ جاننے کے لیے سوال اور جواب کا ضرورت مند ہو (حقیقت سے تو خود ہی واقف ہے تجھے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں)

مایکون لی ان اقول مالیس لی بحق میرے لیے سزاوار نہ تھا کہ جس چیز کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا وہ بات کہتا۔

ان کنت قلتہ فقد علمتہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا یعنی مجھے عذر پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے علم ہوتا اور تو واقف ہے کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔

تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك جو میرے نفس میں ہے اس کو تو جانتا ہی ہے اور جو تیری ذات میں ہے اس کو میں نہیں جانتا یعنی میرے دل میں جو مخفی خیالات ہیں ان سے تو واقف ہے اور تیری پوشیدہ معلومات سے میں ناواقف ہوں۔ فِيْ نِفْسِكَ میں نفس سے ذات مراد ہے پہلے لفظ نفس کی مناسبت کی وجہ سے دوسری جگہ بھی لفظ نفس ہی استعمال کیا۔ (گلدستہ)

بائبل میں حضرت مریمؑ کو کیا خدا کہا گیا؟

حضرت مریم (علیہاالسلام) کو خدا کہنے کا بائبل میں کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن بعد میں حضرت مریم (علیہاالسلام) کے لیے "مادر خدا" کی اصطلاح وضع کی گئی اور جب قرآن مجید نازل ہوا تو اس وقت حضرت مریم (علیہاالسلام) کے مجسمے کلیساؤں میں رکھے جاتے تھے اور بعض عیسائی فرقے ان کے سامنے عبادت کے وہ مراسم بھی ادا کرتے تھے جو صرف خدا کے سامنے ادا کئے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت مریم (علیہاالسلام) کو کسی نہ کسی شکل میں خدا سمجھتے تھے۔ عیسائی حضرات اگرچہ خدا کی عبادت کرتے تھے لیکن خدا کی عبادت کے ساتھ اگر غیر خدا کی عبادت بھی کی جائے تو یہ خدا کی عبادت نہیں بلکہ شرک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تنہا عبادت کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت کرنے سے خدا کی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے اور شرک لازم آجاتا ہے۔ (امداد)

اس اشکال کا جواب کہ عیسائی تو حضرت مریم کو خدا نہیں کہتے اور اللہ کی الوہیت کی نفی نہیں کرتے

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ سوال فرمایا کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنالو 'اس سوال کی کیا حکمت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی ماں کو خدا بنالیا تھا 'اس آیت سے ان کو زجر و توبیخ کرنا 'ان کا رد کرنا اور ان کی مذمت کرنا مقصود ہے 'کیونکہ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس سے انکار کریں گے تو ان لوگوں کی واضح تکذیب ہوگی۔ نیز اس سوال و جواب سے یہ بتانا تھا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ان کے دین کو بدل دیا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق ایسی چیز کا دعوی کیا جس کے وہ خود قائل نہ تھے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نصاری نے حضرت مریم کو خدا نہیں کہا 'اور نہ یہ ان کا عقیدہ ہے تو پھر یہ آیت کس طرح صادق ہوگی 'کیا تم نے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنالو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ انھوں نے صراحتہ حضرت مریم کو خدا نہیں کہا؟ لیکن ان کے اقوال سے یہ بات لازم آتی ہے 'کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے کسی انسان کو جنم نہیں دیا 'انھوں نے خدا کو جنم دیا ہے اور بیٹا ماں کا جز اور ماں کی جنس سے ہوتا ہے 'تو جب بیٹا خدا ہے تو اس سے لازم آیا کہ اس کی ماں بھی خدا ہو۔ گویا وہ صراحتا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کہتے ہیں اور التزاما ان کی ماں کو بھی خدا کہتے ہیں 'اس کی نظیر یہ آیت ہے:

(آیت) "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم"۔ (التوبہ: ۳۱)

ترجمہ: انھوں نے اپنے علماء اور دریشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔

حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا یا رسول اللہ! عیسائی اپنے علماء اور درویشوں کی عبادت تو نہیں کرتے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے اس کو ان کے علماء اور درویش حرام کہیں تو یہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہو اس کو ان کے علماء اور درویش حلال کہیں تو

یہ اس کو حلال کہتے ہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں ! آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت کرنا ہے (اور ان کو خدا ماننا ہے۔ ثعلبی) سو جس طرح عیسائی صراحتا اپنے علماء اور درویشوں کو خدا نہیں کہتے لیکن یہ ان پر لازم آتا ہے ' اسی طرح وہ مریم کو صراحتا خدا نہیں کہتے لیکن یہ ان پر لازم آتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس آیت میں فرمایا مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنالو حالانکہ عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور خدائی کی کبھی نفی نہیں کی۔ خود قرآن مجید میں عیسائیوں کے متعلق مذکور ہے :

(آیت) "لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ"۔ (المائدہ : ٧٣)

ترجمہ : بیشک وہ لوگ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عیسائی یہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم کے ہاتھوں سے جو معجزات ظاہر ہوئے ان کے خالق حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم ہیں۔ اس لحاظ سے ان سے یہ نقل اور حکایت کرنا صحیح ہے کہ "کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنالو"۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہرچند کہ وہ اللہ کے خدا اور معبود ہونے کی نفی نہیں کرتے تھے ' لیکن وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضت مریم کی عبادت بھی کرتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جب اللہ کی عبادت کے ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کی جائے گی تو تو گویا کہ اللہ کی عبادت نہیں کی عبادت نہیں کی گئی ' کیونکہ اللہ تعالیٰ تنہا مستحق عبادت ہے اور وہی عبادت اللہ کی عبادت کہلائے گی جو صرف اسی کی ' کی جائے اور جب اس کی عبادت کے ساتھ دوسروں کی عبادت بھی کی جائے تو پھر وہ اس کی عبادت نہیں ہوگی تو حقیقت میں عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم کو معبود بنایا اور اللہ تعالیٰ کو معبود بنایا اور اللہ تعالیٰ کو معبود نہیں بنایا ' اس لیے فرمایا اے عیسیٰ ابن مریم ! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنالو۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا کمال ادب سے اپنی برأت کرنا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جواب میں عرض کیا تو سبحان (پاک) ہے ' میرے لیے یہ جائز نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی ' بلکہ ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا کہ میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ بات حق نہیں ہے ' اس لیے میں نے نہیں کہی اور کمال ادب سے اس کو اللہ تعالیٰ کے علم پر چھوڑ دیا کہ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے علم ہوتا کیونکہ تجھے میرے متعلق علم ہے اور مجھے تیرے متعلق علم نہیں ہے ' یا اس کا معنی ہے تو میرے غیب کو جانتا ہے اور میں تیرے غیب کو نہیں جانتا ' یا تجھے میری دنیا کے متعلق علم ہے اور مجھے تیری اخروی امور کے متعلق علم نہیں ہے ' یا تجھے میرے اور افعال کا علم ہے اور مجھے تیرے اقوال اور افعال کا علم نہیں ہے ' پھر اس کی تاکید کے طور پر فرمایا : بیشک تو ہی سب غیبوں کا جاننے والا ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے کلام کی ابتداء لفظ سبحان سے کی ' ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جو شریک کی نسبت کی گئی ہے اس کی تنزیہ کریں اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عزت اور سطوت کا بیان کیا جائے۔ (تبیان)

اس سوال اور جواب سے یہ امر تو ثابت ہو چکا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور پیغمبر ہیں اور خدا کے فرمان کے مطابق اپنی زندگی میں توحید کا اعلان اور تبلیغ فرمائی اور نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث یہ محض افتراء بندی ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس بہتان سے بری ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ نصاریٰ کا عقیدہ الوہیت مسیح اور عقیدۂ ابنیت اور عقیدہ تثلیث یہ سب بدعتیں اور گمراہیاں ہیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بعد دین مسیح میں داخل ہوئیں اور عیسیٰ (علیہ السلام) ان سب سے بری اور بیزار ہیں۔ یہ سارا رکوع اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے سامنے انسان کی بندگی و عاجزی سے پر ہے اور نہایت بلیغ انداز میں عیسائیوں کے باطل عقائد کی تردید کر دی گئی اور بتلایا گیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی جو دعوت تھی وہ ایک رسول ہی کی دعوت تھی یعنی یہ کہ ہمیشہ توحید الٰہی کی دعوت دیتے رہے اور شرک سے منع کرتے رہے اور اپنی عبدیت کا اقرار کرتے رہے اور دن رات خدائے قدوس ہی کی عبادت اور بندگی میں لگے رہے اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان لوگوں سے برات و بیزاری ظاہر فرمائیں گے جنہوں نے ان کو الوہیت کا درجہ دیا۔

یہاں تک تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا اور اپنی امت کا معاملہ عرض کیا آگے اپنی امت کے جزاو سزا کے متعلق عرض ہے۔ اور پھر اس پر حق تعالیٰ جو ارشاد فرمائیں گے وہ اگلی خاتمہ کی آیات میں ظاہر کیا گیا ہے جس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ درس میں ہوگا۔

دعا کیجئے: حق تعالیٰ ہم کو سچی توحید و رسالت کا عقیدہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور قیامت کے روز ہم کو اپنے نبی پاک، فخر الانبیاء، سید المرسلین، رحمت اللعالمین، محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا نصیب فرمائیں۔ یا اللہ ہم کو دنیا میں ایسے اعمال و عقائد کی توفیق عطا فرمایئے کہ جو میدان حشر میں ہم کو شافع محشر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے سرخروئی نصیب ہو۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشنودی اور شفاعت نصیب ہو۔ آمین۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

لغۃ القرآن: [مَا : نہیں][قُلْتُ : میں نے کہا][لَهُمْ : ان کے لیے][اِلَّا مَآ : مگر جو][اَمَرْتَنِيْ : مجھے حکم دیا تونے][بِهٖٓ: اسکا][اَنِ : یہ کہ][اعْبُدُوا : تم عبادت کرو][اللّٰهَ : اللہ کی][رَبِّيْ : میرا رب][وَرَبَّكُمْ : اور تمہارا رب][وَكُنْتُ : اور میں ہوں][

عَلَيْهِمْ : ان پر][شَهِيْدًا : نگران][مَّا دُمْتُ : جو میں رہا][فِيْهِمْ : ان میں][فَلَمَّا : پھر جب][تَوَفَّيْتَنِيْ : تونے مجھے فوت کیا][كُنْتَ : تو تھا][اَنْتَ الرَّقِيْبَ : تو نگہبان][عَلَيْهِمْ : ان پر][وَاَنْتَ : اور تو][عَلٰي : پر][كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز][شَهِيْدٌ : نگران]

ترجمہ: میں نے انھیں سوائے اس (بات) کے کچھ نہیں کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم (صرف) اللہ کی عبادت کیا کرو جو میرا (بھی) رب ہے اور تمہارا (بھی) رب ہے، اور میں ان (کے عقائد و اعمال) پر (اس وقت تک) خبردار رہا جب تک میں ان لوگوں میں موجود رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان (کے حالات) پر نگہبان تھا، اور تو ہر چیز پر گواہ ہے

تشریح: یہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا وہ جواب ہے جو آپ بارگاہ رب العزت میں عرض کریں گے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہیبت الٰہی سے کانپ جائیں گے پانچ سو سال تک خاموش رہیں گے پھر یہ جواب عرض کریں گے۔ (روح المعانی)

سبحنک۔ تو پاک ہے ہر قسم کے شر سے۔ مایکون لی۔ میں نے یہ نہ کہا تھا تیرا علم میرا گواہ ہے تو علام الغیوب ہے۔ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک۔ تعلم۔ ہمیشہ سے ہمیشہ تک جاننا۔ ما سے مراد علوم ہیں۔ فی نفسی۔ انسان کے علوم جو اس کی ذات یا اس کے دل میں ہوتے ہیں فی ظرفیہ ہے۔ فی نفسک۔ سے اشارہ وہ علوم ہیں جو تو نے ہم پر ظاہر نہیں فرمائے وہ میں نہیں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے۔ (روح المعانی)

انک انت علامہ الغیوب الغویب میں الف لام استغراقی سے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں سارے غیبوں کا بہت ہی جاننے والا ہے۔ علامہ نسفی (رح) فرماتے ہیں۔ (ترجمہ)

جمہور اسی طرف ہیں کہ یہ سوال بروز قیامت ہوگا۔ اس کی دلیل سیاق و سباق آیت ہے ایک قول یہ ہے کہ یہ مخاطبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے جب ہوا۔ جب کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھایا اس کی دلیل لفظ اذ ہے۔

روح المعانی میں ہے کہ یہ سوال بروز قیامت کافروں کی توبیخ کے لیے ہوگا۔ (آیت)

ایک قول یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہی بعد غروب یہ سوال کیا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے مغرب کی تین رکعتیں پڑھیں جبکہ یہ مخاطبہ ہوا چنانچہ پہلی رکعت اپنی الوہیت کی نفی پر پڑھی۔ دوسری رکعت اپنی والدہ کی نفی الوہیت پر پڑھی۔ تیسری رکعت اللہ تعالیٰ کے اثبات الوہیت و وحدانیت کے لئے۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے مغرب پڑھی وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تھے۔

قال سبحنک۔ من ان یکون لک شریک۔ عرض کی تیری ذات پاک ہے اس سے کہ تیرا شریک ہو۔ مایکون لی۔ ماینبغی لی۔ مجھے یہ زیبا ہی نہیں کہ ان کنت قلتہ فقد علمتہ۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو تو جانتا ہے۔

یعنی مجھے عذر پیش کرنے کی احتیاج ہی نہیں اس لیے کہ تو جانتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اور اگر کہا ہے تو یقیناً تو جانتا ہے کیونکہ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیری معلومات ہیں۔ یعنی میرا ہر معلوم تجھے معلوم ہے اور تیرا کوئی معلوم نہیں۔ بیشک تو غیبوں کا جاننے والا ہے۔ تیرے غیبو تک کسی کا علم نہیں پہنچ سکتا۔

ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ۔ میں نے نہیں کہا انھیں مگر وہی جو تو نے مجھے حکم کیا۔ ان اعبدوا اللہ ربی و ربکم۔ یہ کہ پوجو اللہ کو جو میرے رب اور تمہارا رب ہے۔ و کنت علیھم شھیداً اور میں ان کا نگران تھا۔

مادمت فیھم مدۃ کونی فیھم ۔ جب تک میرا وجود ان میں تھا۔ (تفسیر نسفی)

فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم تو جب اٹھالیا تو نے مجھے تو تو ہی ان کا رقیب و حفیظ تھا۔ **وانت علی کل شیئی شھید۔ من قولی وفعلی وقولھم وفعلھم** ۔ (نسفی) اور تو ہر شے کا نگران و محافظ ہے۔ (حسنات)

سبحان اللہ ! کیا شان ہے بارگاہ خداوندی میں ادب و تعظیم کی اور اللہ کے رسول عیسیٰ (علیہ السلام) کی کسر نفسی کی۔ عرض کرتے ہیں میرے خدا ! میں نے توانھیں وہی کچھ کہا جس کے کہنے کا تو نے مجھے حکم فرمایا۔ میں نے توانھیں صاف صاف اور بار بار کہا تھا کہ تم صرف رب العزت کی عبادت کروجو میرا بھی مالک وپروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ تو احکم الحاکمین ہے اب تو ہی بتا کہ تو نے مجھے یہی کچھ کہنے کا حکم نہیں دیا تھا؟ موجودہ انجیلیں بھی باوجود اپنے تثلیثی شرک کے جو ان کے شارحین نے ان میں بھر دیا اس توحید تعلیم کو مٹا نہ سکیں۔ لکھا ہے کہ "یسوع اس کے پاس سے چلا گیا اور دیکھو فرشتے آکر اس کی خدمت کرنے لگے۔ " (متی ۴ : ۱۰،۱۱) "یسوع نے اس سے جواب میں کہا، لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ " (لوقا ۴ : ۸) اور قرآن کریم میں بھی آپ کا یہ کلام آپ کی کمال عبدیت اور انتہائی عبدیت پر دلالت کر رہا ہے اور آپ نے کتنی وضاحت سے یہ ارشاد فرمادیا کہ خدایا ! یہ پیام توحید بھی میری اپنی طرف سے نہ تھا تیرے ہی ارشاد کی تعمیل یہ ہی تھی کیونکہ تیرے بغیر بتائے میں جانتا ہی کب تھا؟ اللہ کا ایک رسول جو قوم بنی اسرائیل کے سلسلہ کا آخری رسول تھا جس کے بعد اس قوم میں کوئی رسول نہ آیا اپنے بندہ ہونے کی کتنی دلیل دے رہا ہے لیکن ان ساری دلیلوں کو پیٹھ پیچھے پھینک کر قوم نے اس کو الہٰ و معبود بنالیا اور اس کے باوجود ان کو اپنا یہ کھلا شرک نظر نہ آیا اور بدقسمتی سے یہی کچھ قوم مسلم کی اکثریت آج کر رہی ہے کہ نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں جو بنی اسرائیل نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کیا۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کا بیان کہ میری وفات سے بعد کے حالات کو تو ہی بہتر جانتا ہے۔ (عروہ)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے آسمان پر اٹھائے جانے پر ایک اشکال کا جواب

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) وفات پاچکے ہیں۔ کیونکہ توفی کا معنی وفات ہے اور اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ جب تو نے مجھے وفات دے دی 'تو تو ہی ان پر نگہبان تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے 'کیونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے آسمان پر اٹھائے جانے کے متعلق جو احادیث ہیں 'وہ حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور النساء : ۱۵۸ کی تفسیر میں ہم نے بہت زیادہ احادیث پیش کی ہیں۔

توفی کا مادہ وفا سے ہے۔ وفاء کا معنی ہے کسی چیز کو پورا کرنا یا کسی چیز کا تمام و کمال کو پہنچنا 'موت کو وفات اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مدت حیات پوری ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے (آیت) "واوفوا الکیل "۔ (الانعام : ۱۵۲) پورا پورا ماپ کردو (آیت) "واوفوا بعھدی "۔ (البقرہ : ۴۰) مجھ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو۔ (آیت) ' 'ووفیت کل نفس ما کسبت "۔ (آل عمران : ۲۵) ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (تبیان)

توفی کا حقیقی معنی مارنا نہیں بلکہ کسی چیز کو پوری طرح اپنے قبضہ میں لے لینا ہے۔ التوفی اخذ الشیء وافیا: کسی چیز کو کامل طور پر اپنے قبضہ میں لے لینا۔ (بیضاوی) وتوفاہ ای لم یدع منہ شیئا (تاج العروس) چنانچہ حضرت حسن بصری (رح) فرماتے ہیں کہ لفظ وفات قرآن میں تین طرح استعمال ہوا ہے۔ (1)۔ وفات موت۔ (2)۔ وفات نوم۔ (3)۔ وفات رفع۔ پہلی وجہ کی مثال اللہ یتوفی الانفس حین موتھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ موت کے وقت نفسوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے۔ دوسری وجہ کی مثال وھو الذی یتوفا کم باللیل۔ اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو رات کو نیند کے وقت تمہارے نفسوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے۔ تیسری وجہ کی مثال یا عیسیٰ انی متوفیک۔ اے عیسیٰ (علیہ السلام) میں تمہیں زمین سے اٹھا کر اپنے قبضہ اور حفاظت میں لے لوں گا۔ قال الحسن الوفاۃ فی کتاب اللہ عزوجل علی ثلثۃ اوجہ وفاۃ الموت ووفاۃ النوم ووفاۃ الرفع وذالك قولہ تعالیٰ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا۔ قال اللہ تعالیٰ وھو الذی یتوفا کم باللیل۔ قال اللہ تعالیٰ یعیسی انی متوفیك (قرطبی)

اب جب یہ لفظ ان متعدد معانی میں مستعمل ہوتا ہے تو اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ کسی موقع پر ان متعدد معانی سے کونسا معنی مراد ہے دوسرے قرائن کو دیکھنا ہوگا۔ اور اگر حدیث صحیح سے کوئی معنی متعین ہو جائے تو پھر دوسرے معانی کا احتمال ختم ہو جائے گا اور صرف وہی معنی لیا جائے گا جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کتاب کے بیان کا حق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تفویض فرمایا ہے اس کے بعد کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں رہتی۔ جب احادیث نبویہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تو اب آیات قرآنی کو اپنے اغراض واہوا کا لباس پہنانا سراسر بے دینی اور بے باکی ہے۔ (ضیاء)

قرآن مجید میں توفی کا لفظ موت کے لیے بھی آیا ہے اور نیند کے لیے بھی:

(آیت) "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا"۔ (الزمر: ۴۲)

ترجمہ: اللہ موت کے وقت روحوں کو قبض کر لیتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی ان کی نیند کے وقت۔

(آیت) 'وھو الذی یتوفکم بالیل"۔ (الانعام: ۶۰)

ترجمہ: وہی ہے جو رات کے وقت تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

اور اس آیت میں توفی کا معنی پورا پورا اٹھا لینا ہے جیسا کہ بکثرت احادیث میں بیان کیا گیا ہے اس آیت میں توفی کا معنی موت مراد لینے پر مرزائی حسب ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر نصیحت کرتے ہوئے خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! تم اللہ کی طرف جمع کیے جاؤ گے درآنحالیکہ تم ننگے پیر 'ننگے بدن اور غیر مختون ہوگے اللہ نے فرمایا ہے جس طرح ہم نے پہلی بار مخلوق کو پیدا کیا تھا 'ہم اسی حالت میں اس کو لوٹائیں گے 'یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم بیشک اس کو کرنے والے ہیں (الانبیاء: ۱۰۴) اور سنو مخلوق میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو لباس پہنایا جائے گا اور سنو! میری امت میں سے چند لوگ لائے جائیں گے۔ ان کو بائیں جانب سے پکڑا ہوا ہوگا 'میں کہوں گا 'اے میرے رب! یہ میرے اصحاب ہیں 'سو کہا جائے گا آپ (از خود) نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد دین میں کیا نئی باتیں نکالی ہیں 'تو میں اس طرح کہوں گا جس طرح اللہ کے عبد صالح نے کہا تھا میں ان پر اسی وقت تک نگہبان تھا جب تک میں ان میں رہا 'پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی 'تو تو ہی ان پر گواہ تھا۔ الایہ (المائدہ: ۱۱۸۔ ۱۱۷) سو مجھ

سے کہا جائے گا ' آپ کے دنیا سے جانے کے بعد یہ لوگ اپنی ایڑیوں پر پلٹ گئے تھے۔ (مرتد ہو گئے تھے) (صحیح مسلم ' الجنت ' ۵۸ ' (۲۸۶۰) ۷۰۶۷ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ۵۲۶ ۷ ' سنن ترمذی ' رقم الحدیث : ۲۴۲۳۔ ۳۱۶۷ ' سنن نسائی رقم الحدیث : ۲۰۸۷)

اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورۃ مائدہ کی اسی آیت کو نقل فرمایا ہے اور اس آیت میں توفی وفات کے معنی میں ہے۔ مرزائی کہتے ہیں ' اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت میں توفی وفات کے معنی میں ہے۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) وفات پا چکے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اس آیت کو پڑھیں گے تو آپ کے حق میں اس کا معنی وفات ہی ہوگا ' کیونکہ آپ ﷺ کے حق میں اس معنی کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے ' اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جب توفیتنی فرمائیں گے تو ان کے حق میں اس کا معنی وفات نہیں ہوگا ' کیونکہ اس معنی کے خلاف بہ کثرت احادیث ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے ' سو اس کا معنی ہوگا ' جب تو نے مجھے (آسمان پر) اٹھالیا۔ بعض اوقات فاعل کے اختلاف سے فعل کا معنی مختلف ہو جاتا ہے۔ صلی اللہ کا معنی ہے اللہ کی رحمت نازل کی ' صلی الملائکہ کا معنی ہے فرشتوں نے استغفار کیا ' صلی المسلمون کا معنی ہے مسلمانوں نے رحمت طلب کی۔ اس لیے مستبعد نہیں ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) توفیتنی فرمائیں تو اس کا معنی ہو تو نے مجھے وفات دی اور جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) توفیتنی کہیں تو اس کا معنی ہو تو نے مجھے آسمان پر اٹھا لیا جبکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ توفی کا معنی لازماً موت اور وفات نہیں ہے۔ (تبیان)

اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کی توفی بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہم رنگ ہونی چاہیے، عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے مشرکین مکہ ایک درخت (ذات انماط) پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمارے لیے بھی ذات انماط مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہاں ہے۔ آپ نے فرمایا ھٰذا کما قال قوم موسیٰ اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ (یہ تو ایسا ہوا جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے بھی ایسا معبود تجویز کر دو جیسا ان بت پرستوں کا ہے) کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی؟ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکمہ اور اجماع امت کے مخالف عقائد پر تمسک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہو سکتا ہے جن کی نسبت یہ ارشاد ہوا (فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ) 3۔ آل عمران : 7) (گلدستہ)

فوائد

۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا قول و فعل رب کے حکم سے ہوتا ہے۔ ان کی تبلیغ رب کے حکم اور ہماری تبلیغ نبی کے حکم سے ہے۔ اس لیے وہ حضرات رسول ہوتے ہیں دوسرے لوگ رسول نہیں اگرچہ تبلیغ کریں اور سارے وہی کام کریں جو نبی کرتے ہیں۔

۲۔ اس میں عیسائیوں کے عقیدے کا رد ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو رب کہتے تھے۔ فرمایا کہ میرا اور تم سب کا رب اللہ ہے ہم دونوں مربوب ہیں۔

۳۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میری زندگی میں تو ان سے بے خبر تھا میں خبردار تھا۔ اور میری وفات کے بعد میں بے خبر تو خبردار ہو گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی میں، میں ان کا ذمہ دار تھا کہ انھیں تبلیغ کروں بعد وفات میری ذمہ داری تبلیغ کی ختم ہو گئی اور ان کا معاملہ تیرے سپرد ہو گیا۔

۴۔ شہید، شہادت سے ہے جس کے معنی گواہی حاضری ہیں۔ شہید بمعنی گواہ اور حاضر۔ اللہ تعالیٰ مکانی حضور سے پاک ہے۔ تمام چیزیں اس کے حضور حاضر ہیں اور اس کا علم و قدرت ہر جگہ حاضر ہے۔

آیت مبارکہ:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

لغۃ القرآن: [اِنْ : اگر][تُعَذِّبْهُمْ : تو انکو عذاب دے][فَاِنَّهُمْ : بیشک وہ][عِبَادُكَ : تیرے بندے][وَاِنْ : اور اگر[] تَغْفِرْ : تو معاف کرے][لَهُمْ : انکو][فَاِنَّكَ : بیشک تو][اَنْتَ : تو][الْعَزِيْزُ : غالب][الْحَكِيْمُ : حکمت والا]

ترجمہ: اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے (ہی) بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بیشک تو ہی بڑا غالب حکمت والا ہے

تشریح:

اللہ کریم قادر، غالب اور حکیم ہے

یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بیجا سختی نہیں کر سکتے اس لیے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہو گی اور فرض کیجئے معاف کر دیں تو یہ معافی بھی از راہ عجز و سفہ نہ ہو گی۔ چونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں اس لیے کوئی مجرم آپ کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا کہ آپ اس پر قابو نہ پا سکیں۔ اور چونکہ حکیم (حکمت والے) ہیں۔ اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع چھوڑ دیں۔ بہر حال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی، اسی لیے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا برخلاف اس کے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا۔ (رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) (اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان میں سے میرے تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے) یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے۔ (گلدستہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی۔ فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانك انت العزیزا لحکیم (اے میرے رب ! جس نے میری فرمان برداری کی وہ میرے گروہ سے ہوگا اور جس نے نافرمانی کی تو تو ہی عزت وحکمت والا ہے) اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ان تعذبھم الخ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زارو قطار روپڑے اور عرض کی اللھم امتی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ میرے محبوب کے پاس جاؤ اور اس سے رونے کی وجہ پوچھو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ جبرائیل (علیہ السلام) حاضر ہوئے دریافت کیا تو رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کی بخشش کے متعلق اندیشہ ظاہر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر جبرائیل (علیہ السلام) کو یہ پیغام دے کر اپنے محبوب کے پاس بھیجافقال اللہ یاجبرائیل اذھب الی محمد فقل ان سنرضیك فی امتك ولا نسوءك (صحیح مسلم) کہ (اے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ رنجیدہ نہ ہوں) یقیناً ہم آپ کی امت سے ایسا رحمت جو سلوک کریں گے جس سے آپ خوش ہوجائیں گے اور ان سے ایسا معاملہ نہ ہوگا جو آپ کو ناگوار گزرے۔ الحمد للہ جس نے ہم سیاہ کاروں کو ایسے کریم اور بیکس پرور نبی کی امت ہونے کا شرف بخشا۔ صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم۔ (ضیاء)

امتِ مرحوم کے حق میں دعا

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اس آیت مبارکہ کو پڑھ کر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں اپنی امت کیلئے دعا فرمائی۔
مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہونے والی باتیں :

اس حدیث پاک سے چند باتیں معلوم ہوئیں

(1)۔۔رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت پر کمال درجے کے شفیق و مہربان تھے اور امت کی بھلائی اور بہتری میں کوشاں رہتے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کے لیے کسی شرط اور قید کے بغیر بخشش کی دعا مانگی۔
(2)۔۔اس امت مرحوم کے لیے عظیم بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی بخشش کے معاملے میں اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو راضی فرمائے گا۔
(3)۔۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام بہت بلند ہے کہ سب کچھ جاننے والا ہونے کے باوجود حضرت جبرائیل عَلَیْہِ السَّلَام کو اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں بھیجا اور اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت اور شرف کو ظاہر فرمایا۔
(4)۔۔نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبولیت کے اتنے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عظمتوں کو ظاہر فرماتا اور آپ کو راضی فرماتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں اور انہی کے الفاظ میں ہم بھی عرض گزار ہیں کہ :
ہم ہیں ان کے وہ ہیں تیرے تو ہوئے ہم تیرے اس سے بڑھ کر تری سمت اور وسیلہ کیا ہے
ان کی امّت میں بنایا انھیں رحمت بھیجا یوں نہ فرما کہ ترا رحم میں دعویٰ کیا ہے
صدقہ پیارے کی حیا کا کہ نہ لے مجھ سے حساب بخش بے پوچھے لجائے کو لجانا کیا ہے (صراط)

اس اعتراض کا جواب کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے مشرکین کی شفاعت کی

سیاق وسباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی یہ دعا ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد آپ کو اور آپؑ کی والدہؓ کو معبود بنالیا تھا کیونکہ سلسلہ کلام ان ہی کے ساتھ مربوط ہے اور وہ لوگ مشرک تھے اور مشرکوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ' کہ وہ ان کو نہیں بخشے گا۔ پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کی شفاعت کیسے کی ؟ کیونکہ مشرکوں کے لیے شفاعت جائز نہیں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں اس میں ضمیر ان کی طرف راجع ہے جنہوں نے موت سے پہلے اپنے کفر سے توبہ کرلی تھی۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی یہ دعا قیامت کے دن کے بارے میں نہیں ہے ' بلکہ آسمان پر اٹھانے جانے کے بعد ہے اس تقدیر پر اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تو ان کو کفر باقی رکھے ' حتی کہ یہ مرجائیں اور تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں توبہ کی توفیق دے اور اپنی توحید اور اطاعت کی ھدایت دے ' پھر تو ان کو بخش دے تو تو بہت غالب ہے تیرے ارادہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے اور تو اپنے افعال میں حکیم ہے جس میں چاہتا ہے گمراہی پیدا کرتا ہے اور جس میں چاہتا ہے ہدایت پیدا کرتا ہے۔ اس جواب سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اور " اگر تو ان کو بخش دے " کے ساتھ تو غالب اور حکمت والا ہی مناسب ہے اور غفور رحیم مناسب نہیں ہے۔

العزیز الحکیم اور الغفور الرحیم کا فرق

امام رازی کے والد ضیاء الدین عمر رازی رحمۃ اللہ عنہ نے فرمایا اس آیت کے آخر میں العزیز الحکیم ' الغفور الرحیم سے اولی ہے۔ کیونکہ غفور رحیم ایسی صفت ہے جو ہر محتاج کے لیے مغفرت کو واجب کرتی ہے اور عزیز رحیم ایسی صفت ہے جو ہر ایک کے لیے مغفرت کو واجب نہیں کرتی ' کیونکہ عزیز ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غالب ہے جو چاہے کرے ' کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے اور جب وہ عزیز ہو اور ہر اعتبار سے غالب ہو ' پھر اس کا بخش دینا اس کا بہت بڑا کرم ہے اور بعض علماء نے یہ کہا : کہ اگر وہ غفور رحیم کہتے تو یہ متبادر ہوتا کہ وہ شفاعت کر رہے ہیں ' اور جب انھوں نے العزیز الحکیم کہا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ معاملہ بالکلیہ اللہ کے سپرد کردیا ہے۔

فساق مومنین کے لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے شفاعت فرمائیں گے ' کیونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جو یہ کہا اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں یہ نیکوکاروں کے حق میں نہیں فرمایا تھا ' کیونکہ وہ عذاب کے سزاوار نہیں ہیں اور نہ ہی یہ دعا کفار کے حق میں ہے ' کیونکہ ان کا یہ قول " اگر تو ان کو بخش دے تو تو بہت غالب بہت حکمت والا ہے " کفار کے لائق نہیں ہے ' کیونکہ کافروں کی بخشش نہیں ہو سکتی۔ پس واضح ہوا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی یہ شفاعت ان مومنین کے لیے ہے جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے مرتکبین کبائر کی شفاعت ثابت ہے تو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے مرتکبین کبائر کی شفاعت بہ طریق اولی ثابت ہوگی ' اور صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کی شفاعت کے لیے اس آیت کو پڑھا۔

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت پر بہت شفیق تھے اور امت کی بھلائی اور بہتری میں کوشاں رہتے تھے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہاتھ بلند کرکے دعا کرنا مستحب ہے اور اس حدیث میں اس امت کے لیے بہت عظیم بشارت ہے اور اس میں امت کی مغفرت کی بہت بڑی امید ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت عزت اور وجاہت ہے اور حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بھیجنے سے آپ کے شرف اور مرتبہ کا اظہار مقصود ہے۔ یہ حدیث اس آیت کے موافق ہے۔ عنقریب آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ کو راضی کردے گا۔ (الضحی : ۵) اللہ اکبر سارا جہان اللہ کو راضی کرتا ہے اور اللہ آپ ﷺ کو راضی کرتا ہے۔ آپ ﷺ کو راضی کرنے کی بشارت دینے کے بعد یہ فرمایا: اللہ آپ ﷺ کو رنجیدہ ہونے نہیں دے گا ' کیونکہ بعض امتیوں کو بخش دینے سے بھی راضی کرنا متحقق ہو سکتا ہے ' لیکن اگر آپ ﷺ کا ایک امتی بھی دوزخ میں رہ گیا تو آپ ﷺ رنجیدہ ہوں گے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم آپ ﷺ کو رنجیدہ ہونے نہیں دیں گے اور آپ ﷺ کے تمام امتیوں کو دوزخ سے نجات دے دیں گے۔ (تبیان)

امت محمدیہ کے لیے بشارت

ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابوذر نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے ماں باپ قربان رات آپ نے نماز کے اندر قیام کی حالت میں قرآن کی ایک آیت (بار بار) اتنی پڑھی کہ اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم اس پر غصہ کرتے فرمایا میں نے اپنی امت کے لیے دعا کی تھی۔ راوی نے پوچھا پھر کیا جواب ملا فرمایا مجھے ایسا جواب ملا کہ اگر اس کی اطلاع لوگوں کو ہو جائے تو بہت لوگ نماز چھوڑ دیں۔ راوی نے عرض کیا کیا میں اس کی بشارت لوگوں کو نہ دوں فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر یہ پیام آپ لوگوں کو بھیج دیں گے تو وہ عبادت کو چھوڑ کر اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے یہ سن کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آواز دے کر راوی کو واپس بلا لیا اور یہ آیت ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیزالحکیم تلاوت فرمائی

اسی کو (نماز میں بار بار) تلاوت فرمارہے تھے، مسلم اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے

ابن کثیر (رح) نے بروآیت ابوذر (رض) نقل کیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک مرتبہ پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے، اور وہ آیت اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ، ہے پھر جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ یہی آیت پڑھتے رہے، رکوع اسی سے اور سجدے اسی سے کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تو فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے اپنے واسطے شفاعت کی درخواست کی تو مجھے عطا فرمائی، اور وہ انشاء اللہ تعالیٰ ملنے والی ہے، ایسے شخص کے واسطے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو۔

دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے مذکورہ آیت پڑھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا اللھم امتی یعنی میرے پاک پروردگار میری امت کی طرف نظر رحمت فرما، اور آپ رونے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبرائیل امین رونے کی وجہ دریافت فرمائی، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جبرائیل امین کو اپنے مذکورہ قول سے آگاہ کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دو کہ ہم عنقریب تیری امت کے بارے میں تم کو رضامند کردیں گے، اور تم کو ناخوش نہ کریں گے۔ (گلدستہ)

آیت مبارکہ:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ‌ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا‌ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ‌ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۱۹﴾

لغۃ القرآن: [قَالَ : فرمایا][اللّٰهُ : اللہ][هٰذَا : یہ][يَوْمُ : دن][يَنْفَعُ : وہ نفع دے گا][الصّٰدِقِيْنَ : سچ بولنے والے][صِدْقُهُمْ : انکا سچ][لَهُمْ : انکے لیے][جَنّٰتٌ: باغات][تَجْرِيْ : چلتی ہیں][مِنْ : سے][تَحْتِهَا : نیچے ان کے][الْاَنْهٰرُ : نہریں][خٰلِدِيْنَ : رہنے والے][فِيْهَآ : ان میں][اَبَدًا : ہمیشہ][رَضِيَ : راضی ہوا][اللّٰهُ : اللہ][عَنْهُمْ :

ان سے][وَرَضُوْا : اور وہ راضی ہوئے][عَنْهُ : اس سے][ذٰلِكَ : وہ][الْفَوْزُ : کامیابی][الْعَظِيْمُ : بہت بڑی]

ترجمہ: اللہ فرمائے گا: یہ ایسا دن ہے (جس میں) سچے لوگوں کو ان کا سچ فائدہ دے گا، ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہی (رضائے الٰہی) سب سے بڑی کامیابی ہے

تشریح: جو اہل ایمان اپنے اقوال اور افعال میں سچے ہیں اکثر انھیں سچائی کا فائدہ اس دنیا میں بھی ملتا ہی لیکن بعض دفعہ اس دنیا میں اس کا بدلہ ظاہر نہیں ہوتا، البتہ قیامت کے دن سچائی کا بدلہ بہر صورت ملے گا جس کی وجہ سے انھیں جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہو گی جو کہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور جو انسان سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس سچا لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے سے بچو کیونکہ جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور جو انسان جھوٹ بولتا ہی اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔" (مسلم: 6639: کتاب البر: باب 29) (امداد)

سچا آدمی

حدیث میں علانیہ اور تنہائی میں اچھی طرح نماز پڑھنے والے کو سچا بندہ کہا گیا ہے، ارشاد ہے:

ان العبد اذا صلی فی العلانیہ الخ۔

(ترجمہ) یعنی جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور وہ تنہائی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہے تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچ مچ بندہ ہے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بڑی نعمت یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہوا اب کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔

رضاء الٰہی

بڑی کامیابی حق تعالیٰ کی رضاء ہے اور جنت بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ محل رضائے الٰہی ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اس روز رب کریم جلوہ افروز ہو گا اور فرمائے گا مانگو میں دینے پر آمادہ ہوں۔ لوگ اس کی رضامندی مانگیں گے تو فرمائے گا کہ میری رضامندی ہی نے تمہیں میرے گھر اتارا ہے مانگو کیا مانگتے ہو۔ لوگ پھر اس کی رضامندی مانگیں

گے۔فرمائے گا، گواہ رہو کہ سبحانہ تعالیٰ تم سے راضی ہے۔ذلك الفوز العظيم، یہ بڑی زبردست کامیابی ہے۔ لمثل ھذا فلیعمل العملون۔
عمل کرنے والوں کو ایسا ہی عمل کرنا چاہیے۔وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون۔۔ کیونکہ محبت دونوں جانب سے ہوگی۔صوفیہ نے
یہی تشریح کی ہے لیکن عام اہل تفسیر نے توضیح مطلب اس طرح کی ہے کہ اللہ ان کی مخلصانہ کوشش کو پسند فرمائے گا یہ اللہ کی رضامندی
ہوگی اور اللہ کی طرف سے عطا کئے ہوئے کامل ثواب سے اہل جنت خوش ہوں گے یہ ان کی رضامندی ہوگی یعنی ایک طرف سے سعی مشکور
ہوگی اور دوسری طرف سے جزاء موفور۔(گلدستہ)

سچ بولنے کا فائدہ صرف آخرت میں کیوں ہوگا؟

اس پر اجماع ہے کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے 'اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں سچ بولا تھا 'ان کا سچ اس دن کام آئے گا اور ان کو نفع
دے گا 'اور اس دن کسی کا سچ بولنا اس کے لیے نفع آور نہیں ہوگا 'کیونکہ دار التکلیف اور دار العمل دنیا ہے اور قیامت کا دن یوم الجزاء ہے۔اس
دن تو شیطان بھی سچ بولے گا اور کہے گا۔

(آیت) "وقال الشیطن لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم"۔(ابراہیم: ۲۲)

ترجمہ: اور فیصلہ ہو چکنے کے بعد شیطان کہے گا بیشک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا سو میں نے اس کے
خلاف کیا۔

شیطان کا یہ قول سچ ہے لیکن اس دن کسی کا سچ اس کے کام نہیں آئے گا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ مسلمان یوم آخرت میں انبیاء (علیہم السلام) کے تبلیغ کرنیکی جو سچی گواہی دیں گے اور اپنے اعمال کی سچی گواہی دیں گے تو
مسلمانوں کی یہ سچی گواہی ان کو نفع دے گی 'اور نفع یہ ہے کہ ان سے شہادت کے چھپانے کا مواخذہ نہیں ہوگا اور ان کی مغفرت کردی جائے
گی۔

سچ بولنے کا نفع ویسے تو انسان کو ہر روز حاصل ہوتا ہے 'لیکن آخرت میں دائمی اجر و ثواب صرف اس دن حاصل ہوگا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے
بتایا کہ آخرت میں سچ بولنے کا کیا نفع ملے گا 'وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہیں۔انسان کو کوئی نعمت مل جائے تو پھر بھی اس کو
یہ فکر ستاتی رہتی ہے کہ کہیں یہ نعمت زائل نہ ہو جائے اور اگر نعمت زائل نہ ہو تو اس نے ایک دن مر جانا ہے 'تب بھی وہ اس خیال سے ملول
رہے گا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آخرت کی نعمتیں زائل نہیں ہوں گی نہ ان کو موت آئے گی 'بلکہ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔جنت انسان
کے جسم کی نعمت ہے اور اس کی روح کی نعمت یہ ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے تو جنت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ اللہ ان سے
راضی ہوا۔پھر فرمایا: یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ سب سے بڑی کامیابی اللہ کا راضی ہونا ہے 'جنت میں
مرغوبات نفس ہیں اور اللہ کی رضا اس سے بہت بڑا اور اعلیٰ درجہ ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے 'ہم جنت کے لائق تو نہیں ہیں وہ اپنے
فضل و کرم سے ہمیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور سب سے بڑا مطلوب یہ ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جائے۔(تبیان)

المختصر۔۔رضوان الٰہی کی صورت میں جنتوں پر ایک مزید فیض و فضل نصیب ہوگا۔

جسکے بعد کسی فیض و فضل کی ضرورت نہ ہوگی،اسی لیے فرمایا کہ۔۔

(یہ) سب سے (بڑی کامیابی ہے)۔۔یعنی نجات اور حقیقی فوز بھی یہی ہے کہ انسان اپنے مقصود کو حاصل کرلے اور وہ ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی کیونکہ اس کے سوا مومن کا اور کوئی مطلوب و مقصود نہیں۔

اب سورۃ مبارکہ کے آخر میں نصرانیوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی جارہی ہے، کہ تم لوگوں نے حضرت عیسیٰ وحضرت مریم کے تعلق سے جو عقیدہ گھڑا ہے، وہ بالکل باطل ہے، کیونکہ معبود برحق تو۔۔۔

(اللہ تعالیٰ) (ہی) ہے، جس (کی ملکیت آسمانوں زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے)۔

انکے اندر جتنے عقلاء اور غیر عقلاء ہیں سب اسی کی ملک ہیں، وہی ان کا حقیقی مالک ہے، کہ جس طرح کاان میں تصرف کرنا چاہتا ہے کرتا ہے۔ انھیں پیدا کرے، مٹائے، فنا کردے، زندہ رکھے، انھیں مارے۔۔یا۔۔روکے۔ان میں سے کسی کو بھی کسی قسم کا دخل نہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عظیم و جلیل ہے (اور وہ ہر چاہے پر قادر ہے) جو چاہا کیا، جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہے گا کریگا۔ تو عبادت کی مستحق، اس کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔ (اشرفی)

فوائد

۱: یعنی جو دنیا میں سچے عقیدے سچے اعمال پر رہے وہ آج نفع میں ہیں اور جو جھوٹے عقیدے جھوٹے اعمال پر رہے وہ آج نقصان میں ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ بے دین کی بخشش نہیں اگرچہ بزرگوں کی اولاد ہو۔اور کوئی شخص اعمال سے بے نیاز نہیں۔ جو بوؤگے وہی کاٹوگے۔

۲: لھم سے معلوم ہوا کہ جنت کے باغات جنت والوں کی ملک ہوں گے اور ہر جنتی کو چند قسم کے باغ عطا ہوں گے۔ اور ہر جنتی کے باغوں میں ایک نہر ہی نہ ہو گی بلکہ دودھ شہد، پانی وغیرہ کی متعدد نہریں ہوں گی۔

۳: اس طرح کہ اللہ ان کے تھوڑے اعمال پر خوش یہ لوگ اللہ کے تھوڑے رزق پر راضی ہیں رب ان کے گناہ بخشے گا۔ یہ لوگ اس کی بھیجی مصیبت پر رب سے ناراض نہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر سچے متقی کو (رض) کہہ سکتے ہیں۔ یہ الفاظ صحابہ سے خاص نہیں۔

۴: رب کو راضی کرلیناہی بڑی کامیابی ہے۔ بادشاہ بن جانا کمال نہیں نیک بندہ بن جانا کمال ہے۔ (نور)

آیت مبارکہ:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

﴿۱۲۰﴾ ع

لغۃ القرآن: [لِلّٰهِ : اللہ کیلئے][مُلْكُ : بادشاہی][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ : اور زمین][وَمَا : اور جو][فِيْهِنَّ : انکے درمیان][وَهُوَ : اور وہ][عَلٰي : پر][كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز][قَدِيْرٌ : قدرت والا]

ترجمہ: تمام آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے (سب کی) بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور وہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے

تشریح: یہ آخری آیت گویا اس سورۃ کریمہ کے سر پر زریں تاج ہے۔ سب شبہات کا ازالہ، سب گمراہیوں کا رد اور سب حقائق کا حاصل اور نچوڑ اس میں بیان فرما دیا۔ فرمایا زمین اور آسمان اور ان میں خاکی، ناری اور نوری، بے جان اور جاندار، بے شعور اور باشعور جو کچھ بھی ہے سب اللہ وحدہ لاشریک کی ملکیت ہے۔ اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ کوئی خدائی میں شریک نہیں۔ کوئی اس کا بیٹا نہیں۔ سب اس کے بندے اور اس کے حکم کے پابند ہیں۔ ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ اگر کسی کو کوئی چیز نہ دے یا دے کر چھین لے تو کوئی دم نہیں مار سکتا۔ اور اپنے محبوبوں کو خصوصا اپنے محبوب ترین بندے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو دینا چاہے وہ دے دیتا ہے کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ (ضیاء)

جب زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تو ظاہر ہے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم (علیہا السلام) کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا وہ خدا کی مخلوق اور مملوک ہیں خدا نہیں ہیں۔ (امداد)

اپنی ذات کی عظمت ظاہر فرما کر نصاریٰ کا رد کیا کہ ان کا جو خیال ہے کہ ذات واجب تعالیٰ شانہ کے ساتھ دو خدا اور ہیں اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ منع اور عطا۔ ایجاد اور افناء میں۔

تصریح مزید

آیہ کریمہ کے مفہوم سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیر علی کل شے ہے یعنی ہر ممکن الوجود پر اس کی قدرت حاوی ہے۔ (جمل)

اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ کذب بھی اگرچہ شے ہے اور عیوب بھی شے ہیں لیکن چونکہ ذات سبحانہ ہر قسم کے قبائح سے منزہ ہے اور ہر قبیح اس کے لیے محال ہے اسے بھی تحت قدرت ماننا اور علی کل شے قدیر سے سند لانا جہالت ہے۔

نسال اللہ ان یوفقنا لمرضاتہ ویجعلنا من الفائزین بجنابہ۔ وصلی اللہ علی سیدنا ومولنا وملجانا وماونا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔ امین یارب العالمین (حسنات)

یہ ایک ایسا اختتامی تبصرہ ہے جو اس عظیم مسئلے کی بحث کے خاتمے کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ نیز اس عظیم منظر سے جو تاثر ملتا ہے اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ یہاں اللہ وحدہ الہ ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ اس کے سامنے تمام رسول سر تسلیم خم کرتے ہیں اور سب رسول آخری فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں اس میں حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) بھی اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں زمین وآسماں کی حکومت ہے۔

اور یہ آخری تبصرہ اس پوری سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورۃ کا مرکزی موضوع "الدین" ہے اور دین اور دینداری کا اظہار اللہ کی شریعت کی اطاعت میں ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے قوانین و ضوابط اخذ کرنا اور صرف اسی کے مطابق فیصلے کرنا اس لیے کہ وہی بادشاہ ہے جس کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ زمین وآسمان کے درمیان جس قدر چیزیں بھی ہیں وہ اس کی مملوک ہیں اور یہ مالک اور بادشاہ یہ آرڈیننس جاری فرماتا ہے۔ (آیت) "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الکافرون" "اور جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو

اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کافر ہے۔ "یہی ایک مسئلہ ہے اور یہ اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عقیدہ توحید کا مسئلہ ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا مسئلہ ہے ' جس کے بعد ہی مکمل توحید وجود میں آتی ہے اور صرف اللہ الہ وحاکم قرار پاتا ہے۔ (ظلال)

اللہ کی عظمت و جبروت کے ذکر پر سورت کا اختتام

آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے ان کی سلطنت اللہ ہی کی ملکیت میں ہے ' اس آیت میں لفظ ما استعمال فرمایا ہے۔ جو غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ من کا لفظ استعمال نہیں فرمایا ' جو ذوی العقول کے لیے آتا ہے ' اس میں ہو سکتا ہے یہ تنبیہ کرنا مقصود ہو کہ آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے خواہ وہ ذوی العقول اور ذوی العلوم ہوں ' غیر ذوی العقول اور غیر ذوی العلوم سب اس کے قبضہ و قدرت میں مسخر ہیں اور سب اس کی قضاء و قدرت کے تابع ہیں۔ اور ذوی العقول اس کے سامنے غیر ذوی العقول اور جمادات کے درجہ میں ہیں ' اس کی قدرت کے سامنے کسی کی قدرت نہیں اور اس کے علم کے سامنے کسی کا علم نہیں ' اس لیے اس آیت میں غیر ذوی العقول کو ذول العقول پر غلبہ دے کر لفظ ما استعمال فرمایا۔

شریعت اور حقیقت کی طرف اشارہ

جب آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ کی ملک میں ہے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم بھی اللہ کی ملک میں ہیں۔ اس کے مملوک اور عبد ہیں اور جو مملوک اور عبد ہوں ' وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس آیت میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کا رد ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم خدا ہیں ' اس سورت کے شروع میں فرمایا تھا اے ایمان والو! (اپنے) عہد پورے کرو اور احکام شرعیہ کے ذکر سے اس اس سورت کی ابتداء کی تھی اور اس سورت کا اختتام اللہ عزوجل کی کبریائی ' اس کی عزت وجلال اور اس کی سلطنت اور قدرت پر کیا ہے۔ گویا یہ سورت شریعت کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور حقیقت کے ذکر پر ختم ہوتی ہے اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ شریعت ابتداء ہے اور حقیقت انتہاء ہے ' اور یہ کہ شریعت پر عمل کر کے ہی انسان حقیقت تک پہنچے گا۔

تمام مضامین سورت کی دلیل

اس سورت میں احکام شرعیہ بیان کیے گئے ہیں اور یہود کا رد کیا گیا ہے جو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت کا انکار کرتے تھے اور عیسائیوں کا رد کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی الوہیت کے معتقد تھے ' اور اس سورت کو اس آیت پر ختم کیا ہے جس کا معنی ہے ہر چیز اللہ کی ملک میں ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ تمام ممکنات ' ارواح اور اجسام کا موجد اور خالق ہے اور جب اللہ تعالیٰ سب کا خالق اور مالک ہے تو اسے اپنی مخلوق کو امر اور نہی ' حکم دینے اور منع کرنے کا حق ہے اور یہی شریعت ہے ' سو یہی آیت احکام شرعیہ کی دلیل ہے اور اللہ خالق اور مالک ہے تو اسے یہ حق ہے کہ وہ جس حکم کو چاہے معطل کر دے جس شریعت کو چاہے منسوخ کر دے۔ سو اس نے یہود کی شریعت کو منسوخ کر کے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت کو نافذ کر دیا ' سو اس آیت سے یہود کا رد بھی ہو گیا اور اس

آیت سے خصوصیت کے ساتھ عیسائیوں کا رد بھی ہو گیا۔ کیونکہ جب ہر چیز اس کی مملوک ہے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی اس کے مملوک ہیں 'اور جو مملوک ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا 'سو یہ آخری آیت اس پوری سورت کے مضامین کی دلیل ہے۔ (تبیان)

المختصر انسان کی فلاح کا حقیقی نسخہ

یہ سورۃ مائدہ کی آخری آیت ہے۔ اس میں نہ صرف سورۃ مائدہ کی تعلیمات کی روح کھینچ لی گئی ہے بلکہ یہ تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ انسان کی تمام گمراہیوں کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سمیت 'تمام زیر تصرف دنیا کا مالک اور حاکم انسانوں کو سمجھتا ہے اور یا ان قوتوں کو جن کے بارے میں اس نے کچھ تصورات اختیار کر رکھے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ انسانوں اور ان قوتوں کے سامنے اپنی ضرورتوں کے لیے دست سوال دراز کرتا ہے۔ اپنی تنہائیوں میں انھیں سے مناجاتیں کرتا ہے اور محسوس دنیا میں انھیں کے سامنے جھکتا اور انھیں کو اختیارات کا مالک سمجھتا ہے۔ قانون کی ضرورت پڑتی ہے تو انسانوں کے وضعی قوانین کو اختیار کرتا ہے۔ تہذیب اور تمدن کے لیے 'انھیں کی دریوزہ گری کرتا ہے۔ خوف اور امید میں انھیں کو اپنا آستانہ سمجھتا ہے۔ گویا خود انسان اور انسانی ادارے اس کی عبادت گاہ بھی ہیں اور اس کی عقیدت کا مرکز بھی۔ وہی اس کے لیے تخت و تاج کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں کی قوتیں اور طاقتیں 'اس کے لیے پناہ گاہیں ہیں۔ انہی تصورات نے انسانوں کو ہمیشہ اللہ سے یکسر بیگانہ کیا ہے۔ اس لیے اس بنیادی خرابی کا علاج کرنے کے لیے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان بسنے والی قوتیں اور مخلوقات 'ان تمام کا اگر کوئی مالک ہے 'کوئی حاکم ہے اور کسی کو ان پر حکومت چلانے کا حق ہے اور کوئی ان کو قانون کی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے تو وہ صرف ایک اللہ ہے۔ اسی کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ ساری دنیا کی قوتیں اس کے سامنے پرکاہ جیسی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔ اس کی قدرتوں میں 'اس کے علم میں 'اس کی حاکمیت میں 'کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ یہی وہ تصور ہے جس نے ہمیشہ انسانی زندگی کی اصلاح کی اور آج بھی اسلام اسی کی دعوت دیتا ہے اور یہی انسانی زندگی کے بگاڑ کو دور کرنے کا حقیقی نسخہ ہے کیونکہ باقی تمام نسخے انسان کو بگاڑ تو سکتے ہیں سنوار کچھ نہیں سکتے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے انہی تصورات کو سمیٹتے ہوئے کہا: (روح)

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو 'گر ڈرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کی طلب میں مرو ' جب مرو تم
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

اختتامی کلمات

آج بہ روز آدینہ مورخہ ۱۵ جمادی الثانی ۱۴۴۵ھ۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۲۳ سحری کے مبارک وقت میں سورۃ مائدہ کی تفسیر ختم ہو گئی۔ اس سورت کے تمام حقائق و معارف اور تمام اسرار و رموز کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں نے اسلاف کی کتابوں سے استفادہ کرکے اور زیادہ سے زیادہ احادیث پیش کرکے اپنی استطاعت کے مطابق اس کی تحقیق پیش کی ہے۔

الہ العالمین ! اس سعی کو قبول فرما ' اس میں جو کوتاہی ہو گئی اس سے در گزر فرما اور جس طرح تو نے محض اپنے فضل سے سورۃ مائدہ کی تفسیر کی توفیق دی ہے ' بقایا سورۃ قرآن کی تفسیر کی بھی توفیق عطا فرما اور محض اپنے فضل و کرم سے میرے محبین اور قارئین کی مغفرت فرما۔ ہم سب کو دنیا اور آخرت کی ہر مشکل ' مصیبت اور پریشانی اور عذاب سے محفوظ رکھ اور دنیا اور آخرت کی ہر سعادت اور نعمت عطا فرما۔ ور میری ہر تصنیف کو میرے لیے صدقہ جاریہ کر دے ' ان کتابوں کے فیضان کو تا قیام قیامت باقی اور عام رکھ ' ان کتابوں کو موافقین کے لیے موجب استقامت اور مخالفین کے لیے ذریعہ ہدایت بنا۔ آمین یارب العالمین بجاہ نبیک سیدنا محمد خاتم النبیین ، قائد المرسلین ، شفیع المذنبین ، وعلی الہ الطیبین الطاھرین وعلی اصحابہ الکاملین الراشدین وعلی ازواجہ امھات المؤمنین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔

اشاریہ

تفسیر میں ترجمہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری دام برکاتہم ! اور لفظی ترجمہ جناب میاں محمد جمیل زاد مجد کم ! صاحب کا ہے۔

جبکہ تفاسیر کے حوالہ جات ان کے ابتدائی نام سے دیئے گئے ہیں مثلاً ضیاء مراد ضیاء القرآن، روح مراد روح القرآن وغیرہ

کتابیات

نمبر	ترجمہ/تفسیر:	نام کتاب-	القاب	نام مترجم-
1.	تفسیر:	ابن عباس-	پروفیسر	محمد سعید احمد عاطف صاحب-
2.	تفسیر:	ابن کثیر-	حافظ	عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر صاحب-
3.	تفسیر:	ابن مسعود-	مولانا	شمس الدین-
4.	تفسیر:	احکام القرآن للجصاص-		ابو احمد بن علی الرازی-
5.	شان نزول:	اسباب نزول قرآن-		محمد علی نیشاپوری صاحب-
6-	تفسیر:	اشرفی-		سید محمد مدنی اشرفی جیلانی-
7.	تفسیر:	اسرار التنزیل-	مولانا	محمد اکرم اعوان-
8.	تفسیر:	البیان (الغامدی)-		جاوید احمد غامدی-
9.	تفسیر:	الحسنات-	علامہ	ابوالحسنات سید محمد احمد قادری-
10.	تفسیر:	امداد الکرم-		محمد امداد حسین پیرزادہ-
11.	تفسیر:	انوار البیان-	مولانا	عاشق الٰہی-
12.	تفسیر:	انوار الفرقان-		محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب-
13.	تفسیر:	انوار القرآن-	ڈاکٹر	ملک غلام مرتضی-

14. تفسیر: آسان قرآن- مفتی تقی عثمانی صاحب-

15. تفسیر: بغوی- ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی-

17۔ تفسیر: برہان القرآن علامہ قاری محمد طیب نقشبندی

18. تفسیر: تبیان القرآن- مولانا غلام رسول سعیدی-

19. تفسیر: تدبر قرآن- مولانا امین احسن اصلاحی-

20. تفسیر: تفسیرات احمدیہ- ملا احمد جیون-

21. تفسیر: تیسیر القرآن- مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب-

22. تفسیر: جلالین- جلال الدین سیوطی-

23. تفسیر: حقانی- ابو محمد عبدالحق حقانی صاحب-

24. تفسیر: خزائن العرفان- علامہ نعیم الدین مراد آبادی-

25. ترجمہ: در منثور- جلال الدین سیوطی-

26. تفسیر: در منثور- جلال الدین سیوطی-

27. تفسیر: درس قرآن- محمد احمد صاحب- (

28. تفسیر: درس قرآن- مرتب محمد اسحاق-

29. تفسیر: ذخیرۃ الجنان- مولانا سرفراز خان صفدر صاحب-

30. تفسیر: روح القران- ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی-

31. تفسیر: صراط الجنان- ابو صالح محمد قاسم القادری-

32. تفسیر: ضیاء القرآن- پیر پیر کرم شاہ صاحب-

33. ترجمہ: عرفان القرآن- ڈاکٹر طاہر القادری صاحب-

34. تفسیر: عروۃ الوثقی- عبدالکریم اثری صاحب-

35. ترجمہ لفظی: فہم القرآن- میاں محمد جمیل صاحب-

36. تفسیر: فہم القرآن- میاں محمد جمیل-

37. تفسیر: فی ظلال القرآن- سید قطب شہید-

38. تفسیر: فیوض القرآن- ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی-

39. تفسیر: قرطبیؒ- ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبیؒ-

40. تفسیر: کشف الرحمٰن- مولانا احمد سعید دہلوی-
41. تفسیر: گلدستہ تفاسیر- محمد اسحاق-
42. تفسیر: محمود- مفتی محمود صاحب-
43. تفسیر: مدارک- ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمد بن محمود النسفی-
44. تفسیر: مدنی- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)-
45. تفسیر: مدنی کبیر- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)-
46. تفسیر: مظہر القرآن- مفتی شاہ محمد مظہر اللہ-
47. تفسیر: مظہری- قاضی ثناء اللہ پانی پتی-
48. تفسیر: معارف القرآن- مولانا ادریس کاندہلوی صاحب-
49. تفسیر: معارف القرآن- مفتی محمد شفیع صاحب-
50. تفسیر: مفردات القرآن- مولانا محمد عبدہٗ فیروز پوری-
51. تفسیر: نور العرفان- مفتی احمد یار خان نعیمی-
52. تفسیر (اہل تشیع): الکوثر (اہل تشیع)- محسن علی نجفی-
53- تفسیر منازل العرفان عبدالستار شاہ

بائیبل مقدس بائیبل سوسائیٹی

The Bible